یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

اثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۹

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباحُ القرآن ٹرسٹ

پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

نام کتاب ——— تفسیر نمونہ

جلد ——— ۹

زیرِ نظر ——— آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ——— حضرت مولانا سیّد صفدر حسین نجفی رح

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰ گنگارام بلڈنگ
شاہراہِ قائداعظم، لاہور

مطبع ——— اظہار سنز پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ——— ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ ———

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴ الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون: ۷۱۲۲۴۲۳-۷۳۱۴۳۱۱

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عَرضِ ناشَر

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

الحمدُ للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ —— کلامِ حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرۂ آفاق تفسیر —— تفسیر نمونہ —— کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کُتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلیٰ اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآنِ پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مُسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

ب روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہلِ علم
پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ
جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں
جا سکیں۔

نسیر نمونہ کی اس ترتیبِ نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ
ں ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصّہ ایک جلد میں اور بقایا حصّہ
۔ اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت
نے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصّوں میں تقسیم
نے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں
۔۔

س جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۹ اس وقت آپ کے پیش نگاہ ہے جس میں سابقہ جلد ۱۶
ایکجا کر دی گئی ہیں، چنانچہ یہ جلد سُورہ قصص، سُورہ عنکبوت، سُورہ روم، سُورہ آلٓمٓ سجدہ اور سُورہ احزاب
؛ د تفسیر پر مشتمل ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی
رے ہیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے
تے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے
، میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔
خر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں
، تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ
مومنیؑن ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکزِ مُطالعاتِ اِسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو تمام طبقات میں عمُومًا ـــــ اور

نوجوانوں میں خصوصًا

اِسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا

گیا ہے۔

اِس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزۂ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیدِ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر بُرہان	از	مرحوم سیّد ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمّد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سیّد قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمّد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفٰی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابو الفتوح رازی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مُحسنِ ملت حضرت علاّمہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامۂ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوتے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہو گا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیّت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للّٰہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی [illegible] جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آ چکی ہیں (اور یہ اس کی سولہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہو گی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہو گی [1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلا وطنی [2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلا وطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بار الٰہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم۔ ایران

فہرست جلد۹

سورہ قصص ۲۴

سورہ عنکبوت ۱۷۰

سُورۂ رُوم

* * *

تفسیر نمونہ جلد ۹

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ قصص ۲۔ سورہ عنکبوت ۳۔ سورہ روم ۴۔ سورہ لقمان ۵۔ سورہ الم سجدہ
سورہ احزاب

سورۂ قصص، مکی سورت ہے اور اس کی ۸۸ آیات ہیں۔

پارہ ــ ۲۰

سورۂ عنکبوت، مکی سورت ہے اور اس کی ۶۹ آیات ہیں۔

پارہ ۲۰ ــ ۱ تا ۴۴ پارہ ۲۱ ــ ۴۵ تا ۶۹

سورۂ روم، مکی سورت ہے اور اس کی ۶۰ آیات ہیں۔

پارہ ــ ۲۱

سورۂ لقمان، مکی سورت ہے اور اس کی ۳۴ آیات ہیں۔

پارہ ــ ۲۱

سورۂ الم سجدہ: مکی سورت ہے اور اس کی ۳۰ آیات ہیں۔

پارہ ــ ۲۱

سورۂ احزاب، مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۳ آیات ہیں۔

پارہ ۲۱ ــ ۱ تا ۳۰ پارہ ۲۲ ــ ۳۱ تا ۷۳

سُورۂ قصص

☆ مکّہ میں نازل ہوئی

☆ اِس میں ۸۸ آیتیں ہیں

مندرجاتِ سُورۂ قصص :

مشہور یہ ہے کہ یہ سُورۃ مکّہ میں نازل ہوئی تھی ۔ اس وجہ سے اِس کے مندرجات اور اس کا اسلُوب وہی ہے جیساکہ دیگر مکّی سُورتوں کا ہے[1]

اگرچہ بعض مفسّرین نے اِس سورۃ کی آیت نمبر ۸۵ یا ۵۲ سے ۵۵ تک کو اِس سے مُستثنیٰ کیا ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے ۔ آیہ ۸۵ جحفہ (جوکہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) میں نازل ہوئی اور باقی چار آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ لیکن اُن کے قول پر کوئی محکم دلیل نہیں ہے ۔ممکن ہے کہ اہلِ تفسیر کے اِس خیال کا سبب یہ ہو کہ اِن پانچ آیات میں اہلِ کتاب کا ذکر ہے ۔ اور اہلِ کتاب کثرت سے مدینہ میں رہتے تھے ۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کہ قرآن کا جو حصّہ مکّہ میں نازل ہوا ہے ، اُس میں صرف مشرکینِ مکّہ ہی کا ذکر ہو۔ جب کہ مکّہ اور مدینہ کے لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں بہت آنا جانا تھا ۔

البتہ مفسّرین نے آیات ۵۲ تا ۵۵ کی شانِ نزول کا جو ذکر کیا ہے وہ اِن آیات کے مدنی ہونے سے مناسبت رکھتی ہے ان شاء اللہ ہم مناسب مقام پر اُس کا ذکر کریں گے ۔

آیت نمبر پچاسی میں پیغمبرِ خدا[ص] کے اپنے اصلی وطن یعنی مکّہ کا ذکر ہے اِس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ یہ آیت ہجرت کے وقت جب کہ آپؐ مکّہ سے باہر تشریف لیے جا رہے تھے ، اسی مقدّس سرزمین پر نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ جناب رسالتمآبؐ کو سرزمین مکّہ سے جو کہ حرمِ امنِ خُدا اور مرکزِ توحید تھا بہت محبت تھی ۔ چنانچہ اِس آیت میں اللہ اُنھیں بشارت دیتا ہے کہ آخر کار میں تم کو اِس شہر میں واپس لے آؤں گا ۔

مذکورہ بالا مفہوم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت مکّی ہو ۔ اور اگر بالفرض یہ آیت جحفہ میں بھی نازل ہوئی تو وہ مقام بھی بہ نسبت مدینہ کے مکّہ سے نزدیک تر ہے ۔

بنا برایں جب ہم آیاتِ قرآنی کو مکّی اور مدنی میں تقسیم کرتے ہیں تو اِس آیت نمبر پچاسی کو غیر آیات مکّی میں جگہ نہیں دے سکتے ۔ مسلّماً یہ سُورۃ مکّہ میں نازل ہوئی ہے ۔ اِن حالات میں جب کہ باایمان افراد قوی دشمنوں کے پنجہ میں پھنسے ہوئے تھے ۔ وہ دشمن بھی ایسے تھے جو اپنی جمعیت و تعداد اور قدرت و قوت ہر دو لحاظ سے مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے ۔ یہ مسلمان اقلیت اُس اکثریت کے تحت ایسی دبی ہوئی تھی کہ اُن میں کچھ لوگ اسلام کے مستقبل کے متعلق خوف زدہ اور فکرمند رہتے تھے ۔

چونکہ مسلمانوں کی یہ حالت بنی اسرائیل کی اُس وضع کے زیادہ مشابہ تھی جب کہ وہ حکومتِ فرعون کے پنجہ میں گرفتار تھے ۔ اِس لیے اِس سورۃ کے ایک حصّہ میں حضرت موسیٰؑ ، بنی اسرائیل ، اور فرعون کا قصّہ بیان کیا گیا ہے ۔ اور یہ حصّہ اتنا طویل ہے کہ

[1] دیکھیے "تاریخ القرآن" ابوعبداللہ زنجانی ، اور "فہرست" ابن ندیم اور کتب تفسیر ۔

سورۂ مذکورہ کے قریباً نصف حصہ پر مشتمل ہے۔

اِس میں خصوصاً حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے اُس حصہ کا ذکر ہے جب کہ وہ ایک طفلِ ضعیف شیرخوار اور فرعون کے گھر میں پرورش پا رہے تھے۔ مگر قادرِ مطلق کی اُس شکست ناپذیر قدرت نے، جو تمام کائنات پر سایہ فگن ہے، اِس کمزور بچے کو طاقتور دشمنوں کے زیرِ دامن پرورش کرا کے بڑا کر دیا اور آخرکار خدا نے اُسے اِس قدر قوّت عطا فرمائی کہ اُس نے فرعون کی تمام شوکت و ثروت کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ظلم کے محل کو مسمار کر دیا۔

یہ قصہ اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ مسلمان پروردگار کے لطف و کرم کے اُمیدوار رہیں اور اس کی لامحدود قدرت پر اعتماد کر کے اپنے دل کو مطمئن رکھیں۔ اور دشمن کی تعداد کثیر اور اُس کی طاقت سے ہرگز خوف زدہ نہ ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اس سُورۃ کا ابتدائی حصہ اِسی پُرمعنیٰ اور دانش آموز تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے۔

بالخصوص آغازِ بیان میں مستضعفین کے لیے حق و عدالت پر مبنی حکومت کی نوید ہے اور ظالمین کی شان و شوکت کے برباد ہونے کی بشارت ہے یہ بشارت مظلومین کے لیے آرام بخش اور قدرت آفرین ہے۔

اِس سُورۃ کا مغزِ بیان یہ ہے کہ جس وقت تک بنی اسرائیل رہبر و پیشوا سے محروم رہے اور اُن کے سروں پر سائبانِ ایمان و توحید کا سایہ نہ ہوا تھا، اُس وقت تک نہ تو اُن میں کوئی ایسی تحریک رُونما ہوئی اور نہ وہ کوئی ایسی سعی و کوشش کر سکے جو اُنہیں من حیث القوم منظّم و متحد کر دے۔ اندریں حال وہ غلامی اور اسیری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مگر جیسے ہی اُنھیں ایک رہبر مل گیا اور اُن کا دل نورِ علم و توحید سے روشن ہو گیا، وہ فرعون اور آلِ فرعون پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے حکومت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی اسرائیل آزاد ہو گئے۔

اِس سُورۃ کے حصہ دوم میں اُس دولت مند اور متکبر قارون کا ذکر ہے جسے اپنے علم اور دولت پر بڑا بھروسہ تھا۔ اِس غرور و تکبّر کے نتیجہ میں اُس کا انجام بھی بالکل فرعون جیسا ہوا۔ فرعون پانی میں غرق ہوا، اور یہ مٹی میں۔ فرعون کو اپنی فوجی طاقت پر گھمنڈ تھا اور قارون کو اپنی دولت پر۔

خُدائے حکیم نے یہ واقعات اِس لیے بیان کیے ہیں تاکہ اہلِ عالم پر یہ واضح ہو جائے کہ :-

خواہ وہ مکّہ کے اہلِ ثروت ہوں، اس علاقہ کے مُشرک صاحبانِ اقتدار ہوں یا اس دَور کے سیاسی بازی گر ہوں، اِن میں سے کسی میں بھی یہ قدرت نہیں ہے کہ مستکبرین پر مستضعفین کے غلبے کے بارے میں جو ارادۂ الٰہی ہے اس کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ واقعات اس سورہ کے آخری حصہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

اِن دو حصّوں کے درمیان توحید، معاد، اہمیّتِ قرآن، قیامت میں مشرکین کی حالت، مسئلہ ہدایت و ضلالت اور کمزور افراد کی بہانہ جوئی کا جواب مذکور ہے۔ یہ بیان نہایت قیمتی اور سبق آموز ہے۔ درحقیقت یہ بیان سُورۃ کے حصہ اوّل کا نتیجہ اور حصہ دوم کے لیے مقدمہ کا حکم رکھتا ہے۔

فضیلتِ تلاوتِ سُورۂ قصص

جنابِ رسالتمآبؐ سے مروی ایک حدیث میں ہم یُوں پڑھتے ہیں :

من قرء طسٓمٓ القصص اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدق بموسٰی وکذب به ، ولم یبق ملك فی السماوات والارض الا شهد له یوم القیامة انه کان صادقاً

جو آدمی سورۃ قصص کو پڑھے گا تو اسے اُن لوگوں کہ جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کی تصدیق یا تکذیب کی تعداد کی نسبت سے دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔ اور زمین اور آسمان میں کوئی فرشتہ ایسا نہ ہوگا جو بروزِ قیامت اس شخص کی صداقت پر گواہی نہ دے[1]۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ :

جو شخص طوٰاسین ثلاثہ یعنی سُورۃ قصص، نمل اور شعراء کو ہر شبِ جمعہ میں پڑھے گا، اُس کا شمار دوستانِ خدا میں ہوگا اور وہ جوارِ الٰہی اور اُس کے سایۂ حمایت میں رہے گا۔ وہ دُنیا میں کبھی بے امن، ناراحت اور فقیر نہ رہے گا۔ اور آخرت میں خدا اس کو اس قدر انعامات عنایت کرے گا کہ وہ نہ صرف راضی ہو جائے گا بلکہ اُس کی مسرّت کی کیفیت اس سے بھی زیادہ ہوگی[2]۔

یہ امر بدیہی ہے کہ یہ تمام اجر و ثواب اُن لوگوں کے لیے ہے جو اس سُورۃ کو پڑھ کر دُنیا کے قارونوں اور فرعونوں کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ اور راست باز مومنین کی صف میں کھڑے ہو کر باطل کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور مشکلات کے وقت دشمن کے مقابلہ میں ہار نہیں مانتے اور شکست کی ذلّت کو گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ نعماتِ الٰہی کسی کو مُفت میں نہیں مل جاتیں۔ یہ نعمات و برکات اُنہیں لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو کلامِ الٰہی کو پڑھتے ہیں، اُس پر غور کرتے ہیں اور اُس کی تعلیم کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناتے ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان در آغاز سورۃ القصص۔

[2] تفسیر نور الثقلین سورۂ قصص کے آغاز میں، بحوالہ ثواب الاعمال۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ طٰسٓمّٓ ○

۲۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ○

۳۔ نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

۴۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○

۵۔ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ○

۶۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ طٰسٓمّٓ

۲۔ یہ کتاب مُبین کی آیات ہیں۔

۳۔ ہم تجھ سے موسیٰ اور فرعون کا مبنی برحق کچھ قصہ ایمان لانے والوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔

۴۔ فرعون نے زمین میں اپنے آپ کو برتر سمجھ لیا تھا۔ اور وہاں کے رہنے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس نے اُن میں سے ایک گروہ کو کمزور کر دیا تھا۔ اُن کے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا اور اُن کی لڑکیوں کو (کنیزی کے لیے) زندہ رہنے دیتا تھا۔ یقیناً وہ مفسدین میں سے تھا۔

۵۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ اُن لوگوں پر ہم احسان کریں جو زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں اور انہیں زمین کا وارث اور اہل زمین کا پیشوا بنا دیں۔

۶۔ اُنہیں زمین میں ثباتِ قدم عطا کریں (اُن کی حکومت کو مستحکم کر دیں) اور فرعون، ہامان اور اُن کے لشکر کو وہ چیز دکھائیں جس کا اُنہیں خوف ہے۔

تفسیر

ارادۂ الٰہی ہے کہ مستضعفین کامیاب ہوں :

اس دفعہ قرآن کی سُورتوں کے آغاز میں "حروفِ مقطعہ" سے ہمارا چودھویں بار سابقہ پڑ رہا ہے۔ ان میں طٰسم تیسری اور آخری مرتبہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کے حروفِ مُقطعہ کی مختلف تفاسیر کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر ہم نے سورہ بقرہ، سُورہ آلِ عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں مشرح بحث کی ہے۔

جہاں تک "طٰسٓمٓ" کا تعلق ہے مختلف روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف صفات باری تعالیٰ کی مختصر علامات ہیں۔ یا ان سے مراد مُقدّس مقامات ہیں۔

تاہم یہ امر اس معروف تفسیر کے جس پر ہم نے بارہا زور دیا ہے مانع نہیں ہے کہ خدا اس حقیقت کو سب پر روشن کردینا چاہتا ہے کہ یہ کتابِ مقدس آسمانی جو انسان کی ارتقائی تاریخ میں عظیم انقلاب کا سرچشمہ ثابت ہوئی اور جس میں انسان کی طرزِ حیات کے لیے ایک سعادت بخش پروگرام موجود ہے، اس کی تشکیل بھی "الف با" جیسے سادہ حروف سے ہوئی ہے۔ ہر بچہ اس کے کلمات کا تلفظ کر سکتا ہے۔ یہ کتنی اہم اور غیر معمولی بات ہے کہ ایسے سادہ وسائل کی ترتیب و تنظیم کا نتیجہ ایسی عظیم المرتبت کتاب ہو کر جو سب لوگوں کی دسترس میں ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ حروفِ مقطعہ کے بعد بلافاصلہ عظمتِ قرآن کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"یہ باعظمت آیات کتاب مُبین کی آیات ہیں" یہ ایسی کتاب ہے کہ جو خُود بھی روشن ہے اور انسانوں کے لیے راہِ سعادت کو بھی روشن کرنے والی ہے: (تلك آيات الكتاب المبين)[1]

اگرچہ کلمہ "کتاب مبین" بعض آیاتِ قرآن میں مثلاً سُورۂ یونس کی اکسٹھویں آیت:

ولا اصغر من ذلك ولا اكبر الا في كتاب مبين

[1] "تلك" اسم اشارہ دُور کے لیے ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس سے ان آیات کی عظمت مراد ہے۔

اور سُورہ ھُود کی اس آیت میں:

كل في كتاب مبين

"لوحِ محفوظ" کے معنیٰ لیے گئے ہیں۔ لیکن یہ آیت جو اس وقت زیرِ بحث ہے اس میں کلمہ "آیات" استعمال ہوا اور اسی طرح اگلی آیت میں جملہ "نتلوا عليك" آیا ہے۔ ان الفاظ کے قرینہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں "کتاب مبین" سے مراد قرآن ہے۔

اس مقام پر قرآن کی صفت "مبین" ذکر کی گئی ہے۔ کلمہ "مُبین" لُغوی لحاظ سے لازم اور متعدی دونوں معنیٰ میں آیا ہے۔ یعنی وہ چیز جو خود بھی واضح ہے اور دوسری شے کو بھی آشکار کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے روشن پیغام اور مطالب کے ذریعہ حق کو باطل سے آشکار کرتا ہے اور راہِ راست کو گمراہی سے منفصل کردیتا ہے۔

قرآن اس مختصر سے مقدمہ کے بعد موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے یوں فرماتا ہے:

"ہم گروہ مومنین کے لیے تجھ سے موسیٰ اور فرعون کی سچی داستان کا کچھ حصہ بیان کرتے ہیں"۔ (نتلوا عليك من نبأ موسىٰ وفرعون بالحق لقوم يؤمنون)۔

آیت میں حرفِ جار "من" استعمال ہوا ہے۔ اصطلاح نحو میں اسے "تبعیضیہ" کہتے ہیں۔ اس کے معنیٰ قدرے یا تھوڑا سا کے ہیں۔ حرف "من" استعمال کرنے میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ جو کچھ اس مقام پر ذکر کیا جا رہا ہے وہ اس طویل داستان کا صرف ایک گوشہ ہے جو مناسبتِ مقام کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

آیت میں کلمہ "بالحق" سے اس امر کی تاکید ہوتی ہے کہ جو کچھ یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ہر قسم کی خرافات، اباطیل، اساطیر اور غیر واقعی مطالب سے پاک و منزہ ہے۔ "بالحق" کے معنیٰ ہیں "توام باحق" یعنی عین واقعیت۔

کلمہ "لقوم يؤمنون" یہ ایک توضیح ہے اور تاکید ہے اس حقیقت پر کہ اس وقت میں جو مومنین کفار کے ظلم و ستم سہہ رہے تھے یا اُن جیسے لوگ جو کہیں اور ہوں اس داستان کو سُن کر اُن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خواہ دشمن کی طاقت کتنی ہی زیادہ ہو اور اُن کی جمعیت، شمار اور وسائل کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ اُن کے مقابلہ میں اہلِ ایمان خواہ کتنے ہی قلیل التعداد، بظاہر کم طاقت اور اُن کے نیچے پس رہے ہوں اُنھیں ہرگز خوف زدہ و ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اُس قادرِ مطلق کے لیے ہر چیز آسان ہے۔ مومنین پر یہ امر روشن رہے کہ:

وہ خدا جس نے فرعون کو نابود کرنے کے لیے مُوسیٰ کو اُسی کے گھر میں پرورش دلوائی۔

وہ خدا جس نے مظلوم غلاموں کو رُوئے زمین کی سلطنت عطا کی۔ اور مغرور ظالموں کو ذلیل و خوار اور نابود کر دیا۔ وہ خدا جس نے ایک شیر خوار بچے کی پُر شور لہروں میں حفاظت کی اور فرعون اور اُس کے لاکھوں پُرزور ساتھیوں کو نیل کی موجوں میں دفن کر دیا ـــــ تمہیں بھی ان مصائب سے نجات دینے کی قدرت رکھتا ہے۔

یقیناً ان آیات کے اصلی مخاطب مومنین ہی ہیں۔ اُنھیں کے لیے یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ اُن مومنین کے لیے جو ان

آیات کے منشا کو اپنے قلب میں جگہ دیتے ہیں اور ہجوم مصائب میں بھی اپنی منزلِ مقصود کی طرف راہ رو رہتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک مجمل بیان تھا۔ آئندہ آیات میں اِس کی تفصیل آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : فرعون نے خدا کی زمین پر تکبّر، آمریت اور خود سری اختیار کی (انّ فرعون علا فی الارض)۔

حالانکہ وہ ایک ناچیز انسان تھا مگر اُس نے اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اپنی ہستی کو نہ پہچانا اور اپنی حد سے یہاں تک بڑھ گیا کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔

اِس آیت میں الارض سے مُراد ملک مصر اور اُس کے اطراف کا علاقہ ہے۔ اور چونکہ اُس زمانہ میں زمین کا وہی حصّہ آباد ترین تھا اِس لیے قرآن میں یہ کلمہ بصورتِ عام استعمال کرکے خاص معنیٰ مراد لیے گئے ہیں۔

اِس کلمہ کے مَحل استعمال سے یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ " ارض " سے پہلے " ال " اُس عہد کی تخصیص کے لیے آیا ہو اور زمینِ مصر کی طرف اشارہ ہو۔

بہرحال فرعون نے اپنی متکبرانہ حکومت کے استقلال کے لیے چند گناہانِ عظیم کا ارتکاب کیا۔

اوّل تو اُس نے یہ چال چلی کہ ساکنانِ مصر کے درمیان نفاق پیدا کردیا (وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا)۔

یہ وہی سیاست تھی جس کے ذریعہ جابر اور ملوکیت پرستانہ حکومتیں اپنی بنیاد کو مستحکم کرتی رہی ہیں۔ کیونکہ کسی اکثریت پر کسی اقلیت کی حکومت کا پائیدار رہنا اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ " لڑاؤ اور حکومت کرو " کے پروگرام پر عمل نہ کرے۔

اِس قسم کی جابر حکومتیں ہمیشہ " توحیدِ کلمہ " اور " کلمۂ توحید " سے خائف رہتی ہیں۔ ایسی حکومتیں عوام میں اتفاق و اتحاد کے جذبات سے ہمیشہ ڈرتی رہتی ہیں۔ اِسی لیے وہ اپنا تحفّظ اسی میں سمجھتی ہیں کہ حکومت طبقاتی بنیادوں پر رہے۔ یہی پالیسی ہے جس پر تاریخ کے ہر عہد اور ہر زمانے کے فراعنہ کاربند رہے ہیں۔

البتہ فرعون نے خصوصیت سے باشندگانِ مصر کو دو طبقات میں تقسیم کردیا تھا۔ اوّل قبطی جو ملک کے اصل باشندے تھے اور ملک کے تمام رفاہی وسائل، دولت و محلّات اور کلیدی اسامیاں اُن کے اختیار میں تھیں۔ دوسرے سبطی یعنی مہاجر بنی اسرائیل جو اُن قبطیوں کے ہاتھ میں غلاموں اور کنیزوں کی طرح پھنسے ہوئے تھے۔

اِن بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ یہ انتہائی فقر و ناداری میں گرفتار تھے۔ اُن سے نہایت سخت مشقت لی جاتی تھی۔ مگر اُنھیں اُس کا اجر کچھ نہ ملتا تھا۔ کلمہ " اهلها " میں قبطی اور بنی اسرائیل دونوں شامل ہیں۔ اس اعتبار سے کہ بنی اسرائیل ملک مصر میں ایک طویل مدّت سے رہتے تھے۔ تا اینکہ وہ وہیں کے باشندے ہوگئے تھے۔

تاریخ کہتی ہے کہ ملوکِ فراعنہ میں سے بعض نے اپنے لیے ایک " ہَرم " بنانے کے لیے ایک لاکھ غلاموں کو بیس سال تک کام پر لگائے رکھا (مثلاً خوفو بادشاہ کا مشہور ھرم جو موجودہ پایۂ تخت قاہرہ کے نزدیک ہے) اور اُن میں سے ہزاروں آدمیوں کو دورانِ کار میں سخت کام لے کر یا کوڑے مار مار کر قتل کردیا — بنی اسرائیل کے مصائب کا اس مختصر واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ اِس اجمال کی تفصیل کے لیے حدیث کی کتابوں سے رجوع کرنا چاہیئے۔

فرعون کا دوسرا جُرم یہ تھا کہ اُس نے اُس ملک کے ایک طبقہ پر ظلم و قہر کے پہاڑ توڑ کر اُنھیں بالکل بے دست و پا کردیا تھا اِس حالت کو قرآن شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے :

(يستضعف طآئفة منهم يذبح ابناءهم ويستحي نساءهم)۔

فرعون نے اس گروہ کو اتنا ضعیف اور ناتوان کردیا تھا کہ اُن کی اولادِ نرینہ کو قتل کرتا تھا۔
اور اُن کی لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔

اُس نے یہ حکم دے دیا تھا کہ اچھی طرح خیال رکھو۔ بنی اسرائیل میں جو بچّہ بھی پیدا ہو۔ اگر وہ لڑکا ہو تو اُسے اسی وقت قتل کردو۔ اور اگر لڑکی ہو تو اسے کنیزی اور خدمت گاری کے لیے زندہ رکھو۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے اِس فعل سے کونسا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا ؟

مشہور یہ ہے کہ اُس نے عالمِ خواب میں یہ دیکھا تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا ہے جس نے مصر کے تمام گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ قبطیوں کے تو تمام گھر جل گئے ہیں مگر بنی اسرائیل کے گھر سلامت رہے ہیں۔

اُس نے علماء اور خواب کی تعبیر بتانے والوں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ اُنھوں نے کہا :

بیت المقدس کی سرزمین سے ایک آدمی خروج کرے گا۔ اُس کے ہاتھ سے فراعنہ کی حکومت اور ملک مصر تباہ ہوجائے گا[1]

نیز یہ بھی روایت ہے کہ بعض کاہنوں نے اُس سے کہا تھا کہ :

بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کو برباد کردے گا[1]

بالآخر اسی سبب نے فرعون کو اس امر پر آمادہ کیا کہ اُس نے بنی اسرائیل کے نومولود فرزندانِ نرینہ کے قتل کا مصمّم ارادہ کرلیا۔

بعض مفسرین نے فرعون کے آمادہ بہ تعدی ہونے کے متعلق ایک اور بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ :

" گزشتہ پیغمبروں نے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اور اُن کی خصوصیات کے متعلق پیش گوئی کی تھی اور خاندانِ فراعنہ اُن سے واقف ہو کر خوف زدہ رہتا تھا۔ اِس وجہ سے وہ لوگ بنی اسرائیل کے دشمن ہوگئے "[2]

لیکن " يذبح ابناءهم " کا جملہ جو " يستضعف طآئفة منهم " کے بعد آیا ہے، اِس سے ایک اور مفہوم بھی مترشح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حکومتِ فرعون نے بنی اسرائیل کو قومی حیثیت سے کمزور اور ناتواں کرنے کے لیے یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ تاکہ اُن کی اولادِ ذکور کو (جس کے متعلق اندیشہ تھا کہ کسی وقت بغاوت کرکے فرعون کا تختہ اُلٹ دے) ختم کردے اور صرف عورتوں اور لڑکیوں کو کہ جن میں بغاوت اور جنگ کی طاقت نہیں ہوتی، اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھے۔

قولِ بالا کی تائید " سورۂ مومن " کی آیت نمبر پچیس سے ہوتی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ فرعون میں اولادِ ذکور کو قتل کرنے اور اولادِ اناث کو زندہ رہنے دینے کا طرزِ عمل حضرت موسیٰؑ کے دعوئ نبوّت کے بعد بھی جاری رہا۔ آیت یوں ہے :

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ جلد ۷۔ صفحہ ۲۳۹۔ فخررازی۔

[2] تفسیر کبیر فخررازی۔ ذیل آیت موردِ بحث۔

فلما جآءھم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابنآء الذین اٰمنوا معہ
واستحیوا نسآءھم وما کید الکٰفرین الا فی ضلٰل

پس جب موسیٰ ہمارے پاس سے حق لے کر اُن کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے کہا کہ اُن لوگوں کے لڑکوں کو جو موسیٰ پر ایمان لائے ہیں قتل کر دو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو لیکن کافروں کی تدبیریں ہمیشہ گمراہی میں رہیں گی۔

آیہ زیر بحث کا جملہ "یستحی نسآءھم" (اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو) یہ واضح کرتا ہے کہ فرعون کا عورتوں کی بقائے حیات اصرار یا تو اُن سے خدمت لینے کے لیے تھا یا جنسی ہوس رانی کے لیے۔

آیہ کے آخری کلمات میں بطور مجموعی اور بیانِ علت کے طور پر فرمایا گیا ہے : بطور مُسلّم وہ مفسدوں میں سے تھا (انہ کان من المفسدین)۔

فرعون کے اعمال کا خلاصہ صرف اِن الفاظ میں کیا جا سکتا ہے کہ " اُس کا کام رُوئے زمین پر فساد کرنا تھا۔"

اپنے آپ کو مخلوق سے برتر سمجھنا ایک فساد تھا۔ دوسرا فساد یہ تھا کہ اُس نے مصر میں طبقاتی زندگی پیدا کر دی تھی۔ بنی اسرائیل کو رنج و عذاب میں مبتلا کرنا، اُن کے لڑکوں کو قتل کرنا اور اُن کی لڑکیوں کو کنیزیں بنانا تیسرا فساد تھا۔ اِن کے علاوہ بھی بہت سے فساد اور بُرائیاں تھیں۔

یہ امر قدرتی ہے کہ خود پرست اور جاہ پسند لوگ صرف اپنی ذاتی منفعت کے تحفظ کا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ذاتی منافع کا خود غرضانہ تحفظ، انسانی معاشرہ کے مفادات کے تحفظ (جس کے لیے عدالت، قربانی اور ایثار کی ضرورت ہے) سے ہم آہنگ ہو۔ خود غرضی کا نتیجہ ہر شعبۂ زندگی میں بصورت فساد نمودار ہوتا ہے۔

آیت میں کلمہ " یذبح " استعمال ہوا ہے۔ جو ذبح "سے مشتق ہے۔ اِس سے ثابت ہے کہ آلِ فرعون کا سلوک بنی اسرائیل کے ساتھ ایسا تھا جیسا کہ بھیڑوں اور چوپایوں کے ساتھ ہو۔ یعنی وہ ظالم ان بے گناہوں کو حیوانات کی طرح ذبح کرتے تھے۔[1]

وابستگانِ فرعون کی سفاکیوں کے متعلق بہت سے قصّے بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ :-

فرعون نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں کی نگرانی کی جائے اور صرف قبطی اور فرعون کی نامزد دائیاں ہی وضع حمل میں مدد دیں۔ تاکہ اگر طفل نوزاد لڑکا ہو تو فوراً مصری حکومت کے دفتر میں اطلاع دیں۔ تاکہ جلّاد آئیں اور اُسے ذبح کر دیں۔[2]

یہ قطعی واضح نہیں ہے کہ کتنے نومولود بچّے اِس پروگرام کے مطابق قربان کیے گئے۔ بعض لوگوں نے اُن کی تعداد نوّے ہزار اور بعض نے لاکھوں لکھی ہے۔ فرعون اور اُس کے ہواخواہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اِن ہولناک مظالم کے ذریعے قوم بنی اسرائیل کے قیام اور مشیّتِ الٰہی کے پُورا ہونے کی راہ مسدود کر دیں گے۔

---

[1] یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ " ذبح " کا مادہ فعل ثلاثی مجرد میں متعدی ہے۔ لیکن اِس مقام پر وہ باب تفعیل میں استعمال ہوا ہے تاکہ کثرت کے مفہوم کو ظاہر کرے۔ نیز یہاں فعل مضارع کا استعمال اِس جُرم کے استمرار کی دلیل ہے۔

[2] تفسیر کبیر از فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اِس آیت کے بعد بلا فاصلہ یہ بیان کیا گیا ہے : ہمارے ارادہ اور ہماری مشیّت نے یہ طے کیا ہے کہ زمین پر جو ضعیف الحال اور مظلوم ہیں ہم اُن پر احسان کریں اور اُنھیں اپنی عنایات اور نوازشات سے سرفراز کریں : (و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض)۔

اور ہم اُن کو نوعِ انسانی کا پیشوا اور رُوئے زمین کا وارث بنا دیں : (و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین)۔

* * *

ہم اُن کو قوی، صاحبِ قدرت اور توانا کر دیں گے اور اُن کی حکومت کو ثبات بخشیں گے : (و نمکن لھم فی الارض)۔

اور ہم فرعون، ہامان اور اُس کی فوج کو اُسی انجام سے دوچار کریں گے جس کا اُنھیں اِن کمزور لوگوں کی طرف سے خطرہ لگا رہتا ہے : (و نری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون)۔

یہ دونوں آیات کس قدر اپنے مطلب میں واضح اور اُمید بخش ہیں کیونکہ ان آیات میں جو بھی اُمید افزا وعدہ ہے وہ ایک قانون کُلّی کی شکل میں، فعل مضارع کے ساتھ بیان ہوا ہے جس میں استمرار کا مفہوم شامل ہے۔ تاکہ اُن مومنین کو (جو قرآن کے مخاطب ہیں) یہ تصور نہ ہو کہ یہ وعدہ صرف بنی اسرائیل کے ظلم کشیدہ اور ستم دیدہ لوگوں کے لیے ہے اور یہ وعید محض فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے لیے ہے۔ کیونکہ قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ " ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں"۔

یعنی فرعون کا اِرادہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر دے اور اُن کی قدرت و شوکت کو نابود کر کے رکھ دے ــــ لیکن " ہم یہ چاہتے تھے کہ وہ قوی اور کامیاب ہوں"۔

وہ چاہتا تھا کہ حکومت ہمیشہ متکبرین کے قبضے میں رہے ۔ لیکن ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ حکومت کمزوروں اور مستضعفوں کے سپرد کر دیں اور آخر کار ایسا ہی ہوا۔

اِس مقام پر کلمہ " مَنّت " جیسا کہ ہم نے اِس سے قبل بھی کہا ہے " نعمات اور عطایا " کے بخشنے کے معنی میں ہے۔ "مَنّت" کے یہ معنیٰ اُس مفہوم سے مختلف ہیں جو اس کا روزمرہ کی بول چال میں لیا جاتا ہے یعنی کسی کو کچھ دے کے اُس پر احسان کرنا۔ اِس مفہوم میں طرفِ ثانی کی تحقیر ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔

اِن دو آیتوں میں خدا نے کمزوروں اور پسے ہوئے لوگوں کے بارے میں اپنے ارادے کو بے نقاب کیا ہے اور اِس ضمن میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے جو باہم مربوط اور متعلق بیک دیگر ہیں :

اوّل یہ کہ : ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہماری نعمتوں سے فیض یاب ہوں : (و نرید ان نمن ...)۔

دُوسرے یہ کہ : ہم چاہتے ہیں کہ اُنھیں پیشوا بنائیں : (و نجعلھم ائمۃ)۔

تیسرے یہ کہ : ہم چاہتے ہیں کہ اُنھیں جابروں اور ستمگاروں کی حکومت کا وارث بنا دیں : (و نجعلھم الوارثین)۔

چوتھے یہ کہ : ہم اُنھیں ایک مستقل اور پائیدار حکومت دیں گے : (و نمکن لھم فی الارض)۔

آخری اور **پانچویں** بات یہ ہے کہ : وہ پیش آمد جس کا ان کے دشمنوں کو خوف تھا اور اپنی تمام قوتوں اور وسائل کو اس کے ٹالنے پر صَرف کر رہے تھے ، ہم اُس حادثے سے اُنھیں ضرور دوچار کریں گے :

(ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون)۔

ستم دیدہ اور مظلوم لوگوں پر خدا کی عنایات و الطاف اسی طرح نازل ہوتے ہیں ۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں ؟ اور اُن کی ت کیا ہیں ؟ آئندہ **نکات** کی بحث میں ان شاء اللہ ہم اُن پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

ھامان فرعون کا مشہور و معروف وزیر تھا اور فرعون کی حکومت میں اس کا اتنا اثر تھا کہ آیت مذکورہ بالا میں ملک مصر کی ر " جنود فرعون وھامان " کہا گیا ہے۔

(ھامان کے متعلق آیت ۳۸ کی تفسیر میں تشریحاً بیان کیا جائے گا)۔

چند اہم نکات

مستضعفین کی عالمگیر حکومت : سطورِ بالا میں ہم نے یہ کہا ہے کہ آیات بالا میں خدا کا پروگرام کوئی ہنگامی ن بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے ۔ بلکہ ان آیات میں ایک کُلی قانون بیان کیا گیا ہے جو تمام قرون و اعصار اور جملہ اقوام اور جماعتوں یے ہے۔ چنانچہ الفاظ یہ ہیں کہ : ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ستم رسیدہ اور مستضعف لوگوں کو اپنی نعمات عطا کریں اور ہم اُنھیں ا پیشوا اور زمین کی حکومت کا وارث قرار دیں۔

درحقیقت یہ ایک بشارت ہے کہ " حق ، باطل پر اور ایمان ، کفر پر غالب ہو کے رہے گا "

نیز یہ کہ :۔ یہ اُن تمام آزاد لوگوں کے لیے بشارت ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ظلم و جَور کی بساط اُلٹ کر عدل و انصاف کی حکومت قائم ہو۔

اِس مشیتِ الٰہی کے بروئے کار آنے کا ایک نمونہ خاندان فرعون کی حکومت کا زوال اور بنی اسرائیل کی حکومت کا قیام تھا۔ اور اِس بشارت کا کامل تر ثبوت ظہورِ اسلام کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ اور اُن کے اصحاب کی حکومت کا قیام تھا۔ یہ حکومت برہنہ ، تہی دست ، مظلوم اور پاک دل مومنین کی تھی جو ہمیشہ اپنے زمانے کے فرعونوں کی طرف سے تحقیر اور تمسخر کا نشانہ بنتے تھے اور اُن کے ظلم و ستم برداشت کرتے رہتے تھے۔

لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ خدا نے اِسی واماندہ اور اُفتادہ گروہ کے ہاتھ سے قیصر و کسریٰ کے محلات کے دروازے شکستہ ے اُنھیں زور اور قدرت کے تخت سے محروم کر دیا اور ان متکبرین کی ناک کو زمین پر رگڑ دیا۔

اِس بشارت کا وسیع ترین نمونہ وہ مبنی برحق و عدالت حکومت ہوگی جو امام مہدیؑ (ہماری جانیں ان پر فدا ہوں) کے نام رُوئے زمین پر برپا ہوگی۔

یہ آیات من جُملہ اُن آیات کے ہیں جن میں واضح طور پر ایک ایسی حکومت کے ظہور کی خوش خبری دی گئی ہے ۔ اسلامی روایات ری نظر سے وہ ارشادات گزرتے ہیں جو اِس آیت کی تفسیر میں اِس " ظہورِ عظیم " کے متعلق ہیں۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے یوں منقول ہے :

لتعطفن الدنیا علینا بعد شماسھا عطف الضروس علی ولدھا وتلی عقیب ذٰلک ونرید ان نمنّ علی الذین استضعفوا فی الارض ....

دنیا اپنی لکدزنی اور سرکشی کے بعد " اُس اونٹنی کی طرح جو دُودھ دوھنے والے سے اپنے دُودھ کو اپنے بچہ کے لیے بچا لیتی ہے " ہماری طرف رُخ کرے گی۔

اِس کے بعد آپ نے آیت " ونرید ان نمنّ ..... " کی تلاوت فرمائی[1]

ایک اور حدیث میں جو امام علی علیہ السلام ہی سے مروی ہے ہم یوں پڑھتے ہیں کہ آیت فوق کی تفسیر میں فرمایا :

ھم آل محمدؐ یبعث اللہ مھدیھم بعد جھدھم فیعزّھم و یذل عدوھم۔

وہ آلِ محمدؐ ہیں کہ اُن زحمات و مصائب کے بعد جو اُن پر وارد ہوں گے اُن میں سے خدا مہدی کو پیدا کرے گا ۔ جو اُن کو عزت دے گا اور اُن کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے گا[2]

ایک اور حدیث میں جو جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے ، اس میں ہے :

والذی بعث محمداً بالحق بشیراً و نذیراً ، انّ الابرار منا اھل البیت وشیعتھم بمنزلۃ موسٰی وشیعتہ ، وان عدونا و اشیاعھم بمنزلۃ فرعون و اشیاعہ

قسم ہے اُس خدا کی جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا کہ ہم اہلبیت میں ابرار اور اُن کے پیرو مثل موسٰی کے ہیں اور ہمارے دشمن اور اُن کے پیرو فرعون اور اُس کے مقلدین کے سے ہیں[3]

امامؑ کا مقصد یہ ہے کہ آخر کار ہم کامیاب اور فتح مند ہوں گے اور ہمارے دشمن نابود ہو جائیں گے اور ہم ہی حق و عدل پر مبنی حکومت قائم کریں گے۔

البتہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی عالمگیر حکومت اُن حکومتوں کے خلاف اور مانع نہ ہوگی جو مظلوم لوگ ظالموں کے خلاف محدود علاقوں میں قائم کرلیں گے اور یہ مستضعف لوگ جس وقت مبنی برحق و عدل حکومت کی شرائط کو پُورا کریں گے تو خدا کا حتمی وعدہ اور اُس کی مشیت اُن کے حق میں پوری ہو جائے گی اور اُنھیں یہ کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

۲۔ **" مستضعفین " اور " مستکبرین " کون ہیں ؟** ہم جانتے ہیں کہ کلمہ " **مستضعف** " مادہ " **ضعف** " سے مشتق ہے ۔ لیکن چونکہ اِس مادہ کو باب اِستفعال میں لے جایا گیا ہے (لہٰذا خاصیّت باب کی وجہ سے) اِس کے معنٰی ہیں وہ

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار ۲۰۹ ۔

[2] " غیبتِ شیخ طوسی " مطابق نقل تفسیر نور الثقلین ، ج ۴ ص ۱۱۰ ۔

[3] " مجمع البیان " زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ں جسے کمزور کر دیا گیا ہو اور اُسے بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا گیا ہو۔

ایک اور تعبیر کے مطابق "مستضعف" وہ نہیں ہے کہ جسمانی لحاظ سے کمزور و ناتواں ہو اور کسی قسم کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ بلاحاً "مستضعف" وہ ہے کہ اُس میں بالقوۃ اور بالفعل کام کرنے کی استعداد تو موجود ہو، مگر وہ ظالموں کے ظلم اور جبر کے نیچے ہوا ہو۔ لیکن بایں حال کہ اُس کے دست و پا قید و بند میں گرفتار ہیں وہ اِس حالت پر خاموش اور مطیع نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے ع کی تلاش میں رہتا ہے کہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔ جابروں اور ستمگروں کے ہاتھ کاٹ دے اور دُنیا میں ایسا قانو کرے جو حق اور عدل پر مبنی ہو۔

اللہ نے ایسے گروہ سے اُن کی مدد کرنے اور اُنھیں زمین کی حکومت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا کا یہ وعدہ اُن بے دست و پا ں اور ڈرپوک لوگوں کے لیے نہیں ہے جو ظلم کے خلاف فریاد کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ بھلا، اُن سے اِس بات کی توقع ہو سکتی ہے کہ وہ میدانِ نبرد میں آئیں اور قربانی دیں۔

بنی اسرائیل بھی فرعونوں کی حکومت کے وارث اُس وقت ہو سکے جب وہ اپنے رہبر حضرت موسیٰؑ کے حلقۂ اطاعت میں ے۔ اپنے وسائل کو جمع کیا اور سب کے سب من حیث القوم ایک مرکز پر اکٹھے ہو گئے۔ وہ ایمانی اثرات جو اُنھیں حضرت یمؑ سے ورثے میں ملے تھے، حضرت موسیٰؑ کی تبلیغ و تعلیم نے اُنھیں تازہ اور مکمل کیا، خرافات کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور کے لیے تیار ہو گئے۔

البتہ "**مستضعف**" بھی کئی قسم کے ہیں مثلاً مستضعفِ فکری و علمی و ادبی، مستضعفِ اقتصادی، مستضعفِ اخلاقی اور عفِ سیاسی، قرآن مجید میں یہ کلمہ عام طور پر مستضعفینِ سیاسی و اخلاقی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ جب آمر طبع ظالم مسلط ہوتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنی تسلط پسندانہ سیاست کو مستحکم کرنے کی کوشش تے ہیں۔ وہ اپنے محکوموں کے علوم و تہذیب کو تباہ اور اُن کی فکر کو ضعیف کر دیتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ، اُن کی اقتصادی حالت ور کر دیتے ہیں تاکہ اُن میں یہ قوت و توانائی باقی نہ رہے کہ وہ کبھی یہ سوچ سکیں کہ بغاوت کر کے متکبر و ظالم، آمر کے ہاتھ سے حکومت چھین لی جائے۔

قرآن مجید میں پانچ مقامات پر "مستضعفین" کا ذکر آیا ہے۔ اِن سب مقامات پر اِس کلمے سے مراد وہ مومنین ہیں جو ں کے جبر کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں ایک مقام پر مومنین کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اور مستضعفین کی نجات کے لیے جہاد کریں۔ ہ فرمایا گیا ہے:

> تم خدا کی راہ میں اور اُن لوگوں کی نجات کے لیے جو قہر و ستم کا شکار ہیں، جہاد کیوں نہیں کرتے؟ جب کہ یہ ستم دیدہ لوگ کہتے ہیں:-
> اے خدا! تو ہمیں اس شہر (مکہ) سے جس کے باشندے ستمگر ہیں باہر لے جا۔ اور ایک مددگار مقرر کر۔ (نسا ۷۵)

قرآن میں صرف ایک جگہ اُن لوگوں کا ذکر آیا ہے جو ظالم ہیں اور کافروں سے میل جول رکھتے ہیں اور ریاکاری سے اپنے کو "مستضعف" کہتے ہیں۔ قرآن نے اُن کے اس اِدّعا کی نفی کی ہے اور کہا ہے:-

> "تم یہ کر سکتے تھے کہ کفر و فساد کے علاقے سے ہجرت کر کے اُن ظالموں کے پنجے سے رہائی حاصل کر لیتے۔ مگر، چونکہ تم نے ایسا نہیں کیا اِس لیے تمہاری جگہ دوزخ میں ہے۔"
> (نسا: ۹۷)

تاہم، قرآن مجید میں ہر مقام پر مستضعفین کی حمایت کی گئی ہے اور ان کا ذکر بھلائی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اُنھیں ایسے مومنین شمار کیا گیا ہے جو زیرِ تسلط پس رہے ہیں۔ یہ مومن مجاہد اور دینِ خدا کے لیے سعی و کوشش کرنے والے ہیں اور لطفِ خداوندی ان کے شاملِ حال ہے۔

۲۔ متکبرین کی عام روش

صرف یہ فرعون کی خصوصیت نہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو اسیر رکھنے کے لیے اُن کے مردوں کو قتل کرتا تھا اور اُن کی عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام جابروں کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے محکوموں کی عملی قوتوں کو ختم کرتے رہے ہیں۔

اُن میں سے جو جابر حکمران مردوں کو قتل نہ کر سکتے تھے وہ اُن کے جوہرِ مردانگی کو قتل کر دیتے تھے۔ وہ لوگ بُرائی کے وسائل کے ذریعے یعنی لہو و لعب کو پھیلا کر، منشیات کا عادی بنا کر فحشیات کو عام کر کے، جنسی لذائذ کو بے لگام کر کے، شراب اور جُوئے بازی کو جائز کر کے اور طرح طرح کے غیر صحت مندانہ مشاغل کی ترغیب دلا کے اپنی محکوم قوم کی غیرت و حمیت، دلاوری، جنگی رُوح اور قوتِ ایمانی کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ تاکہ بالکل مطمئن ہو کر اپنی استحصالی حکومت کو دوام دے سکیں۔

لیکن — پیمبرانِ الٰہی، بالخصوص پیمبرِ اسلامؐ نے یہ کوشش کی کہ جوانوں کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کریں۔ یہاں تک کہ عورتوں کو بھی بہادری کا سبق سکھائیں اور اُنھیں متکبرین کے مقابلے میں مردوں کی صف میں لا کھڑا کریں۔

اِن دونوں چیزوں کے شواہد گزشتہ تاریخ میں اور زمانۂ حال میں تمام اسلامی ملکوں میں اچھی طرح نمایاں ہیں۔ ہم اس مقام پر اُن کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

۷۔ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوۡسٰۤى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ○

۸۔ فَالۡتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرۡعَوۡنَ لِيَكُوۡنَ لَهُمۡ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ‌ؕ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا كَانُوۡا خٰطِـِٕيۡنَ ○

۹۔ وَقَالَتِ امۡرَاَتُ فِرۡعَوۡنَ قُرَّتُ عَيۡنٍ لِّىۡ وَلَكَ‌ ؕ لَا تَقۡتُلُوۡهُ ‌ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَـتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ○

ترجمہ

۷۔ ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اسے دُودھ پلا اور جب تجھے اس کے بارے میں کچھ خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں اور نہ غمگین ہونا کیونکہ ہم اُسے تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔

۸۔ (جب ماں کو بچے کے بارے میں سخت تشویش ہوئی تو اُس نے حکمِ خدا سے اُسے دریا میں ڈال دیا) فرعون کے خاندان والوں نے اُسے پانی میں سے اُٹھالیا۔ تاکہ انجام کار وہ اُن کا دشمن اور باعثِ اندوہ ہوجائے۔ مسلّمًا فرعون، ھامان اور اُن کا لشکر خطا کار تھے۔

۹۔ اور فرعون کی بیوی نے (جب دیکھا کہ وہ بچے کو قتل کر دینا چاہتے ہیں تو) کہا کہ یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو۔ ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ انجام سے بے خبر تھے (انہیں معلوم نہ تھا کہ جسے وہ اپنی آغوش میں پال رہے ہیں وہی ان کا اصلی دشمن ہے)۔

تفسیر

فرعون کی آغوش میں :

اِس جگہ سے قرآن مستکبرین پر مستضعفین کی فتح و غلبہ کو ذہن نشین کرانے کے لیے موسٰی اور فرعون کے قصّہ کو بالشرح بیان کرتا ہے۔ بالخصوص واقعہ کا وہ حصّہ جس میں حضرت موسیٰؑ ضعیف ترین حالات میں تھے اور فرعون قوی ترین اسباب و شرائط کا حامل تھا، وضاحت سے بیان کیا گیا ہے تاکہ جابروں اور ظالموں کے ارادے پر مشیّتِ الٰہی کے غلبے کو آشکار کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں قرآن شریف میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ "ہم نے موسٰی کی والدہ کو وحی کی کہ موسٰی کو دُودھ پلا اور جس وقت تمہیں اُس کے بارے میں کچھ خوف ہو تو اُسے دریا میں ڈال دو" (واوحینا الی ام موسٰی ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم)۔ اور تم اپنے دل میں کسی قسم کا خوف اور ملال نہ آنے دینا (ولا تخافی ولا تحزنی)۔ کیونکہ ہم اُسے یقیناً تمہارے پاس لوٹا دیں گے اور اُسے رسولوں میں سے قرار دیں گے: (انا رآدوہ الیك وجاعلوہ من المرسلین)۔

اِس مختصر سی آیت میں دو "امر" ہیں، دو "نہی" ہیں اور دو بشارتیں ہیں۔ یہ آیت بحیثیت مجموعی خلاصہ ہے ایک پُر از واقعات داستان کا، جس کا ماحصل یہ ہے:

حکومتِ فرعون نے بنی اسرائیل کے ہاں جو نومولود بیٹے ہوتے تھے انہیں قتل کرنے کا ایک وسیع پروگرام بنایا تھا۔ یہاں تک کہ فرعون کی مقرر کردہ دائیاں بنی اسرائیل کی باردار عورتوں کی نگرانی کرتی رہتی تھیں۔

ان دائیوں میں سے ایک والدہٴ موسٰی کی دوست بن گئی تھی۔ شکمِ مادر میں موسٰی کا حمل مخفی رہا اور اُس کے آثار ظاہر نہ ہوئے۔ جس وقت مادرِ موسٰیؑ کو یہ احساس ہوا کہ بچے کی ولادت کا وقت قریب ہے تو اُس نے کسی کو اپنی دوست دائی کو بُلانے بھیجا۔ جب وہ آگئی تو اُس سے کہا "میرے پیٹ میں ایک فرزند ہے آج مجھے تمہاری دوستی اور محبت کی ضرورت ہے"۔

جس وقت حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے تو آپ کی آنکھوں سے ایک خاص نور چمک رہا تھا۔ چنانچہ اُسے دیکھ کر وہ دایہ کانپنے لگی اور اُس کے دل کی گہرائی میں محبت کی ایک بجلی سما گئی، جس نے اُس کے دل کی تمام فضا کو روشن کر دیا۔

یہ دیکھ کر — وہ دایہ مادرِ موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر بولی کہ میرا یہ خیال تھا کہ حکومت کے دفتر میں جاکے اِس بچے کے پیدا ہونے کی خبر دوں تاکہ جلاد آئیں اور اسے قتل کر دیں اور میں اپنا انعام پالوں۔ مگر میں کیا کروں کہ میں اپنے دل میں اس نوزائیدہ بچے کی شدید محبت محسوس کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ اس کا بال بھی بیکا ہو۔ اِس کی اچھی طرح حفاظت کرو۔ میرا خیال ہے کہ آخر کار یہی ہمارا دشمن ہوگا۔

وہ دایہ مادرِ موسٰی کے گھر سے باہر نکلی۔ تو حکومت کے بعض جاسوسوں نے اُسے دیکھ لیا اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ گھر میں داخل ہو جائیں گے۔ موسٰی کی بہن نے اپنی ماں کو اِس خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ماں یہ سُن کے گھبرا گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے۔

اس شدید پریشانی کے عالم میں جب کہ وہ بالکل حواس باختہ ہو رہی تھی، اُس نے بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور تنور میں ال دیا — اِس دوران میں حکومت کے آدمی آگئے۔ مگر وہاں اُنھوں نے روشن تنور کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ اُنھوں نے مادرِ موسٰی سے نتیش شروع کردی — پوچھا۔ دایہ یہاں کیا کر رہی تھی۔؟ موسٰیؑ کی ماں نے کہا کہ وہ میری سہیلی ہے مجھے ملنے آئی تھی۔ حکومت کے ارندے مایوس ہو کے واپس ہوگئے۔

اب موسٰی کی ماں کو ہوش آیا۔ اُس نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ بچہ کہاں ہے؟ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ناگہاں تنور کے در سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اب ماں تنور کی طرف دوڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ خدا نے اُس کے لیے آتشِ تنور کو "ٹھنڈا اور سلامتی ں جگہ" بنا دیا ہے، وہی خدا جس نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے آتشِ نمرود کو "بَرد و سلام" بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور بچے کو صحیح و سالم باہر نکال لیا۔

لیکن پھر بھی ماں محفوظ نہ تھی۔ کیونکہ حکومت کے کارندے دائیں بائیں پھرتے رہتے اور جستجو میں لگے رہتے تھے۔ کسی بڑے طرے کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سُن لیتے۔

اِس حالت میں خدا کے ایک الہام نے ماں کے قلب کو روشن کردیا۔ وہ الہام ایسا تھا کہ ماں کو بظاہر ایک خطرناک کام پر ادہ کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی ماں اُس ارادے سے اپنے دل میں سکون محسوس کرتی تھی۔

اُس نے کہا — "خدا کی طرف سے مجھ پر یہ فرض عائد ہوا ہے۔ میں اسے ضرور انجام دوں گی۔" اُس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ں اِس الہام کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو دریائے نیل میں ڈال دوں گی۔

اُس نے ایک مصری بڑھئی کو تلاش کیا (وہ بڑھئی قبطی اور فرعون کی قوم میں سے تھا) اُس نے اُس بڑھئی سے درخواست کی کہ یرے لیے ایک چھوٹا سا صندوق بنا دے۔

بڑھئی نے پوچھا: جس قسم کا صندوقچہ تم بنوانا چاہتی ہو اُسے کس کام میں لاؤگی؟

موسٰی کی ماں جو دروغ گوئی کی عادی نہ تھی اِس نازک مقام پر بھی سچ بولنے سے باز نہ رہی۔ اُس نے کہا: میں بنی اسرائیل ں ایک عورت ہوں۔ میرا ایک نوزائیدہ بچہ لڑکا ہے۔ میں اُس بچے کو اُس صندوق میں چھپانا چاہتی ہوں۔

اُس قبطی بڑھئی نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ جلادوں کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ وہ تلاش کرکے اُن کے پاس پہنچ گیا۔ رجب وہ اُنھیں یہ خبر سنانے لگا تو اُس کے دل پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ اُس کی زبان بند ہوگئی۔ وہ صرف ہاتھوں سے اشارے رتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُن علامتوں سے اُنھیں اپنا مطلب سمجھا دے۔ حکومت کے کارندوں نے اُس کی حرکات دیکھ کر سمجھا کہ یہ شخص ہم سے ذاق کر رہا ہے۔ اِس لیے اُسے مارا اور باہر نکال دیا۔

جیسے ہی وہ اُس دفتر سے باہر نکلا اُس کے ہوش و حواس بجا ہوگئے۔ وہ پھر جلادوں کے پاس گیا اور اپنی حرکات سے پھر رکھائی۔ آخر اُس نے یہ سمجھا کہ اِس واقعے میں ضرور کوئی الٰہی راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اُس نے صندوق بنا کے حضرت موسٰیؑ کی والدہ کو سے دیا۔

غالباً صبح کا وقت تھا۔ ابھی اہلِ مصر محوِ خواب تھے۔ مشرق سے پو پھٹ رہی تھی۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے اور صندوق کو دریائے نیل

کے کنارے لائی۔ بچے کو آخری مرتبہ دُودھ پلایا۔ پھر اُسے، اُس مخصوص صندوق میں رکھا (جس میں یہ خصوصیت تھی کہ ایک چھوٹی کشتی کی طرح پانی پر تیر سکے) پھر اُس صندوق کو نیل کی موجوں کے سپرد کردیا۔

نیل کی پُرشور موجوں نے اُس صندوق کو جلد ہی ساحل سے دُور کردیا۔ ماں کنارے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ معاً اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے سے نکل کر موجوں کے اُوپر تیر رہا ہے۔ اُس وقت اگر الطافِ الٰہی اُس کے دل کو سکون و قرار نہ بخشتے تو یقیناً وہ زور زور سے رونے لگتی — اور — پھر سارا راز فاش ہوجاتا۔

کسی آدمی میں یہ قدرت نہیں ہے کہ اُن حساس لمحات میں ماں پر جو گزر رہی تھی۔ الفاظ میں اُس کا نقشہ کھینچ سکے۔ مگر — ایک فارسی شاعرہ نے کسی حد تک اُس منظر کو اپنے فصیح اور پُراز جذبات اشعار میں مجسم کیا ہے: ؎

۱۔ مادر موسٰی چو موسٰی را بہ نیل
در فگند از گفتۂ ربّ جلیل

۲۔ خود ز ساحل کرد با حسرت نگاہ
گفت کای فرزند خرد بی گناہ!

۳۔ گر فراموشت کند لطفِ خدای
چون رہی زین کشتی بی ناخدای

۴۔ وحی آمد کاین چہ فکر باطل است
رہرو ما اینک اندر منزل است

۵۔ ما گرفتیم آنچہ را انداختی
دست حق را دیدی و نشناختی

۶۔ سطح آب از گاہوارش خوشتر است
دایہ اش سیلاب و موجش مادر است

۷۔ رودہا از خود نہ طغیان می کنند
آنچہ می گوئیم ما آن می کنند

۸۔ ما بہ دریا حکم طوفاں می دہیم
ما بہ سیل و موج فرماں می دہیم

۹۔ نقشِ ہستی نقشی از ایوانِ ما است
خاک و باد و آب سرگردانِ ماست

۱۰۔ بہ کہ برگردی بہ ما بسپاریش
کی تو از ما دوستر می داریش؟[1]

[1] پروین اعتصامی کے دیوان سے

۱۔ جب موسیٰ کی ماں نے حکمِ الٰہی کے مطابق موسیٰ کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔
۲۔ وہ ساحل پہ کھڑی ہوئی حسرت سے دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اے میرے بے گناہ ننھے بیٹے!
۳۔ اگر لطفِ الٰہی تیرے شاملِ حال نہ ہو تو، تُو اِس کشتی میں کیسے سلامت رہ سکتا ہے جس کا کوئی ناخدا نہیں ہے۔
۴۔ حضرت موسیٰؑ کی ماں کو اُس وقت وحی ہوئی کہ تیری یہ کیا خام خیالی ہے۔ ہمارا مسافر تو سُوئے منزل رواں ہے۔
۵۔ تُو نے جب اِس بچے کو دریا میں ڈالا تھا تو ہم نے اُسے اُسی وقت سنبھال لیا تھا۔ تو نے خدا کا ہاتھ دیکھا مگر اُسے پہچانا نہیں۔
۶۔ اِس وقت پانی کی سطح (اُس کے لیے) اُس کے گہوارے سے زیادہ راحت بخش ہے دریا کا سیلاب اُس کی دایہ گیری کر رہا ہے اور اُس کی موجیں آغوشِ مادر بنی ہوئی ہیں۔
۷۔ دیکھو دریاؤں میں اُن کے ارادہ و اختیار سے طُغیانی نہیں آتی۔ وہ ہمارے حکم کے مطیع ہیں وہ وہی کرتے ہیں جو ہمارا امر ہوتا ہے
۸۔ ہم ہی سمندروں کو طوفانی ہونے کا حکم دیتے ہیں اور ہم ہی سیل دریا کو روانی اور امواج بحر کو تلاطم کا فرمان بھیجتے ہیں۔
۹۔ ہستی کا نقش ہمارے ایوان کے نقوش میں سے ایک نقش ہے جو کچھ ہے یہ کائنات تو اُس کا مُشتے از خروارے نمونہ ہے۔ اور خاک، پانی، ہوا اور آتش ہمارے ہی اشارے سے متحرک ہیں۔
۱۰۔ بہتر یہی ہے کہ تو بچے کو ہمارے سپرد کر دے اور خود واپس چلی جا۔ کیونکہ تو اُس سے ہم سے زیادہ محبت نہیں کرتی۔

یہ منظر تو یہیں ختم ہوتا ہے۔
اب دیکھنا چاہیئے کہ فرعون کے محل میں کیا ہو رہا تھا؟

روایات میں مذکور ہے کہ فرعون کی ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ایک سخت بیماری سے شدید تکلیف میں تھی۔ فرعون نے اُس کا بہت کچھ علاج کرایا مگر بے سُود۔ اُس نے کاہنوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا: " اے فرعون ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ اِس دریا میں سے ایک آدمی تیرے محل میں داخل ہوگا۔ اگر اُس کے منہ کی رال اِس بیمار کے جسم پر مَلی جائے گی تو اِسے شفا ہو جائیگی۔

چنانچہ فرعون اور اُس کی ملکہ آسیہ ایسے واقعے کے انتظار میں تھے کہ ناگہاں ایک روز اُنھیں ایک صندوق نظر آیا جو موجوں کی سطح پر تیر رہا تھا۔ فرعون نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین فوراً دیکھیں کہ یہ صندوق کیسا ہے اور اُسے پانی میں سے نکال لیں۔ دیکھیں کہ

اُس میں کیا ہے؟

نوکروں نے وہ عجیب صندوق فرعون کے سامنے لاکے رکھ دیا۔ کسی کو اُس کا ڈھکنا کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مطابق مشیتِ الٰہی، یہ لازمی تھا کہ حضرت موسیٰ کی نجات کے لیے صندوق کا ڈھکنا فرعون ہی کے ہاتھ سے کھولا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جس وقت فرعون کی ملکہ نے اُس بچے کو دیکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا کہ ایک بجلی چمکی ہے جس نے اُس کے دل کو منوّر کر دیا ہے۔

اُن دونوں ــــ بالخصوص فرعون کی ملکہ کے دل میں اُس بچے کی محبت نے گھر کر لیا اور جب اِس بچے کا آبِ دہن اُس کی لڑکی کے لیے موجبِ شفا ہو گیا تو یہ محبت اور بھی زیادہ ہو گئی[1]

اب ہم پھر قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اِس سرگزشت کا خلاصہ قرآن کی زبان سے سُنتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

قرآن میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ: ــــ فرعون کے اہلِ خانہ نے مُوسیٰ کو نیل کی موجوں کے اُوپر سے پکڑ لیا۔ تاکہ وہ اُن کا دُشمن اور اُن کے لیے باعثِ اندوہ ہو جائے: (فالتقطه آل فرعون ليكون لهم عدوا وحزنا)۔

" التقط " مادہ " التقاط " سے مشتق ہے۔ جس کے وضعی معنیٰ ہیں۔ " کسی شی کو بغیر تلاش و کوشش پا لینا " اِسی وجہ سے اگر انسان کسی گم شدہ چیز کو پالے تو اُسے " لُقطہ " کہتے ہیں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ فرعون کے اہلِ خانہ نے اس بچے کے قنداقہ (وہ کپڑا جس میں بچہ کو لپیٹتے ہیں) کو اِس نیّت سے دریا سے نہیں نکالا تھا کہ اپنے جانی دشمن کو اپنی گود میں پالیں۔ بلکہ وہ لوگ بقول ملکہ فرعون' اپنے لیے ایک نورِ چشم حاصل کرنا چاہتے تھے۔

لیکن انجامِ کار ایسا ہی ہوا۔ علمائے ادب کی اصطلاح میں " لیکون " میں جو " لام " سابق ہے۔ وہ " لام " عاقبت کہلاتا ہے۔ نہ کہ " لامِ علّت " اور اس معنیٰ و مراد کی تعبیر میں لطافت یہی ہے کہ خدا اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح اِس گروہ کو جنھوں نے اپنی تمام قوتیں اور وسائل، بنی اسرائیل کی اولادِ ذکور کو قتل کرنے کے لیے وقف کر دیئے تھے، اِس خدمت پر مامور کرے کہ جس بچے کو نابود کرنے کے لیے اُنھوں نے یہ پروگرام بنایا تھا، اُسی کو وہ اپنی جان کی طرح عزیز رکھیں! اسی کی پرورش کریں۔

قرآن مجید میں کلمہ " آلِ فرعون " استعمال ہوا ہے۔ یہ اِس امر کی علامت ہے کہ صندوقِ مُوسیٰ کو صرف ایک آدمی نے نہیں نکالا، بلکہ اُس کے نکالنے میں خاندانِ فرعون کے متعدد افراد شریک تھے۔ اور یہ عمل اِس امر کا شاہد ہے کہ وہ کسی ایسے واقعے کے منتظر تھے۔

---

[1] روایت کا یہ حصہ ابنِ عباس سے منقول ہے جو تفسیر فخر رازی میں مذکور ہے۔ دوسری روایات، تفسیر ابوالفتوح اور مجمع البیان میں سے لی گئی ہیں۔

آیت کا اختتام اِن کلمات پر ہوتا ہے کہ " مُسلماً فرعون ، ہامان اور اُن دونوں کے اہلِ لشکر خطار کار تھے " :
(انّ فرعون وھامان وجنودھما کانوا خاطئین) ۔
وہ دونوں ہر جہت سے خطا کار تھے ۔ اِس سے بڑی خطا اور کیا ہوگی کہ اُنھوں نے حق و عدالت کی راہ سے رُوگردانی کر کے اپنی حکومت کی بنیاد ، ظلم ، جور اور شرک پر رکھی تھی ۔ اس سے زیادہ عُریاں خطا اور کیا ہوگی کہ اُنھوں نے ہزاروں بچوں کے سر قلم کر دیئے کہ " کلیم اللہ " کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں مگر خدا نے اُسے اُنھیں کے سپرد کیا اور فرمایا :
اپنے اِس دشمن کو لو ، اُسے پالو اور بڑا کرو ۔[1]

٭ ٭ ٭

اِس کے بعد کی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس بچے کی بابت فرعون ، اُس کی ملکہ اور دیگر اہلِ خاندان میں باہم نزاع اور اختلاف بھی ہوا تھا ۔ کیونکہ قرآن شریف میں یہ بیان ہے : فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ میری اور تیری آنکھوں کا نور ہے اسے قتل نہ کرو ۔ ممکن ہے یہ ہمارے لیے نفع بخش ہو یا ہم اسے متبنیٰ کر لیں : (وقالت امرأت فرعون قرّت عین لی ولك لاتقتلوه عسٰی ان ینفعنآ اونتخذهٗ ولدًا) ۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون بچے کے چہرے اور دیگر علامات سے ، من جملہ اُن کے اُسے صندوق میں رکھنے اور دریائے نیل میں بہا دینے سے یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے کسی کا بچہ ہے ۔
یہ سمجھ کر ناگہاں ، بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کی بغاوت اور اُس کی سلطنت کے زوال کا کابوس اُس کی رُوح پر مسلط ہوگیا اور وہ اِس امر کا خواہاں ہوا کہ اُس کا وہ ظالمانہ قانون ، جو بنی اسرائیل کے تمام نوزائیدہ اطفال کے لیے جاری کیا گیا تھا اس بچے پر بھی نافذ ہو ۔
فرعون کے خوشامدی درباریوں اور رشتہ داروں نے بھی اِس امر میں فرعون کی تائید و حمایت کی اور کہا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ بچہ قانون سے مستثنیٰ رہے ۔
لیکن فرعون کی بیوی آسیہ جس کے بطن سے کوئی لڑکا نہ تھا اور اُس کا پاک دل فرعون کے درباریوں کی مانند نہ تھا ، اِس بچے کے لیے محبت کی کان بن گیا تھا ۔ چنانچہ وہ اُن سب کی مخالفت پر آمادہ ہوگئی اور چونکہ اس قسم کے گھریلو اختلافات میں فتح ہمیشہ عورتوں کی ہوتی ہے ، وہ بھی جیت گئی ۔
اگر اِس گھریلو جھگڑے پر ، دخترِ فرعون کی شفایابی کے واقعے کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو اِس اختلاف باہمی میں آسیہ کی فتح کا اِمکان روشن تر ہو جاتا ہے ۔
مگر آیت کے اخیر میں ایک بہت ہی پُر معنیٰ فقرہ ہے : " وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کر رہے ہیں " : (وھم لایشعرون) ۔
البتہ وہ بالکل بے خبر تھے کہ خدا کا واجب النفوذ فرمان اور اُس کی شکست ناپذیر مشیت نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ یہ طفلِ نوزاد انتہائی

[1] امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ " خاطی " اور " مخطی " میں یہ فرق ہے کہ " خاطی " وہ شخص ہے جو کسی کام کو اچھی طرح نہ کر سکے اور " مخطی " اپنے کام کو اچھی طرح کرتا ہے مگر اُس سے اتفاقاً غلطی ہو جاتی ہے ۔

خطرات میں پرورش پائے ۔ اور کسی آدمی میں بھی ارادہ و مشیتِ الٰہی سے سرتابی کی طاقت و جرأت نہیں ہے ۔

٭ ٭ ٭

اللہ کی عجیب قُدرت :

اِس چیز کا نام قدرت نمائی نہیں ہے کہ خُدا آسمان و زمین کے لشکروں کو مامور کر کے کسی پُر قوت اور ظالم قوم کو نیست و نابود کر دے ۔
بلکہ ــــ قدرت نمائی یہ ہے کہ اُن ہی جبارانِ متکبر سے یہ کام لے کہ وہ اپنے آپ کو خود ہی ــــ نیست و نابود کر لیں اور اُن کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا ہو جائیں کہ بڑے شوق سے لکڑیاں جمع کریں اور اُن کی آگ میں جل مریں ، اپنے لیے خود ہی قید خانہ بنائیں اور اُس میں اسیر ہو کے جان دے دیں ، اپنے لیے خود ہی صلیب کھڑی کریں اور اُس پر چڑھ مریں ۔
فرعون اور اُس کے زور مند اور ظالم ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا ۔ چنانچہ تمام مراحل میں حضرت موسیٰؑ کی نجات اور پرورش اُن ہی کے ہاتھوں سے ہوئی :
حضرت موسیٰؑ کی دایہ قبطیوں میں سے تھی ،
صندوقِ موسیٰ کو امواجِ نیل سے نکالنے اور نجات دینے والے متعلقینِ فرعون تھے ۔
صندوق کا ڈھکنا کھولنے والا خود فرعون یا اُس کی اہلیہ تھی ،
اور ــــ آخر کار فرعون شکن اور مالکِ غلبہ و اقتدار موسیٰ کے لیے امن و آرام اور پرورش کی جگہ خود فرعون ہی کا محل قرار پایا ۔
یہ ہے پروردگارِ عالم خدا کی قُدرت !

۱۰۔ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِىْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۱۱۔ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ؗ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

۱۲۔ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ○

۱۳۔ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۔ مُوسٰی کی ماں کا دل (اپنے بیٹے کی یاد کے سوا) ہر چیز سے خالی ہوگیا۔ اگر ہم اُس کا دل ایمان اور اُمید سے محکم نہ کر دیتے تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیتی۔ (مگر ہماری) غرض یہ تھی کہ وہ مومنین میں سے رہے۔

۱۱۔ ماں نے موسٰی کی بہن سے کہا تو اُس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔ پس وہ اُسے دُور سے دیکھتی رہی اور وہ لوگ اس حال سے بے خبر تھے۔

۱۲۔ اور ہم نے پہلے ہی سے اُس پر دُودھ پلانے والیوں کے دُودھ اُس پر حرام کر دیئے تھے (تاکہ وہ اپنی ماں ہی کی گود میں پھر سے آجائے) پس موسٰی کی بہن نے (جب دیکھا کہ حکام کسی دایہ کی تلاش میں بے تاب ہیں تو) کہا۔ کیا میں تمہیں ایسے گھر والے بتاؤں جو اس نومولود کی کفالت کریں اور اُس کے خیر خواہ بھی ہوں؟

۱۳۔ پس ہم نے اُس (موسٰی) کو اُس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو نیز وہ جان لے کہ خدا کا وعدہ سچا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر

مُوسٰیؑ پھر آغوشِ مادر میں:

اِن آیات میں اِس داستان کا ایک اور حصّہ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت موسٰیؑ کی ماں نے اُس طرح سے جیسا کہ ہم نے پیشتر بیان کیا ہے، اپنے فرزند کو دریائے نیل کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ مگر اس عمل کے بعد اُس کے دل میں جذبات کا ایک شدید طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ نوزائیدہ بیٹے کی یاد، جس کے سوا اُس کے دل میں کچھ نہ تھا، اُس کے احساسات پر غالب آگئی تھی۔

قریب تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور اپنا راز فاش کر دے۔

قریب تھا کہ چیخ مارے اور اپنے بیٹے کی جُدائی میں نالے کرے۔

لیکن ــــ عنایتِ خداوندی اُس کے شاملِ حال رہی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے: موسٰی کی ماں کا دل اپنے فرزند کی یاد کے سوا ہر چیز سے خالی ہوگیا۔

اگر ہم نے اُس کا دل ایمان اور اُمید کے نُور سے روشن نہ کیا ہوتا تو قریب تھا کہ وہ راز فاش کر دیتی۔ لیکن ہم نے یہ اس لیے کیا تاکہ وہ اہلِ ایمان میں سے رہے: (واصبح فؤاد ام موسٰی فٰرغًا ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علٰی قلبھا لتکون من المؤمنین)۔

"فارغ" کے معنی ہیں خالی۔ اِس جگہ "ہر چیز سے خالی" سے مراد یہ ہے کہ "بجز یادِ فرزند ہر شئے سے خالی تھا۔"

ہرچند کہ بعض مفسرین نے یہ مراد لی ہے کہ مادرِ موسٰی کا دل غم و اندوہ سے خالی تھا۔

یا ــ اُس الہام اور خوش خبری سے خالی تھا جو اُسے پہلے دی گئی تھی لیکن اگر سیاقِ عبارت پر غور کیا جائے تو یہ مفاہیم درست نہیں معلوم ہوتے۔

یہ قطعی فطری امر ہے کہ:ـ ایک ماں جو اپنے بچے کو اس صورتِ حال سے اپنے پاس سے جُدا کرے وہ اپنی اولاد کے سوا ہر شے کو بھول جائے گی۔ اور اُس کے حواس ایسے باختہ ہو جائیں گے کہ اُن خطرات کا لحاظ کیے بغیر جو اُس کے اور اس کے بیٹے دونوں کے سر پر منڈلا رہے تھے فریاد کرے اور اپنے دل کا راز فاش کر دے۔

لیکن ــــ وہ خدا جس نے اِس ماں کے سپرد یہ اہم فریضہ کیا تھا۔ اُسی نے اس کے دل کو ایسا حوصلہ بھی بخشا کہ وعدۂ الٰہی پر اُس کا ایمان ثابت رہے اور اُسے یہ یقین رہے کہ اُس کا بچہ خدا کے ہاتھ میں ہے آخر کار وہ پھر اُسی کے پاس آجائے گا اور پیغمبر بنے گا۔

"ربطنا" کا مادہ "ربط" ہے۔ اس کلمہ کے وضعی معنی ہیں "حیوانات کو کسی ایسی جگہ باندھنا جہاں وہ اطمینان سے اپنی جگہ محفوظ رہیں"۔ اِس قسم کی جگہ کو "رباط" کہتے ہیں۔ مجازاً حفظ و تقویت و استحکام بخشنے کے معنی میں آتا ہے۔ اِس آیت میں جو

ربطنا علیٰ قلبھا " کہا گیا ہے تو اس سے مراد یہی ہے کہ ہم نے اُس کے دل کو قوی کر دیا تاکہ وہ خدا کی وحی پر ایمان لائے اور اس عظیم واقعے کا صدمہ برداشت کرے۔

* * *

اِس لُطفِ خداوندی کے طفیل ماں کے دل کا سکون لَوٹ آیا مگر اُسے آرزو رہی کہ وہ اپنے فرزند کے حال سے باخبر رہے۔ اس لیے اُس نے موسیٰ کی بہن سے کہا کہ جا تُو دیکھتی رہ کہ اُس پر کیا گُزرتی ہے: (و قالت لاخته قصیه)۔

" قصیه " مادّہ " قص " سے مشتق ہے۔ اِس کے معنی ہیں کسی چیز کی کیفیت کی جستجو۔ عرفِ عام میں جو لفظ " قصّہ " ہے نام اس وجہ سے ہوا کہ اُس میں بھی قسم قسم کے واقعات کی جستجو ہوتی ہے۔

موسیٰ کی بہن ماں کا حکم بجا لائی اور اتنے فاصلے سے جہاں سے سب کچھ نظر آتا تھا دیکھتی رہی۔ اُس نے دُور سے دیکھا کہ فرعون کے عُمّال اُس کے بھائی کے صندوق کو پانی میں سے نکال رہے ہیں اور موسیٰ کو صندوق میں سے نکال کر گود میں لے رہے ہیں: (فبصرت به عن جنب)۔

مگر وہ لوگ اِس بہن کی اِس کیفیت حال سے بے خبر تھے: (وھو لا یشعرون)۔

اِس واقعے کے متعلق بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ فرعون کے مخصوص خدمت گار اِس بچے کو لے کر محل سے باہر آئے تھے تاکہ اس کے لیے کوئی دُودھ پلانے والی تلاش کریں۔ ٹھیک اُسی وقت موسیٰ کی بہن نے دُور سے اپنے بھائی کو دیکھ لیا تھا۔

مگر — پہلی توجیہہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس توجیہہ کی بناء پر جب موسیٰ کی ماں بچے کے صندوق کو دریائے نیل کے سپرد کر کے گھر لَوٹ آئی تو موسیٰ کی بہن دریا کے کنارے کھڑی دُور سے دیکھتی رہی کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے! اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عُمّالِ فرعون نے اُسے پانی میں سے نکال لیا ہے اور بچہ اُس عظیم خطرے سے جو اُسے درپیش تھا نجات پا گیا ہے۔

" ھو لا یشعرون " کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ مرحوم علامہ طبرسی اِس احتمال کو بعید نہیں سمجھتے کہ اس جگہ اور آیات ماقبل میں اِس جملے کی جو تکرار فرعون کے متعلق ہوئی ہے، اِس سے اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کہ وہ حالات سے اِس حد تک لاعلم تھا تو پھر کس طرح خدائی کا دعویٰ کرتا تھا؟ وہ ارادہ الٰہی اور اُس کی مشیت سے کس طرح نبرد آزما ہونا چاہتا تھا؟

* * *

بہرحال ارادہ الٰہی یہ تھا کہ یہ طفل نوزاد جلد اپنی ماں کے پاس واپس جائے اور اُس کے دل کو قرار آئے۔ اِس لیے فرمایا گیا ہے: "ہم نے تمام دُودھ پلانے والی عورتوں کو اُس پر حرام کر دیا تھا": (وحرمنا علیه المراضع من قبل)[1]

یہ امرِ طبعی ہے کہ شیر خوار نوزاد چند گھنٹے گزرتے ہی بھوک سے رونے لگتا ہے اور بے تاب ہو جاتا ہے۔ اندریں حال لازم تھا کہ موسیٰ کو دُودھ پلانے کے لیے کسی عورت کی تلاش کی جاتی۔ خصوصاً جبکہ ملکۂ مصر اُس بچے سے نہایت دل بستگی رکھتی تھی اور اُسے اپنی جان کے برابر عزیز رکھتی تھی۔

[1] " مراضع " جمع ہے " مرضع " (بروزن مُخبر) کی۔ اس کا معنی ہے " دُودھ پلانے والی عورت "۔ بعض کے نزدیک یہ " مرضع " (بروزن مکتب) کی جمع ہے یعنی دُودھ پلانے کی جگہ یعنی پستانِ مادر۔ اِس کلمے کے متعلق یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر میمی ہے۔ بمعنی " رضاع " دودھ پلانا مگر پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

محل کے خدام حرکت میں آ گئے اور در بدر کسی دُودھ پلانے والی کو تلاش کرنے لگے۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ کسی کا دُودھ پیتا ہی نہ تھا۔

ممکن ہے کہ وہ بچّہ اُن عورتوں کی صُورت ہی سے ڈرتا ہو اور اُن کے دُودھ کا مزہ (جس سے وہ آشنا نہ تھا) اسے اس کا ذائقہ ناگوار اور تلخ محسوس ہوتا ہو۔ اُس بچے کا طور کچھ اس طرح کا تھا گویا کہ اُن (دُودھ پلانے والی) عورتوں کی گود سے اُچھل کے دُور جا گرے دراصل یہ خدا کی طرف سے " تحریمِ تکوینی " تھی کہ اُس نے تمام عورتوں کو اُس پر حرام کر دیا تھا۔

بچہ لحظہ بہ لحظہ زیادہ بھُوکا اور زیادہ بیتاب ہوتا جاتا تھا۔ بار بار رو رہا تھا اور اُس کی آواز سے فرعون کے محل میں شور ہو رہا تھا۔ اور ملکہ کا دل لرز رہا تھا۔

خدمت پر مامور لوگوں نے اپنی تلاش کو تیز تر کر دیا۔ ناگہاں قریب ہی اُنھیں ایک لڑکی مل جاتی ہے۔ وہ اُن سے یہ کہتی ہے: مَیں ایک ایسے خاندان کو جانتی ہوں جو اس بچّے کی کفالت کر سکتا ہے۔ وہ لوگ اُس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ کیا تم لوگ یہ پسند کرو گے کہ مَیں تمہیں وہاں لے چلوں؟ (فقالت ھل ادلکم علیٰ اھل بیتٍ یکفلونه لکم وھم له ناصحون)۔

" مَیں بنی اسرائیل میں سے ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جس کی چھاتیوں میں دُودھ ہے اور اُس کا دل محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اُس کا ایک بچہ تھا وہ اُسے کھو چکی ہے۔ وہ ضرور اِس بچّے کو جو محل میں پیدا ہوا ہے، دُودھ پلانے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

وہ تلاش کرنے والے خدام یہ سُن کر خوش ہو گئے اور موسیٰ کی ماں کو فرعون کے محل میں لے گئے۔ اُس بچّے نے جُونہی اپنی ماں کی خوشبو سُونگھی اُس کا دُودھ پینے لگا۔ اور اپنی ماں کا رُوحانی رس چُوس کر اُس میں جانِ تازہ آ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کا نور چمکنے لگا۔

اُس وقت وہ خدام جو ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے تھے۔ بہت ہی زیادہ خوش و خرّم تھے۔ فرعون کی بیوی بھی اُس وقت اپنی خوشی کو نہ چھپا سکی۔ ممکن ہے اُس وقت لوگوں نے کہا ہو کہ تُو کہاں چلی گئی تھی، ہم تو تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئے۔ تجھ پر اور تیرے شیرِ مشکل کُشا پر آفرین ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ ماں کا دُودھ پینے لگے، فرعون کے وزیر ھامان نے کہا: مجھے لگتا ہے کہ تُو ہی اِس کی ماں ہے۔ بچّے نے اِن تمام عورتوں میں سے صرف تیرا ہی دُودھ کیوں قبول کر لیا؟

ماں نے کہا:

> "اس کی وجہ یہ ہے کہ مَیں ایسی عورت ہوں جس کے دُودھ میں سے خوشبو آتی ہے، میرا دُودھ نہایت شیریں ہے۔ اب تک جو بچہ بھی مجھے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی میرا دُودھ پینے لگتا ہے۔"

حاضرینِ دربار نے اِس قول کی صداقت کو تسلیم کر لیا اور ہر ایک نے حضرت موسیٰؑ کی ماں کو گراں بہا ہدیے اور تحفے دیے[1]۔ ایک حدیث جو امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے اس میں منقول ہے کہ:-

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۴، صفحہ ۲۳۱۔

"تین روز سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا کہ خدا نے بچے کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔"

بعض اہلِ دانش کا قول ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ "تحریم تکوینی" (یعنی دوسری عورتوں کا حرام کردینا) اس سبب سے تھی خدا یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرا فرستادہ پیغمبر ایسا دُودھ پیئے جو حرام سے آلودہ ہو اور ایسا مال کھا کے بنا ہو جو چوری، ناجائز ذرائع، رشوت حق الناس کو غصب کرکے حاصل کیا گیا ہو۔ خدا کی مشیت یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ اپنی صالحہ ماں کے پاک دُودھ سے غذا حاصل کریں۔ وہ اہلِ دُنیا کے شر کے خلاف ڈٹ جائیں اور اہلِ شر و فساد سے نبرد آزمائی کرسکیں۔

❖ ❖ ❖

ہم نے اس طرح موسیٰ کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں روشن ہو جائیں اور اُس کے دل میں غم و اندوہ باقی نہ رہے وہ یہ جان لے کہ خدا کا وعدہ حق ہے۔ اگرچہ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔ (فرددناہ الی امہ کی تقرّ عینہا ولا تحزن ولتعلم ان وعد اللہ حق ولٰکن اکثرھم لا یعلمون)[1]

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ :۔

کیا وابستگانِ فرعون نے موسیٰ کو کُلیتہً ماں کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ اُسے گھر لے جائے اور دُودھ پلایا کرے اور دورانِ رضاعت روزانہ کبھی کبھی بچے کو فرعون کے محل میں لایا کرے تاکہ ملکہ مصر اُسے دیکھ لیا کرے ۔۔۔ یا ۔۔۔ یہ کہ بچہ محل ہی میں رہتا تھا اور موسیٰ کی ماں معین اوقات آکر اُسے دُودھ پلا جاتی تھی ؟

مذکورہ بالا دونوں احتمالات کے لیے ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ لیکن احتمال اول زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ :۔

آیا ۔۔۔ عرصۂ شیر خوارگی کے بعد حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل میں چلے گئے یا اُن کا تعلق اپنی ماں اور خاندان کے ساتھ باقی رہا اور محل سے وہاں آتے جاتے رہے ؟

اس مسئلے کے متعلق بعض صاحبان نے یہ کہا ہے کہ شیر خوارگی کے بعد آپ کی ماں نے اُنھیں فرعون اور اُس کی بیوی آسیہ کے سپرد کر دیا تھا اور حضرت موسیٰؑ اُن دونوں کے پاس پرورش پاتے رہے۔

اس ضمن میں راویوں نے فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی طفلانہ (مگر بامعنیٰ) باتوں کا ذکر کیا ہے کہ اس مقام پر ہم اُن کو بعذر طولِ کلام کے پیشِ نظر قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن فرعون کا یہ جُملہ جو اُس نے بعثتِ موسیٰؑ کے بعد کہا :

"الم نربك فينا وليدًا ولبثت فينا من عمرك سنين" (شعراء-۱۸)

کیا ہم نے تجھے بچپن میں پرورش نہیں کیا اور کیا تو برسوں تک ہمارے درمیان نہیں رہا۔

یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ فرعون کے محل میں مدتوں رہے تھے۔

علی ابن ابراہیم کی تفسیر سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ تا زمانۂ بلوغ فرعون کے محل میں نہایت احترام کے ساتھ رہے۔ مگر اُن کی توحید آشکار باتیں فرعون کو سخت ناگوار ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ اُس نے اُنھیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت موسیٰؑ اس خطرے

[1] "تقرّ عینہا" کے لغوی مادّہ کے متعلق اس کتاب کی آٹھویں جلد میں۔ سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۷۴ کے تحت ذکر ہو چکا ہے۔

کو بھانپ گئے اور بھاگ کر شہر میں آگئے۔ یہاں وہ اس واقعے سے دوچار ہوئے کہ دو آدمی لڑ رہے تھے جن میں سے ایک قبطی اور ایک سبطی تھا (اس واقعے کی تفسیل آئندہ آتی ہے)[1]

۱۴۔ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ○

۱۵۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۟ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۟ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ○

۱۶۔ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

۱۷۔ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۔ اور جب وہ (موسیٰ) بھرپور جوان اور طاقتور ہوگیا تو ہم نے اسے حکمت اور دانش عطا کی اور ہم نیکو کاروں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

۱۵۔ اور وہ ایسے وقت جب اہلِ شہر غافل تھے شہر میں داخل ہوا تو ناگہاں اس نے دو آدمیوں کو دیکھا جو باہم لڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک اُس کے پیروکاروں میں سے تھا اور دوسرا اُس کے دشمنوں میں سے تھا اُن میں سے ایک نے جو اُس کا طرفدار تھا، دشمن کے مقابلے میں اس سے امداد طلب کی۔ موسیٰ نے اُس کے سینے پر ایک مُکّا مارا اور اُس کا کام تمام کردیا (اور وہ زمین پر گرا اور مرگیا) موسیٰ نے کہا کہ یہ ایک عمل شیطانی تھا بیشک وہ دشمن اور صریح بہکانے والا ہے۔

[1] تفسیر علی بن ابراہیم طبق نور الثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۱۷۔

۱۶۔ اُس نے کہا : اے میرے پروردگار ! میں نے اپنے اُوپر ظلم کیا تو مجھے بخش دے۔ پس خدا نے اُسے بخش دیا کہ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۱۷۔ اُس نے عرض کی : اے پروردگار ! مَیں اُس نعمت کے شکرانے میں، جو تو نے مجھے عطا کی ہے، میں کبھی مجرموں کی مدد نہ کروں گا۔

تفسیر

موسٰیؑ مظلوموں کے مددگار کے طور پر :

اَب ہم حضرت موسٰیؑ کی بھرپور زندگی کے تیسرے دَور سے دوچار ہوتے ہیں ۔

اس دَور میں اُن کے وہ واقعات ہیں جو اُنھیں بدورانِ بلُوغ اور مصر سے مدین کو سفر کرنے سے پہلے پیش آئے اور یہ وہ سب ہیں جو ان کی ہجرت کا باعث ہوئے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ اِس سلسلے میں پہلی بات تو یہ فرماتا ہے : موسٰی جب طاقتور اور کامل ہو گئے تو ہم نے اُنھیں حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نیکوکاروں کو اِس طرح جزا دیتے ہیں : (ولمّا بلغ اشدّہ واستوٰی اٰتیناہ حکمًا وعلمًا وکذٰلك نجزی المحسنین) ۔

" أشدّ " کا مادہ " شدّت " ہے ، بمعنی طاقتور ہونا۔ " استوٰی " کا مادہ "استواء" ہے بمعنی کمالِ خلقت اور اُس کا اعتدال ۔

ان دونوں الفاظ کے مفہوم میں کیا فرق ہے ؟ اس پر مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ " بلوغ اشدّ " وہ ہے کہ انسان قوائے جسمانی کے لحاظ سے سرحدِ کمال کو پہنچ جائے۔ غالباً اٹھارہ سال کی عمر میں ایسا ہوتا ہے۔

اور " استواء" زندگی میں استقرار اور اعتدال کو کہتے ہیں۔ یہ کیفیت جسمانی طاقت کے کمال کے بعد پیدا ہوتی ہے ۔

بعض دیگر مفسرین " بلوغ اشدّ " کے معنٰی " کمال جسمانی " اور " استواء" کے معنٰی " کمال عقلی و فکری " سمجھتے ہیں ۔

کتاب معانی الاخبار میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے کہ " اشد " اٹھارہ سال کی عمر ہے اور " استواءؑ عمر کا وہ حصہ ہے جب داڑھی مونچھ نمودار ہو جائے۔

اِن تعبیراتِ بالا میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے اور اِن دونوں کلمات کے لغوی معنٰی پر توجہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے معنٰی جسمانی ، فکری اور رُوحانی طاقتیں ہیں ۔

"حکمؑ " اور علم " میں ممکن ہے کہ یہ فرق ہو کہ "حکم " سے مراد عقل و فہم اور صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد ہے اور علم کے معنٰی ان آگاہی اور دانش ہے جس میں جہل کا شائبہ نہ ہو۔

"کذٰلك نجزی المحسنین " کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں کہ حضرت موسٰیؑ میں اپنے تقویٰ اور طہارتِ قلب اور پاکیزہ اعمال کے سبب یہ استحقاق پیدا ہو گیا تھا کہ خدا انھیں بطور جزا علم و حکمت عطا فرمائے اور بدیہی ہے کہ اس علم و حکمت سے مراد وحی اور نبوّت نہیں ہے ۔ کیونکہ اس زمانے کے بعد حضرت موسٰیؑ پر وحی نازل ہوئی اور نبوّت ملی ۔

بلکہ اس مقام پر علم و حکمت سے مراد وہی آگاہی ، روشن بینی ، صحیح قوّتِ فیصلہ اور اِسی قسم کے اوصاف ہیں جو خدا نے موسٰیؑ کو اُن کی پاک دامنی ، نیکی اور صالح زندگی کے صلہ میں عطا کیے تھے ۔ اِس صورتِ حال سے اجمالاً یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ اگرچہ موسٰیؑ فرعون کے محل میں رہے مگر اُس ماحول کی فضا سے قطعی متاثر نہیں ہوئے ۔ یہاں تک کہ اُن سے جتنا بھی ہو سکتا تھا وہ احیاءِ حق و عدالت میں سعی کرتے رہے ۔ ہرچند کہ آپ کی مصروفیات کا حال تشریحاً ہمیں معلوم نہیں ہے ۔

٭ ٭ ٭

بہرحال حضرت موسٰیؑ شہر میں اُس وقت داخل ہوئے جب تمام اہلِ شہر غافل تھے : (ودخل المدینة علٰی حین غفلةٍ من اھلھا) ۔

یہ واضح نہیں ہے کہ یہ کونسا شہر تھا ۔ لیکن احتمال قوی یہ ہے کہ یہ مصر کا پایۂ تخت تھا ۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو اُس مخالفت کی وجہ سے جو اُن میں فرعون اور اُس کے وزراء میں تھی اور بڑھتی جا رہی تھی ، مصر کے پایۂ تخت سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر جب لوگ غفلت میں تھے ۔ حضرت موسٰیؑ کو موقع مل گیا اور وہ شہر میں آ گئے ۔

اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ حضرت موسٰیؑ فرعون کے محل سے نکل کر شہر میں آئے ہوں کیونکہ عام طور پر فرعونوں کے محلّات شہر کے ایک کنارے پر ایسی جگہ بنائے جاتے تھے جہاں سے وہ شہر کی طرف آمد و رفت کے راستوں کی نگرانی کر سکیں ۔

" علٰی حین غفلةٍ من اھلھا " سے مراد ایسا وقت ہے کہ شہر کے لوگ اپنے مشاغلِ معمول سے فارغ ہو چکے تھے اور کوئی بھی شہر کی حالت کی طرف متوجہ نہ تھا ۔ مگر یہ کہ وہ وقت کونسا تھا ؟ بعض کا خیال ہے کہ " ابتدائے شب " تھی ، جب کہ لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہو جاتے ہیں ، ایسے میں کچھ تو اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ کچھ تفریح اور رات کو بیٹھ کے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اِس وقت کو بعض اسلامی روایات میں " ساعتِ غفلت " کہا گیا ہے ۔ چنانچہ جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث منقول ہے :

"تنفلوا فی ساعة الغفلة ولو برکعتین خفیفتین "

ساعتِ غفلت میں نماز نافلہ پڑھو خواہ وہ دو رکعت مختصر ہی کیوں نہ ہو ۔

اِس حدیث میں جو " ساعتِ غفلت " کا کلمہ آیا ہے اُس کی یہ تعبیر کی گئی ہے :۔

"ساعة الغفلة ما بین المغرب والعشاء"

ساعت غفلت مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت ہے [1]

حقیقت میں وہ وقت غفلت کا ہوتا ہے ۔ بہت سے گناہوں ، بدچلنیوں اور اخلاقی انحرافات کا اسی وقت یعنی آغازِ شب ہی میں ارتکاب کیا جاتا ہے ۔

---

[1] وسائل الشیعہ ، جلد پنجم ص ۲۳۹ (باب ۲۰ از ابواب بقیۃ الصلوٰت المندوبہ) ۔

اُس وقت لوگ نہ تو اپنے کسب و کار میں مشغول ہوتے ہیں نہ بسترِ خواب و استراحت میں ہوتے ہیں بلکہ شہروں پر معمولاً
ب عام غفلت کی حالت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور بد اخلاقی کے مرکزوں میں اُسی وقت رونق ہوتی ہے۔

بعض اہلِ دانش کا خیال ہے کہ "ساعتِ غفلت" سے مراد وقت دوپہر ہے جبکہ نصف روز کام کرنے کے بعد چھٹی ہوتی ہے
ر لوگ آرام کرتے ہیں۔ مگر اس موضوع میں پہلی رائے زیادہ درست اور پُرمعنیٰ معلوم ہوتی ہے۔

بہرکیف حضرت موسیٰؑ شہر میں آئے اور وہاں ایک ماجرے سے دوچار ہوئے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑے ہوئے ہیں
ر ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک حضرت موسیٰؑ کا طرفدار اور اُن کا پیرو تھا اور دوسرا اُن کا دشمن تھا۔ (فوجد
بہا رجلین یقتتلان ھٰذا من شیعتہ وھٰذا من عدوہ)۔

کلمہ "شیعتہ" اس امر کا غماز ہے کہ جناب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل میں اُسی زمانے سے مراسم ہوگئے تھے اور کچھ لوگ اُن کے
یرو بھی تھے۔ احتمال یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنے مقلدین اور شیعوں کے گروہ کو فرعون کی جابرانہ حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے
طور ایک مرکزی طاقت کے تیار کر رہے تھے۔

جس وقت بنی اسرائیل کے اُس آدمی نے موسیٰؑ کو دیکھا تو اُن سے اپنے دشمن کے مقابلے میں امداد چاہی: (فاستغاثہ
لذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ)۔

حضرت موسیٰؑ اُس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگئے تاکہ اُسے اس ظالم دشمن کے ہاتھ سے نجات دلائیں۔ بعض علماء کا خیال ہے
کہ وہ قبطی فرعون کا ایک باورچی تھا اور چاہتا تھا کہ اس بنی اسرائیل کو بیگار میں پکڑ کے اُس سے لکڑیاں اُٹھوائے۔ حضرت موسیٰؑ نے اُس
فرعونی کے سینے پر ایک مُکا مارا وہ ایک ہی مُکے میں مرگیا اور زمین پر گر پڑا: (فوکزہٗ موسٰی فقضٰی علیہ)[1]

اِس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا اُس فرعونی کو جان سے مار دینے کا ارادہ نہ تھا۔ آیات مابعد سے بھی یہ مطلب خُوب
واضح ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہ تھا کہ وہ لوگ مستحقِ قتل نہ تھے بلکہ اُنھیں اُن نتائج کا خیال تھا جو خُود حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل
کو پیش آسکتے تھے۔

لہٰذا حضرت موسیٰؑ نے فوراً کہا کہ یہ کام شیطان نے کرایا ہے کیونکہ وہ انسانوں کا دشمن اور واضح گمراہ کرنے والا ہے: (قال ھٰذا
من عمل الشیطان انہ عدو مضل مبین)۔

اِس واقعے کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ چاہتے تھے کہ بنی اسرائیلی کا گریبان اُس فرعونی کے ہاتھ سے چھڑا دیں۔ ہرچند کہ
وابستگانِ فرعون اس سے زیادہ سخت سلوک کے مستحق تھے لیکن اُن حالات میں ایسا کام کر بیٹھنا قرینِ مصلحت نہ تھا اور جیسا کہ ہم آگے
دیکھیں گے کہ حضرت موسیٰؑ اِسی عمل کے نتیجے میں پھر مصر میں نہ ٹھہر سکے اور مدین چلے گئے

٭ ٭ ٭

پھر قرآن میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تُو مجھے معاف کر دے،
اور خدا نے اُسے بخش دیا۔ کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے: (قال ربّ انّی ظلمت نفسی فاغفرلی فغفرلہ انّہٗ ھو الغفور الرحیم)۔

[1] "وکز" کے معنی مُکا مارنے کے ہیں۔ اِس کلمے کے کچھ اور معنی بھی بتلائے گئے ہیں جو درست نہیں معلوم ہوتے۔

یقیناً حضرت موسیٰؑ اس معاملے میں کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں اُن سے ترکِ اُولیٰ سرزد ہوا۔ کیونکہ انہیں ایسی
بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیئے تھی جس کے نتیجے میں وہ زحمت و تکلیف میں مبتلا ہوں۔ حضرت موسیٰؑ نے اِسی ترکِ اُولیٰ کے لیے
خدا سے طلبِ عفو کیا اور خدا نے بھی اُنھیں اپنے لُطف و عنایت سے بہرہ مند کیا۔

٭ ٭ ٭

حضرت موسیٰؑ نے کہا: خداوندا تیرے اس احسان کے شکرانے میں کہ تو نے میرے قصور کو معاف کر دیا اور دشمنوں
کے پنجے میں گرفتار نہ کیا اور اُن تمام نعمتوں کے شکریے میں جو مجھے ابتدا سے اب تک مرحمت کرتا رہا ہے، مَیں عہد کرتا ہوں کہ ہرگز
مجرموں کی مدد نہ کروں گا اور ظالموں کا طرفدار نہ ہوں گا: (قال ربّ بما انعمت علیّ فلن اکون ظھیراً للمجرمین)۔
"بلکہ ہمیشہ مظلومین اور ستم دیدہ لوگوں کا مددگار رہوں گا۔"

اِس جملے سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود یہ تھا کہ: مَیں آئندہ ہرگز مجرم اور گنہگار وابستگانِ فرعون کا شریکِ کار نہ ہوں گا۔ بلکہ مَیں
بنی اسرائیل کے ستم دیدہ لوگوں کا ہمدرد رہوں گا۔

بعض لوگوں نے آیت میں کلمہ "مجرمین" سے وہ اسرائیلی شخص مراد لیا ہے جو قبطی سے لڑ رہا تھا۔ یہ قیاس حقیقت سے بعید ہے۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت موسیٰؑ کا یہ کام اور مقامِ عصمت:** مفسّرین نے، اُس قبطی اور بنی اسرائیل کی باہمی نزاع اور حضرت موسیٰؑ
کے ہاتھ سے مردِ قبطی کے مارے جانے کے بارے میں بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔

درحقیقت یہ معاملہ کوئی اہم اور بحث طلب تھا ہی نہیں کیونکہ ستم پسند وابستگانِ فرعون نہایت بے رحم اور مُفسد تھے۔ انہوں
نے بنی اسرائیل کے ہزاروں بچّوں کے سر قلم کیے اور بنی اسرائیل پر کسی قسم کا ظلم کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اِس جہت سے یہ لوگ
اِس قابل نہ تھے کہ بنی اسرائیل کے لیے اُن کا قتل احترامِ انسانیت کے خلاف ہو۔

البتہ مفسّرین کے لیے جس چیز نے دشواریاں پیدا کی ہیں وہ اس واقعے کی وہ مختلف تعبیرات ہیں جو خود حضرت موسیٰؑ نے کی ہیں۔
چنانچہ وہ ایک جگہ تو یہ کہتے ہیں:

ھٰذا من عمل الشیطان

یہ شیطانی عمل ہے۔

اور دوسری جگہ یہ فرمایا:

ربّ انّی ظلمت نفسی فاغفرلی

خدایا میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تو مجھے معاف فرما دے۔

جناب موسیٰؑ کی یہ دونوں تعبیرات اس مسلّمہ حقیقت سے کیونکر مطابقت رکھتی ہیں کہ:-

"عصمتِ انبیا کا مفہوم یہ ہے کہ انبیا ماقبل بعثت اور مابعد عطائے رسالت ہر دو حالات میں معصوم ہوتے ہیں۔"

لیکن — حضرت موسیٰؑ کے اس عمل کی جو توضیح ہم نے آیاتِ فوق کی روشنی میں پیش کی ہے، اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے جو کچھ سرزد ہوا وہ ترکِ اُولیٰ سے زیادہ نہ تھا۔ اُنھوں نے اِس عمل سے اپنے آپ کو زحمت میں مبتلا کر لیا کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے ایک قبطی کا قتل ایسی بات نہ تھی کہ وابستگانِ فرعون اُسے آسانی سے برداشت کر لیتے۔

نیز، ہم جانتے ہیں کہ "ترکِ اُولیٰ" کے معنیٰ ایسا کام ہے جو بذاتِ خود حرام [illegible] ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ "عملِ احسن" ترک ہوگیا۔ بغیر اِس کے کہ کوئی عمل خلافِ حکمِ الٰہی سرزد ہوا ہو۔

اِس قسم کے واقعات کا دوسرے انبیاؑ کے احوالِ حیات میں بھی نشان ملتا ہے۔ اُن میں سے ایک حضرت آدمؑ بھی ہیں۔ جن کے متعلق سُورۂ اعراف آیت نمبر ۱۹ کے تحت (جلد ۴ تفسیرِ ھذا میں) مفصّلاً ذکر ہوا ہے۔

اِن آیات کی تفسیر میں "عیون الاخبار" میں جناب امام علی رضا علیہ السلام سے ایک تفسیر مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"ھٰذا من عمل الشیطان" سے مراد " اُن دونوں آدمیوں کی ایک دوسرے سے لڑائی ہے۔ (جو عملِ شیطانی شمار ہوتا ہے) نہ کہ عملِ مُوسیٰ اور اِس جملہ " ربّ انی ظلمت نفسی فاغفرلی " سے مُراد یہ ہے کہ موسیٰ کہہ رہے ہیں کہ — خدایا جس مقام پر مجھے آنا نہیں چاہیئے تھا میں وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اس شہر میں ہرگز داخل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اور " فاغفرلی " سے مراد یہ ہے کہ:۔ " مجھے دشمنوں سے چھپا " تاکہ وہ مجھ پر غالب نہ آجائیں (کیونکہ کلمہ " غفران " چھپانے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے)۔ [1]

۲۔ مُجرموں کی مدد کرنا بہت بڑا گناہ ہے :۔

اسلامی فقہ میں ارتکابِ گناہ میں کسی کی اعانت کرنے اور ظالمین کی مدد کرنے کے بارے میں ایک مفصّل باب ہے، جس میں احادیثِ کثیرہ کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ بدترین گناہوں میں سے ایک گناہ ظالموں، ستمگاروں اور مجرموں کی اعانت کرنا بھی ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اُس کا یہ عمل اس امر کا باعث بنتا ہے کہ اُس کا (مددگار کا) حشر اور عاقبت بھی اُن ہی ستمگاروں کے ساتھ ہوگی۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ہر معاشرے میں ظالم، ستمگار اور فرعون جیسے کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ اگر اُس معاشرے کے عوام اُن لوگوں کے کاموں کی تائید نہ کریں (یعنی خاموش نہ رہیں اور اظہارِ ناپسندیدگی کریں) تو پھر کوئی بھی فرعون نہ بن سکے۔

اِن ظالم فرعونوں کے مُوئیدین عام طور پر کمینے، مفلوک الحال یا ابن الوقت دنیا پرست لوگ ہوتے ہیں، جو اُن کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُن کے دست و بازو یا کم از کم اُن کے لشکر اور جمعیت میں اضافے کا سبب بن جاتے ہیں تاکہ اُن ستم شعاروں کے لیے شیطانی قوّت فراہم کریں۔

قرآن مجید میں اخلاق کے اِس بنیادی اصول کے متعلق بہ تکرار ھدایات موجود ہیں۔ چنانچہ سُورۂ مائدہ کی دوسری آیت میں مذکور ہے:

"وتعاونوا علی البرّ والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"

ایک دوسرے سے نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو مگر گناہ اور تعدی کے کاموں میں مدد نہ کرو۔

---

[1] عیون الاخبار، طبق نقل تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۱۱۹۔

قرآن میں بصراحت مذکور ہے کہ ظالموں کے ساتھ " رکون " عذابِ جہنم کا سبب ہے۔

" رکون " کے معنیٰ خواہ قلبی میلان ہوں یا کسی کے ساتھ اُس کے کام میں ظاہری شرکت، یا کسی کے فعل پر اظہارِ رضایت، دوستی و خیر خواہی یا اطاعت، مفسّرین نے اِن میں سے ہر معنیٰ کی تفسیر کی ہے۔

اِس کلمہ کا ایک اور مفہوم بھی ہے جو اِن معانی کا جامع ہے اور وہ بھروسہ، اعتماد اور وابستگی ہے۔ یہ مفہوم ہمارے مقصود کا زندہ گواہ ہے۔

امام زین العابدین علی ابن الحسینؑ سے ایک حدیث منقول ہے:۔

محمد بن مسلم زہری ایک عالم شخص تھا۔ وہ بنی اُمیہ کی حکومت بالخصوص ہشام بن عبدالملک کے ساتھ تعاون کیا کرتا تھا۔ امام علیہ السلام نے جب اُس کو ظالمین کی اعانت کرنے سے پرہیز کرنے کی ھدایت فرمائی تو اُسے متنبہ کرنے کے لیے یہ الفاظ فرمائے:

اولیس بدعائھم ایاك حین دعوك جعلوك قطباً ادار و ربك رحی مظالمھم، وجسراً یعبرون علیك الیٰ بلایاھم وسلماً الیٰ ضلالتھم داعیاً الیٰ غیّھم، سالکاً سبیلھم، یدخلون بك الشك علی العلماء ویقتادون بك قلوب الجھال الیھم!...
فما اقل ما اعطوك فی قدر ما اخذوا منك! وما ایسر ماعمروا لك فی جنب ماخربوا علیك! فانظر لنفسك فانه لاینظر لھا غیرك وحاسبھا حساب رجل مسئول!

کیا اُنھوں نے (بنی اُمیہ نے) تجھے اپنے گرد مجتمع ہونے کی دعوت نہیں دی؛ اور کیا تجھے اُنھوں نے وہ محور نہیں بنایا جس کے گرد اُن کے ظلم کی چکّی گھومتی ہے۔ اور کیا اُنھوں نے تجھے وہ پُل قرار نہیں دیا جس پر سے عبور کرکے وہ اپنی بلاؤں کی طرف جاتے ہیں۔

اور کیا اُنھوں نے تجھے اپنی ضلالت کے لیے سیڑھی نہیں بنایا۔ اور کیا اُنھوں نے تجھے اپنی جہالت اور گمراہی کی طرف داعی اور اپنی شرمناک راہ کا راہرو قرار نہیں دیا؟ وہ تیرے ذریعے سے علماء کو شک میں مبتلا کرتے ہیں اور جہلاء کے قلوب کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں۔ وہ جو کچھ تجھ سے لیتے ہیں اُس کے عوض تجھے کس قدر قلیل معاوضہ دیتے ہیں اور تیرے ذریعے وہ جتنا برباد کرتے ہیں اُس کے مقابلے میں کتنا کم آباد کرتے ہیں۔

بس تو اپنے نفس پر غور کر کیونکہ خود تجھ سے زیادہ، تیرا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔
اور ایک شخصِ مسئول کی طرح تو خود اپنے نفس کا حساب لے۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ امامؑ کی یہ معنیٰ آشکار اور دلنشین منطق ہر اُس عالم کو جو دربار رس اور وابستۂ حکومت ہو اس کے بارے میں ہے اور واضح کرتی ہے کہ اس کے نتائج کس قدر بُرے اور نحس ہوتے ہیں۔

---

[1] تحف العقول: صفحہ ۶۶

ابنِ عباس کہتے ہیں : کہ یہ آیت " ربّ بما انعمت علیّ فلن اکون ظھیرًا للمجرمین "
من جملہ ان آیات کے ہے جو یہ گواہی دیتی ہیں کہ مجرمین کی مدد کرنا جُرم و گناہ ہے اور مومنین کی اعانت کرنا فرمانِ الٰہی کی اطاعت ہے۔
کہتے ہیں کہ لوگوں نے کسی عالم سے کہا کہ :۔
" فلاں آدمی فلاں ظالم کا مُحرّر ہوگیا ہے اور صرف اُس کی آمدنی اور خرچ کا حساب لکھتا ہے۔ اگر وہ اِس کام کے معاوضے میں کچھ معاوضہ لے تو اُس کی گزر بسر ہو جاتی ہے گی ورنہ وہ خود اور اُس کے عیال فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔"
اُس عالم نے اس سوال کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا :
کیا تم نے اُس مردِ صالح (حضرت موسیٰؑ) کا قول نہیں سُنا ؟

ربّ بما انعمت علیّ فلن اکون ظھیرًا للمجرمین

خداوندا! اِن نعمتوں کے شکرانے میں جو تُو نے مجھے بخشی ہیں، مَیں ہرگز مجرمین کی اعانت نہیں کروں گا۔[1]

---

[1] ظالموں کی اعانت کے بارے میں ہم پہلے ہی دو تفصیلی احادیث ذکر کر چکے ہیں۔ دیکھیئے تفسیر نمونہ ج ۴، سورۂ مائدہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں اور ج ۵ سورہ ہُود کی آیت ۱۱۳ کی تفسیر کے ذیل میں۔

۱۸۔ فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝

۱۹۔ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۗۖ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ۝

۲۰۔ وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی ؗ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ ۝

۲۱۔ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ ؗ قَالَ رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝

۲۲۔ وَ لَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْۤ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ۝

ترجمہ

۱۸۔ موسیٰ نے شہر میں بحالتِ خوف صبح کی جبکہ ہر لحظہ وہ کسی حادثے (اور کسی خبر) کے انتظار میں تھا۔ ناگہاں اس نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی، آج پھر اسے پُکار رہا ہے اور اس سے نصرت طلب کر رہا ہے۔ موسیٰ نے اُس سے کہا کہ تو آشکارا طور پر گمراہ ہے۔

۱۹۔ پس جب اُس (موسیٰ) نے ارادہ کیا کہ اُس شخص کو جو اُن دونوں کا دشمن تھا پکڑ لے تو اُس نے کہا : اے موسیٰ! کیا تو آج مجھے بھی اسی طرح قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ کیا تُو چاہتا ہے کہ تو زمین میں ظالم بن کر رہے اور کیا تو مصلحین میں سے نہیں ہونا چاہتا ؟

۲۰۔ (اُس وقت) ایک شخص شہر کے دُور کے حصّہ سے (فرعونیوں کے مرکز سے) تیزی سے آیا اور کہا کہ سردار تیرے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔ پس تو فوراً شہر سے نکل جا کہ مَیں تیرا خیر خواہ ہوں۔

۲۱۔ وہ شہر سے ڈرتے ہوئے نکلا اور ہر لحظہ کسی حادثے کا کھٹکا تھا۔

(اُس نے خدا سے دُعا کی) اور کہا : اے میرے رب ! تُو مجھے ان ظالم لوگوں سے نجات دے۔

۲۲۔ اور جب اُس نے مدین کی طرف رُخ کیا تو کہا : مجھے اُمید ہے کہ میرا رب مجھے راہِ راست کی ھدایت کریگا۔

تفسیر

مُوسٰیؑ کی مخفیانہ مدین کی طرف روانگی :

ان آیات میں اس پُرحوادث سرگزشت کا چوتھا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ فرعونیوں میں سے ایک آدمی کے قتل کی خبر شہر میں بڑی تیزی سے پھیل گئی۔ قرائن سے شاید لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ اُس کا قاتل ایک بنی اسرائیل ہے اور شاید اس سلسلے میں لوگ موسٰیؑ کا نام بھی لیتے تھے۔

البتہ یہ قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اسے انقلاب کی ایک چنگاری یا اُس کا مقدمہ شمار کیا جاتا تھا۔ اور حکومت کی مشینری اُسے ایک معمولی واقعہ سمجھ کر اُسے چھوڑنے والی نہ تھی کہ بنی اسرائیل کے غلام اپنے آقاؤں کی جان لینے کا ارادہ کرنے لگیں۔

لہٰذا ہم زیرِ بحث پہلی ہی آیت میں یہ پڑھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد موسٰیؑ شہر میں ڈر رہے تھے اور ہر لحظہ اُنہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا اور وہ نئی خبروں کی جستجو میں تھے : (فاصبح فی المدینة خآئفًا یترقب)[1]

ناگہاں انہیں ایک معاملہ پیش آیا۔ آپ نے دیکھا کہ وہی بنی اسرائیلی جس نے گزشتہ روز اُن سے مدد طلب کی تھی اُنھیں پھر پکار رہا تھا اور مدد طلب کر رہا تھا (وہ ایک اور قبطی سے لڑ رہا تھا) : (فاذا الذی استنصرہ بالامس یستصرخه)[2]

لیکن حضرت موسٰیؑ نے اُس سے کہا کہ تو آشکارا طور پر ایک جاہل اور گمراہ شخص ہے : (قال له موسٰی انك لغوی مبین)۔ تو ہر روز کسی نہ کسی سے جھگڑ پڑتا ہے اور اپنے لیے مصیبت پیدا کر لیتا ہے اور ایسے کام شروع کر دیتا ہے، جن کا ابھی موقع نہیں ہے۔ کل جو کچھ گزری ہے میں تو ابھی اُس کے عواقب کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور تُو نے وہی کام از سرِ نو شروع کر دیا ہے۔

❊ ❊ ❊

بہرحال وہ ایک مظلوم تھا جو ایک ظالم کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ (خواہ ابتداءً اُس سے کچھ قصور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو) اِس لیے حضرت موسٰیؑ کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اُس کی مدد کریں اور اُسے اُس قبطی کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں۔ لیکن جیسے ہی حضرت موسٰیؑ نے یہ ارادہ کیا کہ اُس قبطی آدمی کو (جو اُن دونوں کا دشمن تھا) پکڑ کر اُس بنی اسرائیلی سے جُدا کریں وہ قبطی چلّایا، اُس نے کہا : اے موسٰی ! کیا تو مجھے بھی اُسی طرح قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا تھا : (فلما ان اراد ان یبطش

[1] "یترقب" کا مادہ "ترقب" ہے۔ اس کا معنی ہے "انتظار کرنا" اس مقام پر موسٰیؑ اُس حادثے کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ شہر میں کیا خبر ہے۔ یہ جملہ بلحاظِ اعراب ایک خبر کے بعد خبر ہے اگرچہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حال کے بعد حال ہے مگر یہ احتمال بہت بعید ہے۔

[2] "یستصرخ" کا مادہ "استصراخ" ہے جس کے معنی ہیں مدد کے لیے پکارنا۔ حقیقت میں اس کے معنی شور مچانے کے ہیں اور شور مچانا مدد مانگنے کے لیے لازم ہے۔

بالذی هو عدو لهما قال یا موسٰی اترید ان تقتلنی کما قتلت نفسًا بالامس)۔

تیری حرکات سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تُو زمین پر ایک ظالم بن کر رہے گا اور یہ نہیں چاہتا کہ مصلحین میں سے ہو : (ان ترید الا ان تکون جبارًا فی الارض وما ترید ان تکون من المصلحین)[1]

اس جُملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ نے فرعون کے محل اور اُس کے باہر ہر دو جگہ اپنے مصلحانہ خیالات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس موضوع پر اُن کے فرعون سے اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اسی لیے تو اُس قبطی آدمی نے یہ کہا :

یہ کیسی اصلاح طلبی ہے کہ تو ہر روز ایک آدمی کو قتل کرتا ہے ؟

حالانکہ اگر حضرت موسٰیؑ کا یہ ارادہ ہوتا کہ اُس ظالم کو بھی قتل کر دیں تو یہ بھی راہِ اصلاح میں ایک قدم ہوتا۔

بہرکیف حضرت موسٰیؑ کو یہ احساس ہوا کہ گزشتہ روز کا واقعہ طشت از بام ہو گیا ہے۔ اور اِس خوف سے کہ اور زیادہ مشکلات پیدا نہ ہوں، اُنھوں نے اِس معاملے میں دخل نہ دیا۔

❊ ❊ ❊

اس واقعے کی فرعون اور اُس کے اہلِ دربار کو اطلاع پہنچ گئی۔ اُنھوں نے حضرت موسٰیؑ سے اِس عمل کے مکرر سرزد ہونے کو اپنی شانِ سلطنت کے لیے ایک تہدید سمجھا۔ وہ باہم مشورے کے لیے جمع ہوئے اور حضرت موسٰیؑ کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔

اُس وقت ایک غیر متوقع واقعے نے حضرت موسٰیؑ کو موت سے نجات بخشی۔ ہوا یوں کہ ایک آدمی شہر کے دُور دراز حصے سے (جہاں فرعون اور اُس کے اہلِ خانہ رہتے تھے) تیزی کے ساتھ حضرت موسٰیؑ کے پاس آیا اور اُنھیں مطلع کیا کہ آپ کو قتل کرنے کا مشورہ ہو رہا ہے، آپ فوراً شہر سے نکل جائیں، میں آپ کا خیر خواہ ہوں : (وجآء رجل من اقصا المدینة یسعٰی قال یا موسٰی ان الملاَ یأتمرون بك لیقتلوك فاخرج انی لك من الناصحین)۔

یہ آدمی بظاہر وہی تھا جو بعد میں "مومن آلِ فرعون" کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا نام حزقیل تھا۔ وہ فرعون کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھا اور اُن لوگوں سے اُس کے ایسے قریبی روابط تھے کہ ایسے مشوروں میں شریک ہوتا تھا۔

اُسے فرعون کے جرائم اور اُس کی کرتوتوں سے بڑا دُکھ ہوتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کوئی شخص اُس کے خلاف بغاوت کرے اور وہ اس کارِ خیر میں شریک ہو جائے۔

بظاہر وہ حضرت موسٰیؑ سے یہ آس لگائے ہوئے تھا اور اُن کی پیشانی میں من جانب اللہ ایک انقلابی ہستی کی علامات دیکھ رہا تھا اسی وجہ سے جیسے ہی اُسے یہ احساس ہوا کہ حضرت موسٰیؑ خطرے میں ہیں، نہایت سُرعت سے اُن کے پاس پہنچا اور اُنھیں خطرے سے بچا لیا۔

ہم بعد میں دیکھیں گے کہ وہ شخص صرف اسی واقعے میں نہیں، بلکہ دیگر خطرناک مواقع پر بھی حضرت موسٰیؑ کے لیے با اعتماد ہمدرد ثابت ہوا۔ فرعون کے محل میں وہ بنی اسرائیل کے لیے گویا ایک دیدۂ تیز بین تھا۔

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اس اسرائیلی شخص کا جملہ ہے کہ جس نے گمان کیا تھا موسٰیؑ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں تاہم آیت میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اس مفہوم کی نفی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس خبر کو قطعی درست سمجھا اور اس ایماندار آدمی کی خیر خواہی کو بہ نگاہ قدر دیکھا اور اُس کی نصیحت کے مطابق شہر سے نکل گئے۔ اس وقت آپ خوف زدہ تھے اور ہر گھڑی انہیں کسی حادثے کا کھٹکا تھا: (فخرج منہا خآئفًا یترقب)۔

حضرت موسیٰؑ نے نہایت خضوعِ قلب کے ساتھ متوجہ الی اللہ ہو کر اس بلا کو ٹالنے کے لیے اُس کے لُطف و کرم کی درخواست کی اے میرے پروردگار! تو مجھے اس ظالم قوم سے رہائی بخش: (قال ربّ نجّنی من القوم الظّالمین)۔

میں جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور بے رحم ہیں۔ میں تو مظلوموں کی مدافعت کر رہا تھا اور ظالموں سے میرا کچھ تعلق نہ تھا اور جس طرح سے میں نے اپنی توانائی کے مطابق مظلوموں سے ظالموں کے شر کو دُور کیا ہے تو بھی اے خدائے بزرگ! ظالموں کے شر کو مُجھ سے دُور رکھ۔

٭ ٭ ٭

حضرت موسیٰؑ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ شہر مدین کو چلے جائیں۔ یہ شہر شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں تھا اور قلمروِ مصر اور فراعنہ کی حکومت میں شامل نہ تھا۔

لیکن وہ جوان جو محل کے اندر ناز و نعم میں پلا تھا۔ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جیسا کہ سفر اُسے کبھی زندگی بھر پیش نہ آیا تھا۔ اس کے پاس نہ زادِ راہ تھا، نہ توشۂ سفر، نہ کوئی سواری، نہ رفیقِ راہ اور نہ کوئی راستہ بتلانے والا ہر دم یہ خطرہ لاحق تھا کہ حکومت کے اہلکار مجھ تک پہنچ جائیں اور پکڑ کے قتل کر دیں اس حالت میں ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا کیا حال ہوگا۔

لیکن — حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ سختی اور شدت کے دنوں کو پیچھے چھوڑ دیں اور قصرِ فرعون اُنھیں جس جال میں پھنسانا چاہتا تھا اُسے توڑ کر باہر نکل آئیں اور وہ کمزور اور ستم دیدہ لوگوں کے پاس رہیں۔ اُن کے درد و غم کا بہ شدت احساس کریں اور مستکبرین کے خلاف اُن کی منفعت کے لیے بحکمِ الٰہی قیام فرمائیں۔

اس طویل، بے زاد و راحلہ اور بے رفیق و رہنما سفر میں ایک عظیم سرمایہ اُن کے پاس تھا اور وہ تھا ایمان اور توکّل بر خدا۔

لہٰذا جب وہ مدین کی طرف چلے تو کہا: خدا سے اُمید ہے کہ وہ مجھے راہِ راست کی طرف ہدایت کرے گا: (ولمّا توجّہ تلقاء مدین قال عسٰی ربّی ان یھدینی سوآء السبیل)[1]

[1] "تلقاء" مصدر یا اسم مکان ہے اور اس جگہ سمت یا جانب کے معنیٰ میں آیا ہے۔

۲۳۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ۝

۲۴۔ فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ۝

۲۵۔ فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ ۖ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ اور جب موسیٰ مدین میں پانی (کے کنویں) کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ لوگ اپنے چوپایوں کو پانی پلا رہے ہیں اور اُن کے ایک طرف دو عورتیں اپنی بکریوں کو لیے کھڑی ہیں اور (کنویں کے نزدیک نہیں آتیں) اُن سے موسیٰؑ نے پوچھا تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے؟ اُن دونوں نے کہا کہ ہم انھیں اُس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک تمام چرواہے یہاں سے نکل نہ جائیں اور ہمارا والد بہت ہی بوڑھا ہے۔

۲۴۔ پس موسیٰ نے اُن (بکریوں) کو پانی پلایا پھر وہ سائے کی جگہ جا بیٹھا اور کہا: پروردگارا! تُو مجھے جو بھی نعمت عطا کرے گا، میں اُس کا حاجت مند ہوں۔

۲۵۔ (ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ) اُن میں سے ایک حیا اور شرم کے ساتھ چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی۔ اور کہا میرے والد تجھے بلاتے ہیں تاکہ تُو نے جو ہماری بکریوں کو پانی پلایا تھا اُس کی تجھے اُجرت دے — پس موسیٰ اُس کے (شعیب کے) پاس آئے، اس سے سارا ماجرا بیان کیا تو شعیب نے کہا کہ ڈر نہیں تُو نے ظالموں سے نجات پالی ہے۔

تفسیر

ایک نیک عمل نے موسیٰؑ پر بھلائیوں کے دروازے کھول دیئے :

اِس مقام پر ہم اس سرگزشت کے پانچویں حصے پر پہنچ گئے ہیں اور وہ موقع یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ شہر مدین میں پہنچ گئے ہیں ۔

یہ جوان پاکباز انسان کئی روز تک تنہا چلتا رہا ۔ یہ راستہ وہ تھا جو نہ کبھی اُس نے دیکھا تھا اسے طے کیا تھا ۔ بعض لوگوں کے قول کے مطابق حضرت موسیٰؑ مجبور تھے کہ پا برہنہ راستہ طے کریں ۔ بیان کیا گیا ہے کہ مسلسل آٹھ روز تک چلتے رہے ۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ۔

جب بھوک لگتی تھی تو جنگل کی گھاس اور درختوں کے پتے کھا لیتے تھے ۔ ان تمام مشکلات اور زحمات میں صرف ایک خیال سے اُن کے دل کو راحت رہتی تھی کہ اُنھیں فرعون کے پنجۂ ظلم سے رہائی مل گئی ہے ۔

رفتہ رفتہ اُنھیں اُفق میں شہرِ مدین کا منظر نظر آنے لگا ۔ اُن کے دل میں آسودگی کی ایک لہر اُٹھنے لگی ۔ وہ شہر کے قریب پہنچے ۔ اُنھوں نے لوگوں کا ایک انبوہ دیکھا ۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ لوگ چرواہے ہیں کہ جو کنویں کے پاس اپنی بھیڑوں کو پانی پلانے آئے ہیں ۔

جب حضرت موسیٰؑ کنویں کے قریب آئے تو اُنھوں نے وہاں بہت سے آدمیوں کو دیکھا جو کنویں سے پانی بھر کے اپنے چوپایوں کو پلا رہے تھے ۔ (ولما ورد ماء مدین وجد علیه اُمةً من الناس یسقون) ۔

اُنھوں نے اُس کنویں کے پاس دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بھیڑوں کو لیے کھڑی تھیں ۔ مگر کنویں کے قریب نہیں آتی تھیں ۔ (ووجد من دونھم امرأتین تذودان)[1]

اِن باعفت لڑکیوں کی حالت قابلِ رحم تھی جو ایک گوشے میں کھڑی تھیں اور کوئی آدمی بھی اُن سے انصاف نہیں کرتا تھا ۔ چرواہے صرف اپنی بھیڑوں کی فکر میں تھے اور کسی اور کو موقع نہیں دیتے تھے ۔ حضرت موسیٰؑ نے اِن لڑکیوں کی یہ حالت دیکھی تو اُن کے نزدیک آئے اور پوچھا : یہاں کیسے کھڑی ہو : (قال ما خطبکما)[2]

تم آگے کیوں نہیں بڑھتیں اور اپنی بھیڑوں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں ؟

حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ حق کشی ، ظلم و ستم ، بے عدالتی اور مظلوموں کے حقوق کی عدم پاسداری جو اُنھوں نے شہر مدین میں دیکھی قابلِ برداشت نہ تھی ۔

مظلوموں کو ظلم سے بچانا اُن کی فطرت تھی ۔ اِسی وجہ سے اُنھوں نے فرعون کے محل اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرا دیا تھا اور وطن سے بے وطن ہو گئے تھے ۔ وہ اپنی اِس روشِ حیات کو ترک نہیں کر سکتے تھے اور ظلم کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے ۔

لڑکیوں نے حضرت موسیٰؑ سے جواب میں کہا : ہم اُس وقت تک اپنی بھیڑوں کو پانی نہیں پلا سکتیں ، جب تک تمام چرواہے اپنے

[1] " تذودان " کا مادہ " زود " ہے ۔ اس کے معنی ہیں منع کرنا ، روکنا ، وہ لڑکیاں نگہبانی کر رہی تھیں کہ اُن کی بھیڑیں بھاگ نہ جائیں یا دوسرے لوگوں کی بھیڑوں میں نہ مل جائیں ۔

[2] " خطب " بمعنی کام ۔ مقصد ۔

حیوانات کو پانی پلا کر نکل نہ جائیں : (قالتا لا نسقی حتیٰ یصدر الرعاء)[1]

اُن لڑکیوں نے اس بات کی وضاحت کے لیے کہ ان باعفت لڑکیوں کے باپ نے اُنھیں تنہا اِس کام کے لیے کیوں بھیج دیا ہے یہ بھی اضافہ کیا کہ ہمارا باپ نہایت ضعیف العمر ہے : (وابونا شیخ کبیر) ۔

نہ تو اُس میں اتنی طاقت ہے کہ بھیڑوں کو پانی پلا سکے اور نہ ہمارا کوئی بھائی ہے جو یہ کام کرلے ۔ اِس خیال سے کہ کسی پر بار نہ ہوں ہم خود ہی یہ کام کرتی ہیں ۔

❊ ❊ ❊

حضرت موسیٰ کو یہ باتیں سُن کر بہت کوفت ہوئی اور دل میں کہا کہ یہ کیسے بے انصاف لوگ ہیں کہ اُنھیں صرف اپنی فکر ہے اور کسی مظلوم کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے ۔

وہ آگے آئے ، بھاری ڈول اُٹھایا اور اُسے کنوئیں میں ڈالا ۔ کہتے ہیں کہ وہ ڈول اتنا بڑا تھا کہ چند آدمی مِل کر اُسے کھینچ سکتے تھے ۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے اپنے قوی بازوؤں سے اُسے اکیلے ہی کھینچ لیا اور اُن دونوں عورتوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا : (فسقیٰ لھما) ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کنویں کے قریب آئے اور لوگوں کو ایک طرف کیا تو اُن سے کہا : " تم کیسے لوگ ہو کہ اپنے سوا کسی اور کی پرواہ ہی نہیں کرتے " ۔

یہ سُن کر لوگ ایک طرف ہٹ گئے اور ڈول حضرت موسیٰؑ کے حوالے کر کے بولے :

" لیجئے ، بسم اللہ ، اگر آپ پانی کھینچ سکتے ہیں ۔ اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو تنہا چھوڑ دیا ۔ لیکن حضرت موسیٰؑ اُس وقت اگرچہ تھکے ہوئے تھے اور اُنہیں بھوک لگ رہی تھی مگر قوتِ ایمانی اُن کی مددگار ہوئی ، جس نے اُن کی جسمانی قوت میں اضافہ کر دیا اور کنویں سے ایک ہی ڈول کھینچ کر اُن دونوں عورتوں کی بھیڑوں کو پانی پلا دیا ۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ سائے میں آ بیٹھے ۔ اور بارگاہِ ایزدی میں عرض کرنے لگے : خداوندا ! تُو مجھے جو بھی خیر اور نیکی بخشے ، مَیں اس کا محتاج ہوں : (ثم تولیٰ الی الظل فقال رب انی لما انزلت الیّ من خیر فقیر) ۔

حضرت موسیٰؑ (اس وقت) تھکے ہوئے اور بھوکے تھے ۔ اُس شہر میں اجنبی اور تنہا تھے اور اُن کے لیے کوئی سر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی ۔ مگر پھر بھی وہ بے قرار نہ تھے ۔ آپ کا نفس ایسا مطمئن تھا کہ دعا کے وقت بھی یہ نہیں کہا کہ " خدایا تو میرے لیے ایسا یا ویسا کر " بلکہ یہ کہا کہ : " تو جو خیر بھی مجھے بخشے میں اُس کا محتاج ہوں " ۔

یعنی صرف اپنی احتیاج اور نیاز کو عرض کرتے ہیں اور باقی امور الطافِ خداوندی پر چھوڑ دیتے ہیں ۔

❊ ❊ ❊

لیکن ـــــ دیکھو کہ کارِ خیر کیا قُدرت نمائی کرتا ہے اور اُس میں کتنی عجیب برکات ہیں ۔ صرف لوجه اللہ ایک قدم اُٹھانے اور ایک ناآشنا مظلوم کی حمایت میں کنویں سے پانی کے ایک ڈول کھینچنے سے حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں ایک نیا باب کُھل گیا اور یہ عملِ خیر اُن کے لیے برکاتِ مادّی اور رُوحانی کی ایک دُنیا بطور تحفہ لایا ۔ اور وہ ناپیدا نعمت (جس کے حصول کے لیے اُنھیں برسوں کوشش کرنا پڑتی) اللہ نے اُنھیں بخش دی ۔

[1] " یصدر " مشتق ہے " صدر " سے اس کے معنی ہیں " خارج ہونا " اور " رعاء " جمع " راعی " کی بمعنی چرواہان ۔

حضرت موسیٰؑ کے لیے اس خوش نصیبی کا دور اُس وقت شروع ہوا جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ان دونوں بہنوں میں سے ایک نہایت حیا سے قدم اُٹھاتی ہوئی آرہی ہے۔ اُس کی وضع سے ظاہر تھا کہ اُسے ایک جوان سے باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ لڑکی حضرت موسیٰؑ کے قریب آئی اور صرف ایک جملہ کہا : میرے والد صاحب آپ کو بُلاتے ہیں تاکہ آپ نے ہماری بکریوں کے لیے کنویں سے جو پانی کھینچا تھا، اُس کا معاوضہ دیں : (فجآءته احداهما تمشی علی استحیآءٍ قالت ان ابی یدعوك لیجزیك اجر ما سقیت لنا)۔

یہ سُن کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں اُمید کی بجلی چمکی۔ گویا اُنھیں یہ ادراک ہوا کہ اُن کے لیے ایک عظیم خوش نصیبی کے اسباب فراہم ہو رہے ہیں۔ وہ ایک بزرگ انسان سے ملیں گے۔ وہ ایک ایسا حق شناس انسان معلوم ہوتا ہے جو یہ بات پسند نہیں کرتا کہ انسان کی کسی زحمت کا یہاں تک کہ پانی کے ایک ڈول کھینچنے کا بھی معاوضہ نہ دے۔ یہ ضرور کوئی ملکوتی اور الٰہی انسان ہوگا۔ یا اللہ ! یہ کیسا عجیب اور نادر موقع ہے!

بیشک وہ پیر مرد حضرت شعیبؑ پیغمبر تھے۔ اُنھوں نے برسوں تک اِس شہر کے لوگوں کو رجوع الی اللہ کی دعوت دی تھی۔ وہ حق پرستی اور حق شناسی کا نمونہ تھے۔

جب حضرت شعیبؑ نے یہ دیکھا کہ آج میری لڑکیاں ہر روز کے معمول سے قبل گھر آگئی ہیں تو اُنھوں نے لڑکیوں سے اس کا سبب پُوچھا۔ جب اُنھیں کُل واقعے کا علم ہوا تو اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ اُس اجنبی جوان کو اپنے دین کی تبلیغ کریں گے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ اُس جگہ سے حضرت شعیبؑ کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔

بعض روایات کے مطابق وہ لڑکی رہنمائی کے لیے اُن کے آگے آگے چل رہی تھی اور حضرت موسیٰؑ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ اُس وقت تیز ہوا سے اُس لڑکی کا لباس اُڑ رہا تھا اور ممکن تھا کہ ہوا کی تیزی لباس کو اُس کے جسم سے اُٹھا دے۔ حضرت موسیٰؑ کی پاکیزہ طبیعت اس منظر کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اِس لیے اُنھوں نے لڑکی سے کہا کہ مَیں آگے آگے چلتا ہوں۔ تم کسی دوراہے یا چند راہے پر مجھے راستہ بتا دینا۔[1]

چنانچہ حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کے گھر پہنچ گئے۔ ایسا گھر جس سے نُورِ نبوّت ساطع تھا اور اس کے ہر گوشے سے رُوحانیت نمایاں تھی اُنھوں نے دیکھا کہ ایک پیر مرد، جس کے بال سفید ہیں ایک گوشے میں بیٹھا ہے۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ کو خوش آمدید کہا۔ اور پوچھا :

"تم کون ہو ؟ کہاں سے آرہے ہو ؟ کیا کرتے ہو ؟ اس شہر میں کیا کرتے ہو ؟ اور آنے کا مقصد کیا ہے ؟ تنہا کیوں ہو ؟

حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کو اپنی پُوری داستان سنائی۔

قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ جب موسیٰ حضرت شعیبؑ کے پاس پہنچے اور اُنھیں اپنی سرگزشت سُنائی تو حضرت شعیبؑ نے کہا مت ڈرو، تمہیں ظالموں کے گروہ سے نجات مل گئی ہے : (فلما جآءه وقص علیه القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظالمین)۔

ہماری سرزمین اُن کی حدودِ سلطنت سے باہر ہے۔ یہاں اُن کا کوئی اختیار نہیں چلتا۔ اپنے دل میں ذرہ بھر پریشانی کو جگہ نہ دینا۔ تم امن والی جگہ پہنچ گئے ہو۔ مسافرت اور تنہائی کا بھی غم نہ کرو۔ یہ تمام مشکلات خدا کے کرم سے دُور ہو جائیں گی۔

حضرت موسیٰؑ فوراً سمجھ گئے کہ اُنھیں ایک عالی مرتبہ اُستاد مل گیا ہے، جس کے وجود سے رُوحانیت، تقویٰ، معرفت اور زلالِ علم کے چشمے

[1] ابوالفتوح رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

پھُوٹ رہے ہیں اور یہ اُستاد اُن کی تشنگی تحصیلِ علم و معرفت کو سیراب کر سکتا ہے۔

حضرت شعیبؑ نے بھی یہ سمجھ لیا کہ اُنھیں ایک لائق اور مستعد شاگرد مل گیا ہے، جسے وہ اپنے علم و دانش اور زندگی بھر کے تجربات سے فیض یاب کر سکتے ہیں۔

یہ مُسلّم ہے کہ ایک شاگرد کو جس قدر ایک بزرگ اور قابل اُستاد پا کر جتنی مسرت ہوتی ہے، اُستاد کو بھی ایک لائق شاگرد پا کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات

۱۔ مَدین کہاں تھا ؟ "مَدین" ایک شہر کا نام تھا جس میں حضرت شعیبؑ اور اُن کا قبیلہ رہتا تھا۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں تھا (یعنی حجاز کے شمال اور شامات کے جنوب میں) وہاں کے باشندے حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے تھے۔ وہ مصر، لبنان اور فلسطین سے تجارت کرتے تھے۔ آج کل اس شہر کا نام معان ہے۔

بعض لوگ کلمہ "مدین" کا اطلاق اُس قوم پر کرتے ہیں جو خلیج عقبہ سے کوہ سینا تک سکونت پذیر تھی۔ توریت میں بھی اِس قوم کو "مدیان" کہا گیا ہے۔

بعض اہلِ تحقیق نے اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ایک بیٹا جس کا نام "مدین" تھا اِس شہر میں رہتا تھا۔

اگر جغرافیائی نقشے کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا مصر سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے اس لیے حضرت موسیٰؑ چند روز میں وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔

مُلکِ اُردن کے جغرافیائی نقشہ میں، جنوب غربی شہروں میں سے ایک شہر "معان" نام کا ملتا ہے، جس کا محلِ وقوع ہمارے مذکورہ بالا بیان کے مطابق ہے۔

❖ ❖ ❖

۲۔ بہت سی سبق آموز باتیں : حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس حصے میں بکثرت سبق آموز باتیں ہیں :

(ل) پیمبرانِ خدا ہمیشہ مظلوموں کے حامی رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اُس زمانے میں بھی جبکہ وہ مصر میں تھے اور اُس وقت بھی جبکہ وہ مدین میں آگئے، غرض جہاں بھی وہ ظلم و ستم کا منظر دیکھتے تھے بے چین ہو جاتے تھے۔ اُن کا یہ عمل عین حق تھا کیونکہ بعثتِ انبیاء سے خدا کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

(ب) بعض اوقات انسان کا معمولی سا عملِ خیر کتنا پُر برکت ثابت ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے کنویں سے پانی کا صرف ایک ڈول کھینچا۔ اِس عمل سے اُن کا مقصد رضائے الٰہی کے حصول کے علاوہ کچھ نہ تھا لیکن یہ چھوٹا سا کام کس قدر پُر برکت ثابت ہوا ! کیونکہ یہی عملِ خیر اِس امر کا سبب ہوا کہ وہ پیغمبرِ خدا حضرت شعیبؑ کے مکان پر پہنچ گئے۔ اُنھیں احساسِ مسافرت سے نجات ملی اور ایک اطمینان بخش پناہ گاہ مل گئی۔ اُنھیں غذا، لباس اور ایک پاکدامن زوجہ بھی نصیب ہوئی۔ علاوہ بریں افضل ترین نعمت نصیب ہوئی کہ وہ دس سال کی مدت تک

(حض)رت شعیبؑ جیسے پیرِ روشن ضمیر کے انسان ساز مکتبِ تربیت میں رہ کر مخلوق کی رہبری کے لیے تیار ہو گئے۔

(ج) مردانِ خدا کسی کی خدمت کو بھی بالخصوص مزدوروں کی خدمت کو بے اجر و بے معاوضہ نہیں رہنے دیتے۔ اسی وجہ سے جب (ح)ضرت شعیبؑ نے اس اجنبی جوان کے متعلق سُنا کہ اس نے میری بھیڑوں کو پانی پلایا ہے تو چین سے نہ بیٹھے۔ فوراً اپنی بیٹی کو اُس کی تلاش (میں) بھیجا تاکہ اُس کی مزدوری ادا کریں۔

(د) حضرت موسٰیؑ کی زندگی میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یادِ خدا میں مشغول رہتے تھے اور ہر مشکل کے حل کے لیے اُسی سے (دُ)عا کرتے تھے۔

جس وقت ایک قبطی اُن کے ہاتھ سے مارا گیا اور ترکِ اَولیٰ سرزد ہوا تو اُنھوں نے خدا سے فوراً عفو اور مغفرت کی دُعا کی:

قال ربّ انّی ظلمت نفسی فاغفرلی

خدایا میں نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے تو مجھے معاف کر دے۔

اور جس وقت وہ ملکِ مصر سے باہر آئے تو دُعا کی:

قال رب نجّنی من القوم الظالمین

خدایا تو مجھے اس ستمگار قوم سے نجات دے۔

اور جس وقت وہ شہرِ مدین کی طرف روانہ ہوئے تو متوجہ الی اللہ ہو کر کہا:

قال عسٰی ربّی ان یهدینی سوآء السّبیل

مجھے اُمید ہے کہ خدا مجھے راہِ راست کی ہدایت کرے گا۔

اور جس وقت حضرت شعیب کی بھیڑوں کو سیراب کیا اور سائے میں آرام کرنے لگے تو خدا سے عرض کیا:

فقال ربّ انّی لما انزلت الیّ من خیرٍ فقیر

اے پروردگار تو مجھے جو بھی نعمت عطا کرے گا میں اُس کا محتاج ہوں۔

خصوصاً یہ آخری دُعا جو اُنھوں نے زندگی کے بُحرانی ترین وقت میں مانگی، نہایت مؤدبانہ، پُراطمینان اور سکون آمیز تھی۔ اُنھوں نے یہ نہیں (کہ)ا کہ خدایا میری حاجات کو روا فرما۔ بلکہ صرف یہ کہا کہ ـــــ "میں تیرے احسان اور خیر کا محتاج ہوں"۔

(س) یہ خیال نہ کیا جائے کہ حضرت موسٰیؑ صرف سختی کے وقت ہی خدا کو یاد کرتے تھے بلکہ قصرِ فرعون میں بھی جبکہ اُن کا وقت (ناز و) نعم میں گزر رہا تھا وہ خدا کو نہ بھُولے۔ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ ایک روز فرعون کے سامنے اُنھیں چھینک آگئی۔ تو اُنھوں نے فوراً "الحمد (للّ)ہ ربّ العالمین" کہا۔ فرعون یہ بات سُن کر ناراض ہو گیا اور اُن کے ایک تھپّڑ مارا۔ حضرت موسٰیؑ نے بھی جواب میں اُس کی لمبی داڑھی پکڑ کے کھینچی۔ (فر)عون کو اس پر سخت غصہ آیا اور اُنھیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا مگر اُس کی بیوی نے اُنھیں یہ کہہ کر بچا لیا کہ یہ ابھی بچّہ ہے اُسے ابھی کیا پتہ۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۱۷۔

۲۶۔ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۖ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝

۲۷۔ قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ۚ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

۲۸۔ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ۚ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اُن دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے ابّا جان آپ اسے ملازم رکھ لیجیے۔ کیونکہ بہترین ملازم جو آپ رکھ سکیں اسے توانا اور امین ہونا چاہیئے۔

۲۷۔ (شعیب نے موسٰی سے) کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کا تُم سے نکاح کر دوں۔ اس شرط پر کہ تم آٹھ سال تک میری خدمت کرو اور اگر دس سال پورے کرو تو وہ تمہاری طرف سے احسان ہے۔ میں تم سے کوئی سخت کام لینا نہیں چاہتا۔ ان شاء اللہ مجھے صالحین میں سے پاؤ گے۔

۲۸۔ (موسٰی نے) کہا (کوئی حرج نہیں۔ البتہ) میرے اور تمہارے درمیان یہ عہد ہے کہ میں ان مدتوں میں سے جونسی بھی میں تمام کروں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی (اور اس انتخابِ مدت میں میں آزاد ہوں گا) اور ہم جو معاہدہ کر رہے ہیں، خدا اُس پر گواہ ہے۔

تفسیر

حضرت موسٰیؑ حضرت شعیبؑ کے گھر میں:

اَب حضرت موسٰیؑ کی زندگی کے چھٹے دَور کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حضرت موسٰیؑ جناب شعیبؑ کے گھر آگئے۔ یہ ایک سادہ سا دیہاتی مکان تھا، مکان صاف سُتھرا تھا۔ اور رُوحانیت سے معمور تھا۔ جب حضرت موسٰیؑ نے جناب شعیبؑ کو اپنی سرگزشت سُنائی تو اُن کی ایک لڑکی

ایک مختصر مگر پُرمعنیٰ عبارت میں اپنے والد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ موسٰی کو بھیڑوں کی حفاظت کے لیے ملازم رکھ لیں۔ وہ الفاظ یہ تھے :

اے بابا ! آپ اس جوان کو ملازم رکھ لیں۔ کیونکہ ایک بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھ سکتے ہیں، وہ ایسا ہونا چاہیئے جو قوی اور ن ہو اور اس نے اپنی طاقت اور نیک خصلت دونوں کا امتحان دے دیا ہے : (قالت احداهما یاابت استأجره ان خير ن استأجرت القوی الامین)۔

جس لڑکی نے ایک پیغمبر کے زیر سایہ تربیت پائی ہو اُسے ایسی ہی مؤدبانہ اور سوچی سمجھی بات کہنی چاہیئے نیز چاہیئے کہ مختصر الفاظ اور تھوڑی عبارت میں اپنا مطلب ادا کر دے۔

اس لڑکی کو کیسے معلوم تھا کہ یہ جوان طاقتور بھی ہے اور نیک خصلت بھی۔ کیونکہ اس نے پہلی بار کنویں پر ہی اُسے دیکھا تھا اور اُس کی شتہ زندگی کے حالات سے وہ بے خبر تھی ؟

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ اُس لڑکی نے اُس جوان کی قوت کو تو اُسی وقت سمجھ لیا تھا جب اُس نے ان مظلوم لڑکیوں کا حق دلانے ے لیے چرواہوں کو کنویں سے ایک طرف ہٹایا تھا۔ اور اُس بھاری ڈول کو اکیلے ہی کنویں سے کھینچ لیا تھا اور اُس کی امانت اور نیک چلنی وقت معلوم ہو گئی تھی کہ حضرت شعیبؑ کے گھر کی راہ میں اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک جوان لڑکی اُس کے آگے آگے چلے۔ کیونکہ ممکن تھا کہ ہوا سے اُس کا لباس جسم سے ہٹ جائے[1]

علاوہ بریں اُس نوجوان نے اپنی جو سرگزشت سنائی تھی اُس کے ضمن میں قبطیوں سے لڑائی کے ذکر میں اُس کی قوت کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ س کی امانت و دیانت کی یہ شہادت کافی تھی کہ اُس نے ظالموں کی ہم نوائی نہ کی اور اُن کی ستم رانی پر اظہار رضامندی نہ کیا۔

* * *

حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی کی تجویز کو قبول کر لیا۔ اُنھوں نے موسیٰؑ کی طرف رُخ کر کے یوں کہا : میرا ارادہ ہے کہ اپنی ان دو لڑکیوں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کر دوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ تُو آٹھ سال تک میری خدمت کرے : (قال انی ارید ان کحك احدی ابنتی هاتین علی ان تأجرنی ثمنی حجج)[2]

اس کے بعد یہ اضافہ کیا۔ " اگر تو آٹھ سال کی بجائے یہ خدمت دس سال کر دے تو یہ تیرا احسان ہوگا۔ مگر تجھ پر واجب نہیں ہے : ان اتممت عشرًا فمن عندك)۔

بہرحال میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سے کوئی مشکل کام لوں۔ ان شاء اللہ تم جلد دیکھو گے کہ میں صالحین میں سے ہوں، اپنے عہد و پیمان میں ار ہوں۔ تیرے ساتھ ہرگز سخت گیری نہ کروں گا اور تیرے ساتھ خیر اور نیکی کا سلوک کروں گا : (وما ارید ان اشق علیك ستجدنی شاء اللہ من الصالحین)۔

---

[1] علی بن ابراہیم کی تفسیر میں یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی بیٹی سے یہ سوال کیا کہ اس جوان کی قوت کا حال تو کنویں سے بڑا ڈول کھینچنے سے معلوم ہو گیا، تمہیں اُس کی امانت کا حال کیسے معلوم ہوا تو لڑکی نے جواب دیا کہ اُس نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ عورتوں کی کمر پر بھی نگاہ ڈالے۔ (تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۱۲۳)

[2] "حجج" جمع "حجۃ" کی جس کے معنی ہیں ایک سال" عربوں کا معمول یہ تھا کہ ہر سال کے بعد ایک حج کرتے تھے۔ یہ رسم حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلی آتی تھی۔

حضرت شعیبؑ کی طرف سے اس تجویز کے ضمن میں، ازدواج، مہر اور اس کی جملہ خصوصیات کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن پر ان شاء اللہ نکات کے ضمن میں بحث ہوگی۔

* * *

حضرت موسیٰؑ نے اس تجویز اور شرط سے موافقت کرتے ہوئے اور عقد کو قبول کرتے ہوئے کہا : " میرے اور آپ کے درمیان یہ عہد ہے " : (قال ذلك بینی و بینك)۔

البتہ ان دو مدتوں میں سے (آٹھ سال یا دس سال) جس مدت تک بھی خدمت کروں، مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی اور میں اُس کے انتخاب میں آزاد ہوں : (ایما الاجلین قضیت فلا عدوان علیّ)۔

عہد کو پختہ اور خدا کے نام سے طلب مدد کے لیے یہ اضافہ کیا : جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا اُس پر شاہد ہے : (واللہ علی ما نقول وکیل)۔

چند اہم نکات

۱۔ **ادارتِ کار کی درستی کے لیے دو بنیادی شرائط** : آیاتِ مذکور بالا میں، حضرت موسیٰؑ کو ملازم رکھنے کے بارے میں، حضرت شعیبؑ کی دُختر کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے ہیں، اُن میں کسی کام کو ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے کے لیے دو اہم ترین شرائط نہایت مختصر اور جامع صُورت میں بیان ہوئی ہیں۔ اور وہ ہیں " **قدرت** اور **امانت** "

یہ امر بدیہی ہے کہ **قدرت** سے مراد صرف جسمانی قوت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انسان میں محولہ کام کو سرانجام دینے کی استعداد ہو۔ مثلاً ایک قوی اور امین طبیب وہ ہے جو اپنے کام سے آگاہ اور اس پر حاوی ہو۔

ایک قوی سربراہِ ادارہ وہ ہے جو اپنے فرائض منصبی سے خُوب واقف ہو، دفتری کام کے مقاصد سے باخبر ہو، ترتیب کار کا پروگرام بنانے میں ماہر ہو، اس میں بقدر کافی ایجاد و اختراع کی قابلیت ہو، کام کو منظم کرنے کی مہارت رکھتا ہو، اُس کے ذہن میں غایت کار واضح ہو اور اپنی تمام طاقتوں کو مقصد تک پہنچنے کے لیے استعمال میں لائے۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود وہ ہمدرد، خیر خواہ، امین اور اپنے کام میں دیانتدار بھی ہو۔

وہ لوگ جو کسی کو کوئی ذمہ داری سپرد کرتے وقت صرف اُس کی امانت اور درست کرداری پر قناعت کر لیتے ہیں وہ بھی اُسی طرح غلط فہمی میں ہیں جیسے کہ وہ لوگ جو کسی کی مہارتِ خصوصی دیکھ کر اُس پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔

خائن ماہرینِ خصوصی اور بد دیانت واقفانِ کار ویسا ہی نقصان پہنچاتے ہیں جیسا کہ نا اہل اور نا واقفانِ کار ایماندار لوگ۔

اگر ہم کسی ملک کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے انتظامی فرائض کو مذکورہ بالا گروہوں میں سے کسی ایک کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ سربراہ ادارہ خائن ہو اور صالح کردار کے لوگوں کو ذمہ داریوں سے محروم رکھا جائے۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں ایک ہے۔

اسلامی مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ ہر کام اُس کے اہل اور امانت دار آدمی کے ہاتھ میں ہو تا کہ معاشرے کا نظام درست رہے۔ اگر ہم پُوری تاریخ میں حکومتوں کے زوال کے اسباب پر غور کریں تو اُن کی بُنیادی علت یہی پائیں گے کہ کاروبارِ سلطنت مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے

کسی ایک کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

یہ اَمر قابلِ توجہ ہے کہ اِسلام میں اہلیت کار کی خصوصیات میں ہر جگہ "علم اور تقویٰ" کو ہم دوش لازم قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً مرجع تقلید کو مجتہد اور عادل ہونا چاہیئے۔ قاضی اور رہنمائے قوم کو مجتہد اور عادل ہونا چاہیئے (ان شرائط کے علاوہ کچھ اور بھی شرائط ہیں۔ مگر بنیادی شرائط یہی دونوں ہیں یعنی "عدالت و تقویٰ اور علم و آگہی")۔

❁ ❁ ❁

۲۔ حضرت شعیبؑ کا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح

: مذکورہ بالا آیات کو پڑھ کر ذہن میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جن کے بے کم و کاست جوابات دیتے ہیں۔

ا۔ کیا فقہی اعتبار سے یہ درست ہے کہ وہ لڑکی جس کا کسی کے ساتھ نکاح کرنا ہے اُس کا ماقبل تعیّن نہ ہو۔ بلکہ صیغۂ عقد کے اجرا کے وقت کہا جائے کہ:۔

"مَیں ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا تیرے ساتھ نکاح کرتا ہوں۔"

جواب: یہ ہے کہ یہ واضح نہیں ہے کہ مذکورہ الفاظ اجرائے صیغہ کے وقت کہے گئے ہوں گے۔ بلکہ سیاقِ عبارت سے ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی گفتگو ہے، جسے اصطلاح میں "مقاولہ" کہتے ہیں تاکہ موسیٰؑ کی رضامندی کے بعد طرفین ایک دوسرے کو انتخاب کریں۔ پھر صیغۂ عقد جاری ہو جائے۔

ب۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مہر کو غیر طے شدہ حالت میں یا کم اور زیادہ کے درمیان مشکوک حالت میں رکھا جائے۔

جواب: آیت کے لب و لہجہ سے یہ امر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے مہر آٹھ سال کی خدمت طے کی تھی۔ اُسے دس سال تک بڑھا دینا حضرت موسیٰؑ کی مرضی پر منحصر تھا۔

ج۔ کیا اصولاً کام اور خدمت کو مہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیز ایسی عورت سے ہم بستری کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ابھی اُس کا تمام مہر ادا کرنے کا وقت ہی نہیں آیا حتیٰ کہ شوہر کی اتنی بضاعت ہی نہیں ہے کہ کُل مہر یکشت ادا کر دے۔

جواب: ایسے مہر کے عدمِ جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ ہماری شریعت میں ہر وہ شئی جس کی کچھ قیمت ہو اُس پر مہر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ شوہر کے لیے یہ بھی لازم نہیں کہ وہ کُل مہر بیک وقت ادا کر دے۔ اتنا ہی کافی ہے کہ حقِ مہر ادا کرنے کا شوہر ذمّہ دار ہو اور بیوی اس کی مالک ہو جائے۔ شوہر کی درستیٔ صحت اور اُس کا اپنی بیوی کی رفاقت میں رہنا بھی اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہے گا اور اُس میں اتنی قدرت ہوگی کہ وہ حقِ مہر ادا کر سکے گا۔[1]

د۔ یہ بات اصولاً کس طرح ممکن ہے کہ باپ کی خدمت بیٹی کا حقِ مہر قرار دیا جا سکے۔ کیا بیٹی بھی کوئی متاع ہے جسے حقِ خدمت کے عوض فروخت کر دیا جائے۔[2]

---

[1] جواب شریعتِ اسلامی کی روشنی میں دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شریعتِ ابراہیمی میں (جو حضرت موسیٰؑ سے قبل رائج تھی) حقِ مہر کی شرائط کچھ اور ہوں۔

[2] مرحوم محقق حلّی شرائع الاسلام میں کہتے ہیں:۔ آزاد شخص کی منفعت پر عقد صحیح ہے مثلاً بطور مہر کوئی صنعت سکھا دے یا قرآن کی کوئی سورۃ پڑھا دے اور ہر حلال عمل پر اور شوہر کو معینہ مدت کے لیے اجیر بنانے پر۔ اور مرحوم فقیہ بزرگوار صاحب جواہر اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ علماء مشہور اس رائے سے متفق ہیں۔

جواب: اس میں شک نہیں کہ حضرت شعیبؑ نے اس مسئلے میں اپنی بیٹی کی رضامندی حاصل کر لی تھی اور وہ اس قسم کے عقد کو جاری کرنے کے لیے وکیل تھے۔

اس مسئلے کی ایک اور توجیہہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ذمہ جو مہر تھا حقیقت میں اُس کی اصل مالک حضرت شعیبؑ کی لڑکی ہی تھی مگر چونکہ خاندان مشترکہ اور اُن کی زندگی نہایت خلوص اور محبت سے گزرتی تھی، آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہ تھا (جیسا کہ اب بھی قدیمی خاندانوں یا دیہات میں دیکھا جاتا ہے کہ گھر کے تمام افراد مل جُل کر رہتے ہیں) اس لیے وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ حقِ مہر کون لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مہر کی مالک صرف لڑکی ہی ہے نہ کہ باپ اور حضرت موسیٰؑ کی خدمت بھی لڑکی ہی کے لیے تھی۔

ہ۔ حضرت شعیبؑ کی دختر کا مہر نسبتاً بہت زیادہ تھا۔ اگر آج کے حساب سے ایک مزدور کی مزدوری کا ایک ماہ اور پھر ایک سال میں حساب کریں اور پھر اس کو آٹھ سے ضرب دیں تو بہت ساری رقم بن جاتی ہے۔

جواب: اوّل تو یہ کہ یہ ازدواج کوئی معمولی رسم نہ تھی بلکہ موسیٰ کا حضرت شعیبؑ کے زیرِ تربیت رہنے کے لیے اسبابِ اوّلیہ میں سے تھا اور یہ ایک ذریعہ تھا جس سے موسیٰ حضرت شعیبؑ کے دارالعلم میں رہ کر نصابِ تعلیم کو پُورا کریں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طویل مدّت میں موسیٰ نے پیرِ مدین سے کیا کچھ حاصل کیا۔

علاوہ بریں اگر حضرت موسیٰؑ اس مدّت میں حضرت شعیبؑ ہی کے لیے کام کرتے اور اُس کے عوض میں حضرت شعیبؑ موسیٰؑ اور اُن کی زوجہ کے کفیل رہتے تو اُنھوں نے موسیٰ اور ان کی اہلیہ پر جو کچھ کیا اُسے کام کی مزدوری میں سے نفی کریں تو کچھ زیادہ رقم باقی نہ رہے گی اور پھر مہر بہت خفیف رہ جائے گا۔

❁ ❁ ❁

۳۔ ایک مروجہ رسم کی نفی

: اس داستان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو ہمارے معاشرے میں باپ یا لڑکی کے وارثین کی طرف سے لڑکے کو پیام دینا عیب سمجھا جاتا ہے، درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شرع مانع نہیں ہے کہ لڑکی والے اگر کسی لڑکے کو لائق اور قابل سمجھتے ہیں تو اُسے پیغام دے دیں۔ جیسا کہ حضرت شعیبؑ نے کیا۔ نیز بزرگانِ اسلام کے حالاتِ زندگی میں بھی ایسی نظیریں ملتی ہیں۔

❁ ❁ ❁

حضرت شعیبؑ کی لڑکیوں کا نام "صفورہ" (یا صفورا) اور "لیّا" بتایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی شادی "صفورہ" سے ہوئی تھی۔

۲. فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○

۲. فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ

۲. وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ○

۲. اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ○

۲. قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ○

۲. وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ ۫ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ○

۲. قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ○

ترجمہ

۲۹. جب موسٰی نے مدت پوری کردی اور اپنے خاندان کے ساتھ (مدین سے مصر کی طرف) روانہ ہوا تو اس نے طور کی طرف سے آگ دیکھی۔ اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ تم یہاں ٹھہرو، مَیں نے آگ دیکھی ہے شاید مَیں وہاں سے تمہارے لیے کچھ خبر لاؤں یا آگ کا کوئی انگارا لے آؤں تاکہ تم اُس سے گرم ہو جاؤ۔

۳۰. جب اُس کے پاس پہنچا تو ناگہاں میدان کے داہنے کنارے سے اُس بابرکت و بلند زمین میں ایک درخت میں سے آواز آئی۔ " اے موسٰی! مَیں اللہ رب العالمین ہوں۔"

۳۱. تو اپنی لاٹھی کو ڈال دے۔ (جب موسٰی نے عصا کو ڈال دیا تو) دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کر رہی ہے۔ موسٰی کو خوف ہوا اور وہ رُخ موڑ کر چل پڑا اور پھر منہ پھیر کے بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسٰی! واپس آ اور نہ ڈر تو امان میں ہے۔

۳۲. اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال۔ تو جب تُو اسے نکالے گا، وہ بغیر کسی عیب کے سفید اور چمکدار ہو گا۔ اپنے ہاتھوں کو اپنے سینہ پر رکھ تاکہ خوف تجھ سے دُور ہو۔ اور خدا کی طرف سے یہ دو روشن دلیلیں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے ہیں کیونکہ وہ سب فاسق ہیں۔

۳۳. موسٰی نے عرض کیا مَیں نے اُن میں سے ایک فرد کو قتل کیا ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

۳۴. میرا بھائی ہارون اُس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے تو اُسے میرے ساتھ بھیج تاکہ وہ میری تصدیق کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔

۳۵. (خدا نے فرمایا) ہم تیرے بازوؤں کو تیرے بھائی کے وسیلے سے مضبوط کریں گے اور تمہیں غلبہ اور برتری عنایت کریں گے اور ہماری نشانیوں کی برکت سے وہ تم پر غالب نہ ہو سکیں گے۔ تم اور تمہاری پیروی کرنے والے غالب رہیں گے۔

تفسیر

وحی کی تابشِ اوّل :

اس مقام پر اس داستان کا ساتواں منظر ہمارے پیشِ نظر ہے۔

کوئی آدمی بھی حقیقتاً یہ نہیں جانتا کہ ان دس سال میں حضرت موسٰیؑ پر کیا گزری۔ لیکن بلاشک یہ دس سال حضرت موسٰیؑ کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ یہ سال دلچسپ، شیریں اور آرام بخش تھے نیز یہ دس سال ایک منصب عظیم کی ذمہ داری کے لیے تربیت اور تیاری کے تھے۔ درحقیقت اس کی ضرورت بھی تھی کہ موسٰیؑ دس سال کا عرصہ عالم مسافرت اور ایک بزرگ پیغمبر کی صحبت میں بسر کریں اور چرواہے کا کام

کریں تاکہ اُن کے دل و دماغ سے محلات کی ناز پروردہ زندگی کا اثر بالکل محو ہو جائے۔ حضرت موسیٰؑ کو اتنا عرصہ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے ساتھ گزارنا ضروری تھا تاکہ اُن کی تکالیف اور مشکلات سے آگاہ ہو جائے اور ساکنانِ محلات کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔[1]

ایک اور بات بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اسرارِ آفرینش میں غور کرنے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے بھی ایک طویل وقت کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے بیابانِ مدین اور خانۂ شعیبؑ سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک اُولوالعزم پیغمبر کی بعثت کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ یہ مقام کسی کو نہایت آسانی سے نصیب ہو جائے۔ بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد تمام پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰؑ کی ذمہ داری ایک لحاظ سے سب سے زیادہ اہم تھی۔ اس لیے کہ :-

روئے زمین کے ظالم ترین لوگوں سے مقابلہ کرنا، ایک کثیر الافراد قوم کی مدّتِ اسیری کو ختم کرنا،

اور اُن کے اندر سے ایامِ اسیری میں پیدا ہو جانے والے نقائص کو محو کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

توریت اور اسی طرح اسلامی روایات میں مذکور ہے کہ حضرت شعیبؑ نے موسیٰؑ کی مخلصانہ خدمات کی قدر شناسی کے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ بھیڑوں کے جو بچے ایک خاص علامت کے ساتھ پیدا ہوں گے، وہ موسیٰؑ کو دے دیں گے ۔ اتفاقاً مدّتِ موعود کے آخری سال میں جبکہ موسیٰؑ حضرت شعیبؑ سے رخصت ہو کر ملکِ مصر کو جانا چاہتے تھے تو تمام یا زیادہ تر بچے اُسی علامت کے پیدا ہوئے اور حضرت شعیبؑ نے اُنھیں بڑی محبت سے موسیٰ کو دے دیا۔[2]

یہ امر بدیہی ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنی ساری زندگی چرواہے بنے رہنے پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔ ہرچند اُن کے لیے حضرت شعیبؑ کے پاس رہنا بہت ہی مُغتنم تھا مگر وہ اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ اپنی اُس قوم کی مدد کے لیے جائیں جو غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہے اور جہالت و نادانی اور بے خبری میں غرق ہے۔

حضرت موسیٰؑ اپنا یہ فرض بھی سمجھتے تھے کہ مصر میں جو ظلم کا بازار گرم ہے اُسے سرد کر دیں، طاغوتیوں کو ذلیل کریں اور توفیقِ الٰہی سے مظلوموں کو عزّت بخشیں۔ اُن کے قلب میں یہی احساس تھا جو اُنھیں مصر جانے پر آمادہ کر رہا تھا۔

آخرکار اُنھوں نے اپنے اہلِ خانہ، سامان و اسباب اور اپنی بھیڑوں کو ساتھ لیا اور رختِ سفر باندھا اور روانہ ہو گئے۔

متعدد آیاتِ قرآنی میں کلمہ "اھل" آیا ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اُن کی زوجہ کے علاوہ کوئی لڑکا یا کوئی اور اولاد بھی تھی۔ اسلامی روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ توریت کے "سفرِ خروج" میں بھی ذکر مفصل موجود ہے۔ علاوہ ازیں اُس وقت اُن کی زوجہ اُمید سے تھی۔

جب حضرت موسیٰؑ مدین سے مصر کو جا رہے تھے تو راستہ بھول گئے۔ یا غالباً شام کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جانے کے خوف سے بوجہ احتیاط مروج راستے کو چھوڑ کے سفر کر رہے تھے۔

بہرکیف قرآن شریف میں یہ بیان اس طور سے ہے کہ : جب موسیٰ اپنی مدّت کو ختم کر چکے اور اپنے خاندان کو ساتھ لے کر سفر پر روانہ

---

[1] اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دس سال حضرت شعیبؑ کی خدمت کی۔ یہ ذکر کتاب وسائل الشیعہ، جلد ۱۵ ص ۳۲ (کتاب النکاح ابواب المھور باب ۲۲ حدیث ۴) میں آیا ہے۔

[2] اعلام قرآن ص ۴۰۹۔

ہو گئے تو اُنھیں طور کی جانب سے شعلۂ آتش نظر آیا: (فلما قضٰی موسی الاجل وسار باھلہ انس من جانب الطور نارًا)۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہلِ خاندان سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو" مجھے آگ نظر آئی ہے۔ مَیں جاتا ہوں۔ شاید تمہارے لیے وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا آگ کا ایک انگارا لے آؤں تاکہ تم اُس سے گرم ہو جاؤ: (قال لاھلہ امکثوا انی اٰنست نارًا لعلی اٰتیکم منھا بخبر او جذوۃ من النار لعلکم تصطلون)۔

"اٰنست" "ایناس" سے مشتق ہے جس کے معنیٰ مشاہدہ کرنے اور سکون و آرام سے دیکھنے کے ہیں۔

"جَذوۃ" "آگ کا ایک انگارا" بعض لوگوں نے اس کے معنیٰ "ایندھن کا بڑا ٹکڑا" لکھے ہیں۔ اور "اٰتیکم بخبر" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ بھول گئے تھے اور "لعلکم تصطلون" یہ اشارہ کر رہا ہے کہ سرد اور تکلیف دہ رات تھی۔

قرآن کی آیت میں حضرت موسیٰؑ کی زوجہ کی حالت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر تفاسیر اور روایات میں مذکور ہے کہ وہ اُمید سے تھیں اور انہیں دردِ زہ ہو رہا تھا۔ اس لیے موسیٰ پریشان تھے۔

❊ ❊ ❊

حضرت موسیٰؑ جس وقت آگ کی تلاش میں نکلے تو اُنھوں نے دیکھا کہ :-

آگ تو ہے مگر معمول کی سی آگ نہیں ہے بلکہ حرارت اور سوزش سے خالی ہے۔ وہ نُور اور تابندگی کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی تھی۔

حضرت موسیٰؑ اِس منظر سے نہایت حیران تھے کہ ناگہاں اُس پُر برکت سرزمینِ بلند میں وادی کے داہنی جانب سے ایک درخت میں سے آواز آئی : اے موسیٰ مَیں اللہ ربُّ العالمین ہوں (فلما اتاھا نودی من شاطئ الوادِ الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یا موسٰی انی انا اللہ رب العالمین)۔

شاطئ : بمعنی ساحل۔

وادی : بمعنی درّہ یا پہاڑ میں وہ راستہ جہاں سے سیلاب گزرتا ہے۔

ایمن : جانب راست اور یہ "شاطی" کی صفت ہے۔

بُقعۃ : زمین کا وہ حصّہ جو اطراف کی زمین سے ممتاز ہو۔

اس میں شک نہیں کہ یہ خدا کے اختیار میں ہے کہ جس چیز میں چاہے قوّتِ کلام پیدا کر دے۔ یہاں اللہ نے درخت میں یہ استعداد پیدا کر دی۔ کیونکہ اللہ موسیٰؑ سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ موسیٰؑ گوشت پوست کے انسان تھے، کان رکھتے تھے اور سُننے کے لیے انہیں امواجِ صوت کی ضرورت تھی۔ البتہ انبیاءؑ پر اکثر یہ حالت بھی گزری ہے کہ وہ بطور الہام دُرونی پیغامِ الٰہی کو حاصل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح کبھی اُنھیں خواب میں بھی ہدایت ہوتی رہی ہے۔ مگر کبھی وہ وحی کو بصورت صدا بھی سُنتے رہے ہیں۔ بہرکیف حضرت موسیٰؑ نے جو آواز سُنی اُس سے ہم ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ خدا جسم رکھتا ہے۔

بعض روایات میں مذکور ہے کہ موسیٰؑ جب آگ کے پاس گئے اور غور کیا تو دیکھا کہ درخت کی سبز شاخوں میں آگ چمک رہی ہے۔ اور لحظہ بہ لحظہ اُس کی تابش اور درخشندگی بڑھتی جاتی ہے۔ جو عصا اُن کے ہاتھ میں تھا اُس کے سہارے جُھکے تاکہ اس میں سے تھوڑی سی آگ

لے لیں۔ تو آگ موسیٰ کی طرف بڑھی۔ موسیٰ ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ کبھی موسیٰ آگ کی طرف بڑھتے تھے اور کبھی آگ ان کی طرف۔ اسی کشمکش میں ناگہاں ایک صدا بلند ہوئی ــــ اور اُنھیں وحی کی بشارت دی گئی۔

اس طرح ناقابلِ انکار قرائن سے حضرت موسیٰؑ کو یقین ہوگیا کہ یہ آواز خدا ہی کی ہے، کسی غیر کی نہیں ہے۔ لیکن اُس عظیم ذمّہ داری کے اعتبار سے جو موسیٰؑ پر عائد کی گئی تھی لازم تھا کہ اُسی کے مطابق اُنھیں خدا کی طرف سے معجزات بھی عطا کیے جائیں۔ چنانچہ ان آیات میں دو اہم معجزات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ موسیٰ سے کہا گیا کہ: "اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو"۔ چنانچہ موسیٰ نے عصا کو پھینک دیا۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عصا سانپ کی طرح تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر موسیٰ ڈرے اور پیچھے ہٹ گئے۔ یہاں تک کہ مڑ کے بھی نہ دیکھا: (وان الق عصاك فلما راٰها تهتز كانها جآنّ ولّٰى مدبرًا ولم يعقب)۔

جس دن حضرت موسیٰؑ نے یہ عصا لیا تھا تاکہ تھکن کے وقت اُس کا سہارا لے لیا کریں اور بھیڑوں کے لیے اُس سے پتے جھاڑ لیا کریں اُنھیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ قدرتِ خدا سے اُس میں یہ خاصیت بھی چھپی ہوئی ہوگی اور یہ بھیڑوں کو چرانے کی لاٹھی ظالموں کے محل کو ہلا دے گی۔

موجوداتِ عالم کا یہی حال ہے کہ وہ بعض اوقات ہماری نظر میں بہت حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر اُن میں بڑی بڑی استعداد چھپی ہوتی ہے جو کسی وقت خدا کے حکم سے ظاہر ہوتی ہے۔

اب موسیٰ نے دوبارہ آواز سنی جو اُن سے کہہ رہی تھی: واپس آ اور نہ ڈر تو امان میں ہے (یاموسٰی اقبل ولا تخف انك من الاٰمنین)۔

"جان" دراصل اُس شے کو کہتے ہیں جو موجود تو ہو مگر نظر نہ آتی ہو۔ مجازاً "جان" اُن چھوٹے سانپوں کو کہتے ہیں جو گھاس کے ڈھیر یا زمین کے ڈانڈوں کے اندر سے گزرتے ہیں۔

البتہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں "ثعبان مبین" (واضح اژدھا) بھی کہا گیا ہے۔ (اعراف - ۱۰۷، شعراء - ۳۲)

ہم نے قبل ازیں کہا ہے کہ اُس سانپ کے لیے جو یہ دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ممکن ہے اُس کی دو مختلف حالتوں کے لیے ہوں کہ ابتدا میں وہ چھوٹا سا ہو اور پھر ایک بڑا اژدھا بن گیا ہو۔ اس مقام پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ موسیٰؑ نے جب وادیٔ طور میں اُسے پہلی بار دیکھا تو چھوٹا سا سانپ تھا، رفتہ رفتہ وہ بڑا ہوگیا۔

بہرحال حضرت موسیٰؑ پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ درگاہ ربُّ العزّت میں مطلق امن و امان ہے اور کسی قسم کے خوف و خطر کا مقام نہیں ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو جو معجزات عطا کیے گئے اُن میں سے پہلا معجزہ خوف کی علامت پر مشتمل تھا۔ اُس کے بعد موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اب ایک دوسرا معجزہ حاصل کرو جو نور و اُمید کی علامت ہوگا۔ اور یہ دونوں معجزے گویا "انذار اور بشارت" تھے۔

موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور باہر نکالو۔ موسیٰ نے جب گریبان میں سے ہاتھ باہر نکالا تو وہ سفید تھا اور چمک رہا تھا اور اُس میں کوئی عیب اور نقص نہ تھا: (اُسلك يدك فى جيبك تخرج بيضآء من غير سوٓء)۔

حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں یہ سفیدی اور چمک کسی بیماری (مثلاً برص یا کوئی اسی جیسی چیز) کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ یہ نورِ الٰہی تھا جو بالکل ایک نئی قسم کا تھا۔

جب حضرت موسیٰؑ نے اُس سنسان کوہسار اور اُس تاریک رات میں یہ دو خارقِ عادت اور خلافِ معمول چیزیں دیکھیں تو اُن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ چنانچہ اس لیے کہ اُن کا اطمینانِ قلب واپس آجائے اُنھیں حکم دیا گیا کہ اپنے سینے پر اپنا ہاتھ پھیریں تاکہ دل کو راحت ہو جائے: (واضمم اليك جناحك من الرهب)۔

مذکورہ آیت کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد ہے کہ موسیٰ اپنے فرض کی ادائیگی اور پیامِ الٰہی کے پہنچانے میں ثابت قدم اور راسخ العزم رہیں اور کسی مقام اور دُنیا کی کسی طاقت سے خوف نہ کھائیں۔

بعض حضرات کا ذہن اِس طرف منتقل ہوا ہے کہ جس وقت عصا نے سانپ کی شکل اختیار کر لی تو موسیٰ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ اپنی مدافعت کریں لیکن خدا نے اُنھیں حکم دیا کہ اپنا ہاتھ روک لو اور نہ ڈرو، مدافعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہاتھ کی بجائے یہاں جناح (بازو) کا استعمال نہایت فصیح ہے۔ غالباً اِس تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی حالت اُس پرندہ کی سی ہے کہ جب وہ کوئی خوفناک منظر دیکھتا ہے تو اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے لیکن جب وہ بحالتِ سکون میں ہوتا ہے تو اپنے پَر اور بازو سمیٹ لیتا ہے۔

اُس کے بعد موسیٰ نے پھر وہی صدا سُنی جو کہہ رہی تھی: خدا کی طرف سے تجھے یہ دو دلیلیں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے کے لیے دی جا رہی ہیں کیونکہ وہ سب لوگ فاسق تھے اور ہیں: (فذانك برهانان من ربّك الٰى فرعون وملاۡئه انهم كانوا قومًا فاسقين)۔

یہ لوگ خدا کی اطاعت سے نکل گئے ہیں اور سرکشی کی انتہا تک جا پہنچے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ اُنھیں نصیحت کرو اور راہِ راست کی تبلیغ کرو اور اگر وہ تمہاری بات نہ مانیں تو اُن سے جنگ کرو۔

٭ ٭ ٭

اِس موقع پر موسیٰؑ کو اپنی زندگی کا وہ اہم حادثہ یاد آگیا جو مصر میں پیش آیا تھا۔ یعنی ایک قبطی کو قتل کرنا۔ اور فرعون کی پولیس کا اُس قبطی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے پختہ ارادہ۔ اگرچہ موسیٰؑ ایک مظلوم کی حمایت میں اُس قبطی سے لڑے تھے مگر فرعون کی منطق میں یہ عُذر بے معنی تھا۔ وہ اب بھی تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اگر موسیٰؑ اُسے کہیں مل جائیں تو اُنھیں بے چون و چرا قتل کرا دے۔ اس لیے موسیٰ عرض کرتے ہیں: خدایا! میں نے تو اُن میں سے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ اُس کے انتقام میں مجھے قتل کر دیں گے اور میں اپنا فرض ادا نہ کر سکوں گا: (قال ربّ انى قتلت منهم نفسًا فاخاف ان يقتلون)۔

(حضرت موسیٰؑ نے درگاہِ باری تعالیٰ میں عرض کی) علاوہ بریں میں تنہا ہوں اور میری زبان بھی فصیح نہیں ہے۔ تو میرے بھائی ہارون کو بھی میرے ساتھ بھیج کہ وہ مجھ سے زیادہ فصیح زبان ہے تاکہ وہ میری مدد کرے اور تصدیق بھی۔ مجھے اِس بات کا خوف ہے کہ میں تنہا ہوں گا تو لوگ مجھے جھٹلائیں گے: (واخى هارون هو افصح منى لسانًا فارسله معى ردءًا يصدقنى انى اخاف ان يكذبون)۔

"افصح" کا مادہ "فصیح" ہے۔ اِس کے لغوی معنی کسی چیز کے خالص ہونے کے ہیں۔ مراد ہے "سخنِ خالص" یعنی ہر قسم کے حشو و زواید سے خالی۔

" ردء " یعنی معین و یاور۔

بہرحال چونکہ یہ ماموریت بہت اہم اور عظیم تھی، اس لیے حضرت موسیٰؑ کی آرزو تھی کہ اُنھیں شکست ہرگز نہ ہو۔ اس لیے اُنھوں نے اللہ سے یہ تقاضا کیا۔

٭ ٭ ٭

خدا نے بھی اُن کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اُنھیں اطمینان دلایا اور فرمایا: ہم تمہارے بازوؤں کو تمہارے بھائی کے وسیلے سے محکم کریں گے: (قال سنشد عضدك باخيك)۔
اور تمہیں ہر مرحلے پر غلبہ اور برتری عطا کریں گے: (ونجعل لكما سلطانًا)۔
قطعی مطمئن رہو! وہ لوگ ہرگز تم پر غالب نہ ہوں گے اور ان معجزوں کی برکت سے وہ نہ تو تم پر مسلط ہوں گے نہ تمہارے مقابلے میں فتح مند ہوں گے: (فلا يصلون اليكما باٰياتنا)۔
بلکہ تم اور تمہارے پیرو ہی غالب اور فیروز مند رہیں گے: (انتما ومن اتبعكما الغالبون)۔
یہ کیسی عظیم نوید اور کتنی بزرگ بشارت تھی۔ ایسی نوید و بشارت جس نے موسیٰ کے دل کو گرم، اُن کے ارادہ کو پختہ اور عزم کو محکم کر دیا۔ اس نوید کے روشن اثرات کو ہم اس داستان کے آئندہ بیان میں دیکھیں گے۔[1]

[1] اسی حوالے سے تفسیر نمونہ کی جلد ۷، ۴ اور ۸ میں بالترتیب سورۂ طٰہٰ، اعراف اور شعراء کی تفسیر میں مزید مباحث بھی موجود ہیں۔

۳۶۔ فَلَمَّا جَآءَهُم مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○

۳۷۔ وَقَالَ مُوسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۶۔ جس وقت موسیٰ ہمارے روشن معجزات لے کر اُن کے پاس آیا تو اُنھوں نے کہا: یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جسے غلط طور پر خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے اور ہم نے اپنے گزشتہ بزرگوں میں کوئی ایسی بات نہیں سُنی۔

۳۷۔ موسیٰ نے کہا: میرا خدا اُن لوگوں کو جو اُس کی طرف سے ہدایت لائے ہیں اور اُن لوگوں کو جن کے لیے آخر کار دنیا و آخرت کا گھر ہے، خوب جانتا ہے۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔

تفسیر

موسیٰ فرعون کے مقابلے میں:

اس مقام پر اس رُوداد کا آٹھواں حصہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو اُس مقدس مقام پر خدا کی طرف سے نبوت اور رسالت کا فرمان مل گیا۔ وہ مصر میں آئے اور اپنے بھائی ھارونؑ کو مطلع کیا اور وہ رسالت جس کے لیے آپ مبعوث تھے، اُس کا پیغام اُسے پہنچایا۔ پھر یہ دونوں بھائی فرعون سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ آخر بڑی مشکل سے اُس کے پاس پہنچ سکے۔ اس وقت فرعون کے وزراء اور مخصوص لوگ اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اُن سب کو خدا کا پیغام سُنایا۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ پیغامِ حق سُنکر اُن کا ردِ عمل کیا ہوا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں خدا فرماتا ہے کہ جس وقت موسیٰ ہمارے روشن معجزات لے کر اُن لوگوں کے پاس گئے تو اُنھوں نے کہا: " یہ تو جادو کے علاوہ کچھ نہیں ہے جسے غلط طور پر خدا سے منسوب کر دیا گیا ہے: (فلمّا جآءهم موسٰى باٰياتنا بينٰتٍ قالوا ما هٰذآ الا سحر مفترى)۔

ہم نے ایسی بات اپنے بزرگوں میں کبھی نہیں سُنی: (وما سمعنا بهٰذا في اٰبائنا الاولين)۔

اُنھوں نے حضرت موسیٰؑ کے روشن معجزات کے مقابلے میں وہی حربہ اختیار کیا جو پوری تاریخ میں تمام ظالم و جابر اور گمراہ لوگ انبیاً
ے معجزات کے مقابلے میں اختیار کرتے رہے تھے۔

اور وہ تھا جادوگری کا الزام کیونکہ معجزہ بھی خارقِ عادت ہوتا ہے اور جادو بھی لیکن یہ کہاں اور وہ کہاں! جادُوگر گمراہ اور
یا پرست لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کے عملیات کی بنیاد تحریف حقائق پر ہے۔ اِس علامت سے اُن کی حقیقت کو خُوب پہچانا جا سکتا ہے جبکہ
یا کے پیغام حق اور اس کی صداقت پر اُن کے معجزات گواہ ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ چونکہ ساحروں کا بھروسہ بشری طاقتوں پر ہوتا ہے اِس لیے ہمیشہ اُن کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔ لیکن انبیا کے
ں الٰہی طاقت ہوتی ہے لہذا اُن کے معجزات عظیم اور نامحدود ہوتے ہیں۔

قرآن میں "**آیات بیّنات**" بطور جمع استعمال ہوا ہے۔ مراد اس سے وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوتے تھے۔
ہر ذکر دو ہی معجزوں کا ہے۔ مگر ممکن ہے انھیں ان دو معجزوں کے علاوہ بھی معجزے دیئے گئے ہوں۔ یا یہ دو معجزے متعدد معجزوں سے
ب ہوں۔

عصا کا اژدھے کی صُورت میں متشکل ہو جانا ایک عظیم معجزہ ہے اور پھر اُس کا پہلی حالت پر واپس آجانا ایک اور معجزہ ہے۔ اِسی
ح حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کا چمک اُٹھنا ایک معجزہ ہے اور پھر اُس کا حالت اصلی اختیار کر لینا دوسرا معجزہ ہے۔

کلمہ "**مفتری**" کا مادہ "فریہ" ہے جس کے معنی تہمت اور دروغ کے ہیں۔ مصر کے لوگوں نے یہ کلمہ اس لیے استعمال کیا کہ
یہ کہنا چاہتے تھے کہ موسیٰؑ نے خدا کا نام لے کر جھُوٹ بولا ہے۔

اور اہلِ مصر کا یہ کہنا کہ "ہم نے ایسی بات اپنے باپ دادا سے کبھی نہیں سُنی"۔

اُس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ سے قبل اس ملک میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوّت اور اُن کے
م کی شہرت پہنچ چکی تھی یا ممکن ہے کہ اُنھوں نے یہ بات اس وجہ سے کہی ہو کہ اِن واقعات کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور وہ حق کو
دش کر چکے تھے یا ہو سکتا ہے کہ اُن کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ اس سے پہلے بھی ہمارے اجداد کو ایسا پیغام دیا گیا تھا مگر اُنھوں نے
ں نہیں کیا۔

❖ ❖ ❖

لیکن حضرت موسیٰ نے اُن کفار کے جواب میں تہدید آمیز لہجے میں کہا: میرا خُدا اُن لوگوں کے حال سے، جو اُس کی طرف سے
نوں کے لیے ھدایت لاتے ہیں، خُوب آگاہ ہے اور اُس شخص کو بھی خُوب جانتا ہے جس کے لیے دارِ آخرت ہے: (وقال
سیٰ ربی اعلم بمن جآء بالھدٰی من عندہٖ ومن تکون لہٗ عاقبۃ الدار)۔

اِس قول سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود یہ تھا کہ خدا میرے حال سے خُوب آگاہ ہے۔ ہر چند کہ تم مجھے دروغ گوئی سے متہم کرتے ہو۔
یہ نہیں سوچتے کہ خدا ایک جھُوٹے شخص کو ایسے معجزات کیونکر عطا کر سکتا ہے کہ جو اُس کے بندوں کو گمراہ کرتا پھرے۔ خدا میرے دل
حال خُوب جانتا ہے اور خدا نے مجھے یہ معجزات عطا کیے ہیں وہ میرے پیغام کی حقانیت پر دلیل واضح ہیں۔

علاوہ بریں "جھُوٹ کے پَیر نہیں ہوتے" جھُوٹے آدمی کا کام ایک قلیل مدّت تک ہی چلتا ہے اور پھر اُس کا پردہ فاش ہو

جاتا ہے۔ تم عنقریب دیکھ لوگے کہ ہم میں سے کون کامیاب ہوتا ہے اور شکست و رُسوائی کس کی قسمت میں ہے۔
مطمئن رہو اگر میں دروغ گو ہوں تو ظالم ہوں اور ظالموں کو کبھی فلاح نہیں ہوتی: (انہ لا یفلح الظالمون)۔
اور اِس آیت کا مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر ۶۹ کے مطابق ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے:

ولا یفلح الساحر حیث اتٰی

ساحر جہاں بھی جائے گا اسے فلاح نہ ہوگی۔

اِس مقام پر یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں فرعون اور اس کے مفسد اور متکبّر ساتھیوں کی نفسانی حالت کی طرف اشارہ ہو کہ تم لوگ میرے معجزات کو دیکھ کر دل میں تو مجھے برحق سمجھ گئے ہو مگر اپنی خباثتِ نفس کی وجہ سے میری مخالفت کرتے ہو۔ مگر اچھی طرح سمجھ لو کہ تم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے اور انجام کار میرے حق میں ہوگا نہ کہ تمہارے۔ "عاقبۃ الدار" سے مراد ممکن ہے کہ دُنیا کا انجام یا دارِ آخرت یا دونوں ہوں۔ البتہ تیسرے معنی زیادہ جامع اور زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اِس منطقی اور مُہذّب جواب سے اُن کی اِس دُنیا اور آخرت دونوں میں رُوسیاہی کو اُن پر واضح کر دیا۔

۳۸۔ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِى فَأَوْقِدْ لِى يَٰهَٰمَٰنُ عَلَى ٱلطِّينِ فَٱجْعَل لِّى صَرْحًا لَّعَلِّىٓ أَطَّلِعُ إِلَىٰٓ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّى لَأَظُنُّهُۥ مِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ○

۳۹۔ وَٱسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُۥ فِى ٱلْأَرْضِ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ○

۴۰۔ فَأَخَذْنَٰهُ وَجُنُودَهُۥ فَنَبَذْنَٰهُمْ فِى ٱلْيَمِّ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلظَّٰلِمِينَ ○

۴۱۔ وَجَعَلْنَٰهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى ٱلنَّارِ وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ لَا يُنصَرُونَ ○

۴۲۔ وَأَتْبَعْنَٰهُمْ فِى هَٰذِهِ ٱلدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ هُم مِّنَ ٱلْمَقْبُوحِينَ ○

ترجمہ

۳۸۔ فرعون نے کہا : اے (دربارنشیں) سردارو ! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی کو خدا نہیں جانتا (لیکن مزید تحقیق کے لیے) اے ھامان! تو میرے لیے مٹی پر آگ جلا (یعنی اینٹیں پکا) اور پھر میرے لیے ایک بلند برج تعمیر کرتا کہ مجھے موسیٰ کے خدا کا پتہ چلے۔ اگرچہ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

۳۹۔ وہ (فرعون) اور اُس کے لشکر زمین میں ناحق مغرور ہو رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

۴۰۔ پس ہم نے اسے اور اس کی افواج کو پکڑ لیا اور اُنھیں غرقِ دریا کر دیا۔ دیکھو! کہ ظالموں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

۴۱۔ اور ہم نے اُن کو ایسے پیشوا قرار دیا جو (جہنم کی) آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور قیامت کے دن اُن کی مدد نہ کی جائے گی۔

۴۲۔ اور ہم نے اِس دُنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے روز وہ بدحالوں میں سے ہوں گے۔

تفسیر

ظالموں کا انجام :

اِس مقام پر ہم اس تاریخ کے نویں سبق آموز حصّے کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو میدانِ مقابلہ سے ہٹانے کے لیے ایک بُرج بنانے کا منصوبہ بنایا۔

ہم جانتے ہیں کہ منجھے ہوئے سیاستدانوں کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ اُن کی میلانِ طبع کے خلاف پیش آجاتا ہے تو وہ عوام کی توجہ اُس سے منحرف کرنے کے لیے فوراً کوئی نئی چال چلتے ہیں۔ تاکہ عوام کی توجہ اُن ہی کی طرف رہے۔

یوں لگتا ہے کہ فرعون نے نہایت بلند بُرج بنانے کا حکم حضرت موسیٰؑ کے جادوگروں سے مقابلے کے بعد دیا ہوگا۔ کیونکہ قرآن مجید میں سُورہ مومن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منصوبہ اُس وقت بنایا گیا تھا جب کہ فرعون کے اہل کار موسیٰؑ کو قتل کرنے کی تجویز کر رہے تھے اور مومن آلِ فرعون اُنھیں بچانے کی تدابیر کر رہا تھا۔ نیز یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساحروں سے پہلے اس تجویز کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ حضرت موسیٰؑ کی صداقت کی تحقیق اور اُنھیں جادوگروں سے شکست دلانے میں مشغول تھے۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کے ساحروں سے مقابلے کا حال سورہ طٰہٰ، اعراف، یونس اور شعراء میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس مقام پر اُس تفصیل سے قطع نظر کرکے ہم صرف تعمیرِ بُرج کے واقعے کا ذکر کرتے ہیں جو صرف اس سورۃ اور سورۃ مومن میں بیان ہوا ہے۔

جادوگروں پر حضرت موسیٰؑ کی فتح کا حال تمام مملکتِ مصر میں مشہور ہو گیا تھا۔ جادوگروں کے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے سے خطرہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اور حکومتِ فرعون کی پوزیشن سخت خطرے سے دوچار ہو گئی تھی۔ ملک کے عوام جنہیں غلام بنا رکھا تھا، اُن کے بیدار ہونے کا احتمال ہونے لگا تھا۔ اِس لیے اِس نازک وقت میں لازمی تھا کہ ہر قیمت پر عوام کی توجہ اِس مسئلے سے ہٹائی جائے۔ اور اُن کے ذہن کو کسی اور طرف مشغول کرنے، اُنھیں اصل مسئلے سے غافل کرنے اور بے وقوف بنانے کے لیے کوئی تدبیر کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کی طرف سے اُن کے لیے عطا و بخشش کا سلسلہ بھی جاری ہو۔

فرعون نے اس معاملے میں اپنے اہلِ دربار سے مشورہ کیا۔ وہ اُس نتیجے پر پہنچا جس کا ذکر زیرِ بحث پہلی آیت میں آیا ہے :

فرعون نے کہا : اے میرے امراء و وزراء! مجھے تمہارے لیے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں۔ (وقال فرعون یاایھا الملأ ما علمت لکم من الٰہ غیری)۔

مسلّمہ طور پر زمین کا خدا میں ہوں۔ رہا آسمان کا خدا اُس کے وجود پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ لیکن میں احتیاط سے گریز نہیں کرتا اور آسمانی خدا کے متعلق تحقیق کرتا ہوں اِس کے بعد اُس نے ھامان کی طرف رُخ کیا اور کہا : اے ھامان! تُو آگ جلا کر اینٹیں پکا۔ (فاوقد لی یا ھامان علی الطین)۔

اس کے بعد تُو میرے لیے ایک بہت بلند بُرج بنا تاکہ مَیں اُس پر چڑھوں اور موسیٰ کے خدا کو تلاش کروں، ہر چند کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سچّا ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ جھُوٹوں میں سے ہے : (فاجعل لی صرحًا لعلی اطلع الی الٰہ موسٰی وانی لاظنہ

الکاذبین)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرعون نے " اینٹ " کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا اور صرف یہ کہاکہ " مٹی پر آگ جلا " ؟

اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُس زمانے میں ابھی پختہ اینٹیں بنانے کا رواج نہ تھا۔ اینٹ فرعون کے دَور میں ایجاد
۔ مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ طرزِ بیان بھی متکبرانہ ہے جیساکہ جابر بادشاہوں کا طرزِ گفتگو ہوتا ہے۔

بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ کلمہ " آجر " (یعنی اینٹ) کوئی فصیح لفظ نہیں ہے کہ قرآن میں استعمال ہوتا اُس کی بجائے کلمہ "طین "
) استعمال کیا گیا ہے۔

اِس مسئلے میں مفسرین کے ایک گروہ نے (مثلاً فخر رازی اور آلوسی نے) یہ سوال بھی اُٹھایا ہے کہ آیا فرعون نے اپنا مجوزہ بلند مینار
رایا تھا یا نہیں ؟

اِن مفسرین کا ذہن اِس طرف اس لیے منتقل ہوا کہ مینار کی تعمیر کا کام کسی طرح بھی عاقلانہ نہ تھا۔ کیا اُس عہد کے لوگ کبھی بلند پہاڑوں
ں پر چڑھے تھے ؟ اور انھوں نے آسمان کے منظر کو ویسا ہی نہیں دیکھا تھا جیساکہ وہ زمین سے نظر آتا ہے ؟ کیا انسان کا بنایا ہوا مینار پہاڑ
۔ زیادہ اُونچا ہو سکتا ہے ! کیا کوئی احمق بھی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسے مینار پر چڑھ کر آسمان کو چھُوا جا سکتا ہے ؟ لیکن ـــــ وہ مفسرین
ں نے یہ اشکالات پیدا کیے ہیں اُن کی توجہ اِن نکات کی طرف نہیں گئی کہ **اوّل** تو ملکِ مصر کوہستانی نہیں ہے۔ **دوم** یہ کہ انہوں نے
عہد کے لوگوں کی سادہ لوحی کو فراموش کر دیا کہ اُن سیدھے سادے لوگوں کو ایسے ہی مسائل سے غافل کیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خود
ے زمانے میں جسے عصرِ علم و دانش کہا جاتا ہے، لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے کیسے کیسے مکر و فریب اور حیلہ سازیاں
اتی ہیں۔

بہرکیف ـــــ بعض تواریخ کے بیان کے مطابق، ہامان نے حکم دیا کہ ایسا محل اور بُرج بنانے کے لیے زمین کا ایک وسیع قطعہ انتخاب
ر اور اس کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار معمار اور مزدور روانہ کر دے اور اس عمارت کے واسطے مٹیریل فراہم کرنے کے لیے ہزاروں آدمی
کیے گئے۔ اُس نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور اس مقصد کے لیے کثیر رقم خرچ کی۔ یہاں تک کہ تمام ملکِ مصر میں اس عظیم بُرج کی تعمیر
رت ہوگئی۔

یہ عمارت جس قدر بھی بلند سے بلند تر ہوتی جاتی تھی۔ لوگ اتنے ہی زیادہ اُسے دیکھنے آتے تھے اور منتظر تھے کہ دیکھئے فرعون یہ
ت بنا کر کیا کرتا ہے ؟

یہ عمارت اتنی بلند ہوگئی کہ اُس سے دُور دُور تک اطراف و جوانب کا میدان نظر آنے لگا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ معماروں
۔ اس کی مارپیچ سیڑھیاں ایسی بنائی تھیں کہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اُس پر چڑھ سکتا تھا۔[1]

جب وہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور اُسے مزید بلند کرنے کا کوئی امکان نہ رہا تو ایک روز فرعون پوری شان و شوکت سے وہاں آیا
رات خود برج پر چڑھ گیا۔ جب وہ بُرج کی چوٹی پر پہنچا اور آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو اُسے آسمان ویسا ہی نظر آیا جیساکہ وہ زمین سے دیکھا

[1] یہ مؤرخین کا طبع زاد افسانہ ہے۔ موجودہ قاہرہ کے جنوب میں فرعون کے دارالسلطنت کے کھنڈرات موجود ہیں۔ وہاں اِس قسم کی عمارت کا کوئی نشان نہیں ہے۔

کرتا تھا۔ اُس منظر میں ذرا بھی تغیّر و تبدیلی نہ تھی۔

مشہور یہ ہے کہ اُس نے مینار پر چڑھ کے کمان میں تیر جوڑا اور آسمان کی طرف پھینکا یا تو وہ تیر کسی پرندے کے لگا یا پہلے سے کوئی سازش کی گئی تھی کہ تیر خون آلود واپس آیا۔ تب فرعون وہاں سے نیچے اُتر آیا اور لوگوں سے کہا۔ جاؤ، مطمئن رہو اور کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ میں نے موسٰی کے خدا کو مار ڈالا ہے۔[1]

یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ سادہ لوحوں اور اندھی تقلید کرنے والوں کے ایک گروہ نے اور اُن لوگوں نے جن کی آنکھیں اور کان حکومتِ وقت کے پروپیگنڈے سے بند ہو گئے تھے، فرعون کے اِس قول کا یقین کر لیا ہو گا اور ہر جگہ اس خبر کو عام کیا ہو گا اور مصر کی رعایا کو غافل رکھنے کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا ہو گا۔

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمارت دیر تک قائم نہیں رہی (اور اُسے رہنا بھی نہ چاہیئے تھا) تباہ ہو گئی۔ بہت سے لوگ اُس کے نیچے دب کے مر گئے۔ اِس سلسلے میں اہلِ قلم نے اور بھی طرح طرح کی داستانیں لکھی ہیں لیکن اُن کی صحت کی تحقیق نہ ہو سکی اِس لیے انھیں قلم زد کر دیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ فرعون نے یہ جُملہ کہہ کر کر :

ماعلمت لکم من الٰہٍ غیری

مجھے تمہارے لیے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں۔

بڑی شیطنت کا ثبوت دیا تھا۔ جملے سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی اُلوہیت کو تو مسلم سمجھتا تھا اور قابلِ بحث صرف یہ پہلو چھوڑ دیا کہ اُس کے علاوہ کوئی اور خدا بھی ہے یا نہیں ؟

اور چونکہ خدائے برحق کے عدمِ وجود کے لیے اُس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اِس لیے یہاں ایک مغالطہ پیدا کرتا ہے اور اپنے علاوہ کسی اور دوسرے خدا کا عدمِ وجود ثابت کرنے کے لیے ایک بلند بُرج بنانے کا حکم دے کر لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانا چاہتا ہے۔

یہ سب باتیں اس حقیقت کی علامت ہیں کہ وہ معاملے کو خوب سمجھتا تھا مگر مصر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور اپنی پوزیشن بچانے کے لیے بہانوں سے کھیل رہا تھا۔

⁂

اِس کے بعد قرآن مجید میں فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے تکبّر اور اُن کے مبدأ و معاد سے انکار کا ذکر ہے۔ کیونکہ اُن کے تمام گناہوں کا سرچشمہ ان ہی دو حقائق کا انکار تھا۔ چنانچہ قرآن شریف میں یہ ذکر اس طرح ہے : فرعون اور اُس کے فوجیوں نے ناحق زمین پر تکبّر کیا اور خدا کا (جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے) انکار کیا۔ اُنھوں نے یہ گمان کیا کہ قیامت آنے والی نہیں ہے اور وہ ہمارے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے : (واستکبر ھو وجنودہٗ فی الارض بغیر الحق وظنوا انھم الینا لایرجعون)۔

ایسا انسان ضعیف البنیان جو کسی وقت اپنے اُوپر سے مچھر بھی نہیں اُڑا سکتا اور کبھی ایک جراثیم (جو صرف خوردبین ہی سے نظر آتا ہے) قوی ترین انسان کو تہِ خاک پہنچا دیتا ہے، کیونکر اپنی ذات پر غرور کر سکتا ہے اور کس طرح اُلوہیت کا دعویٰ کر سکتا ہے ؟

[1] اقتباس از تفسیر ابوالفتوح رازی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، جلد ۸، صفحہ ۴۶۲۔

مشہور حدیثِ قدسی میں خدا فرماتا ہے :

الکبریاءُ ردائی، والعظمة ازاری، فمن نازعنی واحدًا منهما القیته فی النّار

بزرگی میری ردا ہے اور عظمت میرا لباس ہے جو میری قامت کبریائی پر سلا ہوا ہے جو شخص ان دو چیزوں میں مجھ سے منازعت کرے گا، میں اُسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔[1]

ظاہر ہے کہ خدا کو تو ان توصیفات کی ضرورت نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی سرکشی اور عصیان کوشی اُس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنی حقیقت کو بھُول جاتا ہے اور اُس کا سر کبر و غرور سے بھر جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کبر و غرور کا انجام کیا ہوا۔ قرآن میں یوں فرمایا گیا ہے کہ : ہم نے اُسے اور اُس کے فوجیوں کو پکڑا اور دریا میں ڈبو دیا : (فاخذ ناہ وجنودہٗ فنبذناھم فی الیم)۔

البتہ وہ دریا جو اُن کی حیات کا باعث تھا (یعنی اہلِ مصر کی معاش کا مدار جس کے پانی اور اس کے سیلاب پر تھا) ہم نے اسی کو اُن کی موت کا سبب بنا دیا۔ اور دریائے نیل کو جو اُن کی قدرت اور عظمت کا باعث تھا، ہم نے اُسے اُن کا قبرستان بنا دیا۔

اِس آیت میں کلمہ " نبذناھم " استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ " نبذ " ہے (بروزن " نبض ") اس کے معنی ہیں بے قدر اور بیکار چیزوں کو دُور پھینک دینا "۔ یہاں قرآن کی بلاغت جاذب توجہ ہے کہ ہم نے ان بے قدر اور بیکار چیزوں (فرعون اور اُس کے ساتھیوں) کو دُور پھینک دیا اور زمین کو اُن کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا۔

آیت کے آخر میں رُوئے سُخن پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے دیکھو ظالموں کا انجام کیسا تھا ؛ (فانظر کیف کان عاقبة الظّالمین)۔

آیت میں کلمہ " انظر " چشمِ ظاہر کے لیے نہیں بلکہ چشمِ باطن کے لیے ہے اور کلمہ " ظالمین " صرف زمانۂ ماضی کے سرکشوں کے لیے نہیں بلکہ اِس زمانے کے ستمگروں کا انجام بھی یہی ہے۔

آیت نمبر ۴۱ میں فرمایا گیا ہے : ہم نے اُن کو ایسا پیشوا بنایا ہے جو آتشِ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور قیامت کے روز کوئی بھی اُن کا مددگار نہ ہوگا : (وجعلناھم ائمّةً یدعون الی النّار ویوم القیامة لا ینصرون)۔

مفسّرین کو اِس آیت کی تفسیر میں یہ مشکل پیش آئی ہے کہ خدا کا کام تو خیر کی طرف دعوت دینا ہے اور لیسے امام مقرر کرنا ہے جو پیشوایانِ حق ہوں۔ اِس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا ایسے پیشوایانِ باطل مقرر کرے جو اُس کی مخلوق کو آگ کی طرف دعوت دیں۔

لیکن — غور کیا جائے تو یہ مشکل لا ینحل نہیں ہے۔ کیونکہ " ائمۂ نار " دوزخیوں کے پیشوا ہیں۔ جس وقت ضالّین کے گروہ دوزخ کی طرف حرکت کریں گے تو وہ اُن کے آگے آگے ہوں گے۔ نیز جس طرح وہ دنیا میں " آئمۂ ضلال " تھے۔ آخرت میں بھی دوزخیوں کے پیشوا ہوں گے کیونکہ وہ جہان اِس جہان کی ایک وسیع تر تجسیم ہے۔

دوم یہ کہ " آئمۂ ضلال " خدا نہیں بناتا بلکہ یہ خود انہی کا نتیجۂ اعمال ہوگا۔ یہ مسلّم ہے کہ ہر علت کا معلول اور ہر سبب کا مسبّب فرمانِ الٰہی

[1] تفسیر رُوح المعانی، تفسیر کبیر از فخر رازی، تفسیر المیزان نیز دیگر تفاسیر۔ اِس آیت کے متعلق۔

سے ظہور میں آتا ہے۔ چونکہ اُنھوں نے وہ راہِ عمل اختیار کی جو امامت ضالّین پر منتہی ہوتی تھی لہٰذا نتیجتاً وہ داعی الی النّار ٹھہرے اور ان کی یہ وضع بروزِ قیامت ہوگی۔

٭ ٭ ٭

پھر تاکید مزید کے لیے قرآن میں دُنیا اور آخرت میں اُن کے چہرے کی کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے : اِس دنیا میں ہم نے اُن کے نصیب میں لعنت کی ہے اور بروزِ قیامت اُن کے چہرے مکروہ و سیاہ ہوں گے : (واتبعناھم فی ھٰذہ الدّنیا لعنة ویوم القیامة ھم من المقبوحین)۔[1]

" لعنتِ خدا " کا مطلب " رحمتِ الٰہی " سے محروم ہونا ہے اور لعنتِ فرشتگان و مومنین سے مراد نفرین ہے جو صبح و شام اُن پر نازل ہوتی ہے۔ ظالمین و مستکبرین کبھی تو عام لعنت کے حقدار ٹھہرتے ہیں اور کبھی اُن پر خصوصیت سے لعنت و نفرین ہوتی ہے۔ کیونکہ جو آدمی بھی تاریخ میں ان کے حالات پڑھتا ہے ان پر لعنت و نفرین بھیجتا ہے۔

بہرحال دُنیا کے یہ بدسیرت اُس جہان میں بدصُورت ہوں گے۔ کیونکہ وہ دن " یوم البروز " ہوگا اور اُس روز ہر شخص کے حال سے پردہ اُٹھ جائے گا۔

چند اہم نکات

ائمۂ نور اور ائمۂ نار : قرآن شریف میں دو قسم کے اماموں کا ذکر ہے۔ ایک امام تو پیشوائے متقین ہے جو راہِ راست اور دینِ حق کی طرف ھدایت کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ انبیاءؑ کی آیت ۷۳ میں پیغمبروں کے ایک گروہ کے متعلق ہم یوں پڑھتے ہیں :

وجعلناھم ائمّة یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلوٰة وایتاء الزّکوٰة وکانوا لنا عابدین

ہم نے اُن کو پیشوا بنایا تھا کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ھدایت کرتے تھے۔ ہم نے اُن کو وحی کی کہ وہ نیک کام کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور وہ صرف ہمارے ہی عبادت گزار تھے۔

یہ ایسے امام تھے جن کے فرائضِ عمل بالکل واضح تھے۔ اُن کے فرائضِ عمل کی فہرست توحیدِ خالص، خیر اور نیکی کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور حق و عدالت پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ امامانِ نُور تھے کہ اُن کا سلسلہ انبیاء اور اوصیاء سے گزرتا ہوا جناب خاتم المرسلین تک آتا ہے۔

دوسری قسم کے امام رہبرانِ ضلال و گمراہی ہیں اور آیاتِ زیرِ بحث کی رُو سے وہ " آئمۂ نار " ہیں۔

پیشواؤں کے دو گروہوں کی خصوصیات جیسی کہ امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے یہ ہیں :

[1] " مقبوح " کا مادہ " قبح " ہے جس کے معنی ہیں " زشتی " اور یہ کہ بعض مفسرین نے جو " مقبوح " کے معنی " دھتکارا ہوا "، " رُسوا یا مغضوب یا اور اسی طرح کے لکھے ہیں یہ سب تفاسیر مجازی ہیں جسے لزومی معنی کہتے ہیں۔ ورنہ " مقبوح " کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔

" اُن میں سے گروہ اول خدا کے فرمان کو مخلوق کی رائے اور اپنے ارادے پر مقدم رکھتے ہیں
اور اُسی کے حکم کو برترین فرمان سمجھتے ہیں۔"
لیکن گروہ دوم اپنی رائے کو خدا کے حکم پر مقدم سمجھتے ہیں اور اپنے حکم کو خدا کے فرمان
پر ترجیح دیتے ہیں۔[1]

اہل نظر کے لیے ان دونوں قسم کے اماموں میں امتیاز کرنا اس معیار کی روشنی میں آسان ہو جائے گا جو امام صادقؑ نے بیان فرمایا ہے :

بروز قیامت جب اعمال حسن و قبیح کے مطابق مخلوق کی صف بندی ہوگی تو ہر گروہ اپنے اپنے امام کے پیچھے چلے گا۔ ناری گروہ کسی ناری امام کو تلاش کرلے گا اور نُوری گروہ امام ہدایت کے پیچھے ہوگا۔
چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے :

يوم ندعوا كل أناس بامامهم

وہ ایسا دن ہوگا کہ ہم ہر گروہ کو اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے۔ (بنی اسرائیل - ۷۱)

ہم نے بارہا اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ میدانِ قیامت اس تنگ دُنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع اور عظیم ہوگا۔ اس جہانِ فانی میں جن لوگوں نے جس امام کی بھی پیروی کی ہے اور اُس کے معتقد رہے ہیں، روزِ محشر بھی وہ اُسی کے ساتھ ہوں گے۔
بشر بن غالب یوں بیان کرتا ہے کہ میں نے ابو عبداللہ امام حسین علیہ السلام سے يوم ندعوا كل أناس بامامهم کی تفسیر پوچھی۔ تو امامؑ نے فرمایا :

"امام دعا الى هدى فاجابوه اليه، وامام دعا الى ضلالة فاجابوه اليها، هؤلاء فى الجنة وهؤلاء فى النار وهو قوله عزّ وجل" فريق فى الجنة وفريق فى السعير"

ایک امام تو وہ ہے جو ھدایت کی طرف بُلاتا ہے اور ایک گروہ اُس کی دعوت کو قبول کرلیتا ہے۔ اور ایک امام وہ ہے جو گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے اور ایک گروہ اُس کی بھی پیروی کرنے لگتا ہے۔ پہلا گروہ اہلِ جنّت میں سے ہے اور دوسرا دوزخی ہے اور خدا کے اس فرمان کا کہ ایک فریق جنّت میں ہوگا، اور ایک دوزخ میں، یہی مطلب ہے۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے پیروؤں کے آگے آگے چل رہا تھا، یہاں تک کہ اُس نے اُن سب کو دریائے نیل کی موجوں میں غرق کردیا، بروزِ قیامت بھی وہ اُس گمراہ گروہ کے آگے آگے ہوگا اور اُنھیں دریائے آتش میں ڈبو دے گا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے :

يقدم قومه يوم القيامة فاوردهم النار

[1] تفسیر صافی ذیل آیات زیرِ بحث۔

بروزِ قیامت وہ اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔ یہاں تک کہ وہ اُنھیں آگ میں واخل کر دے گا۔
(ھُود - ۹۸)

ہم اس بحث کو مولائے کائنات امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ایک قول پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے منافقین کے ایک گروہ کے متعلق فرمایا :

ثمّ بقوا بعده، فتقرّبوا الى ائمّة الضلالة، والدّعاة الى النّار بالزور والبهتان، فولوهم الاعمال وجعلوهم حكّامًا على رقاب النّاس

یہ گروہِ منافقین رسُول اللہؐ کی وفات کے بعد بھی باقی رہا۔ اور انھوں نے آئمہ ضلال کی قربت اختیار کرلی اور اُن لوگوں کی پیروی کی جو دروغ اور بہتان کے ساتھ لوگوں کو دوزخ کی طرف بُلاتے تھے۔ اِن آئمہ ضلال نے اُن کے وجود سے خُوب فائدہ اُٹھایا۔ انہیں عہدے اور منصب عطا کیے ـــ اور اُنھیں حکّام بنا کر مخلوق کی گردنوں پر سوار کر دیا۔

۴۳۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○

۴۴۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلٰى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

۴۵۔ وَلٰكِنَّآ أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ○

۴۶۔ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ إِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ أَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○

ترجمہ

۴۳۔ پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسٰی کو کتاب دی۔ ایسی کتاب جو لوگوں کے لیے بصیرت آفریں تھی اور ھدایت و رحمت کا باعث تھی تا کہ وہ غور و فکر کریں۔

۴۴۔ اور جب ہم نے موسٰی کی طرف فرمانِ نبوت بھیجا تو اُس وقت تو مغربی گوشے میں موجود نہ تھا اور نہ تو اُس واقعے کے دیکھنے والوں میں سے تھا۔

۴۵۔ لیکن ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف قومیں پیدا کیں اور اُن پر طولانی زمانے گزر گئے (اور انبیاء کے آثار ان کے دلوں سے محو ہو گئے لہٰذا تجھے تیری آسمانی کتاب کے ساتھ بھیجا) اور تو اہل مدین میں سے نہ تھا کہ اُن (مشرکینِ مکہ) کو اس بارے میں ہماری آیات پڑھ کر سناتا۔ مگر یہ کہ ہم نے تجھے بھیجا (اور تجھے یہ خبریں دیں)۔

۴۶۔ اور تو اُس وقت طور کے پہلو میں نہ تھا۔ جب ہم نے موسٰی کو آواز دی لیکن یہ تیرے رب کی رحمت تھی

(کہ تجھے یہ اطلاعات دیں) تا کہ تو انھیں سُنا کر اپنی اس قوم کو ڈرائے جن کے پاس اِس سے قبل کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

یہ غیبی خبریں اللہ نے دی ہیں:

سُورۃ قصص میں جتنی آیات بھی حضرت موسٰیؑ کی سرگزشت سے متعلق ہیں، ہم اس مقام پر اُس کے دسویں حصے سے متعارف ہوتے ہیں۔

اِس حصے میں حضرت موسٰیؑ پر تورات کے نزول اور احکام عشرہ عطا کرنے کا ذکر ہے یعنی جب نفی طاغوت کا زمانہ ختم ہو گیا (یعنی جب موسٰی اپنی قوم کو بُت پرستوں کے نرغے سے نکال لائے) تو وہ عہد شروع ہوا جب اُن کی دینی نقطہ نگاہ سے تربیت، اصلاح اور غیر خدا کے انکار کے بعد اللہ کی وحدانیت کا اقرار سکھانا تھا۔

چنانچہ خداوندِ عالم فرماتا ہے: ہم نے پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسٰی کو کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرت آفریں اور ھدایت و رحمت کا سبب ہے تاکہ وہ غور و فکر کریں: (ولقد اٰتینا موسی الکتاب من بعد ما اھلکنا القرون الاولیٰ بصائر للناس وھدی و رحمۃ لعلھم یتذکرون)۔

آیت زیرِ نظر میں "قرونِ اولیٰ" (یعنی اعصار گزشتہ کی وہ اقوام جو ہلاک ہو گئیں) سے کونسی قومیں مراد ہیں؛ بعض مفسرین اِس سے قومِ نوح، عاد و ثمود اور اُن جیسی ہی کافر قومیں مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ مرورِ زمانہ سے گزشتہ انبیا کے آثار زمین سے محو ہو گئے تھے اور اب لازم تھا کہ نوعِ انسانی کی تربیت کے لیے ایک نئی کتاب نازل کی جائے۔

بعض کے نزدیک اس سے قومِ فرعون کی ہلاکت مراد ہے جو گزشتہ اقوام کی باقیات میں سے تھی کیونکہ خدا نے اُس قوم کی ہلاکت کے بعد ہی موسٰی پر توریت نازل کی۔

لیکن یہ امر تسلیم کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ "قرون الاولیٰ" سے اِس قسم کی جُملہ اقوام مراد ہوں۔

"بصائر" جمع "بصیرت" کی ہے۔ جس کے معنی "بینائی" کے ہیں۔ مگر اس مقام پر خدا کی وہ نشانیاں اور دلائل مراد ہیں جو مومنین کے قلب کو منوّر کرنے کا سبب ہوں اور ھدایت و رحمت بھی اس بصیرت کے لوازم میں سے ہے۔ نیز دلوں کی بیداری اور قدرتِ الٰہی میں غور و فکر اس کا نتیجہ ہے۔ [1]

٭ ٭ ٭

اِس کے بعد یہ ذکر ہے کہ ہم نے جو کچھ موسٰی اور فرعون کی داستان اس کی جُزئیات کے ساتھ بیان کی وہ قرآن کی صداقت پر دلیل ہے۔ کیونکہ تم اُس موقع پر موجود نہ تھے اور تم نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تھے۔ یہ ہمارا لطف و کرم ہے کہ ہم نے مخلوق کی ھدایت کے لیے تم پر یہ آیات نازل کیں۔

---

[1] بصائر جمع بصیرت و ابصار جمع بصر۔

پھر فرماتا ہے کہ :— جب ہم نے موسیٰ کو فرمانِ نبوت دیا تو تم کوہِ طور کے گوشے میں موجود نہ تھے اور تم اس واقعے کے شاہدین میں سے نہیں تھے (وماکنت بجانب الغربی اذ قضینا الی موسی الامر وماکنت من الشاھدین)۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ مدین سے بسوئے مصر سفر کرتے ہوئے (کہ وہ راستہ سرزمینِ سینا سے گزرتا تھا) ٹھیک مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کر رہے تھے۔

اس کے برعکس جب بنی اسرائیل مصر سے شام کی طرف آئے اور وادیٔ سینا سے گزرے تو انھوں نے مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا۔

لہٰذا بعض مفسرین نے سورہ شعراء کی آیت ساٹھ " فاتبعوھم مشرقین " (جو کہ فرعون اور اس کی افواج کے بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کے بارے میں ہے) کا یہی مطلب سمجھا ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے : ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام کو پیدا کیا مگر جب ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا تو انبیا کی ھدایت اور ان کی تعلیم کا اثر ان کے قلوب سے محو ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے تمہیں رسول بنایا اور قرآن عطا کیا اور گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے تاکہ وہ انسانوں کے لیے نصیحت کا باعث ہوں : (ولٰکنّآ انشأنا قرونًا فتطاول علیھم العمر)۔

اور تم ہرگز اہلِ مدین کے درمیان نہ رہتے تھے (کہ تمہیں ان کی زندگی کے حالات معلوم ہوتے) اور وہ حالات تم انہیں (اہلِ مکہ کو) سناتے : (وماکنت ثاویًا فی اھل مدین تتلوا علیھم اٰیاتنا)[1]

لیکن ہم نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا اور ہزارہا سال ماقبل کے تاریخی حالات کا علم تمہیں بخشا تاکہ تم اس مخلوق کی ھدایت کرو۔ (ولٰکنّا کنّا مرسلین)[2]

٭ ٭ ٭

اسی مفہوم کی تاکید کے لیے اس عبارت کا اضافہ کیا گیا کہ : جب ہم نے موسیٰ کو ندا دی اور اس کے نام فرمانِ نبوت صادر کیا : (وماکنت بجانب الطّور اذ نادینا)[3]

مگر ہم نے تمہیں جن حالات سے مطلع کیا ہے وہ اس رحمت کا تقاضا ہے کہ تم ان کے وسیلے سے اس قوم کو ڈراؤ جن کے پاس قبل ازیں کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا، شاید کہ وہ نصیحت حاصل کریں : (ولٰکن رحمۃ من ربّك لتنذر قومًا مآ اتاھم من نذیرٍ من قبلك لعلھم یتذکّرون)۔

---

[3] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں ندا سے مراد وہ ندا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ستر افراد کے ساتھ کوہِ طور پر گئے تھے اور انھیں خدا کی آواز سنائی دی تھی۔ لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے کیونکہ ان آیات میں اشارہ ہے ان مطالب کی طرف جو ماقبل آیات میں آچکے ہیں اور رسولِ اکرمؐ نے وہ حالات لوگوں کو بتائے جبکہ وہ ان حالات کے شاہد و ناظر نہ تھے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آیاتِ ماقبل میں حضرت موسیٰؑ کا مدین سے مصر کی طرف سفر کرنے اور وادیٔ طور میں پہلی دفعہ کلام خدا کو سننے کا ذکر ہے۔

[1] " ثاوی " کا مادہ " ثوی " ہے۔ جس کے معنی ہیں " مستقل طور پر قیام کرنا " اسی وجہ سے جائے قرار کو " مثوی " کہتے ہیں۔

[2] حضرت موسیٰؑ اور جناب ختمی مرتبت رسالت مآبؐ کے درمیان قریبًا دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ خدا جنابِ رسالت مآبؐ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ : وہ بیدارکن اور ہوش آور واقعات جو ماضی بعید کی قوموں پر گزر چکے ہیں اور تم نے انھیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، ہم نے تمہیں ان سے آگاہ کیا ہے تاکہ تم انھیں اس گمراہ قوم کو سناؤ کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کریں۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں یہ کس طرح کہا گیا ہے کہ :-

اس قوم (زمانۂ رسول کے عربوں) کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

جبکہ یہ بھی مسلم ہے کہ روئے زمین کبھی حجتِ الٰہی سے خالی نہیں رہتی۔ اور اس قوم (عرب) میں بھی پیمبرانِ صاحب کتاب کے اوصیاء موجود رہے ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ :-

اس قوم گمراہ کے پاس ایک صاحب کتاب پیغمبر اور ڈرانے والے کو بھیجنے کی غایت واضح ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ اور پیمبرِ اسلامؐ کے ظہور کے درمیان کئی سو سال گزر چکے تھے۔ اس دوران میں کوئی اولوالعزم پیغمبر نہیں آیا تھا اور یہ مفسد اور ملحد عرب اسی بہانے سے راہِ خدا سے منحرف ہو گئے تھے۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں :

انّ اللہ بعث محمّدًا ولیس احدٌ من العرب یقرء کتابًا ولا یدعی نبوّۃ فساق النّاس حتّٰی بوّاھم محلّتھم و بلغھم منجاتھم

جس وقت خدا نے حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا (اس وقت یہ حال تھا کہ) کوئی عرب بھی آسمانی کتاب نہیں پڑھتا تھا اور وہاں کوئی بھی مدعیٔ نبوت نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے انھیں وہ مقام عطا کیا جو ان کے لائق تھا اور انھیں نجات کی منزل پر پہنچا دیا۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۳۳)

۴۷۔ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

۴۸۔ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝

۴۹۔ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۵۰۔ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۷۔ اگر کسی پیغمبر کے بھیجنے سے پہلے ہم اُن کے اعمال پر اُنہیں سزا دیتے تو وہ کہتے : پروردگارا! تُونے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور مومنین میں سے ہوتے۔

۴۸۔ مگر جب ہماری طرف سے اُن کے پاس حق آیا تو انھوں نے کہا کہ اس پیغمبر کو ایسی چیز کیوں نہیں دی گئی تھی۔ جیسی حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی۔ کیا بہانہ سازوں نے ان کی طرح اُن آیات کا انکار نہیں کیا تھا جو اس سے قبل موسیٰ کو دی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ دونوں (موسیٰ اور ہارون) جادوگر ہیں اور انھوں نے باہم سازش کرلی ہے (تاکہ ہمیں گمراہ کریں) اور اُنھوں نے کہا کہ ہم اِن سب باتوں کے منکر ہیں۔

۴۹۔ کہہ دے کہ اگر تم سچے ہو (کہ تورات اور قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہیں) تو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخش کتاب لے آؤ تاکہ میں اس کی پیروی کروں۔

۵۰۔ پس یہ لوگ اگر تیری تجویز قبول نہ کریں تو جان لے کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اُس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا کہ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے اور اللہ کی ہدایت کو قبول نہ کرے۔ یقیناً خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیر

گریز از حق کے لیے نو بہ نو بہانے :

گزشتہ آیات میں پیغمبر کے بھیجنے کا مقصد ڈرانا اور خوف دلانا بیان ہوا تھا۔ زیر نظر آیات میں سے پہلی میں خدا کے اُس لطف وکرم کا ذکر ہے جو کسی قوم کی طرف رسول بھیجنے کی صُورت میں ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : پیغمبر کو مبعوث کرنے سے پہلے ہم انہیں اُن کے اعمال پر سزا دیتے تو وہ کہتے کہ خدایا تُونے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا تاکہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔ اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو ان کے اعمال اور کفر کی وجہ سے کسی پیغمبر کے بھیجنے کی ضرورت بھی نہ تھی : (ولولا ان تصیبهم مصیبة بما قدمت ایدیهم فیقولوا ربنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع اٰیاتك ونكون من المؤمنین)[1]

اس آیت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ راہِ حق روشن ہے اور ہر عقل شرک اور بُت پرستی کے باطل ہونے کا حکم لگاتی ہے اور اُن کے بہت سے اعمال مثلاً ظلم اور ناانصافیاں ایسے ہیں جنہیں عقل قابلِ نفرت سمجھتی ہے۔ اور وہ ایسے قبیح ہیں کہ بدُون ارسال پیغمبر ہی مستحق سزا ہیں۔

لیکن اس کے باوجود کہ اُن کی بداعمالیوں کے بارے میں حکمِ عقل واضح اور روشن ہے، خدا اُن کے ہر عُذر کی نفی اور اتمامِ حُجت کے لیے، اُن کی طرف پیغمبروں کو آسمانی کتابیں اور معجزات کے ساتھ بھیجتا ہے تاکہ اُن میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہماری بدبختی تو کسی رہنما کے نہ ہونے سے تھی اگر ہمارے لیے خدا کی طرف سے کوئی رہبر ہوتا تو ہم نجات یافتہ اور راہِ ہدایت پر ہوتے۔

بہرحال یہ آیت، اُن آیات میں سے ہے جو "پیغمبروں کو بھیجنے کی صُورت میں" خدا کے لطف کے ضروری ہونے کو بیان کرتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ خدا کسی قوم کو اُس کی طرف پیغمبر بھیجنے سے پہلے اُس کے گناہوں کی سزا نہیں دیتا۔ جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ایک سو پینسٹھ میں مذکور ہے :

رسلا مبشرين ومنذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل وكان الله عزيزا حكيما

ہم نے وہ پیغمبر بھیجے جو بشارت دینے اور ڈرانے والے تھے تاکہ اِن پیغمبروں کے بعد لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ توانا اور حکیم ہے۔

---

[1] بعض مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ "لولا ئی اول" کا جواب محذوف ہے۔ اس شرط کی جزا "لما ارسلنا رسولاً" یا "لما وجب ارسال الرسل" ہونی چاہیئے۔ دوسری تعبیر صحیح تر اور قریب ترین حقیقت ہے۔ بہرحال یہ کلام اُن احکام سے مربوط ہے جن کا عقل مستقلاً ادراک کرتی ہے۔ وگرنہ خدا کی طرف سے بعثتِ انبیاء اور دلائل سے بھی لازم ہے۔ ہرچند کہ پیغمبروں کی آمد کے فوائد میں سے ایک "احکامِ عقلیہ" کی تاکید بھی ہے مثلاً بطلانِ شرک، ظلم کی قباحت اور شر و فساد کے مضرات۔

اس کے بعد قرآن میں اُن کافر اقوام کی بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "ہماری طرف سے پیغمبر بھیجے جانے کے بعد بھی نہوں نے بہانہ سازی کو نہ چھوڑا۔ اور اپنی قدیم منحرف راہوں پر چلتے رہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: جس وقت اُن کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو اُنھوں نے کہا کہ اِس پیغمبر کو ویسے ہی معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جیسے کہ موسیٰ کو دیئے گئے تھے: (فلمّا جآءھم الحقّ من عندنا قالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسٰی)۔

اُس کے ہاتھ میں عصائے موسیٰ کیوں نہیں ہے؟ وہ ید بیضا کیوں نہیں رکھتا؟ اُس کے لیے دریا کیوں نہیں پھٹ جاتا؟ اُس کے دشمن غرق کیوں نہیں ہو جاتے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ ویسا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ ہیں اعتراضات اُن کفار کے۔

قرآن مجید میں اِن بہانہ تراشیوں کا اِس طرح جواب دیا گیا ہے۔

کیا گزشتہ بہانہ جُو لوگوں نے اُن معجزات کا جو موسیٰ کو دیئے گئے تھے اِسی طرح انکار نہیں کیا تھا: (اولم یکفروا بما اوتی موسٰی من قبل)۔

کیا اُس عہد کے کفار نے یہ نہیں کہا تھا کہ: یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) ساحر ہیں۔ اِن دونوں نے باہم مشارکت کر لی ہے (تاکہ ہم کو گمراہ کریں) ہم اِن دونوں کا انکار کرتے ہیں: (قالوا سحران تظاھرا وقالوا انا بکل کافرون)۔

اِس مقام پر کلمہ "سحران" استعمال ہوا ہے۔ حسبِ قاعدہ ساحران ہونا چاہیئے تھا۔ کلمہ سحران شدتِ تاکید کے لیے ہے کیونکہ عربوں کی یہ فطرت تھی کہ جب وہ کوئی بات زور دے کر کہنا چاہتے تھے تو وہ صفت کو عین ذات قرار دے دیتے تھے۔ مثلاً عادل شخص کو "عین عدالت"، ظالم کو "عین ظلم"، ساحر کو "عین سحر" وغیرہ۔

اِس مقام پر اِس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ "کلمہ" سحران" سے مراد حضرت موسیٰ کے دو بڑے معجزے "عصا اور ید بیضا" ہوں۔

اگر اِس مقام پر تردیداً یہ کہا جائے کہ کفارِ مصر کے انکار کا کفارِ مکہ کے انکار سے کیا ربط ہے؟ تو اُس کا جواب واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ اہلِ کفر کی بہانہ جوئی کوئی تازہ بات نہیں ہے۔ تمام اہلِ کفر کا مزاج یکساں ہوتا ہے اور اُن کے اعتراضات بھی ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور اُن کے کافرانہ منصوبے بھی یکساں ہوتے ہیں۔

آیت مافوق کی جو تفسیر ہم نے بیان کی وہ تو شبہ سے پاک ہے۔ مگر کچھ مفسّرین نے اِس آیت کی کسی اور طرح سے بھی تعبیر کی ہے۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ "سحران تظاھرا" سے مراد دو پیغمبر حضرت موسیٰؑ اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کیونکہ مشرکینِ عرب یہ کہتے تھے کہ یہ دونوں ساحر تھے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں۔

اِن مفسّرین نے اپنے قول کی تائید میں ایک تاریخی واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ:-

اہلِ مکہ نے چند لوگوں کو علمائے یہود کے پاس ایسے وقت بھیجا کہ وہ اُن کی عید کا دن تھا۔ اُن لوگوں نے علمائے یہود سے سوال کیا کہ کیا واقعاً محمد پیغمبرِ خدا ہے؟

اُن علماء نے جواب دیا کہ "ہم نے توریت میں اُن کا نام اُن کی صفات کے ساتھ پڑھا ہے۔"

اِن نمایندوں نے واپس آکر مشرکینِ مکہ کو تمام واقعہ کہہ سُنایا۔ اُس وقت کفارِ مکہ نے "سحران تظاھرا ... وانا بکل کافرون" کہا (یہ دونوں ساحر تھے اور ہم دونوں کا انکار کرتے ہیں)[1] لیکن دو نکتوں پر غور کرنے سے یہ تفسیر حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

[1] تفسیر رُوح المعانی، جلد ۲۰، صفحہ ۸۱۔

اوّل یہ کہ:-

روایات اور تاریخ سے یہ بات بہت کم ہے کہ مشرکینِ عرب نے حضرت موسیٰؑ پر ساحری کا اتہام لگایا ہو اور شاید یہیں اِس قسم کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ:-

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے درمیان قریباً دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ یہ ادّعا کرے کہ یہ دونوں جادوگر تھے اور انہوں نے ایک دوسرے سے سازش کر رکھی تھی۔ نیز کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی جادوگر ہزاروں سال قبل یہ جان لے کہ آیندہ کیسا آدمی پیدا ہوگا اور وہ کیا دعویٰ کرے گا۔

❖ ❖ ❖

بہر حال مُفسد طبع مشرکینِ مکہ کو اِس امر پر اصرار تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے پاس حضرت موسیٰؑ جیسے معجزات کیوں نہیں ہیں۔ نیز نہ تو وہ اُس شہادت اور اُن علامات کی طرف اعتنا کرتے تھے جو توریت میں پیغمبرِ اکرمؐ کے متعلق موجود تھیں اور نہ وہ قرآن اور اُس کی پُرعظمت آیات ہی پر ایمان لاتے تھے۔ لہٰذا قرآن میں جنابِ رسالتمآب سے یہ کہا گیا ہے (اے پیغمبر) اِن سے کہہ دو کہ اگر تم سچ مچ یہ اعتقاد رکھتے ہو کہ یہ دونوں کتابیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں تو اس کتاب سے زیادہ نورانی اور ہدایت بخش کوئی اور کتاب خدا کی طرف سے لے آؤ تاکہ میں اس کی پیروی کروں: (قل فأتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدٰی منھما اتبعہ ان کنتم صادقین)۔

لیکن ــــ وہ کفارِ مکہ حق طلب نہ تھے بلکہ صرف بہانہ جُو تھے۔ اِس لیے وہ کسی اور عجیب کتابِ ھدایت کے طلب گار اور پیغمبر کے دارائے معجزات ہونے پر مُصر تھے اور اِس حقیقت سے غافل تھے کہ قرآن سے بڑا معجزہ اور اس سے بہتر کتابِ ہدایت اور کونسی ہو سکتی تھی۔ اگر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قرآن کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تو یہی اُن کی حقانیتِ رسالت کے لیے کافی تھا۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ ہے۔ (اے پیغمبر) اگر یہ کفار تمہارے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو جان لو کہ اپنی ہوس کی پیروی کرتے ہیں: (فان لم یستجیبوا لك فاعلم انما یتبعون اھواءھم)۔

کیونکہ جو انسان ہوا پرست نہیں ہوتا وہ ایسی منطقی پیشکش کے سامنے سر جُھکا دیتا ہے لیکن وہ کسی طرح بھی راہِ راست پر نہیں آتے اور پیغمبر کے ہر پیغام کو کسی نہ کسی بہانے سے رُد کر دیتے ہیں۔

کیا ـــ کوئی شخص اُس سے بھی زیادہ گمراہ تر مل سکتا ہے جو اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر کے کسی بھی ہدایت الٰہی کو قبول نہیں کرتا: (ومن اضلّ ممّن اتّبع ھوٰہ بغیر ھدًی من اللہ)۔

یہ مُسلّم ہے کہ خدا ظالمین کے گروہ کی ہدایت نہیں کرتا: (ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین)۔

اگرچہ وہ لوگ گمراہ تھے لیکن اگر اپنی گمراہی کو محسوس کر کے حق طلب ہوتے تو لطفِ الٰہی بہ مقتضائے "والّذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا"[1]

[1] جو لوگ ہماری طرف کوشش کرتے ہیں ہم انہیں ہدایت کے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

ان کے شامل حال ہوتا مگر وہ ستمگر ہیں۔ وہ اپنی ذات پر بھی ظلم کرتے ہیں اور اُس معاشرے پر بھی جس میں وہ رہتے ہیں۔ ان کا مقصدِ حیات فساد اور عناد کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حالت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ راہِ ہدایت کے لیے اُن کی مدد کرے۔

خواہشات پرستی گمراہی کا سبب ہے:

مذکورہ بالا آیات میں ان دونوں باتوں (یعنی خواہش پرستی اور گمراہی) کا رابطہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اُن لوگوں کو گمراہ ترین کہا گیا ہے جنہوں نے اپنی ہوائے نفس کو اپنا رہبر بنالیا ہے اور ہدایتِ الٰہی کو ہرگز قبول نہیں کرتے ــــ اور ہوائے نفس "عقل کی آنکھوں پر ضخیم پردہ ہے۔"

"ہوائے نفس" کسی موضوع سے ایسا دل بستہ کر دیتی ہے کہ انسان میں ادراکِ حقیقت کی قابلیت ہی نہیں رہتی کیونکہ ادراکِ حقیقت کے لیے واقعات کو بطور امرِ مطلق کے تسلیم کرنا اور ہر قسم کے پیشگی فیصلے اور رُجحانِ طبع کو ترک کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ہر موجود جو عینیتِ خارجی رکھتا ہے، خواہ وہ تلخ ہو یا شیریں، ہمارے میلانِ طبع کے موافق ہو یا مخالف، ہمارے ذاتی مفاد سے ہم آہنگ ہو یا نہ ہو، اسے بلا قید و شرط تسلیم کر لینا ہی ادراکِ حقیقت کہلاتا ہے۔ مگر یہ مجرد اصول انسان کی ہوائے نفس سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اس موضوع پر ہم نے سورۃ فرقان کی آیت نمبر ۴۳ کے ذیل میں جلد ۸ میں مفصل بحث کی ہے۔

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ متعدد روایات میں آیت فوق کی تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ گمراہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے فرستادۂ خدا رہبر امام کو قبول نہیں کیا اور صرف اپنی رائے پر چلے ہوئے ہیں[1]

یہ روایات حضرت امام باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور دیگر آئمۂ ہدیٰؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ اپنے مصداق کے لحاظ سے قطعی روشن اور بہ مرتبہ حق الیقین ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان ہر وقت ہدایتِ الٰہی کا نیاز مند ہے اور یہ ہدایت کبھی تو آسمانی کتاب میں جلوہ گر ہوتی ہے، کبھی وجودِ پیغمبر اور اُس کی سُنّت میں، کبھی اُس کے معصوم اوصیا میں اور کبھی عقل و خرد کے استدلال میں۔

بہرکیف انوارِ ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے لیے، لازم ہے کہ انسان اوامرِ الٰہی پر بے چون و چرا عامل ہو اور کسی امر میں بھی اپنی ہوائے نفس کو دخل نہ دے۔

[1] یہ روایات اصولِ کافی اور بصائر الدرجات میں (بمطابق نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۳۲) مذکور ہے۔

۵۱۔ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

۵۲۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

۵۳۔ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝

۵۴۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

۵۵۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ۝

ترجمہ

۵۱۔ ہم اُن لوگوں کے پاس پے در پے قرآن کی آیات بھیجتے رہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۵۲۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے قبل ازیں کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔

۵۳۔ اور جس وقت اُن کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یقیناً یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور ہم پہلے ہی سے مسلمان تھے۔

۵۴۔ ان لوگوں کو دوگنا بدلہ دیا جائے گا کیونکہ وہ صبر کرتے رہے ہیں اور وہ بھلائی سے ساتھ بُرائیوں کو دُور کرتے رہے ہیں۔ اور ہم نے اُنھیں جو رزق دیا ہے اُس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

۵۵۔ اور جب وہ لغو اور بے ہودہ باتیں سُنتے ہیں تو اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال مبارک ہوں۔ تم پر ہمارا (دُور کا) سلام ہے، ہم جاہلوں کے خواستگار نہیں ہیں۔

شانِ نزول

آیاتِ فوق کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین اور راویانِ حدیث نے گوناں گوں روایات نقل کی ہیں۔ ان تمام روایات میں قدرِ مشترک ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآن اور پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت پر علمائے یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت کا ایمان لانا۔

چنانچہ ــــــ سعید ابنِ جُبیر نے روایت کی ہے کہ یہ آیات اُن ستر عیسائی علماء کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جنہیں نجاشی نے عبشہ سے تحقیقِ حال کے لیے مکہ بھیجا تھا۔ جب جناب رسالتمآبؐ نے اُن کے سامنے سُورہ یٰسٓ پڑھی تو اُن پر رِقّت طاری ہوگئی اور ہ رونے لگے اور اُنہوں نے اسلام قبول کرلیا[۱]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیات نجران کے عیسائیوں کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی تھیں، جو آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے تھے ب اُنھوں نے قرآن کی آیات سُنیں تو ایمان لے آئے[۲]

بعض لوگ ان آیات کو "نجاشی" اور اُس کے اہلِ دربار کے متعلق سمجھتے ہیں[۳]

بعض لوگوں نے ان کی شانِ نزول حضرت سلمان فارسیؓ اور علمائے یہود کی ایک جماعت (مثلاً عبداللہ بن سلام، تمیم الداری اور اردو عبدی وغیرہ) کے متعلق سمجھا ہے[۴]

بعض راوی اِن آیات کا مشارٌ الیہ چالیس روشن ضمیر عیسائی علماء کو بتاتے ہیں کہ جن میں سے بتیس تو جناب جعفر ابن ابوطالب کے ساتھ حبشہ سے مدینہ آئے تھے اور آٹھ شام سے آئے تھے جن میں سے مشہور بحیرا راہب شامی بھی تھا[۵]

البتہ اِن میں سے پہلی تین قسم کی روایات ان آیات کے مکہ میں نازل ہونے سے مناسبت رکھتی ہیں اور اُن لوگوں کے قول کی تائید کرتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کُلی سورہ مکی ہے۔ لیکن چوتھی اور پانچویں قسم کی روایات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی تھیں اور یہ روایات اُن لوگوں کے قول پر گواہی ہیں جو ان آیات کو مدنی سمجھتے ہیں۔

بہرکیف ـــ جو بھی ہو ـــ یہ آیات اِس امر پر شاہد ناطق ہیں کہ اہلِ کتاب کے علماء میں سے ایک جماعت نے آیاتِ قرآن سُن کر اسلام قبول کرلیا تھا کیونکہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رسول اللہؐ ایسی حالت میں کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی اُن پر ایمان نہ لایا ہوتا، ایسی بات کہہ دیں کیونکہ اگر یہ آیات مطابقِ واقعہ نہ ہوتیں تو مشرک فوراً آپ کی تکذیب کرتے اور شور مچانے لگتے۔

تفسیر

حق طلب اہلِ کتاب :

گزشتہ آیات میں اُن بہانوں کا ذکر تھا جو مُشرک لوگ حقائقِ قرآن کو تسلیم نہ کرنے کے لیے تراشا کرتے تھے اور ان آیات میں جو

۱، ۲، ۳۔ تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۶، صفحہ ۲۵۷، ۲۵۸۔

۵۔ مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۲۵۸۔

زیرِ بحث ہیں اُن آمادہ دلوں کا ذکر ہے جنہوں نے کلام الٰہی کو سُن کر حق کو قبول کیا، پھر اُس سے وفادار رہے اور دل وجان سے اُس کی اطاعت کی، جب کہ جُہلا کے تاریک دل حق سے ذرہ بھر بھی متاثر نہ ہوئے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے : ہم نے آیاتِ قرآن کو پے در پے اُن کے پاس بھیجا کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں: (ولقد وصّلنا لهم القول لعلهم يتذكرون)[۱]

یہ آیات بارش کے قطروں کی طرح مسلسل اُن پر نازل ہوئیں۔ ان آیات کی شکلیں نوع بہ نوع تھیں اور ان کی کیفیات مختلف تھیں۔ اُن میں کبھی حُسنِ عمل کی جزا کا وعدہ تھا اور کبھی عملِ سُوء کے نتیجے میں دوزخ کی وعید تھی۔ کبھی اُن میں نصیحت و پند تھی اور کبھی خوف دلایا گیا تھا کبھی تو اُن میں عقلی استدلال تھا اور کبھی گزشتہ قوموں کی عبرت انگیز اور ثمر بخش تاریخ بیان کی گئی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ آیات ہر حیثیت سے بہت کامل اور نہایت ہم آہنگ تھیں۔ جس دل میں قبولِ حق کی ذرہ بھر بھی استعداد ہو وہ اُنھیں خود بخود جذب کرلیتا ہے لیکن کور دل لوگوں نے اُنھیں قبول نہیں کیا۔

❖ ❖ ❖

لیکن وہ لوگ جنہیں قبل ازیں ہم نے آسمانی کتاب دی تھی (یہود و نصاریٰ) وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں: (الذين آتيناهم الكتاب من قبله هم به يؤمنون)۔

کیونکہ وہ قرآن کو اُن علامات کے مطابق پاتے ہیں جو وہ اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

اِس مقام پر جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ یہ ایمان لانے والے، اہلِ کتاب، کچھ افراد تھے لیکن آیتِ فوق میں صرف "اہلِ کتاب" کہا گیا ہے، جو کلمہ عمومی ہے۔ اِس میں کوئی قید اور تخصیص نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ جو لوگ ایمان لائے صرف وہی اہلِ کتاب تھے اور باقی کچھ نہیں تھے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اِس مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، جس وقت اُن کے سامنے یہ آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے، یہ یقیناً حق ہیں اور ہمارے خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں: (واذا يتلى عليهم قالوا آمنا به انه الحق من ربنا)۔

البتہ اُن کے لیے ان آیات کی تلاوت ہی کافی تھی تاکہ وہ "آمنّا" کہیں اور تصدیق کریں۔ اِس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے۔

ہم نے پیغامِ الٰہی کو آج ہی قبول نہیں کیا، بلکہ ہم تو پہلے ہی سے مسلمان تھے: (انا كنا من قبله مسلمين)۔

ہم نے اس پیغمبر کے آمد کی علامات اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھی ہیں۔ ہمیں اُن علامات کے مطابق آنے والے سے دلبستگی تھی اور بے چینی سے ہم اُس کا انتظار کر رہے تھے اور جب ہم نے اپنے اُس ہادی کو پالیا جس کا انتظار تھا تو فوراً دل و جان کے ساتھ اُس پر ایمان لے آئے۔

۱۔ "وصّلنا" کا مادہ "وصل" ہے۔ جس کے معنی ارتباط دینے اور متصل کرنے کے ہیں۔ مگر جب یہ مادہ باب تفعیل میں جاتا ہے تو اس میں کثرت اور تاکید کے معنی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

اِس کے بعد قرآن میں اِس تقلید شکن اور حق طلب گروہ کی جزا کے بارے میں فرمایا گیا ہے : یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے صبر و شکیبائی کی وجہ سے دوگنا اجر پائیں گے : (أُولٰئك يؤتون اجرهم مرتين بما صبروا) ۔

اُنھیں ایک دفعہ تو اِس نیکی کا اجر ملے گا کہ وہ اپنی آسمانی کتاب پر ایمان لائے اور اُس کے احکام کے پابند اور وفادار رہے اور دُوسرا اجر اس بات کا ملے گا کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ پر ایمان لائے اور اُنھوں نے اقرار کیا کہ یہ وہی پیغمبر موعود ہیں کہ جن کے آنے کی سابق کتابوں میں خبر دی گئی تھی ۔

اِس مقام پر اِس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ انھیں دوگنا اجر ملنے کا سبب یہ ہے کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ پر اُن کے ظہور سے پہلے بھی ایمان رکھتے تھے اور ظہور کے بعد بھی اُنھوں نے اپنے ایمان کا اعلان کیا ۔ گزشتہ آیات سے یہ معنیٰ سمجھ میں آتا ہے ۔

اِن اہلِ ایمان نے ہر دو مرحلوں میں اپنے اثباتِ ایمان کے لیے نہایت صبر و استقامت کا ثبوت دیا ۔ نہ تو یہود و نصاریٰ کے منحرف الایمان لوگ اُن کے عمل کو پسند کرتے تھے اور نہ وہ معاشرہ جو اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کا مقلد تھا اُنھیں سابق دین سے دستبرداری کی اجازت دیتا تھا ۔ تاہم ـــــ وہ ثابت قدم رہے اور اُنھوں نے عارضی منافع اور ہوائے نفس کو ٹھکرا دیا اور ـ خدا کی طرف سے دوگنا اجر کے مستحق ٹھہرے ۔

اِس کے بعد قرآن میں اُن کے ایک سلسلۂ اعمال کی طرف اشارہ ہے ۔ اُن کے یہ اعمال ایک دوسرے سے زیادہ قدر و منزلت رکھتے ہیں اور وہ ہیں حسنات کے ذریعے سے سیئات کو دُور کرنا ، خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سے انفاق کرنا اور جُہلا کے ساتھ بزرگانہ برتاؤ کرنا ۔ اِن تین صفات کے ساتھ صبر و شکیبائی کا اضافہ کیا جائے تو چار ممتاز صفات ہو جاتی ہیں ۔

سب سے پہلے یہ ذکر ہے کہ :ـ یہ لوگ بدیوں کو نیکیوں کے ذریعے دُور کرتے ہیں : (ويدرءون بالحسنة السيئة) ۔

یہ لوگ بُری باتوں کو اپنی نیک گفتاری سے ، مُنکر کو امر بالمعروف سے ، جاہلوں کے جہل کو اپنے حلم سے ، عداوت اور کینہ توزی کو محبت سے ، قطعِ محبت کو اپنی دوستی اور صلہ رحمی سے دُور کرتے ہیں ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو بجائے اس کے کہ بدی کا بدلہ بدی سے دیں ، بدی کو نیکی کے ذریعے دفع کرتے ہیں ۔

بُرائیوں کے ساتھ مقابلے ، بالخصوص آمادہ ہٹ دھرم افراد کے مقابلے میں مذکورہ روش نہایت مؤثر ہے اور قرآن میں بار بار اِس روش کا ذکر کیا گیا ہے ۔

ہم نے اس موضوع کو جلد ۵ میں سورہ رعد کی آیت ۲۲ اور سورہ مومنون کی آیت ۹۶ کے ذیل میں تفصیلاً تحریر کیا ہے ۔

اِن مومنین کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ : ہم نے اُنھیں جو رزق دیا ہے وہ اس میں سے انفاق کرتے ہیں : (ومما رزقناهم ينفقون) ۔

یہ مومنین اپنے مال اور ثروت میں سے ہی انفاق نہیں کرتے بلکہ اپنے علم و دانش ، اپنی فکری اور جسمانی طاقت اپنی معاشرتی حیثیت بھی (کہ یہ سب خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں) مستحقین اور نیاز مندوں کے لیے کام میں لاتے ہیں ۔

❁ ❁ ❁

نیز اُن مومنین کا ایک اور امتیازِ عملی یہ ہے کہ جس وقت وہ کوئی لغو اور بیہودہ بات سنتے ہیں تو اُس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں :

(واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه) ۔ اور ہرگز لغویات کے جواب میں لغویات نہیں کہتے اور جہل کا جواب جہل سے نہیں دیتے بلکہ ، بیہودہ بکنے والوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ : (و قالوا لنا اعمالنا و لكم اعمالكم) ۔ نہ تو تمہیں ہمارے جُرمِ اعمال کی سزا ملے گی اور نہ ہمیں تمہارے جرمِ اعمال کی مگر تم جلد ہی جان لوگے ہم میں سے ہر ایک کے عمل کا انجام کیا ہوا ہے ۔

اُس کے بعد اِس مطلب کا اضافہ ہے کہ وہ مومنین اُن جُہلا سے (جو یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اذیت ناک باتوں سے باایمان اور نیکوکار افراد کو غصہ دلائیں اور اُن کی دل آزاری کریں) رُخصت ہو جاتے ہیں اور اُن سے یہ کہتے ہیں " تمہیں ہمارا سلام ہو ، ہم جاہلوں کے طالب نہیں ہیں : (سلام عليكم لا نبتغي الجاهلين) ۔

ہم نہ تو بدگو ہیں اور نہ جاہل اور فسادی ، اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں ۔ ہم تو روشن ضمیر اہلِ دانش اور علمائے عامل اور سچے مومنین کے خواہاں ہیں ۔

اِس عنوان سے وہ لوگ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیوں کو جاہلوں ، کورِ دلوں اور بے خبر بیہودہ بکنے والوں کے مقابلہ میں ضائع اور برباد کریں ، بڑی متانت سے اُن سے کنارہ کش ہو کر اپنے بنیادی مقاصد کے پُورا کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔

قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ جب اس قسم کے افراد سے اُن کا سامنا ہوتا ہے تو اُنھیں سلام تحیت نہیں کرتے بلکہ اُن کا سلام ، سلام رُخصت ہوتا ہے ۔

❁ ❁ ❁

قلوبِ باایمان :

مذکورۂ بالا آیات میں اُن قلوب کی نہایت حسین اور جاذب تصویر کھینچی گئی ہے جن میں ایمان کا بیج ہے اور وہ اُس کی پرورش کرتے ہیں ۔

وہ اُن بے شخصیت افراد کے زُمرے میں سے نہیں ہیں جو جہل ، تعصّب ، بدزبانی ، بیہودہ گوئی اور بخل و کینہ توزی کا مخزن ہیں ۔

یہ لوگ ایسے بزرگوار اور پاک زبان ہیں کہ اُنھوں نے سب سے پہلے کورانہ تقلید کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے ۔ اس کے بعد اُنھوں نے توحید کی منادی کو بہ توجہ تام سُنا اور جب اُنھیں دلائلِ حق کی صداقت کا یقین ہو گیا تو اُنھوں نے حق کو قبول کر لیا ۔

اِس میں شک نہیں کہ ایسے لوگوں کو تقلید شکنی اور اپنے منحرف الحق معاشرے سے جُدا ہونے کا گراں تاوان ادا کرنا پڑتا ہے اور بہت سی تکالیف اور محرومیاں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں ۔ مگر اُن میں اس قدر صبر و شکیبائی کا جوہر ہوتا ہے کہ وہ پیشِ نظر عظیم مقصد کے لیے اِن تمام مشکلات کو برداشت کر لیتے ہیں ۔

یہ لوگ نہ تو کینہ توز ہوتے ہیں کہ ہر بدی کا بدتر جواب دیں اور نہ بخیل و خسیس ہوتے ہیں کہ عطیاتِ الٰہی کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیں ۔

وہ لوگ ایسے بزرگوار ہیں جو مذکورہ بالا نقائص کے علاوہ دروغ ، نامناسب مشاغل ، لڑائی جھگڑوں ، بیہودہ بحثوں ، بے معنی باتوں ، رکیک حرکتوں اور ان جیسی جُملہ ناشائستہ باتوں سے مُحترز رہتے ہیں ۔ وہ پاک زبان اور پاکیزہ قلب رکھتے ہیں ۔ وہ اپنی فعّال اور کارساز توانائیوں

کو جہلا سے جھگڑا کرکے تباہ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ بہت سے موقعوں پر سکوت کو (جو کہ ایسے احمقوں اور بے خرد لوگوں کے لیے بہترین جواب ہے) گویائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے اعمال اور فرائض کی فکر میں رہتے ہیں اور اُن پیاسوں کی طرح جو چشمۂ آب کی طرف جاتے ہیں وہ لوگ بھی علم و دانش کے پیاسے ہیں اور علماء اور دانشمندوں کی صحبت میں حاضر ہونے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

ہاں —— یہی وہ بزرگوار لوگ ہیں جن میں اتنی سعادت موجود ہے کہ ایمان کے پیغام کو دل سے قبول کرتے ہیں اور بیشگاہ خداوندی سے اپنے اعمال خیر کا ایک گنا نہیں بلکہ دوگنا اجر پاتے ہیں۔

یہ لوگ حضرت سلمان فارسی، نجاشی یا بحیرا جیسے متلاشیٔ حق یا اُن ہی جیسے اور اُن ہی کے ہم پایہ ہوتے ہیں کہ جب اُنھیں ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں تو وہ منزل ایمان پر پہنچنے کے لیے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔

اس ضمن میں حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث جاذبِ توجہ ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

نحن صبراء و شیعتنا اصبر منا و ذٰلک انا صبرنا علی ما نعلم و صبروا علی ما لا یعلمون۔

ہم صابر ہیں اور ہمارے شیعہ ہم سے زیادہ صابر ہیں کیونکہ ہم تو اسرارِ اُمور سے آگاہ ہیں، پھر صبر کرتے ہیں (اور طبعاً یہ کام آسان تر ہے) مگر وہ اسرارِ اُمور کو جانے بغیر صبر و شکیبائی کو نہیں چھوڑتے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ دو جانباز آدمی میدانِ جہاد میں قدم رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک انجام کار سے باخبر ہے اور جانتا ہے کہ اس جہاد کا نتیجہ فتح ہو گا۔ لیکن دوسرا شخص باخبر نہیں ہے اور محض خوشنودیٔ خدا کے لیے میدان میں آیا ہے۔ اس حالت میں کیا دوسرے کا صبر پہلے شخص کے صبر سے اولیٰ نہیں ہے؟

یا بالفرض —— اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ متذکرہ دونوں افراد شہید ہو جائیں گے۔ مگر اُن میں سے ایک یہ جانتا ہے کہ شہادت میں کون کونسے اسرار نہاں ہیں اور اس شہادت کے مستقبل کے آئندہ زمانے پر کیا اثرات مترتب ہوں گے اور یہ شہادت آئندہ نسلوں کے لیے ایک نمونہ بن جائے گی۔ لیکن دوسرا شخص اسرارِ آئندہ سے مطلق بے خبر ہے۔ اس لیے دوسرا شخص جب جنگی مصائب پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر بلند تر ہے۔

ایک اور حدیث میں (جو کہ علی بن ابراہیم کی تفسیر میں درج ہے) منقول ہے کہ آیت فوق میں "لغو" سے مراد:۔ کذب، لہو اور غنا ہے۔ اس سے پرہیز کرنے والے آئمہؑ ہیں۔

یہ واضح ہے کہ گزشتہ دونوں احادیث میں بیانِ مصداق کے لحاظ سے کوئی ابہام نہیں ہے۔ وگرنہ "لغو" کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں حدیث دوم کی مراد کے علاوہ اور چیزیں بھی شامل ہیں اور تمام راست کردار مومنین "لغو" سے اعراض کرتے ہیں لیکن اس خصوص میں آئمہؑ کا مقام افضل ترین ہے۔

۵۶۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

۵۷۔ وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۶۔ جسے تو نہیں چاہتا ہدایت نہیں پا سکتا بلکہ خدا ہی جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور خدا ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔

۵۷۔ اور اُنھوں نے کہا کہ اگر ہم تیرے ساتھ ہدایت کو قبول کرلیں تو ہم اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔ کیا ہم نے اُنھیں ایسی جگہ نہیں دی جو حرم امن ہے اور (ہر شہر و دیار کے) ثمرات اُس کی طرف لائے جاتے ہیں کہ جو ہماری طرف سے رزق ہے۔ مگر اُن میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

ہدایت صرف خُدا کے ہاتھ میں ہے:

اگرچہ مفسرین نے زیرِ نظر پہلی آیت کی شانِ نزول میں بہت بحث کی ہے۔ لیکن اُنھوں نے جن روایات کو بنیادِ بحث بنایا ہے وہ بے اعتبار و بے وقعت ہیں۔ اور خاص مقاصد کے لیے اُنھیں وضع کیا گیا ہے۔ لہٰذا —— ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن مجید ہی سے اخذ کی جائے۔ اس کے بعد اُن مشکوک اور جعلی روایات کی تحقیق کی جائے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ گزشتہ آیات میں دو گروہوں کا ذکر تھا۔ ایک گروہ تو ہٹ دھرم کفارِ مکہ کا تھا۔ جنابِ رسولِ خداؐ نے ہر چند اُنھیں ہدایت دینے کی کوشش کی، مگر اُن کے دلوں میں نورِ ایمان کا نفوذ نہ ہوا۔ ان کے برعکس مکہ سے دور دراز فاصلے پر رہنے والا ایک گروہ اہلِ کتاب کا تھا، جنھوں نے ہدایتِ الٰہی کو قبول کیا اور راہِ اسلام میں فرطِ جذبات کے ساتھ استقلال و ایثار کا ثبوت دیا۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے خود پرست جاہلوں اور قریبی عزیزوں کی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کی اور اُن سے خوفزدہ نہ ہوئے۔ ان امور پر توجہ کرنے کے بعد زیرِ نظر پہلی آیت سے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اے پیغمبر تم جسے چاہتے ہو اُسے ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے

اور وہ ہدایت پانے والوں کو خُوب جانتا ہے: (انك لا تهدی من احببت ولٰكن الله يهدی من يشآءُ وهو اعلم بالمهتدين)۔

وہی جانتا ہے کہ کون لوگ اس لائق ہیں کہ ایمان قبول کریں۔ وہی جانتا ہے کہ کونسے دل طلب حق میں بے چین ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ کن سروں میں عشقِ الٰہی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ ہاں۔ وہ ان شائستہ افراد کو خوب پہچانتا ہے۔ وہ اُنھیں توفیق عنایت کرتا ہے اور اپنے لطف کو اُن کا رفیقِ راہ بناتا ہے تاکہ وہ ایمان کی راہ اختیار کریں۔

لیکن —— وہ زشت سیرت تاریک دل جو دشمنِ حق ہیں اور اپنے تمام وسائل سے فرستادگانِ خدا کے خلاف جنگ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی روش زندگی کے لحاظ سے اِس قدر آلودہ اور شرمناک ہیں کہ کسی طرح بھی اُن کا ظرف نُورِ ایمان کو قبول نہیں کرسکتا خدا ہرگز ایسے لوگوں کی راہ میں چراغ توفیق نہیں جلاتا۔

بنا بریں —— اِس مقام پر " ہدایت " سے مراد " ارائه طريق " نہیں ہے۔ کیونکہ راہِ راست کی ہدایت تو پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ بغیر استثنا ہر ایک کی رہبری کرتا ہے۔ بلکہ یہاں ہدایت سے " ایصال بہ مطلوب " اور منزلِ مقصود تک پہنچانا مراد ہے اور یہ صرف خدا کا کام ہے کہ دلوں میں ایمان کا بیج بوئے اور خدا کا یہ کرم بھی عام نہیں ہے۔ بلکہ وہ اہل دلوں پر نظر ڈالتا ہے اور پھر اُنھیں یہ نُورِ ایمانی عطا کرتا ہے۔

بہرحال یہ آیت ایک طرح سے پیغمبر کی دلجوئی کے لیے ہے تاکہ وہ اس واقعیت کی طرف متوجہ ہوں کہ نہ تو مکہ کے بُت پرستوں کے گروہ کا شرک پہ اصرار بے وجہ ہے اور نہ مردم حبشہ یا نجران اور حضرت سلمان اور بحیرا جیسے لوگوں کا ایمان لانا ہی بے دلیل ہے۔ پیغمبر کو چاہیئے کہ گروہ اوّل کے ایمان نہ لانے سے ہرگز ملول خاطر نہ ہوں کیونکہ یہ نورِ الٰہی صرف دلہائے آمادہ کو تلاش کرلیتا ہے۔ پھر وہاں داخل ہوتا ہے اور سکونت پذیر ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی مثالیں آیاتِ قرآنی میں بہت ہیں۔

چنانچہ ہم سُورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۲ میں پڑھتے ہیں:

لیس علیك هداهم ولٰكن الله یهدی من یشآءُ

تم اُن کی ہدایت کے ذمّہ دار نہیں ہو بلکہ خدا جسے چاہتا ہے اُسے ہدایت کرتا ہے۔

اور سورۂ نحل کی آیت ۳۷ میں فرمایا گیا ہے:

ان تحرص علی هداهم فان الله لا یهدی من یضل

اِس گروہ کی ہدایت پر تیرا اصرار مؤثر نہیں ہے کیونکہ خدا نے جسے گمراہ کر دیا ہے، اسے ہدایت نہیں کرتا۔

اور سورۂ یونس کی آیت ۴۳ میں مذکور ہے:

افانت تهدی العمی ولو كانوا لا یبصرون

تم اندھوں کو ہدایت کرنا چاہتے ہو، ہرچند کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے اور کسی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کرتے۔

بالآخر سورہ ابراہیم کی چوتھی آیت میں ایک قانون کُلّی طور فرمایا گیا ہے:

فیضل الله من یشآء ویهدی من یشآء وهو العزیز الحکیم ۰

خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

اِس آیت کا آخری جملہ یہ واضح کرتا ہے کہ اِن دونوں گروہوں کے بارے میں خدا کی مشیت کورانہ نہیں ہے بلکہ بر بنائے معیارِ حکمت اور افراد کی اہلیت، تلاشِ حق کے لیے ان کی جستجو اور ان کے ظروف اور قابلیتوں کے مطابق ہے۔ وہ صرف اسی لحاظ سے کسی جماعت کو توفیقِ ہدایت عطا کرتا ہے اور کسی گروہ سے اُسے سلب کر لیتا ہے۔

* * *

آیاتِ زیرِ بحث میں سے دوسری میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جو دل میں تو اسلام کی حقانیت کے معترف تھے لیکن اپنے ذاتی مفادات کے خیال سے ایمان نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: اُنھوں نے کہا کہ اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کو قبول کرلیں، اور اُس کی پیروی کریں، ہمیں زمین سے اُچک لیں گے: (وقالوا ان نتبع الهدٰی معك نتخطف من ارضنا)[1]

تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ بات حارث بن نوفل نے کہی تھی۔ وہ حضرت پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا:

"ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ حق ہے لیکن جو چیز ہمارے لیے آپ پر ایمان لانے اور قبولِ حق سے مانع ہے وہ یہ ہے کہ عرب ہم پر یلغار کردیں گے اور ہمیں ہماری زمینوں سے اُٹھا لے جائیں گے اور ہم میں اُن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔"[2]

یہ بات صرف وہی آدمی کہہ سکتا ہے جو خدا کی قدرت کو ناچیز سمجھتا ہے اور تھوڑے سے جاہل عربوں کی قوت کو بہت عظیم۔ یہ بات صرف وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کی عنایات اور اُس کی حمایت کے رموز سے آشنا نہیں ہے اور یہ نہیں جانتا کہ وہ اپنے محبّوں کی کس طرح مدد کرتا ہے اور اپنے دشمنوں کو کس طرح برباد کر دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن ایسے لوگوں کے جواب میں فرماتا ہے:

کیا ہم نے اُنھیں ایسی جگہ نہیں دی جو جائے امن ہے۔ اور شہر و دیار کے ثمرات اُن کی طرف لائے جاتے ہیں: (اولم نمکن لهم حرمًا اٰمنًا یجبٰی الیه ثمرات کل شیءٍ)[3] اور یہ رزق ہماری طرف سے ہے: (رزقًا من لدنا)۔ مگر اُن میں سے اکثر یہ نہیں جانتے: (ولٰكن اكثرهم لا يعلمون)۔

وہ خدا جس نے شورہ زار، سنگلاخ اور بے آب و گیاہ زمین کو حرمِ امن قرار دے کر اور مخلوق کے دلوں کو اُس کی طرف ایسا متوجہ کرکے

---

[1] " آیت فوق میں " معك " " نتبع " سے متعلق ہے اور اس امر کا احتمال بھی ہے کہ اس کا تعلق " هدٰی " سے ہو۔ اِس طرح معنیٰ میں خفیف سا فرق ہو جائے گا۔

[2] " مجمع البیان " زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] " یجبٰی " کا مادہ " جبایة " ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں " جمع کرنا " لہٰذا اُس حوض کو جس میں پانی جمع کرتے ہیں " جابیة " کہتے ہیں۔ ضمناً اُوپر کی آیت میں " نمکن " " نجعل " کے معنیٰ میں ہے اور " حرمًا " مفعول ہے۔ ورنہ " نمکن " اپنے اصلی معنیٰ میں جو کہ " تمکین دینا " ہیں " فی " کے صلہ سے متعدی ہوتا ہے۔

دنیا کے مختلف مقامات سے بہترین پیداوار اس کی طرف لاتے ہیں، اپنی قدرت کو خوب ظاہر کر دیا ہے۔

وہ خدا جس نے ایسی قدرت نمائی کی ہے اور ایسی سرزمین کو ایسی امنیت اور ایسی نعمتیں بخشی ہیں کہ تم اپنی آنکھوں سے اُن کے آثار دیکھتے ہو اور سالہا سال سے اُن نعمات سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، کیا وہ اس امر پر قادر نہیں ہے کہ تھوڑے سے بُت پرست عرب اگر تم پر حملہ آور ہوں تو وہ اُن سے تمہاری حفاظت کر سکے ؟

تم کو حالت کفر میں خدا کی دو بڑی نعمتیں ــــ امنیت اور نعمات زندگی، نصیب ہوتی رہی ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بعد اسلام خدا تمہیں اُن نعمتوں سے محروم کر دے۔ دل قوی رکھو، ایمان لاؤ اور مزاج میں استقلال پیدا کرو کہ خدائے کعبہ و مکہ تمہارے ساتھ ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ حرم مکہ مسلمانوں کے لیے تو اس قدر جائے امن و امان نہ تھا۔ کیا مسلمانوں کی ایک تعداد پر ظلم و تعدی نہیں کی گئی ؟ کیا اہل مکہ نے رسول اللہ کو پتھر نہیں مارے ؟ کیا بعض مسلمانوں کو مکہ میں قتل نہیں کیا گیا ؟ کیا آخر کار حضرت جعفر طیار کے ساتھ کچھ لوگوں نے اور پھر باقی افراد نے حضرت پیغمبرؐ کے ساتھ اس خیال سے کہ وہ وہاں اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے تھے ہجرت نہیں کی ؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود مکہ میں دوسرے مقامات سے زیادہ امن تھا اور عرب اُس مقام کو محترم اور پاک سمجھتے تھے اور جن گناہوں کے وہ دوسرے مقامات پر مرتکب ہوتے تھے، وہاں اُن کے ارتکاب کی جرأت کم کرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ عین بے امنی کے زمانے میں بھی بڑی حد تک پُرامن تھا۔ خاص طور پر شہر مکہ میں اُس کے اطراف و جوانب کے علاقوں کی نسبت زیادہ امن رہتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آغازِ اسلام میں ایک قلیل مدت تک یہ سرزمین امن الٰہی مسلمانوں کے لیے ناآسودگی اور بے امنی کا مقام ثابت ہوئی۔ مگر زیادہ عرصہ نہ گذرا کہ یہ مقام پائدار امن کا مرکز اور جملہ اقسام کی عظیم نعمات کا مرکز بن گیا بنابریں مسلمانوں کے لیے ان جلد گزر جانے والی مشکلات کا، عظیم نعمتوں کے حصول کے لیے برداشت کرنا کچھ سخت کام نہ تھا۔

بہرحال ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے نقصان کے خوف سے حارث بن نوفل کی طرح ہدایت اور ایمان سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ خدا پر ایمان لانا اور اُس کے احکامات پر عمل کرنا صرف اُن کے دُنیاوی مفادات ہی کو خطرات سے محفوظ نہیں کر دیتا بلکہ اُن کے مشروع مادی منافع اور اُن کے لیے امن و سلامتی کا معاشرہ پیدا کرنے کے لیے بھی غیر معمولی طور پر مفید ہے۔

آج کی دُنیا میں جسے متمدن کہا جاتا ہے، جو قتل و غارت، خوں ریزی اور تباہ کاری ہم دیکھتے ہیں وہ اس امر کی زندہ گواہ ہے کہ لوگ ایمان اور ہدایت سے دُور ہو گئے ہیں۔

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ خدا نے اس مقام پر پہلے نعمتِ امن کا ذکر کیا ہے اور اُس کے بعد ہر سمت سے مکہ کی طرف ضروریاتِ انسانی کے آنے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ترتیب اس امر کی نشاندہی کرتی ہو کہ جب تک کسی ملک یا شہر میں امن و امان کا دَور دَورہ نہ ہو، اُس وقت تک وہاں کی اقتصادی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ ہم نے اس مطلب کو جلد ۶ میں سورۂ ابراہیم

کی آیۃ ۳۵ کے تحت مفصل بیان کیا ہے۔

علاوہ بریں آیۃ میں "یجبی" فعل مضارع کی صورت میں استعمال ہوا ہے، جو حال اور مستقبل کی حالت استمراری پر دلیل ہے چنانچہ ہم چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس سرزمین کی جانب ہر طرف سے خدا کی نعمتیں کھنچی چلی جا رہی ہیں۔ جو لوگ خانۂ خدا کی زیارت کے لیے جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ یہ خشک و سوزاں اور بے آب و گیاہ زمین انواع و اقسام کی بہترین نعمتوں سے پُر ہے۔ شاید دُنیا کے کسی حصے میں بھی نعمتوں کا اتنا وفور نہ ہو گا۔

❊ ❊ ❊

حضرت ابُوطالبؑ کا ایمان اور معاندین کا منشور :

اُن حضرات کو جو اہل مطالعہ ہیں، یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ راویانِ احادیث کی ایک جماعت کو اس امر پر کیوں اصرار تھا کہ جناب رسالتمآب کے چچا کو بے ایمان اور مشرک ثابت کریں جبکہ ان کے متعلق دُنیا کے تمام مسلمان باتفاق اس امر کے قائل ہیں کہ اُنھوں نے اپنی حیات میں پیغمبر اسلامؐ کی حمایت میں انتہا درجہ فدا کاری، قربانی اور ایثار سے کام لیا۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ اُن کی وفات بحالتِ کفر ہوئی۔

آخر دوسرے لوگوں کے متعلق، جن کا اسلام میں کوئی کردار نہیں ہے، یہ اصرار کیوں نہیں ہے ؟ غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی معمولی اور سرسری نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تاریخی اور روایاتی بحثوں کے پیچھے حضرت علیؑ کے رقیبوں کی طرف سے ایک خطرناک سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس امر پر نظر کرنے سے کسی مزید دقت نظر کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

ان معاندین کا اس امر پر زور تھا کہ علیؑ سے ہر فضیلت چھین لیں۔ حتیٰ کہ اُن کے باایثار اور فداکار باپ کو مُشرک ثابت کریں اور اُنھیں بحالت عدم ایمان دُنیا سے رُخصت کریں۔

یقیناً بنی اُمیہ اور اُن کے ہواخواہ اپنے عہد میں برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بھی، اس فتنہ پردازی میں مشغول رہتے تھے اور کوشش میں لگے رہتے تھے کہ جہاں سے بھی ممکن ہو اس مقصد کے لیے شواہد جمع کریں خواہ وہ کیسے ہی کمزور اور بے بُنیاد ہوں۔

ہم اس کثیف اور گندی سیاست کی مخالفانہ امواج سے جو اپنی جگہ پر غور و فکر کی مستحق ہے، سے قطع نظر کرتے ہوئے ــــ جہاں تک موضوعِ کتاب اجازت دیتا ہے، اس موضوع کا تاریخی اور تفسیری حیثیت سے حقیقت طلبانہ مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ قارئین پر یہ روشن ہو جائے کہ اس ہنگامۂ اختلاف کی پُشت پر کوئی معتبر سند موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف حقیقت ہونے پر زندہ شواہد موجود ہیں۔

۱۔ آیۃ زیر بحث یعنی (انك لاتهدی من احببت ....) کا کسی طرح بھی جناب ابوطالب سے کوئی ربط نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے ماقبل کی آیات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ آیات مشرکین مکہ کے خلاف اہل کتاب میں سے مومنین کی ایک

جماعت کے متعلق نازل ہوئی تھیں۔

جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ فخر رازی جس نے اس آیۃ کو (اجماعِ مسلمین کا نام لے کر) حضرت ابوطالب کی جانب منسوب کیا ہے، خود ہی اعتراف کرتا ہے کہ آیۃ اپنے ظاہری معنیٰ کے لحاظ سے کسی طرح بھی ابوطالب کے کفر پر دلالت نہیں کرتی۔[1]

اس تصریح کے بعد بھی بعض لوگوں کا یہ اصرار کیوں ہے کہ اس آیۃ کو حضرت ابوطالب کے شرک سے مربوط کر دیں۔ واقعاً یہ بات بہت حیران کن ہے۔

۲۔ اس موضوع پر جو سب سے بڑی دلیل قائم کی گئی ہے وہ "ادعائے اجماعِ مسلمین" ہے کہ جناب ابوطالبؑ دُنیا سے مشرک رخصت ہوئے۔

جبکہ اس اجماع کا ذکر محض جھوٹ ہے۔ جیسا کہ اہلِ سُنّت کے مشہور مفسّر آلوسی نے اپنی تفسیر رُوح المعانی میں تصریح کی ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں ہے اور آیۃ زیرِ بحث کے متعلق اجماعِ مسلمین یا مفسّرین کی یہ روایت کہ یہ حضرت ابوطالبؑ کے متعلق نازل ہوئی تھی، درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ علمائے شیعہ اور ان کے بہت سے مفسّرین حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے معتقد ہیں اور اس موضوع پر اُنھوں نے اہلبیت علیہم السّلام کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ علاوہ بریں حضرت ابوطالبؑ کے اپنے اکثر قصائد اُن کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں۔[2]

۳۔ تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "اجماعِ مسلمین" کے ادعا کا سرچشمہ اخبارِ احاد ہیں جن کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ان روایات کی سند میں جن افراد کے نام آتے ہیں وہ مشکوک یا کذاب ہیں۔

ان روایات میں سے ایک ابنِ مردویہ نے اپنی ہی سند کے ساتھ ابنِ عباس سے نقل کی ہے:

آیۃ "انك لا تهدى من احببت" ابوطالب کے متعلق نازل ہوئی ہے پیغمبرِ اسلام نے اُن سے اسلام قبول کرنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا۔[3]

حالانکہ اس روایت کی سند میں "ابوسھل سری" کا نام بھی ہے اور بزرگانِ علمِ رجال کی تصریح کے مطابق وہ حدیث چوروں، جھوٹوں اور روایتیں گھڑنے والوں میں سے تھا۔ "عبدالقدوس ابن سعید دمشقی" کا نام بھی اس حدیث کی سند میں آتا ہے حالانکہ وہ بھی کذابین میں سے تھا۔

بظاہر اس حدیث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ابنِ عباس نے اسے کسی واسطے کے بغیر بیان کیا ہے اور وہ خود اُن حالات کے شاہد و ناظر تھے۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ ابنِ عباس ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے تھے۔ بنابریں حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے وقت وہ شیر خوار ہوں گے۔ اس سے ثابت ہے کہ یہ حدیثیں گھڑنے والے اپنے فن میں بھی ماہر نہیں تھے۔

اس سلسلے میں ایک حدیث ابوہریرہ سے بھی نقل کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر کبیر از فخر رازی، ج ۲۵ ص ۳۔
[2] رُوح المعانی، ج ۲۰، ص ۸۴۔ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔
[3] دُرِّ المنثور، ج ۵، ص ۱۳۳۔

جس وقت ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہؐ نے اُن سے فرمایا کہ:
اے چچا! کہیئے: "لا اله الّا الله" تاکہ میں بروزِ قیامت آپ کے متعلق مُوحّد ہونے کی گواہی دوں"۔

تو ابوطالب نے جواب دیا:

"اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش مجھے یہ طعنہ دیں گے کہ اُس نے موت کے وقت خوف کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا تو میں ضرور توحید کی شہادت دیتا اور تجھے مسرور کر دیتا۔"

اُس وقت آیۃ "انك لا تهدى من احببت" نازل ہوئی۔

اس حدیث کا ظاہری لب و لہجہ یا اندازِ بیان اس امر کا مظہر ہے کہ ابوہریرہ نے اس وقوعہ کو بچشمِ خود دیکھا تھا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ابوہریرہ نے ہجرت سے سات سال بعد (یعنی فتح خیبر کے سال میں) اسلام قبول کیا تھا۔ تو پھر بھلا وہ حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے وقت کیسے موجود ہو گئے جو ماقبل ہجرت واقع ہوئی تھی۔

بنابریں اس روایت سے بھی غیر ماہرانہ جعل سازی نمایاں ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ "ابنِ عباس اور ابوہریرہ خود اس واقعے کے شاہد نہ تھے اور اُنھوں نے یہ داستان کسی دوسرے شخص سے سُنی تھی تو ہم سوال کرتے ہیں کہ "کس سے"؟

جس آدمی نے یہ روایت ان دونوں آدمیوں سے بیان کی وہ ناشناس اور مجہول ہے۔ ایسی حدیث کو مُرسل کہتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ مرسل حدیث معتبر نہیں ہوتی۔

جائے افسوس ہے کہ مفسّرین اور راویانِ اخبار کی ایک جماعت نے بغیر تحقیق و غور و فکر اس قسم کی احادیث کو ایک دوسرے سے لے کر اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے لیے توجیہِ اجماع بھی فراہم کر لی ہے لیکن ظاہر ہے کہ کہاں کا اجماع؟ اور کیسی حدیثِ معتبر؟

۴۔ ان تمام امور سے قطع نظر کر کے ان جعلی احادیث کا متن ہی غمّاز ہے کہ حضرت ابوطالبؑ پیغمبرِ اسلامؐ پر ایمان لائے تھے۔ ہر چند کہ اُنھوں نے مصالح کے تحت اعلانیہ اقرار نہیں کیا تھا۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور زبان تو محض ایک ذریعۂ اظہار ہے۔

بعض احادیثِ اسلامی میں حضرت ابوطالبؑ کی کیفیت کو اصحابِ کہف سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ لوگ دل میں ایمان پنہاں رکھتے تھے مگر بعض وجوہ کی بنا پر اُس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔[1]

۵۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے اہم مسئلے میں صرف یک طرفہ روایات پر قناعت کر لی جائے اور ابوہریرہ اور ابنِ عباس سے جو روایات منقول ہیں صرف اُنھیں پر اکتفا کر لیا جائے؟

اس مسئلہ میں آئمہ اہلِ بیتؑ اور علمائے شیعہ کے اجماع کو قابلِ توجہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ حالانکہ یہ لوگ خاندانِ پیغمبرؐ کے حالات

---

[1] تفسیر صافی اور تفسیر بُرہان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

ے زیادہ واقف ہیں ۔

حضرت ابوطالبؑ کے بہت سے اشعار ہمارے پاس ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اُن کے ایمان کا
ینہ ہیں ۔ بہت سے بزرگوں اور علماء نے اِن اشعار کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ۔ ہم نے آں جناب کی سُخن گوئی کے چند نمونے تفسیر
ہ کی جلد ۳ میں (سورۂ انعام کی آیۃ ۲۶) کے ذیل میں اہلِ سُنّت کے معروف منابع سے نقل کر دیئے ہیں ۔

۶ ۔ اِن تمام امور سے قطع نظر کر کے حضرت ابُوطالبؑ کی تاریخ زندگی ، جناب رسالت مآبؐ کے لیے اُن کی عظیم قربانیاں اور رسول اللہؐ
سلمانوں کی اُن سے شدید محبت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے ۔

ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کی موت کے سال کا نام مسلمانوں نے " عام الحزن " رکھا ۔ یہ سب باتیں اس امر
لیل ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کو اسلام سے عشق تھا ۔ اور وہ جو پیغمبرِ اسلامؐ کی اس قدر مدافعت کرتے تھے وہ محض رشتہ داری کی وجہ
ہ تھی ۔ بلکہ اس دفاع میں آپ کی حیثیت ایک مومنِ مخلص ، ایک جاں نثار اور ایسے فداکار کی تھی جو اپنے رہبر اور پیشوا کا تحفظ
رہا ہو ۔

اِن واضح حقائق کے باوجود کس قدر غفلت ، بے خبری ، ناشکرگزاری اور ظلم ہے کہ بعض لوگوں کا یہ اصرار ہے کہ ایک مومن
وحّد مخلص کو مشرک قرار دے کر دُنیا سے رُخصت کریں ۔

۵۸ ۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝

۵۹ ۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ۝

۶۰ ۔ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ

۵۸ ۔ اور ہم نے بہت سی ایسی بستیوں کو ہلاک کر دیا کہ جو زیادہ نعمتوں پر مغرور ہو گئی تھیں ۔ یہ ہیں اُن کے گھر (کہ جو ویران ہو چکے ہیں) کہ جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی رہا ہے اور ہم ہی اُن کے وارث ہوئے ۔

۵۹ ۔ اور تیرا ربّ بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اُن کے مرکز میں کوئی پیغمبر نہ بھیجے کہ جو اُن کو ہماری آیات پڑھ کر سُنائے اور ہم بستیوں کو ہرگز ہلاک نہیں کرتے مگر یہ کہ اُن کے باشندے ظالم ہوں ۔

۶۰ ۔ اور جو چیز تمہیں دی گئی ہے وہ متاعِ حیات دُنیا اور اُس کی زینت ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے ! کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۔

تفسیر

دُنیا کی دلچسپیاں تمہیں فریب نہ دیں :

گزشتہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ بعض کفارِ مکّہ کو اِسلام قبول کرنے میں یہ عذر تھا کہ اگر ہم ایمان لے آئیں گے تو عرب ہم پر حملہ کر دیں گے اور ہمیں ہماری سرزمین سے باہر نکال دیں گے اور ہماری زندگیوں میں خلل ڈال دیں گے ۔

گزشتہ آیات میں اس عذر کا ناطق جواب دیا گیا ہے ۔

زیرِ بحث آیات میں اُس عذر کے دو جواب اور بھی دیئے گئے ہیں ۔

خدا پہلے یہ فرماتا ہے : بالفرض یہ کہ تم ایمان کو قبول نہیں کرتے اور بحالتِ کفر و شرک مادّی حیثیت سے خوشحال زندگی بسر

کرتے ہو لیکن یہ نہ بھولو کہ ہم نے بہت سی آبادیوں کو جو اپنی خوشحال اور پُر نعمات زندگیوں پر مغرور تھیں نابود کر دیا: (وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا)۔ البتہ غرورِ نعمت نے اُنھیں سرکشی پر آمادہ کیا اور یہ سرکشی ظلم اور نا انصافی کا سرچشمہ بن گئی۔ اور ظلم نے اُن کی اصل حیات کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ ہیں وہ بستیاں اور اُن لوگوں کے مکانات کہ اُن کی تباہی کے بعد کوئی کم ہی اُن میں بسا (فتلك مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلا)۔

اُن کی بستیاں اور مکانات اُسی طرح خالی، خاموش، ویران اور مکینوں کے بغیر پڑے رہے، اگر کچھ لوگ وہاں آکر رہے بھی تو نہایت قلیل مدت کے لیے اور ہم ہی اُن کے وارث ہوئے: (وکنا نحن الوارثین)۔

اے مُشرکینِ مکہ! کیا تم بھی یہ چاہتے ہو کہ بحالتِ کفر اُسی خوشحال زندگی تک پہنچ جاؤ جس کا انجام ہم نے تمہیں بتا دیا ____ بھلا ایسی زندگی کی کیا قدر و قیمت ہے۔

" **بطرت** " کا مادہ " بَطَر " (بروزن بَشَر) اس کے معنیٰ اُس سرکشی اور غرور کے ہیں جو دولت کی زیادتی کی وجہ سے ہو۔

آیۃ میں جو کلمہ " تلك " استعمال ہوا ہے، یہ اسمِ اشارۂ بعید ہے اور اُن چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو قابلِ مشاہدہ ہیں ممکن ہے کہ اس کلمہ سے اشارہ عاد، ثمود یا قومِ لُوط کی سرزمین کی طرف ہو۔ یہ مقامات اہلِ مکہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ یہ مقامات یا تو احقاف کے علاقہ میں تھے (جو یمن اور شام کے درمیان ہے) یا وادیٔ قُریٰ میں تھے یا سدوم کے علاقے میں۔

الغرض یہ تمام مقامات اعراب مکہ کے اُن تجارتی قافلوں کی راہ میں واقع تھے جو شام کا سفر کرتے تھے اور اہلِ عرب اِن ویران بستیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ اُن کی تباہی کے بعد وہاں کبھی کوئی آباد نہیں ہوا۔

آیۃ نمبر اٹھاون میں جو " الا قلیلا " بصورتِ استثنیٰ آیا ہے، اُس کے لیے تین احتمال ہو سکتے ہیں۔

اوّل یہ کہ ساکنین کو مستثنیٰ کیا گیا ہو۔

دوسرے مساکن کو اور

تیسرے سکونت کو۔

پہلی صُورت میں اُس کا یہ مفہوم ہے کہ اُن مقامات کی تباہی کے بعد تھوڑے سے لوگ وہاں آباد ہوئے۔

دُوسری صُورت میں یہ معنیٰ ہیں کہ اُن مقامات کے صرف چند گھر آباد ہوئے اور

تیسری صُورت میں یہ مطلب ہے کہ ویرانی کے بعد وہاں قلیل مدت تک سکونت رہی ہے۔ کیونکہ جس آدمی نے اُن نحوس اور بلاخیز بستیوں میں سکونت اختیار کی وہ بہت جلد فنا ہو گیا۔

البتہ مذکورہ بالا تینوں تعبیرات کے اختیار کرنے سے منشائے الٰہی کے سمجھنے میں کوئی دُشواری پیدا نہیں ہوتی۔ ہر چند کہ پہلے معنیٰ زیادہ بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

بعض حضرات نے " الا قلیلا " کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ اشارہ ہے اس جانب کہ اِس راہ سے آنے جانے والے مسافر تھوڑی دیر کے لیے یہاں ٹھہر جاتے تھے۔ اور بعض لوگوں نے " قلیل " سے اُلّو اور حیواناتِ وحشی مُراد لی ہے۔ ان تمام آرا اور تعبیرات میں قدرِ مُسلّم یہ ہے کہ یہ گناہ و شرک سے آلودہ بستیاں ایسی ویران ہوئیں کہ پھر وہاں کوئی نہ بسا۔

" کنا نحن الوارثین " کا مطلب یہ ہے کہ وہ بستیاں مکینوں سے خالی رہیں۔ نیز یہ کہ " ہر چیز کا حقیقی مالک خدا ہی ہے " اگر وہ عارضی اور وقتی طور پر بعض انسانوں کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیتا ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ ملکیت زائل ہو جاتی ہے اور مالکِ حقیقی ہی اُس کا وارث ہوتا ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد کی آیۃ درحقیقت ایک سوال مقدر کا جواب ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اگر اصول یہ ہے کہ خدا سرکشوں کو نابود کر دیتا ہے تو پھر اُس نے مکہ اور حجاز کے مشرکوں کو عذاب دے کر نابود کیوں نہیں کیا، جنہوں نے اپنی سرکشی کو آخری حد تک پہنچا دیا تھا اور کوئی ایسی جہالت اور گناہ نہ تھا جس کے وہ مرتکب نہ ہوئے ہوں!

اس کے جواب میں قرآن میں ارشاد ہے کہ تیرا پروردگار ہرگز کسی شہر یا آبادی کو ہلاک نہیں کرتا۔ جب تک اُن کے مرکزی مقام پر کوئی نبی نہ بھیج دے جو اُنھیں ہماری آیات پڑھ کر سُنائے: (وماکان ربك مهلك القرٰی حتّٰی یبعث فی امّھا رسولاً یتلوا علیھم ایاتنا)۔

رُوحِ مفہوم یہ ہے کہ ہم جب تک اتمامِ حُجّت نہیں کر لیتے اور اُس قوم کی طرف صریح احکام کے ساتھ پیغمبروں کو نہیں بھیج دیتے اُس وقت تک اُن کو سرکشی کی سزا نہیں دیتے۔

اتمامِ حجت کے بعد ہم اُن کے اعمال کی نگرانی کرتے رہتے ہیں اگر اُن سے ظلم و ستم سرزد ہوتا ہے اور وہ مستوجبِ عذاب ہوتے ہیں تو ہم اُن کو سزا دیتے ہیں اور ہم ہرگز آبادیوں کو نیست و نابود نہیں کرتے مگر اِس حالت میں کہ اُن کے ساکنین ظالم اور ستمگر ہوں: (وماکنا مھلکی القرٰی الا واھلھا ظالمون)۔

" ماکان " یا " ماکنا " تخصیصی الفاظ اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ دائمی اور جاودانی سُنّتِ الٰہی تھی اور ہے کہ وہ کافی اتمامِ حجت کے بغیر کسی قوم کو سزا نہیں دیتا۔ نیز یہ جُملہ کہ " حتّٰی یبعث فی امّھا رسولاً " (جب تک ان شہروں کے مرکز میں اپنا رسول مبعوث نہ کر دے) اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لازم نہیں ہے کہ خدا ہر شہر اور ہر گاؤں میں اپنا پیغمبر بھیجے۔ صرف ایک ایسے مقام پر جہاں اُس قوم کے دانشمند اور اہلِ فکر لوگ رہتے ہوں اور جہاں سے ہر طرف اطلاعات پہنچ سکتی ہوں، پیغمبر کا مبعوث ہونا کافی ہے۔

کیونکہ اُس علاقے کے تمام لوگ ضروریاتِ زندگی کے لیے ہمیشہ وہاں آتے جاتے ہیں۔ اور وہاں جو بھی واقعہ ہو اس کی خبر بسرعت تمام علاقے میں اور دُور و نزدیک کے مقامات میں پھیل جاتی ہے جیسے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی مکہ میں بعثت کی خبر بہت کم مدت میں تمام جزیرۂ عرب میں پھیل گئی تھی۔ بلکہ اُس سے بھی دُور تک پہنچ گئی تھی ____ چونکہ مکہ عرب کا مرکزی مقام تھا (جسے اُم القریٰ کہتے تھے) یہ مقام حجاز کا مرکزِ رُوحانی بھی تھا اور تجارتی مرکز بھی۔ یہاں تک کہ بعثتِ رسولؐ کی خبر اُس زمانے کے تمام متمدن مقامات تک پہنچ گئی تھی۔

اِس آیتہ میں ایک کُلّی اور عمومی حکم بیان کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے جو اِس آیتہ کا مشارٌ الیہ مکّہ کو سمجھا ہے یہ بالکل بے دلیل بات ہے اور "فی اُمّھا" کہنا بھی ایک عام تعبیر ہے کیونکہ کلمہ "اُم" کے معنی ماں اور مرکزِ اصلی کے ہیں۔ یہ کلمہ صرف مکّہ کے لیے مخصوص نہیں ہے[1]

❁ ❁ ❁

زیرِ نظر آیات میں سے تیسری آیتہ اُن بہانہ ساز کفار کی باتوں کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ اگر ہم ایمان لے آئے تو عرب ہم پر یورش کر دیں گے اور ہماری زندگیوں کو تباہ کر دیں گے۔

اُن کے اِس حیلہ کا رَدّ قرآن میں یہ ہے : تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ حیاتِ دنیا کی بے قدر و قیمت متاع اور صرف اُس کی زینت ہے : (وما اوتیتم من شیءٍ فمتاع الحیٰوۃ الدنیا و زینتھا)۔

مگر جو کچھ خدا کے پاس ہے (یعنی دُوسری دُنیا کی بے پایاں نعمتیں اور رُوحانی برکات) وہ بہتر اور پائیدار ہے: (وما عند اللّٰہ خیرٌ و ابقیٰ)۔ کیونکہ دنیا کی تمام مادّی نعمتوں کے ساتھ بہت سے ناگوار واقعات اور طرح طرح کی مشکلات لگی ہوتی ہیں اور دنیا کی کوئی نعمت بھی ضرر اور خطر سے خالی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جو نعمتیں خدا کے پاس ہیں اُن کی یہ حیثیت ہے کہ وہ دائمی اور جاوداں ہیں اور اس دنیا کی راحتیں اور آسائشیں زود گزر ہیں تو بھلا ان دونوں کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟

اِن حقائق کو پیشِ نظر رکھ کے ایک عاقل انسان تھوڑا سا بھی مقابلہ کر کے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُن نعمتوں کو اِس دنیا کی لذّات پر قربان نہیں کرنا چاہیئے۔ اِس لیے آیتہ کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں ـــــ (افلا تعقلون) کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ؟

فخر رازی نے ایک فقیہ کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ اگر کوئی یہ وصیت کرے کہ اُس کا ایک تہائی مال عاقل ترین لوگوں کو دے دیا جائے تو میرا فتویٰ یہ ہے کہ یہ تہائی مال ان لوگوں کو دیں جو اللہ کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ عاقل ترین انسان وہ ہے کہ زود گزر قلیل متاع کو چھوڑ دے اور پائیدار اور مستقل سرمایۂ فراواں کو لے لے اور یہ اصول صرف اُن لوگوں پر صادق آتا ہے جو فرمانِ الٰہی کے مطیع ہیں۔

اِس کے بعد فخر رازی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اُنہوں نے یہ فقہی حکم اِس زیرِ بحث آیت سے اخذ کیا ہے[2]

---

[1] یہ بات کہ آیا اس آیت میں مستقلاتِ عقلیہ بھی شامل ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس بحث کو جلد ۶ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۵ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی، ج ۲۵، ص ۶

۶۱۔ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○

۶۲۔ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ○

۶۳۔ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ○

۶۴۔ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ○

ترجمہ

۶۱۔ وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اُسے حاصل کر لے۔ کیا وہ اُس شخص جیسا ہے جسے ہم نے حیات دُنیا کی متاع دی ہے اور پھر وہ قیامت کے روز (برائے حساب و جزا) پیش کیا جائے گا۔

۶۲۔ اور وہ دن، جس روز خدا انہیں ندا دے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

۶۳۔ اور وہ لوگ جن کے لیے فرمانِ عذاب ثابت ہو چکا ہوگا، کہیں گے: "اے ہمارے ربّ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا تھا۔ جس طرح ہم گمراہ ہوئے تھے اسی طرح ہم نے انہیں گمراہ کیا۔ اَب ہم اُن سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ درحقیقت ہماری نہیں (بلکہ اپنی ہوائے نفس کی) پرستش کرتے تھے۔

۶۴۔ اور اُن سے کہا جائے گا کہ اُنھیں بلاؤ جنہیں خدا کا شریک قرار دیتے تھے۔ تو وہ اُنھیں پکاریں گے مگر وہ انھیں جواب نہ دیں گے اور جب وہ عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے تو تمنّا کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

تفسیر

وہ لوگ صرف اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے :

آیاتِ محّررہ بالا سے قبل کی آیات میں اُن لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے دُنیا کی نعمتوں کے لالچ میں کفر کو ایمان پر اور شرک کو توحید پر ترجیح دی ـــــ اور زیرِ نظر آیات میں اُس گروہ کی حالت اور راست باز مومنین کی کیفیت میں فرق بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ، خدا ، ایک موازنے کے ذریعے جو بصُورت استفہام کیا گیا ہے ، تمام لوگوں کے وجدان سے انصاف طلب ہو کر کہتا ہے : "وہ آدمی جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے اور وہ یقیناً اُس موعود کو پالے گا، کیا اُس کے مساوی ہے کہ جسے ہم نے صرف متاعِ دُنیا کا حصہ دیا ہے اور قیامت کے دن وہ حساب اور جزائے اعمال کے لیے ہمارے سامنے پیش ہو گا" (افمن وعدناه وعداً حسناً فهو لاقيه كمن متعناه متاع الحيٰوة الدنيا ثم هو يوم القيامة من المحضرين)۔

بدونِ شک ہر وہ شخص جس کا ضمیر بیدار ہے ، وہ خدا کے نیک وعدوں اور اُس کی عظیم جاودانی برکات کو اس دنیا کی فانی نعمات اور زود گزر لذات پر (جن کا انجام جاودانی درد و الم ہے) ترجیح دیتا ہے۔

جملہ " فهو لاقيه " تاکیدی ہے ۔ یعنی اللہ کے وعدہ میں ہرگز تخلف نہیں ہوتا ۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ وعدہ سے تخلف یا تو بوجہ جہل ہوتا ہے یا بوجہ عجز ۔ اور اللہ کی ذات ان میں سے ہر ایک سے پاک ہے۔

" هو يوم القيامة من المحضرين " کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے محضرِ الٰہی میں حاضر ہوں گے ۔ بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آتشِ دوزخ میں حاضر ہوں گے ۔ مگر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے ؛ بہر حال آیت کے تیور بتاتے ہیں کہ ان گناہ آلودہ لوگوں کو بالجبر اور اُن کی رغبت کے خلاف کھینچ کر خدا کے حضور لایا جائے گا ۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کہ حساب اور سزا کا خوف اُن کے پُورے وجود پر چھایا ہوا ہو گا۔

کلمہ " حیاتُ الدنیا " جو قرآن مجید کی مختلف سُورتوں میں بارہا آیا ہے ۔ اِس سے اشارہ حیاتِ آخرت اور زندگی جاودانی و زوال ناپذیر کے مقابلے میں اِس دُنیاوی زندگی کی پستی کی طرف ہے۔

کیونکہ کلمہ " دُنیا " مادہ " دنو " سے مشتق ہے ۔ اس کے وضعی معنیٰ ہیں زمان یا مکان میں یا منزل یا مقام سے نزدیک ہونا ۔ کبھی کلمہ دُنیا اور ادنیٰ اُن چھوٹی موجودات کے لیے (جو انسان کے اختیار میں ہوں) عظیم موجودات کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور کبھی بلند اور عالی موضوعات کے مقابلے میں پست موضوعات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کلمہ کا اطلاق دُور کے مقابلے میں نزدیک پر ہوتا ہے۔

چونکہ اس جہان کی زندگی جہانِ دیگر کے مقابلے میں خفیف اور بے قدر اور نزدیک ہے ۔ اس لیے ، اس کو "حیاتِ دُنیا" کہنا نہایت ہی مناسب ہے۔

اس کلام کے بعد قرآن شریف میں منظر کشی کی گئی ہے کہ روزِ حشر کفار کا کیا حال ہو گا ۔ یہ ایسا منظر ہے کہ اس کے تصور ہی سے رُونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسان کانپنے لگتا ہے۔

چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے : ذرا اُس دن کا تصور کرو کہ خدا اُن مشرکین کو آواز دے گا اور کہے گا جنہیں تم نے میرا شریک قرار دیا تھا وہ کہاں ہیں ؟ (و يوم يناديهم فيقول اين شركاءى الذين كنتم تزعمون)۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال ملامت اور سرزنش کے لیے ہے ۔ کیونکہ روزِ محشر تمام پردے اور حجابات اُٹھ جائیں گے ۔ اُس دن نہ تو شرک کا کوئی مفہوم باقی رہے گا اور نہ مشرک اپنے عقیدے پر باقی رہیں گے۔

اس لیے یہ سوال مشرکین کے لیے ایک قسم کی سرزنش اور اُن کے کیفرِ کردار کو یاد دلانے کے لیے ہے اور ایک طرح کی توبیخ و سزا ہے۔

لیکن قبل ازیں کہ وہ مشرکین جواب دیں ، اُن کے معبود گویا ہوتے ہیں اور وہ اپنے پرستاروں سے متنفر اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ اُن مشرکین کے معبُود کبھی تو پتھر یا لکڑی کے بُت تھے ۔ کبھی مقدس ہستیاں تھیں جیسے فرشتے عیسیٰ اور کبھی جنات اور شیاطین تھے۔

آیۃ میں جن شرکاءِ الٰہی کا ذکر ہے اُن میں سے اِس مقام پر تیسرے نمبر کی جماعت (جنات و شیاطین) گویا ہوتے ہیں ۔ ہم اُن کی گفتگو آیۃ مابعد میں اِس طرح پڑھتے ہیں : معبودوں کا ایک گروہ ، جن کے لیے فرمان عذاب مسلّم ہو چکا ہے یوں کہتا ہے : اے ہمارے پروردگار ہم نے ان پرستاروں کو گمراہ کیا ۔ صحیح ہے کہ ہم نے اُنھیں گمراہ کیا ۔ اِسی طرح کہ جیسے کہ ہم خُود گمراہ تھے (لیکن اُن لوگوں نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی) ہم اُن سے بیزار ہیں ۔ وہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ درحقیقت وہ اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے : (قال الذين حق عليهم القول ربنا هٰؤلاء الذين اغوينا اغويناهم كما غوينا تبرأنا اليك ماكانوا ايانا يعبدون)۔

اِس بنا پر آیۃ فوق سورۂ یونس کی اٹھائیسویں آیۃ کی طرح ہے ۔ جس میں یہ قول ہے :

و قال شركاؤهم ماكنتم ايانا تعبدون

یہ باطل معبُود بروزِ قیامت اپنے عبادت کرنے والوں کی طرف رُخ کر کے کہیں گے تم ہماری پرستش نہیں کرتے تھے۔

اِس طرح یہ گمراہ کرنے والے معبُود ، مثلاً ؛ فرعون ، نمرود اور جن و شیاطین اس قسم کے پرستاروں سے اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار[1]

---

[1] مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے متعلق یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ جواب دینے والے مشرکین کے سردار ہیں اور کفر و شرک کے معتقدین مراد ہیں ۔ (یعنی فقط پرستاروں کا ایک گروہ) یہ لوگ اپنے معبُودوں کے متعلق خدا کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنے پیروؤں کا ذکر کریں گے اور اپنی مدافعت کرتے ہوئے عرض کریں گے ۔ خدایا ہم تو خود گمراہ تھے کہ ہم نے شرک کی راہ اختیار کی ۔ اور اس گروہ نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی اور ہم نے اُنھیں گمراہ کیا ۔ لیکن درحقیقت وہ ہماری اطاعت نہ کرتے تھے ۔ بلکہ وہ تو اپنی ہوائے نفس کی اطاعت کرتے تھے ۔
مگر جو تفسیر ہم نے متن کتاب میں بیان کی وہ صحت سے زیادہ قریب ہے ۔

کریں گے اور اپنی مدافعت کریں گے۔ یہاں تک کہ اپنے اُوپر اُن کی گمراہی کا الزام بھی نہ لیں گے اور کہیں گے کہ " انھوں نے اپنی مرضی سے ہماری پیروی کی تھی"۔ لیکن یہ بدیہی امر ہے کہ نہ تو یہ انکار کچھ کارگر ہوگا اور نہ اُن کی اپنے پرستاروں سے بیزاری اور اظہار برات بلکہ وہ معبُود اپنے عبادت کرنے والوں کے گناہ میں برابر کے شریک اور حصّہ دار ہوں گے۔

اِس مقام پر قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ اُس روز (بروزِ حشر) اِن گمراہ اور گنہگار لوگوں میں سے ہر شخص ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کرے گا اور ہر شخص کی یہی کوشش ہوگی کہ اپنا گناہ دُوسرے کے سر تھوپ دے۔

ہم دُنیا میں چھوٹے پیمانے پر اِس قسم کے واقعات کی نظیر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ باہم مل کر کسی خلافِ اخلاق یا خلافِ قانون فعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور جب وہ گرفتار ہو کر عدالت میں پیش ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہارِ خیال کرتے ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالنے لگتا ہے ـــــ دنیا اور آخرت میں گمراہ اور غلط عملی کے مرتکب لوگوں کا انجام یہی ہے۔

جس طرح سے سُورہ ابراہیم کی آیت نمبر بائیس میں مذکور ہے کہ :

وماکان لی علیکم من سلطان الّا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلوموني ولوموا انفسکم

میرا تو تمہارے اُوپر کچھ زور نہ چلتا تھا۔ میں نے تو تمہیں صرف دعوت دی تھی۔
(یعنی امرِ الٰہی کی مخالف راہ کی طرف بلایا تھا) تم نے بڑے اشتیاق سے اُسے قبول کر لیا۔
اُب تم مجھے نہیں بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

مشرکین کے بارے میں سورۂ "صافات" کی تیسویں آیت میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں گے اور ہر ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرائے گا۔ مگر گمراہ کرنے والے جواب میں واضح طور پر کہیں گے :

وماکان لنا علیکم من سلطانٍ بل کنتم قوماً طاغین

❊ ❊ ❊

بہرحال جب اُن سے اُن کے معبودوں کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ جواب دینے سے عاجز رہ جائیں گے۔ تب اُن سے کہا جائے گا کہ تم اپنے معبودوں کو جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے تھے بلاؤ تاکہ وہ اِس وقت تمہاری مدد کریں :
(وقیل ادعوا شرکائکم)[1]

وہ مشرکین یہ جاننے کے باوجود کہ وہ معبود اِس وقت ذرہ بھر بھی کام نہیں آسکتے، انتہائی پریشانی کی وجہ سے یا ہر طرف سے مایوس ہو کر یا فرمانِ الٰہی کی اطاعت کی وجہ سے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اِس طرح مشرکوں اور اُن کے معبُودوں کو سب کے سامنے رسوا کرے وہ اپنے معبودوں کی طرف دستِ تقاضا دراز کریں گے اور اُنھیں اپنی مدد کے لیے بُلائیں گے: (فدعوھم)۔
لیکن وہ جھوٹے معبود، اُنھیں کچھ جواب نہیں دیں گے اور اُن کی صدائے امداد پر لبیک نہیں کہیں گے: (فلم یستجیبوا لھم)۔
وہ (مشرکین) اُس وقت عذابِ الٰہی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے: (ورأوا العذاب)۔ اور یہ آرزو کریں گے کہ

کاش ہم زندہ ہوتے اور ھدایت یافتہ ہوتے: (لو انھم کانوا یھتدون)[2]
کیونکہ اُس میدانِ قیامت میں وہ جو بھی تدبیر کریں گے ناکامی اور رسوائی کے سوا اُس کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ کیونکہ صرف ایمان و عمل ہی وسیلۂ نجات ہے جس سے وہ لوگ محروم ہوں گے۔

---

[1] " شرکائکم " کی تعبیر اس لیے ہے کہ وہ مشرکین خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے تھے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ شریک تم نے بنائے ہیں۔ اِس کا جواب بھی تم ہی دو۔

[2] "لو انھم کانوا یھتدون " کے متعلق بلند پایہ مفسرین نے بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔ اکثریت نے کلمہ " لو " کو حرفِ شرط سمجھا ہے۔ اس کے بعد اس کی جزا کے متعلق بحث کی ہے۔ بعض نے اس شرط کی جزا اس جُملے کو سمجھا ہے جو "رأوا العذاب" سے مستنبط ہوتا ہے۔ اور اِس جملۂ مقدر کی یہ تاویل کی ہے :

اور بعض لوگوں نے جملۂ مقدر کو اس طرح سمجھا ہے: لو انھم کانوا یھتدون لرأوا العذاب فی الدنیا بعین الیقین

بعض مفسرین نے دوسری جزاؤں کو مقدر سمجھا ہے۔ بعض مفسرین معتقد ہیں کہ اصلاً جواب شرط محذوف ہی نہیں ہے۔ انھوں نے جملہ " راوا العذاب " کو جواب شرط قرار دیا ہے۔ اس قول کی بنا پر جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر وہ بروزِ قیامت چشمِ بینا رکھتے اور ہدایت یافتہ ہوتے تو عذاب کو دیکھتے مگر وہ چشمِ بینا نہیں رکھتے۔

مگر ان تمام معانی کے ماوراء ایک معنٰی اور بھی ہے جسے بالائی سطور میں ہم نے ترجیح دی ہے اور وہ یہ ہے کہ "لو" تمنّا کے لیے ہے۔ ادبی کتابوں میں بالخصوص " مغنی اللبیب " میں اس کی شرح دیکھی جاسکتی ہے۔

۶۵۔ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ○

۶۶۔ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ ○

۶۷۔ فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ○

۶۸۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○

۶۹۔ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ○

۷۰۔ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۶۵۔ اس دن کا سوچو کہ جب خدا اُنہیں پکارے گا اور کہے گا : تم نے مُرسلین کو کیا جواب دیا تھا ۔

۶۶۔ اس دن تمام خبریں اُن پر پوشیدہ رہیں گی (یہاں تک کہ وُہ) ایک دوسرے سے سوال (بھی) نہیں کرسکیں گے ۔

۶۷۔ لیکن جو شخص توبہ کرے ، ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو اُمید ہے کہ وہ فلاح یافتگان میں سے ہو جائے گا ۔

۶۸۔ اور تیرا رب جسے چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے ۔ (اس کے سامنے) ان کا کوئی اختیار نہیں ۔ اللہ اُن شریکوں سے منزّہ و برتر ہے جن کے اُس کے لیے وہ قائل ہیں ۔

۶۹۔ تیرا رب سب جانتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور جس کا اظہار

کر دیتے ہیں ۔

۷۰۔ وُہ اللہ ہے کہ جس کے علاوہ کوئی معبُود نہیں اور حمد و ستائش اُسی کے لیے ہے ۔ اِس جہان میں اور دُوسرے جہان میں حاکمیّت (بھی) اسی کے لیے ہے اور تم سب اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے ۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں مُشرکین کا ذکر تھا ۔ اُن آیات میں اُن سوالات کے بارے میں گفتگو تھی جو اُن سے کیے گئے تھے ۔ زیرِ نظر آیات اُسی گفتگو کا تتمہ ہیں ۔

پہلے اُن کے معبُودوں کے بارے میں سوال تھا ۔ اس کے بعد مرسلین کے ساتھ اُن کے سلوک سے متعلق ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : اُس دن کا سوچو جس دن اللہ اُنہیں پکارے گا اور کہے گا ، تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا ۔ (ویوم ینادیھم فیقول ماذا اجبتم المرسلین) ۔

پہلے سوال کی طرح یقیناً اِس سوال کا بھی اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ۔ اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے اُن کی دعوت کو قبول کیا تھا تو یہ جھُوٹ ہے اور اُس میدان میں جھُوٹ نہیں چل سکتا ۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم نے اُن کی تکذیب کی تھی ، اُن پر تہمتیں دھری تھیں ، اُنہیں جادوگر کا نام دیا تھا ، اُنہیں دیوانہ کہا تھا ، اُن کے خلاف مسلح جنگ کی تھی اور انہیں اور اُن کے پیروکاروں کو قتل کیا تھا ــــــ تو یہ بھی اُن کی بدبختی اور رُسوائی کا باعث ہے ۔

وہاں تو یہ عالم ہوگا کہ اللہ کے عظیم نبیوں سے جب سوال ہوگا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے :

تیرے علم کے سامنے تو ہمارا علم کچھ بھی نہیں تُو تو علّام الغیوب ہے ۔ (مائدہ ـ ۱۰۹)

ایسے عالم میں یہ کوردل مُشرک کیا جواب دے سکتے ہیں ؟

اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : " اُس وقت تمام خبریں اُن سے پردۂ اخفا میں ہوں گی " اور جواب دینے کے لیے کچھ بھی اُن کے پاس نہ ہوگا ۔ (فعمیت علیھم الانباء یومئذ) ۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے بھی کچھ پُوچھ نہ سکیں گے " اور نہ کسی کا کچھ جواب سُن پائیں گے ۔ (فھم لایتساءلون) ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں " عمی " یعنی اندھے پن کی نسبت خبروں کی طرف دی گئی ہے نہ کہ خُود اُن کی طرف ۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ " وہ اندھے ہو جائیں گے " بلکہ کہتا ہے ، " خبریں ایسی اندھی ہوں گی کہ اُنہیں

تلاش نہ کر پائیں گی کیونکہ بسا ایسا ہوتا ہے کہ انسان خود کسی چیز سے باخبر نہیں ہوتا لیکن ایک منہ سے دوسرے کی طرف گردش کرتی ہوئی خبر اُس تک پہنچ جاتی ہے۔ معاشرے میں بہت سی خبریں یونہی پھیلتی ہیں لیکن اُس جہان میں نہ تو یہ لوگ آگاہی رکھتے ہوں گے اور نہ ہی خبر پھیلنے کی صلاحیت۔

اس طرح تمام خبریں اُن سے پوشیدہ رہیں گی۔ جب اُن سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اُن مرسلین کو کیا جواب دیا تھا تو اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑے گا اور وہ سراپا سکوت بن جائیں گے۔

قرآن کی روش یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کافروں اور گنہگاروں پر لوٹ آنے کے راستے کھلے رکھتا ہے تاکہ وہ گناہ کے کسی بھی مرحلے سے راہِ حق کی طرف پلٹنا چاہیں تو اُن کے لیے گنجائش موجود ہو۔ اسی لیے اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے۔ البتہ جو شخص توبہ کر لے، ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجا لائے اُمید ہے کہ فلاح یافتگان میں سے ہو جائے۔ (فاما من تاب وامن وعمل صالحًا فعسٰی ان یکون من المفلحین)۔

لہذا تمہارے لیے راہِ نجات ان تین اقدامات میں ہے:

۱۔ خدا کی طرف بازگشت

۲۔ ایمان

۳۔ عملِ صالح

اس کے بعد یقیناً فلاح و نجات ہے۔

"عسٰی" (اُمید ہے) ــــ اگرچہ جو شخص ایمان و عملِ صالح کا حامل ہو اس کے لیے فلاح یقینی ہے لیکن یہاں ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ فلاح اس حالت کے تسلسل سے مشروط ہے اور چونکہ ضروری نہیں کہ ہر توبہ کرنے والا اپنی اس حالت پر باقی رہے اس لیے یہاں یہ لفظ لایا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جب "عسٰی" کی تعبیر کسی ذاتِ کریم سے صادر ہو تو اس میں قطعی اور یقینی ہونے کا مفہوم پنہاں ہوتا ہے جب کہ اللہ تو اکرم الاکرمین ہے۔

⁂

بعد والی آیت درحقیقت نفیِ شرک اور مشرکین کے بطلان کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تیرا رب جس چیز کو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ (وربك یخلق مایشاء و یختار)۔

تخلیق اُس کے ہاتھ میں ہے اور تدبیر و اختیار اور انتخاب بھی اسی کے ارادے پر منحصر ہے۔ "وہ اس کے مقابلے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے"۔ (ماکان لھم الخیرۃ)[1]

خلق کرنے کا اختیار اُسے حاصل ہے، اختیارِ شفاعت کا حامل وہ ہے اور انبیاء و مرسلین بھیجنے کا اختیار اُسی

[1] "ماکان لھم الخیرۃ" میں "ما" نافیہ ہے۔ البتہ بعض نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ یہاں یہ "ما" موصولہ ہے اور "یختار" کے محذوف مفعول پر معطوف ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے۔

کے پاس ہے ــــ خلاصہ یہ کہ تمام چیزوں کا اختیار اس کی ذاتِ پاک کے ارادے سے وابستہ ہے کیونکہ بتوں سے تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا جب کہ فرشتے اور انبیاء بھی اس کی اجازت ہی سے کچھ کر سکتے ہیں۔

بہرحال یہاں اختیار کا اطلاق اس کی عمومیت کی دلیل ہے یعنی اللہ امورِ تکوینی میں بھی صاحبِ اختیار ہے اور امورِ تشریعی میں بھی ــــ دونوں کا سرچشمہ اس کا مقامِ خالقیت ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر وہ کیونکر راہِ شرک پہ چلتے ہیں اور غیرِ خدا کی طرف کس طرح جاتے ہیں۔

اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اللہ ان شرکاء سے منزہ و برتر ہے جن کے وہ قائل ہوتے ہیں۔ (سبحان اللہ وتعالٰی عما یشرکون)۔

اہلِ بیت علیہم السّلام کے حوالوں سے پہنچنے والی روایات میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں مذکور اختیار، انتخاب اور چناؤ خدا کی طرف سے امام معصومؑ کے انتخاب کی طرف اشارہ ہے۔ نیز "ماکان لھم الخیرۃ" (لوگوں کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہیں) سے بھی یہی مفہوم مُراد لیا گیا ہے۔ ان روایات میں دراصل ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے کیونکہ دین کی حفاظت کا مسئلہ خدا ہی سے مربوط ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس مقصد کے لیے خدا کے علاوہ کوئی اور معصوم رہبر کا انتخاب کر سکے۔[1]

⁂

اگلی آیت میں اللہ تعالٰی کے وسیع علم کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ گزشتہ آیت میں اللہ تعالٰی کے وسیع اختیار کا ذکر ہوا تھا، زیرِ نظر آیت اس کے لیے تاکید یا دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تیرا پروردگار اُسے بھی جانتا ہے کہ جو وہ اپنے سینے میں چھپائے رکھتے ہیں اور اُسے بھی جسے آشکار کرتے ہیں۔ (وربك یعلم ما تکن صدورھم وما یعلنون)۔

یہ ہر چیز پر اس کے احاطے اور اختیار کی دلیل ہے نیز ضمنی طور پر مشرکین کے لیے تہدید ہے کہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ اللہ ان کی نیّتوں اور سازشوں سے آگاہ نہیں ہے۔

⁂

زیرِ بحث آخری آیت درحقیقت گزشتہ آیات کے لیے نفیِ شرک کے بارے میں اخذِ نتیجہ اور توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اللہ تعالٰی کی ان چار صفات کا بیان ہے جو سب اُس کی خالقیت اور اختیار کی فرع ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وُہ خدا ہے کہ جس کے علاوہ کوئی معبُود نہیں (وھو اللہ لا الٰہ الا ھو)۔

کیسے ممکن ہے کہ اُس کے علاوہ کوئی معبُود ہو جب کہ خالق صرف وہ ہے اور تمام اختیارات اسی کے دستِ قدرت میں ہیں لہٰذا جو لوگ شفاعت وغیرہ کے عُذر سے بُتوں کے دامن سے متمسک ہیں وہ سخت اشتباہ میں مبتلا ہیں۔

دُوسری صفت یہ کہ تمام نعمتیں، چاہے اِس جہان کی ہوں چاہے اُس جہان کی سب اسی کی طرف سے ہیں اور یہ

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۴ ص ۱۳۶ بحوالہ اصول کافی اور تفسیر علی بن ابراہیم۔

اس کی خالقیت مطلقہ کا لازمہ ہے۔ اس لیے قرآن مزید کہتا ہے : ہر حمد و ستائش بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے چاہے اس جہان میں ہو چاہے اُس جہان میں۔ (له الحمد فی الاولیٰ والاٰخرة)۔

تیسری صفت یہ ہے کہ دونوں جہانوں میں وہی حاکم ہے۔ (وله الحکم)۔

بدیہی ہے کہ جب خالق و مختار وہ ہے تو تکوینی و تشریعی حاکمیت بھی اسی کے اختیار میں ہوگی۔

چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "تم سب کی بازگشت (حساب و اجر کے لیے) اسی کی طرف ہوگی۔ (والیه ترجعون)۔

وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ، وہ تمہارے اعمال سے آگاہ بھی ہے اور وہی یوم الجزا کا حاکم ہے لہذا تمہارا حساب کتاب اور تمہاری جزا و سزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔

۷۱۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝

۷۲۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

۷۳۔ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

۷۴۔ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

۷۵۔ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۱۔ کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک تمہارے لیے رات ہی کو باقی رکھنا چاہے تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے روشنی لا سکے ؟ کیا تم سنتے نہیں ہو ؟

۷۲۔ کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک دن ہی کو باقی رکھنا چاہے تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے رات لا سکے تاکہ تم اس میں سکون پا سکو ؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو ؟

۷۳۔ یہ امر اس کی رحمت میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ اس میں سکون پاؤ اور فضلِ الٰہی سے فائدہ اُٹھاؤ۔ شاید تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

۷۴۔ اس دن کا سوچ جس میں انہیں پُکارے گا اور کہے گا : کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے ؟

۷۵۔ (اس روز) ہم ہر اُمت میں سے گواہ منتخب کریں گے اور (گمراہ مشرکین سے) کہیں گے اپنی دلیل پیش کرو۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ حق اللہ کے لیے ہے اور جو کچھ بھی وہ افترا پردازی کرتے تھے وہ سب ان (کی نگاہ) سے گُم ہو جائے گا۔

تفسیر

رات اور دن کا وجود عظیم نعمت ہے :

زیرِ بحث آیات نعماتِ الٰہی کے ایک عظیم حصّے کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ یہ نعمات توحید اور نفی شرک پر بھی [illegible]ت کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے زیرِ بحث آیات گزشتہ آیات کی بحث کو ہی مکمل کرتی ہیں۔ ان آیات میں مذکور نعمات اُن [illegible]اتِ الٰہی کا ایک نمونہ بھی ہیں جن کی وجہ سے خدا لائق حمد و ستائش ہے، وہی حمد و ستائش جس کا ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے [illegible]یہ نعمات نظامِ آفرینش اور اس جہان کی تدبیر میں خدا کے مختار ہونے پر بھی شاہد ہیں۔

پہلے دن کی عظیم نعمت یعنی روشنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہی روشنی کہ جو ہر جنبش و حرکت کا سرچشمہ ہے۔ [illegible]اد ہوتا ہے : کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک رات کو طویل کر دیتا تو کیا اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو [illegible]ارے لیے روشنی لے آتا ؟ کیا سُنتے نہیں ہو ؟ (قل ارءیتم ان جعل اللّٰہ علیکم الیل سرمدًا الی یوم القیامۃ من الٰہ غیر اللّٰہ یأتیکم بضیاءٍ افلا تسمعون)[1]

(حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

یہاں لفظ "ضیاء" (روشنی) استعمال کیا گیا ہے کیونکہ دن کا اصلی اور بنیادی مقصد روشنی ہی ہے۔ وہی روشنی کہ جس سے تمام موجوداتِ زندہ کی حیات وابستہ ہے۔ اگر سُورج نہ ہوتا تو نہ درخت اُگتے، نہ پھُول کھِلتے، نہ پرندے پرواز کرتے، نہ انسانوں کی حیات ہوتی اور نہ بارش کا کوئی قطرہ برستا۔

"سرمد" دائم اور ہمیشگی کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے "سرد" کے مادہ سے سمجھا ہے اور اس کا معنیٰ "پے درپے" کیا ہے۔ اس کی میم کو اُنہوں نے زائد قرار دیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ مادہ خود دائم اور ہمیشگی کے معنیٰ میں ہے۔[2]

اگلی آیت "تاریکی" کی نعمت کا ذکر کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : کہہ دو : مجھے بتاؤ اگر خدا روزِ قیامت تک دن کو طویل کر دیتا تو اللہ کے علاوہ کوئی معبود ہے جو تمہارے لیے رات لے آتا تاکہ تم اس میں آرام کر پاتے ؟ کیا دیکھتے نہیں ہو ؟ (قل ارءیتم ان جعل اللّٰہ علیکم النہار سرمدًا الی یوم القیامۃ من الٰہ غیر اللّٰہ یأتیکم بلیل تسکنون فیہ افلا تبصرون)۔

تیسری آیت جو درحقیقت گزشتہ دو آیتوں کا نتیجہ ہے اس میں فرمایا گیا ہے : یہ امر رحمتِ الٰہی میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے ہیں تاکہ تم آرام بھی کر سکو اور دُوسری طرف اپنی زندگی کی خاطر فضلِ خدا سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر سکو اور شاید تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ (ومن رحمتہ جعل لکم الیل والنہار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون)۔

جی ہاں، رحمتِ الٰہی کی وسعت کا تقاضا ہے کہ وہ تمہیں زندگی کے تمام وسائل مہیا کرے۔ ایک طرف تو تمہیں کام کاج اور جنبش و حرکت کی ضرورت ہے کہ جو دن کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں اور دوسری طرف تمہیں راحت و آرام کی ضرورت ہے کہ جو شب کی تاریکی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

دورِ حاضر میں سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ روشنی کی موجودگی میں انسانی جسم کی تمام مشینریاں حرکت میں رہتی ہیں۔ خون کی گردش، سانس لینے کی مشینری، حرکتِ قلب وغیرہ۔ اگر روشنی ضرورت سے زیادہ پڑے یا ایک خاص مقدار سے بڑھ جائے تو خلیے (CELLS) تھک جاتے ہیں اور نشاط و اطمینان کی جگہ فرسودگی سی چھا جاتی ہے۔ اس کے برعکس رات کی تاریکی میں بدن کی مشینریاں ایک گہرے آرام و سکون میں ڈُوب جاتی ہیں۔ ایسے میں قویٰ ایک نشاطِ تازہ حاصل کرتے ہیں۔[3]

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ)

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] "ارءیتم" کا عام طور پر "اخبرونی" (مجھے بتاؤ) معنی کیا جاتا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کبھی یہ لفظ "ھل علمتم" (کیا تم جانتے ہو؟) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[2] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اربابِ لُغت نے تصریح کی ہے کہ "سرمدی" ایسے موجود کو کہا جاتا ہے کہ جس کا نہ آغاز ہو اور نہ انجام جب کہ "ازلی" اُسے کہتے ہیں جس کا آغاز نہ ہو اور "ابدی" اُسے کہتے ہیں جس کا انجام نہ ہو۔

[3] تفسیر نمونہ کی آٹھویں اور بارہویں جلد میں اس مسئلے کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ قرآن جس وقت دائمی رات کا ذکر کرتا ہے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے :

"کیا سُنتے نہیں ہو ؟"

اور جس وقت دائمی دن کے بارے میں بات کرتا ہے تو فرماتا ہے :

"کیا دیکھتے نہیں ہو ؟"

تعبیر کا یہ فرق ہوسکتا ہے اس بناء پر ہو کہ رات سے مناسبت رکھنے والی حسِ قوتِ شنوائی ہے جب کہ دن کے ساتھ مناسبت رکھنے والی حس بینائی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے اپنی تعبیرات میں کس حد تک باریک بینی سے کام لیا ہے۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ اس سلسلۂ کلام کے آخر میں "شکر" کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ نور و ظلمت کا ایسا جچا تُلا نظام عطا ہونے پر شکر —— ایسا شکر جو بہر صورت انسان کو معرفتِ منعم پر آمادہ کرتا ہے اور ایسا شکر جو افزائشِ ایمان کا باعث بنتا ہے۔

توحید اور نفی شرک کے بارے میں کچھ دلائل ذکر کرنے کے بعد قرآن پھر اسی سوال کی طرف لوٹتا ہے جو گزشتہ آیات میں زیرِ بحث تھا۔ فرماتا ہے: اس دن کا سوچو کہ جب خدا انہیں پکارے گا اور کہے گا :

کہاں ہیں وہ جو بزعم خود تم نے شریک قرار دے رکھے تھے۔(ویوم ینادیھم فیقول این شرکاءی الذین کنتم تزعمون)۔

یہ آیت بعینہٖ اسی سُورہ کی آیت ۶۲ ہے۔ ہوسکتا ہے یہ تکرار اس بناء پر ہو کہ روزِ قیامت پہلے مرحلے میں اُن سے ایک انفرادی سوال ہوگا تاکہ اُن کا ضمیر بیدار ہو جائے اور وہ شرمندہ ہوں۔ جب کہ دُوسرے مرحلے میں سب لوگوں اور گواہوں کی موجودگی میں سوال کیا جائے گا تاکہ وہ شرمسار ہوں اور دوسری آیت میں اسی مرحلے کی مناسبت سے سوال آیا ہے۔

لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : اس روز ہم ہر اُمّت میں سے گواہ چُنیں گے۔(ونزعنا من کل امۃ شہیدًا)[1]

اس کے بعد "بے خبر اور گمراہ مشرکین سے ہم کہیں گے کہ اپنے شرک پر کوئی دلیل پیش کرو۔"(فقلنا ھاتوا برھانکم)۔

یہ وہ منزل ہے جہاں تمام مسائل روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائیں گے۔" اور وہ جان لیں گے کہ حق خدا کے لیے ہے" (فعلموا انّ الحق للہ)۔

اور جو کچھ وہ افتراء باندھتے تھے سب اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور گُم ہو جائے گا۔(وضل عنھم ما کانوا یفترون)۔

ہر اُمّت میں سے گواہ سے کیا مُراد ہے ؟ اس سلسلے میں اگر قرآن کی دیگر آیات کو ملحوظِ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی اُمّت پر گواہ ہوگا جب کہ پیغمبرِ اسلامؐ خاتم انبیاءؑ ہیں۔ آپؐ تمام انبیاءؑ اور تمام اُمّتوں پر گواہ ہیں۔

[1] نزع کے مادہ سے نزعنا کی تعبیر کسی چیز کو اس کی جگہ سے جذب کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں ہر گروہ سے ایک گواہ لایا جانا مُراد ہے۔

چنانچہ سورہ نساء کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا ہے :

فکیف اذا جئنا من کل اُمّۃ بشھید وجئنا بک علٰی ھٰؤلاء شہیدًا

اس دن ان کی کیا حالت ہوگی کہ جب ہم ہر اُمّت کے اعمال کا گواہ طلب کریں گے اور تجھے اُن پر گواہ قرار دیں گے۔

اس طرح گویا انبیاءؑ کے حضور ایک مجلس منعقد ہوگی اور ان کور دل ہٹ دھرم مُشرکوں سے اس مجلس میں باز پُرس ہوگی۔ اس موقع پر انہیں احساس ہوگا کہ شرک کی مصیبت کتنی بڑی ہے۔ اَب وہ پروردگار کی حقانیت اور بُتوں کی لغویت واضح طور پر دیکھیں گے۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ قرآن یہاں پر کہہ رہا ہے :

ضل عنھم ما کانوا یفترون

یعنی بُتوں کے بارے میں اُن کے بے بُنیاد تصورات و خیالات سب ان کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے کیونکہ میدانِ قیامت مقامِ حق ہے، وہاں باطل کے لیے کوئی گنجائش نہیں لہٰذا باطل غائب اور محو ہو جائے گا۔ اِس دُنیا میں اگر باطل حق کا لباس پہن لیتا ہے اور چند دن فریب کاری میں مشغول رہتا ہے تو وہاں فریب کے پردے سب ہٹ جائیں گے اور حق کے علاوہ کچھ باقی نہ رہے گا۔

ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام " ونزعنا من کل اُمّۃ شہیدًا " کی تفسیر کرتے ہُوئے فرماتے ہیں:

ومن ھٰذہ الامّۃ امامھا

اس اُمّت سے بھی اس کے امام کو چُنا جائے گا۔[1]

یہ بات اِس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ ہر زمانے میں اُمّت کے لیے ایک معصوم شاہد ضروری ہے اور مندرجہ بالا حدیث اس کے ایک مصداق کی طرف اشارہ ہے۔

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۶، صفحہ ۷۲۔

۷۶۔ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَاۤ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ ۚ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝

۷۷۔ وَابْتَغِ فِيْمَاۤ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

۷۸۔ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۶۔ قارون قوم موسٰی میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا۔ ہم نے اسے اِسقدر خزانے دیئے تھے کہ ان کے صندوق ایک طاقتور گروہ کے لیے بھی اُٹھانا مشکل تھے۔ وُہ وقت یاد کر جب اس کی قوم نے اس سے کہا : یہ سب متکبّرانہ خوشی نہ کرو کیونکہ غرور آمیز خوشی کرنے والوں کو خُدا دوست نہیں رکھتا۔

۷۷۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعے آخرت کا گھر تلاش کر اور دُنیا سے اپنے

حصّے کو فراموش نہ کر اور جیسے خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے تُو بھی نیکی کر اور زمین پر ہرگز فساد وگناہ نہ کر کہ خدا مفسدین کو پسند نہیں کرتا۔

۷۸۔ (قارون) کہنے لگا : یہ دولت مَیں نے اپنے علم کی وجہ سے حاصل کی ہے۔ کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ خُدا نے اس سے پہلے کچھ ایسی بھی قوموں کو ہلاک کر دیا جو اس سے زیادہ طاقتور اور زیادہ مالدار تھیں (اور جس وقت عذاب الٰہی آ پہنچتا ہے تو) پھر مجرموں سے ان کے گناہوں کا نہیں پوچھا جاتا (اور ان کے لیے عُذر خواہی کا موقع باقی نہیں رہتا)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کے خُود پرست سرمایہ دار :

حضرت مُوسٰی علیہ السلام کی عجیب و غریب سرگزشت اور فرعون کے خلاف اُن کے جہاد کے بارے میں کچُھ تفصیلات اسی سُورت کی گزشتہ آیات میں بیان کی گئی ہیں اور اس سلسلے میں کہنے کی باتیں کہی جا چکی ہیں۔ مذکورہ گفتگو بہت ہدایت بخش تھی۔

اس سورہ کی کچھ آیات بنی اسرائیل کے ایک اور مسئلے اور اُلجھن سے متعلق ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اُن میں ایک سرکش سرمایہ دار تھا۔ اُس کا نام قارون تھا۔ قارون غرور و سرکشی میں مُست کر دینے والی دولت کا مظہر تھا۔

اصولی طور پر حضرت موسٰی علیہ السلام نے اپنی زندگی میں تین متجاوز طاغوتی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا۔ ایک فرعون تھا جو حکومت و اقتدار کا مظہر تھا؛ دوسرا قارون تھا جو ثروت و دولت کا مظہر تھا اور تیسرا سامری تھا کہ جو مکر و فریب کا مظہر تھا۔ اگرچہ حضرت موسٰیؑ کا سب سے بڑا معرکہ حکومت کے خلاف تھا لیکن دوسرے معرکے بھی اہم تھے اور وہ بھی عظیم تربیتی نکات کے حامل ہیں۔

مشہور ہے کہ قارون حضرت موسٰی علیہ السلام کا قریبی رشتہ دار تھا۔ (چچا تھا یا چچازاد تھا اور یا خالہ زاد)۔ اُس نے تورات کا خُوب مطالعہ کیا تھا۔ پہلے وہ مومنین کی صف میں تھا لیکن دولت کا گھمنڈ اسے کفر کی آغوش میں لے گیا اور اُسے زمین میں غرق کر دیا۔ اس غرور نے اسے پیغمبرِ خدا کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور اس کی موت سب کے لیے باعثِ عبرت بن گئی۔ اس واقعے کی تفصیل ہم زیرِ بحث آیات میں پڑھیں گے۔

ارشاد ہوتا ہے : قارون مُوسیٰ کی قوم میں سے تھا لیکن اس نے ان پر ظلم کیا (انّ قارون کان من قوم موسٰی فبغٰی علیھم)۔

اس ظلم کا سبب یہ تھا کہ اُس نے بہت سی دولت کما لی تھی اور چونکہ اس کا ظرف کم تھا اور ایمان مضبُوط نہ تھا اس لیے فراواں دولت نے اسے بہکا دیا اور اسے انحراف و استکبار کی طرف لے گئی۔

قرآن کہتا ہے : ہم نے اسے مال و دولت کے اتنے خزانے دیے کہ انہیں اُٹھانا ایک طاقتور گروہ کے لیے بھی مُشکل تھا۔ (و اٰتیناہ من الکنوز ما ان مفاتحہ لتنوٓء بالعصبۃ اولی القوّۃ)۔

"مفاتح" "مفتح" (بروزن "مکتب") کی جمع ہے۔ اس کا معنیٰ ہے ایسی جگہ جس میں کوئی چیز ذخیرہ کرتے ہیں مثلاً صندوق کہ جس میں اموال و اشیاء محفوظ رکھتے ہیں۔

اس معنی کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ قارون کے پاس اس قدر سونا چاندی اور قیمتی اموال تھے کہ ان کے صندوقوں کو طاقتور لوگوں کا ایک گروہ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا تھا۔

توجہ رہے کہ "عصبہ" اس گروہ کو کہتے ہیں کہ جس نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوں، جس کے افراد بہت طاقتور ہوں اور اعصاب کی طرح ایک دوسرے کو پکڑے ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قارون کے جواہرات اور گراں قیمت اموال کا حجم کس قدر زیادہ تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ "عصبہ" دس سے لے کر چالیس افراد تک کے گروہ کو کہتے ہیں۔

لفظ "تنوء" "نوء" کے مادے سے زحمت و مشقت سے اُٹھنے کے معنی میں ہے اور بہت وزنی اموال کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے کہ جب انسان اسے اُٹھاتا ہے تو بوجھ کے باعث ایک طرف سے دُوسری طرف کو جُھک جاتا ہے۔

"مفاتح" کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اسے مفسرین اور علماء لغت کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے جب کہ بعض دوسرے علماء نے "مفاتح" کو "مفتح" (بروزن "منبر") کی جمع قرار دیا ہے جس کا معنیٰ ہے چابی۔ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ قارون کے خزانوں کی چابیاں اتنی تھیں کہ کئی طاقتور افراد بڑی مشکل سے انہیں اُٹھا پاتے تھے۔

جن لوگوں نے یہ دوسرا معنیٰ اپنایا ہے وہ خود اپنے اس معنیٰ کی توجیہ میں مشکل سے دوچار ہو گئے ہیں کہ خزانے کی چابیوں کے لیے ایسا کیونکر ممکن ہے۔ بہرحال پہلی تفسیر زیادہ واضح اور زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ اس سے قطع نظر کہ اہل لغت نے "مفتح" کے بھی کئی معانی بیان کیے ہیں ان میں سے ایک معنیٰ "خزانہ" ہی ہے یعنی مال جمع کرنے کی جگہ لیکن پہلا معنیٰ حقیقت سے نزدیک تر اور ہر قسم کے مبالغے سے پاک ہے۔ البتہ "مفاتیح" "مفتاح" کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے چابی۔ ان الفاظ سے اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے۔[1]

---

[1] بعض مفسرین نے یہاں چابی کیلئے بھی ایک مجازی معنی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ مُراد یہ ہے کہ ان تمام اموال کی چابی سنبھالنا اور ان کی حفاظت کرنا طاقتور لوگوں کے لیے بھی مشکل تھا لیکن یہ تفسیر بھی بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔ (اس لفظ کے لغوی مفہوم کو تفصیل سے جاننے کے لیے "لسان العرب" کی طرف رجوع فرمائیں)۔

آیئے اس بحث سے آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے قارون سے کیا کہا :

قرآن کہتا ہے : اس وقت کو یاد کرو جب اس کی قوم نے اس سے کہا : تم میں ایسی خوشی نہیں ہونی چاہیئے جس میں تکبّر اور غفلت ہو کیونکہ خدا غرور میں ڈوبے ہُوئے خوشحال افراد کو پسند نہیں کرتا۔ (اذ قال لہ قومہ لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین)[1]

اس کے بعد چار اور قیمتی ، سرنوشت ساز اور تربیتی نصیحتیں کرتے ہیں۔ اس طرح کل پانچ ہو گئیں۔

پہلے کہتے ہیں : اللہ نے جو کچھ تجھے دیا ہے اُس سے دارِ آخرت حاصل کر۔ (وابتغ فیما اٰتاک اللہ الدار الاٰخرۃ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض کج فہم افراد کے خیال کے برخلاف مال و دولت کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کس راستے پر صرف ہو رہا ہے۔ اگر اس کے ذریعے دارِ آخرت کو تلاش کیا جائے تو پھر اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ غرور، غفلت ، ظلم ، تجاوز اور ہوس پرستی کا ذریعہ بن جائے تو پھر اس سے بدتر بھی کوئی چیز نہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السّلام نے یہی منطق دُنیا کے بارے میں اپنے ایک مشہور جملے میں بیان فرمائی ہے :

من ابصر بہا بصرتہ و من ابصر الیہا اعمتہ

اگر کوئی دُنیا کو ایک ذریعہ جانتے ہوئے اس کی طرف دیکھے تو یہ اُس کی آنکھ کو بینا کر دیتی ہے مگر جو اسے مقصد قرار دیتے ہوئے اس کی جانب دیکھے تو یہ اسے نابینا کر دیتی ہے۔[2]

قارون اپنی بے پناہ دولت کی بناء پر بہت سے اجتماعی امور خیر انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے غرور و تکبّر نے اسے حقائق دیکھنے کی اجازت نہ دی۔

اُنہوں نے مزید کہا : دُنیا سے اپنے حصّے کو نہ بھُول جا (ولا تنس نصیبک من الدنیا)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کا اس دُنیا میں ایک محدُود حصّہ ہے یعنی وہ مال جو اس کے بدن، لباس اور مکان کے لیے درکار ہوتا ہے اور ان پر صَرف ہوتا ہے اس کی مقدار معین ہے اور ایک خاص مقدار سے زیادہ اس کے لیے قابلِ جذب ہی نہیں ہوتا۔ انسان کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔

ایک انسان کتنی غذا کھا سکتا ہے ، کتنا لباس پہن سکتا ہے اور اسے کتنے مکانوں اور سواریوں کی ضرورت ہوتی ہے ؛ مرتے وقت انسان کتنے کفن ساتھ لے جا سکتا ہے ؛ لہذا باقی وہ چاہے نہ چاہے دوسروں کا حصّہ ہے۔ اور انسان اس کا امانت دار ہے۔ امیر المومنین علی علیہ السّلام نے کیا خُوب بیان فرمایا ہے :

یا بن اٰدم ما کسبت فوق قوتک فانت فیہ خازن لغیرک

اے فرزندِ آدم : جو کچھ تو اپنی خوراک کی مقدار سے زیادہ حاصل کرتا ہے اس کے

---

[1] "فرحین" "فرح" کی جمع ہے اس کا معنیٰ ہے وہ شخص کہ جو کچھ چیز پالینے کی وجہ سے مغرور ہو گیا ہو اور خوشی سے پھولا نہ سماتا ہو۔

[2] نہج البلاغہ ، خطبہ ۸۲۔

بارے میں تو دوسروں کا خزانہ دار ہے[1]

اسلامی روایات اور کلماتِ مفسرین میں اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا ایک معنیٰ ہو کیونکہ ایک لفظ ایک سے زیادہ معانی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

وہ تفسیر یہ ہے کہ ——— معانی الاخبار میں ہے کہ "ولا تنس نصیبك من الدنیا" کی تفسیر میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

لا تنس صحتك وقدرتك وفراغك وشبابك ونشاطك ان تطلب بها الاٰخرة

تندرستی، قوت، فراغت، جوانی اور خوشی کو فراموش نہ کر اور ان (پانچ عظیم نعمتوں) کے ذریعے اپنی آخرت طلب کر۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن حکیم کا مذکورہ بالا جملہ تمام انسانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ میسّر صلاحیتوں اور مواقع کو ضائع نہ کردیں کیونکہ مہلت کے لمحے بادلوں کی طرح جلد گزر جاتے ہیں[2]

تیسری نصیحت یہ ہے : جیسے خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی نیکی کر۔ (واحسن کما احسن الله الیك)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ اللہ کے احسان پر نظر لگائے ہوئے ہے اور اس کی بارگاہ سے ہر خیر کا تقاضا کر رہا ہے اور اسی سے ہر قسم کی توقع باندھے ہُوئے ہے تو اس طرح سے وہ کیونکر کسی کے صریح تقاضے کو یا زبانِ حال کے تقاضے کو نظر انداز کر سکتا ہے اور اس سے کیسے بے اعتنائی بَرت سکتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جیسے خدا نے تجھ پر عنایت کی ہے تُو بھی دوسروں سے نیکی کر۔ سُورۂ نور کی آیت ۲۲ میں عفو و درگزر کے بارے میں ایسی ہی بات کہی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر الله لکم

مومنین کو چاہیئے کہ عفو و درگزر سے کام لیں۔ کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ اللہ تمہیں بخش دے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات خدا انسان کو عظیم نعمتیں دیتا ہے جب کہ اسے اپنی ذاتی زندگی میں ان سب کی احتیاج نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی کو خدا ایسی عقل دیتا ہے کہ جو نہ صرف ایک فرد کا نظام چلانے کے لیے کافی ہوتی ہے بلکہ ایک ملک کو کنٹرول کر سکتی ہے۔ کسی کو وہ ایسا علم دیتا ہے جو ایک انسان ہی کے لیے نہیں بلکہ ایک معاشرے کے لیے کارمند ہو سکتا ہے۔ کسی کو وہ ایسا مال دیتا ہے کہ جو بڑے بڑے اجتماعی پروگراموں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس قسم کی نعماتِ الٰہی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ سب کی سب تیری ایک ذات سے متعلق نہیں ہیں بلکہ انہیں دُوسروں کی طرف مُنتقل کرنے کے لیے تُو امانت دار اور وکیل ہے۔ اللہ نے تجھے یہ نعمت اس لیے دی ہے تاکہ تیرے ہاتھ سے اپنے بندوں کا نظام چلائے۔

[1] نہج البلاغہ، کلماتِ قصار ۱۹۲۔
[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۴ ص ۱۳۹، بحوالہ معانی الاخبار۔

آخر میں چوتھی نصیحت یہ ہے : کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مادّی وسائل تجھے دھوکہ دیں اور تُو انہیں گناہ اور دعوتِ گناہ میں صَرف کر دے "زمین میں ہرگز گناہ و فساد نہ کر کیونکہ اللہ مفسدین کو پسند نہیں کرتا" (ولا تبغ الفساد فی الارض ان الله لا یحب المفسدین)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات دولت مند اور سرمایہ دار ہوسِ زر یا بڑا بننے کے جنون میں خرابی کرتے ہیں اور معاشرے کو محرومیت اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ہر چیز اپنے لیے ہی منحصر کر لیتے ہیں، لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کے درپے ہوتے ہیں اور جو کوئی اعتراض کرے اسے ختم کر دیتے ہیں اور اسے ختم نہ کر سکیں تو تہمتیں لگا کر غیر مؤثر اور معاشرے سے ایک طرف کر دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ معاشرے کو خرابی و تباہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان ناصحین نے پہلے قارون کا غرور ختم کرنے کی کوشش کی۔ پھر اسے خبردار کیا کہ دنیا وسیلہ ہے مقصد نہیں اور تیسرے مرحلے میں اسے متنبہ کیا کہ جو کچھ تیرے پاس ہے اُس میں سے تُو اپنے لیے تھوڑا سا خرچ کر سکتا ہے۔ پھر اسے یہ حقیقت یاد دلائی کہ خدا نے تیرے ساتھ نیکی کی ہے تجھے بھی نیکی کرنی چاہیئے ورنہ وہ اپنی نعمتیں تجھ سے چھین لے گا اور پانچویں مرحلے میں اسے زمین میں خرابی برپا کرنے سے ڈرایا اور یہ آخری بات پہلی چار باتوں کا حاصل ہے۔

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ نصیحت کرنے والے یہ افراد کون تھے۔ البتہ یہ بات مُسلّم ہے کہ وہ اہلِ علم، پرہیزگار، زیرک، بابصیرت اور جرأت مند افراد تھے۔ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ وہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ لیکن یہ بات بہت بعید ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے :

اذ قال له قومه

قارون کی قوم نے اس سے کہا۔

اَب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس سرکش و ستمگر بنی اسرائیل نے ان ہمدرد واعظین کو کیا جواب دیا۔

قارون تو اپنی اس بے حساب دولت کے نشے میں چُور تھا اُس نے اُسی غرور سے کہا : مَیں نے تو یہ سب دولت اپنے علم و دانش کے بل بوتے پر حاصل کی ہے : (قال انما اوتیته علیٰ علم عندی)۔ تمہیں اس سے کیا کہ میں اپنی دولت کیسے خرچ کرتا ہوں۔ جو مَیں نے کمایا اسے خُود کمایا ہے تو پھر صَرف کرنے میں بھی مجھے تمہاری راہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں یقیناً خدا مجھے اس دولت کے لائق سمجھتا تھا تبھی تو اس نے مجھے عطا کی ہے اور اسے صَرف کرنے کی راہ بھی اُس نے مجھے بتائی ہے۔ مَیں دوسروں سے بہتر جانتا ہوں۔ تمہیں اس میں دخیل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر زحمت مَیں نے کی ہے، تکلیف مَیں نے اُٹھائی ہے، خُونِ جگر پیا ہے تب کہیں یہ دولت جمع کی ہے۔ دوسروں کے پاس بھی ایسی لیاقت و توانائی ہوتی تو وہ زحمت و کوشش کیوں نہ کرتے۔ مَیں نے کوئی ان کا راستہ تو نہیں روک رکھا اور اگر ان میں اس کی لیاقت نہیں ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ بھُوکے رہیں اور مر جائیں[1]

یہی وہ بوسیدہ اور گھٹیا منطق ہے کہ جو عام طور پر بے ایمان سرمایہ دار نصیحت کرنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

[1] "اوتیته علیٰ علم عندی" اس جملے میں مذکورہ بالا ایک یا تینوں معانی ہو سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے اس باب کو اجمالاً بیان کیا ہے کہ قارون کس علم کے بل پر دولت جمع کرتا تھا۔ کیا وہ علمِ کیمیا تھا، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے یا پھر تجارت، زراعت اور صنعت کا علم تھا یا پھر کیا وہ انتظامی صلاحیّت اور علم کا حامل تھا یا یہ سب امور تھے۔ بعید نہیں کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور یہ ان سب امور کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ (قطع نظر اس کے کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ علمِ کیمیا کے ذریعے تانبے وغیرہ کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے)۔

اس موقع پر قرآن قارون اور اس جیسے دیگر افراد کو ایک تیکھا جواب دیتا ہے: کیا اُسے معلوم نہ تھا کہ خدا نے اس سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ جو اس سے زیادہ طاقتور تھیں، علم میں بڑھ کر تھیں اور سرمایہ بھی ان کے پاس زیادہ تھا۔ (اولم یعلم ان اللہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃ واکثر جمعاً)۔

تو کہتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے لیکن تو بھول گیا ہے کہ تجھ سے زیادہ علم والے اور زیادہ طاقتور افراد بھی تھے۔ کیا وہ عذابِ الٰہی سے بچ سکے ہیں؟

بنی اسرائیل کے اہلِ دانش نے قارون سے کہا تھا:

ما اٰتاک اللہ ...

اللہ نے جو کچھ تجھے عطا کیا ہے۔

لیکن اُس بے اَدب گستاخ نے کہا:

میرے پاس جو کچھ ہے وہ میرے علم کی بدولت ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے ارادے اور مشیّت کا ذکر کر کے اس کی حیثیت و طاقت کے چھوٹے پن کو ظاہر کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک مختصر اور معنی خیز جملے کے ذریعے ایک اور تنبیہ کرتا ہے: "عذابِ الٰہی کے نزول کے وقت مجرموں سے ان کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا" اس وقت سوال و جواب کی گنجائش ہرگز نہ ہوگی، اس وقت تو قاطع، دردناک، تکلیف دہ اور ناگہانی عذاب ہوگا۔ (ولا یسئل عن ذنوبھم المجرمون)۔

یعنی — آج تو بنی اسرائیل کے آگاہ افراد اور اہلِ دانش قارون کو نصیحت کر رہے ہیں، اسے غور و فکر کی دعوت دے رہے ہیں اور اس کے پاس جواب دینے کی گنجائش ہے لیکن جب اتمامِ حجّت ہو چکا اور عذابِ الٰہی آگیا تو پھر غور و فکر کرنے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے اور غرور و تکبّر کے اظہار کی گنجائش نہ ہوگی۔ پھر عذابِ الٰہی آکر رہے گا اور پھر تباہی ناگزیر ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ مجرمین سے سوال نہ ہوگا، اس سے کونسا سوال مراد ہے؟ دُنیا کا یا آخرت کا؟

بعض مفسرین نے پہلا سوال مراد لیا ہے اور بعض نے دوسرا لیکن کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں جگہ پر سوال مراد ہو یعنی سزائے استحصال کے موقع پر دُنیا میں اُن سے سوال نہ ہوگا تاکہ وہ رُوگردانی اور عُذر تراشی کریں اور وہ اپنے آپ کو بے گناہ ظاہر کریں اور قیامت میں بھی اُن سے سوال نہ ہوگا کیونکہ وہاں سوال کے بغیر ہی سب کچھ واضح ہوگا اور قرآن کے بقول مجرموں کی

حالت پر خود اُن کے چہرے گواہ ہوں گے:

یعرف المجرمون بسیماھم

یعنی - مجرم تو اپنی کیفیت ہی سے پہچانے جائیں گے۔ (رحمٰن - ۴۱)

اس طرح زیرِ بحث آیت سُورہ رحمٰن کی آیت ۳۹ سے ہم آہنگ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جانّ

اس دن کسی بھی انسان یا جن سے اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

اس مقام پر ایک اور سوال سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ سورہ حجر کی آیت ۹۲ میں تو ہے:

فوربک لنسئلنھم اجمعین

تیرے رب کی قسم ہم اُن سب سے سوال کریں گے۔

یہ آیت زیرِ بحث آیت سے کیسے ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب دو طریقوں سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ قیامت کے مختلف مرحلے ہوں گے بعض مراحل پر سوال ہوگا اور بعض پر سب چیزیں واضح ہو چکنے کی وجہ سے سوال کی ضرورت نہ رہے گی۔

دُوسرا یہ کہ سوال دو قسم کا ہے:

۱۔ سوالِ تحقیق اور

۲۔ سوالِ سرزنش

قیامت کے روز سوالِ تحقیق کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ ہر چیز آشکار ہوگی اور بیان کی احتیاج نہ ہوگی لیکن سرزنش آمیز سوال وہاں ہوگا اور یہ خود مجرموں کے لیے ایک طرح کی نفسیاتی سزا ہوگی۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک باپ اپنے ناخلف بیٹے سے پُوچھتا ہے کہ کیا مَیں نے تیری اتنی خدمت نہ کی تھی۔ کیا ان خدمات کا صلہ یہ خیانت اور سرکشی تھا (جب کہ حقیقت سے باپ اور بیٹا دونوں آگاہ ہوتے ہیں اور باپ کا مقصد بیٹے کو سرزنش کرنا ہوتا ہے)۔

۷۹۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○

۸۰۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ○

۸۱۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۤ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ○

۸۲۔ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۧ

ترجمہ

۷۹۔ (ایک روز) قارون بڑی سج دھج اور ٹھاٹھ کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا۔ وہ لوگ جو دُنیاوی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے: جیسا مال و متاع قارون کو ملا ہے، کاش ہمارے پاس بھی ہوتا یقیناً اُس کے پاس تو (دولت کا) بہت بڑا حصہ ہے۔

۸۰۔ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہنے لگے کہ تم پر افسوس ہے۔ ثواب الٰہی بہتر ہے، اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے اور عملِ صالح انجام دیتے ہیں۔ لیکن اُسے صابروں کے سوا کوئی نہیں پا سکتا۔

۸۱۔ آخر کار ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور عذابِ الٰہی کے مقابلے میں کوئی جماعت اُس کی مدد نہ کر سکی اور وہ خود بھی اپنی مدد نہ کر سکا۔

۸۲۔ اور وہ لوگ جو کل اُس کی مقام و منزلت کی تمنا کرتے تھے (جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو) کہنے لگے: وائے ہو ہم پر، یہ تو اللہ ہی ہے کہ جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُس پر رزق کو فراخ کر دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ اے افسوس! کافروں پر کہ وہ ہرگز نجات نہیں پا سکتے۔

تفسیر

نمائشِ ثروت کا جنون:

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مغرور دولت مند لوگ طرح طرح کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک نمائش ثروت کا جنون ہے۔ اُنھیں اِس عمل سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اپنی دولت کا لوگوں پر اظہار کریں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی گراں قیمت سواری پر سوار ہو کے نکلیں اور برہنہ پا لوگوں کے درمیان سے گزریں۔ اُن کے منہ پر گرد و غبار ڈالتے جائیں اور اُن کی تحقیر کرتے جائیں۔ اُنھیں اس عمل سے تسکین ہوتی ہے۔

لیکن دولت کی یہی نمائش اُن کے لیے بلائے جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کے خلاف کینہ پرورش پانے لگتا ہے اور جذبات نفرت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی شرمناک اور مکروہ عمل اُن کی زندگی کو ختم کر دیتا ہے یا اُن کی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس جنون آمیز عمل کا نتیجہ کسی قسم کی تحریک ہو۔ مثلاً لالچی افراد میں مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس میں اضافہ ہو۔ اور سرکش لوگوں میں فرمانبرداری کے جذبات پیدا ہوں۔ مگر اہل ثروت، نمائش دولت کے عمل کو اِس تصور کے بغیر انجام دیتے ہیں۔ درحقیقت اُن کا عمل بھی ایک قسم کی ہوس ہوتا ہے۔ اِس میں کسی سُوجھ بُوجھ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

بہر حال قارون بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بلکہ جنونِ نمائش ثروت کا ایک واضح نمونہ تھا۔ قرآن میں زیر بحث آیات میں ایک جُملے کے اندر قارون کی اِس کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ قارون پُوری زیب و زینت سے اپنی قوم کے سامنے نکلا:

(فخرج علٰی قومہٖ فی زینتہ)

کلمہ "فی زینتہ" اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اُس نے اپنی پُوری قوت اور توانائی اِس کام پر صرف کر دی تھی کہ وہ اپنی تمام دولت و آرائش کی لوگوں کے سامنے نمائش کرے اور یہ بات محتاجِ ذکر نہیں کہ اتنی دولت کا مالک شخص جب نمود و حشمت کا ارادہ کرے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

کُتبِ تواریخ میں اس واقعے کے متعلق بہت سے افسانے اور داستانیں ذکر ہوئی ہیں۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ قارون چار ہزار خادموں کی قطار کے ساتھ بنی اسرائیل کے درمیان سے گزرا۔ جبکہ یہ چار ہزار خادم گراں قیمت گھوڑوں پر سُرخ پوشاکیں پہنے ہوئے

سوار تھے۔ اُس کے ساتھ خوش شکل کنیزیں بھی تھیں جو سفید خچروں پر سوار تھیں جن پر سُنہری زین کسے ہوئے تھے۔ اُن کی پوشاکیں سُرخ اور سب طلا کار تھیں۔

بعض لوگوں نے اُس کے خادموں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے اور اسی طرح کی اور باتیں بھی لکھی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان تمام بیانات کو مبالغہ آمیز بھی سمجھ لیں پھر بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ نمائش دولت کے لیے اُس کے پاس بہت ساز و سامان تھا۔

جیسا کہ دُنیا کا معمول ہے قارون کی جاہ و حشمت کو دیکھ کر لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ دُنیا پرست اکثریت نے جب اس خیرہ کن منظر کو دیکھا تو اُن کے دل میں تمنائیں مچلنے لگیں۔ اُنھوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگے کہ کاش وہ بھی قارون جیسی دولت کے مالک ہوتے۔ خواہ ایک دن، ایک ساعت یا ایک لمحے ہی کے لیے یہ شکوہ نصیب ہوتا۔ آہ! اُس کی کیسی شیریں، جذاب، نشاط انگیز اور لذّت بخش زندگی ہے!

چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ دُنیاوی زندگی کے طلب گار تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی قارون کے پاس ہے: (قال الذین یریدون الحیٰوۃ الدنیا یالیت لنا مثل ما اوتی قارون)۔

حقیقت میں اُس کے پاس تو دولت کا فراواں حصہ ہے: (انہ لذو حظ عظیم)۔ آفرین ہے قارون پر اور اُس کی بے پناہ دولت پر، واہ اُس کا کیا جاہ و جلال ہے۔ اور کتنے خادم اور نوکر چاکر ہیں۔ تاریخ میں اُس جیسا کوئی شخص نہیں ہے۔ یہ عظمت اُسے خدا نے عنایت کی ہے۔ غرض لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔

درحقیقت اس واقعے میں امتحان کی ایک بہت بڑی بھٹّی جل رہی تھی۔ اُس بھٹّی کے بیچ میں قارون تھا۔ تاکہ وہ اپنی سرکشی اور غرور کا امتحان دے۔ دوسری طرف بنی اسرائیل کے دُنیا پرست لوگ اُس بھٹّی کے گرداگرد مقیم تھے۔

لیکن قارون کے لیے ایک دردناک عذاب تھا۔ ایسا عذاب جو ایسی نمائش کے بعد ہوتا ہے۔ یہ عذاب اَوجِ عظمت سے قعرِ زمین میں لے جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

لیکن اس دُنیا طلب بڑے گروہ کے مقابلے میں ایک اقلیت اہل علم صاحبانِ فکر، پرہیزگار اور باایمان لوگوں کی بھی وہاں موجود تھی جن کا اُفقِ فکر ان مسائل سے برتر اور بالاتر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک احترامِ شخصیت کا پیمانہ زر اور زور نہ تھا۔ ان کے نزدیک انسان کی قدر کا معیار اُس کے مادی وسائل نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ دولت و ثروت کی عارضی اور مضحکہ انگیز نمود و نمائش پر تمسخر آمیز طور پر مُسکرا دیتے تھے، اور اسے ایک بے مغز اور غیر حقیقی شے سمجھتے تھے۔

چنانچہ قرآن میں مذکور ہے کہ:۔ وہ لوگ جنہیں علم و معرفت عطا ہوئی تھی، اُنھوں نے کہا تم پر افسوس ہے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ثواب اور جزا بہتر ہے: (وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن اٰمن وعمل صالحًا)۔

ان الفاظ پر اُنھوں نے یہ اضافہ کیا کہ یہ ثوابِ الٰہی صرف اُن لوگوں کا نصیب ہے جو صابرین ہیں: (ولا یلقاھا الا الصابرون)۔

اس ثوابِ الٰہی کے مستحق وہ لوگ ہیں جو دُنیا کی زینتوں اور اُس کے ہیجان انگیز فرّ و شکوہ کے مقابلے میں مستقیم المزاج رہتے ہیں۔ جو نعماتِ دُنیا کی محرومیت کو مردانہ وار استقلال سے برداشت کرتے ہیں۔ جو ناکس لوگوں کے سامنے کبھی سر نہیں جُھکاتے اور جو دُنیا میں مال، دولت اور خوف و مصیبت کی آزمائش کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔

مثلاً ـــ اس مقام پر " الذین اُوتوا العلم " سے مُراد بنی اسرائیل کے اہل علم مومنین ہیں۔ اُن میں یوشع جیسے بزرگ افراد بھی تھے۔

اس مقام پر قابلِ غور امر یہ ہے کہ " الذین یریدون الحیٰوۃ الدنیا " (یہ جُملہ گروہ اوّل کے متعلق آیا ہے) کے مقابلہ میں " الذین یریدون الحیٰوۃ الاٰخرۃ " نہیں کہا گیا۔ بلکہ صفت علم کی تخصیص کی گئی ہے۔ کیونکہ علم ہی وہ اصل ہے جس سے ایمان و استقامت، حصولِ ثوابِ الٰہی اور دارِ آخرت میں اجر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

" الذین اوتوا العلم " میں ایک ایسا ابہام بھی ہے کہ یہ قارون کے اس فخر کا جواب ناطق ہے کہ وہ اپنے آپ کو عالم سمجھتا تھا۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ: حقیقی عالم یہ لوگ ہیں کہ جن کا اُفقِ فکر اس حد تک بلند ہے نہ کہ تو خیرہ سر اور مغرور۔

اس جواب میں ہمارے لیے یہ درس بھی ہے کہ علم و دانش ہی جُملہ خیرات و برکات کی بُنیاد ہے۔

٭ ٭ ٭

قارون نے سرکشی اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ لیا تھا۔ مگر تواریخ اور روایات میں اُس کے متعلق کچھ اور ہی واقعہ بیان ہوا ہے جو قارون کی انتہائی بے شرمی کی علامت ہے۔ اور وہ ماجرا یہ ہے کہ:۔

ایک روز حضرت موسیٰؑ نے قارون سے کہا کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ تیرے مال میں سے زکوٰۃ لوں جو محتاجوں کا حق ہے۔ جب قارون زکوٰۃ کی ادائیگی کے اصول سے مطلع ہوا اور اُس نے حساب لگایا کہ اُسے کتنی کثیر رقم دینا پڑے گی تو اُس نے انکار کر دیا اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ وہ بنی اسرائیل کے دولت مندوں کی ایک جماعت کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا:

" اے لوگو! موسیٰ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری دولت خود ہضم کر لے۔ اُس نے تمہیں نماز کا حکم دیا تم نے قبول کیا۔ اُس کے دوسرے احکامات بھی تم نے مان لیے۔ کیا تم یہ بات بھی برداشت کر لوگے کہ اپنی دولت اُسے دے دو!؟"

اُن سب نے کہا کہ نہیں۔ مگر اُس سے کس طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟

اُس وقت قارون کے ذہن میں ایک شیطانی خیال آیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے ایک بہت اچھی تدبیر سوچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے خلاف ایک منافیِ عصمت سازش کرنی چاہیئے۔ ہمیں چاہیئے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک فاحشہ عورت کو تلاش کر کے موسیٰ کے پاس بھیج دیں، تاکہ وہ اُس پر شرمناک تہمت لگا دے۔ بنی اسرائیل نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اُنھوں نے ایک بدکار عورت کو تلاش کیا اور اُس سے کہا کہ:

" تُو جو کچھ مانگے گی تجھے دیں گے بشرطیکہ تو یہ گواہی دے کہ موسیٰ کا تجھ سے نامشروع تعلق تھا"

اُس عورت نے بھی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ ایک طرف تو یہ سازش ہوئی۔ دوسری طرف قارون حضرت موسٰیؑ کے پاس گیا اور اُن سے کہا کہ :-

"بہتر ہے کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کریں اور اُنھیں الٰہی احکامات سُنائیں"

حضرت موسٰیؑ نے یہ پیش کش منظور کر لی اور بنی اسرائیل کو جمع کیا۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو اُنھوں نے حضرت موسٰیؑ سے کہا کہ : "آپ ہمیں خدا کے احکام سنائیں"۔

حضرت موسٰیؑ نے فرمایا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ " بجز اُس کے کسی کی پرستش نہ کرو" صلہ رحم بجا لاؤ، ایسا کرو اور ویسا کرو۔ زناکار آدمی کے لیے خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر وہ زنائے محصنہ کرتا ہے تو اُسے سنگسار کیا جائے۔

جب حضرت موسٰیؑ نے یہ الفاظ کہے تو بنی اسرائیل کے دولت مند سازشی لوگوں نے کہا : " خواہ وہ مجرم تو خُود ہی ہو۔"

حضرت موسٰی نے جواب دیا " ہاں ٹھیک ہے خواہ مَیں خود ہی ہوں"۔

اُس مقام پر اُن بے شرموں نے، بے ادبی اور گستاخی کی حد کر دی اور کہا کہ :

ہم جانتے ہیں کہ تو خُود اس فعل کا مرتکب ہوا ہے۔ اور فلاں بدکارہ عورت سے تیرا تعلق رہا ہے"۔

پھر اُنھوں نے اُس عورت کو بُلایا اور اُس سے کہا کہ تو شہادت دے۔ حضرت موسٰی نے اُس عورت کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ " میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تو اصل حال بیان کر"۔

جب اُس بدکارہ عورت نے یہ بات سُنی تو کانپ گئی، اُس کی حالت بدل گئی اور اُس نے کہا :

" جب آپ مجھ سے سچ بات پُوچھتے ہیں تو میں حقیقت حال بیان کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ میں آپ کو متہم کروں، اِس کے بدلے میں اُنھوں نے مجھے ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ باعفت ہیں اور اللہ کے رسول ہیں"۔

ایک دُوسری روایت میں مذکور ہے کہ اُس عورت نے یہ بھی کہا کہ :-

لعنت ہو مجھ پر، میں نے اپنی زندگی میں بہت گناہ کیے ہیں مگر کسی پیغمبر پر تہمت نہ لگائی تھی۔

اس کے بعد اُس نے دولت کے وہ تھیلے جو اُن سازشیوں نے اُسے دیے تھے نکال کر سامنے رکھ دیے اور مذکورہ باتیں کیں۔

حضرت موسٰیؑ سجدے میں گر گئے اور رونے لگے۔ اِس موقع پر بدسیرت، سازشی قارون پر عذاب نازل ہوا۔ اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ خدا نے قارون کے غرقِ زمین کرنے کا حضرت موسٰیؑ کو اختیار دیا تھا۔ [1]

[1] بمطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۸۲ بحوالہ درالمنثور اسی طرح تفسیر رُوح المعانی۔ نیز دیگر مفسرین نے بھی کچھ فرق کے ساتھ اسی آیت کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے۔

اِس مقام پر قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ : ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں غرق کر دیا: (فخسفنا بہٖ وبدارہ الارض)۔

یہ درست ہے کہ جب مُنکرین کا طُغیان اور سرکشی اور اُن کی جانب سے تہی دست مومنین کی تحقیر و تذلیل۔ اور پیمبرِ الٰہی کے خلاف سازش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اُس وقت دستِ قدرتِ الٰہی دراز ہوتا ہے اور اِن متکبّر گستاخوں کی زندگیوں کو ختم کر دیتا ہے اور اُنھیں ایسی سزا دیتا ہے کہ اُن کی اُفتاد سب لوگوں کے لیے سبب عبرت بن جاتی ہے۔

کلمہ "خسف" اِس مقام پر زمین میں گڑ جانے اور زمین میں پوشیدہ ہو جانے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔ اِنسان کی پُوری تاریخ میں ایسے واقعات بارہا پیش آئے ہیں کہ سخت زلزلہ آیا اور زمین شگافتہ ہو گئی اور اُس نے شہر یا آبادیوں کو نگل لیا۔ مگر اِس مقام پر جس حادثۂ خسف کا ذکر ہے، یہ مختلف نوعیت کا ہے۔ اِس میں فقط قارون اور اُس کے خزانے ہی لقمۂ زمین ہوئے۔

کیا عجب واقعات ہیں کہ فرعون تو دریائے نیل کی موجوں میں غرق ہو جاتا ہے اور قارون شکمِ زمین میں سما جاتا ہے۔ اِس مقام پر دیدنی یہ امر ہے کہ پانی جو مایۂ حیات ہے، وہ فرعون اور اُس کے ہمکاروں کو نابود کرنے پر مامور ہوتا ہے۔ اور زمین جو انسان کے لیے جائے راحت ہے وہ قارون اور اُس کے ساتھیوں کے لیے گورستان بن جاتی ہے۔

یہ مُسلّم ہے کہ قارون اپنے گھر میں تنہا نہ تھا۔ وہ اور اُس کے اہلِ خاندان، اُس کے ہم خیال، اور اُس کے ظالم اور ستمگر دوست سب کے سب شکمِ زمین میں سما گئے۔ لیکن اُس وقت اُس کی مدد کے لیے کوئی جماعت نہ تھی جو اُسے عذابِ الٰہی سے بچا سکتی اور وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا : (فما کان لہ من فئۃ ینصرونہٗ من دون اللّٰہ وما کان من المنتصرین)۔ نہ تو اُس کے دسترخوان کے مُفت خور، نہ اُس کے دلی دوست، نہ اس کا مال و دولت، اِن میں سے کوئی شے بھی اُسے عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکی اور وہ سب کے سب قعرِ زمین میں سما گئے۔

٭ ٭ ٭

آیاتِ زیرِ نظر میں سے آخری آیت میں اُن لوگوں کے بدل جانے کا ذکر ہے جو گزشتہ روز قارون کے جاہ و جلال اور کرّ و فر کو دیکھ کر وجد اور رشک کر رہے تھے اور یہ آرزو کر رہے تھے کہ کاش ہمیشہ کے لیے یا تھوڑی دیر کے لیے ہی یہ شان ہمیں بھی نصیب ہوتی۔

یہ آیت عجیب سبق آموز ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ کہ گزشتہ روز یہ آرزو کر رہے تھے کہ " کاش ہم اُس کی (قارون کی) جگہ ہوتے جب اُنھوں نے اُسے (قارون) اور اُس کی دولت کو زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہمارے خیالات پر افسوس ہے (حق یہ ہے کہ) خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ کلید رزق صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے": (واصبح الذین تمنوا مکانہ بالامس یقولون ویکأن اللّٰہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہٖ ویقدر)۔

(اُنھوں نے کہا) آج یہ بات ہم پر ثابت ہو گئی کہ جس آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی دین ہے۔ اُس کی عطا کا انحصار اِس امر پر نہیں کہ وہ کسی سے راضی اور خوش ہے۔ اور نہ کسی کی محرومی اس وجہ سے ہے کہ وہ

شخص اللہ کی جناب میں بے قدر ہے۔ اللہ افراد اور اقوام کو دولت دے کر اُن کا امتحان لیتا ہے اور اُن کی سیرت اور فطرت کو آشکار کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ (رشک کرنے والے) سوچنے لگے کہ اگر گزشتہ روز خدا اُن کی دُعا کو قبول کرلیتا اور انھیں بھی قارون جیسا ہی بنا دیتا تو اُن کا کیسا عبرت ناک انجام ہوتا۔ لہٰذا اُنھوں نے خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں غرق کردیتا: (لولا ان منّ اللہ علینا لخسف بنا)۔

اور ـــــ گویا کہ کافر ہرگز نجات نہیں پائیں گے: (ویکأنہ لا یفلح الکافرون)۔

اب ہم حقیقت کی نظر سے غرور و غفلت اور کفر و ہوس دُنیا کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں نیز ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ نمائشی زندگیاں جن کا منظر نہایت دل فریب ہوتا ہے ان کی حقیقت کتنی خوفناک ہے۔

اس ماجرے کے انجام سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آخر کار مغرور کافر اور بے ایمان قارون دُنیا سے رُخصت ہوا۔ ہر چند کہ اُس کا شمار بنی اسرائیل کے دانشمندوں اور تورات کے تلاوت کرنے والوں میں ہوتا تھا۔ نیز وہ حضرت موسیٰؑ کا رشتہ دار بھی تھا۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات

۱۔ ماضی اور حال کے قارون: داستانِ قارون (جسے ایک مغرور دولت مند کا مثالی نمونہ کہنا چاہیئے) جسے قرآن کی سات آیات میں بہت ہی جاذبِ توجہ طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے بہت سے حقائق سے پردہ اُٹھاتی ہے۔

یہ داستان اس حقیقت کو روشنی میں لاتی ہے کہ دولت کا غرور اور نشہ بعض اوقات انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ مثلاً اپنی دولت کی نمائش کا جنون، دوسروں کے سامنے اپنی برتری کا اظہار، یا تہی دست لوگوں کی تحقیر کرکے محظوظ ہونے کا جنون وغیرہ۔

یہی غرورِ ثروت اور سیم و زر کی بے کراں حرص کبھی انسان کو بدترین اور مکروہ ترین گناہوں پر آمادہ کر دیتی ہے مثلاً وہ پیمبرِ خدا کے مقابلے پر اُتر آئے اور حقیقت و حقانیت کے خلاف جنگ کرنے لگے حتیٰ کہ پاک ترین افراد پر نہایت بے شرمانہ تہمتیں لگانے لگے اور اپنی دولت خرچ کرکے اس مقصد کے لیے بدکار عورتوں کی امداد حاصل کرنے لگے۔ دولت کا غرور اور نشہ انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ ناصحین کی نصیحت پر کان دھرے اور خیر خواہوں کے مشورے پر عمل کرے۔

(جو اُنھوں نے بندگانِ خدا کے حقوق غصب کرکے حاصل کی ہے) ان کی عقل و دانائی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دانا اور سب کو نادان سمجھتے ہیں۔

یہ بے خبر ثروت مند مغرور اپنے آپ کو سب سے زیادہ عالم اور دانا اور سب کو نادان سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کی دولت یہاں تک کہ اُن کی جرأت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنی ہستی سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو اُس کی ذات سے مستغنی سمجھ کر کہنے لگتے ہیں کہ:-

"ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہماری جدت، تیزیٔ طبع، تخلیقی استعداد اور علم و دانش کا نتیجہ ہے"

ہم نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے تباہ کار متکبرین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اگر قارون مع اپنے عیال و دولت کے قعرِ زمین میں پیوست ہوکر نابود ہوگیا تو دوسرے لوگ، دوسرے طریقوں سے نابود ہو جائیں گے اور زمین ان کی دولت کو کسی اور شکل سے نگل لے گی۔

بعض لوگ اپنی کثیر دولت سے محلات بناتے اور باغ لگاتے ہیں اور ایسی جائیدادیں خریدتے ہیں کہ اُن سے فائدہ اُٹھانا اُن کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی دولت سے بنجر اور ویران زمینیں اس خیال سے خرید لیتے ہیں کہ اُن کے پلاٹ بنا کر فروخت کریں گے۔ اور اس طرح سے بہت سی دولت کما لیں گے۔ اس طرح زمین ان کی دولت کو نگل لیتی ہے۔

اس قسم کے سبک سر دولت مندوں کے سامنے جب اپنی کثیر دولت کو خرچ کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو پھر انھیں ایسے شوق ہو جاتے ہیں جن کی اقدار محض وہمی ہوتی ہیں مثلاً وہ آثار قدیمہ سے برآمد شدہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور کوزے، بیرنگ تختیاں، سالہا سال پُرانی ٹکٹوں یا نوٹوں کو گراں بہا قدیم یادگاریں سمجھ کر خرید لیتے ہیں اور انھیں احتیاط سے اپنے محلات میں سجاتے ہیں۔ اگر ان چیزوں کی حقیقت پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ کوڑی پر پھینکنے کے لائق ہیں۔

ان اہلِ ثروت نے یہ بازیب و زینت روشِ حیات اس حالت میں اختیار کی ہے کہ اُن کے شہر و دیار یہاں تک کہ اُن کے ہمسائے اور زیرِ دیوار نادار اور مفلوک الحال لوگ رہتے ہیں۔ جو رات کو بھوکے سوتے ہیں۔ مگر ان دولت مندوں کا ضمیر ایسا مُردہ ہوگیا ہے کہ انھیں ان غربا کی تکلیف کا قطعی احساس نہیں ہوتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دولت مندوں کے پالتو حیوانات نہایت آرام دہ زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کے لیے تربیت دینے والے اُستاد مقرر کیے جاتے ہیں۔ بوقت بیماری اُن کے لیے طبیب کو بُلایا جاتا ہے۔ جبکہ اُن اہلِ دولت کے قرب و جوار میں مظلوم انسان انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ وہ بسترِ بیماری میں نالہ و فریاد کر رہے ہوتے ہیں، مگر انھیں طبی امداد میسر ہوتی ہے نہ دوا کا ایک قطرہ۔

سطورِ بالا میں جو حالات ہم نے کسی معاشرے کے مخصوص افراد کے لکھے ہیں وہ کبھی ایک قوم یا ملک پر بھی صادق آتے ہیں یعنی دُنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کوئی ایک ملک قارون ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں امریکہ قارون ہوگیا ہے۔

اہلِ امریکہ تیسری دُنیا کے غریب، تہی دست اور پسماندہ عوام کا استحصال کرکے نہایت باشکوہ و جلال زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جو فالتو غذا کوڑوں پر پھینک دیتے ہیں۔ اگر اُسے جمع کرکے صحیح مصرف میں لایا جائے تو دنیا کے لاکھوں بھوکے انسانوں کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

جب ہم لفظ "غریب ملک" استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ ممالک من جانب اللہ مفلس و بے نوا ہیں بلکہ اُن ملکوں کو مغرب کی طاقتور قوموں نے غارت کرکے فقیر بنا دیا ہے۔ ان میں سے بعض ملکوں میں زیرِ زمین گراں بہا معدنیات اور ذخائر ہیں۔ لیکن مغرب کے غارتگر انھیں لوٹ کے جاتے ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں کو کنگال کر دیتے ہیں۔ مغرب کی یہ قارون قومیں درحقیقت خون آشام جونکیں ہیں جنہوں نے تیسری دنیا کے مستضعفین کی ویران شدہ جھونپڑیوں کے کھنڈرات پر اپنے

محلات تعمیر کیے ہیں۔

اس لیے ـــــــ جب تک دُنیا کی مستضعف اقوام متحد و متفق ہوکر ان قارونوں کو قعرِ زمین میں نہ بھیج دیں گی۔ دُنیا کے حالات ایسے ہی رہیں گے۔

فی الحال تو کیفیت یہ ہے کہ غارتگر اہلِ مغرب شراب پی کر عالمِ مستی میں قہقہے لگاتے ہیں اور مفلوک الحال اقوام سر جھکائے روتی ہیں۔

۲۔ قارون یہ دولت کہاں سے لایا تھا؟ یہ امر توجہ طلب ہے۔ سُورۂ مومن کی آیات ۲۳ اور ۲۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی رسالت کا آغاز ہی تین شخصوں کے ساتھ تنازعے سے شروع ہوا تھا۔ وہ تھے فرعون اُس کا وزیر ہامان اور مغرور ثروت مند قارون۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

ولقد ارسلنا موسٰی بآیاتنا وسلطان مبین الٰی فرعون وھامان وقارون فقالوا ساحرٌ کذّاب۔

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات، دلائل اور روشن معجزات دے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف بھیجا۔ مگر اُن سب نے کہا کہ یہ تو بڑا جھوٹا جادوگر ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قارون بھی فرعون کے رُفقا میں سے تھا اور اُن ہی کا ہم عقیدہ تھا۔ ہم تاریخ میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ وہ ایک طرف تو بنی اسرائیل میں فرعون کا نمائندہ تھا اور اُس کا دوسرا مقام یہ تھا کہ فرعون کا خزانہ دار تھا۔[1]

قارون کی اِن حیثیات کے پیشِ نظر اُس کا کردار قطعی روشن ہو جاتا ہے۔ کہ فرعون نے اِس منصوبے کے تحت کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر میں اسیر رکھے اور اُن کے سرمائے اور دولت کو لُوٹتا رہے۔ اُن ہی میں سے ایک منافق، حیلہ باز اور بے رحم انسان کو منتخب کر لیا تھا اور اسے بنی اسرائیل پر مسلط کر کے مختارِ کُل بنا دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنی پستی پر مبنی پُرظلم عہدے سے فائدہ اُٹھاکر اُن کا خُوب استحصال کرے اور اُنھیں تباہ کر دے۔ اور اپنے شیوۂ جَور سے خُوب دولت بھی کما لے۔

قرآن بتاتے ہیں کہ فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے نابود ہو جانے کے بعد اُن کی دولت اور خزانوں کی بہت بڑی مقدار قارون کے پاس رہ گئی تھی۔ اُس وقت تک حضرت موسیٰؑ میں اتنی قوّت پیدا نہ ہوئی تھی کہ قارون سے اُس فرعونی دولت کو جو اُس کے پاس تھی، مُستضعفین کی امداد کے لیے لے لیں۔

بہرکیف قارون نے خواہ اُس دولت کو فرعون کی حیات میں پیدا کیا تھا، یا فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد اُس کے خزانوں کو لُوٹ کر۔ یا بقول بعض بذریعہ علمِ کیمیا یا بذریعہ تجارت یا زیرِ اقتدار پسے ہوئے لوگوں کا استحصال کر کے، جو کچھ بھی ہو۔

جب حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اُس کے ساتھیوں پر فتح حاصل ہوگئی تو قارون نے معاً اپنی پالیسی بدل لی اور بہت بڑھ چڑھ کر (جیساکہ گروہ منافقین کا طریقہ ہوتا ہے) اپنے آپ کو توریت کی تلاوت کرنے والا اور اُس کا عالم ظاہر کیا۔ حالانکہ اس قسم کے لوگوں کے قلب میں نُورِ ایمان کی ایک کرن بھی داخل نہیں ہوتی۔[2]

آخر کار جب حضرت موسیٰؑ نے طے کر لیا کہ وہ اُس سے زکوٰۃ لیں گے تو اُس کے چہرے سے نقاب اُلٹ گئی اور اس کے

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی، جلد ۲۵، صـ۱۳ و تفسیر مجمع البیان، جلد ، صـ۲۶۶ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان، جلد ۸ صـ۵۲۰، سورۂ مومن کی آیت ۲۴ کے ذیل میں۔

پُرفریب رُوبند کے نیچے سے اُس کا بُرا اور منحوس چہرہ ظاہر ہوگیا ـــــ اور ہم نے دیکھا کہ اُس منافق انسان کا کیا انجام ہوا۔

۳۔ دولت کے بارے میں اسلام کا مؤقف: ہم نے جو کچھ سطور بالا میں بیان کیا ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ مال و دولت کے معاملے میں اسلام کا رویہ منفی ہے اور وہ ثروت مندی کا مخالف ہے۔ یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ اسلام غربت و افلاس کو پسند کرتا ہے اور لوگوں کو مسکنت اور بے نوائی کی طرف دعوت دیتا ہے اور اُس حالت کو رُوحانی کمالات کے حصول کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

بلکہ ـــــ اس کے بالعکس اسلام مال و دولت کو ایک مؤثر اور کارساز وسیلہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۰ میں "مال" کو خیر کہا گیا ہے۔ نیز ـــــ امام باقرؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

نعم العون الدنیا علٰی طلب الاٰخرۃ

آخرت تک پہنچنے کے لیے دُنیا اچھا وسیلہ ہے۔[1]

بلکہ ـــــ زیرِ بحث آیات جن میں مغرور اور صاحبِ ثروت قارون کی شدید ترین مذمّت کی گئی ہے، اُن سے بھی یہ حقیقت مترشح ہے کہ اسلام اُس دولت کو پسند کرتا ہے جس کے وسیلے سے "دارِ آخرت" کی جستجو اور اگلے جہان کی نعمات کو طلب کیا جائے۔

جیسا کہ بنی اسرائیل کے اہلِ دانش نے قارون سے کہا: "وابتغ فیما اٰتاک اللّٰہ الدار الاٰخرۃ"۔ اسلام اُس دولت کو پسند کرتا ہے جس میں "احسن کما احسن اللّٰہ الیک" کے تقاضے کے مطابق تمام بنی نوع انسان کے ساتھ بھلائی اور احسان ہو۔

اسلام اس دولت کا مدّاح ہے جس کا مالک "لاتنس نصیبک من الدنیا" کی تعلیم پر عامل ہو (یعنی دولت مند ہونے کے باوجود یہ خیال رکھتا ہو کہ دولتِ دُنیا میں میرا محدود حصّہ ہے)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام اُس دولت کا خواہاں ہے جو "زمین پر باعثِ فساد، انسانی اقدار کو فراموش کر دینے والی، ارتکاز و تکاثر کی جنون آمیز مسابقت میں گرفتار کر دینے والی۔ انسان میں جذبہ برتری ذات پیدا کرنے والی۔ دوسروں کو بہ نظرِ تحقیر دیکھنے والی اور یہاں تک کہ پیغمبروں کے مدِمقابل آنے والی نہ ہو۔ اِن اخلاقِ رزیلہ کی بجائے وہ دولت ایسی ہو جس سے جُملہ بنی نوع کو فائدہ پہنچے، بین الناس اقتصادی نشیب و فراز کے خلا کو پُر کر دے، بے چارے غم رسیدہ لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھے اور مستضعفین کے احتیاجات اور مشکلات کا حل بن جائے۔ اگر کوئی شخص ایسی دولت کا مالک ہے جس کے مصرف ایسے مقدس مقاصد ہیں تو اُس شخص کو دُنیادار اور دولت پرست نہیں کہہ سکتے۔ ایسے شخص کا تعلق نعماتِ آخرت سے ہے۔ چنانچہ ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ: امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ:

"ہم دُنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور اُس سے دلبستگی رکھتے ہیں۔ ہم اِس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم دُنیا پرست نہ ہو جائیں"۔

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۲ صـ۱۷ (ابواب مقدمات تجارت سے باب ۱۶، حدیث ۵)

امام (جو کہ اس شخص کی نیکی اور تقویٰ کو جانتے تھے) نے اُس سے سوال کیا۔

تو دُنیا کی دولت کو کس کام میں خرچ کرنا چاہتا ہے ؟

اُس شخص نے جواباً عرض کیا :

مَیں اُس سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی معاش فراہم کرتا ہوں، اپنے اعزا کی مدد کرتا ہوں، راہِ خدا میں انفاق کرتا ہوں اور حج و عمرہ بجالاتا ہوں۔

یہ سُن کر امامؑ نے جواب دیا :

"لیس هٰذا طلب الدنیا هٰذا طلب الاٰخرة "

یہ دُنیا طلبی نہیں ہے ، طلب آخرت ہے۔ [1]

اس استشہاد کی بنا پر دو قسم کے لوگوں کے عقائد کا بطلان ثابت ہوتا ہے :

اوّل : مسلمان نما تعلیماتِ اسلامی سے بے خبر لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام سرمایہ داری کا حامی ہے۔

دُوسرے : وہ اہلِ غرض دُشمنانِ اسلام جو تعلیماتِ اسلام کو مسخ کر کے اُسے معاندِ ثروت اور حامی افلاس و تہی دستی قرار دیتے ہیں ـــــ مگر اُن پر یہ حقیقت منکشف ہونی چاہیئے کہ :

ایک مفلس و نادار قوم کبھی آزاد اور باعزّت زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

قومی افلاس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ پسماندہ قوم کسی قوی قوم کے زیرِ اثر آکر اس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مفلسی دُنیا و آخرت دونوں جگہ رُوسیاہی کا باعث ہے۔

مفلسی انسان کو گناہ اور مکروہات کی طرف دعوت دیتی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک قول اس معنٰی کا مصداق ہے :

"غنی یحجزك عن الظلم خیر من فقر یحملك علی الاثم "

وہ دولت مندی جو تجھے دوسروں کے سلب حقوق سے باز رکھے اُس فقر سے بہتر ہے جو تجھے گناہ پر آمادہ کرے۔

اس لیے تمام مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی تمام کوشش اس امر پر صرف کریں کہ وہ مالی حیثیت سے غنی اور بے نیاز ہو جائیں، خود کفیل ہوں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ وہ اپنے شرف، عزّت اور استقلال کو، بوجہ فقر و افلاس دوسری قوموں کی وابستگی پر قربان نہ کریں اور یہ جان لیں کہ اسلام کے نزدیک صراطِ مستقیم یہی ہے۔

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۹ (حدیث ۲ از باب ۷، از ابواب مقدمات التجارۃ)۔

۸۳۔ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○

۸۴۔ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۸۳۔ ہم نے دارِ آخرت کو صرف اُن لوگوں کے لیے بنایا ہے جو دُنیا میں اپنی بڑائی اور (حصولِ اقتدار) کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ فساد کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور انجام نیک تو پرہیزگار لوگوں کے لیے ہی ہے۔

۸۴۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اس کے لیے اس کا بہتر صلہ موجود ہے اور جو لوگ کہ بُرے کام کرتے ہیں، اُن کا بدلہ بھی اُن کے اعمال کے مطابق ہی دیا جائے گا۔

تفسیر

فساد فی الارض اور ہوسِ اقتدار کا نتیجہ :

گزشتہ آیات میں ایک گنہگار و متکبّر ثروت مند (یعنی قارون) کے عبرت انگیز واقعہ کے ذکر کے بعد اب زیرِ بحث آیات میں سے پہلی آیت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، درحقیقت وہ اُس ماجرے کا ایک کُلّی نتیجہ ہے۔ چنانچہ ربُّ العزّت فرماتا ہے :

ہم سرائے آخرت صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں جو دُنیا میں ہوسِ اقتدار نہیں رکھتے اور نہ فساد کرتے ہیں۔ (تلك الدار الاٰخرة نجعلها للذین لا یریدون علوًّا فی الارض ولا فسادًا)۔

صرف یہی نہیں کہ وہ بڑا بننے کے خواہشمند اور مفسد نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔ اُن کا دل اِن آلائشوں سے پاک اور اُن کی رُوح اِس قسم کی آلودگیوں سے منزّہ ہے۔

انسان کے لیے جو چیزیں نعمات آخرت سے محرومی کا سبب بنتی ہیں وہ درحقیقت یہی دو ہیں :

اول : بڑا بننے کی طلب ۔

دوم : "فساد فی الارض" ۔ تمام گناہ ان ہی دو چیزوں میں جمع ہیں کیونکہ خدا نے جن منکرات سے نہی کی ہے ، وہ انسان کیلئے تحصیل شرف و کمال اخلاق میں مانع اور اُس کی منشائے تخلیق کے خلاف ہیں ۔

حتٰی کہ ہوسِ اقتدار بجائے خود ان چیزوں میں سے ہے جنہیں "فساد فی الارض" کہتے ہیں ۔ اسی لیے اس کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اُس کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے ۔

ہم نے 'قارون' کے تفصیلی حالات اور اُس کی سرنوشت میں دیکھا ہے کہ جو بات اُس کی بدبختی ، ہلاکت اور نیستی کا باعث بنی وہ اُس کا تکبر اور برتری کی ہوس تھی ۔

اسلامی روایات میں اس مسئلے پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے :

ان لرجل لیعجبه ان یکون شراك نعله اجود من شراك نعل صاحبه
فید خل تحتها ۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اُس کی جوتی کے بند اس کے دوست کے بند سے بہتر ہوں ۔ تو وہ شخص محض اس جذبۂ برتری سے اس آیت کے مفہوم میں داخل ہو جاتا ہے ۔[1]

قابل توجہ یہ امر ہے کہ مفسّر تفسیر کشّاف اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد ایک افادہ کا اضافہ کرتا ہے :-

بعض اہل طمع آیۂ زیر بحث میں جذبۂ کبر ذات اور برتری کو بہ مقتضائے آیہ (قصص ۴) "ان فرعون علا فی الارض" محض فرعون ہی سے منسوب کرتے ہیں ۔ اور بہ مقتضائے آیہ (قصص ۷۷) " ولا تبغ الفساد فی الارض " فساد کو قارون سے مخصوص کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو آدمی فرعون اور قارون کی مانند نہ ہو ، بہشت اور دائمی گھر اُس کی ملکیت ہے ۔ اس طرح وہ لوگ صرف تنہا فرعون و قارون اور اُن جیسے افراد کو بہشت سے خارج کرتے ہیں ۔ اور باقی نعماتِ آخرت کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں ۔ ان حضرات نے اس آیہ کے اخیر میں " والعاقبة للمتقین " پر اس طرح پر غور نہیں کیا جس طرح اُس پر امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ نے غور فرمایا تھا ۔[2]

اس مقام پر " مفسّر تفسیر کشاف " کے قول پر ہم اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ ان اہل طمع حضرات نے فرعون اور قارون کی حقیقت

---

[1] تفسیر " جوامع الجامع " زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] تفسیر فخر رازی : زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

کو بھی نہیں پہچانا ۔ کیونکہ فرعون نے اپنے آپ کو برتر و عالی سمجھا اور وہ مفسد بھی تھا :

انّہٗ کان من المفسدین " (قصص ۴)

قارون نے بھی اُس کی مانند زمین میں فساد کیا اور جذبۂ برتری بھی رکھتا تھا ۔ بہ مقتضائے آیۃ :

"فخرج علی قومه فی زینته " (قصص ۷۹)

ایک روایت میں جناب امیرالمومنین علی علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے کہ خلافتِ ظاہری کے زمانے میں آپ بذاتِ خود بازاروں میں تشریف لاتے تھے ۔ جو لوگ راستہ بھول گئے ہوتے اُن کی رہنمائی کرتے تھے ، ضعیف لوگوں کی مدد کرتے تھے ۔ آپ سوداگروں اور کاسبین کے قریب سے گزرتے تھے اور اُنھیں یہ سناتے جاتے تھے :

تلك الدار الاخرة نجعلها للذین لا یریدون علوًا فی الارض ولا فسادا

اس کے بعد آپؑ یہ فرماتے تھے :

نزلت هذه الاية فی اهل العدل والتواضع من الولاة واهل القدرة من الناس

یہ آیۃ عادل و متواضع سربراہانِ مملکت اور حکام نیز قوم کے صاحبانِ قدرت و اختیار افراد کے متعلق نازل ہوئی ہے ۔[1]

کاسبین اور سوداگروں کو اس تنبیہ سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ جس طرح میں نے حکومت کو اپنے لیے سبب برتری نہیں سمجھا ، تمہیں بھی چاہیئے کہ اپنی فراوانیٔ دولت کو دوسروں پر تحکّم کا سبب نہ بناؤ ۔ کیونکہ انجام نیک صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جن میں احساسِ برتری نہیں اور نہ وہ زمین پر فساد کرتے ہیں ۔

جیسا کہ قرآن میں اس آیت کے آخر میں مذکور ہے " والعاقبة للمتقین " عاقبت پرہیزگاروں کے لیے ہے ۔

" عاقبت " ایک وسیع المفہوم کلمہ ہے ۔ جس میں اس جہان کی پیروزی اور نیک انجام اور دارِ آخرت میں بہشت اور اُس کی نعمتیں ، سب کچھ شامل ہے ۔

چنانچہ ہم نے دیکھا کہ قارون اور فرعون کا کیا انجام ہوا ۔ باوجودیکہ وہ بے مثال طاقت رکھتے تھے ۔ مگر ، چونکہ اُن میں تقوٰی نہ تھا ۔ لہٰذا وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے ۔

اب ہم اس آیۃ کے متعلق اپنے بیان کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کر کے ختم کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس وقت امامؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا :

ذهبت والله الامانی عند هذه الاية

اس آیۃ نے دُنیا میں میری تمام آرزوؤں کو ختم کر دیا ہے اور پیروزیٔ آخرت بھی مشکل ہے ۔[2]

---

[1] اس روایت کو " زاذان " نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نقل کیا ہے ۔ تفسیر مجمع البیان ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم زیر بحث آیت کے ذیل میں

اس حقیقت کے بیان کے بعد کہ سرائے آخرت اور اس کی نعمات دُوسروں پر تسلط جمانے والوں اور متکبرین کے لیے نہیں ہیں بلکہ متواضع اور حق طلب پرہیزگاروں کے لیے ہیں زیرِنظر آیات میں سے دُوسری آیۃ میں ایک قانونِ کلی کا ذکر کیا گیا ہے جس میں پاداش اعمال اور کیفرِ کردار کے متعلق خدا کے عدل اور تفضّل کا ذکر ہے۔ یعنی جو آدمی نیک کام کرے گا اُس کا بہتر بدلہ پائے گا: (من جآء بالحسنة فلهٗ خيرٌ منها)۔

جزائے خیر کا موقع خدا کا مقام تفضّل ہے۔ ذاتِ الٰہی دُنیا کے تنگ چشم لوگوں کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ کسی کے عمل کا صلہ دینے لگتے ہیں تو اُن کے نزدیک عدالت کا یہی مفہوم ہے کہ وہ صلہ ٹھیک اُس کام کے مطابق ہو۔ مگر ذاتِ الٰہی کا مقام اس سے ارفع ہے۔ وہ کبھی بمقابلۂ عمل اپنے لُطفِ بیکراں سے دس گنا، کبھی سو گنا اور کبھی ہزار گنا صلہ دیتا ہے۔ کم از کم دس گنا تو ضرور ہی دیتا ہے، جیسا کہ ہم سورۂ انعام کی آیۃ ۱۶۰ میں پڑھتے ہیں:

"من جآء بالحسنة فله عشر امثالها"

مگر ـــــ اُس صلہ کی حد آخر کو خدا خُود ہی جانتا ہے۔ جس کا ذکر سورہ بقرہ کی آیۃ ۲۶۱ میں راہِ خدا میں انفاق کے صلہ میں ضمناً آیا ہے۔

البتہ ـــــ اس اجر و صلہ کو کئی گنا کر دینا بے حساب نہیں ہے۔ اس کا انحصار پاکیٔ عمل، اخلاص، حُسنِ نیت اور صفائے قلب کے معیار پر ہے۔

نیکوکاروں کے متعلق خدا کے اس فضل و لُطف کا ذکر بدکاروں کے اعمال کی سزا کے بعد آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ گناہ کرتے ہیں اُنہیں اُن کے اعمال کے مطابق ہی سزا دی جائے گی: (ومن جآء بالسيئة فلا يجزى الذين عملوا السيئات الا ما كانوا يعملون)۔

یہ اُس پروردگار کا مقامِ عدل ہے کہ گنہگار اپنے عمل سے ایک ذرہ بھی زیادہ سزا نہیں پائیں گے۔ اس مقام پر یہ جُملہ جاذبِ توجہ ہے کہ:

اُن کے اعمال ہی خود اُن کا صلہ ہیں۔

یعنی اُن کے اعمال کے آثار، (عالمِ ہستی میں بنائے موجودات کے قانون کے مطابق) اُن کے نفوس اور عالمِ خارجی میں باقی رہ جاتے ہیں اور بروزِ قیامت، جس روز ہر رازِ پنہاں آشکار ہو جائے گا، یہ اعمالِ سیئہ مجسّم ہو کر گنہگاروں کے ساتھ ہوں گے اور اُن کے لیے آزار و اذیت کا موجب ہوں گے۔

اس مقام پر تین سوال پیدا ہوتے ہیں، جن کا جواب دینا ضروری ہے:

۱۔ اس آیۃ میں کلمہ "سیئۃ" کی دو مرتبہ تکرار کیوں ہوئی ہے؟

ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اس امر کا بیان حتمی مقصود ہو کہ "سیئات" میں ہر گنہگار کو صرف اُسی عملِ بد کی سزا ملے گی جو اُس نے انجام دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر: خود کردہ را علاجے نیست

۲۔ کیا آیۃ فوق میں کلمہ "حسنہ" میں ایمان اور توحید بھی شامل ہیں؟

اگر یہ درست ہے تو پھر اس جملہ کے کیا معنی ہیں؟ جو کہا گیا ہے:

"ہم اُس سے بہتر کو، اُس کی جزا قرار دیں گے"

کیا اس سے بہتر بھی کوئی شے ہوگی جو اُس کی جزا ہو جائے گی؟

ہم اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ بدون تردید کلمہ "حسنہ" کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس میں انسان کے معتقدات، گفتار و کردار سب کچھ شامل ہے۔ لیکن "پروردگار کی رضا و خوشنودی" توحید کے صرف اعتقاد سے بہتر ہے اور یہی نیکوکاروں کی جزا ہے۔ جیسا کہ ہم سورۂ توبہ کی آیۃ ۷۲ میں پڑھتے ہیں:

ورضوان من الله اكبر

خدا کی خوشنودی ہر جزا سے بہتر ہے۔

۳۔ آیۃ فوق میں کلمہ "حسنہ" مفرد کیوں استعمال ہوا ہے اور کلمہ "سیّئات" جمع کیوں استعمال ہوا ہے؟

اس سلسلے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بہ لحاظ شمار گنہگاروں کی تعداد زیادہ ہے اور نیکوکاروں کی کم ہے۔

اس مقام پر یہ امکان بھی ہے کہ جملہ حسنات "حقیقتِ توحید" میں مجتمع ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ اگر "حسنات" کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی بنیاد عقیدۂ توحید ہی ہے جبکہ سیئات کی بُنیاد شرک ہے اور شرک میں بخلاف "توحید" پراگندگی اور کثرت پائی جاتی ہے۔

۸۵۔ إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○

۸۶۔ وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ○

۸۷۔ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○

۸۸۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۸۵۔ وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہی تجھے تیرے انجام تک پہنچا دے گا۔ کہہ دے کہ میرا رب اُسے بھی خُوب جانتا ہے جو ہدایت لے کر آیا اور اُسے بھی جو کُھلی گمراہی میں ہے۔

۸۶۔ اور تجھے یہ توقع نہ تھی کہ یہ کتاب تجھ پر نازل کی جائے گی۔ مگر یہ محض تیرے رب کی رحمت سے تجھ پر نازل ہوئی ہے پس ہرگز کافروں کا مددگار نہ ہونا۔

۸۷۔ اور بعد از نزول وہ تجھے آیاتِ خدا کی تبلیغ سے روک نہ دیں۔ اُنھیں خدا کی طرف دعوت دے اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

۸۸۔ اور خُدا کے ساتھ کسی اور معبُود کو مت پکارو کیونکہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس کی ذات کے سوا ہر شے فانی ہے۔ حُکم اُسی کا ہے اور سب کچھ اُسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

شانِ نزول :

کچھ مفسّرین نے زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت کی شانِ نزول ابنِ عباس سے نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے :۔

جس وقت جناب رسُولؐ اللہ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ کی طرف جا رہے تھے، تو جب آپ مقامِ جحفہ پر پہنچے کہ جس کا فاصلہ مکہ سے کچھ زیادہ نہیں ہے تو آپ کو اپنا وطن یاد آیا یعنی شہرِ مکہ، کہ جو خدا کا حرم ہے۔ اور وہاں خانہ کعبہ بھی ہے جس سے آنحضرتؐ کا ناقابلِ انقطاع قلبی اور رُوحانی تعلق تھا۔

اِس یادِ وطن سے احساسِ غم آپ کے چہرے پر نمایاں ہوا۔ اُس مقام پر جبرئیل نازل ہوئے اور پُوچھا : کیا واقعاً آپ کو اپنے شہر اور جائے پیدائش کا بہت اشتیاق ہے ؟ آنحضرتؐ نے فرمایا : "ہاں ضرور ہے "۔ تب جبرئیل نے عرض کیا کہ خدا نے آپ کو یہ پیغام بھیجا ہے :

ان الذی فرض علیك القراٰن لرآدك الٰی معاد

جس ذات نے اِس قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے وہ تجھے تیرے وطن میں بھی پہنچا دے گا۔[1]

ہم جانتے ہیں کہ آخر کار یہ عظیم وعدہ پُورا ہوا۔ پیغمبرِ اسلام ایک طاقتور فوج اور بڑی عظمت کے ساتھ مکہ کو فاتحانہ لوٹے اور حرمِ خدا جنگ اور خُون ریزی کے بغیر آپ کے قبضے میں آگیا۔

تاریخ کے اِس عظیم انقلاب کے پیشِ نظر زیرِ نظر آیت قرآن کی اعجاز آمیز پیش گوئیوں میں سے ہے کہ اس کے ذریعے آنحضرتؐ کو حتمی طور پر کسی شرط کے بغیر ایسی خبر دی گئی۔ جو قلیل مدت کے بعد درست ثابت ہوئی۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

حرمِ امن خدا کی طرف بازگشت کا وعدہ :

یہ سُورہ قصص کی آخری آیات ہیں۔ ان میں پیمبرِ اسلامؐ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ موسیٰ بن عمران کی زندگی کے بعض گوشوں اور فرعون اور اُس کے رفقاء سے جنگ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان میں پیمبرِ اسلامؐ کو بشارت دی گئی ہے نیز انھیں نہایت مستحکم دستور العمل دیے گئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے سطُور بالا میں ذکر کیا ــــ ان آیات میں سے پہلی آیت (جیسا کہ مشہور ہے) مقامِ جحفہ پر اس وقت نازل ہوئی، جب آنحضرتؐ مدینے کی طرف سفر کر رہے تھے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر فخر رازی، تفسیر قرطبی، تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر۔

اُن کا ارادہ تھا کہ یثرب جائیں اور اس بستی کو "مدینۃ الرسول" بنادیں۔ اُس مقام پر اسلامی حکومت کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھیں تاکہ پیامِ اسلام میں جو انقلابی صلاحیتیں ہیں، انہیں عمل میں لائیں اور اُس مقام کو وسیع حکومتِ الٰہی اور اس کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے مرکز قرار دیں۔

اس عظیم منصوبے کے باوجود آپ کو مکہ سے جو دل بستگی تھی وہ رنج و غم کا باعث بنی رہتی تھی اور آپ کو اس حرم امن الٰہی سے دُوری سخت ناگوار تھی۔

ان حالات میں آپ کے قلبِ مُطہر پر نُورِ وحی کی تابش ہوتی ہے اور آپ کو وطن مالوف کی طرف بازگشت کی بشارت دی جاتی ہے "بایں الفاظ" کہ: وہی ذات جس نے تم پر قرآن کو فرض کیا، وہ تمہیں تمہارے وطن و مولد کو واپس کر دے گی: (ان الذی فرض علیک القراٰن لرآدک الٰی معاد)۔

تم رنجیدہ خاطر نہ ہو ـــــ وہی خُدا جس نے عالمِ طفولیت میں موسٰی کو اُس کی ماں کے پاس لوٹا دیا، وہی خدا جس نے مصر سے دس سال کی جلاوطنی کے بعد اُسے، اُس کے وطن کو واپس کر دیا تاکہ وہ چراغِ توحید روشن کرے اور مستضعفین کی حکومت قائم کرے۔ اور منکرینِ خدا فرعونیوں کی طاقت کو برباد کر دے۔ وہی تم کو بھی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ مکہ کو لوٹا دے گا۔ اور تمہارے ہاتھ سے اُس مقدس سرزمین میں چراغ توحید روشن کرائے گا۔

وہی خدا جس نے تم پر قرآن نازل کیا، اس کی تبلیغ فرض کی اور تم پر اُس کے احکام کو واجب کیا۔ اُس زمین و آسمان کے مالک قادرِ مطلق خدا کے لیے یہ امور آسان ہیں۔

اس کے بعد اس مطلب کا اضافہ ہے کہ: ان سرپھرے اور متکبر مخالفین سے کہہ دو کہ میرا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس کی طرف سے کون ہدایت لایا ہے اور کون شخص کھُلی گمراہی میں ہے: (قل ربی اعلم من جآء بالھدٰی ومن ھو فی ضلالٍ مبین)۔ مقصد یہ ہے کہ راہِ ہدایت روشن ہے اور مشرکین کی گمراہی آشکار ہے۔ یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں عبث ہے۔ خدا اُن کے افعال سے خوب آگاہ ہے اور حق طلب قلوب بھی حقیقت کو خوب جانتے ہیں۔

اس آیت کی واضح تفسیر یہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی ہے لیکن بہت سے مفسرین نے کلمہ "معاد" کے متعلق دوسرے احتمالات کی طرف بھی رجُوع کیا ہے۔ اُن کے خیالات یہ ہیں کہ:۔

"معاد" سے مراد حیات بعد از موت ہے، یا سرزمینِ محشر، یا خُود موت، یا مقامِ شفاعتِ کُبریٰ، یا بہشت یا بیت المقدس (جہاں سے آنحضرتؐ معراج پر گئے تھے) نیز اسی طرح کے بہت سے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ لیکن آیت کے کُلیۃً مطالعے اور سرگزشت موسٰی و بنی اسرائیل پر غور کرنے کے بعد، اور مذکورہ شانِ نزول کے علم کے بعد یہ تمام معانی حقیقت سے بعید نظر آتے ہیں۔ اس لیے کلمہ "معاد" کی تفسیر (یعنی مقامِ بازگشت) سرزمین مکہ ہی درست ہے۔

علاوہ بریں، یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اگر کلمہ "معاد" کے معنی روزِ قیامت لیے جائیں تو وہ روز صرف پیمبرؐ ہی سے تو مخصوص نہیں ہے جب کہ آیت کا رُوئے سُخن صرف جناب پیغمبرؐ کی طرف ہے۔ نیز یہ کہ ماقبل آیت (۸۴) میں بروز قیامت اعمال کی جزا و سزا کا بیان ہے اور یہ اُس کے بعد ہے، اس لیے بھی کلمہ معاد کا وہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اِس کے برعکس

مطلب کا قوی اِمکان ہے۔ کیونکہ آیت ماقبل (۸۴) میں سرائے آخرت میں جزائے اعمال کا ذکر ہے۔ تو سیاقِ معانی کا تقاضا یہ ہے کہ **اس آیت** میں اِس دنیا کی کامرانیوں کا ذکر ہو۔

❊ ❊ ❊

آیت مابعد (۸۶) میں پیمبرِ اکرمؐ کو خدا کی طرف سے ایک عظیم ترین نعمت کے عطا ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"تمہیں ہرگز اُمید نہ تھی کہ یہ عظیم آسمانی کتاب تمہیں القا کی جائے گی لیکن یہ تمہارے ربّ کی رحمت کا تقاضا تھا":
(وماکنت ترجوا اَن یلقٰی الیک الکتاب الا رحمۃ من ربک)[1]

اُس وقت بہت سے لوگوں نے نئے دین کی آمد کی خوش خبری سُن رکھی تھی۔ نیز، شاید اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگ اس عنایتِ الٰہی کے منتظر تھے کہ وحی اُن پر نازل ہوگی اور خدا اُنھیں یہ ذمہ داری سپرد کر دے گا لیکن اے پیغمبر تمہیں اس کا گمان بھی نہ تھا۔ مگر خدا نے تمہیں اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھا کہ یہ دین تمہارے ذریعے سے دنیا میں پھیلے۔ بعض بزرگ مفسرین نے اس آیت کو اُن آیات سے مربوط سمجھا ہے جن میں پیمبرِ اسلام سے داستانِ موسٰی کے بارے میں خطاب کیا گیا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

وماکنت بجانب الغربی اذ قضینا الٰی موسی الامر .... (قصص۔ ۴۴)
وماکنت ثاویًا فی اھل مدین ..... (قصص۔ ۴۵)
وماکنت بجانب الطُّور اذ نادینا ولٰکن رحمۃ من ربّک .... (قصص۔ ۴۶)
اے رسول تم ہرگز وادئ طور میں موجود نہ تھے، جہاں ہم نے موسٰی پر وحی نازل کی تھی ....
تم نے اہل مدین میں زندگی نہیں گزاری .....
اور جب ہم نے طور پر موسٰی کو وحی کی تھی تم اُس وقت بھی موجود نہ تھے۔ مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے کہ اُس نے تمہیں اِن حالات کی خبر دی۔

اِس تفسیر کے مطابق "کتاب" سے مراد سرگزشتِ انبیائے ماسبق ہے۔
مگر اِس تفسیر اور تفسیرِ ماسبق میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ اسے اُس تفسیر کا ایک حصہ ہی سمجھنا چاہیئے۔
اس کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ ہے کہ:
اَب اس عظیم نعمت کا شکریہ یہ ہے کہ کافروں کی ہرگز مدد نہ کرنا: (فلا تکوننّ ظھیرًا للکافرین)۔
یہ حکم اُس مطلب سے ہم آہنگ ہے جسے ہم آیات ماسبق میں حضرت موسٰیؑ کے متعلق پڑھ آئے ہیں کہ موسٰی نے کہا:

---

[1] بعض مفسرین نے اس مقام پر کلمہ "الا" کو استثنٰی کے معنی میں سمجھا ہے۔ اس بنا پر وہ مستثنٰی منہ کے حذف اور مقدر ہونے کے قائل ہوتے ہیں۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ "الا" اِس مقام پر "لٰکن" کے معنی میں ہے اور اِن معنی میں استدراک کا پہلو نکلتا ہے اور یہ معنی سیاق کے قریب تر ہیں۔

" پروردگارا ! اُن نعمات کی وجہ سے جو تُو نے مجھے دی ہیں۔
مَیں ہرگز مجرمین کا مددگار نہ بنوں گا۔
ظالموں کی مدد کرنے کے بارے میں، ہم نے سورۂ قصص کی آیت ۱۷ کے تحت مفصّل بحث کی ہے۔

* * *

اِس سُورہ کے آخر میں مختلف استدلالات اور تعبیرات کے ساتھ توحید کو واضح کیا گیا ہے۔ وہ توحید جو جُملہ دینی مسائل کی اصل بُنیاد ہے ، وہ توحید جو اصل بھی ہے اور فرع بھی، جو کُل بھی ہے اور جُز بھی۔

ان دو آیات میں پیغمبرِ اکرمؐ کو چار احکامات دیئے گئے ہیں اور خدا کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ نیز اس سُورۃ میں جتنے بھی موضوعات پر بحث ہوئی ہے ، یہ آیات اُن سب کا تکملہ ہیں :

سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کفّار تجھ پر نازل شُدہ آیات سے تجھے باز رکھیں :
(ولا یصدنك عن اٰیاتِ الله بعد اذ انزلت الیك) ۔

اس آیت میں اگرچہ حرفِ نہی کا مرجع کفّار ہیں۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبرؐ اُن کی سازشوں اور خلل اندازیوں سے متنبہ رہیں۔ جیسے کہ ہم کسی سے کہتے ہیں کہ : کوئی آدمی تمھیں بہکانے نہ پائے۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اُن کے دھوکے میں نہ آجانا۔

اِس کے بعد جناب پیغمبرؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب کہ تم پر آیاتِ الٰہی نازل ہو گئی ہیں تو اُن احکامات پر باستقلال قائم رہو اور کسی قسم کے تردّد اور شک کو دل میں نہ آنے دو۔ امر اللہ کی تبلیغ میں جو رکاوٹیں بھی پیش آئیں اُنھیں راستے سے ہٹا دو اور محکم قدموں کے ساتھ مقصد کی طرف بڑھو کیونکہ خدا تمھارے ساتھ ہے اور تمھارا مددگار ہے۔

مُفسّرِ معروف ابنِ عباس کے قول کے مطابق ، اِس آیت کی مخاطب تو ذاتِ پیغمبرؐ ہے لیکن مراد ہیں عام لوگ جیسے کہ ایک عربی ضرب المثل ہے۔ " ایاكِ اعنی واسمعی یاجارہ " میری مراد تُو ہے مگر اے ہمسائی تو بھی سُن لے۔

یہ حُکم جو نفی کا پہلو رکھتا ہے، اس کے بعد اثباتی انداز سے حکم دیا ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دے (وادع الٰی ربّك)۔
وہ خدا جو تیرا مالک ہے، تو جس کے اختیار میں ہے، وہی تیرا مربّی اور تیری پرورش کرنے والا بھی ہے۔ اس حکم کے بعد کہ پیغمبرؐ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیں، ہر قسم کے شرک اور بُت پرستی کی ممانعت کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ قطعاً مشرکین میں سے نہ ہونا : (ولا تکوننّ من المشرکین)۔
یعنی راہِ توحید قطعی آشکارا اور نورانی ہے اور اُس پر چلنے والے ہی راہِ مستقیم پر ہیں۔

* * *

بالآخر چوتھا حکم ہر قسم کے شرک کی نفی پر ایک تاکیدِ مکرّر ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبُود کو مت پُکار : (ولا تدع مع الله الٰهاً اٰخر)۔

الغرض یہ پے در پے احکام جن میں سے ہر ایک دوسرے حکم کا مُؤکّد ہے ، اسلامی پروگرام میں عقیدۂ توحید کی اہمیت کو روشن کرتے ہیں کیونکہ جب تک عقیدۂ توحید پوری طرح دلنشین نہ ہو ، تمام عقائد و اعمال برباد ہیں۔

قرآن میں ان چار احکامات کے ذکر کے بعد خدا کی چار صفات کا ذکر ہے کہ وہ لوازمِ عقیدۂ توحید میں سے ہیں :

۱۔ اوّل : یہ کہا گیا کہ " اُس کے سوا کوئی معبود نہیں : (لا الٰه الّا ھو) ۔
۲۔ اُس ذاتِ پاک کے علاوہ ہر چیز فانی اور نابود ہونے والی ہے : (كلّ شیءٍ هالكٌ الّا وجهه)۔
۳۔ دُنیائے تکوین و تشریع میں حُکم اور حاکمیت اُسی کی ذات سے مخصوص ہے : (له الحکم) ۔
۴۔ آخر الامر ہم سب کی بازگشت اُسی کی طرف ہے : (والیه ترجعون)۔

اِس امر کا امکانِ عقلی موجود ہے کہ آخری تین صفات اثباتِ توحید اور ہر قسم کی اُس بُت پرستی کو ترک کرنے کی دلیل ہو جس کا ذکر صفتِ اوّل میں کیا گیا ہے۔

کیونکہ ـــــــ ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف اُسی کی ذات کے لیے ہے۔
کیونکہ ـــــــ نظامِ ہستی کی تدبیر اور کائنات کی حاکمیت صرف اُسی کے لیے ہے۔
کیونکہ ـــــــ قیامت میں ہم سب کی بازگشت اُسی کی طرف ہوگی۔ اُس کے مقابلے میں معبودانِ مجازی کی بھلا کیا حقیقت ہے اور سوائے اُس کے اور کونسی چیز قابلِ پرستش ہے ؟

" كل شیءٍ هالكٌ الّا وجهه " کی تفسیر میں بڑے بڑے مفسّرین نے گوناں گوں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اِن آرائے مختلف کا محور دو کلمات " وجه اور هالك " ہیں۔ کیونکہ لغوی اعتبار سے کلمہ " وجه " اِنسان کے جسم کے اُس حصّہ کے لیے بولا جاتا ہے جسے چہرہ کہتے ہیں یعنی انسانی صُورت ۔ لیکن جس وقت یہ کلمہ خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اُس سے مُراد اُس کی ذات ہوتی ہے۔

کلمہ " هالك " کا مادّہ " ہلاک " ہے۔ جس کے معنیٰ موت اور نابودی کے ہیں۔ اِن معانی کے پیشِ نظر اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ذاتِ الٰہی کے سوا موجودات میں سے ہر شے فنا ہو جائے گی۔ یہ " فنا " کائنات کے اختتام پر منحصر نہیں ہے بلکہ بحالتِ موجودہ بھی اُس کے مقابلے میں ہر شے فانی اور معدوم ہے۔ کیونکہ جُملہ ممکنات اپنے وجُود کے لیے اُسی کی محتاج ہیں۔ اور لحظہ بہ لحظہ اُسی سے فیضِ وجُود حاصل کرتی رہتی ہیں۔ اُن کا قیام بذاتِ خود نہیں ہے، بلکہ یہ ارادۂ الٰہی ہے۔

ع اگر نازی کند یکدم فرو ریزند قالبہا

اگر مشیتِ ایزدی مائل بہ فنائے ممکنات ہو تو وہ ایک لمحے میں فنا ہو جائیں۔

علاوہ بریں ـــــ کائنات میں تمام موجودات ہر وقت متغیّر ہو رہی ہیں اور اُن کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایٹمی نظریے کے مطابق (یعنی حرکت جوہری) ہر شے کی ماہیّت تغیّر اور حرکت ہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تغیّر اور حرکت سے مراد ہے کہ ہر شے ہر لمحہ فنا اور وجود تازہ کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہے۔ یعنی موجوداتِ جہاں ہر لحظہ مرتے اور زندہ ہوتے رہتے ہیں۔

بنا بریں جملہ موجودات اپنی کیفیّت حالیہ میں بھی " هالك " اور فانی ہیں۔ صرف ذاتِ الٰہی وہ ہے جس میں تغیّر و فنا کو دخل نہیں ہے اور اس کی ذاتِ مقدّس استقلالِ محض ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ جب اِس دُنیا کا وقت آخر آئے گا تو ہر موجودِ ممکن پر فنا اور نیستی کا تسلّط ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے :

كلّ من عليها فان ويبقٰى وجه ربّك ذوالجلال والاكرام

زمین پر رہنے والا ہر وجود فنا ہوجائے گا صرف خدا کی ذات ذوالجلال ہی باقی رہ جائے گی۔

(رحمٰن - ۲۶ , ۲۷)

صرف اہلِ زمین ہی نہیں بلکہ اہلِ آسمان بھی فنا ہوجائیں گے:

ونفخ فى الصّور فصعق من فى السّمٰوات ومن فى الارض

اور جس وقت صور پھونکا جائے گا تو وہ سب کہ جو آسمان میں اور جو زمین میں ہیں مر جائیں گے۔

(زُمر - ۶۸)

یہ تفسیر اس آیت اور دیگر آیات کے ظاہری معنٰی سے ہم آہنگ ہے لیکن بعض مفسّرین نے اس آیت کی اور تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں:

کسی نے کہا ہے کہ "وجہ" سے مُراد عملِ صالح ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ:

انسان کے تمام اعمال "اُس عمل کے سوا جو لوجہ اللہ کیا گیا ہو" ضائع ہوجائیں گے۔

بعض دیگر حضرات نے کہا ہے کہ "وجہ" سے مُراد اشیا کا اللہ سے منسوب پہلو ہے۔ اس بنا پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ تمام اشیا بذاتہ تو معدوم ہیں، سوائے پروردگار کی طرف ان کے انتساب کا پہلو۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ "وجہ" بمعنیٰ دین ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بروزِ قیامت جملہ شریعتیں باطل اور فنا ہو جائیں گی بجز اللہ کے دین کے اور آیت میں کلمہ "له الحكم" کے معنٰی حاکمیت تشریعی سمجھے ہیں اور اسے اس مفہوم کے لیے کلمہ تاکید شمار کیا ہے۔ اسی طرح جملہ "واليه ترجعون" سے اخذ شریعت میں خدا کی طرف رجوع کرنا مُراد لیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ یہ جملہ ان معنٰی پر ایک مکرّر تاکید ہے[1]

ہم نے اس آیت کی تفسیر میں، سطور مافوق میں جو کچھ کہا تھا، یہ تفاسیر جن کا ہم نے بعد میں ذکر کیا اس کے منافی نہیں ہیں کیونکہ جب ہمیں یہ علم ہوگیا کہ اس عالم میں جو چیز باقی رہ جائے گی وہ صرف ذاتِ الٰہی ہوگی۔ تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جو شے کسی طرح بھی اُس کی ذات سے متعلق ہے وہ بھی کیفیتِ بقا و ابدیت اختیار کرلے گی۔

رہبرانِ الٰہی بھی بذاتِ خدا مربوط ہیں اس لیے وہ بھی جاودانی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شے بھی جو ذاتِ الٰہی سے تعلق اور ربط رکھتی ہے وہ فنا اور ہلاکت سے محفوظ رہے گی۔ (یہ مقام غور و فکر ہے)

---

[1] تفسیر نورالثقلین' میں اس آیت کے ذیل میں متعدد روایات کا ذکر ہے۔ ان میں سے بعض میں "وجہ" سے مراد دینِ خدا ہے اور بعض میں مراد رہبرانِ الٰہی اور بعض میں وہ چیزیں جو خدا سے منسوب ہیں۔

چند نکات

۱۔ تمام اشیا کس طرح فنا ہوں گی؟ آیات فوق کے ذیل میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر دنیا کے آخر میں سب چیزیں فنا ہو جائیں گی تو اس مٹی کو بھی فنا ہو جانا چاہیئے جو انسان کے جسم کی بن گئی ہے جب کہ قرآن میں بطور مکرّر یہ صراحت موجود ہے کہ ہم جسم کی اِن ہڈیوں کو جمع کر کے اِن سے دوبارہ انسان پیدا کریں گے۔ یا —— بروزِ قیامت انسان اپنی قبروں سے نکلیں گے۔

نیز جیسا کہ آیاتِ قرآنی کے ظاہری معنٰی سے مترشح ہوتا ہے، بہشت اور دوزخ بھی پیدا کیے جا چکے ہیں جیسا کہ کلمات "أعدّت للمتّقين" یا ان ہی جیسے اور کلمات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ "بہشت پرہیزگاروں کے لیے ہے" چنانچہ قرآن میں دو مقامات پر یعنی سُورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۳۳ اور سورۃ حدید کی آیت ۲۱ میں یہ بیان ہے۔ اور دو مقامات پر دوزخ کا ذکر "أعدّت للكافرين" کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ وہ ہیں سورہ بقرہ آیت ۲۴ اور سورۃ آلِ عمران آیت ۱۳۱۔

اَب سوال یہ ہے کہ اگر بہشت و دوزخ مخلوقات میں سے ہیں تو کیا وہ بھی بروزِ قیامت فنا اور نابود ہو جائیں گی؟ قطع نظر ان امور کے ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیے ایک حیاتِ برزخی بھی ہے۔ جیسا کہ "ارواح" کے ذکر کے وقت ہم نے اُسے آیاتِ قرآنی سے ثابت کیا ہے، تو کیا وہ ساکنانِ برزخ بھی فنا ہوجائیں گے؟

ذیل کی توضیحات سے اِن تمام سوالات کے جوابات واضح ہوجائیں گے:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کلمات "ہلاک' نابودی اور فنا" سے کسی نظم و ترتیب کا زیر و زبر ہوجانا مراد ہوتا ہے نہ کہ اُس شے کے موادِ اصلی کا فنا ہو جانا۔ مثلاً۔ اگر ایک عمارت زلزلہ کی وجہ سے مسمار ہو جائے تو اُس کیفیت پر ہم کلمات "فنا و ہلاک" کا اطلاق کرتے ہیں۔ حالانکہ اُس عمارت کا اصلی مواد موجود ہوتا ہے۔ اُس مواد کی صرف نظم و ترتیب درہم برہم ہوگئی ہوتی ہے۔

نیز یہ کہ دُنیا کے آخر وقت میں۔ خورشید بے نور، چاند تاریک اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور زمین پر ہر زندہ موجود کو موت آجائے گی۔ ایک پہلو سے اِن اشیا کے لیے ہلاکت کا مفہوم یہ ہے:

دُوسرے پہلو سے ہلاکت اور فنا کا اطلاق دُنیا اور اُس کے مافیہا پر ہے۔

لیکن بہشت اور دوزخ (خواہ ہم اُنھیں اسی دُنیا میں سمجھیں' خواہ اس دنیا سے باہر) اس دُنیا کا جُز نہیں ہیں کہ انھیں فنا اور نابودی کے حکم میں شامل کیا جاسکے۔ اِن چیزوں کا تعلق آخرت اور دوسری دُنیا سے ہے نہ کہ اس دُنیا سے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا کہ موجوداتِ امکانی کے لیے ہلاکت اور فنا کا انحصار صرف دنیا کے خاتمے پر ہی نہیں ہے بلکہ یہ موجودات بحالت موجودہ بھی فانی ہیں۔ کیونکہ اوّل تو ان کا وجود قائم بالذّات نہیں ہے بلکہ اپنے وجود کے لیے دوسرے کی محتاج ہیں۔ دوسرے یہ کہ جملہ کائنات ہمہ وقت حالت تغیّر اور حرکت میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حرکت کے معنٰی ہیں فنائے تدریجی۔ جس کے مطابق ہر وقت وجود و عدم کی دونوں کیفیات موجود رہتی ہیں۔ ان توضیحات سے محولا بالا سوالات کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۲۔ "ولاتدع مع اللّٰہ الٰھا اٰخر" کی غلط تفسیر: وہابی لوگ جن کا اس عقیدے پر اصرار ہے کہ "توسّل اور شفاعت" کا مسئلہ حقیقت توحید سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کبھی تو وہ آیت مافوق سے اور کبھی اسی کے مشابہ دوسری آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ:

قرآن میں صریحاً غیرِ خدا کی عبادت و پرستش، یا کسی غیر کا نام خدا کے نام کے ساتھ لینے سے نہی کی گئی ہے: فلاتدعوا مع اللّٰہ احدًا۔ (سُورہ جن - ۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کی آیات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ ہم کسی کو ہرگز نہ پُکاریں۔ ایسی آیات کا مفہوم وہی ہے جو کلمہ "مع اللّٰہ" سے سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص خدا کے اختیار اور اُس کی صفتِ خلاّقی میں کسی اور کو دخیل سمجھے اور مستقل طور پر یہ سمجھے کہ کوئی دوسری ذات بھی خدا کے کاموں کو انجام دے سکتی ہے، تو وہ مُشرک ہے۔

لیکن ــــ اگر ہم تمام اختیارات کو خدا سے مخصوص سمجھیں اور کسی کو بھی اس کی قدرت میں شریک یا مؤثر خیال نہ کریں ــــ مگر یہ عقیدہ رکھیں کہ اولیاءاللہ اُس کے اذن اور فرمان سے شفاعت کرتے ہیں اور اس نیت سے ہم اُن سے متوسّل ہوں کہ وہ خدا کے حضور میں ہماری شفاعت کریں گے تو یہ عین توحید ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف قرآن میں مکرّر اشارہ ہوا ہے۔

آیا ــــ جب برادرانِ یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ "یا ابانا استغفرلنا"

اے باپ تو ہمارے لیے خدا سے مغفرت طلب کر (سُورہ یوسف، ۹۷) تو کیا یہ شرک تھا؟!

یا ــــ جس مقام پر قرآن شریف میں یہ ذکر آتا ہے:

ولوانھم اذظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللّٰہ واستغفرلھم الرّسول لوجدوا اللّٰہ توّابا رحیمًا

جس وقت اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں، اگر وہ تیرے پاس آتے ہیں اور خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور رسول بھی اُن کے لیے مغفرت طلب کرے تو وہ خدا کو توّاب اور رحیم پائیں گے۔ (سورہ نسآء - ۶۴)

تو کیا یہ کفر کی طرف دعوت ہے؟

شفاعت اور توسّل کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے[1]

[1] اس مسئلے کی زیادہ توضیح کے لیے جلد ۳ میں سُورہ مائدہ کی آیت ۳۵ کے ذیل میں اور جلد اوّل میں سُورہ بقرہ کی آیت ۴۸ کے ذیل میں رجوع کریں۔

پروردگارا! ــ تو ہمارے دلوں کو توحید اور معرفت کے نُور سے منوّر کرتا کہ ہم تیرے سوا کسی کو نہ دیکھیں۔ تیرے سوا کسی کی جستجو نہ کریں اور تیرے سوا کسی کی آرزو نہ کریں۔

خداوندا ــــ تو اپنی ذاتِ پاک سے ہمارے ارتباط کو روز بروز محکم کرتا جا۔ تاکہ اِس طریقے سے ہماری رُوح پر تیری ذات کی بقائے جاودانی کا پر تو پڑے۔

بارِ الٰہا ــــ تو ہمارے دلوں سے دنیا کی محبّت، بڑائی کی خواہش اور فساد فی الارض کو دُور رکھ اور تُو ہمیں ان پرہیزگاروں کی صف میں جگہ دے جن کے لیے "عاقبت نیک" ہے (والعاقبة للمتقین)۔

سُورہ "قصص" کی تفسیر ختم ہوئی۔

اکیس ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۰۳ء بہ مطابق ۱۲ر تیر ماہ ۱۳۶۲ ہجری شمسی

سُورَۂ عنکبُوت

- یہ سُورہ مکّہ میں نازل ہوئی
- اس میں ۶۹ آیات ہیں

سُورۂ عنکبُوت کے مضامین

محققین کی ایک جماعت میں مشہور ہے کہ یہ کُل سُورت مکّہ میں نازل ہوئی۔ اس نہج سے اُس کے مضامین مکّی سُورتوں کے مضامین سے ہم آہنگ ہیں۔ اس سُورۃ میں مبدأ و معاد کا ذکر ہے، گزشتہ اولوا العزم انبیاء کے قیام اور مُشرکوں اور بُت پرستوں، جابروں اور ستمگروں سے اُن کی جنگ اور پھر فتح کا بیان ہے اور پھر نتیجۃً ظالم گروہ کی تباہی اور بربادی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

علاوہ بریں اس سُورہ میں یہ مضمون بھی ہے کہ انبیاء نے کس طرح منحرفین کو حق کی طرف دعوت دی اور اُنھیں اس راہ میں کیسی کیسی آزمائشوں سے سابقہ پڑا۔ نیز یہ کہ کفار کس طرح مختلف بہانوں سے قبولِ حق سے اعراض کرتے رہے۔

مفسّرین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات باقی سُورہ سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ گیارہ آیات مدینے میں نازل ہوئی تھیں۔

ان مفسّرین کے اس عقیدے کا محرّک شاید وہ بعض شانہائے نزول ہیں، جن کا ہم بعد میں ذکر کریں گے اور جہاد کی وہ بحث ہے جو ان آیات میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح وہ اشارات بھی ہیں جو ان آیات میں منافقین کے متعلق موجود ہیں۔ یہ تمام مضامین مدنی سورتوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔

تاہم، ہم بعد میں اس مطلب پر غور کریں گے کہ مفسّرین کی یہ توجیہات اس سُورہ کے مکّی ہونے کے منافی نہیں ہیں۔

اس سورہ کے نام "سُورۂ عنکبوت" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سورہ کی آیت نمبر اکتالیس میں بُت پرستوں کے غیر خدا پر اعتقاد کو "عنکبوت (مکڑی) سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس کا بھروسہ بھی نازک تاروں پر ہوتا ہے اور یہ بھروسہ بے بُنیاد ہے۔

بطورِ کُلی کہا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کے مضامین چار حصّوں میں منقسم ہیں:

اوّل: اس سُورہ کی ابتدا میں منافقین کی کیفیت اور اُن کے مبتلائے امتحان ہونے کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اُمور کا ناقابلِ انقطاع تعلق ہے۔ کیونکہ منافقین کی شناخت اُس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک وہ امتحان و آزمائش میں مُبتلا نہ ہوں۔

دوم: آیت کے مضامین کے دوسرے حصّے میں پیمبرؐ اور مومنین کی دلجوئی کے لیے پیمبرانِ اُولوالعزم کی (مثلاً: حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ اور شعیبؑ) کی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے عہد کے نمرود اور خود پرست

اہل دولت کا کس طرح مقابلہ کیا ۔ اُن کی جنگ کے آلات کیا تھے ، کیفیت جنگ کیا تھی اور پھر اس مُبارزہ کا نتیجہ کیا ہوا ؟

اِس بیان کا مقصود یہ ہے کہ ایک طرف تو رسول اللہؐ اور مومنین کا دل قوی ہو اور دوسری طرف رسولِ اسلامؐ کے زمانے کے سنگدل اور ظالم بُت پرستوں کو تنبیہ ہو۔

سوم : اس سورہ کے مضامین کا تیسرا حصّہ جو خصوصیّت سے آخر میں ہے ، اُس میں توحید باری تعالیٰ ، عالمِ آفرینش میں اُس کی آیات اور شرک سے مبارزۃ کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں انسان کی فطرتِ سلیم اور اُس کے وجدان کو مخاطب کیا گیا ہے ۔

چہارم : اس سُورہ کے ایک اور حصّے میں متنوع قسم کے مضامین ہیں مثلاً : غیرحقیقی معبُودوں اور اُن کے عنکبوت صفت پجاریوں کی ناتوانی کا ذکر ہے۔ اسی طرح اس حصّے میں قرآن کی عظمت ، پیمبرِ اسلامؐ کی حقانیت اور مخالفین کی سرکشی کا بیان ہے۔

علاوہ بریں اس حصّے میں مسائل تربیتی کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ مثلاً : نماز ، والدین کے ساتھ نیک سلوک ، اعمالِ صالح اور مخالفینِ اسلام سے گفتگو اور بحث کا طریقہ تعلیم کیا گیا ہے ۔

اِس سُورہ کی فضیلت

تفسیر مجمع البیان میں جناب رسالتمآبؐ کا یہ قول درج ہے :-

من قرء سورة العنكبوت كان له من الاجر عشر حسنات بعدد كُل المؤمنين والمنافقين۔

جو آدمی سورہ عنکبوت پڑھتا ہے اُس کے حصّے میں تمام مومنین اور منافقین کی تعداد سے دس گنا حسنات لکھے جاتے ہیں۔

بالخصوص ماہِ رمضان کی تیئیس۲۳ تاریخ کی شب میں سورہ عنکبوت اور سُورہ رُوم کی تلاوت کے متعلق غیر معمولی فضیلت وارد ہوئی ہے یہاں تک کہ امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک حدیث منقول ہے :

من قرء سورة العنكبوت والروم في شهر رمضان ليلة ثلاث وعشرين فهو والله من اهل الجنة لا استثني فيه ابداً، ولا اخاف ان يكتب الله على في يميني اثماً، وان لهاتين السورتين من الله مكاناً

جو آدمی ماہِ رمضان کی تیئیس۲۳ تاریخ کی شب میں سورہ عنکبوت اور سورۂ روم کی تلاوت کرے قسم بخدا وہ اہل بہشت میں سے ہے۔ میں اِس معاملے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا۔ اور اس بات سے بھی نہیں ڈرتا کہ اس قسم کے لیے میرے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ لکھ دے ۔ بطور مسلّم ان دونوں سورتوں کا خدا کے حضور میں بڑا مرتبہ ہے۔[1]

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں سورتوں کے نہایت منفعت بخش مضامین ، اُن کے توحید آموز اہم اسباق اور انسان کی عملی زندگی کے لیے باعثِ خیر و سعادت پروگرام اس امر کے لیے کافی ہیں کہ جو آدمی بھی صاحبِ فکر و عمل ہو گا ، وہ اسے بہشت کا مستحق کر دیں ۔

بلکہ اگر ہم صرف عنکبوت کے مضامین سے نورِ ایمان اور خلوصِ عمل کا سبق حاصل کریں تو ہم حضرت امام جعفر صادقؑ کی قسم میں شامل ہو جائیں گے ۔

ایک آیت میں انسانوں کے عام امتحان کا ذکر ہے اور یوں لکھا ہے کہ :

بغیر استثنیٰ تمام لوگ امتحان کی کُٹھالی میں تپائے جائیں گے تاکہ جو لوگ گناہ گار ہیں وہ سیاہ رُو ہو جائیں ۔

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اس عظیم آزمائش پر یقینِ کامل رکھتا ہو اور خُود کو اُس امتحان کے لیے تیار نہ کرے اور وہ متقی اور پرہیزگار نہ بن جائے ۔

---

[1] ثواب اعمال (مطابق تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۴۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۚ

۲۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○

۳۔ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ الٓمّٓ

۲۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں وہ چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

۳۔ جو لوگ اِن سے پہلے تھے ہم نے اُن کی بھی آزمائش کی تھی (اور ان کی بھی آزمائش کریں گے) ضروری ہے کہ خدا کا علم ان کے بارے میں بھی سچ ثابت ہو کہ جو سچے ہیں اور اُن کے بارے میں بھی کہ جو کاذب ہیں۔

شانِ نزول :

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق اس سورہ کی ابتدائی گیارہ آیات مدینے میں نازل ہوئیں، اُن مسلمانوں کے متعلق جو مکہ میں تھے، اظہار اسلام کرتے تھے مگر مدینہ کو ہجرت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اُنھیں اپنے اُن بھائیوں کی طرف سے جو مدینے میں تھے، ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ:

"تم جو ایمان کا اقرار کرتے ہو وہ خدا کو قبول نہیں ہے مگر یہ کہ ہجرت کرو اور ہمارے پاس آجاؤ۔"

یہ خط پاکر اُنھوں نے ہجرت کا ارادہ کرلیا اور مکہ سے نکلے۔ مشرکین کے ایک گروہ نے اُن کا تعاقب کیا اور اُن سے جنگ کی۔ مہاجرین میں سے بعض تو مارے گئے اور بعض بچ رہے (اور احتمال یہ بھی ہے کہ بعض نے مشرکین کی اطاعت کرلی اور مکہ کو واپس ہوگئے)۔

بعض دیگر مفسرین نے دوسری آیت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ عمار یاسر اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں کے متعلق ہے جو ایمان لے آئے تھے اور دُشمنانِ اسلام کے مظالم برداشت کررہے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس سورہ کی آٹھویں آیت سعد ابن ابی وقاص کے اسلام لانے کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

لیکن اِن آیات کو دِقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن آیات کا مسئلہ ہجرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں تو صرف اُن مظالم کا ذکر ہے جو اُس زمانے میں دشمنانِ اسلام روا رکھتے تھے یہاں تک کہ وہ مظالم بھی کہ جو مُشرک والدین کی طرف سے اپنی اولاد پر بھی روا رکھے جاتے تھے۔

یہ آیات دُشمنانِ اسلام کی ستم کاریوں اور مظالم کے مقابلے میں مسلمانوں کو استقامت اور پامردی کی تعلیم دیتی ہیں اور اگر درمیان میں کسی مقام پر جہاد کا ذکر آگیا ہے تو اُس کا مفہوم بھی اس امتحان میں ثباتِ قدم ہے نہ کہ مُسلمانوں کا مُسلح جہاد، جس کا حکم مدینے میں نازل ہوا تھا۔

اِسی طرح اگر کہیں منافقین کا ذکر ہے تو ممکن ہے کہ اُس کا اشارہ اُن کمزور ایمان لوگوں کی طرف ہو جو مکہ میں مسلمانوں کے درمیان رہتے تھے۔ وہ کبھی مُسلمانوں سے مِل جاتے تھے اور کبھی مشرکین سے۔ غرض جس کسی کا پلّہ بھاری دیکھتے اُسی کے ساتھ ہو جاتے تھے۔

بہرحال، ان آیات کی ترتیب و تنظیم اس امر کی شاہد ہے کہ ہم اُن سب کو مکی سمجھیں اور روایات بالا جن میں باہم توافق نہیں ہے وہ اس تنظیم کو ختم نہیں کرسکتیں۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

آزمائش ایک دائمی سُنّتِ الٰہی ہے :

اِس سورہ کی ابتدا بھی (الف - لام - میم) حروفِ مقطعات سے ہوتی ہے۔ ہم نے بارہا مختلف زاویہ ہائے نظر سے ان حروف کی تفسیر بیان کی ہے[1]

❖ ❖ ❖

اِس سورہ میں حروفِ مقطعات کے بعد انسانی زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں سے ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ ہے اور وہ ہے اللہ کی طرف سے بندے کا امتحان اور اُس کی آزمائش۔

سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر وہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور

[1] اِن حروف کی تفسیر سورہ بقرہ جلد اوّل، سورہ آلِ عمران جلد دوم اور سورہ اعراف جلد چہارم کے آغاز میں ملاحظہ کیجئے۔

توحید و رسالت پیمبر کی شہادت دیں تو وہ اپنے حال پر چھوڑ دیئے جائیں گے اور اُن کا امتحان نہ ہوگا :(احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھو لا یفتنون)[1]

❊ ❊ ❊

اُس کے بعد بلافاصلہ اس حقیقت کا ذکر ہے کہ اہلِ ایمان کا امتحان اللہ کی ایک دائمی اور جاودانی سُنّت ہے ۔ یہ امتحان صرف اُمّتِ اسلام ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ وہ سُنّتِ الٰہی ہے جو گزشتہ اُمّتوں کے لیے بھی جاری رہی ہے ۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ :

ہم نے گزشتہ اُمّتوں کی بھی آزمائش کی ہے : (ولقد فتنا الذین من قبلھم) ۔ ہم نے گزشتہ اُمّتوں کو بھی امتحان کی بھٹی میں ڈالا ہے ۔ وہ بھی تمہاری طرح بے رحم ، جاہل ، متعصب ، بے خبر اور جنگ پسند دشمنوں کے نرغے میں گرفتار تھیں ۔ الغرض اُمّتوں کے لیے ہمیشہ میدانِ امتحان تیار رہا ہے اور اُنھیں اس میدان سے گزرنا پڑتا ہے ۔

ایسا ہونا بھی چاہیئے کیونکہ :۔ ہر آدمی برترین مومن ، بالا ترین مجاہد اور فدا کار ترین انسان ہونے کا اِدّعا کر سکتا ہے ۔ اس لیے اِس اِدّعا کی حقیقت اور اُس کا وزن امتحان سے ثابت ہونا چاہیئے ۔ امتحان ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدعی کے دعوے اور اُس کی ذہنی آمادگی اور باطنی خلوص میں ہم آہنگی ہے یا نہیں ؟

امتحان کی اِس لیے بھی ضرورت ہے تاکہ اُن کے متعلق خدا کا یہ علم کہ ان میں سے کون سچا ہے اور کون جھُوٹا ، درست ثابت ہو : (فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین) ۔

یہ امر بدیہی ہے کہ خدا سب کے دلوں کا حال جانتا ہے ۔ یہاں تک کہ بنی نوعِ انسان کی خلقت سے پہلے بھی سب کچھ اُس کے علم میں تھا ۔ اِس مقام پر " علمِ الٰہی " سے مُراد یہ ہے کہ جو کچھ اُس کے علم میں ہے وجودِ خارجی میں بطورِ عین الیقین اُس کا ثبوت مل جائے ۔ یعنی اس گروہ کے متعلق خدا کا جو علم ہے ، لوگ اُسے خارج میں بھی دیکھ لیں اور جس شخص کے دل میں جو کچھ ہے وہ نمایاں اور آشکار ہو جائے ۔

خُدا کے متعلق جہاں بھی کلمہ " علم " استعمال ہوا ہے اُس کا یہی مفہوم ہے ۔

یہ حقیقت قطعی واضح ہے کہ انسان کی نیّت اور اُس کا ارادہ جب تک عمل سے ظاہر نہ ہو تو اس کے لیے ثواب ، جزا یا بدلے کا تعیّن نہیں ہو سکتا ۔

آزمائش کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ انسان کی نیت اور اُس کی نفسانی کیفیّت کا حال معلوم ہو جائے ۔

اِس مفہوم کو ایک اور پہلو سے بھی سمجھنا چاہیئے کہ :۔ اِس عالم کی مثال ایک یونیورسٹی یا ایک کھیت کی ہے (اسلامی احادیث میں یہ تشبیہات وارد ہوئی ہیں) جب ایک طالب علم یونیورسٹی میں تحصیلِ علم کے لیے آتا ہے تو دستورِ تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ اُس کی فطری استعداد کی کلی کھل جائے ۔ جس قسم کی لیاقت بھی اُس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے ، اس کی پرورش ہو اور اُس کی مخفی صلاحیتیں قوّت سے فعل میں آ جائیں ۔

---

[1] " یفتنون " کا مادہ " فتنہ " ہے جس کے معنی ہیں ، سونے کو آگ میں تپانا ، اُس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے ، اس کے بعد مجازاً اس کلمہ کو ہر طرح کی ظاہری اور باطنی آزمائش کے لیے بولنے لگے ۔ مزید توضیح کے لیے جلد ۱ ، صفحہ ۴۶۹ (اردو ترجمہ) دیکھیئے ۔

نیز یہ کہ یہ عالم ایک کھیت ہے ۔ اِس کھیت میں جو بیج بویا جائے تو اس کی سرشت اور طینت کا اظہار ہونا چاہیئے ۔ اُس کے اندر سے انکھوا پھُوٹنا چاہیئے ، اُسے خاک سے سر اُبھارنا چاہیئے ۔ جب اُس کی پرورش ہو تو وہ چھوٹا سا پودا بن جائے پھر نشو و نما پاکر ایک تنومند اور بارآور درخت بن جائے ۔ افراد اور اقوام دونوں کو اپنی نشو و نما کے لیے اِن امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے ۔

اِس مقام پر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کی طرف سے جو آزمائشیں آتی ہیں وہ محض افراد کی استعدادات کی شناخت کے لیے نہیں ہیں ۔ بلکہ انسان کی مخفی صلاحیتوں کی پرورش کے لیے ہیں ۔

یہ امر بھی محلِ لحاظ ہے کہ اگر ہم کسی شے یا کسی انسان کو آزماتے ہیں تو وہ کسی مخفی یا مجہول صفت کو معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے ۔ مگر خدا کی آزمائش کشفِ مجہول کے لیے نہیں ہوتی ۔ کیونکہ اُس کا علم تو ہر شے پر مُحیط ہے بلکہ خدا اس لیے آزماتا ہے تاکہ وہ انسانوں کی استعداد کی پرورش کرے اور جو صلاحیتیں اُس میں مخفی ہیں وہ قوت سے فعل میں آجائیں[1]

❊ ❊ ❊

آزمائشیں مختلف رنگ میں :

اگرچہ جُملہ اقوام اور جماعتوں کے لیے امتحان کا عمومی ذکر ، مکّہ کے اُن مومنین کے لیے جو اُس زمانے میں اقلیت میں تھے نہایت مؤثر تھا ۔ اِس حقیقت پر نظر کرکے اُن میں اپنے سخت ترین دشمن کے مقابلے میں صبر و استقامت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا ۔ مگر یہ آزمائشیں صرف مومنین مکّہ ہی کے لیے مخصوص نہ تھیں بلکہ جہاں کہیں بھی مومنین کی جماعت ہے وہ اِس سُنّتِ الٰہی کی مصداق ہے ۔ خدا اُن کا مختلف صورتوں سے امتحان لیتا ہے ——— مثلاً :۔

۱ ۔ مومنین کی کوئی جماعت ایسے معاشرے میں محصور ہو جاتی ہے جو ہر جہت سے آلودہ مفاسد ہے ۔ اُس معاشرے میں مومنین کو ہر جانب سے بُرائیوں کی دعوت گھیرے رہتی ہے ۔ اُس وقت ان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ایسے معاشرے کی بداخلاقیوں کا اثر قبول نہ کریں اور اپنی نیکی اور تقویٰ کو محفوظ رکھیں ۔

۲ ۔ کبھی مومنین کی کوئی جماعت افلاس اور محرومی میں مبتلا ہوتی ہے ۔ جب کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی قدر مخصوص کو جو اُن کا حقیقی سرمایہ ہے فروخت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو بہت جلد اُن کی محرومیت اور افلاس دفع ہو سکتا ہے ۔ لیکن یہ تونگری اُنھیں اسی صُورت میں حاصل ہوگی جب وہ اپنا ایمان ، تقویٰ ، آزادی ، عزّت اور شرف کو ہاتھ سے دینے کے لیے تیار ہو جائیں ۔

۳ ۔ اِس کے برعکس مومنین کے امتحان کا ایک اور بھی رُخ ہے کہ :۔
مومنین کی کوئی جماعت دولت و ثروت میں مستغرق ہو جاتی ہے اور جملہ مادی وسائل اُس کے اختیار میں ہوتے ہیں ۔ اندریں حال اُن کا امتحان یہ ہے کہ :۔
کیا وہ خدا کی نعمات کا شکر ادا کرتے ہیں یا وہ دولت پاکر غفلت ، غرور ، خُود غرضی ، خُود بینی اور لذّات و شہوات میں

---

[1] خدا کی آزمائش اور اُس کے مختلف جواب کی توضیح جلد اوّل آیت ۱۵۷ ، سورہ بقرہ کے ذیل میں بیان ہوئی ہے ۔

مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو برتر سمجھ کر اپنے برادران ایمانی سے منقطع ہو جاتے ہیں۔

۴۔ ہمارے زمانے میں قوموں کو ایک اور شدید امتحان درپیش ہے اور وہ ہے "مشرق یا مغرب زدگی" ۔ وہ مشرق یا مغرب کی بعض اقوام کو دیکھتے ہیں کہ وہ خدا اور فضائلِ اخلاق سے برگشتہ ہو کر دُنیا میں خیرہ کُن مادّی تمدّن سے بہرہ مند ہیں اور اُن کا رفاہی اجتماعی نظام سلطنت بہت اچھا ہے۔

اُن اقوام متمدّن کی حالت کو دیکھ کر پسماندہ اقوام کو ایک قوی مگر عجیب سا جذبہ اسی قسم کی زندگی اختیار کرنے کی طرف کھینچتا ہے وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ تمام اُصولِ اخلاق جن کے وہ معتقد رہے ہیں، اُنھیں پاؤں کے نیچے روند کر اور اُن متمدّن اقوام میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی کی ذلّت برداشت کر کے ۔ اپنے اور سارے معاشرے کے لیے اُسی قسم کے اسباب حیات مہیا کرلیں۔ درحقیقت اس عہد میں یہ بہت بڑا امتحان ہے۔

۵۔ اِس زمانے کے مصائب، درد و رنج، جنگیں اور نزاع، گرانی اور آئے دن قیمتوں میں اضافہ، اور وہ استحصال کرنے والی حکومتیں جو کمزور قوموں کو غلام بناتی ہیں اور اُنھیں اپنے طاغوتی نظام کی اطاعت پر مجبور کرتی ہیں۔

علاوہ بریں انسانوں کی نفسانی خواہشات کی تند و تیز موجیں' ان میں سے ہر ایک بندگانِ خدا کے لیے سخت امتحان ہے۔ اِن ہی حالات میں ایک شخص کے ایمان، تقویٰ، پاکیزگی، امانت اور آزادی کا امتیاز ہوتا ہے۔

لیکن ایسی سخت آزمائشوں میں کامیاب ہونے کے لیے صرف ایک ہی وسیلہ ہے کہ انسان میں استقامتِ ایمانی ہو اور خدا کے لُطف خاص پر بھروسہ رکھے۔

اصول کافی میں: احسب النّاس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنّا وھم لا یفتنون کی تفسیر میں بعض معصومین سے یہ حدیث منقول ہے:

یفتنون کما یفتن الذھب ، ثم قال یخلصون کما یخلص الذّھب

انھیں آزمایا جاتا ہے جس طرح کہ سونے کو بھٹی میں تپایا جاتا ہے۔ وہ لوگ ہر قسم کی آلودگی سے صاف ہوتے ہیں جس طرح کہ آگ سونے کو ہر قسم کے مَیل سے صاف کر دیتی ہے۔[1]

بہرحال وہ عافیت طلب لوگ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ صرف زبان سے اظہارِ ایمان کرنے سے وہ مومنین میں شمار ہونے لگیں گے اور اعلیٰ علیین بہشت میں وہ پیمبروں، صدیقین اور شہدا کے ہم نشین ہو جائیں گے، سخت غلطی پر ہیں۔

امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب کا یہ قول نہج البلاغہ میں موجود ہے:

والّذی بعثہ بالحق لتبلبلنّ بلبلۃ ، ولتغربلنّ غربلۃ ، ولتساطنّ سوط القدر ، حتّٰی یعود اسفلکم اعلاکم واعلاکم اسفلکم

قسم ہے اس ذات کی جس نے پیغمبر کو حق پر مبعوث کیا کہ تم شدّت سے آزمائے جاؤ گے اور چھانے جاؤ گے اور جس طرح کہ ہانڈی میں پانی اُبلتے وقت اُوپر نیچے ہوتا ہے تم بھی منقلب

[1] (اصول کافی) طبق نقل تفسیر نور الثقلین، ج ۴ صفحہ ۱۴۸

ہو گے۔ اس طرح سے کہ تمہارے بلند لوگ پست اور پست لوگ بلند ہو جائیں گے۔[1]

یہ بات امیرالمومنینؑ نے اس وقت کہی جب نئے لوگوں نے آپؑ سے بیعت کی تھی اور وہ اس بات کے منتظر تھے کہ آپ بیت المال کے اموال کی تقسیم اور عہدوں کے عطا کرنے میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا علیؑ کا طرزِ عمل بھی اُسی گزشتہ معیار پر ہوگا جس میں امتیاز اور تخصیص تھی یا آپ کا معیار عدلِ محمدیؐ ہوگا۔

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

۴۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ۝

۵۔ مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ؕ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ۝

۶۔ وَ مَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

۷۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَنَجۡزِیَنَّہُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝

ترجمہ

۴۔ کیا وہ لوگ جو اعمالِ بد کرتے ہیں، یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؛ وہ جو خیال کرتے ہیں کتنا بُرا ہے۔

۵۔ جو کوئی خدا سے ملاقات (اور قیامت) کی اُمید رکھتا ہے (تو اُسے چاہیئے کہ اُس کے فرمان کی اطاعت میں فروگزاشت نہ کرے) یقیناً اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت ضرور آنے والا ہے اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

۶۔ جو شخص جہاد اور کوشش کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے اور خُدا جملہ اہلِ عالم سے بے نیاز ہے۔

۷۔ اور جو لوگ کہ ایمان لائے اور اُنھوں نے عملِ صالح انجام دیئے ہم اُن کے گناہوں کو چھپالیں گے (اور بخش دیں گے) اور اُنھیں اُن کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے۔

تفسیر

قُدرتِ خُدا کی حدُود سے فرار ممکن نہیں:

گزشتہ آیات میں مومنین کے عام امتحان کا ذکر تھا۔ زیرِ نظر پہلی آیت میں کفار اور گناہ گاروں کو شدید تہدید کی گئی ہے تاکہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ اگر انھوں نے مومنین پر ظلم و تعدّی کی اور خُدا کا عذاب اُن پر فوراً نازل نہیں ہوا، تو خُدا اُن سے غافل ہے یا اُس میں اُن پر عذاب نازل کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: وہ لوگ جو گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں کیا اُن کا یہ گمان ہے کہ وہ ہم پر سبقت لے جائیں گے اور ہماری سزا کی گرفت سے بچ نکلیں گے؛ اُن کا یہ خیال کتنا بُرا ہے: (اَم حسب الّذین یعملون السّیئات ان یسبقونا ساء ما یحکمون)۔

خدا کی طرف سے دی ہوئی مُہلت اُن کو مغرور نہ کر دے۔ کیونکہ یہ بھی اُن کے لیے ایک آزمائش ہے اور اُنھیں توبہ اور بازگشت کی مہلت دی گئی ہے۔

بعض مفسّرین نے اِس آیت کا مصداق گنہگار مومنین کو سمجھا ہے۔ اُن کا یہ خیال کسی طرح سے بھی سیاقِ آیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ بلکہ قرینہ اس امر کا شاہد ہے کہ اس آیت کا مصداق مشرکین اور کفار ہیں۔

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد قُرآن میں بارِ دیگر مومنین کے دستور العمل اور اُن کے لیے نصیحت کا ذکر ہے یعنی "جو شخص بھی لقاءِ الٰہی کی اُمید رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ اُس سے جہاں تک بھی ممکن ہو اُس کی اطاعت اور فرمان برداری سے سرتابی نہ کرے۔ کیونکہ خدا نے جو وقت مقرر کیا ہے وہ ضرور آکر رہے گا: (من کان یرجوا لقاء اللّٰہ فانّ اجل اللّٰہ لاٰتٍ)۔[1]

البتہ خدا کا یہ وعدہ حتمی ہے اور اس راہ پر ضرور چلنا پڑے گا۔ علاوہ بریں خدا تمھاری باتوں کو سُنتا ہے اور وہ تمھارے اعمال اور نیّات سے آگاہ ہے کیونکہ وہ "سُننے والا اور جاننے والا ہے": (وھو السمیع العلیم)۔

"لقاء اللّٰہ" سے کیا مُراد ہے، اس سلسلے میں آراء مختلف ہیں۔ بعض مفسرین نے "... مقربین" سے ملاقات مراد لی ہے۔ بعض نے "حساب و جزا" کا پیش آنا مراد لیا ہے، بعض نے اس کی تفسیر میں "حکم و فرمانِ حق" مراد لیا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ کنایہ ہے قیامت کے لیے۔

جبکہ اس آیت کے یہ مجازی معنیٰ لینے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہیئے کہ آیتِ بالا میں بروزِ قیامت

---

[1] اس آیت میں ایک فقرہ محذوف ہے۔ تقدیر میں اِس طرح ہے:

من کان یرجوا لقاء اللّٰہ فلیبادر بالطاعۃ قبل ان یلحقہ الاجل۔ یا

من کان یرجوا لقاء اللّٰہ ویقول اٰمنت باللّٰہ فلیقلہ مستقیماً صابراً علیہ .. ..

فانّ اجل اللّٰہ لاٰتٍ۔

" لقائے پروردگار " سے مراد " ملاقات حسّی " نہیں ہے ۔ بلکہ لقائے رُوحانی اور ایک قسم کا شہود باطنی ہے ۔ کیونکہ اُس روز انسان کی آنکھوں سے مادیات سے ضخیم پردے اُٹھ جائیں گے اور انسان جلوہ ہائے شہود کو دیکھے گا ۔ نیز جیسا کہ علامہ طباطبائی نے " المیزان " میں لکھا ہے :

" لقاءُ اللہ " کا مفہوم یہ ہے کہ بندگانِ خدا بروزِ قیامت ایک ایسی کیفیت میں ہوں گے کہ اُن کے ۔ اور ۔ خدا کے درمیان جو حجابات حائل ہیں وہ اُٹھ جائیں گے ۔ کیونکہ روزِ قیامت کا مزاج ہی یہ ہوگا کہ اُس روز اُن حقائق کا ظہور ہوگا جو عالمِ مادی میں انسان کی نظروں سے پنہاں رہتے ہیں ۔ چنانچہ خُدا فرماتا ہے :

و یعلمون ان اللہ ھو الحق المبین

اُس روز انسان جان لیں گے کہ خدا " حق آشکار " ہے [1] (سورہ نور آیۃ ۲۵)

٭ ٭ ٭

اگلی آیت اُس مضمون کی تعلیل ہے جو گزشتہ آیت میں گزر چکا ہے ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ :۔ مومنین لقاء الٰہی کے لیے جو کچھ اُن کی قدرت میں ہے اُس سے فروگزار نہ کریں " وہ اس لیے ہے تاکہ ہر شخص زندگی میں جہاد کرے اور سعی و کوشش کرے اور مصائب و مشکلات کو برداشت کرے ۔ درحقیقت انسان کا یہ جہاد اُس کی تہذیب نفس ہی کے لیے ہے ۔ کیونکہ خدا تو جملہ اہلِ جہان سے بے نیاز ہے : (ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین) ۔

انسان کے لیے خدا کی آزمائش کا یہ پروگرام کہ وہ ہوائے نفس کے خلاف جہاد کرے ، اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے دشمنوں سے جنگ کرے اور تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرے ، درحقیقت یہ سب کچھ انسان ہی کے فائدہ کے لیے ہے ۔

دگرنہ " خُدا " تو ہر حیثیت سے ایک وجُودِ لامتناہی ہے ۔ اُس کی کوئی احتیاج بھی نہیں ہے جو اُس کے بندوں کی عبادت یا اطاعت سے پُوری ہو جائے ۔ اُس میں کسی قسم کا نقص یا کمی نہیں ہے جسے دوسرے پُورا کر دیں ۔ بلکہ ماسوا اللہ کے پاس کوئی چیز بھی اپنی ذاتی نہیں ہے ۔

اِس بیان سے یہ واضح ہے کہ اِس آیت میں کلمۂ جہاد سے مُراد دُشمنانِ اسلام کے خلاف مسلح جہاد نہیں ہے ۔ بلکہ یہ کلمہ اس مقام پر اپنے لغوی اور وضعی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے ۔ جس کا مفہوم ہے حفظ ایمان اور تقویٰ کے لیے ہر قسم کی کوشش اور جدوجہد ۔ اور ہر طرح کی سختی کو برداشت کرنا ۔ نیز اس کلمہ کے مفہوم میں کینہ پرور اور جنگجو پسند دشمن سے دفاع بھی شامل ہے ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اِس " جہاد " کے تمام منافع مجاہد کی ذات ہی کو پہنچتے ہیں اور وہی اس جہاد کے نتیجے میں دُنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرتا ہے ۔ اگر اُس کے ایسے " جہاد " سے معاشرے کو بھی فائدہ پہنچے تو وہ اُس کے اثرات مابعد ہوں گے ۔ بنا بریں ، جس کسی کو اس قسم کے جہاد کی توفیق عطا ہو اسے لازم ہے کہ وہ اس نعمت عظیم کے لیے خدا کا شکر ادا کرے ۔

---

[1] " لقاءُ اللہ " کی تفسیر کے لیے دیکھئے ، جلد اوّل ذیل آیت ۴۶ سُورۂ بقرہ ۔

آیات زیرِ بحث میں سے آخری آیت اُس مضمون کی توضیح و تکمیل ہے جو آیت ماقبل میں عنوان جہاد کے تحت سربستہ طور پر بیان کیا گیا تھا ۔ اِس آیت میں حقیقتِ جہاد کو واضح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں ہم اُن کے گناہوں کو چھپاتے ہیں : (والّذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لنکفرنّ عنھم سیّئاتھم) ۔ بنا بریں ، اس جہادِ عظیم (ایمان و عملِ صالح) کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ خدا اُن کے گناہوں کو چھپا لیتا ہے اور یہ فائدہ انسان ہی کو پہنچتا ہے ۔ اسی طرح جیسے اعمالِ خیر کا ثواب اُنھیں پہنچتا ہے ۔ چنانچہ اس آیت کے آخر میں مذکور ہے :

ہم اُنھیں اُن کے اُن اعمالِ صالح کی جو اُنھوں نے انجام دیئے ، بہترین جزا دیتے ہیں (ولنجزینھم احسن الذی کانوا یعملون) ۔

" نکفر " کا مصدر " تکفیر " ہے ۔ اس کے وضعی معنی ہیں " چھپانا " ۔ اِس مقام پر " گناہوں کو چُھپانا " سے مُراد " عفو و بخششِ الٰہی " ہے ۔

" احسن الذی کانوا یعملون " کی تعبیر یہ ہے کہ خدا جملہ اعمالِ خیر کی جزا دے گا خواہ وہ " حسن " ہوں یا " اُحسَن " ۔ ممکن ہے اِس قول کا اشارہ یہ ہو کہ ہم اُن کے اعمالِ نیک کو بھی نیک ترین اور بہترین اعمال میں شمار کریں گے یعنی اگر مومنین کے بعض اعمال عالی ، بعضے خوب یا متوسط بھی ہوں تو ہم اُن سب کو عالی ہی شمار کریں گے ۔ درحقیقت یہ تفضّلِ الٰہی ہے جس کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی (مثلاً : سورۂ نور کی آیت ۳۸ میں) اشارہ ہوا ہے :

لیجزیھم اللہ احسن ما عملوا و یزیدھم من فضلہ

خدا اُن کے بہترین اعمال کی جزا دیتا ہے اور اپنے فضل سے اُس پر اضافہ کرتا ہے ۔

۸۔ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

۹۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝

ترجمہ

۸۔ ہم نے انسان کو وصیت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اور اگر تیرے والدین تیرے در پے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے، جس کا تجھے علم نہیں ہے تو پھر تو اُن کی اطاعت نہ کر۔ آخر کار تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو ہم تمہیں اُس سے آگاہ کریں گے۔

۹۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک کام کیے ہم اُنھیں نیک لوگوں میں داخل کریں گے۔

شانِ نزول :

مندرجہ بالا آیت کی شانِ نزول میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں۔ اُن تمام کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ :

کچھ افراد جو مکہ میں تھے اُنھوں نے اسلام قبول کیا۔ مگر جب اُن کی ماں کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے تہیّہ کر لیا کہ نہ تو وہ غذا کھائے گی اور نہ پانی پیئے گی تاوقتیکہ اُس کا فرزند اسلام کو ترک نہ کر دے گا۔ اگرچہ کوئی ماں بھی اپنے اس قول پر ثابت رہی اور اُنھوں نے ترکِ غذا کے عہد کو توڑ دیا۔ مگر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے اس امر کو سب کے لیے واضح کر دیا کہ جب ایمان و کفر کا مسئلہ پیدا ہو تو والدین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے[1]۔

[1] ان روایات کے راوی کا نام سعد ابن ابی وقاص آیا ہے اور بعض جگہ عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی بھی نام ہے۔

تفسیر

ماں باپ کی نسبت بہترین نصیحت :

خدا کی ایک اہم آزمائش اُس تضاد سے عہدہ برآ ہونا ہے جو راہِ ایمان و تقویٰ اور اعزّا و اقارب سے جذباتی تعلق میں ہے۔ قرآن مجید میں اِس موضوع پر مسلمانوں کے فرض کے متعلق واضح ہدایت موجود ہے۔

قرآن میں سب سے پہلے اُس قانونِ کُلّی کو بیان کیا گیا ہے جس کی بنیاد انسانی جذبات اور حق شناسی ہے۔ اِس ضمن میں فرمایا گیا ہے :

ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے۔ (ووصّینا الانسان بوالدیہ حسنًا)۔

اگرچہ بظاہر یہ ایک حکمِ تشریعی ہے۔ مگر اِس سے پہلے یہ تصور ایک "قانونِ تکوینی" کے طور پر ہر شخص کی فطرت میں موجود ہے۔ بالخصوص ــــ اِس مقام پر جو کلمہ "انسان" استعمال ہوا ہے وہ لائقِ توجہ ہے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قانون صرف مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ جس فرد پر بھی کلمہ "انسان" صادق آتا ہے، اسے لازم ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے احسانات کا حق شناس ہو اور ساری عمر ان کے احترام و تکریم اور اُن کے ساتھ نیکی کرنے کو نہ بھولے۔ اگرچہ انسان اِن تمام اعمال کے باوجود اُن کے قرض کو ادا نہیں کر سکتا۔

اِس کے بعد ایک صریحی استثنا کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ : اگر والدین یہ کوشش و اصرار کریں اور اولاد سے کہیں کہ : تو میرے لیے کسی شریک کا قائل ہو جب کہ تو اُس شریک کو جانتا بھی نہ ہو، تو اس حالت میں والدین کی اطاعت نہ کرنا :
(وان جاھداك لتشرك بی مالیس لك بہ علمٌ فلا تطعھما)۔

یہ استثنا اس لیے ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ماں باپ سے جذباتی تعلق انسان کے خدا سے تعلق پر فوقیت رکھتا ہے۔

اِس مقام پر کلمہ "جاھداك" کا مفہوم والدین کی کوشش اور اصرار ہے۔

اِس کے بعد " مالیس لك بہ علمٌ " کہا گیا ہے۔ یعنی وہ چیز جس کا تجھے علم نہیں ہے۔ یہ اس جانب اشارہ ہے کہ شرک کوئی منطقی امر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر شرک واقعی درست ہوتا تو اُس کے لیے کوئی دلیل بھی موجود ہوتی۔ اِس کی ایک اور تعبیر بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کسی شئی کا علم ہی نہ رکھتا ہو تو اُسے چاہیئے کہ اُس کی پیروی بھی نہ کرے۔ کُجا یہ کہ انسان کسی شئی کے باطل ہونے کا علم رکھتا ہو اور پھر بھی اُس کی پیروی کرے۔ ایسی شئی کی پیروی تو جہالت پر مبنی ہے۔ اِس لیے اگر تیرے ماں باپ تجھے جہالت کی پیروی اختیار کرنے کی طرف مائل کریں تو اُن کی اطاعت نہ کر۔

اصولی طور پر اندھی تقلید تو ایمان کے معاملے میں بھی غلط ہے۔ پھر شرک و کفر کے معاملے میں تو اِس کی ضلالت کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

ماں اور باپ کے متعلق یہی نصیحت سورۂ لقمان میں بھی آئی ہے اِس میں یہ کلمات مزید ہیں :

وصاحبھما فی الدُّنیا معروفًا

اِس حالت میں کہ تو شرک کے معاملہ میں اُن کا کہا نہ مان۔ پھر بھی دُنیاوی معاملات
میں اُن کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کر اور رہن سہن میں اُن کے ساتھ نیکی کر۔

یہ بات اِس لیے کہی گئی ہے کہ مبادا کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ شرک کی طرف دعوت دینے کے معاملے میں والدین کی مخالفت کے یہ معنیٰ ہیں کہ اُن کے ساتھ معاملاتِ دُنیا میں بھی کج خُلقی اور بُرا سلوک کیا جائے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کے احترام کی اِسلام میں کتنی تاکید ہے۔

اِس پُوری بحث سے ایک اصولِ کُلّی اخذ ہوتا ہے کہ خدا سے اِنسان کے تعلق پر کوئی شے بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی کیونکہ تعلق بذاتِ الٰہی ہر شئے پر مقدّم ہے۔ یہاں تک کہ وہ والدین کے ساتھ محبت پر بھی (جو قریب ترین رشتہ ہے) مقدم ہے۔

اِس سلسلے میں ایک مشہور حدیث ہے :

لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق

مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی روا نہیں ہے۔

یہ حدیث امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے اور ایسے مسائل میں یہ ایک روشن معیار ہے۔

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ ہے کہ "تم سب کی بازگشت میری طرف ہے۔ مَیں تم کو اُن اعمال سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیتے رہے ہو" اور ان اعمال کی جزا و سزا بے کم و کاست تمہیں ملے گی : (الیّ مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعملون)۔

درحقیقت یہ جُملہ اُن لوگوں کے لیے ایک تہدید ہے جو شرک کی راہ اختیار کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو دوسروں کو بھی شرک کی طرف بُلاتے ہیں۔ کیونکہ صریحاً کہا گیا ہے کہ :

خدا اُن سب کے اعمال کا حساب اپنی نظر میں رکھتا ہے اور موقع پہ اُنھیں اُن سے باخبر کرے گا۔

❖ ❖ ❖

آیت مابعد میں پھر اُس حقیقت کو اُن لوگوں کے متعلق جو ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح بجا لاتے ہیں مکرر اور تاکیداً بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے : وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اعمالِ صالح بجالاتے ہیں ہم اُنھیں زمرۂ صالحین میں داخل کریں گے۔ (والّذین اٰمنوا وعملواالصّالحات لندخلنھم فی الصّالحین)۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کے عمل کا اُس کی سیرت پر ردِّ عمل ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا عملِ صالح اُس کی سیرت کو صالح بناتا رہتا ہے۔ اِس طرح سے وُہ زمرۂ صالحین میں داخل ہوجاتا ہے اور اُس کا عملِ سُوء اُس کی سیرت کو ناپاک کر دیتا ہے اور وُہ بدوں اور غیرِ صالح لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔

اَب سوال یہ ہے کہ : اِس آیت میں اِس مضمون کی تکرار سے کیا مقصود ہے؟

اِس کے متعلق بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیات ماقبل میں اُن لوگوں کی طرف اشارہ تھا جو راہِ حق پر گام زن ہیں اور اس آیت میں ہادیانِ دین اور رہنمایانِ طریقِ توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ عموماً جب کلمہ " صالحین " استعمال ہوتا ہے تو اِس سے مُراد

" انبیاءؑ ہی ہوتے ہیں جو خُدا سے دعا کرتے تھے کہ وہ اُنھیں صالحین سے ملحق کر دے۔

اِس مقام پر اِس احتمال کی بھی گنجایش ہے کہ آیات ماقبل میں مومنین کے لیے اُن کے گناہوں کی بخشش اور اُن کے اعمالِ صالحہ کی اچھی جزا کا ذکر تھا۔ لیکن اِس مقام پر اُن کے اعلیٰ مرتبہ کا ذکر ہے۔ جو بجائے خُود ایک قسم کی جزا ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ صالحین، انبیاءؑ، صدّیقین اور شہداءؑ کی صف میں شامل ہوں گے اور اُن کے ہمدم و ہم نشین ہوں گے۔

❖ ❖

ماں باپ سے حُسنِ سلوک :

یہ کوئی پہلی بار نہیں ہے کہ قرآن مجید میں انسانی زندگی کے اِس اہم مسئلہ کو بیان کیا گیا ہو۔ اِس سے قبل بھی سُورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ میں اِس مسئلے کی جانب اشارہ ہو چکا ہے اور آپ آئندہ سُورۂ لقمان کی آیت ۱۴، ۱۵ اور سورۂ احقاف آیت ۱۵ میں بھی اِس اہم موضوع کے متعلق بیانات پڑھیں گے۔

درحقیقت اسلام ماں اور باپ دونوں کے لیے نہایت ہی احترام کا قائل ہے۔ یہاں تک کہ اِس صُورت میں بھی کہ وہ مُشرک ہوں اور وہ اولاد کو شرک کی طرف دعوت دیں (جو کہ اسلام کی نظر میں بدترین کام ہے) پھر بھی اُن کے حفظِ احترام کو ملحوظ رکھتا ہے۔ قرآن حُکم دیتا ہے کہ اُن کی دعوتِ شرک کو تو ہرگز قبول نہ کرو مگر اُن کے احترام کو واجب جانو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی خدا کی طرف سے انسان کا ایک بہت بڑا امتحان ہے (جس طرف اس سورۃ کے آغاز میں اشارہ ہوا ہے) کیونکہ انسان بعض اوقات عمر کی ایسی منزل میں پہنچ جاتا ہے کہ پھر اُس کی نگہداری بہت مُشکل ہو جاتی اور حالتِ پیری میں بوجہ ناتوانی اُس کی احتیاجات کا پُورا کرنا بہت دُشوار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اُس کی اَولاد اس کی حق شناسی اور اُس کے متعلق فرمانِ الٰہی کی اطاعت کر کے امتحان سے عہدہ برآ ہو۔

جناب رسولِ خداؐ کی ایک حدیث اس طرح منقول ہے کہ :

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا :

مَیں کس شخص کے ساتھ نیکی کروں ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

اس نے دوبارہ سوال کیا : اس کے بعد کس کے ساتھ ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

اس نے سہ بارہ سوال کیا : اُس کے بعد کس کے ساتھ ؟

آپؐ نے فرمایا : اپنی ماں کے ساتھ۔

البتہ جب اُس نے بارِ چہارم سوال کیا تو حضورؐ نے باپ کے ساتھ نیکی کی ہدایت کی اور اُس کے بعد تمام رشتہ داروں کے ساتھ اُن کی قربت کی ترتیب کے لحاظ سے [1]

جناب رسالت مآبؐ کی ایک اور حدیث بہت سی کتابوں میں درج ہے کہ :

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ذیل آیات زیرِ بحث۔

الجنة تحت اقدام الامّهات

بہشت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

مُراد یہ ہے کہ ماں کی خدمت میں فروتنی اور عاجزی کرنے اور اُن کے حضور مثلِ خاکِ راہ ہونے ہی سے انسان کو بہشت نصیب ہوسکتی ہے[1]

[1] تفسیر مجمع البیان، ذیل آیات زیر بحث۔

۱۰۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ

۱۱۔ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○

۱۲۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

۱۳۔ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ؗ وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۠

ترجمہ

۱۰۔ اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں مگر جب اُنھیں راہِ خدا میں ایذا پہنچتی ہے تو وہ لوگوں کے فتنہ کو خدا کا عذاب سمجھتے ہیں۔ مگر جب تیرے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا خُدا جو کچھ اہلِ عالم کے سینوں میں ہے اُس سے خُوب تر ین آگاہ نہیں ہے؛

۱۱۔ اور یقیناً خُدا اُن لوگوں کو بھی جانتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور اُنھیں بھی جو منافق ہیں۔

۱۲۔ اور کافروں نے اُن لوگوں سے کہا جو ایمان لائے ہیں کہ تم ہمارے راستے کی پیروی کرو۔ ہم تمہارے گناہوں کو اُٹھا لیں گے۔ مگر وہ اُن کا ذرّہ بھر گناہ بھی نہیں اُٹھائیں گے۔ کیونکہ وہ جھوٹے ہیں۔

۱۳۔ یہ لوگ اپنا (اپنے گناہوں کا) بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی اور یہ لوگ جو افترا کرتے رہے ہیں، قیامت کے روز اُس کے متعلق اُن سے سوال کیا جائے گا۔

تفسیر

وُہ لوگ جو کامیابیوں میں شریک ہیں مگر مُشکلات میں نہیں :

گزشتہ آیات میں صالح مومنین اور مشرکین کا ذکر تھا۔ اِن آیاتِ زیرِ نظر میں ایک تیسرے گروہ "منافقین" کا ذکر ہے۔

چنانچہ مذکور ہے کہ : "بعض لوگ ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن مخالفین کی سختیوں اور مظالم کے مقابلے میں اُن میں تحمّل اور استقامت نہیں ہوتی۔ جس وقت راہِ خدا میں اُنھیں سختیاں پیش آتی ہیں تو وہ ایمان سے رُوگرداں ہو جاتے ہیں اور اِن مصائب کو خُدا کا عذاب سمجھتے ہیں اور گھبرا جاتے ہیں : (ومن الناس من یقول اٰمنّا باللّٰه فاذا اُوذی فی اللّٰه جعل فتنة الناس کعذاب اللّٰه)۔

مگر جس وقت تجھے تیرے رب کی مدد پہنچتی ہے اور تم کامیاب ہوتے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے اور تمہاری کامیابیوں میں شریک ہیں : (ولئن جاء نصرٌ من ربك لیقولن انّا کنّا معکم)۔

کیا یہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ خُدا اُن کے دلوں کے خیالات سے باخبر نہیں ہے اور کیا خدا ان باتوں سے آگاہ نہیں ہے جو دنیا کے لوگوں کے سینوں میں ہیں : (اَوَلیس اللّٰه بأعلم بما فی صدور العالمین)۔

اِس آیت میں "اٰمنّا" جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ اِس کے بعد "جعل" صیغہٴ مفرد استعمال ہوا ہے۔ شاید صیغہٴ جمع اِس لیے آیا ہو کہ یہ منافقین چاہتے ہوں کہ اپنے آپ کو مومنین میں شمار کرائیں اس لیے وُہ آمنا کہتے ہیں۔ یعنی ہم بھی دوسرے تمام مومنین کی طرح ایمان لائے ہیں۔

"اُوذی فی اللّٰه" سے مُراد "اُوذی فی سبیل اللّٰه" ہے۔ یعنی وہ لوگ کبھی راہِ خُدا اور راہِ ایمان میں دُشمنوں کی طرف سے موردِ آزار ہوتے ہیں۔

اُسے "فتنہ" کہا گیا ہے۔

آیتِ زیرِ نظر میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو لوگوں کی طرف سے جو آزار پہنچتا ہے وہ درحقیقت عذاب نہیں ہے بلکہ آزمائش ہے اور یہ آزمائش اُن کے تکامل ایمان کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اِس طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ "عذاب" اور "امتحان" میں فرق کرنا سیکھیں اور اس بہلنے سے کہ مخالفین اُنھیں ستاتے ہیں، ایمان سے دست بردار نہ ہوں۔ کیونکہ مخالفین کی طرف سے ستایا جانا بھی خدا کی طرف سے دُنیاوی امتحان کے پروگرام میں شامل ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ جُملہٴ فوق "شرطیہ" ہے اور یہ مسلّم ہے کہ جُملہ شرطیہ کے لیے "وجودِ شرط" لازمی نہیں ہے۔

بلکہ اُس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خُدا آئندہ تم کو (اہلِ ایمان کو) کامیابیاں عطا کرے گا تو یہ کمزور ایمان منافقین اُن میں اپنے آپ کو شریک سمجھیں گے۔

علاوہ بریں مکہ میں بھی مسلمانوں نے دشمنوں کے مقابلے میں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ وہ فوجی فتوحات نہ تھیں بلکہ وہ معنوی کامیابیاں تھیں مثلاً اِسلامی تبلیغات عمومی افکار میں نفوذ کر رہی تھیں اور عوام میں اسلام کی پیش رفت ہو رہی تھی۔

اِن سب باتوں کے علاوہ مومنین کے لیے اذیّت و آزار صرف مکّی زندگی ہی تک تھا۔ مدینہ کی زندگی میں اِس قسم کی تکالیف کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا تھا۔

اِس آیت سے ضمناً یہ امر بھی واضح ہوا کہ "منافق" صرف وہی لوگ نہیں ہیں جن کے قلوب میں ایمان تو ہرگز نہیں ہوتا مگر وہ "ایمان" کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کمزور ایمان لوگ بھی جو مخالفین کا ظلم برداشت نہیں کر سکتے اس لیے جلد ہی اپنے عقیدے سے منحرف ہو جاتے ہیں، منافقین میں شمار ہوتے ہیں۔

اور آیت زیرِ بحث میں بظاہر اسی قسم کے منافقین کا ذکر ہے۔ اور یہ تصریح موجود ہے کہ خُدا ان کی نیتوں سے آگاہ ہے۔

۞ ۞ ۞

اِس آیت کے بعد کی آیت میں پھر مزید تاکید کے لیے یہ اضافہ ہے کہ یقینی طور پر خدا مومنین کو پہچانتا ہے اور حتمی طور پر وُہ منافقین کو بھی پہچانتا ہے : (ولیعلمنّ اللّٰه الذین اٰمنوا ولیعلمن المنافقین)۔

اگر سادہ لوح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حقائق کو چُھپا کر احاطہٴ علمِ الٰہی سے باہر رہ سکتے ہیں تو بہت ہی غلط فہمی میں مُبتلا ہیں۔

ہم بار دیگر بطور تکرار یہ کہتے ہیں کہ "اس آیت میں کلمہ "منافق" کا وجُود اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ امر مُسلّم ہے کہ کسی جماعت میں نفاق اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اقتدار میں آکر حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اُس وقت مخالفین باقتدار جماعت سے منحرف ہو کر زیرِ زمین جماعت سازی شروع کر دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ ہم نے سطور مافوق میں کہا، نفاق کے بہت وسیع معنیٰ ہیں۔ اِن معنیٰ میں وہ ضعیف الایمان لوگ بھی شامل ہیں جو تھوڑی سی تکلیف بھی پیش آنے پر اپنا عقیدہ بدل لیتے ہیں۔

۞ ۞ ۞

آیتِ مابعد میں مشرکین کا ایک کمزور اور پوچ قول نقل کیا گیا ہے۔ جبکہ ابھی تک مشرکین کی تعداد زیادہ تھی۔ فرمایا گیا ہے : کافروں نے ایمان والوں سے کہا : "تم آؤ ! ہمارے عقائد اور ہمارے مذہب کی پیروی کرو۔ اگر اِس راہ میں تمہارا کوئی گناہ ہوگا تو ہم اُسے اپنے کاندھوں پر اُٹھالیں گے :

(وقال الذین کفروا للذین اٰمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم)[1]

---

[1] جملہ "ولنحمل" فعل امر ہے۔ اِس پر بعض مفسّرین نے اعتراض بھی کیا ہے کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے آپ ہی کو حکم دے ؟

اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ امر قضیہ شرطیہ کے حکم میں داخل ہے۔ یعنی پُورا جُملہ یُوں ہے۔ "اگر تم ہمارا اتباع کرو تو ہم تمہارے گناہوں کو اُٹھالیں گے" (تفسیر فخر رازی)

مگر ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اِس امر میں کوئی مانع نہیں کہ انسان اپنے آپ کو حکم دے۔ مزید یہ کہ آمر و مامور یہاں ایک ہی شخص ہے۔ لیکن دو اعتبار سے۔

ہم آج بھی بہت سے بداندیش لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ کسی کو عمل بد پر آمادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں، اگر اس فعل میں کوئی گناہ ہے تو وہ ہماری گردن پر حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی آدمی بھی کسی دُوسرے شخص کا گناہ اپنے ذمّے نہیں لے سکتا اور یہ بات ہرگز معقول نہیں ہے۔ (کیونکہ) خُدا عادل ہے۔ وہ کسی کو بھی دوسرے آدمی کے جُرم میں سزا نہیں دے گا۔ علاوہ بریں ان بے اساس باتوں سے کوئی آدمی بھی اعمال کی ذمّہ داری سے بری نہیں ہو جائے گا۔

نیز جیسا کہ بعض کوتاہ فکر لوگ خیال کرتے ہیں، اُن کی رائے کے برخلاف اِس قسم کی بے سروپا باتیں انسان کے گناہوں کی سزا میں سُوئی کی نوک کے برابر بھی کمی نہیں کر سکتیں۔ اِس لیے کسی عدالت میں بھی اگر جج کے سامنے کوئی ایسی بات کہے کہ فلاں آدمی کا گناہ مَیں اپنے ذمّہ لیتا ہوں تو اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔

یہ درست ہے کہ گناہ پر آمادہ کرنے والا شخص بھی گناہ گار کے جُرم میں شریک ہے مگر یہ شرکت اُس گناہ گار کی ذمّہ داری کو کسی طرح کم نہیں کر دیتی۔

لہٰذا دوسری آیت میں بصراحت کہا گیا ہے کہ: وہ لوگ دُوسروں کے گناہوں اور خطاؤں کو ہرگز اپنے کاندھوں پر نہ لیں گے: (وماھم بحاملین من خطایاھم من شیء انھم لکاذبون)۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صدق و کذب جُملہ خبریہ میں ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم جس جُملے پر بحث کر رہے ہیں وہ جُملہ خبریہ نہیں بلکہ جُملہ اِنشائیہ ہے (یعنی فعل امر) اور ہم جانتے ہیں کہ جُملہ اِنشائیہ میں صدق و کذب نہیں ہوتا۔ پس قرآن یہ کیوں کہتا ہے کہ وہ "جھُوٹ بولتے ہیں"؟ اِس سوال کا جواب بیانِ سابق سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جملہ اَمریہ اِس مقام پر ایک جُملہ شرطیہ خبریہ بن جاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو تو ہم تمہارے گناہوں کی ذمّہ داری لیتے ہیں۔ اور ایسے جُملے میں احتمالِ صدق و کذب ہے۔[1]

* * *

اور اِس امر کے پیشِ نظر کہ کہیں ایسا نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کفر و شرک، بُت پرستی اور ظُلم کی طرف دعوت دینے والے لوگ اپنے اعمال کی کوئی سزا نہیں پائیں گے، اِس لیے آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا: وہ لوگ اپنے گناہوں کا بار اُٹھائیں گے اور اُن کے بار پر دُوسرے وزنی بار کا بھی اضافہ ہو گا: (ولیحملن اثقالھم واثقالاً مع اثقالھم)۔

یہ اضافی بار لوگوں کو گمراہ اور دُوسروں کو گناہ کی رغبت دلانے کا ہو گا۔ یہ ویسا ہی بارِ گناہ ہو گا جیسا کہ کسی رسم بد کی بنیاد ڈالنے کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

من سن سنة سیئة فعلیه وزرها ووزر من عمل بها من غیر ان ینقص من وزره شیء

[1] اِس سوال کا جواب ایک اور طرح بھی دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جملہ انشائیہ میں صدق و کذب کا پہلو ہوتا ہے اور عرفِ عام میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام کا حکم دیتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آدمی اُس کام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جھُوٹ بولتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت میں یہ نہیں چاہتا۔

جو آدمی کسی رسم بد کی بُنیاد رکھتا ہے تو اِس رسم بد اور اُن سب آدمیوں کا گناہ جو اس پر عمل کرتے ہیں اُس کی گردن پر ہے۔ بغیر اس کے کہ اُن پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں سے ذرہ بھر کمی ہو۔[1]

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ بروز قیامت اُن سے یقینی طور پر اُن کے افترآت اور دروغ گوئیوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور انھیں اُن کا جواب دینا ہو گا: (ولیسئلن یوم القیامة عما کانوا یفترون)۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس افتراء کا قیامت میں جواب دینا ہو گا وہ کیا ہے؟

تو ممکن ہے اس افتراء کا مطلب وہ دروغ گوئیاں ہوں جو یہ مشرکین خدا کے متعلق کرتے تھے اور کہتے تھے کہ: خُدا ہی نے ہمیں ان بُتوں کی پرستش کا حکم دیا ہے۔

یا اس سے یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ جو یہ کہتے تھے کہ "تمہارے گناہوں کو ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں" اِس قول سے اُن کفار کی یہ مُراد ہو کہ "یہ اعمال ہرگز گناہ نہیں ہیں" اور یہ ایک جھُوٹ ہے جس کا اُنھیں جواب دینا ہو گا۔ یا یہ کہ بروز قیامت اُن سے کہا جائے گا کہ آؤ اور اُن لوگوں کے گناہ اُٹھاؤ! تو وہ لوگ انکار کر دیں گے اور اپنے جھُوٹ کو ظاہر کر دیں گے۔

یا یہ مُراد بھی ہو سکتی ہے کہ اُن کے اقوال کا یہ مطلب تھا کہ ہر انسان دُوسرے انسان کے گناہوں کی ذمّہ داری لے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی دروغ ہے۔ کیونکہ ہر آدمی صرف اپنے ہی اعمال کا ذمّہ دار ہے۔

* * *

چند اہم نکات

ا۔ **اچھی اور بُری رسمیں:** اگر کوئی شخص کسی ایسے کام کی بُنیاد رکھتا ہے جو اُس عہد کے پُورے معاشرے میں نفوذ کر جائے تو بُنیاد رکھنے والا شخص کُل معاشرہ کے اعمال کا ذمّہ دار ہو گا۔ کیونکہ کسی عمل کی تحریک بھی اُس عمل کے اسباب میں سے ہے۔ یہ ثابت ہے کہ جو شخص بھی محرکِ عمل ہے وہ اُس عمل کے خیر و شر میں شریک سمجھا جائے گا۔ خواہ وہ عمل کتنا ہی معمولی ہو۔ جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث روایت کی گئی ہے جو ہمارے اس قول کی موید ہے۔

جناب رسُولِ خداؐ ایک روز اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف رکھتے تھے کہ ایک سائل آیا اور اُس نے مدد کے لیے سوال کیا۔ کسی نے بھی اُسے کچُھ نہ دیا۔ اِتنے میں اصحاب میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اُس فقیر کو کچھ دے دیا۔ یہ دیکھ کر دُوسروں کو بھی خیال پیدا ہُوا اور اُنھوں نے بھی اُس سائل کی مدد کی اِس موقع پر رسُول اللہؐ نے فرمایا:

من سن خیراً فاستن به کان له اجره ومن اجور من تبعه، غیر منتقص من اجورهم شیئاً، ومن سن شراً فاستن به کان علیه وزره ومن اوزار من تبعه، غیر منتقص من اوزارهم شیئاً۔

[1] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲۵ صفحہ ۳۰

جو آدمی کسی نیک رسم کی بُنیاد رکھتا ہے اور دُوسرے اس کی پیروی کرتے ہیں تو اُسے اس کے عملِ خیر اور دوسروں کے اعمالِ خیر کا بھی بدلہ ملے گا۔ بغیر اس کے کہ دُوسروں کی جزا میں کچھ کمی ہو اور جو کوئی رسمِ شر کی بُنیاد رکھتا ہے اور لوگ اُس کی پیروی کرتے ہیں تو اسے اس کے اپنے گناہ اور دُوسروں کے گناہوں کی بھی سزا ملے گی۔ اس کے بغیر کہ ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو۔[1]

اِس مطلب کی اور بھی حدیثیں شیعہ اور سُنّی کُتب احادیث میں مذکور ہیں۔ مگر اُن میں سے یہ مشہور ہے۔

۲۔ ایک سوال کا جواب : اِس مقام پر یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان کا خُون بہا دُوسرے آدمی کے ذمّے ہوتا ہے۔ مثلاً قتل کے معاملہ میں خون بہا "عاقلہ" کے ذمّے ہے۔

"عاقلہ" اصطلاحِ فقہ میں ایک باپ کی اولاد ذکور کو کہتے ہیں کہ خُون بہا کی رقم اُس اولاد ذکور پر تقسیم ہو جائے گی اور ان میں سے ہر ایک اپنا حصّہ ادا کرے گا۔

کیا یہ مسئلہ مندرجہ بالا آیات کے مضامین سے متضاد نہیں ہے ؟

ہم اِس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے مباحث فقہی میں یہ واضح کر دیا ہے کہ "عاقلہ" کا خُون بہا کا ضامن ہونا ایک قسم کا ایک خاندان کے افراد میں متقابل اور لازمی بیمہ ہے۔

اِسلام نے اس وجہ سے کہ کسی خطا کی دِیّت کا بار ایک فرد پر نہ رہے۔ پُورے خاندان کے افراد پر لازم کر دیا کہ وُہ سب باہم دگر "دِیتِ خطا" کے ضامن رہیں اور دِیّت کی رقم کو آپس میں بانٹ لیں۔ ممکن ہے کہ آج ایک شخص خطا کا مرتکب ہو اور کل کو دُوسرا۔

(ہم اس مسئلے کے بارے میں مزید بحث کو فقہ کی کتاب پر چھوڑتے ہیں)

بہرحال ادائے دِیّت کا یہ نظام باہمی مفاد کی حفاظت کے لیے ایک قسم کا تعاون اور امدادِ باہمی ہے۔ اور اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ کوئی شخص دُوسرے آدمی کا گناہ اپنی گردن پر لے لے۔ بالخصوص قتل کا خُون بہا حقیقت میں اس گناہ کا جرمانہ نہیں ہے بلکہ وہ "تلافیٔ نقصان" ہے (یہ امر مستحقِ غور ہے)۔

[1] تفسیر درالمنثور۔

۱۴۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

۱۵۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

۱۶۔ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

۱۷۔ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

۱۸۔ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

۱۹۔ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۴۔ اور ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا۔ وہ اُن میں پچاس سال کم ایک ہزار سال تک رہے۔ پھر اُن کو

(قوم نوح کو) طوفان نے آپکڑا۔ جب کہ وہ ظالم تھے۔

۱۵۔ پھر ہم نے اُس (نوح) کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اُس کشتی کو اہلِ عالم کے لیے ایک نشانی بنادیا۔

۱۶۔ اور ہم نے ابراہیم کو بھیجا۔ جب کہ اُس نے اپنی قوم سے کہا : تم خُدا کی عبادت کرو اور اُس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم اِس بات کو سمجھو۔

۱۷۔ تم لوگ خُدا کو چھوڑکر (پتھر اور لکڑی کے بنے ہُوئے) بُتوں کی عبادت کرتے ہو اور آپس میں دروغ بافی کرتے ہو۔ وہ ذاتیں جن کی تم خدا کو چھوڑکر پرستش کرتے ہو، تمہیں رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتیں۔ پس تم خُدا ہی سے رِزق طلب کرو اور اُسی کی عبادت کرو اور اُس کا شکر ادا کرو کہ جس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

۱۸۔ اگر تم میری تکذیب کرتے ہو تو تم سے پہلی اُمتیں بھی انبیاؑ کی تکذیب کرتی رہی ہیں اور رسول پر تو واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ فرض نہیں ہے۔

۱۹۔ کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ خدا مخلوق کو کس طرح پیدا کرتا ہے اور پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ اور یہ خُدا کے نزدیک آسان ہے۔

تفسیر

سرگزشتِ نوحؑ اور ابراہیمؑ کا ذکر :

گزشتہ آیات میں انسانوں کی عمومی آزمائش کا ذکر تھا۔ یہاں سے اور اس کے بعد انبیاؑ اور گزشتہ اقوام کی آزمائشوں کا ذکر ہے کہ وہ انبیاؑ اور اُن کے ساتھی کس طرح دُشمنوں کے نرغے میں آزار و زحمات سے دوچار رہے، انھوں نے کس طرح صبر کیا اور پھر آخر کار اُنھیں حالات پر فتح نصیب ہوئی۔

یہ اذکار اصحاب پیغمبرِ اسلام کی دلجوئی کے لیے ہیں ; جو اُن ایّام میں مکہ میں طاقتور دُشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ نیز یہ دشمنوں کے لیے تہدید بھی ہے کہ وہ جان لیں کہ اُن کا انجام بڑا دردناک ہوگا۔

یہاں سب سے پہلے ایک اُولوالعزم پیغمبر حضرت نوحؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اُن کی زندگی کا اتنا حصّہ بیان کیا گیا ہے جو اُس وقت مُسلمانوں کی وضع زندگانی کے لیے مناسب تر تھا۔

خُدا فرماتا ہے : ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ اُن کے درمیان پچاس سال کم ایک ہزار سال تک رہا : (ولقد ارسلنا نوحًا الٰی قومہٖ فلبث فیھم الف سنۃٍ الّا خمسین عامًا)۔

حضرت نوح علیہ السلام شب و روز تبلیغ کرنے اور توحید کی طرف دعوت دینے میں مشغول رہتے تھے۔ خواہ خلوت و تنہائی ہو یا آپ لوگوں کے مجمع میں ہوں۔ بہرکیف آپ ہر موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی قوم کو نوسو پچاس سال کی طویل مدّت تک خدا کی طرف

بُلاتے رہے۔ آپ اِس خستہ کن کوشش سے نہ تو تھکے اور نہ اپنی طبیعت میں کسی ضعف کو پیدا ہونے دیا۔ لیکن اِس محنت بادجود ایک قلیل تعداد (تاریخ کے مطابق اسی افراد) کے سوا کوئی آپ کی تعلیم پر ایمان نہ لایا۔ "ضمناً" جناب رسالہ کو یہ آگاہ کیا گیا ہے کہ ; تم ان مُشرکین کو بجانب حق دعوت دیتے رہو اور ان کی سرکشی سے دل شکستہ نہ ہو۔ کیونکہ تمہارے سا مہم درپیش ہے وہ حضرت نوحؑ کی دُشواریوں سے آسان تر ہے۔

مگر دیکھو کہ اِس ستمگر اور جھگڑالو قوم (یعنی قوم نوحؑ) کا انجام کیا ہوا۔ آخر کار اُنھیں ایک عظیم طوفان نے گھیر لیا اس ظالم اور ستمگر تھے۔ (فاخذھم الطوفان وھم ظالمون)۔

اِس طور سے ان کی شرمناک زندگیوں کا طومار لپیٹا گیا۔ اُن کے محلّات اور حویلیاں اور اُن کے بے جان جسم سب کے امواجِ طوفان میں دفن ہوگئے۔

آیت میں جناب نوحؑ کی مُدّتِ تبلیغ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے : " ہزار سال مگر پچاس سال کم، حالان کہ خدا نوسو پچاس سال کہہ دیتا۔

یہ اُسلوبِ بیان طول زمان کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہے، کیونکہ ایک ہزار کا عدد اور پھر وہ بھی " ہزار س صُورت میں، تبلیغ کے لیے بہت بڑا عرصہ ہے۔

آیت فوق کے ظاہری معنیٰ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کُل عمر اتنی ہی نہ تھی۔ جب کہ موجودہ تورات نوحؑ کی کُل عمر اتنی ہی لکھی ہے۔ (توریت سفر تکوین فصل نہم)

لیکن یہ بات درست نہیں بلکہ نوسو پچاس سال کا عرصہ ماقبل طوفان تبلیغ کا ہے۔ آپ طوفان کے بعد بھی طویل مُ زندہ رہے۔ بعض مفسّرین نے تین سو سال لکھے ہیں۔

اگر ہم اپنے زمانے کی عمروں کے معیار سے دیکھیں تو حضرت نوحؑ کی اِتنی طولانی عمر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے اور معلوم نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اُس زمانے میں لوگوں کی عمریں اِس زمانے کی عمروں سے مختلف ہوتی ہوں۔ بعض اسناد سے حاصل ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ کی عمریں طولانی ہوتی تھیں۔ اُن میں سے تو حضرت نوحؑ کی عمر غیر معمولی بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کی بناوٹ میں بھی طول عمر کا امکان ہوسکتا ہے۔

اِس زمانے میں حکمائے نے جو تحقیقات کی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی حد عمر معیّن نہیں ہے اور جن لُ انسان کی عمرِ طبیعی ایک سو بیس سال یا اس سے کسی قدر کم یا زیادہ سمجھی ہے اُن کا خیال بے اساس ہے۔ بلکہ عین ممکن شرائط بقائے حیات کے ساتھ یہ قیاس بدل جائے۔

ہمارے اِس زمانے میں سائنسدان تجربات کے وسیلہ سے اِس قابل ہوگئے ہیں کہ وہ بعض نباتات یا دیگر زند کی عمر کو اُن کی معمول کی مُدتِ حیات سے بارہ گنا زیادہ کردیں۔ بلکہ بعض اوقات تو (اگر آپ تعجب نہ کریں) ۹۰۰ گنا تک کو طویل کردیا گیا ہے۔ اگر یہ تجربات کامیاب ہوتے رہے تو وہ انسان کی مدتِ حیات کو بھی طول دینے میں کامیاب ہوجائیں گے۔[1]

[1] طول عمر کے مسئلے کو بالوضاحت سمجھنے کے لیے بحضرت امام مہدی علیہ السلام کی طولانی عمر کی بحث کے سلسلہ میں "مہدی انقلابی بزرگ" کتاب کا مطالعہ کریں۔

اور یہ ممکن ہو جائے گا کہ انسان ہزاروں سال تک زندہ رہ سکے۔

ضمناً یہ بھی ملحوظ رہے کہ کلمۂ "طوفان" کا مادہ "طواف" ہے۔ اس کے حقیقی معنیٰ ہر اس حادثے کے ہیں جو انسان کو گھیر لے۔ مجازاً اس کلمہ کا اطلاق اُس کثیر پانی یا سیل شدید پر ہونے لگا جو رُوئے زمین پر پھیل کر اُسے نگل لے۔ اِس کا اِطلاق ہوا، آگ اور پانی سب پر ہو سکتا ہے۔ یہ کلمہ کبھی شدید تاریکی شب کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ قوم نوح کو "وھو ظالمون" کہا گیا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ وہ وقوعِ طوفان کے وقت بھی وہ لوگ اُسی طرح ظلم و ستم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اِن کلمات کا اشارہ اِس طرف بھی ہے کہ اگر وہ اِن اعمال سے باز آجاتے اور خدا کی طرف رجُوع کرتے تو ہرگز اِس عذاب میں مُبتلا نہ ہوتے۔

٭ ٭ ٭

اِس کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ ہم نے نوح اور اصحابِ کشتی کو نجات دی اور اُسے اہلِ دُنیا کے لیے ایک نشانی قرار دیا: (فانجیناہ واصحاب السفینۃ وجعلناھا آیۃ للعالمین)۔[2]

٭ ٭ ٭

حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم کے واقعے کے ذکر کے بعد دُوسرے اُولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے حالات کا تذکرہ ہے۔
ہم نے ابراہیمؑ کو بھیجا۔ اور جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ: خدائے واحد کی پرستش کرو اور اُس کے لیے تقویٰ اختیار کرو کیونکہ اگر تم جانو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے: (وابراھیم اذ قال لقومہ اعبدوا اللہ واتقوہ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔[3]

اِس مقام پر تبلیغاتِ انبیاء کے دو اہم "اعتقادی اور عملی" ارکان کا ایک ہی جگہ بیان ہے اور وہ ہیں "توحید" اور "تقویٰ" کی طرف دعوت (توحید کا تعلق اعتقاد سے اور تقویٰ کا ربط عمل سے ہے)۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ اگر تم فکرِ صحیح رکھتے ہو تو ایمان بہ توحید اور تقویٰ تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ اس سے تمہاری دنیوی زندگی شرک و گناہ، بدبختی کی آلودگیوں سے نجات ملتی ہے اور تمہاری آخرت کے لیے بھی یہ سعادتِ جاوید قرار پائی ہے۔

اِس کے بعد حضرت ابراہیمؑ دلائل سے بُت پرستی کا باطل ہونا ثابت کرتے ہیں۔ آپ نے اِس دعویٰ کو مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے اور ان سے اُن مشرکین کے معتقدات اور روشِ حیات کو نا درست ثابت کیا ہے۔

---

[1] مفردات راغب و فرہنگ عمید۔

[2] اِس امر میں کہ "جعلناھا" کی ضمیر کا مرجع کون ہے؟ مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر "ھا" کا مرجع کُل واقعہ اور حادثہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا اشارہ حضرت نوحؑ اور اُن کے اصحاب کی نجات کی طرف ہے۔ بعض نے اِس ضمیر کا مرجع کشتی کو قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کے ظاہری معنیٰ کے لحاظ سے آخری خیال درست ہے۔ درحقیقت یہ کشتی اُس زمانے میں خدا کی عظیم آیات میں سے ایک آیت تھی۔

[3] "ارسلنا" فعل ہے اور نوحاً معطوف علیہ اور ابراہیم معطوف ہے۔ دونوں مفعول ہوتے فعل "ارسلنا" کے۔ بعض نے ابراہیم کو فعل "انجینا" کے مفعول پر عطف سمجھا ہے۔ اور بعض نے فعل محذوف "اذکر" کا مفعول سمجھا ہے۔

پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی کہ: تم خُدا سے منحرف ہو کے بُتوں کی عبادت کرتے ہو: (انما تعبدون من دون اللہ اوثانا)۔

حالانکہ یہ بُت بے رُوح مُجسّمے ہیں۔ نہ یہ صاحبِ ارادہ ہیں، نہ صاحبِ عقل اور نہ صاحبِ شعور۔ وُہ اِن تمام اوصاف سے محروم ہیں۔ اُن کی ہیئت ہی بُت پرستی کے عقیدے کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔
توجہ رہے کہ "اَوثان" جمع ہے "وَثَن" کی (بروزن "صَنَم") وہ پتھر جنہیں بصُورتِ انسان تراش کر اُن کی عبادت کی جاتی تھی۔
اِس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صرف ان بُتوں کی وضع ہی یہ ثابت نہیں کرتی کہ معبُود نہیں ہیں، بلکہ تم بھی جانتے ہو کہ "تم دروغ بافی کرتے ہو اور ان بُتوں کو معبُود کہتے ہو": (وتخلقون افکا)۔
تمہارے پاس اس جھُوٹ کو ثابت کرنے کی بجز چند اوہام و خرافات کے اور کیا دلیل ہے۔
چونکہ "تخلقون" کا مادّہ خلق ہے۔ یہ کلمہ کبھی پیدا کرنے یا بنانے کے معنیٰ دیتا ہے اور کبھی بہ معنیٰ جھُوٹ بولنا۔ اِس لیے بعض مفسّرین نے اِس جملے کی اُس کے علاوہ بھی تفسیر کی ہے جو ہم نے سطور بالا میں تحریر کی۔
اُنھوں نے کہا ہے کہ تخلقون سے مُراد یہ ہے کہ تم اِن مصنوعی معبُودوں کو اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو اور خلق کرتے ہو۔ اِس لحاظ سے کلمۂ "اِفک" کے معنیٰ "غیر حقیقی معبُود" ہوتے اور "خلق" بمعنیٰ "تراشیدن"[1] تراشنا۔
اِس کے بعد حضرت ابراہیمؑ تیسری دلیل دیتے ہیں کہ اگر تم اِن بُتوں کو مادی منفعت کے لیے پُوجتے ہو یا دُوسرے میں فائدے کے لیے، دونوں صُورتوں میں تمہارا یہ خیال باطل ہے کیونکہ تم خدا کے علاوہ جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں رزق روزی نہیں دے سکتے: (ان الذین تعبدون من دون اللہ لا یملکون لکم رزقا)۔
تم خُود اقرار کرتے ہو کہ یہ بُت خالق نہیں ہیں بلکہ خالق حقیقی خدا ہے۔ اِس بنا پر روزی دینے والا بھی وہی ہے۔ لہٰذا روزی خُدا سے طلب کرو: (فابتغوا عند اللہ الرزق)۔
اور چونکہ روزی دینے والا وہی ہے۔ لہٰذا اسی کی عبادت کرو اور اُس کا شکر بجالاؤ: (واعبدوہ واشکروا لہ)۔
اِس مفہوم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ منعم حقیقی کے حضور میں "حسِ شکرگزاری" سے بھی عبادت کی تحریک ہوتی ہے۔
تم جانتے ہو کہ منعم حقیقی خدا ہی ہے۔ پس شکر اور عبادت بھی اُسی کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔
نیز اگر تم سرائے آخرت کی زندگی کے خواستگار ہو تو سمجھ لو کہ ہم سب کی بازگشت اُسی طرف ہے نہ کہ بُتوں کی طرف: (الیہ ترجعون)۔
یہ بُت نہ یہاں کچھ کام آسکتے ہیں نہ وہاں۔
حضرت ابراہیمؑ نے اِس طرح چند مختصر مگر واضح دلائل سے مشرکین کے بے بُنیاد عقائد کو رد کر دیا۔

---

[1] "افک" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس کی اصل صُورت بدل جائے۔ اِس لیے دروغ، بالخصوص "بڑے جھوٹ" کو افک کہتے ہیں۔ اسی طرح بادِ... کو بھی "افک" کہتے ہیں۔

اِس کے بعد حضرت ابراہیمؑ تہدید کے طور پر اور اُن مُشرکین کی سرکشی سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر تم میرے پیام کی تکذیب کرتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے جو اُمّتیں گزر چکی ہیں اُنھوں نے بھی اسی طرح اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے اور آخرکار اُن کا انجام بڑا دردناک ہوا: (وان تکذبوا فقد کذب أمم من قبلکم)۔

رسُول اور فرستادۂ خدا کا فرض واضح ابلاغ کے علاوہ اور کچھ نہیں خواہ لوگ اُسے قبول کریں یا نہ کریں: (وما علی الرسُول الّا البلاغ المبین)۔

اِس مقام پر گزشتہ اُمّتوں سے مُراد قومِ نوح اور وہ اقوام ہیں جو اُس کے بعد وجُود میں آئیں۔

ارتباطِ آیات سے واضح ہوتاہے کہ یہ قول حضرت ابراہیمؑ ہی کا ہے اور بہت سے مفسّرین نے بھی اسی تفسیر کو اختیار کیاہے یا کم از کم بطور احتمال اس کا ذکر کیاہے۔

اِس مقام پر ایک اور احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں رُوئے سُخن مُشرکینِ مکّہ اور رسول اللہؐ کے زمانے کے کافروں کی طرف ہو اور یہ جملہ:

"کذب أمم من قبلکم" اِس احتمال سے بہت مناسبت رکھتاہے۔

اِس کے علاوہ سُورۂ زمر کی آیت ۲۵ اور سورۂ فاطر کی آیت ۲۵ میں پیغمبرِ اسلامؐ اور مشرکینِ عرب کے متعلق جو ذکر آیاہے، اِس آیت کا مفہوم بھی اُس کے مطابق ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا دونوں تفاسیر میں نتیجے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

✽ ✽ ✽

اِس مقام پر قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کو مطلقاً چھوڑ دیا گیاہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ توحیدِ باری تعالیٰ اور اپنی رسالت کے اثبات میں جو دلائل دے رہے تھے اُنھیں معاد کے ذکر پر ختم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا یہ منکرینِ معاد نہیں دیکھتے کہ خدا آفرینش کا آغاز کرتاہے اور پھر اُسے واپس لوٹاتا ہے: (اولم یروا کیف یبدئ اللہ الخلق ثم یعیدہ)۔

اِس مقام پر "رؤیت" یعنی دیکھنے سے مُراد مشاہدۂ قلبی اور علم ہے۔ یعنی کیا یہ لوگ آفرینشِ الٰہی کی کیفیت کو نہیں جانتے؟ وہ ذات جو باراوّل ایجاد و آفرینش پر قدرت رکھتی ہے، اُس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔ کیونکہ ایک چیز پر قدرت رکھنا یہ معنیٰ رکھتاہے کہ اُس کے امثال و اشباہ پر بھی اسے قدرت ہے۔

اِس مقام پر اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ "رُویت" کے معنیٰ "مشاہدہ بالعین" (آنکھ سے دیکھنا) ہو۔ کیونکہ انسان اِس دُنیا میں یہ دیکھتاہے کہ بارش کے فیض سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، زمین سے نباتات اُگتی ہیں۔ انسانی بچّوں کی تولید ہوتی ہے۔ مُرغی کے بچّے انڈوں سے نکلتے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو ذات اِن کاموں پر قُدرت رکھتی ہے، وہ بعدِ مرگ مردوں کو حیاتِ نو بخش سکتی ہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے یہ اضافہ ہے کہ یہ کام خدا کے لیے آسان ہے: (انّ ذالک علی اللہ یسیر)۔

کیونکہ باراوّل ایجاد و آفرینش کے مقابلے میں تجدیدِ حیات آسان تر ہے۔

ذاتِ الٰہی کے لیے کلماتِ "آسان اور دُشوار" کی تعبیرات انسان کے محدُود دماغ اور محدُود القدرت حالت کی اختراعات ہیں جو اُس نے اپنی فہم کے مطابق وضع کر لیے ہیں۔ کام کا آسان یا دُشوار ہونا تو مخلوق کے لیے ہے جس کا اختیار اور قُدرت محدُود ہے نہ کہ خدا کے لیے کہ اُس کی قدرت کے لیے کسی حد کا تعیّن نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)۔

۲۰۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

۲۱۔ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ۝

۲۲۔ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

۲۳۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِنْ رَحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۰۔ (اے رسولؐ) کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اُس نے پہلی مرتبہ کس طرح مخلوق کو پیدا کیا۔ اس کے بعد (اسی طرح) دُوسری دُنیا کو بھی پیدا کرے گا۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۱۔ خُدا جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) عذاب دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور تم سب اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

۲۲۔ اور تم ہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے اور اس کے دائرۂ قدرت سے نہ زمین میں فرار کرسکتے ہو نہ آسمان میں اور خدا کے سوا تمہارے لیے نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔

۲۳۔ اور جن لوگوں نے خُدا کی آیات اور اُس کی لقا سے انکار کیا وہ میری رحمت سے نااُمید ہوگئے ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

خدا کی رحمت سے مایوس لوگ :

یہ آیات معاد کی بحث کے بعد آئی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کے وسط میں جملہ معترضہ کے طور پر ہیں۔

یہ پہلی بار نہیں ہے کہ ہم قرآن میں اس قسم کی طرز بحث کا سامنا کر رہے ہیں۔ قرآن کی روش یہ ہے کہ جس وقت کسی قصّے کا بیان ایک حسّاس مرحلے پر پہنچا ہے تو اس قصّے سے مفید نتائج اخذ کرنے کے لیے اصل قصّہ چھوڑ کر اُن نتائج کا ذکر کرنے لگتا ہے۔

بہرحال زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں مسئلہ معاد کے سلسلے میں دُنیا کی سیر کی دعوت دی گئی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی آیت کا رُخ "سیرِ انفس" کی طرف تھا۔

خدا فرماتا ہے : ان سے کہو کہ رُوئے زمین کی سیر کریں۔ زندہ موجودات کی انواع کو دیکھیں۔ مختلف اور متنوع قسم کی اقوام اور جماعتوں کو اُن کی خصوصیات کے ساتھ ملاحظہ کریں۔ اور دیکھیں کہ خُدا نے اُنھیں بار اوّل کس طرح ایجاد کیا ہے۔ (قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ الخلق)۔

وہی خدا جو رنگا رنگ موجودات اور مختلف اقوام کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے، آخرت میں بھی زندہ کرے گا : (ثم اللہ ینشئ النشأۃ الاٰخرۃ)۔

کیونکہ اُس نے پہلی بار خلق کرکے سب پر اپنی قدرت ثابت کردی ہے۔ ٹھیک ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر اور توانا ہے : (ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر)۔

یہ آیت اور اس سے ماقبل کی آیت قدرتِ الٰہی کی وسعت کی دلیل سے معاد کے امکان کو ثابت کرتی ہیں۔

دونوں آیات میں فرق یہ ہے کہ آیت ماسبق میں خُود انسان اور جو کچھ اُس کے اطراف و جوانب میں ہے اس کی خلقت اوّل کا ذکر ہے اور دُوسری آیت میں انسان کو اقوامِ عالم اور دوسری موجودات کے مطالعے کی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ وہ خُدا کی ایجادِ اوّل کو مختلف مظاہر اور مختلف حالات و شرائط میں مشاہدہ کریں اور خدا کی لامحدود قدرت سے آشنا ہوں اور یہ سمجھیں کہ اُس میں اعادۂ حیات کی طاقت بھی ہے۔

جس طرح سے کہ کبھی "آیات انفس" کے مشاہدے سے توحید کا اثبات ہوتا ہے۔ اور کبھی "آیات آفاق" کے مشاہدے سے اسی طرح ان دونوں طریقوں سے معاد کا بھی اثبات ہوتا ہے۔

اِس زمانے میں یہ آیت سائنسدانوں کے لیے دقیق تر اور عمیق تر مفہوم رکھتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ سیاحت کریں اور اُن موجودات ذی حیات کے آثار دیکھیں جو کبھی رُوئے زمین پر موجود تھے اور اب وہ سمندر کی گہرائیوں، پہاڑوں کی چٹانوں اور زمین کے طبقات میں ڈھانچوں وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔ اِس طرح وہ زمین پر آغازِ حیات کے اسرار اور خدا کی عظمت و قدرت سے آگاہ ہوں اور یہ بھی جانیں کہ وہ اعادۂ حیات پر قدرت رکھتا ہے۔[1]

---

[1] ہم نے اس تفسیر کی جلد ۳ میں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۷ کے ذیل میں سیرِ ارض کے متعلق مفصل بحث کی ہے لیکن وہ بحث زیادہ تر گزشتہ نافرمان قوموں کے انجام سے درسِ عبرت حاصل کرنے کے سلسلہ میں تھی۔

کلمہ " نشأۃ " کے حقیقی معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔ کبھی دُنیا کو " نشأۃ اولیٰ " اور قیامت کو " نشأۃ آخرت " سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ آیت نمبر ۱۹ میں " انّ ذالك علی اللہ یسیر " آیا تھا۔ اور یہاں " انّ اللہ علیٰ کلّ شیءٍ قدیر " آیا ہے۔ اظہارِ بیان کا یہ فرق ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ آیت ماقبل میں محدود مشاہدہ کا ذکر ہے اور اس آیت میں ایک وسیع مشاہدۂ کائنات کی دعوت دی گئی ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت میں اُن مسائل میں سے جو معاد سے متعلق ہیں، ایک مسئلے کا ذکر ہے اور وہ ہے رحمت اور عذاب کا مسئلہ۔ چنانچہ مذکور ہے کہ: " وہ قیامت میں جس شخص کو مستحقِ سزا سمجھے گا اُسے سزا دے گا اور جس شخص کو لائقِ رحمت سمجھے گا اُس پر رحم فرمائے گا اور تم سب اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ (یعذّب من یشآء ویرحم من یشآء والیہ تقلبون) ۔

باوجودیکہ خدا کی رحمت اُس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ لیکن اس آیت میں پہلے عذاب کا ذکر ہے اور پھر رحمت کا۔ کیونکہ یہ بطور تہدید ہے اور تہدید کے لیے یہی مناسب ہے۔

اس مقام پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اوّل عذاب و رحمت کا ذکر ہے اور اُس کے بعد اُس کی طرف بازگشت کا۔ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ قضیہ اس کے برعکس ہے یعنی اوّل لوگ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اُس کے بعد وہ مستحقِ عذاب و رحمت قرار پائیں گے۔ شاید اسی سبب سے بعض لوگ اس عذاب و رحمت کو دُنیا کا عذاب اور رحمت سمجھتے ہیں۔

ہم اُس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آیات مابعد کے قرینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس عذاب و رحمت کا یہاں ذکر ہے اُس کا تعلق روزِ قیامت ہی سے ہے اور " الیہ تقلبون " اِسی مفہوم کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی جب کہ ہم سب کی بازگشت اُسی کی طرف ہے اور وہی اعمال کا حساب لینے والا ہے تو عذاب و رحمت بھی اُسی کے اختیار میں اور اُسی کے ارادے سے ہوگی۔

یہ بھی بعید نہیں ہے کہ اس آیت میں عذاب و رحمت وسیع تر معنی ہوں جو ہائیں دُنیا و آخرت دونوں کا عذاب و رحمت شامل ہو۔

یہ نکتہ بھی روشن ہے کہ " من یشآء " (وہ جسے چاہے گا) سے مُراد وہ مشیتِ الٰہی ہے جو حکمت سے ہم آہنگ ہے۔ یعنی وہ جسے مستحقِ عذاب و رحمت سمجھے گا۔ کیونکہ مشیتِ الٰہی اندھی نہیں ہے بلکہ وہ ہر شخص کے استحقاق کے مطابق ہے۔

کلمہ " تقلبون " کا مادّہ " قلب " ہے۔ اس کے وضعی معنی ہیں، کسی چیز کی صُورت کو بدل دینا۔

چونکہ قیامت کے دن انسان خاکِ بے جاں کی صُورت سے ایک ایسے زندہ موجود کی شکل اختیار کرے گا جو ایک موجودِ مکمل ہوگا لہٰذا اُس کی تجدیدِ آفرینش کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کلمہ " تقلبون " سے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ سرائے آخرت میں انسان اس طرح دگرگوں اور منقلب ہو جائے گا کہ اُس کا باطن ظاہر ہو جائے گا۔ اور اس کے دل کے بھید آشکارا ہو جائیں گے۔ سورۂ طارق کی آیت ۹ " یوم تبلی السرائر " (وہ دن جب کہ دل کے بھید کھل جائیں گے) ان معنی سے ہم آہنگ ہے۔

٭ ٭ ٭

اس بحث کو مکمل کرتے ہُوئے کہ عذاب اور رحمت خدا کے اختیار میں ہے اور سب لوگوں کو اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ اضافہ

کیا گیا ہے: اگر تم یہ خیال کرو کہ تم خدا کی حکومت سے باہر نکل جاؤ گے اور اُس کا دستِ عدالت تمہارا گریبان نہ پکڑے گا۔ تو تم سخت غلطی پر ہو۔ کیونکہ تم خدا کے ارادے پر ہرگز غالب نہیں آسکتے اور اُس کے دائرۂ اختیار سے زمین یا آسمان میں فرار نہیں کر سکتے: (وما انتم بمعجزین فی الارض ولا فی السّمآء)[1]

اور اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی سرپرست اور مددگار اُس وقت تمہاری یاوری کرے گا تو یہ بھی محض غلط فہمی ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے خدا کے علاوہ کوئی ولی اور یاور نہیں ہے: (وما لکم من دون اللہ من ولیّ ولا نصیر) ۔

درحقیقت خدا کے عذاب سے اُسی وقت نجات مل سکتی ہے کہ یا تو تم اُس کی حکومت سے باہر نکل جاؤ۔ یا اُس کے دائرۂ فرمان روائی میں رہ کر دُوسروں کا سہارا لے کر اپنے آپ کو بچاؤ مگر نہ تو اُس کی سلطنت سے باہر نکلنا ممکن ہے (کیونکہ ہر مقام پر اُسی کی حکومت ہے اور تمام عالمِ ہستی اُسی کا وسیع مُلک ہے) اور نہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ اُس کی قدرت کے مقابلے میں عَلَمِ اختیار بلند کرے یا کوئی تمہاری مدافعت کر سکے۔

دو سوال اور ان کا جواب ؛

پہلا سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کو مدِّ نظر رکھتے ہُوئے کہ اس آیت میں مُشرکین اور کفّار سے خطاب ہے اور یہ لوگ زمین کے ساکن ہیں تو یہ کہنا کہ " ولا فی السّمآء " کیا معنی رکھتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک طرح کی تاکید اور مبالغہ ہے۔ یعنی تم نہ تو حدودِ زمین میں خدا کے احاطۂ قُدرت سے نکل سکتے ہو اور نہ آسمانوں میں۔ یعنی بالفرض اگر تم اتنی قدرت رکھتے ہو کہ آسمان پر چڑھ جاؤ تو پھر بھی اُس کے دائرۂ قدرت ہی میں رہو گے۔ یا یہ کہ نہ تو تم اہلِ زمین کے وسیلے سے خُدا کو اُس کی مشیت میں عاجز کر سکتے ہو اور نہ اپنے اُن معبودوں کے وسیلے سے جنہیں تم سمجھتے ہو کہ وہ آسمانوں میں ہیں۔ جیسے فرشتے یا جنات (البتہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے) ۔

دُوسرا سوال یہ ہے کہ " ولی " اور " نصیر " میں کیا فرق ہے؟

علّامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ " ولی " وہ ہے جو بغیر درخواست کے انسان کی مدد کرے۔ لیکن " نصیر " عمومیت رکھتا ہے۔ وہ کبھی درخواست پر اور کبھی بغیر درخواست کے مدد کرتا ہے۔ ان دونوں کلمات کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ " ولی " وہ سرپرست ہے جو بدون تقاضا مدد کرتا ہے اور " نصیر " اُس فریاد رس اور یاور کو کہتے ہیں جو طلب اور درخواست کے بعد انسان کی مدد کرتا ہے۔

اس عنوان سے قرآن میں ان مجرموں کے لیے مجازاتِ الٰہی سے فرار کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

٭ ٭ ٭

خُدا آیت مابعد میں بطور قطع فرماتا ہے کہ: جو لوگ آیاتِ الٰہی اور اُس کی لقا کے مُنکر ہُوئے وہ میری رحمت سے مایوس ہیں:

---

[1] " معجزین " کا مادّہ " عجز " ہے۔ اس کے معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے کے ہیں۔ لہٰذا ناتوانی کے وقت (جو کہ پیچھے رہ جانے کا باعث ہوتی ہے) اس کلمہ کو استعمال کرتے ہیں۔ بیہودہ شخص ہے جو دُوسرے کو عاجز کر دے اس لیے جو آدمی کسی کی قلمروِ قدرت سے بھاگ کر اُسے اپنا پیچھا کرنے سے عاجز کر دیتا ہے اسے بھی معجز کہتے ہیں

(والّذین کفروا بآیات اللّٰہ ولقائہ اولٰٓئک یئسوا من رحمتی)۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ اُن کے لیے دردناک عذاب ہے: (واُولٰٓئک لھم عذابٌ الیم)

یہ عذاب الیم رحمتِ خدا سے مایوس ہونے کا لازمہ ہے۔

"آیات اللّٰہ" یا "آیات تکوینی" سے نظامِ آفرینش میں عظمتِ الٰہی کے آثار مُراد ہیں۔ اِس صُورت میں اِن کلمات سے اشارہ مسئلۂ توحید کی طرف ہوگا۔ جبکہ "لقائہ" سے اشارہ مسئلہ معاد کی طرف ہے۔

یعنی مُنکر مبداٗ بھی ہیں اور مُنکرِ معاد بھی۔

یا ـ "آیات اللّٰہ" سے آیاتِ تشریعی مُراد ہیں۔ یعنی وُہ آیات جو خدا نے اپنے پیغمبروں پر نازل کیں۔ جن میں: مبداٗ و معاد اور نبوّت کا ذکر ہے۔ اِس صُورت میں کلمہ "لقائہ" اِسی طرح کی تعبیر ہے جیسے خاص کے بعد عام کا ذکر کیا جائے۔

اِس کا امکان بھی ہے کہ "آیاتِ اللّٰہ" سے وہ تمام آیاتِ الٰہی مُراد ہوں جو عالمِ آفرینش اور احکاماتِ تشریعی میں ہیں۔

اِس نکتہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ "یئسوا" (وہ مایوس ہوگئے) فعل ماضی ہے۔ ہر چند کہ مقصُودِ کلام زمانہ آئندہ یعنی روزِ قیامت ہے کیونکہ عربوں کا شیوۂ کلام یہ ہے کہ وہ حادثہ آئندہ، جو سو فیصد حتمی الوقوع ہو اُس کے لیے فعل ماضی استعمال کرتے ہیں۔

۲۴۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

۲۵۔ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

۲۶۔ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّىْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

۲۷۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

ترجمہ

۲۴۔ لیکن اُس (ابراہیم) کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُسے قتل کردو یا جلا دو۔ مگر خُدا نے اُسے آگ سے نجات بخشی اور اس واقعے میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۲۵۔ (ابراہیم نے) کہا : تم نے خدا کو چھوڑ کر اپنے لیے بُتوں کو انتخاب کیا ہے تاکہ یہ تمہارے لیے دُنیا کی زندگی میں محبّت اور دوستی کا سبب ہوں مگر تم بروز قیامت ایک دُوسرے کی دوستی سے انکار کردوگے ۔اور ایک دُوسرے پر لعنت بھیجوگے۔ اُس روز تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور کوئی تمہارا مدد گار نہ ہوگا۔

۲۶۔ پس اُس (ابراہیم) پر لُوط ایمان لایا۔ اور (ابراہیم نے) کہا : میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں بے شک وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۲۷۔ اور ہم نے اُسے اسحٰق اور یعقوب عطا کیا اور اُس (ابراہیم) کے خاندان میں نبوّت اور کتاب عطا کی اور دُنیا میں اُس کا اَجر دیا اور وُہ آخرت میں صالحین میں سے ہوگا۔

تفسیر

حضرتِ ابراہیمؑ کو مُستکبرین کا طرزِ جواب :

اَب ہم اس مقام پر ہیں کہ یہ دیکھیں کہ اس گُم راہ قوم نے حضرت ابراہیمؑ کے اُن تین دلائل کا جو توحید، نبوّت اور معاد کے متعلق تھے کیا جواب دیا۔ اُن کے پاس کوئی مُدلّل جواب تو تھا نہیں لہٰذا اُنھوں نے دیگر تمام منہ زور بے منطق بدمعاشوں کی طرح اپنی شیطانی طاقت کا سہارا لیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو قتل کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ جیساکہ قرآن میں فرمایاگیا ہے : ابراہیم کی قوم کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ اسے (ابراہیم کو) قتل کردو یا جلا دو۔ (فما کان جواب قومہٖ الّا ان قالوا اقتلوہ او حرقوہ)۔

قرآن کے اِس طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کی تو یہ رائے تھی کہ ابراہیم کو جلا دیا جائے اور کچھ یہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ اُنھیں تلوار یا کسی اور ذریعے سے قتل کر دیا جائے۔ آخر کار، پہلے گروہ کی رائے مان لی گئی کیونکہ وہ قوم یہ سمجھتی تھی کہ کسی کو مارنے کا بدترین طریقہ یہی ہے کہ اُسے جلا دیا جائے۔ اِس مقام پر یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ابتداً میں اُس قوم کے لوگ حضرت ابراہیمؑ کو عام طریقے سے قتل کرنا چاہتے تھے مگر بعد میں وہ سب اس پر متفق ہوگئے کہ اُنھیں جلا دیا جائے اور اُنھیں شدید ترین عذاب دیا جائے۔

اس آیت میں یہ ذکر نہیں آیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں کس طرح جلایا گیا تھا۔ ہم اس جگہ صرف یہ پڑھتے ہیں کہ خُدا نے اُنھیں آگ سے نجات بخشی۔ (فانجٰہُ اللّٰہُ من النار)۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کی تفصیل سُورۂ انبیاء کی آیات ۶۸ تا ۷۰ میں مذکور ہے۔ جس پر ہم نے تفسیر نمونہ کی تیرھویں جلد میں مفصّل بحث کی ہے۔

آیت کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ اس ماجرے میں ایمان لانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں: (انّ فی ذٰلک لاٰیٰتٍ لقومٍ یؤمنون)

صرف ایک نشانی ہی نہیں بلکہ اِس واقعے میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ روشن معجزہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جسم پر آگ کا اثر نہ ہوا۔ (اور جیساکہ مشہور ہے) آگ گلستان میں تبدیل ہوگئی۔ یہ دوسرا معجزہ تھا۔

تیسرا معجزہ یہ تھا کہ وہ زبردست اقتدار کے حامل لوگ ایک ایسے فرد کے مقابلے میں جس کا ہاتھ ہر وسیلۂ ظاہری سے خالی تھا

قطعی عاجز اور ناتواں ثابت ہوئے۔

اِس عجیب غیر معمولی حادثے کا اُن سیاہ دلوں کی طبیعت پر کچھ اثر نہ ہونا، یہ بھی قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی ہے۔ وہ یوں کہ خدا نے اِس مُعاند اور مخالفِ حق قوم کے افراد سے توفیقِ خیر کو اس طرح سَلب کر لیا تھا کہ بڑی سے بڑی نشانیوں کا بھی اُن پر اثر نہ ہوتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ ۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں پھینکا گیا تو جو چیز جلی وہ صرف وہی رسّی تھی جس سے آپ کو باندھا گیا تھا[1]

ہاں، ٹھیک ہے کہ اُن دُشمنانِ حق کی آتشِ جُرم و جہالت نے اُن چیزوں کو جلا دیا جس میں حضرت ابراہیمؑ کو قید کیا گیا تھا اور وہ آزاد ہوگئے۔ اور یہ بھی ایک نشانی ہے۔ شاید اِن وجُوہ کی بنا پر ۔ حضرت نوحؑ اور بذریعہ کشتی اُن کی نجات کے قصّے میں "جعلناھا اٰیۃ" بصُورتِ مفرد، کہا گیا ہے اور اِس مقام پر " لاٰیٰت " بصُورتِ جمع آیا ہے۔

بہرحال حضرت ابراہیمؑ نے اُس آگ سے بہ لطفِ الٰہی معجزانہ طور پر نجات پائی۔ اُس کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ آپ اپنے مقاصدِ نبوّت اور ہدایت کی تبلیغ سے دست بردار نہیں ہُوئے بلکہ اس کے برعکس آپ نے اور بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے تبلیغ شروع کر دی حضرت ابراہیمؑ نے اپنی مُشرک قوم سے کہا : تم نے خُدائے برحق کو چھوڑ کر اپنی عبادت کے لیے بُتوں کو اختیار کر لیا ہے تاکہ وہ دُنیاوی زندگی میں تمہارے درمیان دوستی اور محبّت کا سبب بنیں لیکن تم متنبہ رہو کہ بروزِ قیامت تمہارا باہمی رشتۂ محبّت بالکل منقطع ہو جائے گا اور تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کر دے گا اور تم آپس میں ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کروگے۔ پس تم سب کا مقام جہنّم ہے۔ اُس روز تمہارا کوئی بھی مدد گار نہ ہوگا: (وقال انّما اتخذتم من دُون اللّٰہ اوثانًا مودّۃ بینکم فی الحیٰوۃ الدّنیا ثمّ یوم القیامۃ یکفر بعضکم ببعضٍ ویلعن بعضکم بعضًا ومأوٰکم النّار وما لکم من ناصرین)[2]۔

بُتوں کا انتخاب بُت پرستوں کے درمیان مؤدّت کا سبب کس طرح ہوتا تھا؟

اس سوال کا چند پہلوؤں سے جواب دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر قوم یا قبیلہ جب ایک ہی بُت کی پرستش کرتا تھا تو اُن میں باہمی وحدت اور یگانگت کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

یہاں یہ اَمر ملحوظ رہے کہ اُس زمانے میں ہر قوم اور ہر قبیلے کا ایک منصُوص بُت ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب میں زمانۂ جاہلیّت میں ہر بُت کسی شہر یا قبیلے سے منسُوب تھا۔ " اُن میں سے بُت " عُزّیٰ " خصوصاً قریش سے منسُوب تھا ۔" لات " قبیلۂ ثقیف کا ۔ اور ۔ " منات " اوس و خزرج کا تھا[3]

دُوسرے یہ کہ بُتوں کی پرستش اُس قوم کا اُن کے اَجداد اور بزرگوں سے تعلق قائم رکھتی تھی۔ غالباً دینِ حق کو قبول نہ کرنے کے لیے

---

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۰، صفحہ ۱۳۰۔

[2] " مودّۃ بینکم " کے منصُوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ " لاجلہ " کا مفعول ہے۔ اِس ضمن میں مفسّرین نے اور بھی احتمالات بیان کیے ہیں۔

[3] سیرت ابن ہشام ج ۱ صفات ۸۶-۸۷۔

اِسی وجہ سے وہ یہ عذر کرتے تھے کہ یہ بُت ہمارے بزرگوں کی یادگاریں ہیں. اور ہم اُن ہی کی پیروی کرتے ہیں ۔

علاوہ بریں کفّار کے سردار اور بزرگ اپنے پیروؤں کو بُتوں کی پرستش کی ترغیب دیتے تھے ۔ اور اُن سردارانِ قوم اور ان کے پیروؤں کے درمیان یہی حلقۂ اتصال تھا۔

لیکن قیامت میں یہ تمام بوچ اور کمزور رشتے منقطع ہو جائیں گے اور ہر آدمی اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالے گا اور اُس پر لعنت اور نفرین کرے گا اور اس کے عمل سے اظہارِ بیزاری کرے گا۔ حتّٰی کہ اُن کے وہ معبود (بُت) جن کے متعلق اُن کا خیالِ خام یہ تھا کہ وہ اُن کے لیے خُدا سے ارتباط کا وسیلہ ہیں اور جن کی بابت وہ یہ کہا کرتے تھے :

مانعبدھم الّا لیقربونا الی اللّٰہ زلفٰی

ہم تو اُن کی محض اِس لیے پرستش کرتے تھے کہ وہ ہمیں خدا سے نزدیک کر دیں گے۔ (زمر۔ ۳)

بروزِ قیامت یہ پرستار اُن سے بھی اظہارِ بیزاری کریں گے ۔

جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۸۲ میں ہے :

کلّا سیکفرون بعبادتھم ویکونون علیھم ضدًّا

وہ معبودانِ باطل بہت جلد اپنے پُجاریوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور اُن کے مخالف ہو جائیں گے ۔

اور بروزِ قیامت ایک دوسرے کے انکار، ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز مشرکین ایک دُوسرے سے بیزاری کریں گے اور وہ چیز جو دُنیا میں اُن کی بے اصل و بے بُنیاد محبّت کا سبب تھی وہ آخرت میں اُن کے لیے باہمی عداوت او بُغض کا باعث بن جائیں گی ۔ جیسا کہ سُورۂ زخرف کی آیت ۶۷ میں فرمایا گیا ہے :

اَلاخلّاءُ یومئذٍ بعضھم لبعضٍ عدوٌّ الّا المتّقین

اُس روز دوست ایک دُوسرے کے دُشمن ہو جائیں گے۔ مگر پرہیزگار (نہیں ہوں گے)۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف بُت پرستوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ وُہ تمام لوگ بھی اس میں شامل ہیں، جنھوں نے دُنیا میں باطل امام اور باطل پیشوا چُنا ہے اور اس کی پیروی کرتے ہیں اور اُس سے پیمانِ مودّت باندھتے ہیں۔ یہ سب بھی قیامت میں ایک دُوسرے کے دُشمن ہو جائیں گے اور ایک دُوسرے سے اظہارِ بیزاری کریں گے اور ایک دُوسرے پر لعنت کریں گے ۔[1]

مومنین کا باہمی پیوندِ محبّت جس کی بُنیاد اس دُنیا میں توحید، خدا پرستی اور اطاعتِ فرمانِ حق پر ہے ، وہ ہمیشہ برقرار رہے گا اور وہاں اور زیادہ محکم ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بروزِ قیامت مومنین ایک دُوسرے کے لیے استغفار و شفاعت کریں گے۔ جب کہ مشرکین ایک دُوسرے پر لعنت کرنے میں مشغول ہوں گے۔[2]

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد کی آیت ۲۶ میں حضرت لُوطؑ کے ایمان لانے کا ذکر ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ، لُوط ابراہیم پر ایمان لائے :

[1] اصول کافی نقل شدہ مطابق تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۵۲
[2] کتاب توحید شیخ صدوق نقل شدہ مطابق نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۵۴

(فاٰمن لہٗ لوطٌ) ۔

حضرت لُوط خُود پیغمبرانِ بزرگ میں سے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے قریبی رشتہ دار تھے (کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے بھانجے تھے)۔ اگر ایک مردِ بزرگ کسی پیغمبر پر ایمان لائے اور اُس کے احکام کی پیروی کرے تو اس کا ایمان لانا ایک اُمت و ملت کے ایمان لانے کے مترادف ہے ۔ خدا نے یہاں خصوصیّت سے حضرت لُوط کے ایمان لانے کا ذکر کیا ہے جو ایک عظیم شخصیت حضرت ابراہیمؑ کے معاصر تھے تاکہ یہ امر واضح ہو جائے کہ جب ایسا شخص ایمان لے آیا تو اذل النّاس کا ایمان نہ لانا کچھ اہمیّت نہیں رکھتا ۔

البتہ یہ قیاس ہوتا ہے کہ شہرِ بابل میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دل موجود تھے ۔ جنھوں نے اُس معجزۂ عظیم کو دیکھ کر آپ کی اتباع کی ۔ مگر یقیناً وہ لوگ اقلیت میں تھے ۔

اِس کے بعد یہ اضافہ فرمایا گیا ہے : ابراہیم نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر رہا ہوں کیونکہ وہ عزیز و حکیم ہے :

(وقال انی مھاجرٌ الٰی ربّی انّہ ھو العزیز الحکیم) ۔

ظاہر ہے کہ جس وقت رہبرانِ الٰہی کسی مقام پر اپنا فرضِ رسالت انجام دیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ معاشرہ اور سارا ماحول اس قدر آلودہ بہ شرک و جہل ہے اور ظالموں کے دباؤ میں ہے کہ اُن کی دعوتِ حق کا اُس مقام پر پھیلنا ناممکن ہو گیا ہے تو وہ وہاں سے کسی اور جگہ ہجرت کر جاتے ہیں تاکہ اُس مقام پر دعوتِ الٰہی کو پھیلائیں ۔

اِس لیے حضرت ابراہیمؑ بھی شہرِ بابل سے حضرت لوطؑ اور اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر "خطۂ انبیا و توحید" یعنی ملکِ شام کی طرف سفر کر گئے تاکہ آپ وہاں ایک جماعت پیدا کر سکیں اور دعوتِ توحید کو وسعت دے سکیں[1] ۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ جُملہ کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں " قابلِ توجہ ہے آپ نے یہ جملہ اِس لیے کہا کہ یہ راہ، راہِ پروردگار، اُس کی رضا کی راہ اور راہِ دین و آئین تھی ۔

اگر فعل " قال " (کہا) کا مرجع حضرت لُوط ہوں ۔ یعنی یہ معنیٰ ہوں کہ " لُوط نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں" تو سیاقِ عبارت اِس مفہوم سے مربُوط ہے ۔ مگر تاریخی اور قرآنی شواہد یہ بتلاتے ہیں کہ " کہا " فعل میں ضمیرِ غائب کا مرجع حضرت ابراہیمؑ ہی ہیں اور حضرت لُوطؑ نے اُن کے ساتھ ہجرت کی تھی ۔

اِس قول کی تائید سورۂ صافات کی آیت ۹۹ سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے :

انّی ذاھبٌ الٰی ربّی سیھدین

مَیں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں اور وہ میری راہنمائی کرے گا ۔[1]

❖ ❖ ❖

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن چار نعماتِ الٰہی کا ذکر ہے جو خدا نے ہجرت کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو عطا کیں ۔ پہلی نعمت لائق اور محترم بیٹے تھے ۔ ایسے فرزند جنھیں یہ توفیق ارزانی ہوئی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں ایمان اور نبوّت کا چراغ روشن رکھ سکیں ۔

[1] حضرت ابراہیمؑ کے بابل سے ملکِ شام کو ہجرت کرنے کی تفصیلی بحث سُورہ انبیا کی آیت نمبر ۷۱ کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی جلد ۷ میں بیان ہوئی ہے

چنانچہ خدا فرماتا ہے : ہم نے اُسے اسحاق اور یعقوب بخشے ۔ (ووھبنالہ اسحٰق و یعقوب) ۔

یہ دونوں نہایت بزرگ اور لائق پیغمبر تھے ۔ اِن میں سے ہر ایک حضرت ابراہیمؑ کی راہ بُت شکنی پر چلتا رہا ۔

دُوسری نعمت یہ کہ نبوّت اور کتاب آسمانی خاندانِ ابراہیمؑ ہی کے اندر مخصوص ہوگئی : (وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب) ۔

صرف اسحاق و یعقوب (یعقوبؑ اسحاقؑ کے بیٹے تھے) ہی پیغمبر نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان میں رسالتمآب خاتم الانبیا تک رسالت کا سلسلہ جاری رہا ۔ اسی خاندان میں یکے بعد دیگرے بزرگ پیغمبر پیدا ہوتے رہے جنھوں نے دُنیا کو نُورِ توحید سے منوّر کیا ۔

تیسرے یہ کہ " ہم نے اُسے دُنیا میں بھی بدلہ دیا " :

(واٰتیناہ اجرہٗ فی الدنیا) ۔

اِس دُنیاوی اجر کا ذکر اشارتاً ہوا ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ مختلف اُمور کی طرف اشارہ ہو ۔ مثلاً نام نیک اور تمام اُمتوں میں آپ کا ذکرِ خیر بطور احترام ۔ کیونکہ تمام اُمتیں حضرت ابراہیمؑ کا ایک اولوالعزم پیغمبر کے طور پر احترام کرتی ہیں اور آپ کے وجُود پر فخر کرتی ہیں اور اُنھیں شیخ الانبیا کہتی ہیں ۔

نیز یہ کہ سرزمینِ مکّہ آپ کی دُعا سے آباد ہُوئی ۔ اور ہر سال مراسم حج ادا کرتے ہوئے تمام حجاج کے دل آپ کی طرف کھنچتے ہیں ۔ اور سب لوگ آپ کے پُرشکوہ ، ایمان آفریں اور نیک ارادوں کو یاد کرتے ہیں ۔ (یعنی خانۂ کعبہ کو دیکھ کر اُس کے بانی کی یاد آتی ہے) گویا کہ یہ بھی ایک اجر ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو دُنیا میں ملا ۔

چوتھا اجر یہ ہے کہ آخرت میں اُن کا شمار صالحین میں ہوگا : (وانہ فی الاٰخرۃ لمن الصالحین) ۔

اور یہ سب باتیں یکجا ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے لیے باعثِ افتخار ہیں ۔

چند اہم نکات

۱ ۔ عظیم ترین اِفتخار : جیسا کہ قُرآن کی بہت سی آیات سے ثابت ہوتا ہے کسی انسان کا صالحین میں شُمار ہونا اُس کے لیے مُنتہائے افتخار ہے ۔ اِس لیے پیغمبروں میں سے بہت سے خُدا سے تمنّا کرتے تھے کہ وُہ اُنھیں صالحین میں جگہ دے ۔

حضرت یُوسفؑ ظاہری شان و شوکت کے انتہائی مدارج پر پہنچنے کے بعد خدا سے یہ دُعا کرتے تھے ،

توفنی مسلمًا والحقنی بالصالحین

اے خُدا تو مجھے اس حالت میں موت دے کہ میں مُسلمان ہوں اور بعدِ مرگ تو مجھے صالحین سے ملحق کر دے ۔

(یوسف ـ ۱۰۱)

حضرت سلیمانؑ بھی اپنی پوری حشمت اور جاہ و جلال کے باوجود خدا سے یہ دُعا کرتے ہیں :

أدخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین

اے خدا ! تو مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں داخل کر ۔ (نمل ـ ۱۹)

حضرت شعیبؑ کا جب موسٰی سے عہد و پیمان ہوتا ہے تو فرماتے ہیں :

ستجدنی ان شاء اللہ من الصالحین

ان شاء اللہ تو مجھے صالحین میں سے پائے گا ۔ (قصص ـ ۲۷)

حضرت ابراہیمؑ بھی خدا سے یہی دُعا کرتے ہیں کہ اُن کا شمار زمرۂ صالحین میں ہو :

رب ھب لی حکمًا والحقنی بالصالحین) (شعرا ـ ۸۳)

حضرت ابراہیمؑ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ اُن کی اُولاد صالح ہو :

ربّ ھب لی من الصالحین (صافات ـ ۱۰۰)

قرآن شریف کی بہت سی آیات میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جب خدا پیمبرانِ بزرگ کی مدح کرتا ہے تو اُن کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ صالحین میں سے ہیں ۔

اِن کُل آیات کے مُطالعے سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ انسان کا عالی ترین مرتبہ کمال صالح ہونا ہے ۔

اَب سوال یہ ہے کہ " صالح ہونا " کیا معنی رکھتا ہے ؟

اُس کے معنی ہیں : اعتقاد و ایمان کے لحاظ سے عظمت و پاکیزگی ۔ اسی طرح عمل اور گفتار و اخلاق کے لحاظ سے بھی مُراد یہ ہے کہ مردِ صالح وہ ہے جو اپنی فکر ، کردار اور گفتار غرض ہر طرح سے نیک ہو ۔

" صالح " کی ضد " فاسد " ہے ۔ یہ واضح ہے کہ زمین پر فساد کرنے میں تمام ظلم و ستم اور تمام بداعمالیاں شامل ہیں ۔

قُرآن مجید میں کلمہ " صلاح " " فساد " کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے ۔ اور کبھی " سیئۃ " کے مقابلہ میں بھی آیا ہے ۔ جن کے معنی ہیں گناہ اور بدی ۔

۲ ۔ حضرت ابراہیمؑ پر خُدا کی عظیم برکات : بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ اِس آیت میں ایک لطیف نکتہ موجود ہے اور وُہ یہ ہے کہ :

خدا نے حضرت ابراہیمؑ کے تمام تکلیف دہ حالات کو اُن کی ضد میں تبدیل کر دیا ۔ چنانچہ

بابل کے بُت پرست یہ چاہتے تھے کہ اُنھیں آگ میں جلا دیں ۔ مگر وہ آگ اُن کے لیے گلزار ہوگئی ۔

وُہ مُشرک یہ چاہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی رفیق نہ ہو اور وہ تنہا رہیں ۔ مگر خدا نے اُنھیں ایسی جمعیّت اور کثرت بخشی کہ دُنیا اُن کی نسل سے بھر گئی ۔

اُن کے بعض نزدیک ترین رشتہ دار گمراہ اور بُت پرست تھے ۔ اُن میں سے " آزر " بھی تھا ۔ خدا نے اس کے عوض اُنھیں ایسے فرزند عطا کیے جو خود ہدایت یافتہ اور دوسروں کے لیے ہادی بھی تھے ۔

حضرت ابراہیمؑ اپنے ابتدائے حال میں مال و دولت نہ رکھتے تھے مگر اللہ نے اُنھیں عظیم مال و جاہ عطا کیا ۔

حضرت ابراہیمؑ شروع شروع میں ایک گمنام انسان تھے ۔ یہاں تک کہ بابل کے مُشرک جب اُن کا ذکر کرتے تھے تو کہتے تھے :

سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم

ہم نے سُنا ہے کہ ایک نوجوان بُتوں کی باتیں کرتا ہے ۔ لوگ اُس کا نام ابراہیم بتلاتے ہیں ۔

مگر خدا نے اُن کا نام ایسا روشن کیا اور اُنھیں ایسی شہرت بخشی کہ اُنھیں سردارِ انبیاءؑ اور سردارِ مرسلین کہا جاتا ہے[1]

[1] تفسیر فخرالدین رازی، کچھ فرق کے ساتھ۔

۲۸۔ وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۲۹۔ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

۳۰۔ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۸۔ (ہم نے لُوطؑ کو بھیجا) جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ تم سے پہلے دُنیا میں کسی نے یہ کام نہیں کیا۔

۲۹۔ کیا تم مردوں کے پیچھے جاتے ہو اور راہ نسلِ انسانی کو قطع کرتے ہو۔ اور اپنی مجلسوں میں بُرے اعمال انجام دیتے ہو۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اگر تو سچا ہے تو ہم پر خدا کا عذاب نازل کر دے۔

۳۰۔ (لُوطؑ نے) کہا : اے میرے ربّ ! تو اِس مفسد قوم کے مقابلے میں میری مدد کر۔

تفسیر

بے شرم گناہ گار :

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کا مختصر سا واقعہ بیان کرنے کے بعد اُن کے ہم عصر پیغمبر حضرت لُوطؑ کا کچھ قصہ بیان کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے : ہم نے لُوط کو مبعوث کیا۔ اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بہت ہی بُرا کام کرتے ہو۔ دُنیا میں کسی نے بھی

اس سے پہلے اس گناہ کا کام نہیں کیا : (ولوطا اذ قال لقومہ انکم لتأتون الفاحشۃ ماسبقکم بہا من احد من العالمین)[1]

"فاحشۃ" کا مادہ "فحش" ہے۔ اس کے وضعی معنی ہر وہ کام یا بات ہے جو نہایت نازیبا اور ناپسندیدہ ہو۔ اس مقام پر ہم جنسی اور لواطت کے لیے کنایہ ہے۔

"ماسبقکم بہا من احد من العالمین" سے خوب واضح ہوتا ہے کہ یہ گھٹیا اور شرمناک عمل عمومی اور قومی خصلت کی صورت میں اس سے قبل کسی قوم و ملت میں بھی موجود نہ تھا۔

قوم لوط کے حالات میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کے اس گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ نہایت بخیل تھے۔ چونکہ ان کے شہر شام کو جانے والے قافلوں کی راہ پر واقع تھے۔ انھوں نے بعض راہ گیروں اور مہمانوں کے ساتھ یہ عمل انجام دینے کی وجہ سے انھیں اپنے آپ سے متنفر کر دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ہم جنسی کے میلانات خود ان ہی میں قوی ہوگئے اور وہ لواطت کی دلدل میں پھنس گئے۔

بہرحال وہ لوگ نہ صرف اپنے گناہوں کا بار اٹھائیں گے بلکہ ان کے گناہوں کا بھی جو آئندہ ان کے عمل کی پیروی کریں گے (اس کے بغیر کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی ہو) کیونکہ جو آدمی بھی کسی گندی اور پلید رسم کی بنیاد رکھتا ہے، وہ اپنے مقلدین کی بداعمالی میں حصہ دار ہوتا ہے اور وہ لوگ اس رسم بد کے بانی تھے۔

❖ ❖ ❖

حضرت لوط نے اس کے بعد اپنے مقصد کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا اور کہا کہ آیا تم مردوں کے پیچھے جاتے ہو: (ائنکم لتأتون الرجال)۔

اور کیا تم نسل انسانی کی بقا کی راہ کو قطع کرتے ہو: (وتقطعون السبیل)[2]

اور کیا تم اپنے ان مقامات پر جہاں تم جمع ہوتے ہو برے اعمال کے مرتکب ہوتے ہو: (وتأتون فی نادیکم المنکر)۔

کلمہ "نادی" کا مادہ "ندا" ہے۔ اس کے معنی ہیں مجلس عمومی۔ اور کبھی تفریح گاہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایسے مقام پر لوگ جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دیتے اور پکارتے ہیں۔

قرآن میں اس کی کوئی تفصیل موجود نہیں کہ وہ اپنی محفلوں میں کون سے برے اعمال کا ارتکاب کرتے تھے۔ لیکن بدون اظہار ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کچھ ایسے کام تھے جو ان کی بدکاریوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جیسا کہ بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ وہ آپس میں فحش اور رکیک الفاظ کا رد و بدل کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی کمر ٹھونکتے تھے، جوا کھیلتے تھے۔ بچگانہ کھیل کھیلتے تھے۔ بالخصوص ایک

---

[1] "لوطا" ممکن ہے کہ "نوحا" پر عطف ہو۔ اس بنا پر "ارسلنا" کا مفعول ہوگا۔ بعض لوگوں نے لوطا کو فعل مقدر "اذکر" کا مفعول سمجھا ہے۔

[2] بعض مفسرین نے "تقطعون السبیل" کی تفسیر میں اور بھی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ اس قوم کی تاریخ پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس قوم نے قافلوں کا راستہ روک دیا تھا۔ کیونکہ اہل کاروان کے لیے اس قوم کے شر سے بچنے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ غیر معروف راستے سے چلیں تاکہ ان کے ہاتھ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ وہ قافلوں کو لوٹتے تھے لیکن ہم نے پہلے جو تفسیر بیان کی وہ مناسب تر ہے۔ کیونکہ تحریم لواطت کے مصالح میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نسل انسانی کے قطع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

دوسرے کو اور راہ گیروں کو سنگریزے مارتے تھے، آلات موسیقی بجاتے تھے اور سارے مجمع کے سامنے برہنہ ہو جاتے تھے۔[1]

جناب رسول خدا سے ایک حدیث مروی ہے جس کی راوی ام ہانی ہیں کہ جب آپ سے " وتأتون فی نادیکم المنکر" کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

کانوا یخذفون من یمر بھم ویسخرون منہ

جو کوئی ادھر سے گزرتا وہ اسے سنگریزے مارتے تھے اور اس سے مذاق کرتے تھے۔[2]

اب اس پر غور کیجیے کہ حضرت لوط کے پیغام حق کے جواب میں اس گمراہ اور بے شرم قوم کا کیا جواب تھا؟

قرآن میں یہ ذکر ہے کہ: ان کے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہ تھا:

اگر تو سچا ہے تو ہمارے لیے خدا کا عذاب لے آ: (فما کان جواب قومہ الا ان قالوا ائتنا بعذاب اللہ ان کنت من الصادقین)۔

ان ہوس بازوں نے، جو کہ عقل و شعور سے محروم تھے، یہ بات حضرت لوط کی معقول اور مدلل دعوت کے جواب بطور مذاق کہی تھی۔

اس جواب سے یہ بھی مترشح ہے کہ حضرت لوط نے مدلل باتوں کے علاوہ انھیں یہ بھی تنبیہ کی تھی کہ اگر تم اسی باطل روش پہ چلتے رہے تو تم پر خدا کا دردناک عذاب نازل ہوگا۔ لیکن انھوں نے راہ ہدایت کی باتوں کو تو چھوڑ دیا اور صرف اسی آخری بات کا جواب دینے لگے۔ اور وہ بھی استہزا اور تمسخر کے طور پر۔

سورہ قمر کی آیت ۳۶ میں اسی مفہوم کے مانند بیان ہے:

ولقد انذرھم بطشتنا فتماروا بالنذر

لوط نے اپنی قوم کو ہمارے عذاب سے ڈرایا۔ مگر وہ ڈرانے والوں سے لڑنے لگے۔

اس گمراہ قوم کا یہ قول یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے، عذاب نازل نہ ہونے کی صورت میں یہ ثابت کریں کہ حضرت لوط دروغ گو ہیں۔ حالانکہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ گناہ گار ترین اقوام کو بھی تجدید نظر اور اپنی اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔

یہ وہ مقام تھا کہ حضرت لوط بالکل بے بس ہوگئے اور درگاہ الٰہی میں غم و اندوہ سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ عرض کی: خدایا! تو مجھے اس مفسد قوم پر فتح عنایت فرما: (قال رب انصرنی علی القوم المفسدین)۔

یہ وہ قوم ہے جس نے زمین کو فساد اور تباہی سے بھر دیا ہے۔ انھوں نے اخلاق اور تقویٰ کو برباد کر دیا ہے۔ عفت اور پاکدامنی سے منہ موڑ لیا ہے۔ عدل اجتماعی کو روند ڈالا ہے۔ شرک و بت پرستی میں فساد اخلاق اور ظلم و ستم بھی شامل کر لیا ہے اور نسل انسانی کو فنا اور نیستی کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ خدایا! تو ان مفسدین پر مجھے کامیابی عنایت فرما۔

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۵۱۷۔

[2] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

ہم جنسی کا رُجحان بدترین لعنت ہے :

ہم جنسی خواہ مردوں کے درمیان ہو (لواطت) یا عورتوں کے (مساحقہ) وہ اُن بدترین انحرافات اخلاقی میں سے ہے جو معاشرے میں مفاسد کا سرچشمہ ہیں۔

اصولاً قدرت نے زن و مرد کے مزاج کو اس طرح خلق کیا ہے کہ اُنھیں جنس مخالف سے تعلق پیدا کرنے میں آسودگی و نفسیاتی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اِس صورت کے علاوہ انسان میں جو بھی جنسی میلان پیدا ہوتا ہے وہ انسان کی طبع سلیم سے انحراف اور ایک قسم کی نفسیاتی بیماری ہے۔ اگر اس میلان کو روکا نہ جائے تو وہ روز بروز شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی جنس مخالف کی طرف میلان خاطر نہیں رہتا اور وہ پھر جنس موافق ہی سے غیر فطری آسودگی حاصل کرنے لگتا ہے۔

اس قسم کے باہمی نامشروع تعلقات انسان کے نظام جسمانی حتیٰ کہ اس کے سلسلۂ اعصاب اور اس کی نفسیاتی کیفیت کو متاثر کرتے ہیں اور جب یہ میلان عادت بن جاتا ہے تو مرد کو ایک کامل مرد اور عورت کو ایک کامل عورت بننے سے روک دیتا ہے۔ اس طرح سے کہ اس قسم کے ہم جنس باز مرد یا عورتیں شدید ضعف جنسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنی اولاد کے لیے اچھے ماں باپ ثابت نہیں ہوتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں تولید نسل کی قابلیت ہی نہیں رہتی۔

ہم جنسی کے میلان سے لوگوں میں بتدریج یہ نفسیاتی مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خلوت پسند ہو جاتے ہیں، مجمع سے گھبرانے لگتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں نفسیاتی تضاد کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوں تو مختلف قسم کی جسمانی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے ان ہی اخلاقی اور اجتماعی دلائل کی بنا پر ہم جنسی کو ہر شکل اور ہر صورت میں حرام کیا ہے اور اس کے لیے بڑی سخت سزا مقرر کی ہے (جس کی حد کبھی موت تک پہنچتی ہے)۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ اِس زمانے کی متمدن دُنیا کی بے لگامی اور تنوع طلبی بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں میں نفسیاتی فساد پیدا کر دیتی ہے۔ لڑکوں میں ناموزوں اور زنانہ لباس پہننے اور خود آرائی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور لڑکیوں میں مردانہ لباس زیب تن کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہیں سے نفسیاتی انحراف اور میلان ہم جنسی جنم لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اِس رُجحان اور ایسے قبیح ترین اعمال کو قانونی شکل دے دی جاتی ہے اور اِسے ہر قسم کی سزا اور تعقیب سے بَری سمجھتے ہیں اِن حالات کی شرح لکھتے ہُوئے قلم کو شرم آتی ہے[1]

[1] اسلام میں ہم جنس پرستی کی حُرمت اور فلسفۂ حُرمت کے سلسلے میں تفصیلی بحث تفسیر نمونہ کی جلد ۵ میں سُورۂ ہُود کی آیت ۸۱ کے ذیل میں کی جا چکی ہے۔

۳۱۔ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرٰهِيمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُوا أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظٰلِمِينَ ۝

۳۲۔ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا ۚ قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا ۚ لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ ۚ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِينَ ۝

۳۳۔ وَلَمَّا أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۚ إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِينَ ۝

۳۴۔ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلٰى أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝

۳۵۔ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَا آيَةً ۚ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ۝

ترجمہ

۳۱۔ اور جب ہمارے بھیجے ہُوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے تو (بیٹے کے تولد کی بشارت دیتے ہُوئے) اُنھوں نے کہا کہ ہم (قوم لُوط کی) اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے باسی ظالم ہیں۔

۳۲۔ (تو ابراہیم نے) کہا: اس بستی میں تو لُوط بھی ہے۔ تو اُنھوں نے کہا کہ جو لوگ اِس بستی میں رہتے ہیں ہمیں خُوب معلوم ہے۔ ہم اُسے اور اُس کے گھر والوں کو بچا لیں گے۔ سوائے اُس کی بیوی کے کہ وہ

اِس قوم میں باقی رہ جائے گی۔

۳۳۔ اور جب ہمارے فرستادگان لُوط کے پاس آئے تو وہ اُنھیں دیکھ کر غمگین ہوگئے تو اُنھوں نے کہا : ڈرو نہیں اور غم نہ کھاؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچا لیں گے۔ سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ قوم میں باقی رہ جائے گی۔

۳۴۔ ہم اِس بستی کے باسیوں پر اُن کی بدکاری کے باعث آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

۳۵۔ ہم نے اُس آبادی کی ایک کھلی ہُوئی نشانی اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دی ہے۔ جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر

گناہ گاروں کا انجام :

آخر کار حضرت لُوطؑ کی دُعا مستجاب ہوئی اور خدا کی طرف سے اس قوم تباہ کار کے خلاف سخت سزا کا حکم صادر ہُوا۔ وہ فرشتے جو عذاب نازل کرنے پر مامور تھے قبل اس کے کہ سرزمین لُوط پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے جاتے، حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک اور پیغام لے کر گئے اور وہ پیغام تھا حضرت ابراہیمؑ کے فرزند کی پیدائش کی خوشخبری۔ زیرنظر آیات میں اوّل فرشتوں کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کا ذکر ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے : جس وقت ہمارے ایلچی حضرت ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر گئے (اُنھیں اسحاق اور یعقوب کے پیدا ہونے کی خوش خبری سُنائی) اور پھر (قومِ لُوط کی بستی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے) کہا کہ ہم اِس شہر اور اس میں بسنے والوں کو ہلاک کر دیں گے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں: (ولما جآءت رسلنآ ابراھیم بالبشرٰی قالوآ انا مھلکوآ اھل ھٰذہ القریۃ ان اھلھا کانوا ظالمین)۔

چونکہ فرشتوں نے "ھٰذہ القریۃ" کہا۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومِ لُوط کی آبادی اُس مقام کے قرب وجوار ہی میں تھی جہاں حضرت ابراہیمؑ رہتے تھے۔

اور اُس قوم کو لفظ "ظالم" سے یاد کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے کیونکہ اُنھوں نے شرک، فسادِ اخلاق اور بے عفتی کی راہ اختیار کی تھی۔ نیز یہ کہ وُہ دُوسروں پر بھی ظلم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُس طرف سے گزرنے والے مُسافروں اور قافلوں پر بھی ستم کرتے تھے۔

❖ ❖ ❖

جب حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات سُنی تو اُنھیں حضرت لُوط پیمبرِ خُدا کی فکر ہُوئی اور کہا : اس آبادی میں تو لوط بھی ہے: (قال انّ فیھا لُوطًا)۔ اُس پر کیا گزرے گی ؟

مگر فرشتوں نے فوراً جواب دیا : آپ فکر نہ کریں ہم اُن سب لوگوں سے خُوب واقف ہیں جو اس بستی میں رہتے ہیں: (قالوا نحن اعلم بمن فیھا)۔

ہم اندھا دُھند عذاب نازل نہیں کریں گے۔ ہمارا پروگرام نہایت سنجیدہ اور نپا تُلا ہے۔

فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ ہم لُوط اور اس کے خاندان کو نجات دیں گے۔ بجز اُس کی بیوی کے کہ جو اُس قوم کے ساتھ ہی مُبتلائے عذاب ہوگی: (لننجینّہٗ واھلہٗ الّا امرأتہٗ کانت من الغابرین)۔

اِس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اُس علاقے کی تمام آبادیوں اور بستیوں میں صرف ایک ہی خاندان مومن اور پاک نفس تھا اور خُدا نے بھی اسے عذاب سے نجات دی۔ جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیت ۳۶ میں مذکور ہے :

فما وجدنا فیھا غیر بیتٍ من المسلمین

ہم نے وہاں ایک خاندان کے سوا کوئی بھی مُسلمان نہ پایا۔

یہاں تک کہ حضرت لُوطؑ کی زوجہ بھی مومنین کی صف سے خارج تھی اس لیے وہ بھی عذاب میں محشور ہوئی۔

کلمہ "غابرین" "غابر" کی جمع ہے۔ اِس کے وضعی معنی یہ ہیں کہ راہِ سفر میں کسی کے رُفقائے کارسفر تو آگے نکل جائیں اور وہ پیچھے رہ جائے۔

وُہ عورت جو خانوادۂ نبوّت میں شامل تھی اُسے تو "مؤمنین اور مُسلمین" سے جُدا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وُہ اپنے کفر و شرک اور بُت پرستی کی وجہ سے اِس صنف سے جُدا ہوگئی۔

اِس طرزِ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عورت منحرف العقیدہ تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ اُس میں یہ بدعقیدگی اُس مشرک معاشرے کے اثر سے پیدا ہوگئی ہو اور ابتدا میں مومن و موحد ہو۔ اِس صُورت میں حضرت لُوطؑ پر یہ اعتراض نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے ایسی مُشرکہ سے نکاح ہی کیوں کیا تھا ؟

یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اگر کچھ اور لوگ حضرت لُوطؑ پر ایمان لائے ہوں گے تو وہ حتماً نزولِ عذاب سے پہلے اُس گناہ آلود زمین سے ہجرت کر گئے ہوں گے۔ تنہا حضرت لوطؑ اور اُن کے عیال اُس مقام پر اِس توقع سے اخیر وقت تک ٹھہرے ہوں گے کہ ممکن ہے اُن کی تبلیغ اور ڈرانے کا لوگوں پر اثر ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیمؑ کو یہ شک تھا کہ عذابِ الٰہی حضرت لوطؑ کو بھی گھیر لے گا ؟ اِسی لیے تو اُنھوں نے فرشتوں کے سامنے لوطؑ کے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور اُنھوں نے اطمینان دلایا کہ لُوط اِس بلا سے محفوظ رہیں گے۔

اِس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جانتے تو سب کچھ تھے مگر اُنھوں نے ــــ صرف اپنے اطمینانِ قلب کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ چنانچہ اسی پیغمبر بزرگ کا ایک ایسا ہی اور واقعہ مسئلہ معاد کے متعلق ہے۔ جب کہ خدا نے پرندوں کو زندہ کر کے معاد کا منظر اُن کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

لیکن مفسّر بزرگ علّامہ طباطبائی کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا مقصد یہ تھا کہ یہ کہہ کر کہ "لُوط بھی اُن میں ہے" لُوط کے وجُود کو اُس قوم سے رفعِ عذاب کی دلیل قرار دیں۔ نیز سُورۂ ہُود کی آیت ۷۴ - ۷۶ سے بھی اِس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ اِس قوم کی سزا میں تاخیر ہو جائے تو ممکن ہے کہ اُن کے قلوب نُورِ ہدایت سے منوّر ہو جائیں۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کو یہ جواب مِلا کہ آپ اِس امر میں اصرار نہ کیجئے۔ اُن کی حالت اِس لیت و لعل سے گزر چکی ہے اور اُن کی سزا کا قطعی وقت آگیا ہے۔[1]

[1] المیزان : جلد ۱۶، صفحہ ۱۲۹۔

لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس مقام پر فرشتوں نے حضرت لوطؑ اور اُن کے خاندان کی نجات کے متعلق جو جواب دیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات کا موضوعِ سخن صرف حضرت لُوطؑ کی ذات ہی تھی لیکن رہیں سُورۂ ہُود کی آیات تو اُن کا مطلب کچھ اور ہی ہے۔ اور جیساکہ ہم نے کہا حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال محض اپنے مزید اطمینان کے لیے کیا تھا۔

✽ ✽ ✽

یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ سے فرشتوں کی گفتگو ختم ہوگئی اور وہ حضرت لوطؑ کے علاقے کی طرف روانہ ہوگئے۔
قرآن میں مذکور ہے کہ جس وقت ہمارے فرشتے لوطؑ کے پاس آئے تو وہ اُنھیں دیکھ کر غمگین اور پریشان ہوگیا: (ولمّآ ان جآءت رُسلنا لوطًا سیٓء بھم وضاق بھم ذرعًا)۔

حضرت لُوطؑ کا یہ اضطراب اس وجہ سے تھا کہ وُہ اُنھیں پہچانتے نہ تھے۔ وہ فرشتے خوبصورت جوانوں کی صُورت میں آئے تھے اور ایسے آلودہ معاشرہ میں ایسے مہمانوں کا آنا ممکن تھا کہ حضرت لوطؑ کے لیے پریشانی اور اُن مہمانوں کے سامنے ہی بے آبروئی کا باعث ہوتا۔ لہٰذا آپ کو سخت فکر دامن گیر ہوئی کہ دیکھئے اس گم راہ، بے حیا اور بے شرم قوم کا ان مہمانوں کو دیکھ کر کیا ردِعمل ہوتا ہے؟

کلمہ "سیٓء" کا مادہ "ساء" ہے بہ معنی بدحال ہونا اور "ذرع" کے معنی دل یا خُلق کے ہیں۔ اس لیے "ضاق بھم ذرعًا" کے معنی ہوں گے کہ حضرت لوطؑ پریشان اور بے چین ہوگئے۔

بعض مفسّرین نے یہ بھی کہا ہے کہ کلمہ "ضاق" کے معنی ہیں: "راستہ طے کرتے وقت اُونٹ کے دو قدموں کا فاصلہ" اور جس وقت اُس کی پُشت پر بھاری بوجھ لدا ہوتا ہے تو اُونٹ کے قدموں کا فاصلہ تنگ تر اور کم تر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا "ضاق ذرعًا" کسی سنگین اور طاقت فرسا واقعے کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے مگر ان مہمانوں نے جب حضرت لوطؑ کے اضطراب کو دیکھا تو فوراً اپنا تعارف کروایا اور اُن کی پریشانی کو ختم کر دیا۔

اُنھوں نے کہا کہ آپ نہ تو خوف زدہ ہوں اور نہ غم کریں۔ یہ بے شرم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بہت ہی جلد یہ سب کے سب نابُود ہو جائیں گے۔ ہم آپ کو اور آپ کے خاندان کو بچا لیں گے۔ سوائے آپ کی بیوی کے کہ وہ اِن گناہ گاروں کے درمیان رہے گی اور ہلاک ہو جائے گی: (وقالوا لا تخف ولا تحزن انّا منجّوک واھلک الّا امرأتک کانت من الغابرین)۔

البتہ سُورۂ ہُود کی آیات سے خُوب معلوم ہوتا ہے کہ جب اُس بے شرم قوم کو حضرت لوطؑ کے مہمانوں کا علم ہوا تو بہت جلد اُن کے پاس آئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ وہ اُن مہمانوں پر دست درازی کریں۔ حضرت لوطؑ (جنھوں نے ابھی فرشتوں کو پہچانا نہ تھا) یہ حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اُنھوں نے ان بے شرموں کو کبھی تو بذریعہ نصیحت، کبھی دھمکی کے ذریعہ اور کبھی اُن کے ضمیر کو اپیل کرتے ہوئے کہ کیا تم میں ایک آدمی بھی راست باز نہیں ہے۔؟ اور کبھی اُن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ میں تمہارے ساتھ اپنی دُختر کا نکاح کر دوں گا اُنھیں بُرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بے شرم کسی طرح باز نہ آئے۔ اُن کے پیشِ نظر تو صرف اُن کا بے شرمانہ مقصد تھا۔
لیکن پروردگار کے ایلچیوں نے حضرت لُوطؑ سے اپنا تعارف کروایا اور بطریقِ اعجاز اُن ہجوم آور لوگوں کو اندھا کر دیا۔ اِس طرح اُس عظیم نبیؑ کا دل مطمئن کر دیا۔[1]

[1] اس واقعے کی تفصیل جلد ۵ میں سُورہ ہُود کی آیات ۷۷ تا ۸۱ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اُن فرستادگانِ پروردگار نے حضرت لوطؑ سے دو لفظ کہے، ایک تو "نہ ڈرو" دوسرے "غمگین نہ ہو"۔ دیکھنا یہ ہے کہ اِن دو کلمات "خوف اور حُزن" میں کیا فرق ہے۔ تفسیر المیزان میں لکھا ہے کہ:

"خوف" اُس حادثے کا ہوتا ہے جس کے پیش آنے کا احتمال ہو اور "حزن" حادثے کے لازمی ہونے کا ہوتا ہے۔

بعض اہلِ لُغت نے خوف اور غم میں یہ فرق کیا ہے کہ "خوف" کا تعلق آئندہ ہونے والے حادثے سے ہے اور غم کا تعلق ایسے حادثے سے ہے جو گُزر چکا ہو۔ اِن دونوں کلمات کے مفہوم میں یہ احتمال بھی ہے کہ "خوف" خطرناک باتوں کا ہوتا ہے اور "غم" دردناک واقعات کا خواہ اُن میں کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس مقام پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ سُورۂ ہُود کی آیات کا تاثر یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی پریشانی اپنی ذات کے لیے نہ تھی بلکہ اِس لیے تھی کہ یہ بدکردار لوگ مہمانوں پر دست درازی کریں گے۔ لیکن فرشتوں نے جو جواب دیا وہ حضرت لُوطؑ اور اُن کے خاندان سے متعلق تھا اور اِن دونوں باتوں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

اِس سوال کا جواب سورہ ہُود کی آیت ۸۱ سے مِل سکتا ہے۔ کیونکہ جب وہ بے شرم لوگ مہمانوں پر دست درازی کرنے آئے تو فرشتوں نے لُوطؑ سے کہا کہ "یہ قوم آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی"۔ یعنی ہم تو ہم ہیں یہ تو تجھے بھی کچھ آزار نہیں پہنچا سکتے۔ اِس بنا پر فرشتوں نے اپنے تحفّظ کو تو مُسلّم قرار دیا۔ اور حق یہ ہے کہ اُن کا تحفظ مسلّم بھی تھا۔ اور اُنھوں نے بشارت نجات کو حضرت لوطؑ اور ان کے خاندان تک محدود کر دیا۔

✽ ✽ ✽

اِس کے بعد اُن فرشتوں نے اِس وجہ سے کہ اُس بے شرم قوم کے متعلق اُن پر جو فرض عائد کیا گیا تھا اس کی وضاحت کریں، یہ اضافہ کیا: چونکہ یہ قوم نہایت فاسق اور گناہ گار ہے اِس وجہ سے ہم اِس بستی اور اس کے باسیوں پر آسمان سے عذاب نازل کریں گے: (انّا منزلون علٰی اھل ھٰذہ القریۃ رجزًا من السّمآء بما کانوا یفسقون)۔
اِس مقام پر "قریۃ" سے مُراد وہی شہر سدوم اور اُس کے اطراف و جوانب کے شہر اور آبادیاں مُراد ہیں جن میں قومِ لُوط آباد تھی بعض لوگوں نے اُن کی مردم شماری ستّر لاکھ لکھی ہے۔[1]

کلمہ "رجز" سے "عذاب" مُراد ہے۔ "رجز" کے حقیقی معنی اِضطراب کے ہیں۔ مجازاً ہر وہ امر جو موجب اضطراب ہو اُسے رجز کہنے لگے۔ عربوں نے اس کلمہ کے معنی کو وسیع کر لیا اور سخت بلاؤں، طاعون، برف اور ژالہ باری، شیطانی وساوس اور عذاب الٰہی کے معنی میں بولنے لگے۔

جملہ "بما کانوا یفسقون" سے اُن پر دردناک عذاب نازل ہونے کی یہ علّت واضح ہوتی ہے کہ وہ فسق اور خدا کی نافرمانی میں مُبتلا تھے۔ اور فعل "یفسقون" جو کہ فعل مضارع ہے وہ اِس امر کی دلیل ہے کہ وہ اِس گناہ میں مسلسل اور دائمی طور پر مبتلا تھے۔ اِس اندازِ کلام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ اِس گناہ کے مسلسل ارتکاب سے باز آجاتے اور حق پرستی، تقویٰ اور پاکیزگی کی راہ اختیار کر لیتے تو اللہ اُن کے گزشتہ گناہوں کو معاف کر دیتا اور اُن پر یہ عذاب نازل نہ ہوتا۔

[1] رُوح البیان جلد ۶، صفحہ ۴۶۷۔

اس مقام پر قرآن شریف میں اُس دردناک عذاب کی نوعیت کا جو اُس قوم پر نازل ہوا، تفصیلی ذکر نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی فرمایا گیا ہے کہ:

ہم نے اُن آبادیوں کے (ویرانوں، کھنڈرات اور آثار بلا دیدہ) کو اُن لوگوں کے لیے جو عقل و فہم سے کام لیتے ہیں باقی رکھا ہے۔
(ولقد ترکنا منہا اٰیۃً بیّنۃً لقوم یعقلون)۔

لیکن سورہ ہُود کی آیت ۸۲ اور سورۂ اعراف کی آیت ۸۴ میں اُن پر نازل شدہ عذاب کی تشریح کی گئی ہے کہ اوّل تو شدید زلزلے نے اُن کے شہروں کو کلیۃً زیر و زبر کر دیا۔ اِس کے بعد اُن پر آسمان سے پتھر برسے۔ اِتنی کثیر مقدار میں کہ اُن کے بدن اور ویران شدہ مکانات و محلات اُن کے نیچے دفن ہوگئے۔

کلمہ "اٰیۃ بیّنۃ" (روشن نشانی) سے اشارہ ہے، شہر سدوم کے باقی ماندہ کھنڈرات کی طرف کہ جو آیات قرآنی کے مطابق حجازی قافلوں کی راہ آمد و رفت میں واقع تھا اور یہ آثار ظہورِ پیغمبرِ اسلامؐ کے وقت تک باقی تھے۔ چنانچہ سورۂ حجر کی آیت ۷۶ میں مذکور ہے:

وانہا لبسبیل مقیم

اُس کے آثار اہلِ قافلہ کی راہ کے کنارے موجود ہیں۔

اور سورۂ صافات کی آیت ۱۳۷، ۱۳۸ میں یوں آیا ہے:

وانکم لتمرون علیہم مصبحین و باللّیل افلا تعقلون

تم صبح و شام اُن مقامات کے قریب سے گزرتے ہو کیا تم غور نہیں کرتے۔

۳۶۔ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ○

۳۷۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ○

۳۸۔ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ○

۳۹۔ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ ○

۴۰۔ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۶۔ اور ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو مدین کی طرف بھیجا۔ اُس نے کہا: اے میری قوم! خُدا کی عبادت کرو اور یومِ آخرت کی اُمید رکھو اور زمین میں فساد نہ کرو۔

۳۷۔ مگر اُنھوں نے اُسے جھٹلایا۔ پس اُنھیں زلزلے نے آپکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے اور مر گئے

۳۸۔ اور ہم نے عاد و ثمود کو بھی ہلاک کر دیا۔ اور اُن کے (ویران شدہ) مکانات تمہارے سامنے موجود ہیں شیطان نے ان کے اعمال کو اُن کی نظروں میں زینت دی تھی اور اُنھیں راہ سے روک دیا تھا جب کہ وہ دیکھ رہے تھے۔

۳۹۔ ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا۔ موسیٰ اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ آئے مگر اُن لوگوں نے روئے زمین میں لپنے آپ کو بڑا بنایا (اور تکبر کیا) مگر وہ ہم پر سبقت لے جانے والے نہ تھے۔

۴۰۔ ہم نے اُن سب کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ ہم نے اُن میں سے بعض پر سنگریزوں کی بارش کا طوفان بھیجا اور اُن میں سے بعض کو ایک چیخ نے آپکڑا۔ اور بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو (پانی میں) غرق کر دیا اور خدا نے ہرگز ان پر ظلم نہیں کیا۔ یہ تو خود اُنہی نے اپنے اُوپر ظلم کیا تھا۔

تفسیر

ظالموں کے ہر گروہ کی سزا مختلف تھی:

حضرت لوطؑ اور اُن کی قوم کے تذکرے کے بعد دُوسری قوموں کا ذکر آتا ہے مثلاً قوم شعیب، عاد و ثمود، قارون اور فرعون۔ زیرِ نظر آیات میں ان میں سے ہر ایک کی طرف مختصر اور تنبیہ خیز اشارہ ہے۔

پہلے یہ کہا ہے: ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو مدین کی طرف بھیجا: (والیٰ مدین اخاھم شعیبًا)[1]۔

حضرت شعیبؑ کو "بھائی" کہا گیا ہے۔ ہم نے اس کے متعلق بارہا کہا ہے کہ اس کلمہ کی وجہِ استعمال یہ ہے کہ ان پیغمبروں کو اپنی اُمتوں سے انتہائی محبت تھی اور وہ اُن پر تفوق حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نیز یہ کہ ان پیغمبروں کی اپنی قوموں سے رشتہ داری بھی تھی۔

"مَدیَن" اُردن کے جنوب مغرب میں ایک شہر ہے آجکل اُس کا نام "معان" ہے۔ یہ شہر خلیج عقبہ کے مشرق میں ہے۔ حضرت شعیب اور اُن کی قوم وہیں رہتی تھی[2]۔

حضرت شعیبؑ نے تمام پیغمبرانِ بزرگ کی طرح مبداء و معاد کے اعتقاد سے (جو کہ ہر دین کی اساس ہے) اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ اور کہا: اے میری قوم! تم خدا کی عبادت کرو اور روزِ قیامت کی اُمید رکھو: (فقال یا قوم اعبدوا اللہ وارجوا الیوم الاٰخر)۔

"مبداء" پر ایمان رکھنے سے انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ خدا دائمی طور پر اور مسلسل میرے اعمال کی نگرانی کر رہا ہے۔

[1] یہ جملہ "ولقد ارسلنا نوحًا" کے جملہ اور اس کے بعد کے جملہ پر عطف ہے۔
[2] "مدین" کے متعلق سورہ قصص کی آیت ۲۳ کے ذیل میں تشریح کی گئی ہے۔

اور معاد پر ایمان رکھنے سے انسان کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ اُس روز بے کم و کاست میرے جملہ اعمال کے متعلق بازپرس ہوگی۔ ان باتوں کا اعتقاد انسان کی اخلاقی تربیت اور اصلاح میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے۔

حضرت شعیبؑ کی تبلیغ کا تیسرا حکم ایسا جامع عملی اصول تھا جس میں تمام معاشرتی اور اجتماعی پروگرام شامل تھے۔ آپؑ نے فرمایا زمین پر فساد کرنے کی کوشش مت کرو: (ولا تعثوا فی الارض مفسدین)۔

فساد کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کی تخریب کاری، ویران گری، راہِ راست سے انحراف اور ظلم شامل ہے۔ اس تصور کی ضد "صلاح و اصلاح" ہے کہ جس کے مفہوم میں ہر وہ عمل شامل ہے جو تعمیری اور بنی نوع انسان کی منفعت کے لیے ہو کلمہ "تعثوا" کا مادہ "عثی" ہے۔ جس کے معنی ہیں دُنیا میں فساد برپا کرنا مگر یہ کلمہ زیادہ تر مفاسدِ اخلاق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی لیے اس کے بعد کلمہ "مفسدین" کا استعمال بطور تاکید ہے۔

٭ ٭ ٭

مگر قوم شعیب نے اِس کے بجائے کہ اُس مصلح بزرگ کی نصائح کو گوشِ دل سے سنتے، اُلٹی اُن کی تکذیب کرنی شروع کر دی (فکذبوہ)۔ اُن کی یہ بدعملی اِس بات کا سبب ہوئی کہ اُنھیں شدید زلزلے نے آپکڑا: (فاخذتھم الرجفۃ)۔

اور وہ لوگ اس حادثے سے اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر گئے اور مر گئے: (فاصبحوا فی دارھم جاثمین)

کلمہ "جاثم" کا مادہ "جثم" ہے (بروزن چشم) اس کے معنی ہیں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھنا۔ اور ایک مقام پر ٹھہرنا۔ کچھ بعید نہیں کہ اِس کلمہ کے استعمال کرنے سے یہ مراد ہو کہ جب یہ زلزلہ آیا تو وہ سو رہے تھے۔ جھٹکا محسوس کر کے وہ ناگہانی طور پر اُٹھے جیسے ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے تو حادثے نے اُنھیں جان بچانے کی مُہلت نہ دی۔ دیواریں گر پڑیں اور بجلی جو اس زلزلہ مرگ بار کے ساتھ ہی چمک رہی تھی گرتی رہی اور وہ سب لوگ مر گئے[1]۔

اِس کے بعد کی آیت میں قوم عاد و ثمود کا ذکر ہے۔ مگر اُن اقوام سے اُن کے پیغام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ قومیں تھیں جنھیں اُس وقت کے مخاطبینِ قرآن خوب جانتے تھے۔ نیز یہ کہ قرآن کی دُوسری آیات میں اُن کے پیغمبروں کا ذکر مکرر آیا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے عاد و ثمود کی قوموں کو ہلاک کر دیا: (وعادًا وثمودا)[2]۔

اِس کے بعد یہ اضافہ ہے کہ اُن اقوام کی بستیوں اور اُن کے مقامات کو تم خوب جانتے ہو۔ (اُن کے شہروں کے ویرانے سرزمینِ حجر اور یمن میں تمہاری راہوں کے کنارے واقع ہیں) (وقد تبیّن لکم من مساکنھم)۔

تم ہر سال اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ یمن اور مُلکِ شام کی طرف سفر کرتے ہو۔ سرزمین "حجر" سے جو کہ جزیرۃ العرب کے شمال میں ہے اور احقاف سے جو کہ یمن کے قریب بجانب جنوب ہے گزرتے ہو اور عاد و ثمود کے شہروں کے کھنڈرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ پس تم ان کے انجام سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے؟

[1] قوم شعیب کی تباہی کا دردناک حال تفصیلاً سورۂ ھُود کی آیات ۸۴ تا ۹۵، جلد نہم میں آیا ہے۔
[2] "عادًا و ثمودًا" فعل "اھلکنا" کا مفعول ہے جو کہ مقدر ہے۔ یہ بات آیت ماقبل سے سمجھ میں آتی ہے۔ بعض مفسرین نے اسے (اذکر) کا مفعول سمجھا ہے۔

اس کے بعد اُن اقوام کی اصل بدبختی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شیطان نے اُن کے اعمال کو اُن کی نظروں میں مُزیّن کر دیا تھا اور انجام کار اُنھیں راہِ حق اختیار کرنے سے روک دیا تھا: (و زین لهم الشیطان اعمالهم فصدهم عن السبیل) ۔

حالانکہ وہ اقوام چشم بینا اور عقل و خرد رکھتی تھیں اور توحید و تقویٰ اُن کی فطرت میں تھا اور پیامبرانِ الٰہی نے بھی اُنھیں اچھی طرح راہِ راست کی طرف رہبری کی تھی: (و کانوا مُستبصرین) ۔

بعض مفسّرین نے " وکانوا مستبصرین " کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ وہ اقوام چشم بینا اور عقل و فہم رکھتی تھیں۔ بعض نے خیال کیا ہے کہ وہ فطرتِ سلیم کی مالک تھیں۔ بعض نے یہ معنی سمجھے ہیں کہ اُنھیں پیغمبروں کی رہنمائی میسّر آئی تھی۔

اگر اس آیت سے مذکورہ تمام معانی اخذ کیے جائیں تو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قطعی جاہل نہ تھے بلکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حق کیا ہے۔ اُن کا وجدان بیدار تھا، عقل و خرد سے بھی وہ بہرہ مند تھے اور پیمبرانِ الٰہی اُن پر اتمامِ حجت کر چکے تھے۔ لیکن ـــــ ان تمام باتوں کے باوجود اُنھوں نے عقل اور ضمیر کی آواز کی طرف سے کان بند کر لیے اور انبیاءؑ کی دعوت سے منہ موڑ لیا اور شیطانی وساوس کی پیروی کرنے لگے۔ اور روز بروز اُنھیں اپنے غلط اعمال زیبا تر نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ وُہ عصیان کی اُس منزل پر پہنچ گئے جہاں سے لوٹنا ناممکن ہوگیا۔

اَب قانونِ فطرت نے اِن بے بار و بے ثمر خشک لکڑیوں کو پُھونک دیا۔ ہر وہ درخت جو پھل نہیں لاتا اُس کی سزا یہی ہے

⁂

اس کے بعد کی آیت میں ان تین نافرمانوں کا ذکر ہے جن میں سے ہر ایک شیطانی طاقت کا واضح نمونہ تھا۔ وہ تھے قارون، فرعون اور ہامان ۔ فرمایا گیا ہے : ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا: (و قارون و فرعون و هامان)[1]

قارون اُس ثروت کا مظہر ہے جس میں غرور، غفلت اور خُودغرضی بھی پائی جاتی تھی۔

فرعون ایسی متکبرانہ طاقت کا مظہر ہے جس میں شیطنت آمیختہ تھی اور ہامان مُستکبر ظالموں کی معاونت کا نمونہ ہے۔

اُس کے بعد مذکور ہے کہ : مُوسیٰ ان تینوں کے پاس روشن دلائل لے کر آئے اور اُن پر اتمامِ حُجت کی: (ولقد جاءهم موسٰی بالبیّنات) ۔

مگر اُنھوں نے زمین پر غرور، تکبّر اور سرکشی کی راہ اختیار کی: (فاستکبروا فی الارض) ۔

قارون اپنی دولت، خزانوں، علم و ہُنر پر بھروسا کرتا تھا۔

فرعون و ہامان اپنے لشکر، فوجی طاقت، اور جاہل عوام میں اپنے پروپیگنڈے پر بھروسا کرتے تھے۔

مگر وہ لوگ ان اسبابِ ظاہری کے باوجُود خُدا پر سبقت نہ لے جاسکے اور اُس کی قدرت کے پنجے سے نکل کے کہیں فرار نہ کر سکے: (وما کانوا سابقین) ۔

[1] یہ تینوں کلمات بھی فعل مقدر " اھلکنا " کا مفعول ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض نے انھیں فعل " اذکر " کا مفعول سمجھا ہے۔

خدا نے اسی زمین کو قارون کو فنا کرنے کا حکم دیا جو اس کے آرام و راحت کا گہوارہ تھی اور فرعون اور ہامان کو نابود کرنے کا حکم اُس پانی کو دیا جو انسان کے لیے سبب حیات ہے۔

خُدا نے اِن سرکشوں کو نابُود کرنے کے لیے زمین و آسمان کے لشکر جمع نہیں کیے بلکہ اُن ہی چیزوں کو جو اُن کی بقائے حیات کا مُوجب تھیں اُنھیں نیست کرنے پر مقرر کر دیا۔[1]

" سابقین " جمع ہے " سابق " کی۔ اس کا معنی ہے وہ آدمی جو کسی سے آگے بڑھ کر پیش قدمی اختیار کرے۔ اگر خدا یہ فرماتا ہے " وہ لوگ آگے نہ بڑھ سکے " تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی پُوری امکانی طاقت کے باوجود خدا کے دائرۂ قدرت سے باہر نکل کے اور خدا کے عذاب سے نہ بچ سکے بلکہ جیسے ہی خُدا نے ارادہ کیا اُسی وقت اُنھیں نہایت ذلّت و رُسوائی کے ساتھ دیارِ عدم کو بھیج دیا جیسا کہ خدا اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے: ہم نے اُن میں سے ہر ایک کو اُس کے گناہ کی پاداش میں پکڑ لیا: (فکلًا اخذنا بذنبه) ۔

چونکہ ماقبل کی دو آیات میں چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا تھا مگر اُن کی سزاؤں کا ذکر نہ تھا۔ وہ تھے "قومِ عاد و ثمود، قارون، فرعون اور ہامان"۔ اس لیے اس آیت کے اخیر میں بالترتیب ان کی سزاؤں کا ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے : ہم نے اُن میں سے بعض پر شدید تباہ کُن طوفان سنگریزوں کے ساتھ بھیجا (فمنهم من ارسلنا علیه حاصبًا) ۔

"حاصب" کا معنی وہ طوفان ہے جس میں سنگریزوں کی بارش ہو۔ "حصباء" کے معنی ہیں سنگریزہ

اس گروہ سے قومِ عاد مُراد ہے۔ سورہ ذاریات، سورہ حاقہ اور سورہ قمر کے مطابق اُن پر سات رات اور آٹھ دن تک شدید تباہ کُن طوفان مسلط رہا۔ اُس طوفان نے اُن کے گھروں کو بالکل کھنڈر کر دیا اور اُن کے جسموں کو جھڑتے پتوں کی طرح پراگندہ کر دیا۔ (حاقہ ۵ تا ۷)

اُن میں سے دُوسروں کو آسمانی کڑک نے گھیر لیا: (ومنهم من اخذته الصیحة) ۔

ہم نے کہا ہے کہ صیحہ آسمانی بجلی کا وہ کوندا ہے جس کے ساتھ ہی زمین میں زلزلہ آجاتا ہے۔

یہ وہ عذاب تھا جو قومِ ثمود اور بعض دیگر اقوام پر نازل ہوا۔

جیسا کہ خدا سُورہ ہُود کی آیت ۶۷ میں فرماتا ہے :

واخذ الّذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دیارهم جاثمین

اور ہم نے اُن میں سے بعض کو زمین میں غرق کر دیا: (ومنهم من خسفنا به الارض) ۔

یہ وہ سزا تھی جو بنی اسرائیل کے مغرور و مُستکبر قارون کو دی گئی تھی جس کا سُورہ قصص کی آیت ۸۱ میں ذکر گزر چکا ہے۔

آخرکار اُن میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا: (ومنهم من اغرقنا) ۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ فرعون و ہامان اور اُن کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کا قرآن کی مختلف سُورتوں میں ذکر آیا ہے۔

بہرکیف اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ چار قسم کی سزائیں چار ہی قسم کے لوگوں کو دی گئی تھیں جن کی گمراہی، گناہوں اور

[1] قارون کی زندگی کے حالات سورہ قصص کی آیتوں ۷۶ تا ۸۱ میں مفصّل ذکر ہو چکے ہیں۔ اور فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی ہلاکت کا واقعہ سورۂ قصص کی تفسیر میں اسی جلد میں اور سُورۂ اعراف کی تفسیر، جلد چہارم میں بیان کیا جاچکا ہے۔

انحراف کا گزشتہ دو آیات میں ذکر آچکا ہے۔ مگر اُس مقام پر اُن کی سزاؤں کا ذکر نہیں تھا۔

لیکن ــــ بعض مفسّرین نے اس مقام پر جو یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ان سزاؤں میں دُوسری اقوام بھی شامل ہوسکتی ہیں (مثلاً: کلمہ "غرق" میں قوم نوح بھی شامل ہے اور قوم لُوط پر بھی سنگ باری ہوئی تھی)، اُن مفسّرین کا یہ خیال حقیقت سے بہت بعید ہے۔ کیونکہ قرآن میں جس مقام پر اُن کا حال بیان کیا گیا ہے، وہیں اُن کی سزاؤں کا ذکر بھی ہے۔ تو پھر سزاؤں کے ذکر کی تکرار کی ضرورت نہ تھی۔ زیرِنظر سلسلۂ آیات میں جس چیز کا ذکر نہ تھا وہ ان چار گروہوں کی سزائیں ہیں، جنہیں آخری دو آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی تاکید کے لیے کہ یہ لوگ اپنے ہی اعمال سیئہ کے ردّ عمل کے طور پر ان عذابوں میں مبتلا ہوئے اور اُنھوں نے جو بیج بویا تھا اُس کی فصل کاٹی۔ خدا فرماتا ہے: خدا نے ہرگز ان پر ظلم و ستم نہیں کیا۔ بلکہ ان لوگوں نے خُود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا: (وماكان الله ليظلمهم ولكن كانوا انفسهم يظلمون)۔

گناہ گاروں کو خواہ اس دُنیا میں سزا دی جائے یا اُس دُنیا میں، درحقیقت وہ اُن ہی کے گناہوں کا ردّ عمل ہوگا اور اُس مقام پر جہاں اصلاحِ احوال اور بازگشت کی تمام راہیں اُن پر بند ہو جائیں گی وہ بداعمالیاں اُن کے سامنے مجسّم ہو جائیں گی۔

خدا اِس سے کہیں زیادہ عادل ہے کہ وہ انسانوں پر حقیر سے حقیر ترین ظلم بھی روا رکھے۔

قرآن کی دیگر متعدد آیات کی طرح اس آیت سے بھی انسان کی آزادیٔ ارادہ اور آزادیٔ اختیار ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فیصلۂ عمل خود انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اُسے آزاد ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

اِس بنا پر جو لوگ کہ "جبر" کے معتقد ہیں (افسوس ہے کہ مسلمانوں میں بھی اِس عقیدے کے لوگ موجود ہیں) قرآن کے اس توانا استدلال سے اُن کا عقیدہ باطل ٹھہرتا ہے۔

۴۱۔ مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

۴۲۔ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

۴۳۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ○

۴۴۔ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ○

ترجمہ

۴۱۔ جن لوگوں نے خُدا کے سوا دُوسروں کو اپنے اولیا بنا رکھا ہے وہ مکڑیوں کی مانند ہیں کہ وہ بھی اپنے لیے گھر بناتی ہیں اور مکڑی کا گھر کمزور ترین گھر ہے۔ کاش کہ وہ لوگ اِس بات کو سمجھتے۔

۴۲۔ اور وہ لوگ خدا کے علاوہ جسے بھی پکارتے ہیں خدا اُسے جانتا ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۴۳۔ ہم لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہلِ علم کے سوا کوئی انھیں نہیں سمجھتا۔

۴۴۔ خُدا نے آسمانوں اور زمین کو حق پر پیدا کیا ہے یقیناً اہلِ ایمان کے لیے اِن میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر

مکڑی کے جالے کی مانند کمزور اُمید گاہیں :

گزشتہ آیات میں مُفسد، مُستکبر، ہٹ دھرم اور نا انصاف ظالم مشرکین کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ زیر بحث آیات میں اسی مناسبت سے ایک قابلِ توجہ اور ناطق مثال اُن لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدا کو اپنا معبود اور ولی قرار دیتے ہیں۔ ہم اس مثال پر جتنا بھی غور کریں اتنے ہی زیادہ نکات ہماری سمجھ میں آتے ہیں۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے : جو لوگ غیر خدا کو اپنا معبود اور ولی بناتے ہیں وہ مکڑی کی مانند ہیں جو اپنے لیے جالا تنتی ہے۔ جب کہ مکڑی کا گھر سب سے کمزور گھر ہوتا ہے۔ اے کاش وہ یہ جانتے : (مثل الّذین اتّخذوا من دون الله اولیاء کمثل العنکبوت اتّخذت بیتًا وانّ اوھن البیوت لبیت العنکبوت لوکانوا یعلمون)۔

سبحان اللہ! یہ کیسی رسا اور جاذب مثال اور کیسی دقیق اور ناطق تشبیہ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہر حیوان اور ہر کیڑا مکوڑا اپنے لیے گھر یا آشیانہ بناتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی کا گھر بھی مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور نہیں ہوتا۔

اصولاً مکان ایسا ہونا چاہیئے جس میں دیواریں، چھت اور دروازہ ہو جو اپنے مکین کی حوادث اور موسموں کے تغیرات سے حفاظت کرے۔ اُس کی غذا، خوراک اور دُنیاوی ضرورت کی چیزیں اُس میں محفوظ رہیں۔ بعض عمارتوں کی چھت نہیں ہوتی۔ مگر کم از کم دیواریں تو ہوتی ہیں۔ یا اگر دیواریں نہیں تو چھت ہوتی ہے۔ لیکن مکڑی کے جالے میں جو نہایت ہی نازک تاروں سے بنایا ہوا ہوتا ہے نہ دیوار ہوتی ہے نہ چھت، نہ صحن، نہ دروازہ۔ یہ چیزیں تو رہیں ایک طرف، دُوسری طرف دیکھیے تو اُس کی ساخت کا مٹیریل اِس قدر کمزور اور ناپائیدار ہوتا ہے کہ وہ کسی حادثے کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر نرم رفتار ہوا بھی چلے تو اُس کے تانے بانے کو درہم برہم کر دے۔ اگر اُس پر بارش کے چند قطرے گر جائیں تو اُسے برباد کر دیں۔ اگر آگ کے معمولی سے شعلے کی گرمی بھی پہنچے تو اُسے نابود کر دے۔ حتیٰ کہ اگر اُس پر گرد و غبار بھی بیٹھ جائے تو بھی پارہ پارہ ہو کر مکان کی چھت سے لٹک جاتا ہے۔

اِس گروہ کے باطل معبودوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، نہ کسی مشکل کو حل کر سکتے ہیں اور نہ مصیبت کے وقت کسی کی پناہ گاہ بن سکتے ہیں۔

ہاں — یہ ٹھیک ہے کہ یہ گھر دراز پا مکڑی کے لیے مرکزِ استراحت بھی ہے اور اس کے حصولِ غذا کے لیے حشرات کو شکار کرنے کا جال بھی ہے۔

لیکن اگر اُس کا دُوسرے حیوانات اور حشرات کے گھروں سے مقابلہ کیا جائے تو نہایت کمزور اور ناپائیدار ہے۔

جن لوگوں نے خدا کے علاوہ کسی غیر کو اپنا معبُود قرار دیا ہے، اُن کا بھروسہ بھی تارِ عنکبوت پر ہے۔ مثلاً : فرعونوں کے تخت و تاج، قارونوں کا بے شمار مال و زر، بادشاہوں کے خزانے اور محلّات۔ یہ سب تارہائے عنکبوت ہیں اور یہ سب اسباب نمائش طوفانِ حوادث کے مقابلے میں — ناپائیدار۔ ضعیف، ناقابلِ اعتماد اور فنا پذیر ہیں۔

تاریخ کے انقلابات ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ درحقیقت انسان اُن میں سے کسی چیز پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔

لیکن —— جن لوگوں نے ایمان اور خدا پر توکّل کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہے۔ حقیقت میں اُن کا تکیہ مضبوط دیوار پر ہے۔

❊ ❊ ❊

اِس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ باوجودیکہ مکڑی کا جالا اور اُس کے تار کمزوری کے لیے ضرب المثل ہیں لیکن وُہ عجائب آفرینش میں سے بھی ہے۔ اگر انسان اُس پر غور کرے تو وہ خالقِ حقیقی کی عظمت سے اور بھی زیادہ آشنا ہو جائے۔

مکڑی کے تار ایک چپکنے والے مادہ سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ مادہ مکڑی کے پیٹ کے نیچے سُوئی کے ناکے کے برابر نہایت چھوٹے چھوٹے خلیوں میں ہوتا ہے۔ اُس کی ساخت ایک خاص ترکیب سے ہوتی ہے کہ وہ ہوا لگتے ہی سخت ہو جاتا ہے۔

مکڑی اِس مادّے کو اپنی خاص طرح کی اُنگلیوں سے اُن خلیوں میں سے باہر نکالتی ہے اور اُس سے اپنا جالا بناتی ہے۔

علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ ہر مکڑی اِس قلیل ترین مائع مادہ سے پانچ سو میٹر تار بنا سکتی ہے۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مکڑی کا تار اپنی غیر معمولی نزاکت کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے ورنہ اگر اتنا ہی باریک تار فولاد کا ہو تو اُس سے مضبُوط تر ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ مکڑی کے جالے کا ہر تار، چار تاروں سے مِل کر بنا ہوتا ہے۔ پھر اُن چار تاروں میں سے ہر تار ایک ہزار تاروں سے مِل کر بنا ہوتا ہے۔ جن میں سے ہر تار اُس کے بدن کے نہایت چھوٹے سے سُوراخ میں سے نکلتا ہے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ اِن بافتوں کا ہر فرعی تار کس قدر باریک، لطیف اور نازک ہوتا ہوگا۔

مکڑی کے جالے کی ساخت میں جو مٹیریل استعمال ہوتا ہے، اُس کے عجیب ہونے کے علاوہ اُس کی ساخت اور ہندسی شکل بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگر ہم کسی مکڑی کے سالم گھر کو غور سے دیکھیں تو اِن ہی نازک تاروں میں ہمیں آفتابِ درخشاں کی طرح کا ایک دلچسپ منظر نظر آئے گا۔ البتہ مکڑی کے لیے یہ گھر نہایت مناسب اور آئیڈیل ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس سے زیادہ کمزور مکان کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا اور وہ معبُود بھی جن کی خدا کے علاوہ پرستش کی جاتی ہے ایسے ہی ہیں۔

اِس چھوٹی سی مخلوق کی تخلیق میں قدرتِ الٰہی کی عظمت اُس وقت اور بھی زیادہ آشکار ہوتی ہے، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ مکڑی صرف ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض ماہرین علم الحیات کا دعویٰ ہے کہ اب تک بیس ہزار قسم کی مکڑیاں پائی گئی ہیں اور اُن میں سے ہر نوع کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔

آیت میں " اصنام " (بتوں) کے بجائے کلمہ " اولیاء " (جمع " ولی ") استعمال ہوا ہے۔ شاید اِس کلمے کے استعمال میں یہ حکمت ہے کہ نہ صرف انسان کے خُود ساختہ معبُود (بُت) بلکہ خدا کے مقرر شدہ پیشوا اور رہبر کو چھوڑ کر جسے بھی پیشوا اور رہبر بنایا جائے وہ سب اِسی حکم میں شامل ہیں۔

جُملہ " لوکانوا یعلمون " (اگر وہ جانتے ہوں)، آیت کے اخیر میں آیا ہے۔ اس کا تعلق نہ تو باطل معبُودوں سے ہے اور نہ خانۂ عنکبوت کی کمزوری سے۔ کیونکہ اُس کی کمزوری کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ اس بناء پر اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے کہ

اگر وُہ لوگ اپنے باطل معبُودوں اور اُن ہستیوں کی جن پر وہ تکیہ کرتے ہیں ناپائیداری اور بے بقائی کو سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ یہ سب اپنے ضعف اور عدمِ قدرت میں تارِ عنکبوت کی مانند ہیں۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد کی آیت میں غافل اور بے خبر مشرکین کو تہدید آمیز تنبیہہ کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے: خُدا ہر اُس شے کو جسے، وہ خدا کے علاوہ پُکارتے ہیں جانتا ہے: (انّ اللّٰہ یعلم ما یدعون من دُونہ من شیءٍ)۔

اُن کا شرکِ جلی ہو یا شرکِ خفی کوئی بھی خدا سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی خدا قادرِ مطلق۔ لازوال اور حکیم علی الاطلاق ہے۔ (وھو العزیز الحکیم)۔

اگر خدا نے اِن کفّار کو مُہلت دے رکھی ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اِن کے اعمال کو جانتا نہیں یا اُس کی قُدرت محدود ہے بلکہ یہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اُنھیں کافی مہلت دے تاکہ اِن سب پر اتمامِ حُجّت ہو جائے۔ اور اُن میں سے جن افراد میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہے وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں۔

بعض مفسّرین نے اس جُملے کو مُشرکین کے اِن بہانوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو وہ اپنی بُت پرستی کے لیے تراشتے رہتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ:۔ ہم اِن بُتوں کی پرستش اِن کی وجہ سے نہیں کرتے۔ بلکہ درحقیقت بُت تو آسمان کے ستاروں، پیمبروں اور فرشتوں کے مظہر اور علامات ہیں اور سجدہ کرتے وقت ہمارے تصوّر میں تو وہی ہستیاں ہوتی ہیں۔ یہ تو ہم اِنہی کے احترام میں کرتے ہیں اور ہمارا سُود و زیاں بھی اُن ہی کے اختیار میں ہے۔

مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ تم جن ذاتوں کو پُکارتے ہو خُدا اُنھیں خُوب جانتا ہے۔ خواہ وہ کچھ بھی ہوں۔ مگر خدا کے حکم اور قدرت کے مقابلہ میں تارِ عنکبوت کی مانند ہیں۔ اُن کے پاس تمھیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

❊ ❊ ❊

زیرِ نظر آیات میں سے تیسری آیت دُشمنانِ پیغمبر کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ اِس قسم کی مثالوں پر کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وُہ خدا جو زمین و آسمان کا خالق ہے، مکڑی، مکھی اور اسی طرح کے حشرات کی مثالیں دے۔

قرآن میں اِس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں اور اہلِ علم کے سوا اُنھیں کوئی نہیں سمجھتا: (وتلک الامثال نضربھا للناس وما یعقلھآ الّا العالمون)۔

— کسی مثال کی اہمیّت یا لطافت اُس کے عظیم یا حقیر ہونے میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے مقصُود پر کس طرح منطبق ہوتی ہے۔ بعض اوقات حقیر سی مثال سے اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

بطورِ مثال۔ — جس وقت کمزور اور بے اساس سہاروں کی بابت گفتگو ہو تو اُس وقت مثال کے لیے "تارِ عنکبوت" کا انتخاب عینِ فصاحت و بلاغت ہے۔ کیونکہ یہ مثال اُس بے اساس و ناپائیدار سہارے کو بہترین انداز سے واضح کرتی ہے۔

اِسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اہلِ علم ہی قرآن میں بیان کردہ مثالوں کی لطافت و نزاکت کا ادراک کرتے ہیں۔

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ: خُدا نے آسمان اور زمین کو حق پر خلق کیا ہے۔ اِس میں ایمان لانے والوں کے لیے عظیم نشانی ہے: (خلق اللّٰہ السّماوات والارض بالحق انّ فی ذالک لاٰیۃ للمؤمنین)۔

خُدا کا کوئی کام بھی باطل اور عبث نہیں ہے۔ اگر خدا کسی وقت مکڑی اور اُس کے کمزور اور بے بُنیاد گھر کی مثال دیتا ہے تو دُرست ہے اور اگر وہ مثال کے لیے کسی حقیر سے وجُود کا انتخاب کرتا ہے تو حق کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ وگرنہ اُس کے لیے کسی بڑی چیز کی مثال کو اختیار کرنا کونسا مُشکل تھا کیونکہ وہ تو عظیم کہکشاؤں اور نظامہائے آسمانی کا خالق ہے۔

یہ اُمر بھی قابلِ غور ہے کہ اِن چند آیات کے آخیر میں آیاتِ الٰہی کے ادراک کا معیار علم و ایمان کو قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے کہ "لوکانوا یعلمون" (اگر وہ جانتے) دُوسری جگہ فرماتا ہے: "ما یعقلھا الّا العالمون" (اِن مثالوں کی نزاکت کا بجز عالمانِ آگاہ کے کوئی ادراک نہیں کر سکتا)۔

اِس آخری آیت میں فرماتا ہے: "انّ فی ذٰلک لاٰیۃً للمؤمنین۔"

اِس میں اہلِ ایمان کے لیے بڑی نشانی ہے۔

اِن تمام معیارات سے مُراد یہ ہے کہ حق تو جمالِ آفتاب کی طرح روشن ہے مگر اہل اور بیدار دل ہی اُس کی کرنوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ وہ قلوب جو آگاہ ہیں اور جستجوئے حق رکھتے ہیں۔ حق کو قبول کرنے کے لیے بیدار رُوح اور قلبِ سلیم کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کور دل مُشرک جمالِ حق کو نہیں دیکھتے تو اِس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مخفی ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ وُہ بصیرت سے عاری ہیں۔

۴۵۔ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۵۔ کتاب میں سے جو کچھ تم پر وحی کیا گیا ہے اسے پڑھا کرو اور نماز قائم کرو کیونکہ نماز فحشات اور منکرات سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بڑا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے جانتا ہے۔

تفسیر

نماز اعمالِ قبیح سے روکتی ہے:

پیغبرانِ اُولوالعزم اور اقوامِ گزشتہ کی سرگزشت کے حصے، اور ان رہبرانِ الٰہی سے اُن کا نامناسب و ناسزا سلوک اور اُن اقوام کی زندگی کے غم انگیز انجام کے بعد، خداوندِ عالم کا رُوئے سُخن بجانب پیغبرِ اسلامؐ اُن کی دل جوئی، تسلّی خاطر، تقویتِ رُوح اور اُنھیں ایک کُلّی اور جامع دستور العمل دینے کے لیے مُنعطف ہوتا ہے۔ اُنھیں دو حکم دیئے گئے ہیں:

اوّل یہ کہ: کتابِ الٰہی کا جتنا حصّہ تمھیں وحی کیا گیا ہے اُس کی تلاوت کرو۔ (اُتل مآ اوحی الیك من الکتاب)۔

تم ان آیات کو پڑھو کیونکہ تم جو چاہتے ہو وہ ان میں ہے۔ علم و حکمت، نصیحت، معیارِ شناختِ حق و باطل، وسیلہ تنویرِ روح و قلب اور ہر گروہ اور ہر جماعت کے لیے زندگی کا پروگرام ان آیات میں موجود ہے۔ تم ان آیات کو پڑھو اور اُن پر عمل کرو۔ اُنھیں پڑھو اور اُن سے ہدایت حاصل کرو۔ پڑھو اور اُن کی تلاوت سے اپنا قلب روشن کرو۔

پہلے حکم کے بعد جس میں تعلیم کا پہلو ہے۔ دُوسرا حکم یہ ہے کہ: نماز قائم کرو۔ (واقم الصلٰوۃ)۔

اس کے بعد نماز کے عظیم فوائد کا ذکر ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ نماز انسان کو اعمالِ فحش اور منکرات سے باز رکھتی ہے۔ (ان الصلٰوۃ تنھٰی عن الفحشآء والمنکر)[1]

چونکہ نماز کی خُوبی ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو مبداء و معاد کی یاد دلاتی ہے جو کہ کج روی سے بچے رہنے کا قوی ترین سبب ہے۔

[1] "فحشآء" اور "منکر" کا فرق جلد ۶ میں سورہ نحل کی آیت ۹۰ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ "فحشاء" سے مراد مخفی گناہانِ کبیرہ ہیں اور منکر آشکار گناہانِ کبیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ یا "فحشا" وہ گناہ ہیں جو قوائے شہویہ کے تحت کیے جائیں اور منکر وہ گناہ ہے جو قوتِ عقلیہ کے تحت کیا جائے۔

اس لیے وہ اُسے اعمالِ فحش اور مُنکرات سے باز رکھتی ہے۔

جب کوئی آدمی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو تکبیر کہتا ہے۔ یعنی خدا کے ہر شے سے برتر و بالا ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اُس کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے، اُس کی حمد و ثنا کرتا ہے، اُس کی رحمانیت اور رحیمیت کی تعریف کرتا ہے، روزِ جزا کو یاد کرتا ہے۔ اُس کی بندگی کا اعتراف کرتا ہے، اُس سے صراطِ مستقیم کی ہدایت کا خواستگار ہوتا ہے اور گمراہوں اور مغضوب لوگوں کی پیروی سے خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ (مضمون سُورہ حمد)

بدونِ شک ایسے انسان کے قلب اور رُوح میں جو پابندِ صلوٰۃ ہو قبولِ حق کی تحریک، پاکیزگی کا خیال اور تقویٰ کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے آدمی رکوع کرتا ہے اور اپنے خالق کے حضور پیشانی خاک پر رکھتا ہے اور اُس کی عظمت کے تصوّر میں ڈُوب جاتا ہے، تو اُس کے دل سے خود غرضی اور تکبّر کے جذبات محو ہو جاتے ہیں۔

وہ توحیدِ الٰہی کی شہادت دیتا ہے اور پیغبرِ اکرمؐ کی رسالت کا اقرار کرتا ہے۔ اس حالت میں وہ جنابِ رسالت مآبؐ پر دُرود بھیجتا ہے اور خدا کے حضور میں دونوں ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتا ہے کہ وہ اُسے صالح بندوں میں شمار کرے۔ (تشہد و سلام)

یہ تمام امور پابندِ صلوٰۃ انسان کے نفس میں رُوحانی لہریں پیدا کر دیتے ہیں اور اُس کی قوّتِ رُوحانی گناہ کے مقابلے میں مستحکم دیوار بن جاتی ہے۔

اس عمل کی شب و روز میں چند بار تکرار ہوتی ہے۔ چنانچہ جب انسان صبح کو نیند سے بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔ وسطِ روز میں جس وقت آدمی دُنیاوی کاروبار میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں مؤذن کی صدائے تکبیر سُنتا ہے تو اپنی مصروفیات کو چھوڑ کر درگاہِ الٰہی کی طرف رُخ کرتا ہے۔ حتّٰی کہ دن کے ختم ہونے اور رات کے شروع ہوتے وقت اپنے بسترِ استراحت پر جانے سے پہلے بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہو کر اپنے دل کو مرکزِ انوار بناتا ہے۔

علاوہ بریں جس وقت کوئی آدمی نماز کی تیاری کرتا ہے تو پہلے نہاتا دھوتا اور اپنے آپ کو پاک کرتا ہے۔ ہر حرام اور غصب کردہ شے کو اپنے آپ سے دُور کرتا ہے۔ پھر بارگاہِ ربّ العزت میں حاضر ہوتا ہے۔ یہ تمام امور اُسے فحشاء اور مُنکر سے باز رکھتے ہیں۔

بلحاظ شرائط کمال اخلاص اور رُوحِ عبادت جس نمازی کا جتنا معیار ہے وہ اُسی قدر فحشاء اور مُنکر سے دُور رہتا ہے۔ بمناسبت معیار کبھی تو مکمل طور پر انسان بچا رہتا ہے۔ اور کبھی محدود طور پر۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی آدمی نماز پڑھے اور اُس پر کوئی اثر نہ ہو خواہ اُس کی نماز دکھاوے ہی کی کیوں نہ ہو۔ یا وہ شخص آلودہ گناہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ایسی نماز کے نفس پر اثرات کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ دکھاوے کی نماز بھی نہ پڑھتے تو اور زیادہ گناہوں میں آلودہ ہوتے۔

ہم اس مطلب کو قدرے واضح طور پر یوں بیان کر سکتے ہیں کہ فحشاء اور مُنکر سے پرہیز کرنے کے بھی بہت سے مراتب و درجات ہیں۔ اور ہر نمازی کا مرتبہ و مقام اُس کے رُوحانی مدارجِ کمال کے مطابق ہے۔

اس آیت کے متعلق ہم نے جو کچھ سطُورِ بالا میں کہا ہے، اُس سے واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسّرین نے اس آیت کی تفسیر میں لاحاصل زحمت اُٹھائی ہے اور نامناسب تفاسیر کے انتخاب میں بیکار محنت کی ہے۔ شاید اُنھوں نے یہ دیکھا کہ بعض لوگ نماز

پڑھتے ہیں اور مرتکب گناہ بھی ہوتے ہیں اس لیے اُنھوں نے آیت کے مطلق معنی پر نظر ڈالی اور سلسلۂ مراتب کا لحاظ نہیں کیا۔ لہٰذا وہ شک میں پڑ گئے اور آیت کی تفسیر کے لیے دُوسری راہیں اختیار کرلیں۔

مثلاً ـــــ بعض نے کہا ہے کہ نماز انسان کو فحشا اور منکر سے اتنی ہی دیر کے لیے باز رکھتی ہے جب تک وُہ مشغولِ نماز ہوتا ہے۔

یہ کیا عجیب بات ہے۔ یہ کچھ نماز ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ اُن میں بحالتِ مشغولیت انسان مرتکبِ گناہ نہیں ہوتا۔

بعض اور لوگوں نے کہا ہے کہ نماز کے اعمال و اذکار ایسے جُملے ہیں جن میں سے ہر ایک انسان کو فحشا اور منکر سے باز رکھتا ہے۔ مثلاً تکبیر و تسبیح و تہلیل انسان سے کہتی ہے کہ گناہ نہ کر۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اِس صدائے نہی کو سُنتا بھی ہے یا نہیں۔

اِسی طرح بعض نے اِس آیت کی اِس عنوان سے تفسیر کی ہے کہ اِس مقام پر کلمہ "نہی" صرف "نہی تشریعی" ہے وہ اِس حقیقت سے غافل رہے ہیں کہ یہاں نہی تکوینی مُراد ہے۔ آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ :- نماز کی تاثیر ہی انسان کو ارتکابِ گناہ سے باز رکھنے والی ہے۔ اِس لیے آیت زیرِ نظر کی اصلی تفسیر وہی ہے جو ہم نے سطور بالا میں بیان کی البتہ اِس امر میں کوئی مانع نہیں کہ نماز فحشا اور مُنکر سے نہی تکوینی بھی کرتی ہے اور نہی تشریعی بھی۔

❖ ❖ ❖

چند توجہ طلب احادیث

(۱) ایک حدیث میں جو پیغمبرِ اسلامؐ سے مروی ہے :

من لم تنهه صلاته عن الفحشاء والمنكر لم يزدد من الله الّا بُعداً

جس آدمی کی نماز اُسے فحشاء اور مُنکر سے نہیں روکتی اسے نماز سے خُدا سے دُوری کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔[1]

(۲) آنحضرتؐ سے ایک اور حدیث میں اس طرح منقول ہے :

لاصلٰوة لمن لم يطع الصلٰوة - وطاعة الصلٰوة ان ينتهي عن الفحشآء والمنكر۔

جو آدمی نماز کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا اُس کی نماز نماز نہیں ہے۔ اور اطاعتِ نماز یہ ہے کہ فحشاء اور مُنکر سے اُس کی نہی پر عمل کرے۔[2]

[1] و [2] مجمع البیان زیرِ بحث ... کے ذیل میں (دُوسری حدیث میں نہی تشریعی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

(۳) آنحضرتؐ سے مروی ہم ایک اور حدیث میں یُوں پڑھتے ہیں کہ : انصار میں سے ایک جوان رسُول اللہؐ کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ مگر وہ قبیح گناہوں میں مُبتلا تھا۔ لوگوں نے رسول اللہؐ سے یہ بات بیان کی تو آپ نے فرمایا :

انّ صلاتهٔ تنهاه يوماً

آخرکار اُس کی نماز کسی دن اُسے اِن اعمال سے روک دے گی۔[1]

(۴) نماز کا یہ اثر اِس قدر اہم ہے کہ بعض روایات میں اُسے نماز کے مقبول یا نامقبُول ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ جناب امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا ہے :

من احبّ ان يعلم اقبلت صلٰوته ام لم تقبل؟ فلينظر هل منعت صلٰوته عن الفحشآء والمنكر؟ فبقدر ما منعته قبلت منه

جو آدمی یہ جاننا چاہے کہ اُس کی نماز خدا کے حضور میں مقبُول ہوئی یا نہیں تو اُسے چاہیئے کہ یہ دیکھے کہ کیا اُس کی نماز نے اُسے فحشاء اور مُنکرات سے روکا ہے یا نہیں۔ بس اُس کی نماز نے جس قدر اُسے اِن افعال سے روکا ہے اُسی قدر اُس کی نماز مقبول ہوئی ہے۔[2]

❖ ❖ ❖

آیت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں (ولذكرُ الله اكبرُ)۔

"ذکرِ خدا اُس سے بھی زیادہ برتر و بالا ہے۔"

اس جُملے میں نماز کا ایک اہم ترین فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نماز کی برکات و آثار میں سے نہی عن الفحشآء والمنکر سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ نماز انسان کو خدا کی یاد میں مشغول کر دیتی ہے۔ یہی وُہ چیز ہے جو ہر خیر و سعادت کی بُنیاد ہے۔ یہاں تک کہ انسان کے فحشاء اور مُنکر سے بچے رہنے کا اصل عامل بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ اور حقیقت میں نماز کی جُملہ برکات میں سے اِس کی برتری کا باعث یہ ہے کہ یہی ہر خیر و سعادت کی بُنیاد ہے۔

یادِ خُدا اصولاً باعثِ حیاتِ دل اور راحت القلوب ہے۔ اور کوئی شے بھی اِس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

الا بذكر الله تطمئن القلوب

آگاہ رہو کہ یادِ خُدا ہی دلوں کے اطمینان کا سبب ہے۔ (رعد - ۲۸)

اصولی طور پر تمام عبادات خواہ وہ نماز ہو یا کوئی اور عبادت سب کی رُوح ذکرِ خُدا ہی ہے۔ نماز کے الفاظ، افعالِ نماز، مقدّماتِ نماز، اور تعقیباتِ نماز یہ سب کی سب چیزیں درحقیقت انسان کے دل میں یادِ خُدا کو زندہ کر دیتی ہیں۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ سُورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۴ میں نماز کے اِس بُنیادی فلسفے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ چنانچہ مُوسٰیؑ کو مخاطب

[1] و [2] مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

کرکے کہا گیا ہے :

اقم الصلوٰۃ لذکری

نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو۔

بزرگ مفسرین نے جملہ بالا (ولذکر اللہ اکبر) کی اِس سے مختلف تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ جن میں سے بعض کے متعلق روایاتِ اسلامی میں بھی اشارات ملتے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ :

خُدا تمہیں اپنی رحمت کے وسیلے سے یاد کرتا ہے اور تم اُسے اطاعت کے وسیلے سے یاد کرتے ہو[1]

دُوسرے یہ کہ :- ذکرِ خُدا نماز سے بھی برتر و بالاتر ہے کیونکہ ہر عبادت کی رُوح ذکرِ خدا ہی ہے۔

مذکورہ بالا تفاسیر جن میں سے بعض کا ذکر روایاتِ اسلامی میں بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اِن کا مقصود بطونِ آیت ہو۔ وگرنہ آیت کا ظاہری مفہوم تو وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر جہاں کلمۂ ذکر اللہ آیا ہے اِس سے مراد بندوں کا خدا کو یاد کرنا ہے۔ آیت بالا سے بھی ذہن اِسی مفہوم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ خُدا بندوں کو یاد کرتا ہے، تو ہو سکتا ہے کہ یہ براہِ راست نتیجہ ہو اِس بات کا کہ بندے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اِس طرح سے اِن دونوں معانی کا تضاد برطرف ہو جاتا ہے۔

معاذ بن جبل سے منقول ایک حدیث کے مطابق عذابِ الٰہی سے نجات کے لیے انسان کا کوئی عمل بھی " ذکر اللہ " سے بہتر نہیں ہے تو اس کے بارے میں لوگوں نے ان سے سوال کیا کہ کیا راہِ خدا میں جہاد بھی اس سے بہتر نہیں ہے۔ تو معاذ بن جبل نے جواب دیا ہاں۔ کیوں خدا فرماتا ہے :

ولذکر اللہ اکبر

ظاہراً یوں لگتا ہے کہ معاذ بن جبل نے یہ بات رسُول اللہؐ سے سُنی تھی کیونکہ وُہ خود بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے پیغمبرِ خُدا سے سوال کیا کہ تمام اعمال میں کونسا عمل برتر ہے ؟

تو رسول اللہؐ نے فرمایا :

اِن تموت ولسانك رطب من ذکر اللہ عزّوجلّ

یہ کہ مرتے وقت تیری زبان ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو۔

اِنسان کی نیت اور اُس کے حضورِ قلب کی کیفیت و کمیت نماز اور دیگر تمام عبادات میں مختلف رہتی ہے اِس لیے آیت کے آخر میں اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے : (واللہ یعلم ما تصنعون)۔ یعنی خدا جانتا ہے کہ تم کیا کام کرتے ہو۔

تم کونسے اعمال مخفی طور پر اور کون سے آشکارا طور پر انجام دیتے ہو۔ تمہاری کیا کیا نیتیں ہوتی ہیں اور تم زبان سے کیا کچھ کہتے ہو۔ خدا اِن سب باتوں کو جانتا ہے۔

---

[1] اِس تفسیر کے مطابق اِس مقام پر اللہ فاعل ہے۔ لیکن گزشتہ تفسیر کے مطابق آیت میں مذکور فعل کا فاعل ہے۔

فرد اور جماعت کی تربیّت میں نماز کا اثر :

اگرچہ نماز ایسی چیز نہیں کہ اُس کا فلسفہ کسی سے مخفی ہو۔ لیکن جب ہم متونِ آیات اور روایاتِ اسلامی کو دقّتِ نظر سے دیکھتے ہیں تو بہت سی باریکیاں اور نکات ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً :

۱۔ نماز کا فلسفہ اس کی رُوح و اساس، مقصد و عمل اور نتیجہ غرض سب کچھ یادِ خدا ہے۔ یعنی وہی ذکر اللہ جسے آیت بالا میں " برترین " کہا گیا ہے۔

البتہ " ذکر " ایسا ہونا چاہیئے جو تمہیدِ فکر اور فکر وہ کہ جو محرّکِ عمل ہو۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث " ولذکر اللہ اکبر " کی تفسیر میں منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا :

ذکر اللہ عند ما احل وحرم

افعال حلال و حرام کے بارے میں خدا کو یاد کرنا (یعنی خدا کا ذکر ایسا ہونا چاہیئے کہ انسان حلال کام انجام دے اور حرام سے بچے)[1]

۲۔ نماز گناہوں کو دھودیتی ہے اور خدا کی مغفرت و بخشش کا وسیلہ ہے۔ کیونکہ نماز انسان کو توبہ اور اصلاحِ عمل پر آمادہ کرتی ہے۔ اِس لیے ایک حدیث میں ہے کہ جناب رسولِ خداؐ نے اپنے اصحاب سے سوال کیا :

لوکان علی باب دار احدکم نهر واغتسل فی کل یوم منه خمس مرات اکان یبقی فی جسده من الدرن شیء ؟

قلت لا۔ قال :- فان مثل الصلوٰة کمثل النهر الجاری کلما صلی کفرّ ما بینهما من الذنوب۔

اگر تم میں سے کسی کے مکان کے دروازہ کے سامنے صاف و پاکیزہ پانی کی نہر ہو اور وہ آدمی دن میں پانچ دفعہ اُس نہر میں غسل کرے تو کیا اُس آدمی کے جسم پر کسی قسم کی کثافت اور مَیل باقی رہ جائے گا ؟

جواب میں عرض کیا گیا۔ نہیں۔

تب رسول اللہؐ نے فرمایا : نماز بھی اُسی آبِ جاری کی مانند ہے۔ جس وقت بھی انسان نماز پڑھتا ہے تو وہ گناہ جو دو نمازوں کے درمیان اُس نے انجام دیئے ہوتے ہیں، محو ہو جاتے ہیں[2]

اِس طرح سے اِنسانی رُوح پر گناہوں سے جو زخم لگ جاتے ہیں نماز کی مرہم سے بھر جاتے ہیں اور دل پر جو زنگ لگ جاتا ہے وُہ صاف ہو جاتا ہے۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۸۲ صفحہ ۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۳ صفحہ ۷ (باب ۲ از ابواب اعداد الفرائض حدیث ۳)۔

۳۔ نماز آئندہ گناہوں کے مقابلے میں دیوار بن جاتی ہے کیونکہ وہ انسان کے اندر رُوحِ ایمانی کو قوی کرتی ہے اور دل میں تقویٰ کے پودے کی پرورش کرتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایمان و تقویٰ گناہوں کو روکنے کے لیے مضبوط ترین دیواریں اور یہی وہ چیز ہے جسے زیرِ بحث آیت میں "تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔
اِس مطلب کی متعدد احادیث کے مطابق پیشوایانِ اسلام کے سامنے بعض گناہ گار لوگوں کا حال بیان کیا گیا تو اُنھوں نے فرمایا :

فکر نہ کرو۔ نماز اُن کی اصلاح کر دے گی۔

۴۔ نماز غفلت کو دُور کر دیتی ہے۔ راہِ حق کے راہیوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو بھول جائیں اور زندگی کی مادی راحتوں اور زود گزر لذّتوں میں غرق ہو جائیں۔
مگر نماز — جو کہ وقت کے مختلف فاصلوں سے ہر شب و روز میں پانچ بار ادا کی جاتی ہے۔ مسلسل انسان کو آگاہ اور متنبہ کرتی رہتی ہے۔ وُہ انسان کو اُس کا مقصدِ آفرینش سمجھاتی رہتی ہے اور دُنیا میں اس کی حیثیت اور فرصت آگاہ کرتی رہتی ہے۔ انسان کے لیے یہ ایک بڑی نعمت ہے کہ "اس کے پاس ایک ایسا وسیلہ ہے جو ہر رات دن میں اُسے چند مرتبہ خوابِ غفلت سے جگاتا رہتا ہے"۔

۵۔ نماز تکبّر اور خود بینی کو دُور کر دیتی ہے۔ کیونکہ انسان ہر شب و روز میں سترہ رکعت نماز پڑھتا ہے اور ہر رکعت میں دوبا خدا کے سامنے خاک پر پیشانی رکھتا ہے۔ اِس حالت میں اپنے آپ کو اُس کی عظمت کے سامنے صرف ایک ذرّہ ناچیز ہی نہیں بلکہ اُس کی لامحدودیت کے مقابلہ میں ایک صفر سمجھتا ہے۔
نماز انسان کے غرور اور خُود پرستی کو دُور کر دیتی ہے نیز تکبّر اور احساسِ برتری کو ختم کر دیتی ہے۔
امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام نے اپنی اُس معروف حدیث میں جس میں عباداتِ الٰہی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے، ایمان کے بعد نماز کہ جو افضل عبادات ہے، کی یہی غایت بیان فرمائی ہے :

فرض اللّٰہ الایمان تطھیرًا من الشرك والصلٰوۃ تنزیھا عن الکبر

خدا نے ایمان کو شرک کی نجاست سے پاک کرنے کے لیے فرض کیا اور نماز کو تکبّر سے پاک کرنے کے لیے۔ (نہج البلاغہ کلمات قصار ۲۵۲)۔

۶۔ نماز انسان کے فضائلِ اخلاق اور اس کے کمالِ رُوحانی کی پرورش کا وسیلہ ہے کیونکہ وہ انسان کو عالمِ مادّی اور عالمِ طبیعت کی چار دیواری سے آزاد کرتی ہے اور اُسے ملکوتِ آسمانی کی طرف بلاتی ہے۔ اُسے فرشتوں کے ساتھ ہم صدا اور ہم راز کر دیتی ہے۔ انسان حالتِ نماز میں اپنے آپ کو بلاواسطہ خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اُس سے باتیں کر رہا ہوں۔
شب و روز میں انسان کئی مرتبہ اِس عمل کی تکرار کرتا ہے۔ اِس صُورت میں کہ انسان خُدا کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت اور

اُس کی عظمت کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اور سُورۂ الحمد کہ جو نیکی اور پاکبازی کی بہترین رہبر ہے، کے بعد قرآن کی دوسری آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ عمل نفسِ انسانی میں بہترین فضائلِ اخلاق کی پرورش کرتا ہے۔
حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام نے فلسفہ نماز کے متعلق ایک حدیث میں فرمایا :

الصّلٰوۃ قربان کلّ تقی

نماز ہر پرہیزگار کے لیے تقربِ الٰہی کا وسیلہ ہے[1]

۷۔ نماز انسان کے تمام اعمال کو قدر و قیمت اور رُوح عطا کرتی ہے۔ کیونکہ نماز انسان کے اندر رُوحِ اخلاص کو زندہ کرتی نماز نیّتِ خالص، گفتارِ پاک اور اعمالِ صالح کا مجموعہ ہے۔ رات دن میں اِن تمام چیزوں کی تکرار انسان کی رُوح میں تمام اعمالِ خیر کا بیج بو دیتی ہے۔ اور نفس کی کیفیت اخلاص کو تقویت بخشتی ہے۔
ایک مشہور روایت میں ہے کہ جب امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کا سرِ اقدس ظالم ابن ملجم کی تلوار سے شگافتہ ہو چکا تھا تو آپؑ نے اپنی وصیتوں میں یہ بھی فرمایا :

اللّٰہ اللّٰہ فی الصلٰوۃ فانھا عمود دینکم

نماز کے بارے میں خُدا سے ڈرو، خُدا سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے[2]

یہ مُسلّم ہے کہ اگر چوبِ خیمہ ٹوٹ جائے یا گر پڑے تو خیمے کی طنابیں یا میخیں خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں وہ بے فائدہ ہیں۔ اِسی طرح اگر نماز کے وسیلے سے بندوں کا خدا سے تعلق باقی نہ رہے، تو دُوسرے اعمال بے اثر ہو جاتے ہیں۔
امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک حدیث مروی ہے :

اوّل ما یحاسب بہ العبد الصلٰوۃ فان قبلت قبل سائر عملہ وان ردّت ردّ علیہ سائر عملہ۔

قیامت میں جس چیز کا سب سے پہلے بندوں سے حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اگر خدا نے نماز کو قبول کر لیا تو دیگر اعمال بھی مقبول ہو جائیں گے اور اگر وہ ردّ کر دی گئی تو تمام اعمال ردّ ہو جائیں گے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نماز خالق و مخلوق کے درمیان ایک راز ارتباط ہے۔ اگر نماز اپنی شرائط کے ساتھ صحیح طور پر ادا ہو جائے تو اُس میں قربت اور اخلاص کے جذبات کہ جو جملہ اعمال کی قبولیت کی بُنیاد ہیں، فطرتاً پیدا ہو جاتے ہیں اور اگر اخلاص اور نیّت صادق نہ ہو تو تمام اعمال بیکار اور غیر نتیجہ بخش ہیں اور اعتبار کے درجے سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

۸۔ مشتملاتِ نماز سے قطع نظر اگر نماز اپنی شرائط کے ساتھ توجہ سے ادا کی جائے تو وہ انسان کو تقویٰ کا عادی بناتی ہے کیونکہ — ہم جانتے ہیں کہ صحتِ صلوٰۃ کی شرائط میں یہ اُمور شامل ہیں کہ نمازگزار کا مکان، اُس کا لباس، وہ فرش

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۱۳۶۔
[2] نہج البلاغہ، وصیت ۴۷۔

جس پر وہ نماز پڑھتا ہے ، وہ پانی جس سے وضو اور غُسل کرتا ہے اور وہ مقام جہاں وہ غُسل اور وضو کرتا ہے، اُن سب کو غصب سے مبرا اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز سے پاک ہونا چاہیئے ۔
جس آدمی کا کردار تجاوز ، ظلم ، سُود خوری ، غصب ، کم فروشی ، رشوت خوری اور کسب اموالِ حرام سے آلودہ ہو تو وہ ادائے نماز کی شرائط کو کیونکر پُورا کر سکتا ہے ۔

اِس بنا پر رات دن میں پانچ مرتبہ نماز کی تکرار بنی نوع انسان کے حقوق کا احترام کرنے کی تعلیم دیتی ہے ۔

۹۔ نماز کے لیے ، اُن شرائط کی صحت کے علاوہ جو اُس کی قبولیت کے لیے لازمی ہیں کچھ اور شرائطِ کمال بھی ہیں کہ اُن کا لحاظ رکھنا بہت سے گناہوں کے ترک کرنے کے لیے مؤثر ہے ۔ علم فقہ اور حدیث کی کتابوں میں ایسے بہت سے امور کا ذکر ہے جن کی وجہ سے نماز قبول نہیں ہوتی ۔ اُن میں سے ایک شراب خوری بھی ہے ۔ روایات میں ذکر ہے کہ :-

لا تقبل صلٰوۃ شارب الخمر اربعین یومًا الّا ان یتوب

شراب خوار کی نماز چالیس روز تک قبول نہیں ہوتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ توبہ کرے۔[1]

متعدد روایات میں ہے کہ جن لوگوں کی نماز قبول نہیں ہوگی اُن میں سے ظالم رہنما بھی ہے۔[2]
بعض دوسری روایات میں یہ تصریح موجُود ہے کہ جو آدمی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اُس کی نماز قبول نہیں ہوگی ۔ اِسی طرح اور روایات میں آیا ہے کہ حرام غذا کھانے ، غرور و تکبّر اور خود بینی سے بھی نماز قبول نہیں ہوتی ۔ ظاہر ہے کہ قبولیت نماز کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھنے سے کیسی تربیتِ اخلاق ہوتی ہے ۔

۱۰۔ نماز انسان میں نظم و ضبط کی عادت پیدا کرتی ہے کیونکہ اُسے لازماً معین وقت پر ادا کرنا ہوتا ہے ۔ ہر نماز کی ادائیگی میں تقدیم یا تاخیر دونوں سے نماز باطل ہو جاتی ہے ۔ اِسی طرح سے نماز کے دیگر آداب و احکام ہیں ، مثلاً نیت ، قیام و قعود رکوع و سجود وغیرہ کہ جب اِنسان اِن سب کو پُوری توجہ کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے تو اُس کے کردار اور اُس کی زندگی کے نظام میں نظم و ضبط کا پیدا ہو جانا آسان ہو جاتا ہے ۔

نماز با جماعت سے قطع نظر کرتے ہوئے فُرادیٰ نماز میں یہ تمام فوائد مضمر ہیں ۔ اور ہم اِن پر خصوصیاتِ جماعت کا اضافہ کریں کہ جو رُوحِ نماز کا تقاضا ہے تو نماز میں اور بھی بے شمار برکات ہیں ، جن کے تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے ۔ علاوہ بریں ہم سب ہی کم و بیش اُنھیں جانتے ہیں ۔
فلسفہ و اسرارِ نماز کے متعلق امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السّلام کی ایک جامع حدیث نقل کر کے ہم اپنے بیان کو ختم کرتے ہیں ۔

امامؑ کی خدمت میں ایک خط آیا جس میں فلسفۂ نماز کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو اُس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :
نماز کے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی ادائیگی کے دوران میں اِنسان کی توجہ اللہ کی طرف رہتی ہے اور

[1] بحار الانوار ، ج ۸۴ صفحہ ۳۱۷ تا صفحہ ۳۲۰ ۔
[2] بحار ، ج ۸۴ صفحہ ۳۱۸ ۔

وہ اپنے پروردگار کی ربوبیت کا اقرار کرتا رہتا ہے ۔ نمازی آدمی شرک و بُت پرستی کے خلاف جنگ کرتا ہے ، اپنے پروردگار کے حضور نہایت خضوع و خشوع سے کھڑا ہوتا ہے ، وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے ، اپنے گزشتہ گناہوں کی خدا سے بخشش طلب کرتا ہے ۔ اور ہر روز خدا کی تعظیم کے لیے زمین پر پیشانی رکھتا ہے ۔
نماز کا مقصود یہ بھی ہے کہ انسان ہمیشہ ہوشیار رہتا ہے اور اس بات کو یاد رکھتا ہے کہ خدا سے غفلت کا گرد و غبار اُس کے دل پر نہ بیٹھنے پائے ، وہ دنیا کی دولت پرست و مغرور نہ ہو جائے ، بلکہ ہمیشہ خدا کے حضور میں خضوع و خشوع کی حالت میں رہے اور اُسی سے دُنیا کی دولت اور دین کی نعمات میں اضافے کا طالب ہو ۔
علاوہ بریں ذکرِ خدا کا تسلسل کہ جو نماز کے سبب سے حاصل ہوتا ہے ، اِس امر کا مُوجب ہوتا ہے کہ انسان اپنے مولا ، مُدبّر اور خالق کو فراموش نہیں کرتا اور اُس پر سرکشی کے جذبات کا غلبہ نہیں ہوتا ۔
خُدا کی طرف یہی توجہ اور اُس کی درگاہ میں حاضری انسان کو گناہوں سے باز رکھتی ہے اور طرح طرح کی بُرائیوں سے بچاتی ہے۔[1]

[1] وسائل الشیعہ ، جلد ۳ صفحہ ۷ ۔

۴۶۔ وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوٓا اٰمَنَّا بِالَّذِىٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

۴۷۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ○

۴۸۔ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○

۴۹۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ اور تم اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر احسن طریقے سے، سوائے اُن لوگوں کے جو ظلم کے مرتکب ہوں اور اُن سے کہو کہ خدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر نازل ہُوا ہے اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور

ہم اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

۴۷۔ اس طرح ہم نے تمہارے اُوپر کتاب نازل کی ہے پس جن لوگوں کو ہم نے اس سے قبل آسمانی کتاب دی تھی وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور (مشرکین کے) اس گروہ میں سے بھی بعض اس پر ایمان لائیں گے اور ہماری آیات کا کفار کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا۔

۴۸۔ اور تم نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ ضرور شک کرتے کہ جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے درپے ہیں۔

۴۹۔ بلکہ یہ (کتاب آسمانی) روشن آیات ہیں جو اُن لوگوں کے سینوں میں ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۔ اور ظالموں کے سوا ہماری آیات کا کوئی انکار نہیں کرتا۔

تفسیر

بحث کے لیے بہترین روش اختیار کرو :

گزشتہ آیات میں جاہل اور آمادہ بجنگ بُت پرستوں کے متعلق گفتگو تھی، جس کا لہجہ مقتضائے حال کے مطابق تند اور سخت تھا۔ اُن میں اُن کے معبودوں کو تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور بتایا گیا تھا۔

لیکن آیاتِ زیرِ بحث میں اہلِ کتاب سے بحث و مباحثہ کا ذکر ہے کہ وہ عُمدہ طریقہ سے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انھوں نے کُتبِ آسمانی اور انبیاء کے احکامات کچھ تو سُنے تھے۔ اور مُدلّل بات سُننے کے لیے وُہ کچھ زیادہ آمادہ تھے۔ یوں بھی ہر آدمی سے اس کی عقل و علم اور اخلاق کے معیار کے مطابق گفتگو کرنی چاہیئے۔

اس سلسلے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے کہ بجز اُس روش کے جو سب سے بہتر ہے اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو (ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن)[1]

"لا تجادلوا" کا مادہ "جدال" ہے۔ اس کے حقیقی معنی رسّی کو بٹنے، بل دینے اور اسے مضبُوط کرنے کے ہیں۔ یہ کلمہ مضبُوط عمارت وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

جب دو آدمی کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں۔ تو ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وُہ دوسرے کو اُس کے عقیدے سے

[1] اَلّتی موصوف مقدر کی صفت ہے مثلاً "الطریقة"۔

موڑدے اس وجہ سے اِس عمل کو " مجادلہ " کہتے ہیں۔ کُشتی لڑنے کو بھی " جدال " کہتے ہیں۔ بہرکیف اس مقام پر " تجادلوا " سے مُراد مُدلّل گفتگو ہے۔

اِس مقام پر " التی ھی احسن " کہنا نہایت جامع تعبیر ہے کیونکہ یہ الفاظ مباحثے میں ہر لحاظ سے صحیح اور مناسب طریقہ اختیار کرنے کا مفہوم لیے ہوئے ہیں خواہ وہ الفاظ کا استعمال ہو، خواہ گفتگو کے مشمولات ہوں، خواہ طرزِ گفتگو ہو، خواہ گفتگو کے دوران میں دیگر امور ہوں۔

بنا بریں اِس جُملے کا مفہوم یہ ہے کہ بدورانِ مباحثہ، تمہارے الفاظ مؤدبانہ ہوں، گفتگو کا لہجہ دوستانہ ہو اور مضمون مُدلّل ہو۔ آہنگِ صدا میں شور و غل، خشونت اور ہتکِ احترام کا شائبہ نہ ہو۔ اسی طرح ہاتھوں اور چشم و ابرو کی حرکات جن سے انسان اپنا مطلب واضح کرتا ہے نہایت مہذب ہوں۔

تعبیراتِ قرآن بھی کیسی جامع ہیں کہ ایک مختصر سے جُملے میں معنی کی ایک دُنیا، پوشیدہ ہے۔

یہ نصیحت اِس وجہ سے کی گئی ہے کہ اِسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث کی غایت طرفِ مقابل کو شرمندہ کرنا، اُسے شکست دینا یا اس پر تفوق حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ طرفِ ثانی کے دل میں ہمارے کلام کا اثر ہو اور حق اس کی رُوح کی گہرائی میں اُتر جائے۔ یہ مقصود بہترین طور پر اُسی اندازِ گفتگو سے حاصل ہو سکتا ہے جس کی قرآن میں نصیحت کی گئی ہے۔

حتیٰ کہ ایسا کرنا ہوتا ہے کہ انسان کسی کے سامنے قولِ حق کو اگر اس طرح پیش کرے کہ حرفِ ثانی کو خیال پیدا ہو کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے، تو وہ حق کی طرف بہت جلد مائل ہو جاتا ہے کیونکہ اِنسان اپنے افکار سے اپنی اولاد کی طرح پیار کرتا ہے۔

اِسی وجہ سے کہ قرآن مجید میں بہت سے مسائل سوالیہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ تاکہ اِس سوال کا جواب مخاطب کے دل سے موج زن ہو اور وہ اُسے اپنی ہی بات سمجھے۔

مگر ہر قانون میں اِستثنا بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اسی اسلامی اصولِ بحث کے تحت نرم گفتاری اور حُسنِ تکلّم کو بعض اوقات فریقِ مخالف مؤقف کی کمزوری پر محمول کر سکتا ہے یا ممکن ہے کہ یہ مبنی بر انسانیت شیوۂ گفتار طرفِ مقابل کی جرأت اور جسارت میں اضافہ کر دے۔ اِسی لیے آیت کے آخر میں اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے مگر اُن لوگوں کے ساتھ یہ اُسلوبِ گفتگو اختیار نہ کرو جنھوں نے اِن میں سے ظلم کیا ہے: (الّا الّذین ظلموا منھم)۔

یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اُوپر اور دُوسروں پر ظلم کیا اور اُنھوں نے بہت سی آیاتِ الٰہی کو چھپایا تاکہ لوگ پیغمبرِ اسلامؐ کے اوصاف سے آشنا نہ ہوں۔

وُہ لوگ کہ جنھوں نے ظلم کیا۔ اور ــ خدا کے اُن احکامات کی توہین و تحقیر کی جو اُن کے مفاداتِ دُنیا کے خلاف تھے۔

وُہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا اور مشرکین کی طرح دین میں خرافات شامل کر لیں مثلاً: حضرت مسیح یا عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔

مختصر یہ کہ ــ اُن لوگوں کے ساتھ نرم گفتاری لاحاصل ہے کہ جنھوں نے ظلم کیا ہے اور استدلالی گفتگو کی بجائے تلوار کھینچ لی اور دلیل کی بجائے طاقت پر بھروسا کیا اور امن و صلح کی بجائے شیطنت اور شرارت پر اُتر آئے۔

آیت کے آخر میں " مجادلۂ احسن " کی ایک ایسی مثال پیش کی گئی ہے کہ وُہ اِس قسم کی بحثوں کے لیے ہمیشہ ایک نادر نمونہ ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: تم ان سے کہو کہ ہم اُس پر جو خدا کی طرف سے ہم پر اور تم پر نازل ہوا ہے، ایمان رکھتے ہیں، تمہارا اور ہمارا معبُود ایک ہے اور ہم اُس کی اطاعت کرتے ہیں: (وقولوا اٰمنا بالذی اُنزل الینا وانزل الیکم و الٰھنا والٰھکم واحدٌ ونحن لہٗ مسلمون)۔

اِس آیت میں گفتگو کا کیا ہی دلچسپ اسلوب اور کیسا ہی پیارا طرز ہے۔ اُس شے پر جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے ایمان اور عقیدہ کی ہم آہنگی ہے۔ تمام تعصبات کو دُور کر دیا گیا ہے۔ ہم اور تم کا تفرقہ مٹا دیا گیا ہے اور آخر میں توحیدِ باری تعالیٰ کا اقرار ہے اور غیر مشروط طور پر اُس کی اطاعت کا اقرار ہے۔

" مُجادلۂ احسن " کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جو کوئی اُسے سُنتا ہے وہ طبعاً پسند کرتا ہے۔ یہ اسلوبِ گفتگو ثابت کرتا ہے کہ اسلام " گروہ بندی " نہیں چاہتا اور نہ وہ بنی نوع میں تفرقہ اندازی کو پسند کرتا ہے۔ اسلام تو صرف وحدت کی دعوت دیتا ہے، ہر حق بات کو مان لینے کی نصیحت کرتا ہے۔

اس قسم کی بحث کے نمونے قرآن میں بکثرت ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کی طرف امام صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں:

" مجادلۂ احسن " کی مثال وہ گفتگو ہے جو " سورہ یٰسین " کے آخر میں منکرینِ معاد کے سلسلے میں آئی ہے۔

وہ مُنکرین جب ایک بوسیدہ ہڈی کو رسول اللہؐ کے سامنے لائے اور کہا کہ کس میں یہ قدرت ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کر دے؟ تو جواب میں آنحضرتؐ نے فرمایا:

" یحییھا الذی انشأھا اول مرّۃ ...... "

وہی خدا جس نے پہلے پیدا کیا تھا زندہ کرے گا۔ وہی خدا جو سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کرتا ہے[1]

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد کی آیت اُن چار اصولوں کی تاکید کے طور پر آئی ہے جو آیتِ ماقبل میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: ہم نے تم پر اِسی طرح کتاب آسمانی نازل کی ہے: (وکذٰلک انزلنآ الیک الکتاب)۔

اِس قرآن کے نزول کی اساس یہ ہے کہ ذاتِ معبُود واحد و یکتا ہے، تمام پیمبرانِ برحق کی دعوت کی غایت ایک ہی تھی، فرمانِ الٰہی کی بے چون و چرا اطاعت کی جائے اور لوگوں سے مجادلہ و مباحثہ بہترین طریقہ پر کیا جائے۔

بعض مفسّرین کی رائے یہ ہے کہ اِس جُملے میں پیغمبرِ خداؐ پر نزولِ قرآن کو، انبیاءؑ ماقبل پر نازل ہونے والی کتابوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے گزشتہ پیمبروں پر آسمانی کتابیں نازل کیں اسی طرح تم پر بھی قرآن نازل کیا ہے۔

مگر پہلی تفسیر زیادہ پُرمعنی معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند کہ دونوں تفاسیر کو قبول کر لینا بھی ممکن ہے۔

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۶۳۔

اس کے بعد قرآن اضافہ کرتا ہے : وہ لوگ جنھیں ہم نے اس سے قبل آسمانی کتاب دی تھی (اور وہ واقعی اس کی اتباع کرتے ہیں) وہ اس کتاب پر ایمان لے آئیں گے : (فالذین اٰتیناھم الکتاب یؤمنون بہ)۔

کیونکہ اُنھوں نے اِس کتاب کی صداقت کی نشانیاں اپنی کتاب میں دیکھی ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اُصولی طور پر اس کتاب کے مضامین کو اپنی کتاب کے مضامین سے ہم آہنگ پاتے ہیں۔

مگر ہم جانتے ہیں کہ تمام اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) پیمبرِ اسلامؐ پر ایمان نہیں لائے۔ اِس بنا پر یہ جملہ اُن حقیقی اور طالبانِ حق مومنین کے لیے آیا ہے جو ہر قسم کے تعصبات سے پاک تھے اور جن کے لیے درحقیقت "اہلِ کتاب" کی صفت موزوں تھی۔

اس کے بعد مزید کہا گیا ہے : ان میں سے بھی ایک گروہ (اہلِ مکہ و مشرکینِ عرب) اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے۔ (ومن ھٰؤلاء من یؤمن بہ)[1]

آیت کے آخر میں دونوں قسم کے کفار کے متعلق کہا گیا ہے : ہماری آیات کا کفار کے علاوہ کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ (وما یجحد باٰیاتنا الا الکافرون)[2]

"جحد" کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا معتقد تو ہو مگر بظاہر اُس کا انکار کرتا ہو۔ لہٰذا مذکورہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ درحقیقت کفار اپنے دل میں ان آیات کی عظمت کے معترف تو ہیں اور وہ اس کلام میں صداقت و راستی کی علامات کا ادراک بھی کرتے ہیں۔ نیز جناب رسالت مآبؐ کی پاکیزہ سیرت اور اُن کے پیروکاروں کے مخلصانہ کردار کو دیکھ کر وہ اس کلام کی حقانیت کے قائل ہیں مگر بزرگوں کی کورانہ تقلید، جاہلانہ تعصب، اور نامشروع اور وقتی دُنیاوی مفاد کا خیال اُنھیں انکار پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اور کلمۃ الحق کہنے سے روکے رکھتا ہے۔

اِس ترتیب سے خدا نے قرآن کے مقابلہ میں مختلف اقوام کے مواقف کو بیان کیا ہے۔

اُن میں سے ایک صف میں اہلِ ایمان ہیں۔ چاہے وہ علمائے اہلِ کتاب اور ان میں سے راست باز مومنین ہوں۔ یا وہ مُشرک ہوں، جو تشنۂ حق تھے مگر جب اُنھوں نے حق کو پالیا تو اُس سے دل لگا لیا۔

دُوسری صف میں ہٹ دھرم منکرین ہیں۔ جنھوں نے حق کو دیکھا مگر چمگادڑ کی طرح اُس نور سے چھپ گئے کیونکہ اُن کے تار و پُود میں کفر کی ظلمت سمائی ہوئی تھی، اِس لیے اُنھیں نورِ ایمان سے وحشت تھی۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ گروہِ ثانی نزولِ آیات سے پہلے بھی کافر ہی تھا۔ لیکن اُن کے کُفر پر تاکید مزید ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ اِس سے قبل اُن پر اتمامِ حُجت نہ ہوئی تھی۔ اب اتمامِ حجت کے بعد اُن کا کُفر حقیقی ثابت ہوگیا ہے۔ وہ یہ کہ علم و آگاہی

---

[1] بعض مفسرین نے جملہ "الذین اٰتیناھم الکتاب" کا اشارہ مُسلمانوں کی طرف سمجھا ہے اور "من ھٰؤلاء من یؤمن بہ" سے اہلِ کتاب مُراد لی ہے۔ مگر یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے۔ کیونکہ "الذین اٰتیناھم الکتاب" اور اسی جیسی تعبیرات قرآن میں یہود و نصاریٰ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوئیں۔

[2] راغب، مفردات میں کہتے ہیں: "جحود" کے معنی ہیں اُس بات کی نفی جس کا دل میں اثبات ہو اور اس بات کا اثبات جس کی دل میں نفی ہو۔

کے باوجود وہ راہِ مستقیم کو چھوڑ کر دانستہ گمراہ ہوئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد پیمبرِ اسلامؐ کے دعویٰ کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے (جو کہ حقیقت میں آیۂ گزشتہ کے مضمون پر تاکید ہے) فرمایا گیا ہے :

اے رسُولؐ ! تم نے قرآن نازل ہونے سے قبل کوئی کتاب نہیں پڑھی اور تم ہرگز اپنے ہاتھ سے کچھ نہ لکھتے تھے، تاکہ ایسا نہ ہو کر تمہارے وُہ دشمن جو ہر وقت تمہاری دعوت کی تکذیب کی فکر میں رہتے ہیں، اُنھیں شک و تردّد کا موقع مل جائے اور وہ کہیں کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وُہ پُرانی کتابوں کے مطالعے اور اُن سے اخذ و نقل کا نتیجہ ہے : (وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک اذًا لارتاب المبطلون)[1]

اے رسولؐ ! تم ہرگز مکتب میں نہیں گئے اور کبھی عبارت نہیں لکھی لیکن وحی الٰہی کے ذریعے مدرسین کو پڑھانے والا معاملہ ہوگیا۔ بھلا اِس بات کا کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے نہ تو کبھی سبق پڑھا ہو، نہ کبھی کسی اُستاد اور مکتب کی شکل دیکھی ہو اور وہ اپنی طرف سے ایک کتاب تصنیف کر کے لے آئے اور تمام بنی نوعِ اِنسان کو مقابلے کا چیلنج کر دے اور سب لوگ اُس جیسی کتاب تصنیف کرنے سے عاجز ہو جائیں ؟

کیا۔ رسُول کا یہ اعجاز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی لامحدود قدرت کی وجہ سے ظہور میں آ رہا ہے اور اُنھوں نے جو کتاب پیش کی ہے وہ آسمانی ہے جو کہ خدا کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ہے۔

اگر کوئی شخص بطورِ اعتراض یہ کہے کہ ہم یہ کیونکر جانیں کہ پیمبرِ اسلامؐ نہ کبھی کسی مکتب میں گئے اور نہ لکھنا ہی سیکھا ؟

تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں رہتے تھے جس میں لکھے پڑھے لوگ بہت ہی محدود اور گنے چُنے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ تمام شہرِ مکہ میں سترہ آدمیوں سے زیادہ لکھنے پڑھنے کے قابل نہ تھے۔ ایسے معاشرے میں اگر کوئی مکتب میں جائے اور پڑھنا لکھنا سیکھے تو وہ اپنے آپ کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ تو ہر طرف مشہور ہو جائے گا اور اُسے تعلیم دینے والے اُستاد کو بھی لوگ جانتے ہوں گے۔

بھلا ایسا آدمی کیونکر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں پیمبرِ برحق ہوں اور کیونکر ایسا سفید جھوٹ بول سکتا ہے ؟

بالخصوص یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی تھیں جہاں پیمبرِ خداؐ پلے بڑھے تھے اور وہ بھی اُن ہٹ دھرم دشمنوں کے سامنے جن کی نظر سے چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی چھُپی نہیں رہ سکتی تھی۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد کی آیت میں حقانیتِ قرآن کے اور دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے : یہ کتاب آسمانی ایسی آیاتِ بیّنات کا مجموعہ ہے جن کی جگہ اہلِ علم کے سینوں میں ہے۔ (بل ھو اٰیاتٌ بیّناتٌ فی صدور الذین اُوتوا العلم)۔

---

[1] "من قبلہ" میں جو ضمیر ہے اس کا مرجع قرآن ہے اور کلمہ "یمین" (دایاں ہاتھ) اس لیے کہا کہ عام طور پر انسان داہنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ مُبطلون، "مبطل" کی جمع ہے اور یہ اُس آدمی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو باطل کرنے کے درپے ہو۔

کلمہ "آیات بینات" اس امر کا مظہر ہے کہ حقانیت قرآن کے دلائل خود اسی میں موجود ہیں، وہ آیات ہی سے روشن ہیں اور یہ آیات خود اپنی صداقت کی دلیل ہیں۔

یہ آیاتِ قرآن خدا کی آیاتِ تکوینی کی طرح ہیں کہ انسان جن کے مطالعے سے کسی دوسری چیز کی احتیاج کے بغیر حقیقت کو پالیتا ہے۔ یہ آیاتِ تشریعی اگر انھیں بغور دیکھا جائے تو اپنے مشمولات کے لحاظ سے خود ہی اپنی صداقت کی دلیل ہیں۔

علاوہ بریں ان آیات کے طرف دار اور گرویدہ وہ لوگ ہیں جنھیں علم و معرفت حاصل ہے۔ ہر چند کہ وہ تہی دست اور پا برہنہ ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی فکر و خیال کی وقعت اور قدر کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اُس مکتبِ فکر کے حامی کون لوگ ہیں۔ اگر اُس کے بانی کے گرد نادان یا چالاک و عیار لوگ جمع ہو گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی قماش کا ہوگا۔ لیکن اگر اُس مکتبِ فکر کے حامی وہ لوگ ہیں جن کے سینے میں اسرارِ علوم پوشیدہ ہیں تو یہ اُس فکر کی حقانیت کی دلیل ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صداقتِ قرآن کے حامیوں اور عاشقوں میں علمائے اہلِ کتاب کا ایک گروہ اور حضرت ابوذرؓ، حضرت سلیمان، حضرت مقداد، حضرت عمار یاسر اور حضرت علیؑ جیسی بلند شخصیتیں تھیں۔

اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات مروی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت "اہل بیت" کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ مگر آیت کا مفہوم اسے منحصر نہیں کرتا اس لیے یہ روایات "الذین اوتوا العلم" کا واضح مصداق بتاتی ہیں۔[1]

اگرچہ بعض روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس آیت میں "الذین اوتوا العلم" سے خصوصیت سے مراد آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ در حقیقت یہ قرآن کے علم کامل کے مرحلے کی طرف اشارہ ہے جو انھیں عطا ہوا ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ دیگر علماء اور صاحبانِ عقل و خرد بھی علوم قرآنی سے بہرہ ور ہوں۔

ضمناً: اس آیت سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ علم و دانش کا انحصار صرف کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے اور کتاب پڑھنے پر نہیں ہے کیونکہ آیاتِ گزشتہ سے صریحاً یہ ثابت ہے کہ رسول اللہؐ کبھی کسی مکتب میں نہیں گئے تھے اور اُنھوں نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا مگر پھر بھی وہ "الذین اوتوا العلم" کے بہترین اور افضل ترین مصداق ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ علم رسمی کے ماورا ایک برتر علم ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے قلب میں بصورتِ نُور ودیعت کیا جاتا ہے:

العلم نورٌ یقذفه الله فی قلب من یشاءُ

اور در حقیقت جوہرِ علم یہی ہے۔ باقی تو پوست اور چھلکا ہے۔

اس آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے۔ عناد پیشہ ستمگروں کے علاوہ کوئی بھی ہماری آیات کا انکار نہیں کرتا (وما یجحد بآیاتنا الا الظالمون)۔

کیونکہ اُن آیات کے معانی و مفاہیم روشن ہیں اور وہ پیغمبرؐ اُنھیں لایا ہے۔ جس نے کبھی سبق نہیں پڑھا اور اُمّی ہے۔ اور صاحبانِ فکر اہلِ علم اُن پر ایمان لائے ہیں۔

[1] یہ روایات تفصیلی طور پر تفسیر برہان کی جلد ۳ صفحہ ۲۵۲ پر مذکور ہیں۔

علاوہ بریں مجموعی طور پر ان آیات کے مضامین اور مشمولات روشن و آشکارا ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں بینات کہتے ہیں اور گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی اُن کے مضامین آئے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود کیا سوائے اُن لوگوں کے جو نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ معاشرے پر ظلم کرتے ہیں، کوئی شخص بھی اُن کا انکار کر سکتا ہے؛ (بطور تکرار تحریر ہے کہ کلمہ "جحد" اُس مقام پر بولا جاتا ہے کہ انسان کسی چیز کا جان بوجھ کر انکار کرے)۔

چند اہم نکات

۱۔ **ہمارے محبوب پیمبر جو کبھی مکتب میں نہیں گئے:** یہ درست ہے کہ لکھنا پڑھنا ہر انسان کے لیے باعثِ کمال سمجھا جاتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے عدم واقفیت ہی کمال بن جاتا ہے۔ یہ اصول حضرت خاتم الانبیاءؐ پر بالخصوص صادق آتا ہے۔

کیونکہ: بالفرض اگر کوئی تعلیم یافتہ عالم یا کوئی آگاہِ علوم اور کثیر المطالعہ فلسفی نبوّت کا دعویٰ کرے اور قوم کے سامنے کوئی کتاب یہ کہہ کر پیش کرے کہ "یہ کتاب آسمانی ہے" تو اس صورت میں قوم کی طرف سے شکوک پیش آنے کا امکان ہے کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب خود اسی شخص نے تصنیف کر لی ہو۔ لیکن ـــــ اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک علمی لحاظ سے پس ماندہ قوم میں سے ایک ایسا انسان اُٹھتا ہے جس نے کبھی کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، کوئی کتاب نہیں پڑھی اور نہ کبھی کوئی صفحہ لکھا اور وہ ایک ایسی عظیم المرتبت کتاب پیش کرتا ہے جو نہایت بلند اور عالی مضامین پر مشتمل ہے تو یہ ادراک کرنا قطعی آسان ہے کہ یہ کتاب اُس کی تصنیف یا تخلیق فکر نہیں ہے۔ بلکہ وحی آسمانی اور تعلیم الٰہی کا نتیجہ ہے۔

قرآن کی دوسری آیات میں آنحضرتؐ کے لیے کلمہ "اُمّی" استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت اس کلمہ کی تین تفسیریں لکھی ہیں۔ اُن میں سے بہتر تفسیر "درس ناخواندہ" ہے۔ در حقیقت حجاز میں کوئی مدرسہ نہ تھا کہ جہاں پیمبر اسلامؐ تعلیم حاصل کرتے اور نہ کوئی معلّم تھا جس سے علمی استفادہ کر سکتے۔ ہم نے اس سے پہلے یہ کہا ہے کہ مکہ میں ایسے لوگ جو لکھ پڑھ سکتے تھے، سترہ[1] سے زیادہ نہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت صرف ایک ہی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔

یہ امر خلافِ فطرت ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں مبادی علم سے آشنا لوگ بھی اس قدر کمیاب اور انگشت شمار ہوں اگر کوئی آدمی صاحبِ علم و معرفت ہو اور لوگ اُسے نہ جانتے ہوں۔ ان میں سے اگر کسی نے قطعی طور پر یہ کہا ہو کہ میں نے ذرا بھی تعلیم حاصل نہیں کی اور اُس کے اس دعویٰ پر کسی نے بھی شک نہ کیا ہو تو یہ واقعہ مدعی کے صدقِ قول پر دلیل ہے۔

بہرحال آیات زیر بحث میں جناب رسالت مآبؐ کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے وہ اعجاز قرآن کو ثابت کرنے اور بہانہ جو لوگوں کی بہانہ شکنی کے لیے نہایت مؤثر اور کافی ہے۔

[1] فتوح البلدان بلاذری طبع مصر ص ۴۵۹

جی ہاں! رسالت مآبؐ بے نظیر اور عظیم عالم تھے۔ آنحضرتؐ نے صرف مکتب وحی میں تحصیلِ علم کی تھی۔

بعض لوگوں کے لیے جو ایک بہانہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے بعثتِ نبوّت سے پہلے ملکِ شام کے ایک دو سفر کیے تھے۔ (وہ بھی قلیل مُدّت کے لیے جس میں آپ تجارتی کاروبار میں مصروف رہے تھے) تو ممکن ہے اُن ایک دو سفروں میں آپؐ علمائے اہلِ کتاب سے ملے ہوں اور اُن سے دینی مسائل تحصیل کیے ہوں۔

اس ادّعا کے ضُعف کی دلیل خُود اسی میں پوشیدہ ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسا انسان جس نے کبھی مکتب کا مُنہ نہیں دیکھا نہ کوئی حرف پڑھا وہ پیمبرانِ گزشتہ کی تمام تاریخ، احکام و قوانین اور معارفِ عالی کو لوگوں سے سُن کر اتنی جلد یاد کر لے اور اُنھیں تئیس سال کی مُدّت میں بروئے کار لائے اور جب اُسے ایسے مسائل سے سابقہ پڑے جن کے پیش آنے کا کبھی گمان بھی نہ ہو تو اس کا ردِ عمل نہایت حق بجانب ہو۔

یہ بات ٹھیک ویسی ہی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص نے تمام طبّی علوم چند روز میں ازبر کر لیے ہیں کیونکہ وہ فلاں ہسپتال میں ڈاکٹروں کو بیماروں کا علاج کرتے دیکھتا رہا تھا۔ یہ بات تو بالکل مذاق معلوم ہوتی ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ لازمی ہے کہ یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کو نبوّت پر فائز ہونے کے بعد تعلیماتِ الٰہی کے ذریعے پڑھنے لکھنے پر قدرت حاصل ہو گئی ہو۔ اگرچہ کسی تاریخ میں بھی یہ نہیں لکھا کہ آپؐ نے رسمی طور پر تحصیلِ علم کی ہو، آپؐ کوئی تحریر پڑھ سکتے ہوں یا اپنے ہاتھ سے خط بھی لکھ سکتے ہوں۔

اور ہو سکتا ہے یہ بھی کہا جائے کہ آنحضرتؐ تمام عمر جو اس کام سے پرہیز فرماتے رہے، شاید اس وجہ سے تھا کہ بہانہ جو لوگوں کے ہاتھ کوئی ثبوت نہ آ جائے۔

کُتبِ تاریخ اور حدیث میں صرف ایک موقع کا ذکر ہے کہ جنابِ رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور وہ ہے صُلحِ حدیبیہ کا واقعہ۔ مسند احمد میں یہ لکھا ہے کہ آں جنابؐ نے خُود اپنے ہاتھ میں قلم پکڑا اور صُلح نامہ لکھا۔[1]

لیکن علمائے اسلام کی ایک جماعت نے اس حدیث کا انکار کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ یہ قول زیرِ بحث آیاتِ قرآنی کے صریحًا خلاف ہے۔ ہرچند کہ بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ آیت میں صراحت نہیں ہے۔ کیونکہ بقول اُن کے اِن آیات میں پیمبر اکرمؐ کی قبل از نبوّت کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ آپؐ نے مقامِ نبوّت پر فائز ہونے کے بعد بطور استثنا ایک موقع پر کچھ لکھا ہو۔ آپؐ کا یہ فعل بھی معجزہ شمار ہو گا۔

بہرکیف ایسے مسئلے میں خبرِ واحد پر بھروسا کرنا حزم و احتیاط کے خلاف ہے اور علمِ اصول میں جو بات طے شدہ ہے اس کے بھی خلاف ہے۔ ہرچند کہ اس حدیث کے صحیح مان لینے سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی۔[2]

٭ ٭ ٭

۲۔ دُوسروں کے دِلوں میں نفوذ کا طریقہ: دِلوں کو مُسخّر کرنے اور دُوسروں کے افکار میں کلمۃُ الحق کے نفوذ کے لیے

[1] مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۲۹۸۔

[2] تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے تحت پیمبرِ اُمّی کی تشریح ملاحظہ ہو۔

صرف قوی اور مستحکم استدلال ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ مدِمقابل سے رُو در رُو ہونے اور اُس سے گفتگو کرنے کے اسلوب کو بھی عمیق ترین اثر پیدا کرنے میں دخل ہے۔

کیونکہ ـــــ بہت سے لوگ ہیں جو نہایت دقیق اور موشگاف بحث کر سکتے ہیں اور مسائلِ علمی سے باخبر اور ماہر ہیں لیکن چونکہ وہ بطورِ احسن اور نتیجہ بخش بحث کرنے کے اسلوب سے واقف نہیں ہیں اس لیے اُن کی گفتگو دُوسروں کے دِلوں میں بہت کم اثر کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کو قائل کرنے کے لیے صرف اس کی عقل و فکر کو مطمئن کرنا یا اُسے لاجواب کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ کلمۂ حق کے کسی کی شخصیت میں اُترنے کے لیے اُس کی تسکینِ جذبات ضروری ہے کیونکہ انسان کی نصف شخصیت کی تعمیر جذبات و احساسات سے ہوئی ہے۔

اس بات کو دُوسرے الفاظ میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ مطالبِ گفتگو کا صرف کیفیتِ شعور میں اُترنا کافی نہیں ہے بلکہ اُنھیں نفس کے تحتِ شعور کا حصّہ بن جانا چاہیے۔

انبیاءِ کرام اور بالخصوص پیمبرِ اسلامؐ اور آئمہ ہُدیٰؑ کے حالات پر غور کرنے سے خُوب واضح ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار اپنے تبلیغی اور تربیتی مقاصد کو حاصل کرنے اور لوگوں کے قلوب میں کلمۂ حق کے نفوذ کے لیے اخلاق اجتماعی اور نفسیاتی اصول کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اُن کا لوگوں سے گفتگو کرنے کا طریقہ ایسا تھا کہ وہ بہت جلد انہیں اپنے مقصد کی طرف متوجہ اور جذب کر لیتے تھے۔ اگرچہ بعض حضرات آئمہؑ کے ایسے اثرات کو معجزہ قرار دینا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اگر ہم بھی لوگوں سے گفتگو کرنے میں اُن ہی کے شیوۂ بحث اور سُنّت و روش کو اختیار کریں تو بہت جلد اُنھیں متاثر کر سکتے ہیں اور اُن کی رُوح کی گہرائی میں نفوذ کر سکتے ہیں

پیمبرِ اسلامؐ کے متعلق قرآن میں بصراحت مذکور ہے:

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظًا غليظ القلب لانفضّوا من حولك۔

یہ رحمتِ الٰہی ہے کہ تُو اُن کے لیے نرم خو ہے اگر تو سخت اور سنگدل ہوتا تو یہ لوگ تیرے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ (آلِ عمران - ۱۵۹)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ گھنٹوں بحث اور گفتگو کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنے مذاکرات میں کامیاب نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس مدِمقابل اپنے عقیدۂ باطل میں سخت تر اور زیادہ متعصب ہو جاتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ اُنھوں نے اپنی بحث میں "روشِ احسن" کو ملحوظ نہیں رکھا۔

بحث میں سختی، اپنی برتری کا اثبات، دوسرے کی تحقیر، اظہارِ کبر و غرور، دُوسروں کے عقاید و خیالات کا عدمِ احترام اور بحث میں خلوص کا فقدان یہ سب باتیں مباحثہ میں انسان کی شکست کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن اخلاقِ اسلامی کے مباحث میں "جدال" اور "مراء" کی تحریم کے تحت ایک بحث کا ذکر آتا ہے۔ اُس سے مُراد ایسی بحث ہے جس میں حق جوئی اور حق طلبی

کی نیت نہ ہو بلکہ اس کی غایت محض لفظی جنگ، اپنی برتری کا اثبات اور اپنی بات کی ترجیح ہو۔

"جدال" اور "مراء" کی حرمت ان کے اخلاقی اور معنوی پہلوؤں کے علاوہ اِس لیے بھی ہے کہ اِس قسم کی بحثوں سے فکری ارتقا نہیں ہوتا۔

"جدال" اور "مراء" کی حُرمت تو یکساں ہے۔ مگر علمائے اسلام نے اِن دونوں میں فرق کیا ہے۔ اُنھوں نے "مراء" کو بمعنی اظہارِ فضل و کمال اور "جدال" کو ایسا وتیرہ کہا ہے جو دُوسرے کی تحقیر کے لیے ہو۔ نیز "جدال" بحث میں ابتدائی حملے کو کہتے ہیں اور "مراء" دفاعی حملے کو کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں علمی مسائل میں بحث کرنے کو "جدال" کہتے ہیں۔ اور "مراء" عام ہے خواہ بحث علمی ہو یا غیر علمی۔ البتہ "جدال و مراء" کی ان تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بہر حال مخالفین سے بحث و مجادلہ کبھی تو "جدال بہ احسن" کے اُصول پر کیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی بحث ہوتی ہے، جس میں اُن شرائط کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اور کبھی وہ بحث "غیر احسن" ہوتی ہے۔ اور وہ ایسی بحث ہے جس میں شرائط مذکورہ کو فراموش کردیا جاتا ہے۔

اب ہم اِس گفتگو کو چند سبق آموز اور ناطق روایات لکھ کر ختم کرتے ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں:

لا یستکمل عبد حقیقة الایمان حتّٰی یدع المراء وان کان محقا۔

کوئی آدمی بھی بطور کامل حقیقتِ ایمان کو نہیں پاتا تاوقتیکہ وہ "مراء" کو ترک نہ کرے۔ خواہ وُہ حق پر ہی ہو۔[1]

ایک اور روایت میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ پیغمبر نے اپنے فرزند سے کہا:

یا بُنیّ ایاك والمراء فانهٗ لیست فیه منفعة وهو یهیج بین الاخوان العداوة۔

اے میرے بیٹے، تو "مراء" سے پرہیز کر کیونکہ صرف یہی نہیں کہ اُس میں کوئی منفعت نہیں بلکہ وہ بھائیوں کے درمیان دُشمنی کی آگ بھڑکاتا ہے۔[2]

نیز پیمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ:

ماضلّ قوم بعد ان هداهم الّا اوتوا الجدال

کوئی قوم ہدایت یافتہ ہونے کے بعد گمراہ نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ وہ آپس میں جنگ جُویانہ اور اثبات برتری کی ایسی بحثیں کرنے لگے جن میں کوئی حقیقت نہ ہو۔[3]

---

[1] سفینة البحار، مادہ "مراء"۔
[2]، [3] احیاء العلوم۔

۳۔ کُفار اور ظالمین: آیات زیرِ بحث میں ایک مرتبہ ہمیں یہ جُملہ نظر آتا ہے:

ہماری آیات کا کوئی انکار نہیں کرتا مگر کُفار کہ وُہ از رُوی عناد انکار کرتے ہیں۔

یہی جُملہ بارِ دیگر قدرے تفاوت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جس میں **کافرون** کے بجائے **ظالمون** استعمال ہوا ہے:

"ہماری آیات کا ظالموں کے سوا کوئی انکار نہیں کرتا"

اِن دونوں آیات کے تقابل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تکرارِ مطلب نہیں ہے بلکہ اِن میں دو مختلف مطالب بیان کیے گئے ہیں۔

آیت ۴۷ میں جہاں **کافرون** استعمال ہوا ہے یہاں اشارہ منکرین کے عقیدے کی طرف ہے اور آیت ۴۹ میں جہاں **ظالمون** کہا گیا ہے یہاں اہلِ انکار کا عمل مُراد ہے۔

اوّل یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنی رائے اور تجویز یا اپنے بزرگوں کی کورانہ تقلید کی وجہ سے کفر و شرک کو اختیار کرلیا ہے، وہ ہر مُنزل من اللہ آیت کا انکار کرتے ہیں۔ خواہ اُن کی عقل اُسے درست اور حق ہی سمجھتی ہو۔

دُوسرے مقام پر یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی ذات پر اور معاشرے پر ظلم کی راہ اختیار کی ہے، اسی طرزِ عمل میں اپنے ناجائز مفادات دیکھتے ہیں اور اِس ظلم کو جاری رکھنے کا مُصمم اِرادہ کیے ہوئے ہیں۔ تو یہ فطری امر ہے کہ وُہ ہماری آیات کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ہماری آیات جس طرح اُن کے اُسلوبِ فکر سے ہم آہنگ نہیں ہیں اُن کے شیوۂ عمل سے بھی مطابقت نہیں رکھتیں۔

۵۰۔ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ○

۵۱۔ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○

۵۲۔ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ شَهِيدًا ۖ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ○

۵۳۔ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُسَمًّى لَجَاءَهُمُ الْعَذَابُ ۚ وَلَيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○

۵۴۔ يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ ۚ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ○

۵۵۔ يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۵۰۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اُس پر خُدا کی طرف سے معجزات نازل کیوں نہیں ہوئے تو

اُن سے کہہ دو کہ معجزات تو خُدا ہی کے پاس ہیں (اور اسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں نہ کہ میری اور تمہاری پسند کے مطابق) اور مَیں تو کُھلم کُھلا ڈرانے والا ہوں۔

۵۱۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے کہ جو پیہم اُنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے۔ اِس میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے۔

۵۲۔ ان سے کہہ دو: میرے اور تمہارے درمیان خُدا ہی گواہ کافی ہے۔ اور وہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اُسے جانتا ہے۔ اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اُنہوں نے خُدا کا انکار کیا وہ خسارے میں ہیں۔

۵۳۔ یہ لوگ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اگر ایک وقت مقرر نہ ہوچکا ہوتا تو اُن پر (اللہ کا) عذاب آجاتا اور یہ عذاب آخر کار اُن پر ناگہانی طور پر نازل ہوگا جب کہ وُہ بے خبر ہوں گے۔

۵۴۔ یہ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ دراں حالیکہ جہنّم تو کافروں کو گھیرے ہُوئے ہے۔

۵۵۔ اور جس دن (اللہ کا) عذاب اُنھیں اُوپر سے نیچے تک ڈھک لے گا تو اُن سے کہا جائے گا تم جو کام کیا کرتے تھے اب اُس کا مزہ چکھو (اور یہ بہت سخت اور دردناک دن ہوگا)۔

تفسیر

کیا قرآن بطور معجزہ کافی نہیں ہے ؟

جو لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور باطل پر اصرار کی وجہ سے اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ قرآن کے استدلال اور منطقی بیان کو بہ اطاعت قبول کر لیں اور آنحضرتؐ کی حقانیت کی اس جہت سے پذیرائی کریں کہ وہ تحصیل علم نہ کرنے کے باوجود ایسی کتاب لائے۔ اُنھوں نے ایک نیا بہانہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ قرآن کی زیرِ بحث آیات میں سے پہلی آیت میں اُس کا ذکر ہے کہ اُنھوں نے بطور تمسخر کہا کہ اُس پر (مُوسٰی اور عیسٰی کی طرح) خدا کی طرف سے معجزات کیوں نازل نہیں ہوئے: (وقالوا لولا انزل علیه اٰیاتٌ من ربه)۔

اُس کے پاس عصائے مُوسٰی، یدِ بیضا اور دمِ مسیحا جیسے معجزات کیوں نہیں ہیں ؟

وُہ اپنے دُشمنوں کو اپنے عظیم معجزات کے ذریعے نابُود کیوں نہیں کر دیتا۔ جس طرح کہ موسٰیؑ، شعیبؑ، ہُودؑ اور نوحؑ و ثمود نے نابود کر دیا تھا۔

یا جس طرح کہ سُورۂ بنی اسرائیل میں اس گروہ کا قول پایا جاتا ہے کہ (اُنھوں نے کہا) پیمبرِ اسلامؐ مکہ کے خشک بیابان میں پانی کے چشمے کیوں جاری نہیں کر دیتا۔ اس کے پاس سونے کا محل کیوں نہیں ہے۔ وہ آسمان پر کیوں چڑھ نہیں جاتا اور اوران کے لیے خدا کی طرف سے آسمان سے ایک خط کیوں نہیں لاتا ؟ [1]

تواریخ میں بصراحت یہ واقعات موجود ہیں کہ پیمبرِ اسلام قرآن کے علاوہ اور بھی معجزات رکھتے تھے۔ مگر کفار ان باتوں سے درحقیقت طلب گارِ معجزہ نہ تھے۔ بلکہ وہ اِن بہانہ سازیوں سے ایک طرف تو اعجازِ قرآن سے صرف نظر کرنا چاہتے تھے۔ دُوسری طرف وُہ منہ مانگے معجزے کے خواہش مند تھے۔ من پسند کے معجزات کا تو مطلب یہ ہے کہ پیغمبرِ خداؐ ہر شخص کی خواہش کے مطابق، وُہ جس قسم کے بھی معجزے کا طلب گار ہو، کر دکھائیں مثلاً: اُن میں سے ایک آدمی کہے کہ " آپ آبِ شیریں کا چشمہ جاری کر دیجئے۔

دُوسرا کہے کہ مجھے تو یہ معجزہ پسند نہیں آپ مکہ کے پہاڑوں کو سُونے کا بنا دیجئے۔ تیسرا کہے کہ یہ معجزات کافی نہیں ہیں؛ آپ ہمارے سامنے ہی آسمان پر چڑھ جائیں۔

اِس صُورت سے یہ لوگ معجزات کو بے قدر بازیچۂ اطفال بنا دیں۔ اور پھر انجام یہ ہو کہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی کہیں کہ یہ تو جادوگر ہے۔

لہٰذا قرآن میں سورۂ انعام کی آیت ۱۱۱ میں بیان کیا گیا ہے :

ولو انّنا نزّلنا الیھم الملٰئکة وکلّمھم الموتٰی وحشرنا علیھم

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۰ تا ۹۳۔

کلّ شیءٍ قبلاً مّا کانوا لیؤمنوا

اگر ہم اُن کی طرف فرشتوں کو بھیجتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور تمام چیزوں کو اُن کے سامنے موجُود کر دیتے تو وُہ پھر بھی ایمان نہ لاتے۔

بہرحال قرآن میں اِن ہٹ دھرم بہانہ ساز لوگوں کو دو طرح سے جواب دیا گیا ہے۔

اوّل یہ کہ اے رسول اِن سے کہہ دو کہ معجزہ میرا کام نہیں جو تمہاری خواہش کے مطابق صادر ہوتا ہے بلکہ تمام معجزات خدا کے اختیار میں ہیں: (قُل انّما الاٰیات عند الله)۔

خدا ہی اِس مصلحت کو بہتر جانتا ہے کہ کس قوم کے لیے، کس وقت اور کونسا معجزہ مناسب ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون لوگ جویائے حق اور ذوقِ تحقیق رکھتے ہیں۔ تو وہ معجزہ بھی اُن ہی کو دکھاتا ہے نیز وہ جانتا ہے کہ کون سے لوگ بہانہ ساز اور اپنی خواہشاتِ نفس کے غلام ہیں۔

اور اِن سے کہہ دو کہ مَیں تو فقط ڈرانے والا اور خبردار کرنے والا ہوں: (و انّما انا نذیرٌ مُّبین)۔

میرا فرض تو صرف ڈرانا، تبلیغ کرنا اور تمہیں کلامِ خُدا سُنانا ہے۔ رہا معجزات اور خوارقِ عادات کا دکھانا، سو یہ خدا کے اختیار میں ہے۔

* * *

دُوسرا جواب یہ ہے کہ کیا اُن کے لیے یہی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب آسمانی نازل کی ہے جو ہمیشہ اُنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے: (اولم یکفھم انّا انزلنا علیك الکتاب یُتلٰی علیھم)۔

یہ لوگ مادّی معجزات کا تقاضا کرتے ہیں، درآں حالیکہ قرآن برترین رُوحانی معجزہ ہے۔

یہ لوگ زُود گزر معجزہ کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ قرآن جاودانی معجزہ ہے اور رات دن اُس کی آیات اُنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ناخواندہ انسان (اور اگر بالفرض اُس نے پڑھا بھی ہو) ایسی کتاب پیش کرے جس کے مشمولات اور مضامین ایسے عجیب ہیں اور جس کی فصاحت میں ایسا جذب ہے جو انسانوں کی طاقت سے بالا ہے۔ اور وُہ جملہ اہلِ عالم کو مقابلے کا چیلنج کر دے۔ اور سب لوگ اس کتاب کا جواب پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہ جائیں۔

اگر ــــــ وہ واقعاً معجزے کے طلب گار ہیں تو ہم نے قرآن نازل کر کے اُن کے مطالبے سے بھی بڑا معجزہ اُن کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ مگر نہیں ــــــ وہ لوگ حق طلب نہیں ہیں بلکہ بہانہ ساز ہیں۔

یہ امر مدِّ نظر رہے کہ جُملہ " اولم یکفھم " (کیا اُن کے لیے کافی نہیں ہے) معمولاً ایسے موقع پر بولا جاتا ہے کہ جب انسان کوئی کام ایسا کرے جو طرفِ مقابل کی توقع اور اُمید سے کہیں بالا ہو اور مدِّ مقابل اُس کی قدر و وقعت سے غافل ہو یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لے۔ مثلاً مدِّ مقابل یہ اعتراض کرے کہ تو نے میری فلاں خدمت کیوں نہیں کی ؟ اور ہم اُس کی خواہش سے بھی عظیم تر خدمت کی نشان دہی کریں (جسے اُس نے نظرانداز کر رکھا ہو) اور کہیں کہ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری اتنی بڑی خدمت کی ہے ؟

اِن سب باتوں سے قطع نظر معجزہ کو پیغمبر کی دعوت کی کیفیت اور زمان و مکان کی شرائط سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔
اِس لیے جس پیمبر کی شریعت جاودانی ہے، اُس کا معجزہ بھی جاودانی ہی ہونا چاہیئے۔
جس پیغمبر کی دعوت جہاں گیر ہے اور آئندہ زمانوں پر بھی حاوی ہو اُس کا معجزہ بھی رُوحانی اور عقلی اُسلوب کا ہونا چاہیئے۔
جو تمام اہلِ فکر اور اہلِ خرد کے لیے موجب جذب و کشش ہو۔ یقیناً قرآن ہی اِس مقصد کو پُورا کرتا ہے نہ کہ عصائے مُوسٰی اور یدِ بیضا۔

آیت کے آخر میں مزید توضیح و تاکید کے لیے کہا گیا ہے : اِس آسمانی کتاب میں ایمان لانے والوں کے لیے عظیم رحمت اور نصیحت موجود ہے : (انّ فی ذالک لرحمۃً و ذکرٰی لقومٍ یؤمنون)۔
واقعاً قرآن رحمت بھی ہے اور پند و نصیحت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی ہے لیکن صرف اہلِ ایمان کے لیے، صرف اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے حقیقت کو خوش آمدید کہنے کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیئے ہیں، صرف اُن لوگوں کے لیے جو طالب نور ہیں اور راہِ مُستقیم کے جُویا ہیں۔ ایسے لوگ اِس رحمت کا اپنی پُوری شخصیت کے ساتھ ادراک کرتے ہیں اور اُس کے سائے میں راحت پاتے ہیں۔ یہ لوگ آیاتِ قرآنی کو جتنی مرتبہ بھی پڑھتے ہیں اُن کے قلوب پر اُن کے نئے معانی روشن ہو جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ "رحمت" اور "ذکرٰی" میں یہ فرق ہو کہ قرآن صرف ایک معجزہ اور دفترِ نصیحت ہی نہیں ہے بلکہ اِن باتوں کے علاوہ، وہ حیاتِ انسانی کے لیے ایسے قوانین اور اصولِ عمل سے پُر ہے جن کی اِتباع اِنسان کے لیے باعثِ نزولِ رحمت ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اس میں انسان کی اخلاقی اور رُوحانی تربیت اور تکمیلِ انسانیت کے قواعد اور نصائح موجود ہیں۔
اِس کے موازنہ میں عصائے موسیٰ ایک معجزہ تو تھا مگر لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی میں تو اُس کا کچھ اثر نہ تھا
برخلاف اس کے قرآن اپنے اسلوب کے لحاظ سے معجزہ تو ہے ہی مگر اُس میں اِنسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مکمل پروگرام بھی ہے اور باعثِ رحمتِ الٰہی ہے۔

چونکہ ہر مُدّعی کو اپنے اثباتِ دعویٰ کے لیے شاہد و گواہ کی ضرورت ہے، اِس لیے آیۂ مابعد میں فرمایا گیا ہے :
اے رسُول اِن سے کہہ دو کہ یہی کافی ہے کہ : میرے اور تمہارے درمیان خدا گواہ ہے (قُل کفٰی باللہ بینی و بینکم شھیداً)۔

یہ امر واضح ہے کہ کوئی گواہ جس قدر بھی حقیقتِ قضیہ سے زیادہ باخبر ہو گا، اُس کی گواہی کی قدر اُسی نسبت سے زیادہ ہو گی۔ لہٰذا جملہ مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : وُہ خدا جو میرا گواہ ہے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُس سب کو جانتا ہے : (یعلم ما فی السمٰوات والارض)۔
اَب دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے اپنے پیمبرؐ کی حقانیت پر کس طرح گواہی دی ہے۔
ممکن ہے کہ صداقت پیغمبرؐ کی یہ گواہی عملی ہو۔ جب خُدا نے قرآن جیسا عظیم معجزہ پیغمبرؐ کو عطا کیا تو گویا عملاً اُن کی حقانیت

کی سند بھی جاری کر دی کیونکہ کیا یہ ممکن ہے کہ خُدائے حکیم و عادل قرآن جیسا معجزہ (العیاذ باللہ) کسی دروغ گو کو عطا کر دے؛ اِس بنا پر کسی کو ایسا معجزہ عطا کرنا ہی اُس کی نبوّت کی صداقت پر خدا کی بہترین گواہی ہے۔
مذکورۂ بالا عملی گواہی کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں خدا کی قولی شہادت بھی موجود ہے۔ چنانچہ سورہ احزاب کی آیت ۴۰ میں مذکور ہے :

ماکان محمّد ابا احدٍ من رجالکم ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین
محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں وہ تو اللہ کے رسُول اور خاتم النبیین ہیں۔

اور سُورہ فتح کی آیت ۲۹ میں ہے :

محمّد رسول اللہ والذین معہ اشدّاءُ علی الکفار رحماءُ بینھم
محمدؐ رسُولِ خدا ہیں اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں وُہ کفّار کے مقابلے میں سخت ہیں اور باہم ایک دوسرے پر رحیم اور مہربان ہیں۔

بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ آیت مدینہ کے بعض اشرافِ یہود کے جواب میں نازل ہوئی ہے جیسے کعب ابن اشرف اور اس کے مُتبعین تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ اے محمدؐ کیا کوئی شخص اِس بات کا گواہ ہے کہ تم خدا کے رسول ہو؛
اِس کے جواب میں یہ آیت نازل ہُوئی اور کہا کہ یہ گواہی خدا دیتا ہے۔
اِس کی تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شہادتِ خدا سے مُراد یہ ہے کہ سابق آسمانی کتابوں میں یہ شہادت موجود ہے جسے اہلِ کتاب کے علماء اچھی طرح جانتے ہیں۔ بہرکیف اِن تینوں تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے اور ممکن ہے کہ اِس آیت میں یہ تمام مفاہیم جمع ہوں۔
آیت کے آخیر میں بطور تہدید و تنبیہ فرمایا گیا ہے : جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اُنھوں نے خدا کا انکار کیا، وہ درحقیقت خسارے میں ہیں : (والذین اٰمنوا بالباطل وکفروا باللہ اُولٰئک ھم الخاسرون)۔
اِس سے بڑا اور کون سا خسارہ ہو گا کہ اِنسان اپنی شخصیت کے تمام سرمائے کو کسی ناچیز اور بے قدر شئے کے لیے گنوا دے جیسا کہ مُشرکین کا عمل تھا کہ اُنھوں نے اپنا دل و جان بُتوں کے حوالے کر دیا تھا اور اُنھوں نے اپنی تمام جسمانی قوتیں اور جُملہ انفرادی اور اجتماعی وسائل کو آئینِ بُت پرستی کی ترویج و تبلیغ اور نامِ خدا کو محو کر دینے میں صَرف کر دیا تھا مگر اُنھیں خسران و زیاں کے علاوہ اُس کا کچھ بھی پھل نہ ملا۔
غالباً آیاتِ قرآنی میں اِسی عظیم خسران کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی کلمہ "اخسر" کہہ کر بھی اِس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یعنی اس سے بڑا اور کوئی نقصان نہیں ہے۔ (ھُود - ۲۲، نمل - ۵ - کھف - ۱۰۳)

یہ بات بھی اہم ہے کہ انسان کو کسی تجارت میں نقصان ہو جاتا ہے اور وہ اپنا سرمایہ گنوا بیٹھتا ہے اور اس کا دیوالیہ نکل جاتا ہے مگر کبھی اس سے بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے کہ اُس تاجر کے شانوں پر قرض کا بار رہ جاتا ہے اور دیوالیہ ہونے کی یہ بدترین شکل ہے۔ مُشرکین کا بالکل یہی حال تھا۔ بلکہ وہ کبھی دوسروں کی گمراہی اور ایمان کے دیوالیہ پن کا باعث بھی ہوتے تھے[2]

❁ ❁ ❁

گزشتہ آیات میں جناب رسالت مآبؐ کی دعوت الی الحق کے مقابلے میں کفار کی دو بہانہ تراشیوں اور اُن کے جوابات کا ذکر ہوا تھا۔

اوّل یہ کہ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟

قرآن میں اس کا یہ جواب دیا گیا تھا کہ یہ کتاب آسمانی خود برترین معجزہ ہے۔

دُوسرے یہ کہ اِس پیغمبر کی حقانیت کا گواہ کون ہے؟

قرآن میں یہ جواب دیا گیا کہ وہ خدا گواہ ہے جو عالمِ کُل ہے۔

زیرِ بحث آیت میں کفّار کی ایک تیسری بہانہ سازی کا ذکر ہے کہ: یہ لوگ عذاب الٰہی کے بارے میں عجلت کرتے ہیں۔ اور تُجھ سے بہت جلدی چاہتے ہیں؛ (ویستعجلونك بالعذاب)۔

وُہ کہتے ہیں کہ اگر عذابِ الٰہی حق ہے اور وُہ کُفّار پر نازل ہوتا ہے تو وُہ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا؟

قرآن میں اِس سوال کے تین جواب دیئے گئے ہیں:

اَوّل یہ کہ: اگر وقت موعُود متعین نہ ہوتا تو اُن پر فوراً خُدا کا عذاب نازل ہو جاتا: (ولولا اجل مسمّی لجاءهم العذاب)۔

وقت اِس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ اوّل تو یہ خوابِ کفر سے بیدار ہوں اور اگر ایسا نہ ہو تو مُہلتِ وقت سے اُن پر اتمامِ حُجّت ہو جائے۔ کیونکہ خدا اپنے کاموں میں بخلافِ حکمت جلد بازی نہیں کرتا۔

دُوسرے یہ کہ: جو لوگ یہ بات کہتے ہیں، اُنھیں اِس کا کیا اطمینان ہے کہ اُن کے طلب کرتے ہی اُن پر عذاب نازل ہو جائے گا؛ کیونکہ یہ عذاب تو اس حالت میں کہ وہ بے خبر ہوں گے اُن پر ناگہاں اور بدون آثار نازل ہو جائے گا: (ولیأتینهم بغتةً وهم لا یشعرون)[3]

اگرچہ عذاب کا وقت موعود، مُعیّن و مقرر ہے۔ مگر اُس کی تاخیر میں مصلحت یہ ہے کہ کُفّار اُس سے آگاہ نہ ہوں اور وُہ ابتدائی آثار کے بغیر اُنھیں آ پکڑے۔ کیونکہ اگر اُس وقت کا اعلان کر دیا جاتا تو گنہگاروں کی جرأت و جسارت اور بھی بڑھ جاتی۔ وُہ وقت موعُود کے آخری لمحے تک اپنے گناہ و کفر کو جاری رکھتے اور جب یہ دیکھتے کہ وقتِ موعود کے مطابق عذاب کی گھڑیاں

[1] اِس موضوع پر تفصیلی بحث جلد ۷ میں سُورہ کہف کی آیت ۱۰۳ کے تحت درج کی جا چکی ہے۔

[2] "بغتة" کا مادہ "بغت" (بروزن "وقت") ہے اس کا معنی ہے کسی حادثہ کا ناگہاں اور بلا انتظار ہونا۔

نزدیک ہیں تو آخری لمحات میں سب توبہ کر لیتے اور خدا کی طرف رجُوع کرتے۔

قوموں کی تربیت اخلاقی میں اِس قسم کی سزاؤں کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کا وقتِ مقررہ نامعلوم رہے۔ تاکہ اُن کا خوف اور ڈر اُنھیں گناہوں سے باز رکھنے کا ایک مؤثر عامل ثابت ہو اور ہر گھڑی اپنا اثر دکھاتا رہے۔

ہم نے نزولِ عذاب کی جس حکمتِ تاخیر کا ذکر کیا ہے، اُس سے ثابت ہے کہ جُملہ "وهم لا یشعرون" سے یہ مُراد نہیں ہے کہ اُنھیں اصلاً وجود عذاب ہی کا اِدراک نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو عذاب میں کوئی حکمت ہی باقی نہ رہتی۔ بلکہ اس جُملے کا مقصود یہ ہے کہ اُنھیں وقوعِ عذاب کے وقت اور اُس کے آثارِ نزول کی مطلق خبر نہ ہوگی۔ بالفاظِ دیگر، اُن پر عذاب بحالتِ غفلت بجلی کی مانند ٹوٹ پڑے گا۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہانہ جُوئی صرف کُفّارِ مکّہ ہی تک منحصر نہ تھی بلکہ قبل ازآں دُوسری قومیں بھی تعجیلِ عذاب پر اصرار کرتی رہی تھیں۔

❁ ❁ ❁

تیسرا جواب قرآن کی آیت مابعد میں دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ: اے رسولؐ یہ کفار تم سے عذاب الٰہی میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم نے اِن کافروں کا احاطہ کیا ہوا ہے: (یستعجلونك بالعذاب وانّ جهنّم لمحیطةٌ بالکافرین)۔

مُراد یہ ہے کہ اگر عذاب دنیا میں تاخیر ہو جائے تو عذابِ آخرت تو اُن کے لیے سو فیصد قطعی اور یقینی ہے اور ایسا مُسلّم ہے کہ قرآن میں اُس کا ذکر ایک امرِ وقوعی کے طور پر کیا گیا ہے۔ بایں الفاظ کہ جہنّم گویا اب بھی اُن کا احاطہ کیے ہُوئے ہے۔

اِس آیت کی ایک دقیق تر تفسیر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بہ معنی حقیقی دو جہتوں سے جہنّم اَب بھی اُنھیں گھیرے ہوئے ہے

اوّل تو دُنیاوی جہنّم ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ شرک اور گناہوں کی جہنّم میں مبتلا ہیں جو اُنھوں نے اپنے جلنے کے لیے خود فراہم کی ہے۔ وہ جنگ و خُوں ریزی، نزاع و اختلاف باہمی، بدامنی اور عدمِ سکُون، ظلم و بیدادگری اور ہوا و ہوس اور سرکشی کی جہنّم میں گھرے ہوئے ہیں۔

دُوسرے یہ کہ آیاتِ قرآنی کے ظاہری مفہوم کے مطابق اِن کُفّار کے لیے جہنّم اَب بھی موجود ہے اور جیسا کہ ہم نے سطُورِ ماقبل میں تشریح کی ہے اسی دُنیا کے باطن میں ہے۔ اور اُس نے درحقیقت کُفّار کو گھیر رکھا ہے۔ چنانچہ سورہ تکاثر کی آیات ۵، ۶، ۷ میں اُس کا ذکر موجود ہے:

کلّا لو تعلمون علم الیقین لترونّ الجحیم ثمّ لترونّها عین الیقین

ایسا نہیں ہے اگر تمہیں علم الیقین ہوتا تو جہنم کا مشاہدہ کرتے اور پھر اس کو عین الیقین سے دیکھتے[1]

[1] اس موضوع کی توضیح کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۲ میں آلِ عمران کی آیت ۱۳۲ کی تفسیر دیکھیے۔

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے : وہ روز بڑا سخت اور دردناک ہوگا۔ جب عذابِ الٰہی اُنھیں سر کے اوپر اور پاؤں کے نیچے سے گھیر لے گا اور اُن سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے تھے آج اُس کا مزہ چکھو : (یوم یغشاھم العذاب من فوقھم ومن تحت ارجلھم ویقول ذوقوا ماکنتم تعملون)[1]

یہ آیت ممکن ہے بروز قیامت کفار کے لیے احاطۂ عذاب جہنم کی توضیح کے لیے ہو۔

نیز ممکن ہے کہ اُس دردناک عذاب کا بیان ہو جس نے اُن کے اعمال کی وجہ سے اُنھیں آج گھیرا ہوا ہے اور کل کو ظاہر و آشکار ہوگا۔

بہرحال قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ عذاب اُن کے سر کے اُوپر اور پاؤں کے نیچے سے آئے گا اور بقیہ اطراف و جوانب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ بیان اس مطلب پر حاوی ہے کہ جب آگ کے شعلے پاؤں کے نیچے سے باہر ہوں گے اور سر کے اُوپر سے نازل ہوں گے تو وہ اُن کفار کے تمام اطراف و جوانب کو گھیر لیں گے۔

اُصولاً فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سر سے پاؤں تک بے اتفاقی کے دلدل میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی اُس کا تمام وجود اِس گناہ میں غرق ہوگیا ہے۔

اِس طرح سے بعض مفسرین کو جو یہ مشکل پیش آئی کہ اُنھوں نے یہ غور کیا کہ قرآن میں بالا و پائین کا ذکر تو ہوا ہے باقی چار اطراف کو کیوں چھوڑ دیا ہے ، وہ حل ہو جاتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ جملہ " ذوقوا ماکنتم تعملون " کا کہنے والا خدا ہے۔

علاوہ برایں ، یہ اِس قسم کے لوگوں کے لیے ایک نفسیاتی سزا ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ آخرت کی زندگی میں عذابِ الٰہی انسان کی دُنیاوی بداعمالیوں کے ردِّعمل ، انعکاس اور تجسم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

٭ ٭ ٭

چند اہم نکات

۱۔ دلائلِ اعجازِ قرآن : اس میں شک نہیں کہ قرآن پیغمبرِ اسلام کا عظیم ترین معجزہ ہے اور یہ معجزہ جاودانی ، اپنی دلیل آپ ، منہ بولتا ، محسوس اور ہر زمانہ کے لیے مُناسب اور انسانوں کے ہر طبقہ کے لیے ہے۔

ہم نے اعجازِ قرآن کے متعلق مشرح اور توضیحی بحث جلد اوّل میں سُورۂ بقرہ کی آیت ۲۴ کے تحت تحریر کی ہے۔ اس مقام پر اس کی تکرار کی حاجت نہیں ہے۔

۲۔ انکارِ معجزات کا ثبوت : بعض مغرب زدہ دانشور چاہتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے معجزات کا انکار کر دیں۔ اُن کا اصرار ہے کہ پیغمبرِ اسلام سے قرآن کے علاوہ کوئی اور معجزہ صادر نہیں ہوا۔ ان حضرات کے مزاج سے یہ بھی امکان ہے کہ وہ قرآن کو بھی معجزہ نہ سمجھیں حالانکہ اُن کا انکارِ معجزات آیاتِ قرآنی ، روایاتِ متواترہ اور اسلام کی مسلّمہ تاریخ کے خلاف ہے۔

[1] بعض مفسرین نے " یوم " کو فعل مقدر کا ظرف سمجھا ہے اور بعض نے " محیطۃ " سے متعلق جانا ہے۔

ہم نے اس موضوع کو جلد ۶ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ کے تحت بیان کیا ہے۔

۳۔ من پسند کے معجزات : پیمبروں کے مخالفین کی ہمیشہ ایک روش یہ بھی رہی ہے کہ وہ معجزات کو ایک ایسا عمل بتاتے رہے ہیں جو پیمبروں سے فی البدیہہ ارتجالاً سرزد ہوتا ہے۔

وہ اپنے اس عمل سے ایک طرف تو معجزے کی اہمیت کم کرکے اُسے بے قدر اور مبتذل ثابت کرنا چاہتے تھے۔ دُوسری طرف وُہ اس بہلنے سے انبیاءؑ کی دعوت کو ردّ کرنا چاہتے تھے۔

لیکن انبیاءؑ کبھی بھی اُن کی اِس سازش کا شکار نہیں ہوئے۔ جیسا کہ آیاتِ بالا میں مذکور ہے۔ وُہ اِن کے جواب میں کہتے تھے کہ :

"معجزات ہمارے اختیار میں نہیں ہیں کہ جنھیں تمہاری مرضی اور خواہش کے مطابق ہر روز اور ہر گھڑی دکھایا جائے بلکہ معجزہ تو صرف حکمِ خُدا سے صادر ہوتا ہے اور ہمارے اختیار سے باہر ہے"

معجزاتِ اقتراحی کے بارے میں تفسیرِ نمونہ جلد ۵ میں سورۂ یونس کی آیت ۲۰ کے تحت تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

۵۶۔ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ○

۵۷۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ○

۵۸۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّھُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ○

۵۹۔ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ○

۶۰۔ وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّۃٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا اللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَاِیَّاکُمْ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

ترجمہ

۵۶۔ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے، تم میری ہی عبادت کرو (اور دُشمن کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ)۔

۵۷۔ ہر متنفّس موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ پھر تم ہماری طرف لوٹ آؤ گے۔

۵۸۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک اعمال کیے ہم اُنھیں بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وُہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ نیک عمل

کرنے والوں کا کیا خُوب بدلا ہے۔

۵۹۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو صبر (اور استقامت) اختیار کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکّل کرتے ہیں۔

۶۰۔ اور کس قدر چلنے پھرنے والے جاندار ایسے ہیں کہ جو اپنا رزق اُٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اللہ انھیں اور تمھیں رزق دیتا ہے اور وُہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسّرین کا نظریہ ہے کہ زیرِ نظر پہلی آیت اُن مومنین کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ میں کُفّار کا ظلم برداشت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ فرائض اسلامی کو بھی ادا نہ کرسکتے تھے۔ اِس لیے اُنھیں حکم دیا گیا کہ اُس سرزمین سے ہجرت کرجائیں۔

نیز بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ آخری زیرِ نظر آیت یعنی "وکاین من دآبۃٍ لا تحمل رزقھا" اُن مومنین کی شان میں ہے جو مکہ میں دُشمنوں کے ستم سہہ رہے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہم مدینہ کو ہجرت کرجائیں تو وہاں نہ ہمارا کوئی گھر ہوگا نہ زمین۔ وہاں ہمیں کون آب و غذا دے گا؛ تب یہ آیت نازل ہوئی جس میں ہے کہ زمین پر تمام حرکت کرتے والے خدا کے خوانِ نعمت سے روزی کھاتے ہیں۔ تم بھی اپنی روزی کی فکر نہ کرو۔

تفسیر

ہجرت کرنی چاہیئے:

گزشتہ آیات میں یہ ذکر تھا کہ مُشرکین نے اِسلام اور مُسلمانوں کے مقابلے میں کیا کیا مختلف مواقف اختیار کیے مگر زیرِ بحث آیات میں خُود مسلمانوں کی حالت بیان کی گئی ہے یعنی ان مشکلات کی حالت میں جو مسلمانوں کو کفّار کے نرغے میں اُن کی طرف سے اذیّت و آزار کی صُورت میں پیش آرہی ہیں، مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔

خداوندِ عالم فرماتا ہے: اے میرے بندو کہ جو ایمان لائے ہو اور دُشمنانِ اسلام کے نرغے میں فرائضِ دینی ادا نہیں کرسکتے، تو میری زمین وسیع ہے۔ تم دوسرے مقام کو ہجرت کر جاؤ اور وہاں میری عبادت کرو: (یاعبادی الّذین اٰمنوا اِنّ ارضی واسعۃ فایّای فاعبدون)۔

یہ امر بدیہی ہے کہ یہ حکم اُس زمانے کے صرف مومنین مکّہ ہی کے لیے مخصوص نہ تھا اور آیت کی شانِ نزول اس کے وسیع اور دراز دامنِ معنی کو جوکہ قرآن کی دُوسری آیات سے ہم آہنگ ہے محدُود نہیں کرتی۔

اِس جہت سے یہ آیت ایک اُصولِ کُلّی کی حامل ہے کہ جس زمانے میں اور جس معاشرہ و مقام میں مُسلمانوں کی آزادی کاملاً سلب ہوجائے، وہاں رہنے سے ذلّت و خواری کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور وہاں رہ کر الٰہی پروگرام پرعمل نہ ہوسکے تو مُسلمانوں کا فرض ہے کہ وہاں سے ایسے مقامات کی طرف ہجرت کرجائیں جہاں وہ مطلق آزادی یا نسبتاً آزادی کے ساتھ اپنے فرائضِ دینی ادا کرسکیں۔

بہ الفاظِ دیگر ـــــ آفرینش اِنسان کا مقصود خدا کی عبادت ہے۔ وہ عبادت جس میں زندگی کے ہر میدان میں انسان کی آزادی، سرفرازی اور کامیابی کا رازمخفی ہے۔ " فایّای فاعبدون " میں اِسی طرف اشارہ کیاگیاہے۔ نیز سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں :

وماخلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون

جب یہ بنیادی اور آخری مقصد انسان کے پیشِ نظر ہو تو ہجرت کے سوا اور کوئی راہ نہیں رہتی۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ اِس لیے کسی اور جگہ قدم رکھنا چاہیئے۔ ایسے مواقع پر قبیلہ و قوم، وطن اور گھربار کے تعصبات میں مقیّد رہ کر کسی قسم کی ذلت کو برداشت نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اِن چیزوں کا احترام اُسی وقت تک جائز ہے جب تک مقصودِ حقیقی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام نے ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا ہے :

لیس بلد باحق بك من بلد خیرالبلاد ماحملك

تیرے لیے کوئی شہر بھی دوسرے شہر سے بہتر نہیں ہے۔ بس بہترین شہر وہی ہے
جو تجھے قبول کرلے اور تیری ترقی کے اسباب فراہم کردے[1]

یہ مُسلّم ہے کہ حُبّ وطن اور اپنی جائے ولادت سے ذہنی تعلق انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ مگر زندگی میں کبھی ایسے مسائل بھی پیش آجاتے ہیں کہ یہ چیزیں حقیر اور بے مقدار ہوجاتی ہیں۔

ہجرت کے متعلق اِسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اِس سلسلے میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ہم نے اُنھیں سُورۂ نسا کی آیت ۱۰۰ کے تحت جلد چہارم میں بیان کیاہے۔

خُدانے اپنے بندوں کو "یاعبادی" کہا ہے۔ یہ اُس کی طرف سے نہایت ہی محبت آمیز طرزِ خطاب ہے۔ درحقیقت یہ انسان کے لیے تاجِ افتخار ہے جو مقامِ رسالت و خلافت سے بھی برتر ہے۔ جیساکہ تشہد میں ہمیشہ کلمہ "عبد" کو شہادتِ رسالت سے پہلے اداکرتے ہوئے ہم کہتے ہیں :

"اشهد انّ محمّداً عبدہٗ و رسولہٗ "

یہ اَمرجالبِ توجہ ہے کہ جب خدانے آدم کو پیدا کیا تو اُسے " خلیفة الله " کے لقب سے عزّت بخشی۔ مگر شیطان

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ نمبر ۴۴۲۔

پھر بھی اُسے بہکانے سے مالیوس نہ ہُوا۔ وہ آدم کے پاس آیا اور پھر جو ہونا تھا وہ ہُوا۔ مگر خدانے آدم کو مقامِ عبودیت پر سرفراز کیا تو شیطان نے اُس کے مقابلے میں ہار مان لی اور کہا :

فبعزّتك لاغوینهم اجمعین الّاعبادك منهم المخلصین

مجھے قسم ہے تیری عزّت کی کہ میں تمام فرزندانِ آدم کو بہکاؤں گا۔ مگر اُن میں سے
تیرے مُخلص بندوں کو نہیں بہکا سکتا۔ (ص - ۸۲، ۸۳)

یہاں تک کہ خدانے بھی اِس امر کی ضمانت دی ہے اور فرمایاہے :

انّ عبادی لیس لك علیهم سلطان

تو ہرگز میرے بندوں پر تسلّط حاصل نہ کرسکے گا۔ (حجر - ۴۲)

اِس بنا پر عبودیت خالص کا مقام زمین پر خلافتِ الٰہی کے مقام سے بھی برتر و بالاتر ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا اُس سے یہ خُوب واضح ہوتاہے کہ آیت زیرِ بحث میں کلمہ "عباد" سے تمام انسان مُراد نہیں ہیں بلکہ صرف وہ اِنسان مُراد ہیں جو مومن ہیں اور آیت میں جملہ " الّذین اٰمنوا " تاکید اور توضیح کے لیے استعمال ہواہے۔[1]

چونکہ ـــــ وہ لوگ جو مُشرکین کے شہروں میں رہتے تھے اور ہجرت کے لیے آمادہ نہ تھے۔ اُن کے دیگر عذروں میں سے ایک یہ تھاکہ ہم اِس بات سے ڈرتے ہیں کہ اپنے شہروں سے نکل جائیں اور دُشمنوں کی طرف سے موت یا بھُوک اور دیگر خطرات سے دوچار ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ہم اپنے خویش و اقارب، اولاد اور شہر و دیار سے جُدائی کے غم میں مُبتلا ہو جائیں۔

قرآن میں اُن کے خطرات کا ایک جامع جواب دیاگیاہے : آخرکار سب انسانوں کا انجام موت ہے اور ہرشخص موت کا مزہ چکھے گا۔ پھر تم ہماری طرف لَوٹ آؤ گے : (کلّ نفسٍ ذائقة الموت ثمّ الینا ترجعون)۔

یہ جہان کسی کے لیے بھی " دارالبقا" نہیں ہے۔ یہاں سے بعض لوگ جلد اور بعض دیر میں چلے جائیں گے۔ بہرحال ہر شخص کو دوستوں، اعزّا و اقارب اور اولاد کی جُدائی کا صدمہ سہنا ہے۔ تو پھر انسان ان زود گزر مسائل کے لیے شرک اور کُفر کی آبادیوں میں رہ کر کیوں ذلّت و قید کو برداشت کرے؟ کیا صرف اِس لیے کہ چند روز اور زندہ رہ جائے؟

اِن سب باتوں کے علاوہ ڈرنا اِس بات سے چاہیئے کہ قبل اس کے کہ تم ایمان و اسلام کی زمین میں پہنچو تمہیں شرک وکفر کی جگہ موت آجائے۔ سوچو کہ ایسی مَوت کتنی خوفناک اور دردناک ہے۔

پھر یہ بھی گمان نہ کرو کہ موت ہی ہر چیز کی انتہا ہے۔ موت تو درحقیقت انسان کی اصلی زندگی کا آغاز ہے۔ کیونکہ تم سب ہماری طرف لَوٹ آؤ گے۔ یعنی خدائے بزرگ اور اُس کی بے پایاں نعمتوں کی طرف۔

[1] "فایّای فاعبدون" کا جُملہ درحقیقت جزائے جملہ شرطیہ پر عطف ہے جو محذوف ہے اور جملہ مقدّر یہ ہے :

انّ ضاقت بکم الارض فاهجروا منها الی الاخری وایّای اعبدون۔

اس کے بعد کی آیت میں، چند نعمتوں کا اس طرح ذکر ہے :

جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے عمل صالح انجام دیے، ہم اُنھیں بہشت کے بالا خانوں میں جگہیں دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی : (والّذین آمنوا وعملوا الصّالحات لنبوّئنّھم من الجنّۃ غرفًا تجری من تحتھا الانھار)[1]

وُہ لوگ ایسے محلّات میں سکونت اختیار کریں گے جنھیں ہر طرف سے جنّت کے درخت گھیرے ہوں گے اور طرح طرح کی نہریں جن کے پانی کا ذائقہ اور اُس کا منظر مختلف ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے ثابت ہے، درختوں کے جھرمٹ میں سے نکل کر ان محلّات کے نیچے رواں ہوں گی۔

یہ ملحوظ رہے کہ "غُرف" جمع ہے "غُرفہ" کی۔ اس کے معنی ہیں : بلند عمارت اور بالاخانہ کہ جو اپنے اطراف سے ممتاز ہو۔ بہشتی بالا خانوں کا امتیاز یہ ہے کہ وُہ دُنیاوی مکانات اور محلّات کے مانند نہ ہوں گے کہ جن میں انسان تھوڑی دیر بھی آرام نہیں کر پاتا کہ کوچ کا نقارہ گونجنے لگتا ہے بلکہ اہل ایمان اور صالحین اُن میں ہمیشہ رہیں گے : (خالدین فیھا)۔

آیت کے اخیر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے : کیا اچھا اجر ہے اُن لوگوں کا جو صرف خوشنودئ خدا کے لیے عمل کرتے ہیں : (نعم اجر العاملین) ۔

اِس آیت میں مومنین اور صالحین کے اجر کا جو ذکر ہے اُس سے گزشتہ آیات میں کفّار اور گناہ گاروں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اگر سادہ سا موازنہ بھی کیا جائے تو مومنین اور صالحین کے اجر کی عظمت روشن ہو جاتی ہے۔

گزشتہ آیات کے مضمون میں کفّار کے آگ اور ایسے عذاب میں مُبتلا ہونے کا ذکر تھا کہ جس نے اُنھیں سر سے پاؤں تک گھیرا ہُوا ہے۔ اور اُن سے بطور سرزنش یہ کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کرتے تھے اب اُس کا مزہ چکھو۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ مومنین نعمات بہشتی میں غوطہ زن ہیں اور رحمتِ پروردگار ہر طرف سے اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ ملامت بار جملوں کے بجائے ایسے کلمات سُنتے ہیں جن سے سراسر خداوندِ کریم کے لُطف و محبّت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن سے کہا جاتا ہے : "عمل کرنے والوں کا اُجر کتنا اچھا ہے"!

ظاہر ہے کہ "عاملین" جملہ ہائے ماقبل کے قرینے کے مطابق وہ لوگ ہیں جن سے یہ کیفیت ایمان عمل صالح سرزد ہوتا ہے۔ ہر چند کہ کلمہ "عاملین" اپنے لغوی معنی میں محدُود نہیں ہے بلکہ مُطلق ہے۔

جناب رسالت مآبؐ سے ایک حدیث مروی ہے :

ان فی الجنّۃ لغرفًا یُری ظھورھا من بطونھا وبطونھا من ظھورھا۔

بہشت میں ایسے شفاف محلّات ہیں کہ اُن کے اندر کا حصّہ باہر سے اور باہر کا منظر اندر سے نظر آتا ہے۔

---

[1] "لنبوّئنّھم" کا مادہ تبوئہ (بروزن تذکرہ) ہے اس کا معنی ہے، بغرض بقائے دوام کسی کو سکونت دینا۔

حضورؐ نے یہ فرمایا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی :

یا رسول اللہؐ وہ محلّات کس کی ملکیت ہوں گے؟

آنحضرتؐ نے جواب دیا :

ھی لمن اطاب الکلام واطعم الطعام و ادام الصیام وصلی اللہ باللّیل والنّاس نیام

یہ محلّات اُس شخص کے لیے ہیں جو اپنی گفتگو کو پاکیزہ کرے، بھوکوں کو کھانا کھلائے، بکثرت روزے رکھے اور وقتِ شب جب سب لوگ محوِ خواب ہوں تو وہ اللہ کے لیے نماز پڑھے۔[1]

اِس کے بعد کی آیت مومنین عامل کے اہم اوصاف کو بیان کرتی ہے۔ یعنی : یہ وہ لوگ ہیں جو مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر توکّل کرتے ہیں : (الّذین صبروا وعلٰی ربّھم یتوکّلون)۔

یہ لوگ اپنے بیوی بچّوں، دوستوں، عزیزوں اور گھر بار سے جُدا ہوتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔

یہ مومنین غربت کی تلخیاں، وطن سے نکل کر بے وطنی کی سختیاں سہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے دُشمنوں کے آزار کو جان و دل سے برداشت کرتے ہیں اور اپنے نفس سے جہاد کی راہ میں، جو جہادِ اکبر اور اپنے سے قوی دُشمنوں سے لڑائی میں جو کہ جہادِ اصغر ہے، طرح طرح کی مشکلات برداشت کرتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔

بے شک اِس صبر و استقامت ہی میں اُن کی کامیابی کا راز ہے اور یہی اُن کے شرف کا باعث ہے۔ کیونکہ صبر و استقامت کے بغیر زندگی میں کوئی تخلیقی اور مثبت عمل نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں وہ مومنین نہ اپنے مال و دولت پر بھروسا کرتے ہیں، نہ اپنے دوستوں اور عزیزوں پر۔ اُن کا توکّل صرف خدا پر ہے اور صرف اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اگر ایک ہزار دشمن بھی اُنھیں ہلاک کرنے کا ارادہ کریں تو وہ یہ کہتے ہیں :

اے خدا! اگر تو میرا دوست ہے تو مجھے دشمنوں سے کچھ خوف نہیں۔

اگر ہم سچ مُچ غور کریں تو صبر و توکّل ہی جُملہ فضائل اِنسانی کی جڑ ہے۔ "صبر" انسان کو موانع اور مشکلات کے مقابلے میں استقامت بخشتا ہے اور "توکّل" اِس راہ پُر نشیب و فراز میں انسان کو آمادہ بہ عمل رکھتا ہے۔ درحقیقت اعمالِ صالح انجام دینے کے لیے اِن دو فضائلِ اخلاقی یعنی صبر و توکّل سے مدد لینی چاہیئے۔ کیونکہ صبر و توکّل کے بغیر وسیع پیمانے پر اعمالِ صالح کا انجام دینا ممکن ہی نہیں ہے۔[2]

---

[1] تفسیر قرطبی، ذیل آیت زیر بحث، جلد ۷، صفحہ ۵۰۷۵۔

[2] توکّل کی حقیقت اور اُس کے فلسفے کے بارے میں مفصّل بحث جلد ۶ میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۲ کے ذیل میں مذکور ہے اور صبر کے بارے میں جلد ۶ صفحہ ۲۷۷ اور جلد ۲ میں صفحہ ۲۱۷ (اُردو ترجمہ) دیکھیے۔

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن لوگوں کے شکوک و شبہات کا جواب ہے جو اپنی زبان قال یا زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ: اگر ہم اپنے شہر سے ہجرت کریں گے تو ہمیں روزی کون دے گا؛ قرآن میں ان کے اس خوف کا یہ جواب دیا گیا ہے: تم روزی کی فکر نہ کرو اور ذلت و اسارت کے عیب و عار کو برداشت نہ کرو ـــــ روزی رساں خدا ہے نہ کہ تم بلکہ زمین پر چلنے والے بہت سے جانذار ایسے بھی ہیں جو اپنا رزق اُٹھا نہیں سکتے اور نہ وہ اپنے گھونسلوں اور بلوں میں غذا کا ذخیرہ کرتے ہیں اور ہر روز انہیں نئے رزق کی طلب ہوتی ہے مگر خدا اُنہیں بھوکا نہیں چھوڑتا اور انہیں رزق دیتا ہے وہی خدا تمہیں بھی رزق دے گا: (وکاین من دآبۃٍ لاتحمل رزقھا اللّٰہ یرزقھا وایاکم)۔

انسان سے قطع نظر زمین پر حرکت کرنے والوں اور حیوانات و حشرات میں، بہت ہی کم ایسی انواع ہیں جو چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی غذا صحرا و بیابان سے لاکر اپنے بل یا چھتے میں ذخیرہ کرتی ہوں۔ اکثر مخلوقات "قانع الیوم" ہیں یعنی وہ ہر روز اپنے لیے تازہ رزق حاصل کرتی ہیں۔ اور جو کمایا سو کھایا کے طرزِ عمل پر زندگی گزارتی ہیں۔ اس قسم کی کروڑوں مخلوقات ہمارے اطراف و جوانب میں دُور و نزدیک۔ بیابانوں، سمندروں کی گہرائیوں، پہاڑوں کی بلندیوں اور دروں میں موجود ہیں یہ سب اپنے پروردگار کے خوانِ بے دریغ سے اپنا رزق کھاتے ہیں۔

لہٰذا ـــــ تو اے انسان جو کہ ایسی مخلوق کے مقابلہ میں اپنی روزی حاصل کرنے اور اُسے ذخیرہ کرنے کے لیے زیادہ باہوش اور توانا ہے، اپنی قطع روزی کے خوف سے ایسی مکروہ اور شرمناک زندگی سے کیوں چمٹا ہوا ہے؛ اور دُنیا میں ہر قسم کے ظلم و ستم اور ذلت و خواری کو کیوں برداشت کرتا ہے؛ تو بھی اس تنگ و تاریک زندگی کے دائرہ سے باہر نکل اور اپنے پروردگار کے وسیع دسترخوان پر بیٹھ اور روزی کی فکر نہ کر۔

اُس حالت میں جب کہ تُو اپنی ماں کے شکم میں ایک ناتوان جنین کی شکل میں تھا اور کوئی شخص بھی یہاں تک کہ تیرے باپ اور تیری مادرِ مہربان کا دستِ شفقت بھی تجھ تک نہ پہنچ سکتا تھا، تیرے خدا نے تجھے فراموش نہیں کیا اور جس چیز کی تجھے ضرورت تھی وہ بہم پہنچائی۔ اِس وقت تو تُو ایک توانا اور طاقتور وجُود ہے۔ نیز چونکہ حاجت مندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ روزی رساں اُن کی ضروریات سے آگاہ ہو، اِسی لیے آیت کے آخر میں: (وھو السمیع العلیم) فرمایا گیا ہے۔ یعنی وہی سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

وہ تم سب کی باتیں سُنتا ہے یہاں تک کہ تمہاری اور تمام حرکت کرنے والے جانداروں کی زبانِ حال کو بھی سُنتا اور جانتا ہے، تم سب کی ضروریات سے خُوب آگاہ ہے اور کوئی چیز اس کے بے پایاں علم سے پنہاں نہیں ہے۔

۶۱۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

۶۲۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

۶۳۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۗ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۗ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

۶۴۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۗ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

۶۵۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ○

۶۶۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚۙ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۶۱۔ اگر اُن سے تو پُوچھے کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے خلق کیا اور کس نے تمہارے لیے شمس و قمر کو مُسخر کیا ہے، تو وہ کہیں گے اللہ نے تو پھر وُہ (عبادتِ خدا سے) منحرف کیوں ہو رہے ہیں ؟

۶۲۔ خُدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

۶۳۔ اگر تُو اُن سے پُوچھے کہ آسمان سے پانی کس نے برسایا اور اُس کے وسیلے سے زمین کو اُس کی موت کے بعد کس نے زندہ کر دیا ؟ تو کہیں گے کہ اللہ نے تو اُن سے کہہ : تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ مگر اُن میں سے اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

۶۴۔ یہ دُنیا کی زندگی تو لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں اور حقیقی زندگی کا مقام تو دارِ آخرت ہی ہے۔ کاش کہ وہ لوگ جانتے۔

۶۵۔ جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ اللہ کو پُکارتے ہیں (اور اُس کے غیر کو بُھول جاتے ہیں)۔ مگر جب اللہ اُنھیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وُہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔

۶۶۔ (چھوڑو انہیں) تاکہ ہم نے جو آیات اُنھیں بخشی ہیں اُن کا انکار کریں اور دُنیا کی زُود گزر لذّات سے فائدہ اُٹھائیں۔ لیکن بہت جلد اُنھیں معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر

دل میں خُدا زبان پر بُت :

آیاتِ گزشتہ میں رُوئے سُخن ان مُشرکین کی طرف تھا جنھوں نے حقانیتِ اسلام سمجھ تو لیا تھا لیکن اِس خوف سے کہ اُن کی بسر اوقات کے ذرائع منقطع ہو جائیں گے وہ ایمان کو قبول کرنے اور ہجرت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ آیاتِ زیرِ بحث میں رُوئے سُخن بجانب پیمبرِ اسلامؐ اور درحقیقت تمام مومنین کی طرف ہے۔ ان آیات میں دلائلِ توحید کو "خلقت"، ربوبیت اور "فطرت" کی بنیاد پر تین مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ اِن دلائل کے ذریعے یہ بات اُن کے دل نشین کی گئی ہے کہ اُن کی تقدیر اُس خدا کے ہاتھ میں ہے جس کی قدرت کے آثار تم انفس و آفاق میں دیکھتے ہو، نہ کہ بُتوں کے اختیار میں کیونکہ اس معاملے میں اُن کا کچھ دخل نہیں ہے۔

سب سے پہلے خلقت زمین و آسمان کا ذکر کیا گیا ہے اور مُشرکین کے باطنی اعتقادات کا حوالہ دیتے ہُوئے فرمایا گیا ہے: اگر تم ان سے یہ سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا ہے ؛ اور کس نے بندوں کے مفاد میں سُورج اور چاند کو اپنے زیرِ فرمان مُسخر کر رکھا ہے، تو سب کے سب بیک زبان جواب دیں گے: "اللہ" نے: (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله)۔

کیونکہ یہ مُسلّم ہے کہ بُت پرست یا اُن کے علاوہ کوئی آدمی بھی یہ نہیں کہتا کہ خالقِ زمین و آسمان اور تسخیر کنندۂ خورشید و ماہ یہ حقیر سے پتھر اور لکڑی کے بُت ہیں جنھیں انسانوں نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہے۔

بہ الفاظِ دیگر بُت پرست بھی خدا کی توحید میں کوئی شک نہ کرتے تھے۔ البتہ وہ لوگ عبادت میں مُشرک تھے۔ وہ کہتے تھے: "ہم بُتوں کو اس لیے پُوجتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہیں۔ جیسا کہ سُورۂ یونس کی آیت ۱۸ میں مذکور ہے :

ويقولون هؤلاء شفعاؤنا عند الله

(اُن کا قول تھا) ہم اِس لائق نہیں ہیں کہ براہِ راست خُدا سے ارتباط حاصل کریں۔ اِس لیے ہمیں چاہیئے کہ بُتوں کے ذریعے سے رابطہ برقرار رکھیں:

ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى

ہم اُن کی پرستش نہیں کرتے مگر اس وجہ سے تاکہ ہمیں اُن کے وسیلے سے خُدا کی قُربت حاصل ہو جائے۔ (زمر - ۳)

وہ لوگ اس حقیقت سے غافل تھے کہ خالق اور خلق کے درمیان کوئی فاصلہ موجود نہیں ہے اور وہ ہم سے رگِ جاں سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ انسان موجوداتِ عالم کُل سرسبد اور شاہکار ہے، وہی اِس قابل ہے کہ خدا سے بلاواسطہ

رابطہ پیدا کرسکے۔ کوئی اور مخلوق اُس کے لیے واسطہ نہیں بن سکتی۔

بہرحال، اس روشن دلیل کے بعد، آیت کے اخیر میں فرمایا گیا ہے: جب حقیقت یہ ہے تو یہ کُفّار خدا کی عبادت سے منہ موڑ کے پتھر اور لکڑی سے تراشے ہوئے ناچیز بُتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں: (فانّٰی یؤفکون)۔

"یؤفکون" مادہ افک (بروزن "فکر") سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی واقعی اور حقیقی شکل کو بدل دینا۔ اِسی مناسبت سے اس کا اطلاق دروغ اور بادِ مخالف پر بھی ہوتا ہے۔

اس مقام پر "یؤفکون" صیغۂ مجہول استعمال ہوا ہے۔ اس سے مُراد ہے کہ مُشرکین بحالت شعور استدلال عقلی کے ساتھ ایسا نہیں کرتے بلکہ بلا ارادہ بُت پرستی کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

تسخیر شمس و ماہ سے مُراد وہ نظامات ہیں جو خدا نے اُن کے لیے مقرّر کر دیئے ہیں اور یہ نظامات بہ اعتبارِ نتائج انسانوں کے لیے منفعت بخش ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اِس مفہوم کی تاکید کے لیے کہ خالق و رازق وہی ہے، یہ اضافہ کیا گیا ہے: خدا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے۔

اور جس کے لیے چاہتا ہے محدُود اور تنگ کر دیتا ہے: (اللّٰہ یبسط الرزق لمن یشآء من عبادہٖ و یقدر لہ)۔

روزی کی کلید اُسی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسانوں اور بُتوں کے ہاتھ میں۔

آیات ماقبل میں یہ جو کہا گیا ہے کہ "راست باز مومنین صرف اُسی پر توکّل کرتے ہیں" اسی وجہ سے ہے کہ جب کہ ہر چیز کا کُلّی اختیار اُسی کو حاصل ہے، تو وُہ پھر اظہارِ ایمان سے کیوں ڈریں اور یہ کیوں سوچیں کہ ہماری زندگیاں دُشمنوں کی طرف سے خطرہ میں ہیں۔

اگر مومنین یہ تصوّر کریں کہ خدا قُدرت تو رکھتا ہے مگر اُن کے حال سے آگاہ نہیں ہے تو یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ خدا عالمِ کُل ہے: (انّ اللّٰہ بکُلّ شیءٍ علیم)۔

یہ بات ہرگز قابلِ تصوّر نہیں کہ خدا خالق و مُدبّرِ عالم ہو اور اُس کا فیض بہ تسلسلِ لمحات موجودات کو پہنچ رہا ہو اور وُہ اُن کی حالت سے آگاہ نہ ہو۔

٭ ٭ ٭

دُوسرے مرحلے میں خدا کی ربوبیّت اور اُس کی طرف سے رزق کے چشمے جاری ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: اگر اُن مشرکین سے تم یہ سوال کرو کہ آسمان سے پانی کون برساتا ہے۔ اور زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد اُس کے وسیلہ سے کون زندہ کرتا ہے؛ تو وہ سب بیک زبان کہیں گے، "اللّٰہ": (ولئن سألتھم من نزّل من السّمآء مآءً فاحیا بہ الارض من بعد موتھا لیقولنّ اللّٰہ)۔

بُت پرستوں کا یہ باطنی اعتقاد ہے۔ یہاں تک کہ اُنھیں اُس کے زبان سے اقرار کرنے سے بھی انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی خدا ہی کو خالق اور رَبّ سمجھتے تھے اور اُسی کو مُدبّرِ عالم سمجھتے تھے۔

اُس کے بعد فرمایا گیا ہے: کہو کہ حمد و ستائش صرف اللہ ہی کے لیے ہے: (قل الحمد للّٰہ)۔

حمد و سپاس اُس ذات کے لیے ہے جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے کیونکہ پانی (جو کہ اصل سرچشمۂ حیات ہے اور سب جانداروں کے لیے باعثِ حیات ہے) اُس کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ہر قسم کا رزق بھی اُسی کی طرف سے آتا ہے۔

اس بنا پر حمد و ستائش بھی اُسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیئے۔ اور دُوسرے معبُودوں کا اس میں کچھ حصّہ نہیں ہے۔

تم خدا کا شکر کرو کہ مشرکین کو بھی ان حقائق کا اعتراف ہے۔ نیز اس بات کا بھی شکریہ ادا کرو کہ ہمارا استدلال اِس قدر مُستحکم اور ناطق ہے کہ کسی شخص میں بھی اُس کے ابطال کی قدرت نہیں ہے۔

اور چونکہ مشرکین کی گفتگو اور اُن کے عمل میں تناقض تھا، اس لیے آیت کے اخیر میں ان کلمات کا اضافہ کیا گیا ہے: (بل اکثرھم لا یعقلون)۔ اِن میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

دگرنہ کیونکر ممکن ہے ایک عاقل و فہمیدہ انسان اس قدر پراگندہ گوئی کرے کہ ایک طرف تو وہ اُس ذات کو خُدا کہے جو خالق و رازق و مُدبّرِ عالم ہے اور دُوسری طرف بُتوں کو سجدہ کرے۔ جنہیں اُس کے احوالِ حیات میں کوئی دخل ہی نہیں ہے۔

ایک طرف تو وُہ "خالق" و "ربّ" کی توحید کا قائل ہو اور دوسری طرف عبادت میں شرک کرے۔

یہ الفاظ لائقِ توجہ ہیں کہ یہ نہیں کہا کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی عقل ہے تو سہی مگر اُس سے کام نہیں لیتے۔

٭ ٭ ٭

اور اس غرض سے کہ اُن (مُشرکین) کے خیالات و افکار کو اِس محدُود زندگی کے اُفق سے بلند کرے اور اُن کی عقول کے سامنے ایک وسیع ترین عالم کا منظر پیش کرے، خُدا اس کے بعد کی آیت میں اس دُنیا کی زندگی کی کیفیّت کو سرائے آخرت کی حیاتِ جاوداں کے مقابلے میں ایک بلیغ اور پُرمعنی عبارت میں اس طرح بیان کرتا ہے: اس دُنیا کی زندگی لہو و لعب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اِس زندگی میں کھیل کُود اور لایعنی مشاغل کے سوا اور کوئی مقصد نہیں: (وما ھٰذہ الحیٰوۃ الدّنیا الّا لھوٌ و لعب)۔

حقیقی زندگی دارِ آخرت ہی کی ہے۔ کاش کہ وُہ لوگ اِس بات کو جانتے: (وانّ الدار الاٰخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون)۔

یہ الفاظ کتنے جاذب اور مؤثر ہیں۔ کیونکہ "لھو" کے معنی ایسا ہر مشغلہ اور ایسا ہر کام ہے جو انسان کو زندگی کے بنیادی مسائل سے مُنحرف کر دیتا ہے اور "لَعب" خیالی مقصد کے لیے خیالی پلاؤ پکانے کو کہتے ہیں۔ کھیل کو بھی لعب کہتے ہیں۔

جب بچّے کوئی کھیل کھیلتے ہیں تو اُن میں سے ایک بادشاہ بنتا ہے، دُوسرا وزیر بنتا ہے، تیسرا سپہ سالارِ فوج بنتا ہے، کوئی اُن میں قافلہ سالار بنتا ہے اور کوئی راہ زن بنتا ہے۔ جنگ کے بعد جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو یہ تمام عہدے خواب و

خیال بن کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کہتاہے کہ دُنیا کی زندگی ایک قسم کا مشغلہ اور کھیل ہے۔ اس دُنیا میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے تصوّرات سے دل لگاتے ہیں۔ چند روز کے بعد پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر زیرِ خاک پنہاں ہو جاتے ہیں۔ اُس کے بعد اُن کی زندگی اور اُن کے مشاغل کے متعلق لوگ سب کچھ بھُول جاتے ہیں۔

لیکن حقیقی زندگی جس کو نہ فنا ہے، نہ اس میں درد و رنج ہے، نہ خوف و اضطراب ہے اور نہ تضاد و تزاحم ہے وہ حیاتِ آخرت ہی ہے۔ مگر ـــــ کاش کہ انسان اس حقیقت کو جانے اور نظرِ دقیق اور تحقیق سے کام لے۔

جو لوگ کہ اس دُنیا سے دل لگاتے ہیں اور اس کی ظاہری سج دھج پر فریفتہ ہو جاتے ہیں وہ بچوں کی طرح ہیں۔ خواہ اُن کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو۔

ضمناً یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ کلمہ "حیوان" (بروزن "ضربان") بہت سے مفسّرین اور اہلِ لُغت کے نزدیک بمعنی "حیات" کا مفہوم رکھتاہے۔ (معنی مصدری رکھتاہے)[1]

آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ سرائے آخرت ہی عینِ حیات ہے۔ گویا اُس میں ہر طرف سے زندگی کے چشمے پھُوٹتے ہیں۔ وہاں بجز زندگی کچھ اور نہیں ہے۔

یہ بدیہی ہے کہ قرآن کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ خدا حیات سرائے آخرت کے ذکر سے اُن نعمات کی قدر کم کرے جو اُس نے اپنے بندوں کو اس دُنیا میں عنایت کی ہیں۔ بلکہ اس موازنہ سے مقصود صرف یہ ہے کہ خدا انسان کے سامنے دونوں جہان کی زندگیوں کی قدر و حیثیت کو پیش کرنا چاہتاہے۔ علاوہ بریں یہ بھی پیشِ نظر ہے کہ وہ انسان کو متنبہ کرے کہ وہ اِن نعماتِ دُنیاوی کا اسیر نہ ہو جائے بلکہ اُن کا حاکم ہو اور اپنی شخصیت کے جواہرِ اصلی کو اِن کے عوض ضائع نہ کر دے۔

٭ ٭ ٭

تیسرے مرحلے میں انسان کی فطرت و سرشت کا بیان ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ بحرانی ترین حالات میں انسان کے دل میں نُورِ توحید چمکنے لگتاہے۔ اِس حقیقت کو ایک نہایت ہی واضح مثال سے روشن کیا گیاہے۔

جس وقت وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا کو اخلاصِ کامل سے یاد کرتے ہیں۔ اُس وقت غیرِ خُدا اُن کے ذہن سے قطعی محو ہو جاتاہے۔ لیکن جب خدا اُنہیں طوفان اور گرداب سے رہائی بخش دیتاہے اور بسلامت خشکی پر پہنچا دیتاہے تو وُہ پھر مُشرک ہو جاتے ہیں: (فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین فلمّا نجاھم الی البرّ اذا ھم یشرکون)۔

یہ درست ہے کہ شدائد زندگی اور طوفانِ حوادث ہی میں انسان کی فطرت کے جوہر کھُلتے ہیں۔ کیونکہ ہر انسان کی رُوح میں توحید کا نُور چھپا ہوا ہے مگر معاشرت کے لایعنی آداب و رسُوم، غلط تربیت اور شر و فساد آگیں تعلیم اُس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مگر جب ہر طرف سے مصیبتوں کے طوفان اُٹھتے ہیں اور انسان مشکلات کے گرداب میں پھنس جاتاہے تو پھر وہ تمام وسائلِ ظاہری سے

[1] یہ کلمہ دراصل "حیی" سے ماخوذ ہے اور "حییان" تھا۔ حرفِ یا "واؤ" سے تبدیل ہو گیا اور "حیوان" ہو گیا۔

دست کش ہو جاتاہے۔ پھر اُس کی فطرت اسے ماورائے عالم کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اُس وقت اُس کے دل سے شرک آلود خیالات محو ہو جاتے ہیں اور وہ اِن حوادث کی بھٹی میں تپ کر بہ مصداق "مخلصین لہ الدین" ہر کھوٹ سے صاف ہو جاتاہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ انسان کے قلب میں ایک نقطۂ نورانی موجود ہے۔ جس کا تعلق اُس عالم سے ہے جو جہانِ مادی سے ماوراء ہے اور ذاتِ الٰہی سے اُس کا نزدیک ترین ربط ہے۔

غلط تعلیمات، غفلت و غرور بالخصوص ہر جہت سے سلامتی اور فراوانیٔ دولت کی حالت میں اس نقطۂ نورانی پر پردے پڑ جاتے ہیں مگر حوادث کے طوفان ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں، غفلت کی گرد جھڑ جاتی ہے اور وہ نقطۂ نورانی پھر چمکنے لگتاہے۔

عظیم ہادیانِ اسلام مُنکرینِ خدا کو اِسی طریقہ سے راہِ راست پر لاتے تھے۔

ہم سب نے اُس شکی کی داستان سُنی ہے جو معرفتِ الٰہی کے معاملہ میں سخت شک میں مُبتلا تھا اور امام جعفر صادقؑ نے اِسی لاشعوری جذبے کے حوالے سے اس کو ہدایت فرمائی۔ اُس آدمی نے امام کی خدمت میں عرض کی:

یا بن رسول اللّٰہ دلنی علی اللّٰہ ما ھو؟ فقد اکثر علی المجادلون وحیرونی فقال لہ الامام (ع): یا عبد اللّٰہ! ھل رکبت سفینۃ قط؟

قال: نعم

قال: فھل کسر بک حیث لا سفینۃ تنجیک ولا سباحۃ تغنیک؟

قال: نعم

قال: فھل تعلق قلبک ھنالک ان شیئاً من الاشیاء قادر علی ان یخلصک من ورطتک؟

قال: نعم

قال الصادق (ع): فذالک الشیٔ ھو اللّٰہ القادر علی الانجاء حیث لا منجی وعلی الاغاثۃ حیث لا مغیث۔

اے فرزندِ رسُولؐ! آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ خدا کون ہے؛ کیونکہ مجھے ایک عظیم وسوسہ نے حیران کر دیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا: اے بندۂ خدا! کیا تو کبھی کشتی میں سوار ہوا ہے؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ تیری کشتی ایسی جگہ ٹوٹی ہو کہ وہاں تجھے بچانے کے لیے کوئی کشتی موجود نہ ہو اور تُو تیر بھی نہ سکتا ہو؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کیا اُس حالت میں تیرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کوئی ہستی ایسی ہے جو

تجھے اس مصیبت سے بچا سکتی ہے؟

اُس نے عرض کیا: ہاں۔

امامؑ نے فرمایا: وہ خدا ہی ہے جو اس حالت میں نجات دینے پر قدرت رکھتا ہے

جب کوئی نجات دہندہ اور فریادرس نہ ہو۔[1]

❖ ❖ ❖

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں خدا پرستی اور توحید باری تعالیٰ پر ان تمام استدلات کے بعد مخالفین اسلام کو سخت تہدید شدید کے بعد، ارشادِ خداوندی ہے: وُہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں اور ہماری عطا کردہ نعمات کے ناشکر گزار ہیں۔ وہ چند روز ان زودگزر لذات سے لطف اُٹھا لیں۔ لیکن وہ جلد سمجھ جائیں گے کہ کفر و شرک کا انجام کیا ہوگا اور وہ اُنھیں کن آفات میں مبتلا کر دے گا: (لیکفروا بما اٰتیناھم ولیتمتعوا فسوف یعلمون)۔

اگرچہ اس آیت میں کُفر اور انکارِ آیات کا ذکر ہے لیکن یہ بدیہی ہے کہ ان الفاظ کا مقصد تہدید ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی جرائم پیشہ انسان سے کہا جائے کہ تم سے جو گناہ اور جُرم بھی ہو سکتا ہے کر لو لیکن اپنے اعمال کا نتیجہ جلد ہی بھگتو گے۔

اگرچہ عبارت میں صیغۂ امر استعمال ہوا ہے مگر اس سے کسی شے کی طلب مراد نہیں بلکہ تہدید مراد ہے۔

نیز یہ کہ "فسوف یعلمون" مطلق صورت میں آیا ہے اور یہ وضاحت نہیں ہے کہ وہ کیا جان لیں گے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ وہ جلد جان لیں گے۔

یہ شیوۂ کلام صرف اس لیے ہے کہ اس کا مفہوم جتنا بھی زیادہ وسیع ہوگا سُننے والے کا ذہن کسی حد میں محدود نہ رہے گا۔ بداعمالیوں کا نتیجہ عذابِ الٰہی، دونوں جہان میں رُسوائی اور ہر قسم کی بدبختی ہے۔

❖ ❖ ❖

سختیوں میں فطرتِ انسانی کے جوہر کُھلتے ہیں:

ہم ان شاءاللہ سورۂ رُوم کی آیت ۳۰ کے ذیل میں اصل توحید و خدا شناسی کے امرِ فطری ہونے کے متعلق تفصیل سے بحث کریں گے۔

اس مقام پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں زندگی کی مشکلات اور سختیوں کا ذکر اس عنوان سے کیا گیا ہے کہ وہ انسان کی اس فطرت کے ظہور کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔

ایک مقام پر فرمایا گیا ہے:

وما بکم من نعمةٍ فمن الله ثم اذا مسّکم الضرُّ فالیه تجئرون ثمّ اذا کشف الضرّ عنکم اذا فریقٌ منکم بربّھم یشرکون ۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۳ طبع جدید صفحہ ۴۱

تمہارے پاس جتنی بھی نعمات ہیں وہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں اور جب تم پر کوئی بلا نازل ہوتی ہے تو تم اُس کی درگاہ میں فریاد کرتے ہو۔ مگر جب خدا وہ بلا تم سے ٹال دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ پھر مُشرک ہو جاتا ہے۔ (نحل: ۵۳-۵۴)

سُورہ یونس میں یہ بات ایک اور طرح سے بیان ہوئی ہے:

واذا مسّ الانسان الضرّ دعانا لجنبه او قاعداً او قائماً فلمّا کشفنا عنه ضرّه مرّ کان لم یدعنا الی ضرٍّ مسّه جب انسان کو مصیبت آلیتی ہے تو سوتے، بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی حالت میں ہمیں پکارتا ہے۔ لیکن جب ہم وہ مشکل دُور کر دیتے ہیں تو وہ اپنی پہلی غفلت میں جا پڑتا ہے۔ گویا کہ اس نے اپنی مُشکل کے حل کے لیے ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔ (یونس ۱۲)

سُورۂ رُوم کی آیت ۳۳، سورۂ زمر کی آیت ۴۹ اور سُورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۶۷-۶۹ میں یہی مطلب عبارات و دیگر اشارات پُرمعنیٰ کے ساتھ آیا ہے۔

ہم نے آیات زیر بحث میں بھی یہ پڑھا ہے کہ مُشرکین کا یہ گروہ جب اُن کے دل نجاستِ کفر سے آلودہ ہوتے ہیں تو بتوں کے پاس جاتا ہے مگر جب یہ سمندری سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور وہاں اُنھیں طوفان، بھنور اور مخالف ہوائیں گھیر لیتی ہیں اور اُن کی کشتیاں سطحِ امواج پر گھاس کے تنکے کی طرح حرکت کرنے لگتی ہیں اور وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اُن کے قلب میں نُورِ توحید چمکنے لگتا ہے اور تمام خود ساختہ معبود غائب ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے دل میں "خلوصِ کامل" پیدا ہوتا ہے (مگر یہ خلوص مجبوراً پیدا ہوتا ہے اور بے قدر ہوتا ہے)۔

لیکن جیسے ہی طوفان ٹل جاتا ہے اور حالات پھر معتدل ہو جاتے ہیں تو اُن کے دل پر پھر پردے پڑ جاتے ہیں اور گلِ توحید کے اطراف میں شرک اور بُت پرستی کے کانٹے اُگ آتے ہیں۔

ممکن ہے کہ کُفار کی اس قلبی کیفیت کے لیے عُذر پیش کیا جائے کہ اُن کی یہ حالت شعور میں اُن تمام نہیں خیالات اور اثرات کی وجہ سے ہے، جو اُنھوں نے اپنے معاشرے اور تہذیب سے حاصل کر لیے ہیں۔

مگر یہ عُذر اس صُورت میں قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ یہ حالت صرف اُن مذہبی لوگوں کی ہوتی جو مذہبی ماحول میں رہتے ہیں، لیکن تجربہ یہ ہے کہ غیر مذہبی معاشرے میں سخت ترین منکرین خدا کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نورِ توحید کا راز کہیں اور مخفی ہے۔ یعنی وہ انسان کے لاشعور اور اُس کی فطرت و سرشت میں داخل ہے۔

۶۷۔ اَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ○

۶۸۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ

۶۹۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ○

ترجمہ

۶۷۔ کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام اُمن بنایا ہے۔ درآں حالیکہ لوگ اُس کے اطراف سے اُچک لیے جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور خُدا کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟

۶۸۔ اُس سے زیادہ ظالم کون ہے جو خُدا پر جھوٹ باندھتا ہے یا جب اس کے سامنے حق بات آئے تو اُس کی تکذیب کرتا ہے۔ کیا کافروں کا ٹھکانا جہنّم نہیں ہے؟

۶۹۔ اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں خلوصِ نیت کے ساتھ جہاد کیا ہم ضرور اُنھیں اپنی راہ کی ہدایت دیں گے اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

شانِ نزول

تفسیر "دُرالمنثور" میں زیرِ بحث آیت کے متعلق ابنِ عباس سے یہ روایت منقول ہے:
مشرکین کے ایک گروہ نے رسول اللہؐ سے یہ کہا: اے محمدؐ! ہم آپؐ کے دین میں اس وجہ سے داخل نہیں ہوتے کہ ہم ڈرتے ہیں کہ لوگ (مخالفین) ہمیں اُٹھا کر لے جائیں گے (اور جلد ہی موت کے گھاٹ اتار دیں گے) کیونکہ ہماری تعداد کم ہے اور مشرکینِ عرب کی جمعیت زیادہ ہے۔ جیسے ہی اُنھیں یہ اطلاع ملے گی کہ ہم نے آپ کا دین قبول کر لیا ہے تو وہ ہمیں اُٹھا کر لے جائیں گے۔ ہم اُن میں سے صرف ایک ہی شخص کی خوراک ہیں۔
اس مقام پر آیت "اولم یروا..." نازل ہوئی۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں بھی مشرکین کے اس بہانے کی طرف دُوسری صورت سے اِشارہ ہوا تھا کہ:
"ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر ہم اظہارِ ایمان کر دیں اور اُس کے ساتھ ہجرت کریں تو ہماری زندگی تو مختل ہو جائے گی"
قرآن میں اُن کے اس بہانے کا مختلف طریقوں سے جواب دیا گیا ہے۔

زیرِ بحث آیات میں اُنھیں ایک اور طریقے سے جواب دیا گیا ہے۔ خدا فرماتا ہے: کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے لیے حرم امن قرار دیا ہے۔ (یعنی سرزمینِ پاک و مقدس مکہ): (اولم یروا انا جعلنا حرمًا امنًا)۔

جب کہ سارے عرب بدامنی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ "اس سرزمین سے باہر انسانوں کو اُٹھا کے لے جاتے ہیں" ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہے مگر اس سرزمین میں بہر حال امن و امان برقرار رہتا ہے: (و یتخطف الناس من حولھم)۔

وہ خدا جو اس امر پر قادر ہے کہ حجاز کے اس بحرِ متلاطم و طوفانی میں حرمِ مکہ کو آرام و امن کے ایک جزیرہ کی مانند بنا دے، تو کیا اُس میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ اُنھیں دُشمنوں سے محفوظ رکھے؟ وہ لوگ خدائے قادر و توانا کے مقابلے میں اِن ضعیف و ناتوان لوگوں سے کیوں ڈرتے ہیں؟

کیا اس کے باوجود وہ باطل پر ایمان رکھیں گے اور خدا کی نعمت کا انکار کرتے رہیں گے: (افبالباطل یؤمنون وبنعمۃ اللہ یکفرون)۔

مختصر بات یہ ہے کہ جو خدا اِس اَمر پر قادر ہے کہ ایک پُرفساد ملک میں جہاں نیم وحشی لوگ آباد ہیں، ایک چھوٹے سے علاقے کو جائے امن قرار دے دے۔ کیا وہ یہ نہیں کر سکتا کہ کافر اور بے ایمان لوگوں میں مومنین کو آفات سے محفوظ رکھے

⁂

قرآن میں اس روشن دلیل کے ذکر کے بعد بطورِ استقرا ایک کلیّہ قائم کیا گیا ہے: آیا اُن لوگوں سے بھی زیادہ ظالم کوئی ہے

خدا پر بہتان باندھتے ہیں یا جب حق اُن کے پاس آتا ہے تو اُس کا انکار کرتے ہیں۔ (ومن اظلم ممن افترٰی علی اللّٰہ کذبًا او کذّب بالحقّ لمّا جاءہ)۔

ہم تے تمہارے لیے اس اَمر کی واضح دلائل قائم کردی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔ مگر تم تو خدا پر بہتان لگاتے ہو اور اس کے لیے شریک بنا لیتے ہو۔ یہاں تک اپنے اس کفر و شرک کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ سب کچھ بھی رضائے الٰہی سے ہو رہا ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا جس میں حق کے دلائل واضح اور روشن ہیں۔ لیکن تم ان چیزوں سے قطع نظر کرکے اُنھیں پسِ پُشت ڈال دیتے ہو۔ کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم و ستم متصور ہو سکتا ہے؟

یہ شیوہ اپنے اُوپر اور تمام بنی نوعِ انسان پر ظلم ہے کیونکہ شرک اور کفر ظلم عظیم ہے۔

بہ الفاظ دیگر وسیع معنی کے لحاظ سے ظلم کا مفہوم یہ ہے کہ "کسی چیز کو اُس کے مناسب مقام سے نکالنا اور منحرف کردینا" اس لحاظ سے — کیا اس سے بھی بدتر کوئی بات ہو سکتی ہے کہ انسان ایک بے حقیقت پتھر اور لکڑی کو خالق زمین و آسمان کا شریک و سہیم بنا دے۔

علاوہ ازیں شرک جُملہ معاشرتی مفاسد کی بُنیاد ہے۔ درحقیقت دُوسرے مظالم اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً ہوا پرستی، جاہ پرستی یا دُنیا پرستی۔ ان میں سے ہر ایک، ایک قسم کا شرک ہے۔

لیکن ہر شخص متنبہ رہے کہ "ایک نامُبارک انجام" مُشرکین کے انتظار میں ہے۔ کیا کافروں کا مقام و محل دوزخ نہیں ہے؟ (الیس فی جھنّم مثوًی للکافرین)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید میں پندرہ مقامات پر جن لوگوں کو ظالم ترین افراد کہا گیا ہے۔ اُن سب کا ذکر جُملہ استفہامیہ سے کیا گیا ہے۔ یعنی "من اظلم" (یہ استفہام انکاری ہے)۔

ان آیات میں غور و فکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ بظاہر ان میں مختلف مسائل بیان ہوئے ہیں مگر دیکھا جائے تو ان سب کی بُنیاد شرک ہے۔ اس لیے ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے جلد ۳ میں سُورہ انعام آیت ۲۱ کے تحت دیکھیے:

۞ ۞ ۞

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں جس پر سُورۂ عنکبوت کا اختتام ہوتا ہے، ایک اہم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ جو اس تمام سُورت کا جوہر ہے اور اُس کے آغاز سے ہم آہنگ ہے۔

فرمایا گیا ہے اگرچہ راہِ خدا میں بہت سی مشکلات ہیں۔ مثلاً ایک دُشواری حق کو پہچاننے کی جہت سے ہے۔ شیاطین جن و انس کے وسوسوں کے لحاظ سے بھی دشواری ہے۔ بے رحم اور مغرور دُشمنوں کی مخالفت بھی ایک دُشواری ہے۔ علاوہ بریں وہ لغزشیں بھی ایک مشکل ہیں جن کا انسان سے سرزد ہونا ممکن ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک ایسی حقیقت بھی ہے جو ان مشکلات کے مقابلے میں دل کو اطمینان بخشتی اور قوی رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ "جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم

انھیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں اور خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے": (والّذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا و ان اللّٰہ لمع المحسنین)۔

اَب رہا یہ مسئلہ کہ اس مقام پر کلمہ "جہاد" سے کیا مُراد ہے؟ آیا اس سے مُراد "جہاد با دُشمن" ہے؛ یا جہاد بالنفس؛ یا جہاد در راہِ معرفتِ خُدا" بذریعہ علم و استدلال ہے؟

مفسّرین نے اس کے مفہوم کے لیے متعدد احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح کلمہ "فینا" کی تعبیرات میں بھی اختلاف ہے آیا اس سے مُراد "راہ رضائے الٰہی" ہے؛ یا راہِ جہاد بالنفس مُراد ہے؛ یا طریقِ عبادت مُراد ہے؛ یا دشمنانِ اسلام سے جنگ کرنا مُراد ہے؟

لیکن — یہ ایک روشن اَمر ہے کہ کلمہ "جہاد" اور اسی طرح کلمہ "فینا" کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہر جہت ہے۔ وہ تمام کوششیں اور ہر قسم کا جہاد جو راہِ خدا میں صرف اُس کی رضا کے لیے کیا جائے اور جس کی غایت یہ ہو کہ انسان منشائے الٰہی کے تحت زندگی بسر کرے، اس مفہوم میں شامل ہیں۔ خواہ انسان اکتسابِ معرفتِ الٰہی کی راہ میں کوشش کرے یا اپنے نفس سے جہاد کرے یا دشمنانِ اسلام سے جنگ کرے یا اطاعتِ الٰہی کی مشقت کو برداشت کرے یا وسوسۂ معصیت کے مقابلہ میں استقامت اختیار کرے یا اپنی توانائی مستضعف افراد کی مدد کرنے میں صرف کرے یا کوئی اور نیک کام کرے۔ غرض سب باتیں کلمات "جہاد" اور "فینا" کے مفہوم میں شامل ہیں۔

الغرض جو لوگ مذکورہ راہوں میں جس شکل و صُورت سے بھی مُجاہدہ کرتے ہیں خدا کی حمایت و ہدایت اُنکے شاملِ حال رہتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اُس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آیت میں کلمہ "سُبُل" (جمع سبیل بمعنی راہ) سے مُراد مختلف راستے ہیں، جو خُدا تک پہنچتے ہیں۔ یعنی جن کی غایت رضائے الٰہی ہے مثلاً۔ راہِ جہاد بالنفس۔ راہِ جہاد با دُشمنانِ اسلام۔ راہِ تحصیلِ علم و دانش وغیرہ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اِن مقاصد میں سے انسان کسی مقصد کے لیے بھی جہاد کرے تو وہ اس راہ پر گام زن ہو جاتا ہے جو خُدا تک پہنچتی ہے۔

خدا نے اپنی راہ کے تمام مُجاہدین سے یہ وعدہ کیا ہے تو اس وعدہ کو مختلف تاکیدات سے (مثلاً لامِ تاکید اور نونِ تاکید ثقیلہ سے) مؤکد کیا ہے اور انسان کی کامیابی، ترقی اور حصُولِ مقاماتِ رُوحانی کو دو چیزوں میں محصُور کر دیا ہے اور وہ ہیں "جہاد" اور "خلوصِ نیت"۔

کچھ فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ "تفکر اور مطالعہ" سے علم و دانش حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ورزشِ ذہنی انسان کی رُوح کو "صُورِ معقولات" کے قبول کرنے کے لیے تیار کر دیتی ہے اور جس وقت انسان کی رُوح اُنھیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے تو خالقِ متعال و واہب الصُّور کی جانب سے انسان کی رُوح پر فیضِ علم کی بارش ہوتی ہے۔

اس بنا پر انسان کو اس راہ میں جہاد تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن ہدایت خُدا کے اختیار میں ہے۔ نیز حدیث میں یہ جو وارد ہوا ہے کہ:

حصولِ علم کا انحصار تعلیم و تعلم کی کثرت پر نہیں ہے بلکہ علم ایک نُور ہے کہ خدا جس قلب کو اہل اور مناسب حال سمجھتا ہے اُس میں ودیعت کر دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس کا اشارہ بھی ہمارے بیان کردہ مفہوم کی طرف ہو۔

* * *

چند اہم نکات

۱۔ جہاد و اخلاص : آیات ماقبل سے یہ مطلب بخوبی اخذ ہوتا ہے کہ ہمیں جو بھی شکست و ناکامی پیش آتی ہے وہ اِن دو اسباب میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یا تو ہم نے جہاد میں کوتاہی کی ہے یا ہمارے عمل میں خلوص نہ تھا۔ اگر یہ دونوں شرائط (جہاد و اخلاص) باہم جمع ہو جائیں تو اللہ کے تاکیدی وعدے کے مطابق اُن کے لیے مقاصد میں کامیابی اور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت یقینی ہے۔

اگر ہماری منہاجِ فکر درست ہو تو ہم اسلامی معاشرے کو پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کے اسباب معلوم کر سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ جو مسلمان کل تک رہنمائے عالم تھے، آج پس ماندہ کیوں ہو گئے ہیں؟

وُہ زندگی کے ہر پہلو یہاں تک کہ ثقافت، کلچر اور اپنے قوانین کے لیے بھی دوسروں کی طرف دستِ نیاز کیوں دراز کرتے ہیں؟

وُہ سیاسی طوفانوں اور بیرونی فوجی حملوں کی صُورت میں دوسروں پر بھروسہ کیوں کرتے ہیں؟

ایک وقت وُہ تھا کہ دُوسرے اُن کے خوانِ علم و ثقافت کے ریزہ چیں تھے۔ اور آج وہ دوسروں کے دسترخوان سے رفعِ احتیاج کرتے ہیں۔

وہ کیوں اغیار کے دستِ ہوس میں گرفتار ہیں اور اُن کے مُلک دوسروں کے تصرّف میں کیوں ہیں؟

اِن تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے وہ یہ کہ یا تو ہم نے جہاد کو فراموش کر دیا ہے یا ہماری نیّتوں میں خلوص باقی نہیں رہا۔

ہاں ــــ بالکل درست ہے کہ علمی و ادبی، سیاسی و اقتصادی اور فوجی محاذوں پر ہم نے جہاد کو قطعی فراموش کر دیا ہے۔ اس کے بجائے مُسلمانوں پر حُبِّ نفس، دُنیا کی محبّت، راحت طلبی، تنگ خیالی اور اغراضِ شخصی غالب آگئی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے اپنے ہاتھ کے مقتولین کی تعداد اُس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ دُشمن نے قتل کی ہے۔

ایک مغرب زدہ یا مشرق زدہ گروہ ہے جس نے اپنی عزّتِ نفس اور اپنی خُودی کو اُن اقوام کے مقابل ہار دیا ہے۔ اسلامی ممالک کے صاحبانِ اقتدار اور رہنمایانِ قوم نے اپنے آپ کو غیر اقوام کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

اہلِ دانش اور صاحبانِ فکر و تدبیر نے مایوس ہو کر خلوت نشینی اختیار کر لی ہے۔ اِن سب اسباب نے جذبۂ جہاد اور اخلاص کو محو کر دیا ہے۔

جس وقت بھی ہمارے اندر تھوڑا سا اخلاص بھی پیدا ہو جائے گا اور ہمارے مجاہدین میں حرکتِ عمل پیدا ہو گی تو یکے بعد دیگرے کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں گی۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ مایوسیاں اُمید سے اور ناکامیاں کامیابی سے، ذلت عزّت و سربلندی سے، انتشار و نفاق وحدت و تنظیم باہمی سے بدل جائے گی۔

قرآن کتنا باعظمت و الہام بخش ہے کہ اُس نے ایک مختصر سے جُملے میں درد و درمان دونوں کو بیان کر دیا ہے۔

درست ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں ہدایتِ الٰہی اُن کے شاملِ حال رہتی ہے اور یہ بدیہی ہے کہ ہدایتِ الٰہی کے ہوتے ہوئے گم راہی اور شکست کبھی پیش نہیں آسکتی۔

اہلِ بیتؑ کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت کا مرجع آلِ محمدؐ اور اُن کے پیرو ہیں۔ تو درحقیقت وہ اِس مفہوم کے مصداقِ کامل ہیں کیونکہ یہ حضرات طریقِ جہاد اور راہِ اخلاص میں پیش قدم اور پیش رو تھے۔ اس تفسیر سے آیت کا مفہوم محدُود نہیں ہوتا۔

بہرحال ہر شخص اپنی جدوجہد کے دوران میں اِس حقیقتِ قرآنی کو واضح طور پر محسُوس کرتا ہے کہ جس وقت بھی وہ راہِ خُدا میں سعی و کوشش اور جہاد کے لیے آمادہ ہوتا ہے تو اُس کے لیے آسانیوں کے دروازے کُھل جاتے ہیں اور مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور اُس کے لیے سختیاں قابلِ تحمل ہو جاتی ہیں اور وُہ اُن پر غالب آجاتا ہے۔

* * *

۲۔ لوگ تین قسم کے ہیں : (۱) ایک گروہ ہٹ دھرم مُنکرین کا ہے کہ کوئی ہدایت بھی اُن کے لیے سُود مند نہیں ہے۔

(۲) دُوسرا گروہ اُن مُخلصین کا ہے جو حق کی جستجو میں رہتے ہیں اور نتیجتاً حق کو پا لیتے ہیں۔

(۳) تیسرا گروہ اِن سے بھی برتر ہے۔ وہ لوگ حق سے دُور نہیں ہیں کہ کوشش کر کے نزدیک ہوں۔ وُہ حق سے جُدا نہیں ہیں کہ کوشش کر کے اُس سے جا ملیں بلکہ وُہ ہمیشہ حق کے ساتھ ہیں۔

آیت ۶۸ میں "ومن اظلم ممّن افترٰی" کا اِشارہ گروہِ اوّل کی طرف تھا۔ اور ــ آیت ۶۹ میں "والّذین جاھدوا فینا" سے گروہِ دُوم مراد ہے۔ اور اِسی آیت میں "اِنّ اللّٰہ لمع المحسنین" گروہِ سوم کے لیے ہے۔ اِن الفاظ سے یہ مفہوم بھی اخذ ہوتا ہے کہ "مُحسنین" کا مقام مجاہدین سے ارفع ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جہاد اور اپنی نجات کے لیے کوشاں رہنے کے علاوہ مقامِ ایثار و اِحسان پر بھی فائز ہیں اور دُوسروں کے لیے اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے سے پہلو تہی نہیں کرتے۔

* * *

اے پروردگار! تو ہمیں ایسی توفیق عنایت فرما کہ تمام عمر تیری راہ میں سعی و کوشش سے دست بردار نہ ہوں۔

خُداوندا! ــ تو ہمیں ایسا اخلاص مرحمت فرما کہ ہمیں تیرے سوا کسی غیر کا خیال بھی نہ آئے اور کسی غیر کی طرف ہمارا قدم نہ اُٹھے۔

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

بارِ الٰہا!

تُو ہمارا مقام مجاہدین سے بلند کر دے اور ہمیں مُحسنین کے مقام احسان و ایثار پر فائز کر دے اور تمام عمر تو ہمارے سروں پر اپنی ہدایت کا سایہ رکھ۔ آمین یا ربّ العالمین۔

تفسیر سُورہَ "عنکبُوت" اختتام کو پہنچی

۲۱ شوال ۱۴۰۳ھ ہجری

سُورہَ رُوم

- مکہ میں نازل ہُوئی
- اس کی ۶۰ آیات ہیں

سُورۂ رُوم کے مُندرجات

قول مشہور کے مطابق چونکہ یہ تمام سُورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے لہٰذا اس میں مکّی سُورتوں کے سے مضامین اور رُوح موجود ہے ۔ یعنی اِس میں سب سے زیادہ مبداء و معاد کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے ۔ کیونکہ اِسلام کا مکّی عہد ایسا زمانہ تھا جس میں بُنیادی اعتقادات کی تعلیم پر زور تھا ۔ مثلاً توحید ، مبارزہ با شرک ، توجہ بہ معاد اور بروز قیامت اعمال کی جزا و سزا وغیرہ ۔ اِن مباحث کے ضمن میں کچھ اور مطالب بھی آگئے ہیں جو اِن ہی سے مربُوط ہیں ۔

درحقیقت اِس سُورۃ کے مضامین کا اِن سات حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے :

۱ ۔ اِس میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ آئندہ ہونے والی جنگ میں اہلِ روم کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہوگی ۔ یہ پیش گوئی اُس گفتگو کی مناسبت سے ہے جو اِس موضوع پر مُسلمانوں اور مُشرکین میں ہُوئی تھی ۔ اِن شاء اللہ آئندہ ہم تفصیل سے اس کا ذکر کریں گے ۔

۲ ۔ کسی قدر بے ایمان افراد کی طرزِ فکر اور اُن کی کیفیتِ حالات کا ذکر ہے اور اُس کے بعد اُنھیں بروزِ قیامت اُن کی بداعمالیوں کی سزا اور عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ۔

۳ ۔ اِس سُورۃ کی آیات کے ایک اہم حِصّے میں خُدا کی عظمت کا ذکر ہے اور اس کے لیے ان امور کی نشاندہی کی گئی ہے : آسمان و زمین ، اِنسان کے وجُود ، موت سے حیات اور حیات سے موت کے ظہور ، خاک سے انسان کی پیدائش ، اُس کے لیے نظامِ زوجیت اور اِس نظام سے ہم جنس افراد کی پیدائش ، پھر اُن کے درمیان رابطہ محبّت ، بوقتِ شب نیند کی نعمت ، دن کو حصولِ معاش کے لیے حرکت و عمل ، ظہورِ رعد و برق و باران ، موت کے بعد زمین کا دوبارہ زندہ ہونا اور امرِ الٰہی کے مطابق زمین اور دیگر سیاروں کے نظام کی تدبیر ۔

۴ ۔ ان دلائل کے ذکر کے بعد جو معرفتِ الٰہی کے لیے انفس و آفاق میں موجود ہیں ، یہ ذکر ہے کہ توحید ایک امرِ فطری ہے ۔

۵ ۔ بے ایمان افراد کے حالات کو مشرّح طور پر مکرّر بیان کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اُن کے گناہوں کے نتیجے میں زمین فساد سے بھر گئی ہے ۔

۶ ۔ سُود خواری کی مذمّت کی گئی ہے نیز مسئلہ مالکیت اور حق ذی القربیٰ کا ذکر ہے ۔

۷ ۔ دلائلِ توحید کے لیے حق کی نشانیوں کا مکرّر ذکر ہے اور اُن مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو معاد سے متعلق ہیں ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اِس سُورۃ میں بھی قرآن کی دُوسری سُورتوں کی طرح دلائلِ عقلی بھی ہیں ، جذب و احساس کو بھی بیدار کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خطابت کا ایسا مرکب ہے کہ مجموعی طور پر نفوسِ انسانی کی ہدایت اور تربیت کے لیے ایک جامع منصوبہ ہے ۔

فضیلتِ سُورۂ رُوم

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے ۔ جس کی طرف ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ۔ آپؑ نے فرمایا :

جو شخص ماہِ رمضان کی تئیسویں شب میں سُورۂ عنکبوت اور سُورۂ رُوم پڑھے گا ۔ قسم بخُدا وہ اہلِ بہشت میں سے ہے ۔ مَیں اِس کلیہ میں کوئی استثنا نہیں کرتا ۔ اِن دو سُورتوں کی خُدا کے نزدیک بڑی وقعت ہے [1]

جنابِ رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ایک اور حدیث اِس طرح سے منقول ہے :

من قرئها كان له من الاجر عشر حسنات بعدد كل ملك سبح الله بين السّماء والارض وادرك ماضيع في يومه وليلته ۔

جو شخص کہ سُورہ رُوم کو پڑھے گا اُسے ہر اُس فرشتے کے حسنات کے مقابل جو زمین اور آسمان کے درمیان خُدا کی تسبیح کرتا ہے ، دس گُناہ اجر ملے گا اور جو کچھ اُس نے رات یا دن میں تلف کیا ہے اُس کی بھی تلافی ہو جائے گی ۔[2]

یہ امر واضح ہے کہ جو شخص اِس سُورۃ کے مضامین کو جو کہ سراسر درسِ توحیدِ خُدا ہے اور بروزِ قیامت عظیم عدل و انصاف کے بیان پر مشتمل ہیں ، اپنے قلب و روح میں جگہ دے گا ، وہ محسوس کرے گا کہ خدا ہر لمحہ اُس کا محافظ و نگہبان ہے اور وہ روزِ جزا اور بروزِ قیامت عدلِ الٰہی کا یقین رکھے گا اور اُس کا دل خدا کے خوف سے اِس طرح سے معمور ہو جائے گا کہ وہ ایسے اجرِ عظیم کا مستحق ٹھہرے گا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۶۹ بحوالہ ثواب الاعمال از شیخ صدوق ۔

[2] مجمع البیان آغاز سُورۂ روم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۚ

۲۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ

۳۔ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ

۴۔ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ

۵۔ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ

۶۔ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۷۔ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱: المٓ

۲۔ اہلِ رُوم مغلوب ہو گئے۔

۳۔ (اور یہ شکست) نزدیک کے مُلک میں رُونما ہُوئی۔ لیکن وُہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے۔

۴۔ چند ہی سال میں۔ سب کام حکمِ خدا سے ہوتے ہیں خواہ (اس شکست و کامیابی سے) قبل ہوں یا بعد میں اور اُس روز مومنین خوش ہو جائیں گے۔

۵۔ خُدا کی مدد کے سبب سے۔ خُدا جسے چاہتا ہے فتح و نصرت دیتا ہے اور وُہ عزیز و رحیم ہے۔

۶۔ یہ خُدا کا وعدہ ہے اور وُہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۷۔ یہ لوگ تو دُنیا کی صرف ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت کی زندگی سے غافل ہیں۔

شانِ نزول

جُملہ مفسرین بزرگ کا اس پر اتفاق ہے کہ اِس سُورۃ کی پہلی آیات اُس وقت نازل ہوئی تھیں جب جناب رسالت مابؐ مکّہ میں تھے اور مومنین بہ لحاظ تعداد اقلیت میں تھے۔ اُس زمانے میں ایرانیوں اور رُومی حکومت میں جنگ ہوئی۔ جس میں ایرانی فوج کو فتح ہوئی تھی۔

مکّہ کے مُشرکین نے اِس فتح کو فالِ نیک سمجھ کر اپنے شرک کو مبنی برحق ہونے کی دلیل قرار دیا اور کہا کہ ایرانی تو مُشرک اور مجُوسی ہیں کیونکہ وہ ثنویت پرست ہیں مگر رُومی مسیحی اور اہلِ کتاب ہیں۔ لہٰذا جس طرح ایرانی غالب اور رُومی مغلوب ہُوئے اسی طرح آخری فتح شرک ہی کی ہوگی، اِسلام کا دَور جلد ختم ہو جائے گا اور ہم فتح مند ہوں گے۔

اگرچہ اس قسم کی خوش فہمیاں۔ بے بُنیاد ہوتی ہیں۔ لیکن اُس معاشرے اور ماحول کے جُہلا میں یہ پروپیگنڈا بے اثر نہیں رہ سکتا تھا۔ لہٰذا یہ امر مُسلمانوں پر گراں گزرا۔

اُس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ جن میں حتمی طور پر یہ کہا گیا کہ اگرچہ ایرانی اِس جنگ میں کامیاب ہوگئے ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ رُومی فوج سے شکست کھائیں گے۔ یہاں تک کہ اس پیش گوئی کے پُورا ہونے کا وقت بھی بتا دیا گیا اور کہا کہ چند سال کے اندر ہی یہ امر وقوع پذیر ہوگا۔

قرآن کی یہ حتمی پیش گوئی ایک طرف تو اس کتابِ آسمانی کے اعجاز کی علامت اور اس امر کی دلیل تھی کہ اس کے لانے والے کو خدا کے علم بے پایاں اور اس کے عالم الغیب ہونے پر کتنا بھروسہ تھا۔ دوسری طرف یہ مشرکین کی فال گیری کی نقیض تھی۔ اس پیش گوئی نے مسلمانوں کو ایسا آسودہ و مطمئن کر دیا کہ ان میں سے بعض نے اس مسئلے پر مشرکین سے شرط باندھنی شروع کر دی۔ (یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت تک اس قسم کی شرط بندی کی ممانعت کا حکم نہیں آیا تھا) [1]

تفسیر

ایک عجیب پیش گوئی :

یہ سورۃ ان انتیس سورتوں میں سے ایک ہے جو حروفِ مقطعہ سے شروع ہوتی ہیں (الم) ہم ان حروفِ مقطعہ کی تفسیر کے بارے میں بارہا بحث کر چکے ہیں بالخصوص سورہ بقرہ، سورہ آلِ عمران اور سورۂ اعراف کی ابتدا میں۔

اس مقام پر جو چیز جاذبِ توجہ ہے وہ صرف یہ ہے کہ بہت سی ان سورتوں کے برخلاف جو حروفِ مقطعہ سے شروع ہوتی ہیں اور معاً بعد ازاں ان میں عظمتِ قرآن کا ذکر شروع ہو جاتا ہے،

اس سورہ میں عظمتِ قرآن کی بحث نہیں ہے بلکہ ایرانیوں کے مقابلے میں اہلِ روم کی شکست اور پھر ان کی فتح کا ذکر ہے۔ لیکن غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بحث بھی عظمتِ قرآن ہی کا بیان ہے۔ کیونکہ یہ غیبی خبر جو زمانہ مستقبل سے متعلق ہے، اس کتابِ آسمانی کی عظمت و اعجاز کے دلائل میں شمار ہوتی ہے۔

⁂

خداوندِ عالم حروفِ مقطعہ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے۔ رومی مغلوب ہو گئے: (غلبت الرّوم)۔

اور یہ شکست اس مقام پر ہوئی ہے جو تم سے نزدیک ہے: (فی ادنی الارض)۔

"اے ساکنانِ مکہ!" تمہارے نزدیک کے علاقہ میں یہ واقعہ نمودار ہوا ہے۔ یعنی جزیرۃ العرب کے شمال سرزمین شام میں۔ اس علاقے میں جو بصری اور اذرعات کے درمیان واقع ہے۔

اس مقام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ "روم" سے مشرقی روم (موجودہ ترکی) مراد ہے نہ کہ مغربی۔

بعض مفسرین (مثلاً شیخ طوسی نے تبیان میں) نے یہ خیال کیا ہے کہ "ادنی الارض" سے مراد ملکِ ایران ہے یعنی یہ شکست ایران اور روم کی سرحد پر واقع ہوئی۔ [2]

کلمہ "الارض" کی ابتدا میں الف و لام عہد کے پیشِ نظر پہلی تفسیر درست معلوم ہوتی ہے لیکن بعض جہات سے

[1] یہ شانِ نزول مختلف تعبیرات سے تفاسیر مجمع البیان، المیزان، نور الثقلین، ابوالفتوح رازی تفسیر فخر رازی، تفسیر آلوسی، تفسیر فی ظلال اور دوسری تفاسیر میں آئی ہے۔

[2] تفسیر تبیان، جلد ۸ ص ۲۰۶۔

جن کا ذکر ہم کریں گے دوسری تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

کلمہ "ادنی الارض" سے ایک تیسرا مفہوم بھی اخذ ہو سکتا ہے جو باعتبار نتیجہ تفسیر دوم سے زیادہ مختلف نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ "زمین" سے مراد روم کا علاقہ ہے یعنی اہلِ روم نے اپنی سرحد کے قریب ترین علاقے میں ایرانیوں سے شکست کھائی۔

کلمہ "ادنی" سے اس شکست کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اگر کسی فوج کو اس کے ملک کی سرحد سے دور دراز علاقے میں شکست ہو جائے تو یہ امر اس قدر اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کسی فوج کو اس کے ملک کے قریبی علاقے میں جہاں اسے ہر طرح کی کمک پہنچ سکتی ہے اور جو زیادہ مضبوط علاقہ شمار ہو وہاں شکست ہو جائے۔

اس بنا پر "فی ادنی الارض" کے مفہوم میں رومیوں کی شکست کی اہمیت شامل ہے۔ اس حالت میں مغلوب قوم کے لیے یہ پیش گوئی کہ انھیں آئندہ چند سال میں فتح حاصل ہو گی اور بھی زیادہ اہم ہے اور ایسی پیش گوئی طریق اعجاز کے علاوہ اور کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

اس شکست کے ذکر کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ رومی اس شکست کے بعد جلد ہی فتح یاب ہوں گے: (وھم من بعد غلبھم سیغلبون)۔

صرف کلمہ "سیغلبون" ہی (یعنی وہ جلد غالب ہوں گے) بیانِ مقصود کے لیے کافی تھا مگر "من بعد غلبھم" کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ فتح کی اہمیت زیادہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک شکست خوردہ فوج کا ایک قلیل مدت میں پھر غالب آجانا غیر متوقع ہے اور قرآن میں مستقبل میں اس کے وقوع کی خبر دی گئی ہے۔ [1]

اس کے بعد اس حادثے کے وقوع کی مدت بالفاظ (فی بضع سنین)۔ چند سال ہی میں بیان کی گئی ہے۔

جب کلمہ "بضع" کہا جاتا ہے تو اس سے کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال مدت مراد ہوتی ہے۔ [2]

[1] خسرو اول انوشیرواں کے بعد اس کا بیٹا ہرمزد اور ہرمزد کے قتل کے بعد پرویز ملقب بہ خسرو دوم تخت نشین ہوا۔

سنہ ۶۱۲ء میں روم کے بادشاہ قیصر ماریس کو ایک شخص مسمی فوکس نے قتل کر دیا۔ خسرو نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر روم کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں جو سنہ ۶۱۵ء تک جاری رہی ایرانی سپہ سالاروں نے انزخ، انطاکیہ، دمشق اور یروشلم پر قبضہ کر لیا اور شمالی مصر کے بعض حصے بھی فتح کر لیے "غُلبتِ الرّوم" اس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔

قیصر ماریس کے بعد ہرقل روم کا بادشاہ بنا اس نے سنہ ۶۲۳ سنہ ۶۲۴ عیسوی میں ایرانیوں سے نہ صرف مفتوحہ علاقے واپس لے لیے بلکہ وہ ایرانی حدود میں داخل ہو کر شہر کنزک تک پہنچ گیا۔ سنہ ۶۲۸ء میں وہ ایران کے دارالسلطنت تیسفون تک آ پہنچا۔ خسرو وہاں سے فرار ہو گیا اور تھوڑی مدت بعد ایک بغاوت میں مارا گیا۔

"وھم من بعد غلبھم سیغلبون" رومیوں کی اس فتح کی پیش گوئی ہے۔

[2] کلمہ "بضع" سے اور معنی بھی مراد لیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ مدت کم از کم تین سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال ہوتی ہے یا کم از کم ایک سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال یا کم از کم چھ سال اور زیادہ سے زیادہ نو سال۔ مگر ہم نے جو کہا وہ زیادہ مشہور ہے۔

اگر خدا زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر دیتا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر چیز اور ہر کام اُسی کے اختیار میں ہے۔ خواہ کوئی بات اس شکست خوردہ قوم کی فتح سے پہلے ہو یا بعد میں: (لله الامر من قبل ومن بعد)۔

یہ امر بدیہی ہے کہ کائنات میں ہونے والے ہر واقعے کا خدا کے حکم اور اس کے ارادے سے وقوع پذیر ہونا ہمارے اختیار و آزادیٔ ارادہ اور پیش نظر مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے سعی و کوشش میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے کہ اس عبارت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ انسان سے اختیار کو سلب کر لے بلکہ یہ نکتہ سمجھانا مقصود ہے کہ درحقیقت قادر بالذات اور مالک علی الاطلاق وہی ہے اور کسی انسان کے پاس جو کچھ ہے اسی کا دیا ہوا ہے۔

اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے کہ: اگر آج رُومیوں کو شکست ہو گئی ہے اور مشرک اس سے خوش ہیں تو جب رُومی غالب ہوں گے تو مومنین خوش ہوں گے: (ویومئذٍ یفرح المؤمنون)۔

٭ ٭ ٭

البتہ مومنین نصرتِ الٰہی سے خوش ہوں گے: (بنصر الله)۔

خدا جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے، وہ شکست ناپذیر اور مہربان ہے: (ینصر من یشاء وهو العزیز الرحیم)۔

اُس روز مسلمانوں کی خوشنودی سے کیا مراد ہے؟

اس کے متعلق کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رُومیوں کی فتح سے خوش ہوں گے۔ ہر چند کہ ان کا شمار بھی کفار میں تھا، لیکن ـــــ چونکہ وہ کتاب آسمانی کے حامل تھے، انہیں مشرک مجوسیوں پر ان کی فتح گویا شرک پر توحید کی فتح کا ایک مرحلہ تھی۔

اس مسئلے میں بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ مومنین اس وجہ سے خوش ہوتے کہ انھوں نے اس واقعے کو فالِ نیک سمجھا اور مشرکین پر اپنی فتح کی دلیل خیال کیا۔

یا یہ کہ ـــــ اُن کی خوشی کا باعث یہ تھا کہ اس واقعے سے اُس روز قرآن کی عظمت اور اُس کی پیش گوئی کی صداقت ظاہر ہو گئی۔ یہ بات بھی مسلمانوں کے لیے ایک اہم معنوی فتح خیال کی گئی۔

یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ رُومیوں کی فتح مسلمانوں کی مشرکین پر فتوحات میں سے ایک فتح کی ہم زمان تھی۔ بالخصوص بعض بزرگ مفسرین نے لکھا ہے کہ رُومیوں کی یہ فتح مسلمانوں کی جنگِ بدر میں فتح یا صلح حُدیبیہ کے ہم زمان تھی کہ وہ بھی اپنی حیثیت سے ایک بڑی فتح شمار ہوتی تھی۔ خاص طور پر کلمہ "بنصر الله" اس مطلب سے مناسبت رکھتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلمان اُس روز مختلف جہتوں سے خوش ہوتے۔

اوّل تو اس وجہ سے کہ اہلِ کتاب کو مجوسیوں پر فتح حاصل ہوئی جو کہ خدا پرستی کی شرک پر فتح کی علامت تھی۔

دوم: چونکہ قرآن کی معجزانہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی، اس لیے یہ بھی ایک معنوی فتح تھی۔

سوم: اُسی زمانے میں مسلمانوں کو دوسری فتوحات کے علاوہ ایک اور فتح حاصل ہوئی تھی۔ وہ تھی صلح حدیبیہ۔

٭ ٭ ٭

پھر بطور تاکید مزید فرمایا گیا ہے: یہ وہ وعدہ ہے جو خدا نے کیا ہے: (وعد الله)[1]۔

اور خدا ہرگز وعدہ خلافی نہ کرے گا، اگرچہ اکثر آدمی نہیں جانتے: (لا یخلف الله وعده ولٰكنّ اكثر النّاس لا یعلمون)۔

اور لوگوں کی لاعلمی کا باعث یہ ہے کہ انھیں خدا اور اُس کے علم و قدرت کی معرفت حاصل نہیں ہے۔ درحقیقت انھوں نے خدا کو پہچانا ہی نہیں۔ اس لیے وہ اس حقیقت سے کہ خدا کا اپنے وعدے سے پھر جانا محال ہے، آگاہ نہیں ہیں کیونکہ وعدہ سے پھر جانا یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یعنی وعدہ کرتے وقت کوئی بات نامعلوم تھی مگر جب بعد میں معلوم ہوئی تو رائے بدل گئی یا وعدہ خلافی ضعف و ناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے [illegible] کیونکہ اس میں اپنا وعدہ پورا کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔

لیکن وہ خدا جو ہر کام کے انجام سے باخبر ہے اور اس کی قدرت تمام اہلِ جہان کی قدرتوں پر فوقیت رکھتی ہے، وہ ہرگز اپنے وعدے سے نہ پھرے گا۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ: یہ کوتاہ بین لوگ دُنیا کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور آخرت اور انجام کار سے بے خبر ہیں: (یعلمون ظاهرًا من الحیٰوة الدنیا وهم عن الاٰخرة هم غافلون)۔

یہ لوگ صرف دُنیاوی زندگی سے آگاہ ہیں اور اس زندگی کی بھی صرف ظاہری حالت پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے دُنیاوی زندگی سے جو حاصل کیا ہے وہ صرف چند مصروفیات، لذّات زودگزر اور خواب و خیال ہیں اور اس زندگی کے ماحصل میں جو غرور اور غفلت پوشیدہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اگر وہ لوگ دُنیا کی اس زندگی کے باطن اور مخفی کیفیت کو بھی جانتے ہوتے تو یہی بات اُن کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھی کہ آخرت میں کیا ہوگا۔ کیونکہ اگر اس حیات ناپائیدار پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ طویل زنجیرِ حیات کی ایک کڑی ہے اور طویل سفر کی ایک منزل ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شکمِ مادر میں بچے کی زندگی مقصود بالذّات نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک طویل زندگی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔

ہاں ٹھیک ہے کہ وہ لوگ اس دُنیاوی زندگی کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اس کی باطنی کیفیت اور مخفی حالت سے غافل ہیں۔

اس موقع پر جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ آیت ختم میں ضمیر "هم" مکرّر استعمال ہوئی ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس غفلت و بے خبری کا باعث وہ خود ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ہم سے کہے کہ: "تو نے مجھے اس

---

[1] "وعد الله" بطور مفعول مطلق منصوب ہے اور اس کا عامل محذوف ہے اور اس کے ماقبل جملہ "سیغلبون" سے جو کہ وعدۂ الٰہی کا مصداق ہے، معلوم ہوتا ہے اور بحالتِ تقدیر پورا جملہ یوں ہے: "وعد الله ذٰلك وعدًا"۔

کام سے غافل کر دیا۔ اور ہم اُس کے جواب میں یہ کہیں کہ: تُو، تو خود ہی غافل ہوگیا۔ یعنی تو خُود ہی اپنی غفلت کا باعث تھا۔

چند اہم نکات

۱۔ اعجازِ قرآن — علمِ غیب کے لحاظ سے: قرآن کا معجزہ ثابت کرنے کے دلائل میں سے ایک دلیل قرآن کی غیبی خبریں بھی ہیں کہ جن کا ایک نمونہ آیاتِ زیرِ بحث میں آیا ہے۔ چنانچہ آیات کے اندر مکرر تاکیدات کے ساتھ ایک شکست خوردہ فوج کی چند سال بعد عظیم فتح کی خبر دی گئی ہے اور اس اطلاع کو خدا کے تخلف ناپذیر وعدہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس پیش گوئی کے چند اہم پہلو ہیں، اوّل تو مطلقاً فتح کی خبر دی گئی ہے:

وھم من بعد غلبھم سیغلبون

اور اس کے بعد انہیں جلد ہی فتح نصیب ہوگی۔

دوسرے کفار پر اُسی زمانے کے قریب مسلمانوں کی فتح کی خبر ہے:

ویومئذٍ یفرح المؤمنون بنصر اللہ

اور اُس نصرتِ الٰہی کے باعث اہلِ ایمان خوش ہوں گے۔

تیسرے یہ تصریح ہے کہ واقعہ چند سال بعد ظہور پذیر ہوگا: فی بضع سنین۔

چوتھے دوبارہ تاکید کے ساتھ اس وعدے کا قطعی ہونا ثابت کرتے ہیں:

وعد اللہِ لا یخلف اللہ وعدہٗ

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ نو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ دونوں واقعات وقوع پذیر ہوگئے۔ نئی جنگ میں رومیوں نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی اور قریباً اُسی زمانے میں صلح حدیبیہ کے ذریعے (اور ایک روایت کے مطابق جنگ بدر میں) مسلمانوں کو دشمنوں پر قابلِ دید فتح حاصل ہوئی۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک انسان اپنے عام اکتسابی علم کے ساتھ ایسے اہم واقعے کی بطور قطعی خبر دے سکتا ہے؟

یہاں تک کہ بالفرض اگر کوئی سیاسی آدمی پیش بینی کے قابل بھی ہو۔ تب بھی وہ ایسی بات نہایت محتاط الفاظ میں بطور احتمال کہے گا، نہ کہ اس طرح صراحت اور تیقن کے ساتھ کیونکہ اگر یہ پیش گوئی غلط ثابت ہو جاتی تو دشمنوں کے ہاتھ ابطالِ نبوت کی ایک سند آجاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسائل مثلاً اہلِ روم کی فتح یا واقعہ حدیبیہ ثابت کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے علم و اطلاع کا منبع

کوئی دوسرا تھا۔ وگرنہ کوئی شخص بھی معمول کے اور عام حالات میں نہ اتنی توانائی رکھتا ہے، نہ جرأت کر سکتا ہے کہ تیقن کے ساتھ ایسی بات کہہ دے۔

بالخصوص پیغمبرِ اسلامؐ کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو غیر محتاط بات کہہ دیتے ہیں بلکہ آپ کے تمام کام منظم و محکم تھے۔ ایسا شخص اگر اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اطلاعات کا مرکز ماورائے طبیعت ہے اور اس کا انحصار وحیِ الٰہی اور خدا کے بے پایاں علم پر ہے۔

اس پیش گوئی کی تاریخی مطابقت پر ہم جلد ہی بحث کریں گے۔

۲۔ ظاہر بین لوگ: اُصولاً ایک مومن اور صاحبِ معرفت انسان اور ایک مادہ پرست یا مشرک کی بصیرت میں بہت فرق ہے۔

مقدم الذکر انسان اپنے عقیدۂ توحید کی بنا پر کائنات کو خدائے حکیم و دانا کی مخلوق سمجھتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ کے تمام افعال ایک پیشِ نظر غایت کے تحت اور حکمت پر مبنی ہیں۔ اور اس بنا پر وہ عالم کو نہایت دقیق اسرار و رموز کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے اس عالم میں کوئی چیز بھی بے کار نہیں ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کے تمام کلمات پر مغز و پر معنی ہیں۔

یہ بصیرتِ توحیدی اُسے متنبہ کرتی رہتی ہے کہ دُنیا کے کسی واقعے اور کسی امر ... کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھے کیونکہ ممکن ہے کہ جو بات بالکل سادہ نظر آتی ہے اُس میں پیچیدہ ترین راز ہوں۔

توحید پرست انسان کی نظر اس دُنیا کی گہرائی کو دیکھتی ہے نہ صرف اُس کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتی۔ اس نے مکتبِ توحید میں یہ سبق پڑھا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدا کا کوئی فعل بیہودہ نہیں ہے اور تخلیقِ عالم کی کوئی غایت ہے۔ اس لیے کائنات کے ہر جزو کو اُسی غایت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔

اُس کے مقابلے میں مؤخر الذکر مادہ پرست بے ایمان انسان دُنیا کو اندھے، بہرے اور بے مقصد واقعات کا ایک مجموعہ سمجھ کر صرف اُس کے ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس حقیقت کا قائل ہی نہیں ہے کہ اس کا باطن اور عمق بھی ہے۔

اس گروہ کا خیال ہے کہ بالغرض ایک کتاب ہے جس کے اوراق پر ایک طفلِ نادان نے اپنی اُنگلیوں سے بے مقصد لکیریں اور خطوط کھینچ دیئے ہیں تو کیا اس کتاب کی کوئی اہمیت ہوگی؟ یا اُس میں کچھ معنی ہوں گے؟ اُن کی نظر میں یہ دُنیا بھی ایسی ہی ہے۔

یہاں تک کہ بعض عظیم سائنس دانوں کا قول ہے کہ بنی نوعِ انسان میں سے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے وہ مفکرین جو نظامِ کائنات کے متعلق غور و فکر کرتے رہے ہیں وہ مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ (غور کیجیے گا)۔

چنانچہ دانش مند معروف معاصر آئن سٹائن یُوں کہتا ہے[1]:

---

[1] آئن سٹائن (EINSTEIN) کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

دُنیا کے نقد جیسے مفکر ... اس سے منطق والا ایسا شخص
سمجھ سکتا ہے جو ایک قسم کا مخصوص مذہبی احساس نہ رکھتا ہو، اگرچہ اُس کا مذہب
عامۃ النّاس کے مذہب سے مختلف ہوتا ہے۔

اس عالم کا مذہب کائنات کے عجیب و دقیق نظام پر غور کرنے کے بعد ایک
مسرت بخش حیرت پر مبنی ہوتا ہے۔ جب کبھی ان اسرار سے پردہ اُٹھتا ہے تو معلوم
ہوتا ہے کہ انسان نے اَب تک اپنی منظم کوشش اور غور و فکر سے اس کائنات
کے متعلق جو کچھ جانا ہے، وہ علم کے ایک ہلکے عکس سے زیادہ نہیں ہے۔

آئن سٹائن ایک دُوسری جگہ کہتا ہے:

سائنس دانوں، متفکرین اور انکشاف کرنے والوں کے لیے وہ شئے جو اس بات کا سبب ہوئی کہ وہ عمر بھر
اور سالہا سال تک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر کائنات کے دقیق اسرار کا مطالعہ کرتے رہیں، اُن کا یہی مذہبی
اعتقاد تھا۔[۱]

ایک وہ آدمی ہے جو اس دُنیا ہی کو آخری مرحلہ اور مقصودِ حیات سمجھتا ہے۔

دُوسرا وہ شخص ہے جس کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور اس کی زندگی تو ایک کھیت اور اُس حیاتِ جاودانی کے لیے میدانِ امتحان ہے جو اس کے بعد آنے والی ہے۔ بھلا ان دونوں آدمیوں کا دُنیا کے متعلق طرزِ عمل یکساں کیسے ہو سکتا ہے؟

اُن میں سے ایک کی نظر صرف اس کے ظاہر پر ہوتی ہے اور دُوسرا اس کی عمیق حقیقت پر غور و فکر کرتا ہے۔

اور زاویۂ نظر کا یہ اختلاف اُن لوگوں کی تمام زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

ظاہر بین انسان راہِ خدا میں خرچ کرنے کو نقصان مایہ سمجھتا ہے۔ جب کہ مردِ موحد اسے پُر منفعت تجارت خیال کرتا ہے
اُن میں سے ایک سُود خوری کو اپنی آمدنی میں افزائش کا ذریعہ خیال کرتا ہے اور دُوسرا اُسے باعثِ وبال و بدبختی و زیاں سمجھتا ہے۔
اُن میں سے ایک جہاد کو اپنے لیے باعثِ زحمت اور شہادت کو بمعنی فنا سمجھتا ہے اور دُوسرا جہاد کو رمزِ سربلندی اور شہادت کو حیاتِ جاوداں خیال کرتا ہے۔

یہ درست ہے کہ بے ایمان لوگ دُنیا کی صرف ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں:

یعلمون ظاھرًا من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون ۝

۳۔ تاریخی مطابقت: اس پیش گوئی سے جنگِ ایران و رُوم کی مطابقت تاریخی یوں ہے کہ:

خسرو پرویز کے عہد میں ایرانیوں اور رُومیوں کے درمیان ایک طویل جنگ کا سلسلہ شروع ہُوا جو قریباً چوبیس سال تک جاری رہی یعنی ۶۰۴ء سے شروع ہو کر ۶۲۸ء عیسوی میں ختم ہوئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۶۱۶ء عیسوی میں ایران کے دو سپہ سالاروں شہر براز اور شاہین نے رُوم کے مشرقی علاقے پر

[۱] ماخوذ از کتاب "دُنیائی کہ من می بینم"۔

حملہ کر دیا اور رُومیوں کو شکست دے کر شامات، ایشیائے کوچک اور مصر تک کو فتح کر لیا۔ رُوم کی مشرقی حکومت جس نے شدید شکست کھائی تھی تباہی کے کنارے جا پہنچی اور ایرانیوں نے ان کے تمام ایشیائی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔

یہ واقعہ بعثتِ پیغمبرؐ کے قریباً ساتویں سال پیش آیا۔ اس کے بعد قیصرِ رُوم "ہرقل" نے ۶۲۲ء عیسوی میں ایران پر جوابی حملہ کیا اور خسرو پرویز کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ اس جنگ کا سلسلہ جس میں رُومی فاتح رہے ۶۲۶ء عیسوی تک جاری رہا۔ ایرانیوں نے شکست سے متاثر ہو کر خسرو پرویز کو سلطنت سے معزول کر کے اُس کے بیٹے "شیرویہ" کو بادشاہ بنا دیا۔

تاریخی لحاظ سے یہ امر پیشِ نظر رہے کہ جنابِ رسولِ خداؐ کی ولادت ۵۷۱ء عیسوی میں ہوئی اور آپؐ کی بعثت ۶۱۰ء عیسوی میں ہوئی۔ اس حساب سے ایرانیوں کے ہاتھوں رُومیوں کو بعثت کے ساتویں سال شکست ہوئی اور پھر رُومیوں کو فتح اور ایرانیوں کو شکست ہجرت کے پانچویں یا چھٹے سال سے منطبق ہوتی ہے۔

ہجرت کے پانچویں سال جنگِ خندق ہوئی اور چھٹے سال صلحِ حدیبیہ واقع ہوئی۔

البتہ ایران اور رُوم کے مابین جنگ کی خبروں کو حجاز و مکہ تک پہنچتے پہنچتے کچھ دیر لگی ہو گی۔ بہرحال اس تاریخی مطابقت سے قرآن کی پیش گوئی کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ (غور کیجیے گا)

۸۔ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۣ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ○

۹۔ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ۭ

۱۰۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ۧ

ترجمہ

۸۔ کیا وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے آسمانوں، زمین اور اُن دونوں کے درمیان جو کچھ ہے،کو نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ اور ایک معینہ مُدّت کے لیے۔ مگر بہت سے لوگ (قیامت اور) اپنے ربّ کی لقا کے مُنکر ہیں۔

۹۔ کیا اُن لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ دیکھ لیتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہُوا جو اُن سے پہلے تھے۔ وُہ قوت میں اُن سے زیادہ تھے۔ اُنھوں نے زمین کو (زراعت اور آبادی کے لیے) دگرگوں کیا اور اس سے زیادہ آباد کیا جتنا ان لوگوں نے آباد کیا ہے۔ اُن کے لیے مبعوث شدہ نبی اُن کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آتے رہے (لیکن انھوں نے انکار کیا اور اپنی سزا پائی) اور خُدا ایسا نہ تھا جو اُن پر ظلم کرتا یہ تو اُنھوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا۔

۱۰۔ پھر اُن لوگوں کا انجام جو اعمال بد کے مرتکب ہوئے، اس مقام تک پہنچا کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا اور اُن کی ہنسی اُڑائی۔

تفسیر

بدکاروں کا انجام:

گزشتہ زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اُن ظاہربیں لوگوں کا ذکر تھا جن کے اُفقِ فکر کی وسعت صرف اِس محدود عالَم اور جہانِ مادّی تک ہے۔ وُہ لوگ قیامت اور وجُودِ عالَمِ ماورائے طبیعت سے غافل ہیں۔

مگر ــــ آیات زیرِ بحث اور آیات آئندہ میں مبدأ و معاد کے متعلق مختلف مطالب کا ذکر ہے۔

اوّل ــــ بطورِ استفہام اعتراض آمیز قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ اپنے ذہن میں یہ نہیں سوچتے کہ خدا نے آسمانوں کو، زمین کو اور اُن کے درمیان جو کچھ ہے اُسے بھی حق کے بغیر پیدا نہیں کیا اور اُن کے لیے ایک معیّن مُدّت مقرر کی ہے:

(اولم یتفکروا فی انفسھم ما خلق اللہ السماوات والارض وما بینھما الا بالحق واجل مسمّی)۔

یعنی اگر وہ لوگ صحیح طور پر سوچیں اور اپنے وجدان اور عقل کے فیصلے کی طرف رجوع کریں تو وہ اِن دو اُمور سے خُوب آگاہ ہو جائیں گے جن میں سے اوّل یہ ہے کہ یہ کائنات اساسِ حق پر پیدا کی گئی ہے۔ اور اُس کا وُجود ایسے نظام کے تحت قائم ہے جو اُس کے خالق کی عقل، قُدرتِ کامل اور اس کے وجود کی دلیلِ کامل ہے۔

دُوسرے ــــ یہ کائنات زوال اور فنا کی طرف رواں ہے۔

چونکہ ــــ یہ ممکن نہیں ہے کہ اُس خالق حکیم نے اسے بے مقصد و بے غایت پیدا کیا ہو ۔ اس کا وجود ، اِس اَمر کی دلیل ہے کہ اِس جہان کے بعد ایک اور دُنیا اور دارُالبقا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اِس جہان کی آفرنیش بے معنی تھی اور یہ قطعی لا یعنی بات تھی کہ انسان کی چند روزہ زندگی کے لیے اِس طویل و عریض کائنات کو پیدا کر دیا جائے ۔ اسی سے وجودِ آخرت کا ثبوت ملتا ہے۔

اگر اِس حقیقت پر غور کیا جائے کہ یہ کارخانۂ کائنات ایک نظم و ترتیب کے تحت چل رہا ہے ۔ کائنات کا کوئی جز بھی آزاد اور مستقل نہیں بلکہ ہر جز اپنے وجود و بقا کے لیے ایک دوسرے کا محتاج اور باہم دگر منحصر ہے تو ہمیں تو ہمارے ذہن کی رسائی کسی مبدا یعنی خالق حکیم کی طرف ہوتی ہے اور " اجل مسمّٰی " معاد کی دلیل ہے ۔ یعنی اس کائنات کا وجود ایک معیّنہ وقت تک ہے (غور کیجئے گا) ۔

لہٰذا آیت کے اخیر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ بہت سے لوگ اپنے پروردگار کی لقا کے منکر ہیں : (وانّ کثیرًا من الناس بلقآئ ربھم لکافرون) ۔

یا اکثر آدمی " معاد " ہی کے منکر ہیں ۔ جیسا کہ قرآن شریف میں مشرکین کا قول بار بار نقل ہوا ہے کہ وہ کہتے تھے :

کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے ۔ تو ہم پھر زندہ ہو جائیں ؟ یہ تو عجیب بات ہے اور یہ غیر ممکن ہے ۔

یہ ، اس بات کے کہنے والے کے جنون کی دلیل ہے ۔ (رعد ۔ ۵ ، مومنون ۔ ۳۵ ، نمل ۔ ۶۷ ، ق ۔ ۳)

یا ۔ یہ کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کرتے لیکن اُن کا عمل ایسا پُر عصیان اور شرم ناک ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معاد پر قطعی یقین نہیں رکھتے ۔ کیونکہ اگر وہ معاد کے معتقد ہوتے تو ان کا عمل ایسا قابلِ نہ ہوتا اور وہ خود ایسے مُفسد نہ ہوتے ۔

آیت میں جو " فی انفسھم " کے الفاظ ہیں اُن کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ لوگ اپنے " اسرارِ وجود " کا مطالعہ کریں ، جیسا کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے : بلکہ ۔ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عقل و وجدان کو کام میں لاکر زمین اور آسمان کی خلقت پر غور کریں ۔

ممکن ہے کہ کلمہ " بالحق " کے دو معنی ہوں ۔ ایک تو یہ کہ کائنات کی آفرنیش ، اُس کا نظم و ترتیب اور قانونِ فطرت حق کے ساتھ ہے ۔

دوسرے یہ کہ تخلیق کا مقصد حق ہے ۔ ان دونوں تفسیروں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے [1]

" لقاء ربّھم " سے مُراد (جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے) یہ ہے کہ بروزِ قیامت حجابات اُٹھ جائیں گے اور انسان اپنے " شہود باطنی " سے خدا کو اُس کی عظمت کے ساتھ پہچانے گا ۔

❊ ❊ ❊

" اجل مُسمّٰی " کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس دُنیا کی زندگی کو دوام اور بقا نہیں ہے ۔ گویا یہ تمام دُنیا پرست لوگوں کو ایک تنبیہ ہے ۔

آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے ۔ کیا اُنھوں نے زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا کیا انجام ہوا جو اُن سے پہلے تھے : (اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الّذین من قبلھم) ۔

[1] اگر پہلے معنی مراد لیے جائیں تو " بالحق " میں جو " با " ہے وہ مصاحبت کے لیے ہوگی ۔ دوسری صورت میں یہ " لام " کے معنی میں ہوگی ۔

وہ لوگ طاقت میں ان سے زیادہ تھے ۔ اُنھوں نے زمین کو دگرگوں کیا اُسے اِن سے زیادہ آباد کیا تھا : (کانوا اشدّ منھم قوّۃ واثاروا الارض وعمروھا اکثر ممّا عمروھا) ۔

اُن کی طرف مبعوث پیغمبر اُن کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ آئے : (وجآءتھم رسلھم بالبیّنٰت) ۔

لیکن اُنھوں نے احکامِ الٰہی سے بغاوت کی اور حق کی اطاعت نہ کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی طرف سے دردناک عذاب میں مُبتلا ہوئے ۔

خدا نے تو ان پر ہرگز ظلم نہیں کیا ۔ لیکن اُنھوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا : (فما کان اللّٰہ لیظلمھم ولٰکن کانوا انفسھم یظلمون) ۔

درحقیقت آیت ۹ میں اُن اقوام کی طرف اشارہ ہے جو پیمبر کے ہم عصر مشرکین کے مقابلے میں مال ، جسمانی طاقت اور قدرت کے لحاظ سے کہیں بہتر اور برتر تھے ۔ نیز اُن کے دردناک انجام کو اِن کُفار کے لیے درسِ عبرت قرار دیا گیا ہے ۔

آیت میں " اثارُوا الارض " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔ ممکن ہے کہ اِس سے زراعت و شجر کاری کے لیے زمین کا جوتنا یا کھودنا مراد ہو یا نہریں اور کاریز کا کھودنا ، یا کسی بڑی عمارت کی تعمیر کے لیے بُنیاد کھودنا مراد ہو یہ تمام چیزیں مراد ہوں ۔ کیونکہ " اثاروا الارض " کا مفہوم بہت وسیع ہے یہاں تک کہ تعمیر و آبادی کے جُملہ مراحل اس میں شامل ہیں ۔[1]

چونکہ اس زمانے میں وہی لوگ سب سے زیادہ صاحب قوّت و اقتدار سمجھے جاتے تھے جو کاشت کاری میں ترقی یافتہ تھے یا جنھوں نے فنِ تعمیر میں خُوب ترقی کی تھی ۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اُن لوگوں کو مشرکینِ مکہ کے مقابلے میں (جو کہ ان فنون میں نہایت پس ماندہ تھے) یقیناً برتری حاصل تھی ۔

لیکن جب اُنھوں نے ان فنون میں برتری کے باوجود آیاتِ الٰہی اور اُس کے پیمبروں کا انکار کیا اور اُن کی تکذیب کی تو اُن میں عذابِ الٰہی سے بچ کر نکل جانے کی طاقت نہ تھی ۔ لہٰذا اے مشرکینِ مکہ ! تم سوچو کہ تم کس طرح اُس کے عذاب سے بچ سکتے ہو ؟

وہ یہ دردناک عذاب اور اپنے اعمال کی پاداش کو خود ہی لائے تھے ۔ اُنھوں نے خُود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا تھا ۔ خدا تو کبھی کسی پر ظلم و ستم روا نہیں رکھتا ۔

❊ ❊ ❊

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں اقوامِ گزشتہ کے آخری مرحلہ کفر کا بیان ہے کہ : اُن کی بداعمالیاں اور سرکشی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اُنھوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی اور اس سے بھی بدتر یہ کہ اُن کا مذاق اُڑانے لگے : (ثمّ کان عاقبۃ الذین اساءوا السّوآی ان کذّبوا بایات اللّٰہ وکانوا بھا یستھزءون) ۔

البتہ گناہ اور آلودگی نفس جذام کی بیماری کی طرح ہے ، جو رُوحِ ایمان کو کھا کر فنا کر دیتی ہے یہاں تک کہ انسان آیاتِ الٰہی

[1] " اثار " کا مادہ " ثور " (بوزن غور) ہے ، جس کے معنی پراگندہ کرنے کے ہیں ۔ عرب بیل کو ثَور کہتے تھے ۔ وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ اُسے ہل میں جوتتے تھے ۔

کی تکذیب کرنے لگتا ہے۔ اس منزل سے بھی آگے بڑھ کر آیاتِ الٰہی اور پیغمبروں کا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کفر کے اُس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے کہ اُس پر کسی وعظ، نصیحت یا تخویف کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اِس حالت میں اُس کے لیے صرف عذابِ الٰہی کا تازیانہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

گناہ گاروں اور اَوامرِ الٰہی کے باغیوں کے صفحاتِ زندگی کو اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ابتداء میں ایسے سرکش اور طغیان کوش نہ تھے۔ اُن کے دلوں میں نُورِ ایمان کی کوئی کرن ضرور چمکتی تھی۔ لیکن پے در پے گناہوں کا ارتکاب انھیں روز بروز ایمان اور تقویٰ سے دُور کرتا گیا اور انجام یہ ہوا کہ وہ کفر کے آخری مرحلے پر پہنچ گئے۔

کربلا کی شیر دل خاتون جناب زینب سلام اللہ علیہا نے دمشق میں یزید کے سامنے جو خُطبہ دیا ہے، اُس میں آپ نے اس آیت کو انہی معنی میں استعمال کیا ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں۔

اُن معظمہ نے دیکھا کہ یزید کفر آمیز کلمات کہہ رہا ہے اور وہ مشہور اشعار پڑھ کر جن میں سے ایک کی ابتدا یُوں ہے:

لعبت هاشم بالملك ...... اسلام کی ہر شئے کا مذاق اُڑا رہا ہے اور اُس کی اِن باتوں سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کا اسلام کے بُنیادی اُصولوں میں سے کسی پر بھی ایمان نہیں ہے[1]۔ تو، اُن مخدومہ نے حمدِ الٰہی اور پیغمبرِ اکرمؐ پر درود کے بعد یُوں فرمایا:

صدق الله كذالك يقول ثم كان عاقبة الذين
اساؤا السوای ان كذبوا بايات الله وكانوا بها يستهزءون ....

اگر آج تو ان کفر آمیز اشعار کے ذریعے اسلام اور ایمان کا انکار کر رہا ہے اور اپنے مُشرک بزرگوں سے جو جنگِ بدر میں مُسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے یہ کہہ رہا ہے کہ:

" کاش کہ تم زندہ ہوتے اور یہ دیکھتے کہ مَیں نے خاندانِ بنی ہاشم سے تمہارا انتقام لے لیا ہے"۔

تو یہ کچھ تعجب کا مقام نہیں ہے کیونکہ یہ وہی بات ہے جو خدا نے فرمائی ہے کہ " مجرمین آخر کار ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں"۔

اُن معظمہ نے اِس سلسلے میں بہت سے مطالب ارشاد فرمائے۔
(مزید توضیح کے لیے بحارالانوار، جلد ۴۵ صفحہ ۱۵۷ دیکھیے)[2]

[1] نفی اسلام اور انکارِ نبوّت کے سلسلے میں تاریخوں میں یزید کے متعدد اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے:
نہ کوئی نبی آیا اور نہ وحی اُتری۔ یہ تو بنی ہاشم کی ملک و مال پر قبضہ کرنے کے لیے محض ایک چال تھی۔
گویا کہ اعلانِ نبوّت محض ایک سیاسی کھیل تھا۔
(۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ)

[2] آیت نمبر ۱۰ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کے مطابق " السوای " " اساؤا " کا مفعول ہے اور " ان كذبوا بايات الله " اس " كان " کے بجائے ہے اور اس کی خبر عاقبة ہے۔ علامہ طباطبائی مرحوم نے اِس مطلب کا بطورِ احتمال ذکر کیا ہے۔ اگرچہ خود اُنھوں نے اس کی تصدیق نہیں کی۔ اور ابوالبقاء نے کتاب " املاء ما من به الرحمٰن " کے صفحہ ۱۸۵ جلد ۲ پر اِس مطلب کا دو احتمالات میں سے ایک کو قابلِ قبول ہونے کے طور پر ذکر کیا ہے مگر مفسرین کی اکثریت مثلاً طبرسی، صاحب المیزان، فخر رازی، آلوسی، ابوالفتوح رازی، اور قرطبی نے فی ظلال و تبیان میں اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرے احتمال کو قوی سمجھا ہے اور وہ یہ ہے کہ " سوئ " کان کا اسم ہوگا اور " ان كذبوا " تعلیل کے لیے ہے۔ اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے:

" آخر کار اُن لوگوں کا انجام جو اعمالِ بد انجام دیتے تھے، بد ہی ہوا۔ کیونکہ اُنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی"۔

یہ جملہ للذين احسنوا الحسنیٰ " کے مشابہ ہے جس کا معنی ہے۔ جنھوں نے نیکی کی اُن کے لیے نیکی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ آیت کے ظاہری معنی سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے یہ تفسیر اُس کے برخلاف ہے اور ان مفسرین نے اگر اس تفسیر کو اختیار کیا ہے تو ہمیں یہ امر اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ آیت کے ظاہری معنی سے جو مفہوم ہم آہنگ ہے اُسے ترک کر دیں۔ بالخصوص وہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے اس امر پر مجبور ہیں کہ " جملہ " ان كذبوا " میں حرف " لام " کو مقدر سمجھیں اور یہ تقدیر ظاہرِ کلام کے خلاف ہے۔ (غور کیجئے گا)

۱۱۔ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

۱۲۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ○

۱۳۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ○

۱۴۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ○

۱۵۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ○

۱۶۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۔ خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ پھر تم سب اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

۱۲۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو مُجرمین مایوسی اور غم و اندوہ میں ڈوب جائیں گے۔

۱۳۔ اور جنہیں اُنھوں نے خُدا کا شریک قرار دیا تھا اُن میں سے کوئی بھی اُن کا شفیع نہ ہوگا

اور وہ (اُس روز) اُن شریکوں کا انکار کردیں گے۔

۱۴۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو (لوگ) ایک دُوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔

۱۵۔ مگر وُہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وُہ باغ جنّت میں شاداں و مسرور ہوں گے۔

۱۶۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اور ہماری آیات اور لقائے آخرت کی تکذیب کی وُہ عذاب الٰہی میں حاضر کیے جائیں گے۔

تفسیر

قیامت میں مُجرمین پر کیا گزرے گی:

گزشتہ آیت میں اُن تکذیب کرنے والوں کا ذکر تھا جو آیات الٰہی کا مذاق اُڑاتے تھے اور زیرِ نظر آیات میں کچھ معاد اور قیامت میں مُجرمین کی حالت کا ذکر کر کے مُعاد کے متعلق اُس مضمون کی تکمیل کی گئی ہے جس کا ذکر آیات ماقبل میں آیا تھا۔

پہلے یہ فرمایا گیا ہے: خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے۔ اور پھر اُس کا اعادہ کرے گا اور تم سب پھر اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے: (اللہ یبدؤا الخلق ثمّ یعیدہ ثمّ الیہ ترجعون)۔

اِس آیت میں مسئلہ معاد کے بارے میں ایک پُرمعنی اور مختصر دلیل دی گئی ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی بالفاظِ مختلف اِس دلیل کی تکرار ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

وہی ذات جو آفرینش اوّل پر قُدرت رکھتی تھی، معاد پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ نیز
قانونِ عدالت اور حکمتِ الٰہی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مخلوق فنا ہو کر دوبارہ پیدا ہو۔

"ثمّ الیہ ترجعون" سے یہ مُراد ہے کہ بروزِ قیامت زندہ ہونے کے بعد سب کے سب خدا کے دارالعدل کی طرف وہاں سے سزا یا جزا پانے کے لیے لَوٹیں گے۔ اِس سے برتر یہ کہ وہ مومنین جو دُنیا میں اوامرِ الٰہی کی اطاعت کر کے مدارج رُوحانی کی تکمیل کرتے رہے ہیں، وُہ اپنی رُوحانی تکمیل میں اُسی طرح ختم ناپذیر منزلِ معرفت اور پروردگار کی قُربت کی طرف بڑھتے رہیں گے۔

آیت مابعد میں مجرموں کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ: جس روز قیامت بپا ہوگی، مجرمین نااُمیدی اور غم واندوہ میں ڈوب جائیں گے: (ویوم تقوم الساعة یبلس المجرمون)۔

"یبلس" مادہ "ابلاس" سے بنا ہے۔ اِس کے معنی اُس غم واندوہ کے ہیں جو انسان پر شدت یاس و نااُمیدی سے طاری ہو جاتا ہے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ بالفرض انسان کسی چیز سے نااُمید ہو جاتا ہے تو اگر وہ شے بقائے حیات کے لیے اہمیت نہیں رکھتی تو اُس کی نااُمیدی بھی اہم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ کسی لازمۂ زندگی سے مایوس ہوا ہے تو اُس پر غم واندوہ کا طاری ہونا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اِس لیے بعض مفسّرین نے مادۂ "ابلاس" کا خاصہ "ضروری ہونا" بھی قرار دیا ہے۔

"ابلیس" کو اسی مناسبت سے ابلیس کہتے ہیں کہ وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس اور غم ناک ہو گیا ہے۔

بہرحال مجرم اسی کے مستحق ہیں کہ اُس روز مایوس اور غم ناک ہوں کیونکہ وُہ عرصۂ محشر میں اپنے ساتھ نہ تو ایمان اور عمل صالح ہی لائے ہیں۔ اور نہ اُس روز اُن کا کوئی مددگار و رفیق ہوگا۔ نہ یہ امکان ہوگا کہ وہ پھر دُنیا کی طرف لوٹ جائیں اور اپنی گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کر لیں۔

٭ ٭ ٭

لہذا آیت مابعد میں یہ اضافہ کیا گیا ہے۔ اُن کے معبُود اُس روز شفاعت نہ کریں گے: (ولم یکن لهم من شرکائهم شفعٰؤا)۔

آیت میں معبودوں سے وہی بُت مراد ہیں کہ جس وقت اُن کُفار سے پُوچھا جاتا تھا کہ تم اِن بُتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ جواب دیتے تھے:

هٰؤلاء شفعآؤنا عندالله

یہ بُت درگاہِ الٰہی میں ہمارے شفیع ہیں۔ (یونس - ۱۸)

اُن کُفار کی سمجھ میں اُس وقت یہ بات آئے گی کہ وہ پتھر کے بے قدر وقیمت ٹکڑے تو کسی قسم کا اختیار اور قدرت نہ رکھتے تھے۔ اِسی وجہ سے وہ اُن معبُودوں سے جنھیں وہ خدا کا شریک سمجھا کرتے تھے۔ نفرت اور بیزاری کا اظہار کریں گے اور "اُن سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے انکار کر دیں گے": (وکانوا بشرکائهم کافرین)۔

بھلا کُفار معبودوں کا انکار کیونکر نہ کریں گے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ معبُود نہ صرف یہ کہ اُن کی کسی مصیبت میں کام نہیں آسکتے بلکہ بقول قرآن وہ معبُود اپنے پرستاروں ہی کی تکذیب کرنے لگیں گے اور کہیں گے:

اے پروردگار! "ماکانوا ایانا یعبدون"

یہ لوگ ہماری نہیں، بلکہ اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے تھے۔ (قصص - ۶۳)

اِس سے بھی سوا یہ کہ وہ معبود اپنے پرستاروں کی دُشمنی پر کمر باندھ لیں گے۔ جیسا کہ سُورۂ احقاف آیت ۶ میں ہے:

واذا حشر الناس کانوا لهم اعداءً وکانوا بعبادتهم کافرین

جس وقت مشرکین محشور ہوں گے تو اُن کے جھوٹے معبُود اُن کے دُشمن ہو جائیں گے اور اُن کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔

٭ ٭ ٭

آیت ۱۴ میں بروز قیامت لوگوں کے مختلف گروہ ہو جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ بروز قیامت لوگ ایک دُوسرے سے جُدا ہو جائیں گے: (ویوم تقوم الساعة یومئذٍ یتفرّقون)۔

٭ ٭ ٭

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح انجام دیئے وہ بہشت کے باغ میں نعمات الٰہی سے بہرہ مند اور مسرُور و شادکام ہوں گے۔ اس طرح سے کہ اُن کے چہروں سے مسرّت کے آثار ظاہر ہوں گے: (فامّا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات فهم فی روضة یحبرون)۔

"یحبرون" کا مادّہ "حبر" ہے۔ اور (بروزن قشر) اس کا معنی ہے "اثر خُوب"۔ یہ کلمہ اُس وقت بھی بولا جاتا ہے جب خوشی اور مُسرّت کا اثر چہرے سے ظاہر ہو اور چونکہ اہل بہشت وہاں خوشی اور سرور سے ایسا معمور ہوگا کہ اس کا اثر اُن کے تمام وجُود سے ظاہر ہوگا اس لیے اس مفہوم کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔

"روضة" اُس مقام کو کہتے ہیں جہاں پانی اور درخت بکثرت ہوں اس لیے سرسبز و شاداب باغات کو بھی روضہ کہتے ہیں۔

اگر اِس آیت میں یہ کلمہ بصُورتِ اسم نکرہ استعمال ہوا ہے تو اس مقام کی عظمت اور بزرگی کو واضح کرنے کے لیے ہے یعنی مومنین بہشت کے بہترین خوبصُورت اور سرور انگیز باغات میں نعماتِ الٰہی سے لُطف اندوز ہوں گے۔

٭ ٭ ٭

لیکن جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ہماری آیات اور قیامت آخرت کی تکذیب کی ہے وہ ضرور عذابِ الٰہی میں حاضر کیے جائیں گے: (وامّا الذین کفروا وکذّبوا بآیٰتنا ولقاء الاٰخرة فاُولٰٓئک فی العذاب محضرون)۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اہلِ بہشت کے لیے کلمہ "یحبرون" استعمال ہوا ہے جو ہر لحاظ سے اُن کی مسرت کی علامت ہے لیکن دوزخیوں کے لیے کلمہ "محضرون" استعمال ہوا ہے، جو اُن کی انتہائی کراہت اور ناراحتی کی دلیل ہے کیونکہ حاضر کیے جانے کا اطلاق ایسے موقع پر ہوتا ہے کہ کسی آدمی کو اُس کی دلی خواہش کے خلاف پکڑ کے لایا جائے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اہلِ بہشت کے معاملہ میں "ایمان" اور "عملِ صالح" دونوں کی قید لگائی گئی ہے۔ جب کہ دوزخیوں کے متعلق صرف عدمِ ایمان (انکار مبدء ومعاد) کا ذکر کیا گیا ہے۔

اِس میں رمز یہ ہے کہ داخلِ بہشت ہونے کے لیے صرف ایمان کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ عملِ صالح بھی

لازم ہے۔ مگر واصلِ جہنم ہونے کے لیے عدم ایمان ہی کافی ہے۔ خواہ اُس آدمی نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ کیونکہ "کفر" بجائے خود گناہ عظیم ہے۔

٭ ٭ ٭

قیامت کا ایک نام "ساعت" کیوں ہے؟

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں قیامت کو "ساعت" کہا گیا ہے۔ اُن آیات میں زیرِ نظر آیات میں سے دو آیات (۱۲ - ۱۴) بھی شامل ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ "ساعت" کے حقیقی معنی "زمانے کا ایک حصہ" یا لحظاتِ زودگزر ہے۔ اور چونکہ حادثۂ قیامت ناگہانی اور برق آسا طور پر واقع ہوگا۔ نیز یہ کہ خدا "سریع الحساب" ہے، اِس لیے وہ اُس روز بندوں کا جلد حساب لے گا لہٰذا قیامت کو "ساعت" کہا گیا ہے۔ تاکہ لوگ یومِ رستاخیز کی حیثیت و واقعیت کو ہمیشہ نظر میں رکھیں۔

ابنِ منظور "لسان العرب" میں لکھتا ہے کہ "ساعة" اُس وقت کا نام ہے جب کہ اِس عالم کے اختتام کے لیے ایک چیخ ماری جائے گی اور اُس آواز کو سُن کر سب جاندار فوراً مرجائیں گے اور یہ اُس وقت کا نام بھی ہے جبکہ قیامت میں لوگ قبروں سے اُٹھائے جائیں گے۔

دُنیا کے اختتام اور وقوعِ قیامت کے لیے اس نام کا اِس لیے انتخاب کیا گیا ہے کہ پہلی چیخ میں جیسا کہ خدا نے اِس آیت میں اشارہ کیا ہے:

ان کانت الا صیحۃ واحدۃ فاذا ھم خامدون [1]

سب کے سب بطور ناگہانی مر جائیں گے۔

اور جب دوبارہ صُور پھونکا جائے گا تو سب کے سب ناگہاں زندہ ہو جائیں گے اور پھر قیامت بپا ہوگی۔

"زبیدی" نے "تاج العروس" میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ "ساعة" تین قسم کی ہے:

۱۔ **ساعتِ کُبریٰ**: وہ دن جب لوگوں کو حساب کے لیے زندہ کیا جائے گا۔

۲۔ **ساعتِ وُسطیٰ**: جب خدا کی طرف سے نزولِ عذاب کی وجہ سے کسی مخصوص زمانے میں ناگہانی طور پر سب کے سب آدمی بہ یک وقت مُرجائیں گے۔

۳۔ **ساعتِ صُغریٰ**: ہر انسان کی موت کا دن۔

٭ ٭ ٭

[1] یٰس - ۲۹۔

۱۷۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝

۱۸۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝

۱۹۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۷۔ پاک و منزّہ ہے وُہ خدا جس وقت کہ تم شام کرتے ہو اور صبح کرتے ہو۔

۱۸۔ آسمانوں اور زمینوں میں حمد و ستائش اُسی کے لیے مخصوص ہے۔ اور تسبیح و تنزیہ اُسی کے لیے ہے بوقتِ عصر بھی اور ظہر کے وقت بھی۔

۱۹۔ وُہ خدا زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے۔ اور زمین کو اُس کی موت کے بعد حیات بخشتا ہے اور اسی طرح تم بروزِ قیامت نکالے جاؤ گے۔

تفسیر

تسبیح و حمد ہر حال میں خُدا کے لیے ہے:

آیاتِ گزشتہ میں مبدا و معاد کے موضوع پر ایک طویل بحث گزری ہے اور کسی قدر مومنین کے اجر اور مُشرکین کی پاداشِ عمل کا ذکر آیا ہے۔

آیاتِ زیرِ نظر میں خُدا کی حمد، تسبیح اور ہر قسم کے شرک، نقص اور عیب سے اُس کے منزّہ ہونے کا ذکر ہے۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے :

تسبیح و تنزیہ اُسی خدا کے لیے مخصوص ہے جس وقت کہ تم صبح کرتے ہو اور شام کرتے ہو: (فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون)۔

آسمان و زمین میں حمد و ستائش اُسی ذات پاک کے لیے مخصوص ہے اور بوقت عصر اور جب ظہر کا وقت ہوتا ہے: (ولہ الحمد فی السماوات والارض وعشیًّا وحین تظھرون)۔

اِن دو آیات میں اِس ترتیب سے تسبیح پروردگار کے لیے چار اوقات بیان ہے :

۱۔ آغازِ شب (حین تمسون)۔

۲۔ طلوعِ صبح (وحین تصبحون)۔

۳۔ وقت عصر (وعشیًّا)۔

۴۔ زوال آفتاب یعنی ظہر کا وقت (وحین تظھرون)۔[1]

لیکن بحیثیت مکان " ادائے حمد " میں عمومیت ہے۔ جس میں آسمانوں اور زمین کی وسعتیں شامل ہیں۔ آیات فوق میں مذکورہ بالا چار اوقات کے ذکر سے ممکن ہے بطور محاورہ یہ مراد ہو کہ ہمیشہ اور دائمی طور پر تسبیح کرتے رہو۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ " فلاں شخص کی صبح و شام دیکھ بھال کرتے رہو " اور مراد ہوتی ہے کہ ہمیشہ اور ہر وقت اُس کے نگران حال ہو

بعض مفسّرین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ مذکورہ چار اوقات سے نماز کے چار اوقات مراد ہیں۔ مگر وہ اس اعتراض کا جواب دینے سے قاصر رہے ہیں کہ پانچ اوقات کے بجائے صرف چار اوقات کا ذکر کیوں ہے ؟ (یعنی وقت عشا کا کوئی ذکر نہیں ہے)

لیکن — ممکن ہے کہ اس سوال کا یہ جواب دیا جائے کہ چونکہ مغرب و عشا کی نمازوں کا وقت نسبتاً نزدیک ہے اور اِن دونوں نمازوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ اِس لیے دونوں کا ذکر ایک ہی جگہ کر دیا گیا ہے جب کہ نمازِ ظہر و عصر کے اوقاتِ فضیلت میں چند گھنٹے کا فاصلہ ہے۔

لیکن — اگر ہم حمد و تسبیح کا وہ وسیع مفہوم لیں جو آیات زیر بحث سے مترشح ہوتا ہے تو پھر یہ پانچ نمازوں میں محدود نہ رہے گی۔ ہر چند کہ اِن نمازوں پر اُس کا واضح اِطلاق ہوتا ہے۔

اِس مقام پر اِس نکتے کا ذکر بھی لازمی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ " سبحان اللہ ولہ الحمد " کہہ کر خدا نے اپنی تسبیح حمد خود ہی کی ہو۔ جیسا کہ سورہ مومنون کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے :

فتبارک اللہ احسن الخالقین

پُر برکت اور جاوید ہے وہ خدا جو خلق کرنے والوں میں بہترین ہے۔

یا — ممکن ہے کہ یہ حمد و تسبیح بمعنی امر ہو۔ یعنی "سبحوہ واحمدوا لہ" یعنی اُس کی تسبیح اور حمد کرو۔

یہ تفسیر اِس مفہوم سے قریب تر معلوم ہوتی ہے کہ آیات زیر بحث میں تمام بندوں کو ہر صبح و شام اور بوقت ظہر و عصر حمد و

[1] ملحوظ خاطر رہے کہ "عشیًّا" و "حین تظھرون" عطف ہے "حین تمسون" پر جس کا تعلق موضوع تسبیح سے ہے۔

تسبیح کا حکم دیا گیا ہے ، خواہ نماز میں ہو یا اس کے علاوہ تاکہ اُن کے قلب و رُوح سے شرک و گناہ کے آثار پوری طرح محو ہو جائیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ :

جو کوئی اِن دو آیات اور اُس کے بعد کی آیت کو بوقت صبح پڑھے گا تو جو فریضہ بھی اُس سے دن میں فوت ہوگا، خُدا اُسے اُس کا بھی صلہ دے گا اور جو کوئی ان آیات کو آغاز شب میں پڑھے گا تو جو فریضہ بھی اس سے رات کو فوت ہوگا خُدا اُس کا اجر بھی دے گا۔ (تفسیر نور الثقلین۔ جلد ۴ ، صفحہ ۱۸۲)

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت میں پھر مسئلہ معاد کا ذکر ہے اور منکرین جس بات کو بعید از عقل سمجھتے تھے اُس کا ایک اور طرح سے جواب دیا گیا ہے وہ یہ کہ : سُنت الٰہی یہ ہے کہ وہ زندہ کو مُردہ سے اور مُردہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے اور زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ تم بھی اسی طرح بروز قیامت زندہ کیے جاؤ گے اور اپنی قبروں سے نکالے جاؤ گے: (یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی ویحی الارض بعد موتھا وکذالک تخرجون)۔

یعنی معاد کے منظر اور اختتام دُنیا کے منظر کی بالترتیب یا ہمیشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے تکرار ہوتی رہتی ہے۔ جن میں سے ایک تو زندہ کو مُردہ سے نکالنا ہے اور دُوسرا مُردہ کو زندہ سے۔

بنا برایں یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے کہ دُنیا کے خاتمے پر تمام زندہ موجودات مر جائیں اور قیامت میں تمام انسان ایک نئی زندگی حاصل کریں۔

لیکن قرآن شریف میں اس حقیقت کو کہ " مُردہ سے زندہ کو کیسے نکالا جاتا ہے " بارہا مردہ زمین کی مثال دے کر واضح کیا گیا ہے۔

یہ امر سب پر روشن ہے کہ سردیوں کے موسم میں زمین مُردہ ہو جاتی ہے۔ نہ اُس میں گھاس اُگتی ہے۔ نہ کوئی پھول کھلتا ہے نہ کوئی شگوفہ۔[1]

لیکن فصل بہار میں اعتدال ہوا اور حیات بخش بارش کے قطرات گرنے کی وجہ سے زمین میں ایک جُنبش پیدا ہوتی ہے۔ ہر جگہ گھاس اُگ آتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں شاخوں پر شگوفے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ہے معاد کا منظر جسے ہم دُنیا میں دیکھتے ہیں۔

لیکن یہ کہ زندہ سے مُردہ کیونکر نکالا جاتا ہے ، یہ بات بھی پوشیدہ و پنہاں نہیں ہے۔

کُرۂ زمین کی سطح پر درخت مرجاتے ہیں اور خشک لکڑی کی صُورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان اور حیوانات اپنی زندگی سے محروم ہو کر جسدِ بے جان بن جاتے ہیں۔

[1] یہ تشبیہ ایرانی موسم کے لحاظ سے ہے۔ ہمارے مُلک میں زمین موسم گرما (مئی جون) میں مُردہ ہوتی ہے اور برسات اُسے زندہ کرتی ہے۔

لیکن۔ —— بعض مفسرین نے زندہ کو مُردہ سے نکالنے کی یہ تفسیر کی ہے کہ انسان وحیوان نطفے سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ کافر کے گھر میں مومن پیدا ہو جاتے ۔ بعض نے سونے والوں کا بیدار ہونا مُراد لیا ہے ۔

لیکن یہ قطعی عیاں ہے کہ یہ تمام تعبیرات و تاویلات آیت کے لغوی معنی سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ نطفے ہی کو لیجیے تو وُہ مُردہ نہیں ہوتا بلکہ وُہ موجودِ زندہ ہوتا ہے ۔ اسی طرح ایمان و کفر کے استعارات کو آیت کے باطن سے تو اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن ظاہری معنی اس طرف راجع نہیں ہیں ۔

آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ خدا ہمیشہ مُردہ موجودات سے زندہ موجودات کو نکالتا ہے۔ اور زندہ موجودات کو بے جان موجودات میں بدل دیتا ہے ۔ دورِ حاضر میں انسان نے علوم میں تجربات اور مشاہدات سے جتنی بھی ترقی کی ہے اور معلومات کا جو ذخیرہ بہم پہنچایا ہے اُس کے مطابق یہ ہرگز نہیں دیکھا گیا کہ غیر ذی حیات سے زندہ وجود پیدا ہو جاتے ۔ یعنی زندگی سے زندگی پیدا ہوتی ہے نہ کہ موت سے ۔ بلکہ ہمیشہ زندہ موجودات بیج[1] سے یا کسی دوسرے زندہ وجود کے نطفے سے متولّد ہوتے ہیں ۔

ابتدا میں یہ کُرۂ زمین آگ کا ایک گولا تھا ۔ اس پہ زندگی کا وجود نہ تھا ۔ بعد میں اُن مخصوص اسباب کی وجہ سے (جن کا علومِ حاضرہ کے ذریعے سے اب تک انکشاف نہیں ہو سکا ہے) اس بے جان زمین سے ، ایک عظیم تحریک کے ساتھ زندہ مخلوقات پیدا ہوگئیں ۔

لیکن جہاں تک موجودہ حالات میں انسان کے علم و دانش کی رسائی ہے اُس کے ذریعے کُرۂ زمین کے موجودہ حالات میں یہ تحریک نظر نہیں آتی ۔ (ممکن ہے کہ سمندروں کی گہرائی میں اب تک یہ عظیم تحریکِ حیات موجود ہو) ۔

لیکن ہمارے لیے جو بات محسوس اور کاملاً قابلِ ادراک ہے وہ یہ ہے کہ بے جان موجودات زندہ موجودات کے اجسام کا جزو بن جاتے ہیں اور پھر خود بھی زندہ مخلوقات میں شامل ہو جاتے ہیں ۔

ہم جو آب و غذا کھاتے ہیں وہ زندہ مخلوق نہیں ہے ۔ لیکن وہ جیسے ہی ہمارے جسم کا جزو بنتی ہے ، ایک زندہ مخلوق بن جاتی ہے ۔ غذا کی وجہ سے ہمارے بدن کے خلیوں CELLS پر مزید خلایا کا اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ چنانچہ اسی طرح ایک طفلِ شیر خوار جوان ہوکر قوی ہیکل بن جاتا ہے ۔

کیا یہ اصولِ تغذیہ موت سے زندگی کو برآمد کرنا نہیں ہے ؟

بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ طبیعی کے نظام میں دائماً ایک دَور جاری رہتا ہے کہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت خارج ہوتی رہتی ہے ۔

---

[1] مصنف نے بیج کی مثال تو دی ، مگر اس کی تشریح نہیں کی ۔ ہر بیج میں قابلیتِ نشو و نما خفتہ ہوتی ہے ۔ زمین کی قوتِ نامیہ اسے بیدار کرتی ہے اور رُوح پیدا کر دیتی ہے ۔ صرف جدید علمائے حیاتیات BIOLOGIST ہی نے نہیں ، قدما نے بھی یہ معلوم کر لیا تھا کہ نباتات میں بھی زندگی ہے ۔ اُس کا نام اُنھوں نے رُوحِ نباتی رکھا تھا ۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم قطعی واضح ہے کہ خُدا مُردہ شے سے زندہ کو وجود میں لاتا ہے ۔ مفسّرین نے زندگی کی صرف ایک ہی صُورت کو پیشِ نظر رکھا جو حیوانات میں ہے ۔ اسی وجہ سے انھوں نے اِدھر اُدھر کی تاویلات کی ہیں ۔

اسی دلیل سے وہ خدا جو خالقِ فطرت ہے اس امر پر بھی قادر ہے کہ بروزِ قیامت مردوں کو زندہ کر دے ۔

البتہ ، جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے ، معنوی اور باطنی لحاظ سے آیۂ زیرِ بحث کی اور تفاسیر بھی ہو سکتی ہیں مثلاً کافر کی نسل سے مومن پیدا ہو جائے اور مومن کی اولاد کافر ہو جائے ۔ جاہل کی اولاد عالم ہو جائے اور عالم کا فرزند جاہل رہ جائے ۔ مُفسد کا خلف صالح ہو اور صالح کا خلف مُفسد ہو جائے ۔ بعض اسلامی روایات میں اس طرف اشارہ بھی ہوا ہے ۔

ممکن ہے کہ بطُونِ آیت سے یہ معانی اخذ کیے گئے ہوں ۔ کیونکہ آیاتِ قرآن کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مرگ و حیات کے ایک جامع اور وسیع معنی ہوں جن میں مادّی اور رُوحانی دونوں پہلو شامل ہوں ۔

امام مُوسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے آیۂ "**یحی الارض بعد موتها**" کی تفسیر میں ایک روایت مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

لیس یحییها بالقطر ولکن یبعث الله رجالاً فیحیون العدل فتحی الارض لاحیاء العدل ولاقامة العدل فیه انفع فی الارض من القطر اربعین صباحاً ۔

آیت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ خدا زمین کو بارش کے ذریعے زندہ کرتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پیدا کرتا ہے جو اصولِ عدل کو زندگی بخشتے ہیں اور احیائے عدل سے زمین زندہ ہو جاتی ہے اور آگاہ رہو کہ زمین پر عدل کا قائم ہونا چالیس روز تک مسلسل بارش سے زیادہ نافع ہے ۔[1]

امام کے اس قول سے کہ آیت کا مقصد "نزولِ باران" نہیں ہے

اس آیت کے معانی کو محدود کرنے کی نفی ہو جاتی ہے یعنی آیت کی تفسیر کو بارش کے معنی ہی تک محدود نہ کرنا چاہیے کیونکہ عدالت کے ذریعے زمین کی معنوی زندگی نزولِ باراں سے کہیں زیادہ اہم ہے ۔

---

[1] نقل از کتاب کافی ، نورالثقلین ، جلد ۴ ، صفحہ ۱۷۳

۲۰۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○

۲۱۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○

۲۲۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ○

ترجمہ

۲۰۔ اور اُس (خدا) کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اُس کے بعد جب تم انسان بن گئے تو رُوئے زمین پر پھیل گئے۔

۲۱۔ اور اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے ازواج کو پیدا کیا تاکہ تم اُن کی قُربت میں تسکین پاؤ اور اُس نے تمہارے درمیان مودّت اور مہربانی پیدا کر دی۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر کرتے ہیں۔

۲۲۔ نیز اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور

تمہاری زبانوں اور رنگ کا اختلاف، اہلِ علم کے لیے اِس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

تفسیر

اَنفُس و آفاق میں خُدا کی آیات:

ان آیات اور ان کے بعد آنے والی آیات کے کچھ حصّے میں نظامِ عالمِ ہستی میں خُدا کی نشانیوں اور دلائلِ توحید کے جاذبِ توجہ نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس بیان سے گزشتہ مباحث کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیتِ مجموعی یہی آیات قرآن کی آیاتِ توحید کا ایک اہم حصّہ ہیں۔

یہ آیات جو سب کی سب " من ایاته " (یعنی خدا کی نشانیوں میں سے ایک) سے شروع ہوتی ہیں اُن کا ایک مخصوص آہنگ ہے، لب و لہجہ دلچسپ اور دلکش ہے اور اُن کی تعبیرات مؤثر اور عمیق ہیں۔

مجموعی طور پر یہ آیات سات ہیں۔ اُن میں چھ تو مسلسل ہیں اور ایک آیت نمبر ۴۶ الگ ہے۔

آیاتِ آفاق و انفس کے لحاظ سے ان آیات کی تقسیم دلچسپ ہے۔ اِس طرح سے کہ ان میں سے تین آیات میں آیاتِ انفس کا ذکر ہے۔ (یعنی خود انسان کی ذات میں کون سی آیاتِ الٰہی ہیں)۔

اور تین آیات میں آیاتِ آفاق کا بیان ہے (یعنی عالمِ خارجی میں عظمتِ پروردگار کی کون کون سی نشانیاں ہیں)۔

جب کہ ایک آیت میں آیاتِ انفس و آفاق دونوں کا ذکر ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ وہ آیات جو "من ایاته" سے شروع ہوتی ہیں قرآن میں گیارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جن میں سے سات تو اِسی سورہ رُوم میں ہیں اور دو آیتیں سورہ حٰم سجدہ (۳۷۔ ۳۹) میں اور دو آیات سُورۂ شوریٰ میں ہیں (۲۹ ۔ ۳۲) اور حق یہ ہے کہ اِن گیارہ آیات کا مجموعہ اثباتِ توحید پر کاملاً حاوی ہے۔

آیات زیرِ نظر کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے ہم اِس نکتے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن مسائل اور رمُوزِ فطرت کی طرف قرآن کی اِن آیات میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بظاہر عام آدمیوں کے لیے قابلِ ادراک اور قریب بفہم ہیں۔ لیکن انسانی علم و دانش کی ترقی کے ساتھ ساتھ اِن آیاتِ الٰہی کے تازہ رمُوز و نکات کا انکشاف ہوتا جاتا ہے۔ اِس تفسیر میں ہم اُن میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

قرآن میں سب سے پہلے انسان کی آفرینش کا ذکر ہے اور تخلیقِ انسان اللہ کی پہلی اور سب سے اہم نعمت اور احسان ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ الٰہی میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ اِس کے بعد تم اِنسان بن گئے اور رُوئے زمین پر پھیل گئے۔ (ومن اٰیاته ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون)۔

اس آیت میں خدا کی دو نشانیوں کا ذکر ہُوا ہے :

اوّل انسان کی مٹی سے پیدائش کا۔ اس سے پہلے انسان یعنی آدم کی تخلیق مُراد ہے یا تمام انسانوں کی پیدائش مراد ہے کیونکہ وہ مواد غذائی جس سے انسان کا جسم پرورش پاتا ہے بلاواسطہ یا بالواسطہ زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

دُوسری نشانی یہ ہے کہ نسلِ انسانی کثیر ہوگئی اور نسلِ آدم تمام رُوئے زمین پر پھیل گئی۔ اگر خدا آدم میں افزائشِ نسل کی خصُوصیت نہ رکھتا تو اُس کی نسل کا سلسلہ کب کا منقطع ہو چکا ہوتا۔

مقامِ حیرت ہے کہ کثیف مٹی کہاں اور انسان جیسی لطیف ہستی کہاں ؟

مقامِ غور ہے کہ آنکھ کے نازک ترین پردے جو برگِ گُل سے بھی لطیف تر، حسّاس تر اور نازک تر ہوتے ہیں اسی طرح سے دماغ کے لطیف اور غیر معمولی حسّاس خلیات کو اگر ہم مٹی کے پاس رکھیں اور پھر دونوں کا مقابلہ کریں تو اُس وقت یہ راز سمجھ میں آئے گا کہ خالقِ کائنات نے کس حکمتِ بالغہ سے مٹی کے مادۂ کثیف سے کس قسم کے نازک، دقیق اور قیمتی آلات سریع الحس تخلیق کیے ہیں۔

مٹی میں نہ تو نور ہے، نہ حرارت ہے، نہ زیبائی، نہ طراوت، نہ حس و حرکت۔ مگر بایں ہمہ خلقتِ وجودِ انسانی کا خمیر اُسی سے اُٹھا ہے۔

جو ذات کہ ایسے بے جان مادہ سے (جو موجوداتِ عالم میں سب سے کمتر اور پست ترین شمار ہوتا ہے) ایسی عجیب و غریب مخلوق پیدا کر سکتی ہے، وہی اس قدرت اور لامحدود علم و دانش کے لیے ہر قسم کی تحسین و ستائش کی مستحق ہے

تبارك الله احسن الخالقين

اس بیان سے اس واقعیت کا علم بھی ہوتا ہے کہ بحیثیتِ نوعِ انسانوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اُن کا جوہرِ آفرینش ایک ہی ہے۔ خاک سے سب کا ناقابلِ انقطاع تعلق ہے اور طبعاً آخرکار سب کے سب خاک ہی کی طرف لَوٹ جائیں گے۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ لغتِ عرب میں کلمہ " اذا " امورِ ناگہانی کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔

اس مقام پر اس کلمہ کے استعمال سے ممکن ہے یہ مُراد ہو کہ خدا نے آدم کو "تکثیرِ مثل" کی اِتنی قُدرت دی کہ قلیل مُدت میں اُس کی نسل تمام رُوئے زمین پر پھیل گئی اور ایک انسانی معاشرہ وجود میں آگیا۔

❋ ❋ ❋

زیرِ بحث آیات میں سے دُوسری آیت میں تخلیقِ انسان کا حال بیان کرنے کے بعد اُن نشانیوں کا ذکر ہے جو انسان کے نفس میں موجود ہیں۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے۔ آیاتِ الٰہی میں سے ایک اور بات یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے ازواج کو پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم اُن کی قُربت میں سکون حاصل کرو ؛ (ومن اٰیاتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیھا)۔

اور چونکہ زن و شوہر کے درمیان رشتۂ محبت کی بقا کے لیے بالخصوص اور تمام انسانوں کے درمیان بالعموم، ایک جذبہ اور رُوحانی و قلبی کشش کی ضرورت ہے، اس لیے آیت میں اِن الفاظ کا اضافہ کیا گیا۔ تمہارے درمیان محبت اور رحمت

کو پیدا کیا: (وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ)۔

آیت کے اخیر میں تاکیدِ مزید کے لیے فرمایا گیا ہے۔ ان اُمور میں فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں: (انّ فی ذالک لاٰیات لقوم یتفکرون)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اِس آیت میں شادی کا مقصد سکون و راحت بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے لیے نہایت پُرمعنی لفظ "لتسکنوا" استعمال کیا گیا ہے۔ اِس ایک لفظ میں بہت سے مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اس قسم کی تعبیر کی نظیر سُورۂ اعراف کی آیت ۱۸۹ میں بھی ملتی ہے۔

یہ حق ہے کہ اِن خصوصیات کے ساتھ شریکِ حیات کا وجود کہ وہ ایک دوسرے کے لیے زندگی کی راحت کا باعث ہیں خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔

زندگی کے اِس راحت و آرام کا باعث یہ ہے کہ یہ دونوں اصناف ایک دُوسرے کی تکمیل کرنے والی اور ایک دُوسرے کی خوشی، مسرّت اور پرورش کا وسیلہ ہیں۔ یہاں تک کہ اِن میں سے ہر ایک، ایک دُوسرے کے بغیر ناقص ہے اور یہ فطری اَمر ہے کہ ایک شخصیّت موجود اور دُوسرے اُس کے باعثِ تکمیل وجُود میں اِس قسم کا خوش آیند جذبہ موجود ہونا چاہیئے۔

اِس اصولِ فطرت سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ جو لوگ اِس سُنّتِ الٰہی کو ترک کرتے ہیں اُن کی شخصیّت ناقص رہ جاتی ہے کیونکہ اُن کی تکمیلِ شخصیت کا ایک مرحلہ طے نہیں ہوا۔

تجرد کی زندگی صرف اُن حالات میں جائز ہے جب انسان کسی خاص ضرورت یا شرائط کے تحت مجبور ہو۔

بہرحال زندگی کا یہ آرام و سکون، جسمانی، رُوحانی، انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے ہے۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ترکِ ازدواج کی وجہ سے بعض جسمانی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مجرد افراد میں جو نفسیاتی اُلجھنیں اور رُوحانی اضطراب ہوتا ہے اُس کی وجہ بھی یہی ہے، جو سب پر روشن ہے۔

معاشرتی نُقطہ نگاہ سے مُجرّد لوگوں کو اپنی ذمّہ داری کا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ اسی لیے ان میں خودکشی کے واقعات بہت نظر آتے ہیں اور اُن سے خوفناک جرائم بھی سرزد ہوتے ہیں۔

جس وقت اِنسان تجرّد کی زندگی کو چھوڑ کر خانگی زندگی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر ایک تازہ شخصیت کا احساس کرتا ہے نیز اُسے اپنی ذمّہ داری کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ حالتِ ازدواج میں انسان کو جو راحت ملتی ہے، اُس میں یہ امور بھی داخل ہیں۔

اَب رہا " مودّت اور رحمت " کا مسئلہ تو درحقیقت یہ دونوں چیزیں انسانی معاشرے کی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ ہیں کیونکہ ہر معاشرہ افراد کے اجتماع سے بنتا ہے۔ اِس کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو اینٹوں اور پتھروں کے ٹکڑوں سے مل کر تعمیر ہوتی ہے۔ اگر افرادِ انسانی پراگندہ حالت میں رہیں تو کوئی معاشرہ بھی وجُود میں نہیں آسکتا جیسے کہ اجزائے تعمیر اگر باہم مرتُبط نہ ہوں تو کوئی عمارت بھی وجود میں نہیں آسکتی۔

وُہ ذات جس نے انسان کو معاشرتی زندگی کے لیے پیدا کیا، اُسی نے اُس کی فطرت میں باہمی تعاون اور اُلفت کا جذبہ بھی

ودلیعت کر دیا ہے۔

ممکن ہے کہ " مودّت " اور " رحمت " میں مختلف جہات سے فرق ہو :

۱۔ " مودّت " وُہ داخلی تحریک ہے جو ابتدا میں ارتباط کا سبب بنتی ہے۔ لیکن ـــــ عمر کے آخری حصّے میں اگر زوجین میں سے ایک ضعیف و نا تواں ہو جائے اور اُس میں اتنی طاقت نہ رہے کہ دوسرے کی خدمت کر سکے تو اُس وقت " رحمت " مودت کی جگہ لے لیتی ہے۔

۲۔ " مودّت " کا تعلق سن رسیدہ لوگوں سے ہے جو ایک دُوسرے کی خدمت کر سکتے ہیں۔ لیکن اولاد اور چھوٹے بچّے سایۂ رحمت میں پرورش پاتے ہیں۔

۳۔ مودّت یک طرفہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے طرف ثانی کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن " رحمت " میں ایثار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یک طرفہ ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک معاشرے کی بقا کے لیے کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے تعاون سے خدمت کریں اور یہ جذبہ مودّت سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدمت کے صِلہ کی توقع نہیں کی جاتی اسے " ایثار " کہتے ہیں، جو جذبۂ رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مگر آیت میں زوجین کے درمیان " مودّت " اور " رحمت " دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس تعبیر سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ خصوصیت جملہ بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ جن میں زوجین کا تعلق ان جذبات کا واضح مصداق کہے جا سکتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے تمام معاشروں میں خاندانی زندگی ایسی چیز ہے جس کا وجود مودّت اور رحمت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر افراد خاندان کے درمیان یہ جذبات نہ رہیں یا کمزور ہو جائیں تو اس سے معاشرے میں ہزاروں اضطراب، بے چینیاں اور مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

⁂

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت اُن مضامین کا ایک مجموعہ ہے جن کا اُن آیات میں ذکر ہوا ہے جن میں انفس و آفاق میں پائی جانے والی نشانیوں کا ذکر ہے۔

اس میں سب سے پہلے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے ـــــ خدا کی عظیم آیات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق بھی ہے : (و من اٰیاتہٖ خلق السّماوات والارض)۔

آسمان پر سیاروں کے کرات ہیں۔ اُن کے نظامات، کہکشائیں اور اُن کی بلندی اور مسافت کا یہ عالم ہے کہ انسان کا بلند پرواز تخیل اُن کی عظمت کا ادراک کرنے سے عاجز ہے اور اُن کے مطالعے سے اِنسان تھک جاتا ہے۔ اِنسان کا علم و دانش جس قدر بھی ترقی کرتا جاتا ہے، اُسی قدر خدا کی عظمت کے تازہ نکات اُس پر آشکار ہوتے جاتے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ انسان بلندی پر نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف اِتنی ہی سمجھتا تھا جتنے اُسے نظر آتے تھے۔

ماہرینِ علم ہیئت نے اُن ستاروں کی تعداد جو بغیر دُوربین کے نظر آتے ہیں پانچ ہزار سے چھ ہزار تک بیان کی ہے۔

لیکن جس رفتار سے بڑی بڑی دُور بینوں کی ایجاد میں اضافہ ہوا ہے اُسی رفتار سے مزید آسمانی عظیم الجثہ کرات دریافت ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ علمائے ہیئت کا خیال ہے کہ یہ کہکشاں جو ہم سے قریب تر ہے اور جو خلائے لامحُدود میں موجود کثیر کہکشاؤں میں سے ایک ہے، اِس میں ایک ارب سے زیادہ ستارے ہیں۔ جن میں سے ہمارا سُورج اپنی خیرہ کُن عظمت کے باوجود کہکشاں کے متوسّط ستاروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ تو صرف خُدا ہی کو علم ہے کہ ان تمام کہکشاؤں میں جن کا ابھی تک شمار نہیں ہو سکا، کتنے ستارے ہوں گے۔

اِسی طرح جس سُرعت سے سائنسی علوم مثلاً : علم الارض، علم نباتات، علم الحیات، علم تشریح اعضا، طبیعیات علم النفس اور تحلیل نفسی ترقی کر رہے ہیں، اُسی رفتار سے آفرینش زمین کے متعلق تازہ انکشافات ہو رہے ہیں، جن میں سے ہر ایک عظمتِ الٰہی کی ایک آیت ہے۔

اس کے بعد کلام کا پہلو بدل کر انسان کے نفس میں من جملہ آیاتِ عظیم کے ایک آیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی اُس کی آیاتِ عظمت میں سے ہے : (واختلاف السنتکم والوانکم)۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اِنسان کی اجتماعی زندگی افراد و اشخاص کی شناخت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ دُنیا کے تمام اِنسانوں کی شکلیں، قیافہ، قد اور ڈیل ڈول یکساں ہو جائے تو اُسی دن اُن کی زندگیوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ باپ اور بیٹے، اپنے اور غیر کی پہچان نہ ہو سکے گی۔ اور ـــــ نہ مُجرم و بے گناہ، قرض خواہ و مقروض، حاکم و محکوم رئیس و مرؤس، میزبان و مہمان اور دوست و دُشمن کی تمیز ہو سکے گی۔ یسی حالت میں کیسا عجیب گھپلا اور گڑبڑ پیدا ہو جائے گی۔ کبھی کبھی دو جڑواں بھائیوں کے، جو ہر جہت سے باہم مشابہہ ہوتے ہیں، لوگوں سے مِلنے اور اُن کی شناخت کے بارے میں یہ دُشواری پیش آتی ہے۔ چنانچہ ہم نے سُنا ہے کہ دو، ہم رنگ و ہم شکل بھائیوں میں سے ایک بیمار ہوا اور ماں نے دوا دُوسرے کو پلا دی۔

اِس لیے معاشرہ کی تنظیم کے لیے خدا نے اِنسانوں کی آوازوں اور رنگوں کو مختلف بنایا ہے۔

جیسا کہ فخر الدین رازی نے آیت زیر بحث کے ذیل میں کہا ہے :

ایک انسان دوسرے انسان کو یا تو آنکھ سے دیکھ کر پہچانتا ہے یا اُس کی آواز سُن کر، اس لیے خدا نے بذریعہ چشم شناخت کرنے کے لیے اِنسانوں کے رنگ، صورتوں اور شکلوں کو مختلف بنایا ہے۔

اور بذریعہ گوش شناخت کرنے کے لیے آوازوں اور لہجوں میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔

یہاں تک کہ ـــــ تمام دُنیا میں دو اِنسان بھی ایسے نہیں مل سکتے جو چہرے کی بناوٹ اور آواز کے لہجے میں ہر لحاظ سے یکساں ہوں۔ یعنی انسان کی صُورت جو ایک چھوٹی سی بات ہے اور اُس کی آواز کا لہجہ جو ایک سادہ سی چیز ہے، قدرت خدا سے کروڑوں آدمیوں کا بھی ایک دُوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ خدا کی عظیم آیات میں سے ہے۔

اِس موقع پر ایک احتمال اور بھی ہے اور بعض مفسّرین نے اُس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ اختلافِ السنہ سے مُراد بولی جانے والی زبانوں کا فرق مراد ہے جیسے عربی، فارسی، تُرکی وغیرہ اور رنگوں کے اختلاف سے نسلوں کے رنگوں کا اختلاف مُراد ہے

جیسے زرد نسلیں، سیاہ نسلیں، گوری نسلیں وغیرہ۔

لیکن آیت میں استعمال شدہ کلمہ "اختلاف" کے وسیع معنی بھی لیے جاسکتے ہیں۔ جن میں یہ تفسیر اور تفسیر ماقبل دونوں شامل ہوں۔ بہرکیف، خلقت کا یہ تنوع ہر جہت سے خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانی ہے۔

فرید وجدی نے اپنی دائرۃ المعارف ENCYCLOPEDIA میں مغرب کے مشہور سائنس دان نیوٹن کا یہ قول درج کیا ہے:

> "خالق کائنات خدا کے بارے میں ہرگز شک نہ کرو کیونکہ عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ صرف بے شعور فطرت اور سلسلۂ علت و معلول سے موجودات ظہور میں آجائیں۔
> کیونکہ اندھی فطرت BLIND NATURE (جو ہر زمان و مکان میں یکساں وجود رکھتی ہے) سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس سے یہ تمام نوع بہ نوع کائنات اور رنگارنگ موجودات صادر ہوسکیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اندھی فطرت سے کوئی ایسا عالم پیدا ہوجائے جس کے اجزا میں نظم و ترتیب ہو اور تغیراتِ زمان و مکان کے باوجود اس کے تناسب اور ہم آہنگی میں کوئی فرق نہ آئے۔
> اس سے ثابت ہے کہ لازماً اس کائنات کا مبدا کوئی ایسی ذات ہے جو صفات علم و حکمت اور ارادہ سے متصف ہے۔[1]

قرآن شریف آیت کے آخر میں کہتا ہے:

ان چیزوں میں اہل علم و دانش کے لیے آیاتِ الٰہی ہیں: (انّ فی ذٰلک لاٰیات للعالمین)۔ کیونکہ اہل علم ہی عامۃ الناس کے مقابلے میں ان اسرار سے بہتر طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی، جلد اول صفحہ ۴۹۶ (مادہ الہ)

۲۳۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

۲۴۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

۲۵۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ اور اُس کی آیات میں سے تمہاری رات اور دن کی نیند بھی ہے۔ اور تمہارا اُس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ تحقیق کہ ان اُمور میں اُن کے لیے جو سُنتے ہیں بہت سی نشانیاں ہیں۔

۲۴۔ اور اُس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ وُہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور (بارش کی) اُمید کا بھی اور وُہ آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وُہ زمین کو اُس کی مَوت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

۲۵۔ اور اُس کی آیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وُہ تمہیں (قیامت میں) زمین سے بلائے گا تو تم فوراً نکل پڑو گے (اور میدانِ حشر میں حاضر ہو جاؤ گے)۔

تفسیر

انسان کے نفس اور خارجی دُنیا میں خُدا کی عظمت کی نشانیاں: گزشتہ بحثوں کے بعد جن میں انفس و آفاق میں آیاتِ الٰہی کا ذکر تھا، زیرِ نظر آیات میں ان عظیم آیات کے ایک اور حصہ کا بیان ہے۔

سب سے پہلے نیند کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کیونکہ وُہ مظاہرِ فطرت میں سے ایک اہم مظہر اور نظامِ عالم میں اُس کے خالق کی حکمت کا اظہار ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ تمہارا دن اور رات میں سونا نیز فضلِ الٰہی سے حصہ پانے کے لیے تمہاری سعی و کوشش اور ضروریاتِ زندگی کو پُورا کرنے کے لیے تمہاری بھاگ دوڑ اور اُن کا پُورا ہونا یہ سب آیاتِ الٰہی میں سے ہے: (ومن اٰیاتہٖ منامکم باللیل والنھار وابتغاؤکم من فضلہٖ)۔

آیت کے اخیر میں یہ الفاظ ہیں۔ سُننے والوں کے لیے ان امور میں بہت سی نشانیاں ہیں: (ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یسمعون)۔

کسی سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ تمام "جان داروں" کو صَرف شدہ طاقت کو بحال کرنے اور آئندہ محنت و مشقت کے واسطے تیار ہونے کے لیے، آرام کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ استراحت اور نیند لازمی طور پر انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ لوگ جو کسبِ معاش میں محنت اور مشقت کرتے ہیں وہ تو ناگزیر طور پر تھک کر سو جاتے ہیں۔

پھر سے تازہ دم ہونے کے لیے نیند سے بہتر اور کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے جو فطرتاً اِنسان پر طاری ہو جاتی ہے اور جو وقتی طور پر انسان کے تمام جسمانی، فکری اور دماغی اعمال کو مُعطّل کر دیتی ہے۔

صِرف بعض اعضا و قُویٰ جن کا مصروفِ عمل اور بیدار رہنا ثباتِ حیات کے لیے لازم ہے نہایت آہستگی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ مثلاً حرکتِ قلب، روانیِ تنفس اور دماغ کے بعض حصّے۔

یہ نعمتِ الٰہی اِس امر کا باعث ہوتی ہے کہ انسان کے جسم اور رُوح میں از سرِ نو قُوّت کار آ جاتی ہے۔ انسان جب استراحت کرتا ہے تو وُہ اُس وقت کام سے فارغ ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر سونے سے اُس کی تھکن دُور ہو جاتی ہے اور اُس کے اعضا کو آرام مِل جاتا ہے اِس طرح انسان میں ایک نئی زندگی، خوشی اور تازہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر انسان سویا نہ کرتا تو اس کا جسم جلد ہی پژمُردہ اور فرسُودہ ہو جاتا اور بہت جلد ناتوان اور ضعیف ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ مناسب و معتدل نیند اِنسان کے لیے نشاطِ جوانی کی بقا، طُولِ عمر اور صحت و سلامتی کا باعث ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں نیند کا ذکر "ابتغاؤکم من فضلہ" سے پہلے آیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں کہ اپنی روزی تلاش کرو۔ اِس ترتیب میں مَصلحت یہ ہے کہ "نیند" تلاشِ رزق کے لیے بُنیادی شرط ہے۔ کیونکہ اگر انسان نے کافی آرام نہ کیا ہو تو "ابتغاؤکم من فضلہ" بھی مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ بھی درست ہے کہ معمولاً انسان رات کو سوتا ہے اور دن کو اپنا رزق تلاش کرتا ہے مگر یہ لازمی نہیں ہے کہ انسان اپنے معمولاتِ حیات کو بدل نہ سکے۔ خدا نے اِنسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ اپنی نیند کی عادت کو بدل سکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اُس میں تغیّر کر سکتا ہے۔ اِسی لیے "منامکم باللیل والنھار" کہا گیا ہے (رات کا ذکر پہلے اور دن کا ذکر بعد میں ہے)۔

بے شک سونے کا اصل وقت رات ہی کا ہے اور تاریکی کے سبب شب کو سکُون محسوس ہوتا ہے اِس لیے آرام کرنے کے لیے اُسے اوّلیت حاصل ہے۔ مگر انسان کی زندگی میں بعض حالات ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ اِس کے برعکس عمل کرنا پڑتا ہے مثلاً رات کو سفر کرنا پڑے تو دن کو آرام کرنا پڑے گا۔ اسی قیاس پر دیکھیے کہ اگر سونے کے اوقات انسان کے اختیار میں نہ ہوتے تو کتنی دُشواری پیش آتی۔

نیند کو آیاتِ الٰہی میں شُمار کرنے کی اہمیّت ہمارے زمانے میں اور بھی زیادہ واضح ہو گئی ہے کیونکہ فی زماننا بعض صنعتی کارخانے اور ہسپتال رات دن کام کرتے اور کھُلے رہتے ہیں اور اُن میں کام کرنے والے تین تین شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔

آدمی کے جسم اور رُوح کو نیند کی ضرورت اِتنی زیادہ ہے کہ انسان میں بے خوابی کے تحمّل کی توانائی بہت ہی کم ہے اور انسان چند شب و روز سے زیادہ بے خوابی برداشت نہیں کر سکتا۔

اِس لیے ظالم اور ستم شعار اہلِ اقتدار کسی کو بدترین سزا یہی دیتے ہیں کہ اُسے سونے نہیں دیتے۔

برعکس اِس کے بہت سی بیماریوں کا مؤثر علاج یہ ہے کہ بیمار کو گہری نیند سُلا دیا جائے۔ اِس طرح سے اس کی قوّتِ مدافعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

لیکن عام انسانوں کے لیے نیند کی مقدار کو مُعیّن نہیں کیا جا سکتا کیونکہ طُولِ خواب کا انحصار اِنسان کے سن و سال، اُس کے حالات، اس کی جسمانی بناوٹ اور نفسیاتی کیفیت پر ہے۔

البتہ ــــ نیند کی اُس مقدار کو کافی کہہ سکتے ہیں جس کے بعد انسان اپنے اندر تازگی محسُوس کرے۔ جس طرح پانی پی کر اور غذا کھا کر سیری محسُوس کرتا ہے۔

یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ نیند کے لیے جس طرح طولِ زمان کا لحاظ ہے اُس کا گہرا ہونا بھی اہمیّت رکھتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات ایک گھنٹے کی گہری نیند، چند گھنٹوں کی اچٹتی ہوئی نیند کے مقابلے میں اِنسان کی رُوح اور جسم کو تازگی بخشنے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

لیکن ــــ اگر کسی موقع پر گہری نیند ممکن نہ ہو صرف خفیف اور اچٹتی ہوئی نیند اور غنودگی بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔ جیسا کہ سُورۂ انفال کی آیت ۱۱ میں مجاہدینِ بدر کے متعلق ذکر ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں گہری نیند ممکن ہی نہیں ہے اور

نہ مفید و سود مند ہے۔

بہر حال ــــ نیند اور استراحت ۔ اور اُس سے جو سکون، نشاط اور توانائی حاصل ہوتی ہے، خدا کی ایسی نعمت ہے جس کی کسی طرح بھی توصیف نہیں ہو سکتی۔

* * *

اِس کے بعد کی آیت میں آیاتِ الٰہی کی پانچویں قسم کو بیان کیا گیا ہے۔ اِس آیت میں بھی خدا کی اِن نشانیوں کا ذکر ہے جو نفسِ انسانی سے باہر عالمِ خارج میں پائی جاتی ہیں۔ اِس میں خصوصیت سے رَعد و برق، بارش اور زمین کی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ الٰہی میں سے ایک بجلی بھی ہے جو تمہارے لیے موجبِ خوف بھی ہے اور باعثِ اُمید بھی: (ومن اٰیاتہ یریکم البرق خوفاً وطمعاً)۔

بجلی کا خوف تو یہ ہے کہ وہ کبھی بصورتِ صاعقہ ٹوٹ پڑتی ہے اور ہر اُس چیز کو جو اُس کے احاطہ میں آجائے جلا خاک کر دیتی ہے۔ بجلی چمکنے سے " اُمید " یہ ہوتی ہے کہ عموماً گرج چمک کے بعد تند و تیز بارش ہوتی ہے۔ اِس بنا پر بجلی نزولِ بارش کا پیش خیمہ ہے۔ اِس کے علاوہ بجلی کے چمکنے میں جو فوائد ہیں اُنھیں اِس زمانے میں سائنس دانوں نے منکشف کیا ہے۔

ہم نے سورۂ رَعد کے آغاز میں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے[1]

اِس کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ خدا آسمان سے پانی برساتا ہے جو زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے: (وینزل من السّماء ماءً فیحیی بہ الارض بعد موتھا)۔

خشک اور جلتی بھنتی زمین میں جس سے مُوت کی بُو آتی ہے چند حیات بخش بارشوں کے بعد جان آجاتی اور وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اُس سے اُگنے والے پھولوں، سبزے اور جڑی بُوٹیوں سے اُس کے آثارِ حیات نمایاں ہوتے ہیں۔ اُس کی حالت دیکھ کر کوئی یقین بھی نہیں کر سکتا کہ یہ وہی مُردہ زمین ہے۔

آیت کے آخر میں بطور تاکید اضافہ کیا گیا ہے کہ اِن چیزوں میں اُن لوگوں کے لیے جو فکر کرتے اور عقل سے کام لیتے ہیں خدا کی نشانیاں ہیں: (انّ فی ذٰلک لاٰیات لقوم یعقلون)۔

اہلِ عقل و فکر ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اِس مُرتّب نظامِ فطرت کے پیچھے کسی قادرِ مطلق کا ہاتھ ہے جو اِس نظام کو چلا رہا ہے۔ نیز یہ کہ یہ نظامِ فطرت محض اتفاقاً یا اندھی اور بہری حرکت و ضرورت سے ظہور میں نہیں آگیا۔

* * *

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں، عالمِ خارج میں موجود آیاتِ الٰہی کے سلسلے میں زمین و آسمان کے نظام اور اُن کی ثبات و بقا کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ آیاتِ عظمتِ الٰہی میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان و زمین اُس کے امر سے قائم ہیں: (ومن اٰیاتہ ان تقوم السّماء والارض بامرہ)۔

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد ۵ کی طرف رجوع فرمایئے۔

یعنی صرف آسمان و زمین کی تخلیق ہی جیسا کہ آیت ۲۲ میں اشارہ ہوا ہے، آیتِ الٰہی نہیں بلکہ اِن کے نظام کا باقی رہنا ایک دوسری نشانی ہے۔ کیونکہ یہ عظیم اَجرام اپنی منظم گردش کے لیے اور چیزوں کی احتیاج بھی رکھتے ہیں جن میں سے سب سے اہم اُن کی باہم قوّتِ جاذبہ اور دافعہ ہے۔

خداوندِ عالم نے کراتِ سماوی میں اِن دونوں قوتوں کو ایسے اعتدال پر رکھا ہے کہ لاکھوں سال گزرنے کے بعد بھی سرِ مُو انحراف کے بغیر اپنے اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو گزشتہ آیت میں یہ بیان ہے کہ خالقِ کائنات ذاتِ واحد ہے۔ اور ــ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اِس کارخانۂ عالم کی مُربّی اور مدبّر بھی ذاتِ احدیت ہی ہے۔

آسمان اور زمین کے لیے فعل " تقُوم " کا استعمال جس سے اُن کا قیام اور ثبات مُراد ہے، ایک لطیف تعبیر ہے۔ جو انسان کے معمولاتِ حیات سے لی گئی ہے کیونکہ انسان کے کام کرنے کے لیے بہترین حالت، حالتِ قیام ہے۔ اِس حالت میں وہ اپنے تمام کام انجام دینے پر قُدرت رکھتا ہے اور اپنے اطراف پر پُورا تسلط رکھتا ہے۔

کلمہ " امر " کے استعمال سے پروردگار کی انتہائی قُدرت مُراد ہے کہ اس عظیم و وسیع کائنات کے نظم اور دوامِ حیات کے لیے اُس کا ایک حُکم ہی کافی ہے۔

اِس آیت کے اخیر میں، معاد کے لیے توحید کو بُنیادی شرط قرار دیتے ہوئے، بحث کا رُخ اسی طرف موڑتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ جب وہ تمہیں زمین میں سے بُلائے گا تو تم سب کے سب باہر نکل آؤ گے: (ثمّ اذا دعاکم دعوةً من الارض اذا انتم تخرجون)۔

قرآنِ کریم میں یہ بات بکرار نظر آتی ہے کہ خدا معاد کو زمین و آسمان میں اُس کی قدرت کی نشانیوں کی بُنیاد پر ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ بحث بھی اُن ہی آیات میں سے ہے۔

کلمہ " دعاکم " سے یہ مُراد ہے کہ جس طرح اِس کائنات کی نظم و تدبیر کے لیے اُس کا ایک حکم کافی ہے، اسی طرح بروزِ قیامت دوبارہ جی اُٹھنے اور حشر و نشور کے لیے بھی اُس کا ایک دفعہ بُلانا ہی کافی ہوگا خصُوصیت سے جب اِس جُملے پر توجّہ کی جائے " اذا انتم تخرجون "۔

عربی زبان میں کلمہ " اذا " مناجات کے لیے آتا ہے۔ اِس سے ثابت ہے کہ ایک ہی دفعہ پُکارنے سے سب کے سب ناگہانی طور پر قبروں سے باہر نکل آئیں گے۔

اِس ضمن میں " دعوةً من الارض " کے الفاظ سے معادِ جسمانی ثابت ہوتی ہے کہ بروزِ قیامت انسان اسی زمین سے اُٹھایا جائے گا۔

چند اہم نکات

۱۔ درسِ خُداشناسی کا ایک مکمّل نصاب : گزشتہ چھے آیات میں خُداشناسی کے مضمون کو مختلف انداز و

عنوانات سے بیان کیا گیا ہے۔ جو درحقیقت اِس درس کے لیے ایک مکمل نصاب ہے۔

اِس مضمون میں آفرینش آسمان سے لے کر مٹی سے انسان کی تخلیق، اہل خانہ کی باہمی محبت، شب و روز کی راحت بخش نیند، نظامِ کائنات میں تدبیرِ الٰہی، نزولِ باران اور اقوامِ عالم کی زبانوں اور اُن کے رنگوں کا اختلاف، غرض کہ اَنفس و آفاق میں خدا کی جو بھی آیات ہیں، اُن سب ہی کا ذکر ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اِن آیات میں سے ہر ایک میں دلائل [illegible] دو حصّے ہیں، ایک حصّہ بطور تمہید ہے اور دُوسرے میں دعویٰ کا اثبات اور تاکید ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس اعتبار سے چھ آیات میں خدا کی بے پایاں قدرت کے اظہار کے لیے مجموعی طور پر بارہ گواہ ہو گئے۔

۲۔ کون لوگ اِن آیات سے کسبِ حکمت کرتے ہیں؟

اِن چھ آیات میں سے درمیان کی چار آیات میں تاکیداً کہا گیا ہے کہ اِن حوادثِ عالم اور اجزائے کائنات میں علما، عقلا، متفکرین اور سُننے والوں کے لیے روشن نشانیاں ہیں۔ مگر آیت ۲۰ اور ۲۵ میں یہ ذکر نہیں ہے۔

فخرالدین رازی نے اِس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ آیت ۲۰ میں اِس امر کا ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آیات بیس اور اکیس ایک دُوسرے کے بعد آئی ہیں اور دونوں میں اُن آیات کا ذکر ہے جو انسان کے عالمِ اَنفس میں ہیں۔

اور آخری آیت میں مطلب اِس قدر واضح ہے کہ اُس پر غور کرنے کے لیے تعقّل و تفکّر کی ضرورت ہی نہیں[1]۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ پہلے کلمہ "تفکّر" استعمال ہوا ہے۔ اُس کے بعد "علم" کا ذکر ہے۔ کیونکہ علم کے لیے فکر کی بُنیادی حیثیت ہے۔ اُس کے بعد سُننے والے کان کا ذکر ہے۔ کیونکہ علم و آگاہی کے طفیل ہی انسان کلمۂ حق سُننے اور قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ جس طرح سے کہ قرآن میں مذکور ہے:

فبشّر عباد الّذین یستمعون القول فیتّبعون احسنہٗ

میرے اُن بندوں کو بشارت دو جو باتوں کو سُنتے ہیں اور اُن میں سے بہترین پر عمل کرتے ہیں۔ (زمر - ۱۷-۱۸)

آیت ۲۴ میں "عقل" کا ذکر ہے۔ کیونکہ عقل کامل کی منزل پر وہی لوگ پہنچیں گے جو سُننے والے کان رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجّہ ہے کہ زیرِ نظر آیات میں سے آیت ۲۰ میں اِنسان کی خلقت اور اُس کی نسل کے زمین پر پھیلنے کا ذکر ہے:

ثـمّ اذا انتـم بشر تنتشـرون

اور آخری آیت ۲۵ میں بروزِ قیامت زمین سے جی اُٹھنے کا ذکر ہے:

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

اذا انتـم تخـرجون۔

پہلی آیت ۲۰ میں آغازِ انسان کا ذکر ہے اور آخری ۲۵ میں اُس کے انجام کا ذکر ہے۔

۳۔ عالمِ خواب کے عجائبات

علما نے خواب اور اُس کی خصوصیات کے بارے میں جو بحثیں کی ہیں اُن کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس پُراسرار عالم کے تمام پہلو روشن نہیں ہوئے اور انسان کی اُس کی پیچیدہ حقیقتوں تک رسائی نہیں ہوئی۔

ابھی اہلِ علم میں یہ امر زیرِ بحث ہے کہ انسان کے جسم میں کون سا عمل اور ردِّ عمل ہوتا ہے کہ ناگہانی طور پر اُس کے دماغ اور بدن کے عمل کا ایک حصّہ مُعطّل ہو جاتا ہے اور اُس کی رُوح اور جسم میں ایک نئی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض عُلما کا یہ خیال ہے کہ انسان کے جسم میں تبدیلیاں نیند آنے کا باعث ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب دماغ سے جسم کے دُوسرے حصّوں میں خُون جاتا ہے تو یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جو مغز سے باقی اعضا کی طرف انتقالِ خُون کو ظاہر کرتا ہے۔

علما کا ایک اور گروہ جسم میں کیمیائی تبدیلیوں کو نیند کا باعث سمجھتا ہے۔ اِن لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جس وقت انسان محنت مشقت کرتا ہے تو اُس کے جسم میں ایک زہر پیدا ہو جاتا ہے جو دماغ کے ایک حصّے کو بیکار کر دیتا ہے۔ اُس کے نتیجے میں انسان سو جاتا ہے اور جب یہ زہر جزوِ بدن بن کر زائل ہو جاتا ہے تو انسان بیدار ہو جاتا ہے۔ سائنس دانوں کی ایک اور جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ "نیند" کا ایک عامل اعصابی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دماغ میں بھی ایک خاص قسم کا فعّال نظامِ اعصاب موجود ہے۔ جس کی مثال موٹر کے پٹرول کی سی ہے۔ یہ نظامِ اعصاب تھک کر بیکار ہو جاتا ہے اور آدمی سو جاتا ہے۔

مگر اِن تمام نظریات پر اعتراضات کیے گئے ہیں جن کے ابھی تک شافی جوابات نہیں دیے جا سکے۔ اِس لیے ابھی تک "نیند" ایک پُراسرار چیز ہی ہے۔

سائنس دانوں نے جن عجائباتِ خواب کا انکشاف کیا ہے۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بوقتِ خواب جب دماغ کے خلیوں کا اکثر حصّہ اپنا کام ترک کر دیتا ہے تو بعض خلیے جنھیں "خلاہائے نگہبان" کہنا چاہیئے، بیدار رہتے ہیں اور انسان عالمِ بیداری میں اُن خلیوں کو جو پیغام بھی دیتا یا جو نصیحت بھی کرتا ہے وُہ اُسے ہرگز فراموش نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ وُہ مغز کو بیدار کر کے اُسے متحرّک کر دیتے ہیں۔

مثلاً ـــــ ایک تھکی ماندی ماں جب رات کو سونے لگتی ہے اور اُس کا شیرخوار بچّہ اُس کے قریب ہی گہوارے میں محوِ خواب ہوتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر دماغ کے "نگہبان" خلیوں سے (جو رُوح اور جسم کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں) یہ کہتی ہے کہ "میرا بچّہ جس وقت بھی روئے تو مجھے جگا دینا۔ ماں کے نزدیک اُس کے علاوہ دُوسری آوازوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بادل کی گرج اس ماں کو نیند سے بیدار نہ کرے۔ لیکن بچّے کی ہلکی سی آواز بھی اُسے جگا دیتی ہے اور دماغ کے

نگہبان خلیئے اس فرض کو ادا کرتے ہیں۔

ہم نے اِس بات کو خُود اپنے اُوپر بارہا آزما کے دیکھا ہے کہ اگر ہم نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہے کہ صبح سویرے یا آدھی رات کو ہمیں کسی سفر یا کسی اہم پروگرام پر جانا ہے تو عین وقت پر آنکھ کُھل جاتی ہے۔ جب کہ دیگر مواقع پر ہم گھنٹوں پڑے سوتے رہتے ہیں۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ نیند ایک رُوحانی منظر ہے اور رُوح ایک پُراسرار عالم ہے۔ لہٰذا ـــــ کیا عجب ہے کہ اِس مسئلے کے بہت سے پہلو ایسے ہوں جو ابھی انسان پر منکشف نہ ہوتے ہوں۔ مگر انسان اس اسرار کی گرہ کُشائی میں جتنا بھی زیادہ غور و فکر کر رہا ہے اتنا ہی اُس پر اِس منظر کے خالق کی عظمت واضح ہوتی جاتی ہے۔

❖ ❖ ❖

۴۔ **میاں بیوی کی باہمی محبّت :** اگرچہ ـــ انسان کا اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے رابطہ نسبی ہے جس کی بُنیاد رشتہ داری کے گہرے تعلق پر ہے۔ اس کے مقابلے میں زوجین کا باہمی تعلق صرف قانون اور معاہدۂ باہمی پر ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُن دونوں کے درمیان محبت رشتہ داری کے تعلق پر سبقت لے جاتی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں "وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ" میں انسان کی اِسی فطرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

جناب رسالتمآبؐ سے ایک حدیث مروی ہے کہ : جنگِ اُحد کے بعد آپؐ نے بنتِ جحش سے فرمایا کہ "تیرے ماموں حمزہؓ شہید ہوگئے۔" تو اُس نے جواب دیا : "اِنّا لِلّٰہ و انّا الیہ راجعون" "مَیں خُدا سے اِس مصیبت کا اجر چاہتی ہوں۔"

آپؐ نے پھر اُس سے کہا ـــــ "تیرا بھائی بھی شہید ہوگیا۔"

اُس لڑکی نے پھر "انّا لِلّٰہ" پڑھا اور اس کا اَجر خدا سے مانگا۔ مگر جناب رسالت مآبؐ نے جیسے ہی اُسے اُس کے شوہر کے مرنے کی خبر سُنائی، تو وُہ سر پیٹنے اور فریاد کرنے لگی۔

ہاں ـــــ یہ قول کتنا سچا ہے :

"مایعدل الزوج عند المرأۃ شیءٌ"

عورت کے لیے کوئی شے بھی اُس کے شوہر کے مانند نہیں ہے۔[1]

---

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۷۴۔

۲۶۔ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○

۲۷۔ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

۲۸۔ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○

۲۹۔ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○

ترجمہ

۲۶۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اُس کے سامنے جُھکے ہُوئے ہیں اور سب اُسی کے فرماں بردار ہیں۔

۲۷۔ اور وہی خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اُسے لوٹائے گا اور اُس کے لیے یہ کام آسان تر ہے

اور اُس کے لیے آسمانوں اور زمین میں توصیف برتر ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۲۸۔ خُدا تمہارے لیے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان کرتا ہے (اگر تمہارے پاس لونڈیاں اور غلام ہوں تو) کیا وہ تمہارے غلام اور لونڈیاں تمہارے اِس مال میں جو ہم نے تمہیں دیا ہے شریک ہیں؟ اور کیا اُس میں وہ تمہارے برابر کے حصہ دار ہیں؟ اور کیا اُن سے اجازت لیے بغیر تم اُس میں تصرف سے اسی طرح ڈرتے ہو جیسے آزاد حصہ داروں سے؟ ہم اِس طرح اپنی آیات کو اُن کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

۲۹۔ بلکہ ظالم بغیر علم و آگاہی کے اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور خُدا جسے گُمراہ کرے اُسے کون ہدایت کر سکتا ہے اور اُن کا کوئی یاور و مددگار نہ ہوگا۔

تفسیر

خُدائے واحد ہی مالکِ حقیقی ہے

گزشتہ آیات میں "توحیدِ خالقیت" اور "توحیدِ رُبوبیت" کے متعلق بحث تھی۔ مگر زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت میں توحید کی ایک اور شاخ یعنی "توحیدِ مالکیت" کا ذکر ہے۔ چنانچہ خُدا فرماتا ہے: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اُس کے لیے ہے (ولہ من فی السّماواتِ والارض)۔ اور چونکہ سب اُس کی ملکیت ہیں، اِس لیے سب کے سب اُس کے سامنے فروتن اور مطیع ہیں (کلٌّ لہٗ قانتون)۔

یہ ظاہر ہے کہ اِس مقام پر مالکیت اور مطیع ہونے کا مفہوم مالکیت و اطاعتِ تکوینی ہے۔ یعنی قانونِ آفرینش کے لحاظ سے ہر شے کی زمامِ امر اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ خواہ نہ خواہ اُس کے قوانین کا پابند ہے۔

یہاں تک کہ نافرمان، باغی اور قانون شکن گناہ گار بھی، خدا کے قوانینِ تکوینی کی پابندی پر مجبور ہیں۔ اِس مالکیت کی دلیل اُس کی وہی خالقیت اور رُبوبیت ہے۔ وہ ذات جس نے ابتدا میں کائنات کو خلق کیا اور اُس کا نظام و تدبیر بھی جس کی قدرت

میں ہے، لازماً اُس کا مالکِ اصلی بھی وہی ہے۔

چونکہ جہانِ ہستی کی تمام موجودات اِس اَمر میں یکساں ہیں۔ (یعنی جہانِ تکوین میں جُملہ مخلوقات قوانینِ فطرت کی مطیع ہیں)۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی مالکیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مُشرکین کے خیالی معبود بھی اُسی مالک الملوک کے مملوک اور مطیعِ فرماں ہیں۔

ضمناً یہ بھی ملحوظ رہے کہ "قانت" کا مادّہ "قنوت" ہے، جس کے معنی ہیں ایسی اطاعت جس میں عاجزی اور انکساری بھی شامل ہو۔ بقول راغب اصفہانی در مفردات:

جنابِ رسالت مآبؐ سے ایک حدیث مروی ہے:

کل قنوت فی القراٰن فھو طاعۃ

قرآن میں جہاں کہیں بھی کلمۂ قنوت آیا ہے اس کے معنی اطاعت کے ہیں۔

اطاعت بھی دو طرح کی ہے، تکوینی اور تشریعی۔

یہ جو بعض مفسّرین نے اِس مقام پر قانتون کے معنی "قائمون بالشھادۃ علی وحدانیتہ" کیے ہیں، درحقیقت یہ مفہوم بھی اطاعت کا ایک پہلو ہے۔ کیونکہ وحدانیت خدا کی شہادت دینا بھی ایک قسم کی اطاعتِ خدا ہی ہے۔[1]

آیاتِ گزشتہ اور آیاتِ آئندہ میں مبدأ اور معاد کے مسائل تانے بانے کی طرح بُنے ہُوئے ہیں۔ چنانچہ زیرِ قلم آیات میں سے آیت ۲۷ میں پھر مسئلہ معاد کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ "اُسی کی ذات ہے جس نے آفرینش کا آغاز کیا اور وہ پھر اُسے لوٹائے گا اور یہ کام اُس کے لیے آسان تر ہے۔" (وھوالذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہٗ وھو اھون علیہ)۔[2]

اِس آیت میں مختصر ترین اِستدلال کے ساتھ اِمکانِ معاد کو ثابت کیا گیا ہے۔ رُدرح بیان یہ ہے کہ:۔

جب تم یہ مانتے ہو کہ آغازِ آفرینش اُسی کی طرف سے ہے۔ تو بعد فنا "تجدیدِ حیات" جو تخلیقِ اوّل کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے، اُس پر وہ کیوں قادر نہیں ہو سکتا؟

اعادہ تخلیق کے، آغازِ تخلیق سے آسان تر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ابتدا میں سرے سے کسی چیز کا وجود ہی نہ تھا اور خدا اُسے عدم سے وجُود میں لایا ہے مگر بعد فنا اعادہ کے لیے کم از کم موادِ اصلی تو موجود ہوگا۔ جس کا کچھ حصہ مٹی میں ملا ہوگا اور کچھ حصہ فضا میں پراگندہ ہوگا۔ خدا کا کام تو اُن اجزائے منتشر کو صرف منظم کرنا اور اُنھیں صورت بخشنا ہی ہوگا۔

---

[1] آلوسی نے اپنی کتاب رُوح المعانی میں، اس آیت کے تحت اِس رائے کو کسی ماقبل مفسر سے نقل کیا ہے۔

[2] فخر رازی نے تفسیر کے حوالہ سے یوں نقل کیا ہے کہ۔ خدا نے جنابِ مسیحؑ کی بغیر باپ کے پیدائش کے متعلق یہ کہا ہے "ھو علیّ ھین" اور علیّ کا مقدم ہونا حصر کی دلیل ہے۔ یعنی یہ کام صرف میرے لیے آسان ہے نہ کہ میرے غیر کے لیے۔ اور زیرِ نظر آیت میں "ھواھون علیہ" یہاں علیہ حصر کے معنی نہیں دیتا، مراد یہ ہے کہ جو شخص کسی کام کا آغاز کر سکتا وہ اُس کا اِعادہ بھی کر سکتا ہے۔

اس مقام پر ایک نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ کسی کام کا آسان یا سخت ہونا فکرِ انسانی کے مطابق ہے جب کہ ذاتِ لامحدود کے لیے سخت و آسان میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کام کا سخت و آسان ہونا اُس مقام پر متصوّر ہوتا ہے جہاں فاعل کی قدرت محدود ہو کہ وہ ایک کام کو تو آسانی سے کر سکے اور دوسرے کام کو دُشواری سے ۔ لیکن جب فاعل کی قدرت لامحدود ہو تو پھر سخت و آسان کے الفاظ بے معنیٰ ہیں ۔

درحقیقت کلمات " آسان" اور " دُشوار" کا مفہوم اضافی ہے۔ خدا کے لیے عظیم ترین پہاڑ کو اُٹھا لینا اُتنا ہی آسان ہے جتنا انسان کے لیے گھاس کے تنکے کو ۔

شاید اِسی وجہ سے آیت میں بلا فاصلہ یہ الفاظ ہیں :(وله المثل الاعلى في السماوات والارض) ۔
آسمانوں اور زمین میں خدا ہی کے لیے توصیف برتر ہے۔

کیونکہ آسمان و زمین میں کسی وجُود کے متعلق بھی جو وصفِ کمال تصوّر کیا جائے مثلاً : علم ، قدرت ، مالکیت عظمت جُود و کرم تو اُس کا مصداقِ اتم و اکمل خدا ہی ہے۔ کیونکہ صرف ذاتِ الٰہی ہی لامحدود ہے۔ باقی ماسوا اللہ محدود ہے۔ علاوہ بریں خدا کے اُوصاف ذاتی ہیں اور دیگر ہر شے کے اضافی اور عارضی ہیں۔ نیز یہ کہ جُملہ کمالات کا منبع اصلی وہی ہے۔

ہماری زبان (ہر زبان جو انسان بولتا ہے) روزمرہ کے دُنیاوی مطالب کے افہام و تفہیم اور مقصد بر آری کے لیے ہے کوئی زبان بھی ماورائی حقائق اور ذاتِ باری تعالیٰ کے اوصاف بیان نہیں کر سکتی جس طرح کہ ہم نے کلمۂ " اھون" کو دیکھا۔ جُملہ مافوق بھی اِن جُملوں کی مانند ہے جیسے سُورۂ اعراف آیہ ۱۸۰ میں ہے :

وللّٰه الاسماء الحسنىٰ فادعوه بها

خدا کے لیے بہترین نام ہیں لہٰذا اسے ان ناموں سے پکارو ۔

یا جیسے سورۂ شُوریٰ کی آیت ۱۱ میں آیا ہے :

ليس كمثله شيءٌ

کوئی شے بھی دُنیا میں اُس کی مثل نہیں ہے ۔

آیت کے اختتام پر بہ عنوان تاکید یا بطور دلیل فرمایا گیا ہے : اور وہی عزیز و حکیم ہے (وهو العزيز الحكيم)۔
وہ عزیز اور شکست ناپذیر ہے۔ لیکن قدرت نامحدود کے ہوتے ہوئے بھی وہ کوئی کام بے حساب انجام نہیں دیتا۔ اُس کے تمام کام حکمت پر مبنی ہیں ۔

* * *

گزشتہ آیات میں توحید و معاد کے متعلق کچھ دلائل بیان کرنے کے بعد ایک مثال کی صُورت میں نفیٔ شرک کی دلیل دی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے : خدا خود تمہارے ہی حالات سے تمہارے لیے ایک مثال دیتا ہے (ضرب لكم مثلاً من انفسكم) ۔

وہ مثال یہ ہے کہ اگر تمہارے غلام اور خادم ہوں تو کیا یہ لوگ اس روزی میں جو ہم نے تمہیں دی ہے ، تمہارے

شریک ہو جائیں گے ؟ (هل لكم من ما ملكت ايمانكم من شركاء في ما رزقناكم) ۔

اِس طرح کی شرکت کہ تم دونوں ہر طرح سے مساوی ہو (فانتم فيه سواء) ۔ اور اس طرح بے تکلف شریک ہوں کہ تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے مال میں تصرّف کریں گے۔ جس طرح کہ تم اپنے آزاد شرکا (یعنی رشتہ داروں) سے اپنے مال اور میراث کے متعلق ڈرتے ہو۔ (تخافونهم كخيفتكم انفسكم)۔ یا یہ کہ تمہارا یہ حال ہو جائے کہ تم اپنے مال میں اُن کی اجازت کے بغیر تصرّف نہ کر سکو ۔

(مثال کا نتیجہ یہ ہے کہ) جب کہ تم اپنے غلاموں کی " جو تمہاری مجازی ملکیت ہیں " اپنے کاروبار اور اموال میں اِس طرح شرکت کو نادرست سمجھتے ہو تو پھر ان مخلوقات کو جو خدا کی حقیقی ملکیت ہیں اُس کا شریک کس طرح سمجھتے ہو ؟ یا جب تم پیغمبروں کو (مثلاً مسیحؑ کو) یا ملائکہ کو ۔ یا ایسی مخلوق کو جیسے جنّات ہیں یا پتھر یا لکڑی کے بُتوں کو خدا کا شریک سمجھتے ہو تو بتاؤ کہ یہ تمہارا کیسا غیر منطقی اور غلط فیصلہ ہے ؟ یہ مجازی غلام جو ممکن ہے کہ بہت جلد آزاد ہو جائیں اور تمہاری ہی صف میں آکھڑے ہوں (چنانچہ اِسلام میں اس مُساوات کی بُنیاد ڈال دی گئی ہے) جب تک غلام ہیں اپنے مالک کے مُساوی نہیں ہو سکتے اور اُس کے اختیارات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتے۔

تو پھر تم نے اُن حقیقی غلاموں کو کیونکر خدا کا شریک سمجھ لیا ہے کہ جو اپنی ذات اور وجُود کے لیے خدا کے محتاج ہیں اور خدا کے ساتھ اُن کی احتیاج کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ اُن کے پاس جو کچھ ہے اُسی کا دیا ہوا ہے اور اُس کے فضل کے بغیر وہ ہیچ و پُوچ ہیں ۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ اِس آیت میں اُن کلمات کی طرف اشارہ ہے جو مشرکین قریش مراسم حج کے وقت جب " لبّیک" کہتے تھے تو کہا کرتے تھے وہ کہتے تھے :

لبّيك ، اللّٰهم لاشريك لك ، الاشريكاً هو لك تملكه وما ملك

لبّیک، اے خدا ! تیرا کوئی شریک نہیں ہے ، مگر تیرا ایک شریک ہے جس کا تُو مالک ہے اور اُس کی املاک کا مالک بھی ہے [1]

یہ امر بدیہی ہے کہ اس آیت کی یہ شانِ نزول دیگر آیات کی طرح اِس کے معنیٰ کو محدود نہیں کرتی۔ ہر حال میں یہ آیت تمام مشرکین کے لیے جواب ہے جو اُن ہی کی زندگی سے لیا گیا ہے ، جس کا مدار غلامی کے رواج پر تھا۔ اِس آیت میں اِس دلیل سے اُن پر اتمامِ حُجّت کی گئی ہے ۔

کلمہ " ما رزقناكم " کے اِستعمال سے مقصود یہ ہے کہ تم حقیقت میں نہ تو اِن غلاموں کے حقیقی مالک ہو اور نہ اُس مال کے جو تمہارے پاس ہے کیونکہ اِن سب چیزوں کا مالکِ حقیقی خدا ہے ۔ لیکن اِس علم کے باوجود تم اِس بات کے لیے تیار نہیں ہو کہ اپنے مجازی مال و دولت کو ایسے افراد کے سپرد کر دو جو بطورِ مجاز تمہارے مملوک کہلاتے ہیں اور اُنہیں اپنی دولت میں شریک سمجھو۔ حالانکہ عام فطرتِ انسانی کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر محال نہیں ہے ۔ کیونکہ اگر غلام پر اعتبار ہو تو

[1] تفسیر المیزان و تفسیر مجمع البیان و تفسیر نور الثقلین ، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

اُسے مال میں حق تصرّف دیا جا سکتا ہے۔
لیکن خدا اور مخلوقات میں خالق اور مخلوق کا ناقابلِ تغیّر فرق ہے۔ یہ امر محال ہے کہ مخلوق، خالق کے اختیارات میں شریک
ہو سکے۔

علاوہ بریں ــــ جب کسی ذات یا شے کی پرستش کی جاتی ہے تو اُس کے دو ہی سبب ہوتے ہیں۔ یا تو اُسے اُس کی
عظمت کی وجہ سے پُوجا جاتا ہے۔ یا بہ تمنائے سُود یا بخوفِ زیاں (جو اُس سے انسان کو پہنچ سکتا ہے) مگر اِن خُود ساختہ
معبودوں میں تو اِن میں سے ایک بات بھی نہیں [1]
آیت کے اخیر میں اس مسئلے پر زیادہ غور و خوض کرنے کے لیے بطور تاکید فرمایا گیا ہے: ہم اس طرح اُن لوگوں کے لیے
جو غور و فکر کرتے ہیں اپنی آیات کی تشریح کرتے ہیں (کذالك نفصّل الآيات لقوم يعقلون)۔
البتہ ــــ تمہاری ہی زندگیوں سے واضح مثالوں کا ذکر کر کے ہم تمہیں بہ تکرار حقائق سمجھاتے ہیں تاکہ تم اُن پر غور کرو۔ کم از کم
اتنا تو سمجھو کہ جو بات تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ ربُّ العالمین کے لیے بھی پسند نہ کرو۔

٭ ٭ ٭

مگر یہ آیاتِ بیّنات اور اس قسم کی واضح اور روشن مثالیں صاحبانِ فکر کے لیے ہیں۔ نہ کہ بے دانش نفس پرست ظالموں
کے لیے۔ جن کے دلوں پر جہل و نادانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ایامِ جاہلیّت کی خرافات اور تعصبات نے اُن کی
فضائے فکر کو تیرہ و تار کر دیا ہے۔ اس لیے آیہ بعد میں یہ اضافہ کرتی ہے: ظالم، علم و آگاہی کے بغیر اپنی ہوا و ہوس کی
پیروی کرتے ہیں۔ اُن کا عمل کسی دلیل کے تحت نہیں ہے (بل اتبع الذين ظلموا اهواءهم بغير علم)۔
خدا نے ایسے لوگوں کو اُن کی بداعمالیوں کی وجہ سے وادیٔ ضلالت میں پہنچا دیا ہے۔ بھلا اُن لوگوں کی ہدایت کون کر
سکتا ہے جنہیں خدا نے گمراہ کیا ہو (فمن يهدي من اضل الله)۔
آیت نمبر ۲۹ میں "اشرکوا" کے بجائے "ظلموا" استعمال ہوا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ "شرک" بجائے
خود بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ خالق پر ظلم ہے۔ کیونکہ مشرکین خدا کی مخلوق کو اُس کا ہم پایہ بنا دیتے ہیں۔
نیز یہ خلقِ خدا پر بھی ظلم ہے۔ کیونکہ مشرکین اُنھیں راہِ توحید سے جو درحقیقت راہِ خیر و سعادت ہے، گمراہ کرتے ہیں۔
"شرک" اپنی ذات پر بھی ظلم ہے۔ کیونکہ مُشرک اپنی زندگی کو برباد کر کے گمراہی میں سرگرداں رہتا ہے۔
ضمناً ــ کلمہ "ظلموا" کا استعمال مؤخر جملہ کے لیے بطور مقدمہ ہے۔ یعنی اگر خدا نے اُن ظالموں کو راہِ حق سے گمراہ
کر دیا ہے تو یہ اُن کے ظلم کا نتیجہ ہے۔ جس طرح کہ ہم سُورۂ ابراہیم کی آیت ۲۷ میں پڑھتے ہیں:

ويضل الله الظالمين

خُدا ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے۔

---

[1] بعض مفسرین نے جملہ "تخافونهم كخيفتكم انفسكم" کی کچھ اور تفسیر کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اِن خُود ساختہ معبودوں میں اتنی قدرت
نہیں ہے کہ تم اُن سے ڈرو۔ اتنا بھی نہ ڈرو جتنا ایک دوسرے سے ڈرتے ہو۔ اس سے زیادہ ڈرنے کا کیا موقع ہے مگر ہم نے جو تفسیر ابتدا میں کی ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔

یہ مُسلّم ہے کہ خدا جن لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دے تو اُن کا کوئی بھی یار و ناصر نہ ہوگا (وما لهم من ناصر
خُدا نے اس عنوان سے گروہِ ظالمین و مُشرکین کی منحوس سرنوشت کو بیان کیا ہے۔ اور جیسا کہ فرمایا گیا ہے، وہ اسی کے
مستحق ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ عظیم ترین مظالم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی عقل و فکر سے دست کش ہو کر آفتابِ علم و دانش
کی طرف سے مُنہ موڑ لیا ہے اور ظلمتِ ہوا و ہوس کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ فطری امر ہے کہ خدا اُن سے
توفیق سلب کر لے اور اُنھیں کفر و شرک کی تاریکیوں میں چھوڑ دے جہاں اُن کا کوئی یار و ناصر نہ ہوگا۔

۳۰۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۳۱۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

۳۲۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۰۔ تو اپنا رُخ پروردگار کے خالص دین کی طرف کرلے کیونکہ یہ فطرت ہے کہ جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی آفرینش میں کوئی تغیّر اور تبدیلی نہیں ہوتی اور یہی محکم و استوار دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

۳۱۔ تم اسی خدا کی طرف رجُوع کیے رہو۔ اُس سے ڈرتے رہو، نماز قائم کرتے رہو اور مُشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

۳۲۔ (اور نہ اُن لوگوں میں سے ہونا) جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔ (تعجب یہ ہے کہ) ہر گروہ اُسی سے (وابستہ ہے اور) خوش ہے

جو کچھ اُس کے پاس ہے۔

تفسیر

اِس مقام تک، مشاہدہ کائنات سے توحید و خدا شناسی کا سبق حاصل کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس عالم مادّی کے ماوراء ایک ایسی ذات ہے جو مبداء علم و قُدرت ہے، بہت سی بحثیں ہوئی ہیں اور اس سُورۃ میں جو آیاتِ توحید سے متعلق آئی ہیں اُن سے بھی یہی سبق حاصل کیا ہے۔

اَب جو نئی آیات زیرِ بحث ہیں اُن میں سے پہلی آیت میں اُس توحید کا ذکر ہے جو عالم فطرت میں موجود ہے یعنی اُسی مسئلۂ توحید کو مشاہدۂ عالم مظاہر کے بجائے مشاہدۂ نفس، مشاہدۂ باطن اور کیفیّتِ عالمِ وجدان کے زاویہ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا کے پاک اور خالص دین کی طرف رُخ کرو (فاقم وجھك للدّين حنيفًا)۔

کیونکہ یہی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کے عملِ تخلیق میں تغیّر نہیں ہوتا (فطرت اللّٰه الّتی فطر النّاس علیها ۭ لا تبدیل لخلق اللّٰه)۔

اور یہی محکم و اُستوار دین و آئین ہے (ذالك الدين القيّم)۔

مگر اکثر لوگ اِس حقیقت کو نہیں جانتے (ولكن اكثر النّاس لايعلمون)۔

"وجه" کے لغوی معنیٰ ہیں "صورت" مگر یہاں صورت ظاہری نہیں بلکہ صورت باطنی اور "رُوئے دل" مراد ہے۔ یعنی یہ مطلب نہیں کہ تم دین کی طرف اپنا مُنہ کرلو بلکہ قلبی توجہ مطلوب ہے۔ توجہ قلبی کو بطورِ استعارہ "وجه" کہا گیا ہے کیونکہ یہ جسم کا سب سے اہم عضو ہے۔

"اقم" کا مادہ "اقامه" ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں صاف اور مستقیم کرنا اور کھڑا کرنا۔

"حنيف" کا مادہ "حنف" ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں "باطل سے حق کی طرف میلان" یا "کجی سے راستی کی طرف" اِس کی ضد "جنف" ہے یعنی راستی سے گمراہی کی طرف میلان۔

"دینِ حنیف" وہ دین ہے جو تمام انحرافات، خرافات، کجی اور گمراہیوں سے جُدا ہوا اور راستی اور درستی کی طرف مائل ہوا ہے۔

مجموعی طور پر اس جُملہ کے یہ معنیٰ ہیں کہ اپنی توجہ دائماً اُس دین کی طرف رکھو جو ہر قسم کی کجی اور ناراستی سے پاک ہے وہی آئینِ اسلام اور وہی خدا کا پاک اور خالص آئین ہے[1]

اِس آیت میں بطور تاکید یہ سمجھایا گیا ہے کہ "دینِ حنیف" جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے، وہ دین ہے جو خدا نے

[1] "الدّين" میں الف ولام عہد کے معنیٰ دیتا ہے۔ یعنی وہی دین و آئین جس کی تبلیغ پر پیغمبرِ اسلامؐ مامور تھے۔

تمام بنی نوعِ انسان کی سرشت میں ودیعت کیا ہے اور فطرتِ انسانی جاودانی اور تغیر ناپذیر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اس آیت میں اور بھی چند حقایق ہیں:

۱۔ صرف خدا شناسی ہی نہیں بلکہ دین و آئین بطورِ کُلّی تمام جہات سے ایک امرِ فطری ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ جب ہم حقیقتِ توحید پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُمورِ تکوینی اور اُمورِ تشریعی کے درمیان ہم آہنگی ہونی چاہیئے مُراد یہ ہے کہ احکامِ شریعت فطرتِ انسانی کے مطابق ہوں اور انسان کی فطرت سے بھی شریعت کے قوانین کی تائید ہوتی ہو۔

اس مطلب کو بالفاظِ دیگر یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ "تکوین" (فطرتِ انسانی) اور "تشریع" (اُمورِ شرعی) دونوں قوی بازوؤں کی مانند ہیں، جو اعمالِ انسانی میں ہم آہنگی کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی امرِ شریعت ایسا ہو جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہو۔ بخلاف اس کے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان کی فطرتِ سلیم میں کوئی میلان ہو اور شریعت اُس کی مخالفت کرے۔

اس میں شک نہیں کہ "شریعت" فطرتِ انسان کی عناں گیر رہتی ہے اور اسے منحرف راستوں سے روکنے کے لیے اُس پر حدود و قیود اور شرائط عائد کرتی رہتی ہے۔ مگر سلامت رو فطری خواہشات کی ہرگز مخالفت نہیں کرتی بلکہ اُنہیں مشروع طریقوں سے پُورا کرنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو "تکوین" اور "تشریع" میں تضاد پیدا ہو جائے، جو اساسِ توحید سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ خدا ایسے کام نہیں کرتا جو ایک دوسرے کے ضد و نقیض ہوں۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُس کا فرمانِ تکوینی تو یہ ہو کہ یہ کام کر اور فرمانِ تشریعی یہ ہو کہ نہ کر۔

۲۔ دین اپنی خالص اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک صورت میں انسان کے تحت الشعور میں موجود ہے۔ انسان کا راہِ مستقیم سے منحرف ہونا ایک عارضی امر ہے۔ اس بناء پر پیمبروں کا فرض یہ ہے کہ وہ انسان کو ان عارضی انحرافات سے روک دیں اور اُس کی اصلی فطرت کو اظہار کا موقع فراہم کریں۔

۳۔ نیز جملہ "لا تبدیل لخلق الله" اور اُس کے بعد جملہ "ذلك الدين القيم" مذہب اور دین کے فطری ہونے اور فطرتِ الٰہی کے عدمِ امکانِ تغیر پر تاکید ہے۔ ہر چند کہ بہت سے لوگ کافی استعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ لازم ہے کہ کلمہ "فطرت" کا مادہ "فطر" (بوزن بذر) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اُس کے طول سے چیرنا۔ یہ کلمہ مجازی طور پر بمعنی خلقت استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ موجوداتِ عالم کی آفرینش کے وقت پردۂ عدم شگافتہ ہوا اور مخلوقات ظاہر ہو گئیں۔

بہرحال جب انسان روزِ اوّل عالمِ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو اُسی دن سے یہ نورِ الٰہی اُس کے دل میں چمکنے لگتا ہے۔ ہم نے جو کچھ سطورِ بالا میں کہا ہے اُس کی وہ متعدد روایات تائید کرتی ہیں جو اس آیت کی تفسیر میں مذکور ہوئی ہیں۔

ہم اُن کا اس وقت ذکر کریں گے جب اس آیت کے نکات لکھیں گے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی بیان کریں گے کہ "توحید" ایک فطری شئے ہے۔

* * *

اس کے بعد کی آیت میں یہ اضافہ ہے کہ دینِ حنیف یعنی خالص و فطری دین کی طرف تمہاری توجہ اس حال میں ہے کہ تم خدا کی طرف لوٹو گے (منیبین الیہ)۔ تمہارے وجود کی اصل و اساس توحید پر ہے اور آخر کار تم اسی بُنیاد کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

کلمہ "منیبین" کا مادہ "انابہ" ہے جس کے وضعی معنی ہیں "پھر لوٹ آنا"۔ اس مقام پر اس لفظ کا مفہوم ہے، "خدا کی طرف لوٹ آنا" یا "توحیدی فطرت کی طرف لوٹ آنا"۔ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ ہمیشہ ایسے اسباب پیدا ہونے کا امکان ہے جو انسان کو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مرکزِ توحید سے منحرف کر دیں۔ اس حالت میں انسان کو خدا کی طرف لوٹنا چاہیئے اور جتنی مرتبہ بھی اس عمل کی تکرار ہوگی، فطرتِ توحید محکم و استوار ہوتی جائے گی اور اسباب انحراف کمزور اور ضعیف ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ ہمیشہ کے لیے انسان کا عقیدۂ توحید مستحکم ہو جائے گا اور وہ "فاقم وجهك للدين حنيفا" کا مصداق ہو جائے گا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ "اقم وجهك" میں صیغہ واحد ہے اور "منیبین" میں صیغہ جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا حکم اگرچہ مفرد صورت میں ہے اور اس کے مخاطب جنابِ رسالت مآب ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس سے تمام مسلمان اور مومنین مراد ہیں۔

"انابت" اور "بازگشت" کے ذکر کے بعد "تقویٰ" کا حکم ہے کہ جو تمام اوامر و نواہی کا جامع ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا سے پرہیز کرو (واتقوه) یعنی اُس کے احکام کی مخالفت سے پرہیز کرو۔

اُس کے بعد تمام اوامر میں سے سب سے زیادہ زور اور تاکید نماز پر ہے۔ فرمایا گیا ہے: نماز قائم کرو (واقیموا الصلوٰة)۔

کیونکہ نماز ہر جہت سے شرک کے ساتھ مبارزہ کا بہترین لائحہ عمل ہے اور عقیدۂ توحید اور ایمان باللہ کو مستحکم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

اس لیے ذکرِ صلوٰۃ کے بعد ہی شرک کے بارے میں فرمایا گیا ہے: مشرکین میں سے مت ہو جانا (ولا تکونوا من المشرکین)۔ کیونکہ "شرک" عظیم ترین گناہ اور اکبر کبائر ہے۔ ممکن ہے روزِ حساب خدا ہر قسم کے گناہوں کو بخش دے مگر وہ گناہِ شرک کو کبھی نہ بخشے گا۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۴۸ میں مذکور ہے:

ان الله لا یغفر ان یشرك به و یغفر ما دون ذلك لمن یشاء

خدا گناہِ شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ لیکن اگر وہ چاہے گا تو اس سے کمتر گناہوں کو بخش دے گا۔

یہ واضح ہے کہ اس آیت میں چار احکام آئے ہیں (یعنی توبہ و بازگشت بسوئے خدا، تقویٰ، اقامتِ نماز اور پرہیز از شرک) یہ سب مسئلۂ توحید اور اُس کے آثارِ عملی پر تاکید کے لیے ہیں

٭ ٭ ٭

زیرِ نظر آیت میں علامات و نتائجِ شرک میں سے ایک کو نہایت مختصر اور پُرمعنی عبارت میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ وہی لوگ جنہوں نے اپنے دین کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور مختلف فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوگئے ہیں: (من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً)۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ اُن فرقوں میں باہم جو تضاد و اختلاف ہے۔ اس کے باوجود ہر گروہ اپنے عقاید اور مسلمات سے خوش ہے (کل حزب بما لدیھم فرحون)۔

یہ مُسلّم ہے کہ علاماتِ شرک میں سے ایک پراگندگی اور باہمی تفرقہ بھی ہے کیونکہ مختلف معبودوں کی پرستش سے متفاوت عقاید اور منتشر روشِ فکر پیدا ہوتی ہے اور یہ چیزیں باہمی تفرقہ اور پراگندگی کا موجب ہو جاتی ہیں۔ شرک کی اساس اور خصوصیت یہ ہے کہ ہوائے نفس، تعصب، کبر، خودخواہی اور خود پسندی اس کے سایہ بسایہ رہتی ہے۔ اس لیے کسی قوم میں اتحاد و وحدت صرف خدا پرستی، تواضع و ایثار اور عقلی روش ہی کے تحت باقی رہ سکتی ہے۔

منطقِ استخراجی کے اصول سے ہمیں جہاں بھی اختلاف اور پراگندگی نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں کسی نہ کسی قسم کا شرک ضرور موجود ہے۔ اخذ نتایج کے اعتبار سے اس مضمون کو بصورت تکرار یوں کہا جا سکتا ہے کہ شرک کا نتیجہ کسی قوم میں تفرقہ تضاد، ذہنی توانائیوں کا ضیاع اور آخر کار اُس قوم کا ضعف و ناتوانی اور تباہی ہے۔

لیکن یہ کہ مشرکین اور منحرفین راہِ راست میں سے ہر گروہ نے اپنے لیے جو راہ انتخاب کر لی وہ اسی کو حق سمجھتا ہے اور اُسی سے خوش ہے۔ اُن کی یہ روش کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ ہوا و ہوس انسان کی دلی خواہشات کو اُس کی نظر میں مزّین کر کے جلوہ گر کرتی ہے اور خواہشات کی اس جلوہ آرائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس طریقِ حیات سے جو اس نے اختیار کر لی ہے زیادہ دل بستگی اور راحتِ قلب محسوس ہونے لگتی ہے۔ خواہ وہ راہِ عمل قطعی گمراہی ہی کیوں نہ ہو۔

جب انسان کی چشمِ بصیرت پر خواہشاتِ نفس کا پردہ پڑ جاتا ہے تو وہ چہرۂ حقیقت کو اُس کی اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتا اور حُب و بُغض سے غیر جانبدار ہو کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

سُورۂ فاطر آیت ۸ میں یوں مذکور ہے:

افمن زین لہ سوء عملہ فراٰہ حسناً

وہ شخص جس کی نظر میں اُس کے اعمال قبیح مزّین ہوگئے ہیں اور وہ اُسے حَسین نظر آتے ہیں، کیا وہ اُس شخص کی مانند ہے جو راہِ خدا میں قدم اُٹھاتا ہے اور حقائق کو اصل صورت میں بے نقاب دیکھتا ہے؟

چند اہم نکات

۱۔ توحید انسان کی داخلی قوی قوتِ جاذبہ ہے:

جس طرح کہ دلائلِ عقلی و منطقی انسان کے طرزِ عمل کو معین کرتے ہیں اسی طرح اُس کے نفس میں ایسے جذبات اور تمایلات موجود ہیں کہ جو کبھی تو شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اس کے طرزِ عمل کا تعین کرتے ہیں۔

نسلِ انسانی کے بقا کا راز ہی یہ ہے کہ انسان مسائلِ حیات میں ہمیشہ ہی دلائلِ عقلی و منطقی سے کام نہیں لیتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرنے لگے تو بہت سے مقاصدِ زندگی مُعطّل ہو کے رہ جائیں۔ مثلاً اگر انسان غذا کھانے یا آمیزشِ جنسی کے لیے طبی اور منطقی دلائل دینے لگے۔ یعنی غذا کھانے سے "بدل ما یتحلل" ہوتا ہے اور توالد و تناسل بقائے نسل انسانی کا باعث ہے، تو اس کی نوع اب سے پہلے کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ لیکن جنسی جذبہ و جبلّت اور غذا کھانے کی خواہش خواہ نہ خواہ اُس سے یہ اعمال سرزد کراتی ہے اور یہ مقاصد جس قدر بقائے حیاتِ فرد اور بقائے نوع کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں یہ جذبات بھی اتنے ہی زیادہ قوی ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ کشش اور میلان دو قسم کا ہے۔ کبھی تو غیر شعوری ہوتا ہے۔ جیسے کہ حیوانات عقل و فکر کے بغیر ہی غذا اور جنس مخالف کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

اور کبھی یہ میلان شعوری ہوتا ہے یعنی یہ جبلّت عقل و شعور سے کام لے کر اپنا عمل کرتی ہے۔

قسم اوّل کے جذبات کو "جبلّت" اور قسم دوم کو "فطرت" کہتے ہیں۔

خدا پرستی اور اُس کی ذات کی طرف میلانِ قلب ہر شخص کی فطرتِ اصلیہ ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات ہماری اس بات کو ایسا ادّعا سمجھیں جو خدا پرست لوگوں کی طرف سے تراش لیا گیا ہے۔ مگر ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جن سے نہ صرف انسان کا میلان ذاتِ الٰہی کی طرف فطری ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اپنے تمام اصولوں کے ساتھ ایک فطری امر ہے۔ مثلاً:

(۱) انسان کی پُرہنگامہ طویل تاریخ میں ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کا مذہبی اعتقاد اور ماورائے فطرت طاقت پر ایمان ضرور رہا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ فطرتِ انسانی ہے۔ کیونکہ اگر اعتقاد و ایمان باللہ صرف انفرادی رجحان اور عادت ہوتا اور یہ جذبہ عمومیت نہ رکھتا اور نہ دائمی اور ہمیشگی ہوتا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ یہ عارضی واقعہ ہے۔ مگر اس کی عمومیت اور دوام اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔

بڑے بڑے مؤرخین کی رائے ہے کہ اُنھوں نے جہاں تک انسانی تاریخ کا کھوج لگایا ہے اور زمانۂ ماقبل تاریخ کا جس حد تک انکشاف ہوا ہے، اُنھوں نے انسانی معاشرے میں "لادینیت" کا بجز استثنائی صورت کے کہیں نشان نہیں پایا۔

عصرِ حاضر کا مشہور مؤرخ ویل ڈیورنٹ کہتا ہے:

اگر ہم مذہب کی یہ تعریف کریں کہ وہ "مافوق الطبیعت" قوتوں کی پرستش کا نام ہے۔ تو ابتدائے بحث ہی سے یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بعض ابتدائی اقوام کا ظاہراً کوئی مذہب نہ تھا۔

اس کے بعد وہ اِس قسم کی اقوام کی مثالیں دے کر لکھتا ہے کہ یہ مثالیں نادرات میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم اعتقاد مطابق حقیقت ہے کہ :۔

"دین ایک ایسا مظہر ہے جو ہر انسان کی فطرت سے اُبھرتا ہے۔"

اِس کے بعد وہ یہ اضافہ کرتا ہے کہ ایک فلاسفر کی نظر میں مذہب کے وجود کا مسئلہ، نفسیات اور تاریخ کے بُنیادی مسائل میں سے ہے۔ وہ اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ تمام ادیان میں لغو اور خلافِ عقل عقائد موجود ہیں، بلکہ وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ جب سے تاریخ انسانی شروع ہوتی ہے، اُسی وقت سے "دین" بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے

اختتامِ کلام پر وہ اپنی گفتگو کو اس پُر معنی سوال پر ختم کر دیتا ہے۔

"یہ تقویٰ جیسے کسی طرح بھی انسان کے دل سے محو نہیں کیا جا سکتا اُس کا منبع کہاں ہے؟"[1]

یہی مؤرخ اپنی ایک اور تحقیق میں (جو اُس نے ادیان ماقبل تاریخ کے متعلق کی ہے) یوں لکھتا ہے :

اگر ہم ماقبل تاریخ میں وجود مذہب کا تصور پیشِ نظر نہ رکھیں تو ہم اُس کے وجود کو موجودہ تاریخی دَور میں بھی نہیں سمجھ سکتے۔[2]

ماقبل تاریخ انسانوں کے متعلق آثارِ قدیمہ کی کُھدائی سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں، اُن سے بھی اِس امر کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور عالم علمِ معاشرت SOCIOLOGIST سموایل کینگ اپنی کتاب بنام "جامعہ شناسی" میں لکھتا ہے:

موجودہ نسلِ انسانی کے اسلاف بھی یقیناً کسی مذہب کے معتقد تھے۔

وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اُن آثار کو پیش کرتا ہے جو آثارِ قدیمہ کی کُھدائی سے مُنکشف ہوئے ہیں کہ وہ :۔

اپنے مُردوں کو ایک مخصوص وضع سے دفن کرتے تھے اور اُن کے ساتھ ایسی
اشیاء بھی رکھتے تھے جو اُن کے عقیدے کے مطابق بروز قیامت کام آئیں۔[3]

بہر حال کوئی محقق بھی مذہب کو انسان کی تاریخ حیات سے جُدا کرنا قبول نہیں کرتا۔

(۲) . آج کی دُنیا کے مشاہدے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اِس زمانے کی بعض مُستبد طاقتوں نے اپنی پُوری کوشش اور طاقت صَرف کر کے لوگوں کے دلوں سے مذہب کو محو کرنا چاہا۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔

چنانچہ ہم خُوب جانتے ہیں کہ رُوس کی برسرِ اقتدار پارٹی، ساٹھ برس سے بغیر کسی وقفے کے مسلسل پروپیگنڈے اور معاشرے کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے جملہ وسائل سے کام لے کر یہ کوشش کر رہی ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں سے مذہبی

---

[1] تاریخ تمدن، جلد اول صفحہ ۸۷ تا ۸۹ -

[2] تاریخ تمدن؛ جلد اول صفحہ ۱۵۶ -

[3] جامعہ شناسی، صفحہ ۱۹۲ -

اعتقادات کو بالکل ختم کر دے۔ لیکن اِس آہنی پردے سے کبھی کبھی جو خبریں پھُوٹ نکلتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام پروپیگنڈے اور سخت گیری کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ حالیہ دنوں میں رُوس کی بعض ریاستوں میں مذہبی جوش و خروش زیادہ نظر آنے لگا ہے۔ جس نے حکومت کے حکّام بالا کو حیران کر دیا ہے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی روز یہ سختی اور گلوگیری ختم ہو گئی تو مذہب پھر اپنی جگہ لے لے گا۔ یہ امر اس بات کا شاہد ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے۔

(۳) . علاوہ بریں ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ تجزیہ نفسی PRYCHO ANALYST نے ابعادِ رُوحِ انسانی PRYCHO DIMINSIMS کے بارے میں جو انکشافات کیے ہیں وہ بھی مذہب کے فطری ہونے پر شاہد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نفسِ انسانی کے مختلف ابعاد کے متعلق تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس میں ایک جوہرِ قدسی یا یزدانی بھی ہے جسے جبلّت مذہبی کہنا چاہیئے۔ بعض ماہرینِ نفسیات اِس امر کے قائل ہیں کہ انسان میں "راستی، علم، نیکی اور زیبائی کے جذبات کا سرچشمہ یہی جوہر قدسی ہے۔

علمائے نفسیات کا قول ہے کہ نفسِ انسانی میں اصولی اور اساسی محرکات حسب ذیل ہیں :

۱. حِسّ راستی : انسان میں یہ حِس ہر قسم کے علوم و فنون کا سرچشمہ ہے۔ یہی انسان کو رموزِ کائنات کی تحقیق اور انکشاف پر آمادہ کرتی ہے۔

۲. حِسّ نیکی ETHICAL INSTINCT یہ حِس انسان کو فضائلِ اخلاق مثلاً عدالت، شجاعت، قربانی اور ان جیسے دیگر اُمور کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان میں بذاتِ خود یہ صفات نہ ہوں تو وہ ایسے فضائل کے حاملین کو ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی طینت میں نیکی کا میلان موجود ہے۔

۳. حسِ زیبائی (جبلّتِ حُسن) AESTHETIC INSTINCT یہ جبلّت انسان کو فنونِ لطیفہ، جمالیات، ادبیات، ذوقی اور وجدانی اشواق کی طرف مائل کرتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرے کو متغیر کر دیتی ہے۔

۴. حِسّ مذہبی RELIGIOUS INSTINCT یعنی یہ ایمان رکھنا کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اُس کی عبادت اور حمد و ثنا کرنا۔ اِس موضوع پر کُودن ٹایم نے جو مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اُس میں وہ لکھتا ہے:

سگمنڈ فرائڈ نے انسان کے لاشعور کے متعلق جو تحقیقات شروع کی تھیں (جسے اُلفرڈ ایڈلر اور یُنگ نے ترقی دی) اُس سے علمِ نفسیات کے دائرہ علم میں ایسی قوتیں آئی ہیں جو انسان کے نفس کی گہرائیوں میں مستور ہیں، جو ادراکِ حقائق کرتی اور ماوراءِ عقل رُموز کی معرفت حاصل کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ انسان میں "حِس دینی" موجود ہے اور اس کا راز کیا ہے۔ ہرچند کہ ابھی اس (حس دینی) کے متعلق ماہرینِ نفسیات میں اتفاق نہیں ہے، تاہم اِس مسئلے پر غور و فکر کا سلسلہ جاری ہے۔ اور مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے نفسیات "حِس دینی" کی اِس تعریف پر متفق ہیں جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

"حِس دینی" نفسِ انسانی کے فطری اور مستقل عناصرِ اولیہ میں سے ہے۔ یہ احساس نفس کا حقیقی اور زیبا ترین حصہ ہے۔

نفس پر جو دوسری کیفیات طاری ہوتی ہیں یہ اُن میں سے کسی سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس احساس کا چشمہ لاشعور کی گہرائی سے پھوٹتا ہے۔

انسان کے اندر جو ذوقِ جمال، نیکی اور راستی کا رجحان موجود ہے اس کی علّت بھی یہی احساس ہے جسے مفہوم دینی یا زیادہ صحیح الفاظ میں مفہومِ مقدس کہنا چاہیئے۔

اگر ان چاروں احساسات بالا کو "مقولات اربعہ" کہا جائے تو حسِ دینی ہی ایک ایسا مقولہ ہے۔ جس میں باقی ہر سہ احساسات مع اپنی خصوصیات کے شامل ہیں۔

تانہ گی۔ دوکینٹین[1] نے مذکورہ مقالہ کا جو تخلیص اور ترجمہ کیا گیا ہے، اُس میں مذکور ہے:

جس طرح کہ عصرِ حاضر کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے کہ عالمِ مادّی میں طول، عرض و عمق کے علاوہ ایک چوتھا بُعد "زمانہ" یا "مکان" بھی بیان کیا جاتا ہے[2]

جو فضا کے ابعادِ ثلاثہ سے منفرد ہوتے ہوئے اُن تین ابعاد کا جامع بھی ہے۔

اسی طرح اس زمانے کے ماہرین نفسیات نے نفسِ انسانی میں حسِ جمال، حسِ خیر اور حسِ راستی کے علاوہ ایک حسِ قدسی یا یزدانی (کہ جسے حقیقت میں نفسِ انسانی کا بعدِ چہارم کہنا چاہیئے) کو دوبارہ ثابت کیا ہے[3]

نفس کا یہ بُعدِ چہارم (یعنی حسِ قدسی) باقی احساسات سے منفرد ہے۔ ممکن ہے احساسات سہ گانہ اسی سے پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) انسان کی یہ جبلّت بھی کہ وہ مصائب کے طوفان میں اپنی مشکلات کے حل اور شدائدِ زندگی سے نجات حاصل کرنے کیلیے کسی نادیدہ اور ماورائی طاقت سے لو لگاتا ہے، اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اُس کے اندر ایک اندرونی جذبہ اور فطری الہام موجود ہے جو اُسے وجودِ خدا کا یقین دلاتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات انسان کے اس میلان کو اُس مذہبی پروپیگنڈے کا ردِ عمل سمجھیں جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ہم عمر بھر اُس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس جذبے کے مظاہر تمام انسانوں، یہاں تک کہ اُن لوگوں میں بھی موجود ہیں جو عام طور پر مذہبی ذوق نہیں رکھتے، تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ شک و اعتراض غلط ہے۔ بلکہ کسی ماورائی طاقت پر اعتقاد رکھنا انسان کے نفس کی گہرائی میں موجود ہے، جو کہ کسی پروپیگنڈے کا نتیجہ نہیں ہے۔

(۵) انسان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی نظر آتے ہیں جن کی حسِ مذہبی کے منہاج کے سوا اور کوئی تاویل و تفسیر نہیں ہو سکتی

---

[1] مقالہ کرول تانہ گی۔ ترجمہ مہندس بہبہانی۔ در کتاب حسِ مذہبی یا بعدِ چہارم روحِ انسانی۔

[2] ایرانی اہلِ قلم انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ناموں کے املا اس طرح بگاڑ دیتے ہیں کہ اُن کی اصلیت کا پتا چلانا دُشوار کیا امرِ محال ہو جاتا ہے۔ مذکورہ نام کا آخری حصہ تو KANTAIN ہے۔ اول کے دو لفظوں کی تحقیق نہ ہو سکی۔

[3] بعدِ چہارم کا محقق البرٹ آئن سٹائن ہے (۱۹۵۵ء - ۱۸۷۹ء) یہ محقق ماہرِ ریاضیات تھا۔ اُس کا نظریہ ہے کہ کسی شے کی مکان و زمان میں پوزیشن چوتھا بُعد ہے۔
POSITIONN IN SPACE AND TIME

[4] مصنف نے جسے دینی لفظ دوبارہ اس لیے اضافہ کیا ہے کہ رہبرِ دین تو نفس کی اس قوت کو پہلے ہی بتا چکے تھے جیسے کہ قرآن میں ہر مقام پر خطاب "نفس" سے ہے

مثلاً ——— ہم ایسے انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ جو نہایت جوش کے ساتھ اپنے تمام مالی وسائل کسی مذہبی مقصد یا نظریے پر قربان کر دیتے ہیں۔ اُن کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بے نظیر طور پر مذہب پر نثار کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اِس راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

وہ شہدا جنھوں نے مقاصدِ الٰہی کو پُورا کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں ذوق و شوق سے شربتِ شہادت نوش کیا، صرف اسلامی تاریخ ہی میں ایسے افراد کی مثالیں بکثرت نہیں پائی جاتیں بلکہ دُوسری اقوام اور ملتوں کی تاریخ میں بھی کم نہیں ہیں یہ مثالیں اِس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ انسان کے نفس کی گہرائی میں حسِ مذہبی موجود ہے۔

ممکن ہے کہ اِس موقع پر یہ سوال بھی اُٹھایا جائے کہ کمیونسٹ لوگ جو اپنے الحاد اور مذہبی مخالفت کو چھپاتے تک نہیں اُن میں بھی اپنے معتقدات اور افکار کے لیے ایسا ہی قربانی کا جذبہ موجود ہے۔

لیکن اگر قدرے غور کیا جائے تو یہ اعتراض یا در ہوا ثابت ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ کمیونسٹ حضرات جو مذہب کی کلیتہً نفی کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مذہب اساطیر الاولین میں سے ہے اور انسان کی ابتدائی سرگزشت کی یادگار ہے، جب کہ وہ عالمِ طفلی تھا۔ اِس لیے کمیونسٹ معاشرے میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے لاشعوری طور پر اپنے اِس عقیدے کو مذہب بنا لیا ہے۔ وہ لوگ اپنے قومی رہنماؤں کو اسی نظرِ عقیدت سے دیکھتے ہیں جیسا کہ مصر کے بُت پرست اپنے بُتوں کو دیکھتے تھے۔ چنانچہ لینن کی قبر کی زیارت کے آئے دن جو اوصاف وضع کیے جاتے ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں۔

وہ لوگ "مارکس ازم" کے اُصولوں کو مثل وحی آسمانی اور نقص سے پاک اور مُقدّس سمجھتے ہیں۔ وہ مارکس اور لینن کو معصومین کی طرح منزّہ عن الخطا تصوّر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان اصولوں میں اصلاح اور تجدیدِ نظر ناقابلِ معافی گناہ سمجھتے ہیں۔ نیز اپنے مخالفین کو اہلِ دین ہی کی اصطلاح میں "مُرتد" کہتے ہیں۔ گویا کہ اُن کے لیے لادینی (منحرف شکل میں) ایک دین بن گئی ہے اور اُن کے افکار، مراسم اور اعتقادات مذہبی رنگ اختیار کر گئے ہیں۔

* * *

۲۔ احادیثِ اسلامی میں فطرتِ خُداشناسی کا ذکر

صرف قرآن ہی میں نہیں بلکہ احادیثِ اسلامی میں بھی "معرفتِ الٰہی" اور توحید کے ایک امرِ فطری ہونے کے بارے میں خوب بحث کی گئی ہے۔ اِن میں سے بعض احادیث میں "فطرتِ توحیدی" اور بعض میں عنوانِ "معرفت" کے تحت۔ بعض میں "فطرتِ اسلامی" یہاں تک کہ بعض میں اس جذبے کو "ولایت" کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مُحدّث بزرگوار جناب کُلینی نے "اصولِ کافی" میں ہشام ابن سالم کے واسطے سے ایک نہایت معتبر حدیث نقل کی ہے۔ ہشام کا قول ہے کہ اُس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ: "فطرت اللہ التی فطر الناس علیها" میں فطرت سے کیا مُراد ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ "توحید" مراد ہے[1]

---

[1] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۱۰ (باب فطرۃ الخلق علی التوحید)۔

نیز اُسی کتاب " کافی " میں امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی سے ایک اور حدیث منقول ہے کہ اُس صحابی نے جب آیت مذکور کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا کہ " فطرت " سے مُراد " اسلام " ہے[۱]

امام باقر علیہ السلام سے ایک اور حدیث اسی کے مشابہ منقول ہے کہ آپؑ کے ایک صاحبِ علم صحابی زرارہ نے جب اِس آیت کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا کہ :-

فطرھم علی المعرفة به

خدا نے فطرتِ انسانی میں اپنی معرفت و شناخت کا جذبہ رکھا ہے۔[۲]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث منقول ہے جو مشہور ہے :

کُل مولود یولد علی الفطرة الاسلام حتی لیکون ابواہ هما اللذان یھودانه وینصرانه

ہر بچہ نوزاد فطرتِ اسلام اور شرک سے خالی دین پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس کے ماں باپ اُس پر یہودیت یا نصرانیت جیسے انحرافی عقائد کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔[۳]

اصولِ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث اِس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپؑ سے جب آیت مذکور کی تفسیر دریافت کی گئی تو جواب میں فرمایا کہ " فطرت " سے مراد ولایت اور اولیائے الٰہی کی رہبری کو قبول کرنا ہے۔[۴]

امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ میں (جو کہ نہج البلاغہ میں مندرج ہے) مختصر مگر بلیغ الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ فبعث فیھم رسله و واتر الیھم انبیائه لیستأدوھم میثاق فطرته ویذکروھم منسی نعمته ویحتجوا علیھم بالتبلیغ ویثیروا لھم دفائن العقول

خدا نے انسانوں کی طرف اپنے رسول بھیجے اور یکے بعد دیگرے انبیا کو مامور کیا تاکہ وہ اُن سے پیمانِ فطرت کے ایفا کا مطالبہ کریں اور اُنھیں خُدا کی وہ نعمتیں یاد دلائیں جنھیں وہ بھول گئے ہیں اور بذریعہ تبلیغ اُن پر اتمامِ حُجت کریں اور اُن کے لیے عقل کے خزانوں کو فاش کر دیں۔

مذکورہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرشتِ انسانی میں صرف " معرفتِ الٰہی " ہی نہیں بلکہ کُل اسلام بصورت ایجاز ودیعت کیا گیا ہے۔ جس میں توحید سے لے کر پیشوایانِ الٰہی کی رہنمائی ، پیغمبر کے سچّے جانشین یہاں تک کہ فروعاتِ دین سب کچھ شامل ہے۔ نہج البلاغہ سے جناب امیرالمومنینؑ کا جو قول سطور بالا میں نقل کیا گیا ہے ، اُس کی اساس پر پیغمبروں کا فرض فطرتِ انسانی کی گرہ کُشائی ، خدا کی فراموش کردہ نعمتوں کو یاد دلانا ، انسان کی فطرت توحیدی کو بیدار کرنا اور نفسِ انسانی کے لاشعور میں معرفتِ الٰہی کے جو خزینے مخفی و مستور ہیں ، انھیں واشگاف کر کے حالتِ شعُور میں لاتا ہے۔

یہ نکتہ مستحقِ توجہ ہے کہ دُنیاوی زندگی میں انسان کو جو مشکلات ، تکالیف اور دردناک حادثات پیش آتے ہیں ، قرآن شریف

---

[۱] ، [۲] کافی ج ۲ صفحہ ۱۲ ۔ [۳] تفسیر جمع الجوامع از مرحوم طبرسی ذیل آیت موردِ بحث ۔

[۴] تفسیر نور الثقلین ، جلد ۴ صفحہ ۱۸۴ ۔

میں ان امور کا اس پہلو سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ انسان کے اندر حسِ مذہبی کو بیدار کرنے کے وسائل ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فاذا رکبوا فی الفلك دعوا الله مخلصین له الدین فلمّا نجاھم الی البر اذا ھم یشرکون ۰

جس وقت وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سمندر میں خطرات میں گھر جاتے ہیں تو بڑے خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں۔ مگر جب اُنھیں خدا سلامتی کے ساتھ خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر مُشرک ہو جاتے ہیں۔ (عنکبوت - ۶۵)

اس مضمون کے متعلق اسی سُورۃ کی (جو کہ سورۂ عنکبوت سے مشابہ ہے) آیاتِ مابعد کی تفسیر کرتے ہوئے اور باتوں کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

۳۳۔ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ

۳۴۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

۳۵۔ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ۝

۳۶۔ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ جس وقت لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے تو وُہ اپنے ربّ کو پُکارتے اور اس کی طرف رجُوع کرتے ہیں۔ پھر جب وہ اُنھیں اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے تو اُن میں سے ایک فریق اپنے پروردگار کی نسبت مُشرک ہو جاتا ہے۔

۳۴۔ (انہیں رہنے دو تاکہ) ہم نے اُن کو جو کچھ بخشا ہے اس کی ناشکر گزاری کریں اور (دُنیا کی زُود گُزر نعمتوں سے) فائدہ اُٹھالو مگر جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا (کہ تمہارے کُفران اور خُود غرضیوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے)۔

۳۵۔ کیا ہم نے اُن پر کوئی ایسی محکم دلیل نازل کی ہے جو اُنھیں شرک کرنا سکھاتی ہے اور اس کی توجیہ کرتی ہے؟

۳۶۔ اور جب ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وُہ اُس سے خوش ہو جاتے ہیں۔ اور جب اُن کے اعمال کے سبب اُنھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اچانک مایوس ہو جاتے ہیں۔

تفسیر

زیرِ نظر آیات میں سے پہلی آیت گزشتہ آیات کے مضمون پر استدلال اور تاکید ہے یعنی تصورِ توحید ایک فطری امر ہے اور مصائب اور شدائد کے وقت یہ نُورِ الٰہی دل میں چمکتا ہے۔ چنانچہ خداوندِ عالم فرماتا ہے: جب انسانوں کو کوئی ضرر پہنچتا ہے تو وُہ خُدا کو یاد کرتے ہیں اور اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں: (واذا مسّ النّاس ضرٌّ دعوا ربّهم منيبين اليه)۔

لیکن یہ لوگ اس قدر کم ظرف، کوتاہ فکر، اسیرِ تعصب اور اپنے بزرگوں کے ایسے اندھے مُقلِّد ہیں کہ جیسے ہی اُن کے اُوپر سے سخت حادثات گُزر جاتے ہیں اور نسیمِ راحت و آرام چلتی ہے اور خدا اُن پر اپنی طرف سے رحمت کی بارش کرتا ہے تو اُن میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے معاملے میں مُشرک ہو جاتا ہے: (ثمّ اذا اذاقهم منه رحمة اذا فريق منهم بربّهم يشركون)۔

اس مقام پر "مسّ النّاس ضرٌّ" سے مُراد معمولی تکلیف ہے۔

اسی طرح "اذا قهم منه رحمةً"

(جب وہ اپنی طرف سے رحمت چکھاتا ہے) سے بھی اشارہ نعمت کی مقدارِ قلیل ہے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر کلمہ "اذاق" (چکھانا) کا استعمال کسی شے کی مقدارِ قلیل کے لیے ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ کلمات "ضر" اور "رحمة" ہر دو اسم نکرہ استعمال ہوئے ہیں۔

اِس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب اُنھیں کوئی معمولی مشکل بھی پیش آتی ہے تو اُن کی فطرۃ توحید پر سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ مگر مختصر سی نعمت پاکر اُن کی راہ فکر مُتغیّر ہو جاتی ہے اور وہ غافل ہو جاتے ہیں اور سب کچھ بُھول جاتے ہیں۔

پہلی حالت کے متعلق بطورِ کُلیہ یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسانوں کا یہ حال ہے کہ وہ مشکلات کے وقت خدا کو یاد کرتے ہیں کیونکہ "فطرۃ توحیدی" کا وجود سب کے اندر یکساں ہے۔

لیکن ـــــ دُوسری صُورت (یعنی نعمت پاکر غافل ہو جانا) میں صرف اِن لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے راہِ شرک کو اختیار کیا ہے۔

کیونکہ دُنیا میں اس کے ایسے بندے بھی ہیں کہ راحت و زحمت ہر حال میں شکرِ خدا کرتے ہیں اور زندگی کے عارضی تغیّرات اُنھیں یادِ حق سے غافل نہیں کرتے۔

" منیبین الیه " کا مفہوم جیسا کہ ہم نے سابقاً ذکر کیا توجّہ طلب ہے۔ کیونکہ " انابة " مادّہ " نوب " سے بنا ہے۔ اِس کے معنی ہیں، کسی چیز کی طرف پھر لوٹ جانا۔ اس سے اس معنی کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انسان کی فطرت میں جذبہ توحید و خُدا پرستی بُنیادی طور پر موجود ہے اور شرک ایک عارضی صُورت ہے کہ انسان کسی وقت خدا سے اُمید منقطع کر لیتا ہے۔ مگر پھر خواہ نہ خواہ ایمان باللہ اور توحید کی طرف لوٹتا ہے۔

یہ امر توجّہ طلب ہے کہ آیت بالا میں " رحمت " کا انتساب خدا کی طرف ہے۔ لیکن " ضُر " یعنی زحمت و تکلیف کو اس کی طرف منسُوب نہیں کیا گیا۔ کیونکہ بہت سی سختیاں اور تکلیفیں خود ہمارے ہی اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ مگر تمام رحمتیں من جانب اللہ ہیں خواہ وہ عارضی ہوں یا مُستقل ہوں۔

اس آیت میں کلمہ " ربھم " دو بار آیا ہے۔ یہ اس حقیقت کی تاکید کے لیے ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اُس کی تدبیر کو اپنے نفس میں محسوس کرتا ہے بشرطیکہ غلط تعلیم و تربیّت اُس کا راستہ شرک کی طرف نہ موڑ دے۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ " اذاقھم منه " میں ضمیر " منه " کا مرجع ذاتِ الٰہی ہے۔ اِس سے اِس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ تمام نعمتیں اُسی کی طرف سے ہیں۔ بہت سے مفسّرین نے (مثلاً مصنّفین المیزان، تبیان، ابوالفتوح رازی) اِس ضمیر کا یہی مفہوم لیا ہے۔ اگرچہ بعض دیگر مفسّرین نے (جیسے کہ فخر رازی) اِس ضمیر کا مرجع " ضُر " بتایا ہے اور آیت کے یہ معنی سمجھے ہیں :-

" خدا جس وقت مضرت اور تکلیف کے بعد اُن کی طرف اپنی رحمت بھیجتا ہے۔ تو ایک گروہ مُشرک ہو جاتا ہے "۔

اگر آیت کا یہ مفہوم سمجھا جائے تو اس مقام پر حرف " من " بدلیت کے معنی دیتا ہے۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ آیت کے ظاہری معنی کے لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

⁂

اِس کے بعد کی آیت میں اُن کم ظرف مشرکین کی تنبیہ و تہدید کے لیے کہ جو نعماتِ الٰہی کے حصول کے بعد اللہ کو بھُول جاتے ہیں، فرمایا گیا ہے : اُنھیں ہماری نعمتوں کا انکار کرنے دو اور جو کچھ اُن کے اِمکان میں ہے اُنھیں کرنے دو۔ (لیکفروا بما اتیناھم)۔

جتنا بھی تمہارے اِمکان میں ہے اِس دُنیا کی زُود گزر نعمتوں سے فائدہ اُٹھا لو : (فتمتعوا)۔

مگر تم جلد ہی اپنے بُرے اعمال کا نتیجہ دیکھ لو گے : (فسوف تعلمون)[1]

---

[1] آیت ۳۴ : " لیکفروا " کی ابتداء میں لام " امر " کا ہے اور یہ امر تہدید کے لیے ہوتا ہے اور " تمتعوا " بھی دوسرا امر ہے۔ اس میں بھی تہدید کا پہلو موجود ہے۔ ہر چند کہ اوّل (یعنی " لیکفروا ") امر غائب کی صُورت میں ہے اور دوسرا (یعنی " تمتعوا ") امر حاضر کی صورت میں ہے۔ گویا کہ خدا نے مشرکین کو ابتداء میں غائب فرض کیا۔ اُس کے بعد تہدید شدید کے لیے اُنھیں حاضر قرار دے کر مخاطب کرتا ہے مگر بعض مفسّرین نے اِس لام کو لام عاقبت سمجھا ہے۔ یعنی آخر کار اُنھوں نے خدا کی نعمتوں کا انکار کیا۔ مگر پہلے معنی زیادہ موزوں ہیں۔

اگرچہ بظاہر آیت کے مُخاطب مُشرکین ہی ہیں۔ لیکن اگر آیت کا مفہوم وسیع ہو تو کچھ بعید نہیں کہ اس میں وہ سب لوگ شامل ہوں جو نعماتِ الٰہی سے فائدہ اور لُطف تو اُٹھاتے ہیں، مگر اِن نعمتوں کے مُنعم اور بخشنے والے کو بھُول جاتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ اس موقع پر فعل امر کا استعمال تہدید کے لیے ہے۔

⁂

آیت مابعد میں گروہ مشرکین کو قصُوروار ثابت کرنے کے لیے اُن کے خلاف سرزنش کو سوال کے پیرائے میں ادا کیا گیا ہے : کیا ہم نے اُن پر کوئی دلیل محکم نازل کی ہے، جو اُنھیں راہ شرک پر چلنے کی لفظاً ترغیب دیتی ہے۔ (ام انزلنا علیھم سُلطاناً فھو یتکلم بما کانوا به یشرکون)۔

کلمہ " ام " یہاں استفہام کے لیے ہے۔ یہ استفہام انکاری برائے توبیخ ہے۔

یعنی انسان راہ و رسم شرک کا اتباع یا تو ندائے فطرت کی وجہ سے کرتا ہے یا بحکم عقل، یا ہدایت الٰہی کی وجہ سے، اور یہ تینوں باتیں محال اور ناشدنی ہیں کیونکہ جب وہ مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اُن کی فطرت اصلیہ ظاہر ہوتی ہے اور وہ خدائے واحد کو پکارتی ہے۔ نیز عقل بھی انھیں سلامت روی کا مشورہ دیتی ہے کہ اُس کا سہارا تلاش کرو کہ جو " واھب النعم " ہے۔ (بدون احسان نعمتیں بخشنے والا ہے)۔

آخر میں حکم الٰہی کا معاملہ رہ جاتا ہے۔ سو اِس آیت میں اس کی بھی نفی کی گئی ہے کہ ہم نے اُنھیں ہرگز ایسا حکم نہیں دیا۔ اِس بنا پر اعتقاد شرک کے لیے اُن کے پاس کوئی قابلِ قبول بنیاد نہیں ہے !

کلمہ " سُلطان " کا معنی وہ شے ہے جو فتح مندی اور تسلط کا موجب ہو مگر اِس مقام پر یہ کلمہ ایسی دلیل کے لیے استعمال ہوا ہے جو محکم اور قلب کو مطمئن کرنے والی ہو۔

کلمہ " یتکلم " (یعنی کلام کرتی ہے) ایک مجازی اُسلوب ہے۔ جو کسی دلیل کے واضح ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی دلیل ہے جو انسان سے کلام کرتی ہے۔

بعض مفسّرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اِس مقام پر کلمہ " سلطان " کے معنی فرشتہ ہیں۔ اگر یہ معنی درست سمجھے جائیں تو " تکلم " کے مجازی نہیں بلکہ حقیقی معنی لیے جائیں گے یعنی ہم نے اُن کی طرف کوئی ایسا فرشتہ نہیں بھیجا جو شرک کا پیغام لے کر گیا ہو اور اِس موضوع پر اُس نے اُن سے گفتگو کی ہو۔

مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے۔

⁂

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت (۳۶) جس میں اِن (مُشرک) کم ظرف جُہلا کی طرزِ فکر اور نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے) کے الفاظ یہ ہیں کہ : ہم جس وقت لوگوں کو اپنی رحمت سے سرفراز کرتے ہیں تو وہ خوش اور مغرور ہو جاتے ہیں۔ مگر جب، اُنھوں نے جو اعمال انجام دیئے ہیں اُن کے نتیجے میں اُنھیں رنج اور تکلیف پہنچتی ہے تو وہ مایوس اور نا اُمید ہو جاتے ہیں :

(واذا اذقنا الناس رحمةً فرحوا بها وان تصبهم سيئة بما قدمت ايديهم اذا هم يقنطون) ۔

جب کہ راست باز مومنین وہ ہیں کہ نہ تو وہ نعمت و غناء کے وقت غرور و غفلت میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ مصیبت کے وقت اُن پر یاس و نا اُمیدی طاری ہوتی ہے ۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نعمت عطیۂ الٰہی ہے ۔ اِس لیے وہ اس کے لیے خدا کا شکر کرتے ہیں اور مصیبت کو وہ آزمائش و امتحان یا اپنے اعمال کا نتیجہ سمجھتے ہیں لہٰذا وہ صبر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہیں ۔ جب کہ بے ایمان لوگ " غرور" اور " یاس " کے درمیان بے قرار ہوتے ہیں تو با ایمان افراد " شکر اور صبر" کے درمیان مطمئن ہوتے ہیں ۔

اِس آیت سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ کم از کم اِنسان کو پیش آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں کا ایک حصہ اُس کے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور خدا اس ذریعے سے اُن کی اصلاح اور اُن معصیت سے پاک کر کے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے ۔

اِس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ جملہ " فرحوا بها " صرف نعمت پا کر شادمان ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ایسی خوشی مراد ہے جس میں ایک قسم کی مستی اور بے خبری بھی شامل ہو جیسے کہ اُن کم مایہ لوگوں کی حالت ہوتی ہے جن کے پاس اچانک دولت آ جائے ۔ دگرنہ ایسی خوشی اور مسرت جس میں شکرِ خدا اور توبہ الی اللہ بھی شامل ہو بُری چیز نہیں ہے بلکہ اُس کا تو حکم دیا گیا ہے ۔

قل بفضل الله و برحمته فبذالك فليفرحوا (یونس ۔ ۵۸) ۔

اِس کے بعد " بما قدمت ايديهم " کہہ کر گناہوں کو ہاتھوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اکثر کام ہاتھ ہی سے انجام دیتا ہے ۔ اگرچہ دل ، آنکھ اور زبان سے بھی گناہ ہوتے ہیں ۔ لیکن اُن اعمال کی کثرت ہے جو ہاتھوں سے کیے جاتے ہیں ۔ اِس لیے کلمہ " ايدی " کو منتخب کیا گیا ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت اور آیت ۳۳ کے مضمون میں تضاد نہیں ہے ؟

کیونکہ اِس آیت میں مُشرکین کی مایوسی کا ذکر اُس حالت میں ہے ، جب کہ وہ مصائب میں مُبتلا ہوں ۔ جب کہ آیت گزشتہ (۳۳) میں یہ بیان ہے کہ وہ سختیوں اور مشکلات کے وقت خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی کیفیت حال کا نتیجہ اُس آیت (۳۳) میں ذاتِ الٰہی سے اُمید و رجا ہے اور اس آیت میں مایوسی ہے ۔

لیکن اگر ایک نکتے پر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب مِل جاتا ہے ۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیت میں تمام زیاں رساں امور شامل ہیں مثلاً : طوفان ، زلزلہ یا اور قسم کی آفاتِ ارضی و سماوی کہ اُن کے نزول کے وقت عام آدمی خواہ وہ موحد ہوں یا مشرک خدا کو پکارتے ہیں اور یہ فطرتِ توحیدی کی ایک علامت ہے ۔

زیرِ بحث آیت میں یہ مذکور ہے کہ گناہوں کا انسان کے ضمیر پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے اور اُس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے کیونکہ بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن سے عملِ خیر سرزد ہوتا ہے تو مغرور ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی

سے محفوظ سمجھنے لگتے ہیں اور جب وہ کوئی عملِ بد انجام دیتے ہیں تو اُن کے جذبات اس کے برعکس ہوتے ہیں اور اُن پر سرتا سر رحمتِ خدا سے مایوسی چھا جاتی ہے ۔

جب کہ وہ عجب اور غرور بھی مذموم ہے اور رحمتِ خدا سے یہ یاس اور نا اُمیدی بھی نازیبا ہے ۔

اِس لیے دونوں آیات میں جو مضامین ادا کیے گئے ہیں وہ مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں ۔

۳۷۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ؀

۳۸۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀

۳۹۔ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ؀

۴۰۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؀

ترجمہ

۳۷۔ کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو فراخ اور تنگ کر دیتا ہے، بے شک اس میں ایماندار لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۳۸۔ پس تو قریبیوں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرتا رہ۔ یہ امر اُن لوگوں کے لیے

جو رضائے خدا کے طالب ہیں بہتر ہے اور ایسے ہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

۳۹۔ اور تم جو سُود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو خدا کے نزدیک اس میں افزائش نہیں ہوتی اور تم جو بطور زکوٰة ادا کرتے ہو اور صرف رضائے الٰہی کے طلب گار ہوتے ہو، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی دوگنا اُجر پانے والے ہیں۔

۴۰۔ خدا کی ذات ہی وُہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر رزق دیا۔ پھر وہ تمہیں مار دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ تم نے خدا کے لیے جو شریک قرار دیے ہیں، کیا اُن میں سے کوئی ایسا ہے کہ اِن کاموں میں سے کوئی کام کر سکے؛ اِس سے برتر و مُنزّہ ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیں۔

تفسیر

پہلی زیرِ بحث آیت میں بھی گزشتہ مقامات کی طرح "توحید ربوبیت" کا تذکرہ ہے۔ اور جیسا کہ آیات ماقبل میں آچکا ہے بعض کم ظرف لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ہم اُنھیں اپنی نعمتیں عطا کرتے ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور جب وہ کسی بلا یا مصیبت سے دوچار ہو جاتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے اِس آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ (اولم یروا انّ اللہ یبسط الرزق لمن یشآء و یقدر)۔

جب انسان نعمتوں سے غنی ہو جائے تو یہ حالت اُس کے لیے غرور، سرکشی اور یادِ الٰہی کی فراموشی کا باعث نہ ہو جائے اور سلبِ نعمات یاس اور نا اُمیدی کا باعث نہ ہو جائے کیونکہ: روزی کی وسعت اور تنگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی اس کی مصلحت فراخی میں ہوتی ہے اور کبھی تنگی میں۔

یہ درست ہے کہ یہ عالم عالمِ اسباب ہے، جو لوگ محنتی اور سخت کوش ہیں، عام طور پر وہ زیادہ کماتے ہیں اور خوش حال ہیں۔ بخلاف ازیں کاہل اور کم کوش لوگ عُسرت میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ نہایت لائق اور جدوجہد کرنے والے لوگ جتنی بھی زیادہ کوشش کرتے ہیں، کامیاب نہیں ہوتے۔ اس کے بالکل ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو کسبِ معاش میں بہت کوشش نہیں کرتے، مگر اُن کے لیے ہر طرف سے روزی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔

یہ مستثنیات اس لیے ہیں تاکہ خدا یہ بتا دے کہ اس عالمِ اسباب میں جو ترغیبات TEMPTATIONS ہیں ان کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ انسان عالمِ اسباب ہی میں گم ہو جائے۔ انسان کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کارخانے کی پُشت پر ایک قوی ہاتھ ہے جو اُسے چلا رہا ہے۔

اس عالمِ نیرنگ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی مقصد کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کر لے اور ہر دروازے پر دستک دے لے مگر اُس کے لیے ہر راستہ بند ہوتا ہے اور کبھی اُس کے لیے اتنی آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہنوز وہ کسی دروازے کے قریب بھی نہیں آتا کہ اُس کے لیے کُھل جاتا ہے۔

ہم اپنی زندگی میں اس قسم کے واقعات دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک شخص کو نعمت کا غرور ہے اور دُوسرا آدمی غربت اور افلاس کی وجہ سے مایوس ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارے ارادوں اور خواہشات کے پیچھے ایک قوی ہاتھ ہے جو کام کر رہا ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: ان معاملات میں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں خدا کی قدرت اور عظمت کی نشانیاں ہیں۔ (انّ فی ذالک لاٰیات لقوم یؤمنون)۔

بعض مفسّرین نے اس مضمون کی ایک حکایت بیان کی ہے:

کسی نے ایک عالم سے سوال کیا:

ماالدلیل علی ان للعالم صانعًا واحدًا

اس امر کی کیا دلیل ہے کہ اس عالم کا ایک صانع یکتا ہے؟

اُس عالم نے جواب دیا: تین دلیلیں ہیں۔

ذل اللبیب، وفقر الادیب، وسقم الطبیب

اوّل یہ کہ اہلِ خرد و حکمت دُنیا میں ذلیل ہیں۔

دوم یہ کہ اہلِ علم و ادب فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔

سوم یہ کہ طبیب بھی بیمار ہوتے ہیں۔[1]

بے شک ان مستثنیات کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ چارۂ کار کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔

چنانچہ امیرالمومنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث مروی ہے:

عرفت اللّٰہ سُبحانہٗ بفسخ العزائم وحل العقود ونقض الھمم

مَیں نے اپنے خدا کو اس بات سے پہچانا کہ عزائمِ محکم فسخ ہو جاتے ہیں اور کبھی گرہیں کُھل جاتی ہیں اور کبھی قوی ارادے ٹوٹ جاتے ہیں اور ناکام ہو جاتے ہیں۔[2]

اور چونکہ ہر نعمتِ الٰہی اپنے ساتھ ذمّہ داریاں اور فرائض بھی لاتی ہے۔ اس لیے آیت مابعد میں رُوئے سخن پیغمبرؐ کی

[1] تفسیر رُوح البیان، جلد ۷ صفحہ ۴۹ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۲۵۰۔

طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب کہ ایسا ہے تو تم اپنے اعزّا و اقارب کا حق ادا کرو۔ اسی طرح مسکینوں اور مسافروں کی مدد کرو (فاٰت ذاالقربٰی حقه والمسکین وابن السّبیل)۔

جب تمہارا رزق وسیع ہو تو یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ بلا شرکتِ غیرے تمہارا ہی ہے۔ بلکہ تمہارے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہیں۔ اُن میں سے تمہارے اعزّا ہیں اور وہ حاجت مند لوگ ہیں جو شدّتِ فقر سے ناتوان ہو گئے ہیں، اسی طرح وہ آبرومند لوگ ہیں جو وطن سے دُور حالتِ مسافرت میں حادثات پیش آنے کی وجہ سے محتاج ہو کر سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔

کلمہ "حقہ" سے اس واقعیت کا اظہار مقصود ہے کہ مذکورہ بالا لوگ انسان کے مال و دولت میں شریک ہیں۔ اگر انسان انہیں کچھ بطورِ امداد دیتا ہے تو درحقیقت وہ اُن کا حق ادا کر رہا ہے اور اُن پر کچھ احسان نہیں کر رہا۔

مفسّرین کی ایک جماعت نے اس آیت کا مخاطب خصوصیّت سے جنابِ رسالت مآب اور اُن کے اعزّا و اقارب ہی کو سمجھا ہے۔

جناب ابوسعید خدری اور دوسرے اصحاب سے ایک مشہور روایت میں یہ نقل ہوا ہے:

جس وقت یہ آیہ نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے "فدک" جناب فاطمہؑ کو بخش دیا۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں:

لما نزلت ھٰذہ الاٰیة علی النبیؐ اعطی فاطمة فدکًا وسلمه الیها[1]

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے بھی اس مضمون کو بعینہٖ بیان کیا ہے[2]۔ امام جعفر صادقؑ کی زبانی ایک روایت ہے جس میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت ابوبکر کے درمیان ہوئی تھی، اُس میں یہ مضمون نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔[3]

مگر مفسّرین کی ایک اور جماعت نے اس آیت میں خطاب کے عمومی معنٰی مُراد لیے ہیں۔ جس میں جنابِ رسول اللہؐ اور اُن کے علاوہ سب لوگ شامل ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اعزّا و اقارب کے حق کو فراموش نہ کرے۔

مگر ان دونوں تفاسیر میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ دونوں قابلِ تسلیم اور اپنے مقام پر درست ہیں۔ بایں وجہ کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے اور جنابِ پیغمبرؐ، اُن کے اقربا، بالخصوص جنابِ فاطمہ زہراؑ اُس کی مصداقِ کامل ہیں۔

یہ امر واضح ہے کہ مذکورہ بالا تفاسیر میں سے کوئی بھی اِس آیت کے مکّی ہونے کی تردید نہیں کرتی۔ کیونکہ آیت کا مفہوم جامع ہے جس پر مکہ میں بھی عمل ہو سکتا تھا اور مدینہ میں بھی یہاں تک کہ جنابِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو اس آیت کی اساس پر فدک کی جاگیر عطا کرنا کاملاً قابلِ قبول ہے۔

[1] و [2] تفسیر مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] نورالثقلین، جلد ۴ صفحہ ۱۸۶ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

اس مقام پر صرف جملہ " لما نزلت هـذه الاٰية " کے مفہوم کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے۔

جناب ابوسعید خدری کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فدک کی جاگیر جنابِ فاطمہؑ کو اِس آیت کے نازل ہونے کے بعد عطا کی لیکن اگر اس مقام پر (لَمّا) کے معنٰی علّت کے لیے جائیں تو نہ کہ زمانۂ خاص کے لیے تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے اور روایت کا یہ مفہوم ہو جائے گا کہ:

پیغمبرؐ نے خدا کے اِس حکم کے مطابق فدک جنابِ فاطمہؑ کو عطا کر دیا۔

علاوہ ازیں بعض آیات کبھی دو دفعہ بھی نازل ہوئی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر قسم کے مستحق اور نیازمند افراد میں سے صرف اِن تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہی کیوں ہوا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اِس وجہ سے ہو کہ اِن تین قسم کے افراد کی اہمیت زیادہ ہے۔ کیونکہ رشتہ داروں کا حق تو سب سے فائق ہے اور محروم اور حاجت مند لوگوں میں سے مساکین اور راہِ سفر میں درماندہ لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

فخر رازی نے اِس سوال کی توجیہ میں ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ آٹھ قسم کے لوگ جنہیں زکوٰۃ کی رقم دینی چاہیئے، اُنھیں اسی صُورت میں دی جا سکتی ہے جب کہ صاحبِ مال پر ادائے زکوٰۃ واجب ہو۔ مگر آیت میں جن تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے، ہر حالت میں اُن کی مدد کرنا لازم ہے۔ کیونکہ بعض رشتہ دار تو واجب النفقہ ہوتے ہیں اور " مسکین " وہ محروم فقیر ہے کہ اگر اُس کی مدد نہ کی جائے تو اکثر اوقات اُس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ کوئی مسافر ایسے حالات میں گرفتار ہو کہ مدد نہ پہنچنے کی صُورت میں اُس کی جان پر بَن جائے۔ علاوہ بریں آیت میں اِن تین قسم کے لوگوں کا جس ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے وہ اُن کے رُتبہ کی اہمیت کی مناسبت سے ہے۔

بہرحال آیت کے اخیر میں نیکوکار لوگوں کی تشویق اور ضمناً اِس بخشش کی شرطِ قبولیت کے طور پر فرمایا گیا ہے: یہ کام اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو صرف رضائے الٰہی کے طالب ہیں۔ (ذالك خيرٌ للذين يريدون وجه الله)۔

اور جو لوگ کہ ایسے کارہائے خیر انجام دیتے ہیں وہ نجات یافتہ ہیں۔ (واولٰئك هـم المفلحون)۔ وہ اِس جہان میں نجات یافتہ ہوں گے۔ کیونکہ " انفاق " دُنیاوی زندگی میں ایسی عجیب برکات کا مُوجب ہوتا ہے اور آخرت میں خدا کی ترازو میں اِنفاق وزنی ترین اعمال میں سے ہوگا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت بالا میں کلمہ " وجه الله " سے خدا کی جسمانی صُورت مراد نہیں ہے کیونکہ وہ صورت جسمانی نہیں رکھتا بلکہ اِس کلمہ سے مُراد خدا کی ذات ہے۔

اِس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف انفاق اور رشتہ داروں اور دیگر صاحبانِ حقوق کا حق ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ اخلاص اور پاک نیّت کے ساتھ ہو۔ اُس میں کسی قسم کی ریاکاری اور خُودنمائی نہ ہو اور نہ احسان و تحقیر کا جذبہ ہو۔ دینے والا کسی قسم کے بدلے کا منتظر بھی نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مفسّرین کے قول کے خلاف جنھوں نے یہ لکھا ہے کہ داخلِ بہشت ہونے کے لیے " انفاق " " وجه الله " کا مصداق نہیں ہے، حقیقت امر یہ ہے کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے اُس کا

کسی نہ کسی طرح خدا سے کچھ تعلق ہوتا ہے۔ وہ کام خواہ اس کی رضا کے لیے ہو یا حصولِ اجر و ثواب یا اُس کے عذاب سے نجات پانے کے لیے ہو۔ یہ سب کام وجہ اللہ ہیں۔ اگرچہ انسان کے لیے مرحلہ عالی و کامل یہ ہے کہ ہر کام کرتے وقت اُس کی نظر میں خدا کی عبودیت اور اطاعت کے سوا کوئی اور مقصد نہ ہو۔

آیت مابعد میں اُس بحث کی مناسبت سے جو انفاقِ خالص کے متعلق جاری تھی، اِنفاق کی دو صُورتوں کا ذکر ہے۔ اوّل تو وہ انفاق ہے جو محض لوجه الله کیا جائے اور دوسرے وہ جو حصولِ مالِ دُنیا کے لیے کیا جائے۔ اِس سلسلے میں خدا فرماتا ہے: تم جو مال اِس مقصد سے خرچ کرتے ہو کہ اُس سے افزائش ہو اور لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو جائے تو خدا کے نزدیک اُس میں کچھ اضافہ نہ ہوگا۔ البتہ تم جو بطورِ زکوٰۃ صرف رضائے الٰہی کے لیے دیتے ہو، اس قسم کے لوگ کئی گنا اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ (وما اٰتيتم من ربًا ليربوا في اموال الناس فلا يربوا عند الله وما اٰتيتم من زكاة تريدون وجه الله فاولٰئك هـم المضعفون)۔

اِس آیت میں جملۂ دوم کا مفہوم " یعنی زکوٰۃ دینا اور راہِ خدا میں اِنفاق کرنا اجر و ثواب کثیر کا موجب ہے " واضح ہے لیکن جملۂ اول کے مفہوم کی کہ " ربا " درحقیقت بمعنی افزائش ہے۔ مفسّرین نے گوناگوں تفاسیر کی ہیں۔

اُن میں سے پہلی تفسیر جو سب سے زیادہ واضح اور آیت کے مفہوم سے ہم آہنگ تر، اور اُن روایات سے ہم ساز ہے جو اہلِ بیتؑ سے منقول ہیں، یہ ہے کہ اس مقام پر " ربا " سے مراد وہ تحائف ہیں جو بعض لوگ دوسروں کے لیے بالخصوص صاحبانِ دولت و ثروت کے لیے لے جاتے ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن اہلِ دولت سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر منفعت حاصل کریں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ اُمراء کو جو ہدیے پیش کیے جاتے ہیں اُنھیں مستحقِ امداد سمجھ کر تو نہیں پیش کیے جاتے اور نہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ حاجت مند ہیں اس لیے پہلے ان کی مدد کرنی چاہیئے بلکہ مدِّ نظر یہ ہوتا ہے کہ یہ ہدیہ ایسی جگہ دیا جائے جہاں سے زرِ کثیر حاصل ہو سکے۔ یہ فطری امر ہے کہ اس طور کے تحائف جن میں شائبہ اخلاص نہیں ہوتا، اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اُن کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اس بنا پر اس آیت میں " ربا " سے مراد ہدیہ اور عطیہ ہی ہے اور جملہ " ليربوا في اموال النّاس " کا مفہوم لوگوں سے زیادہ فائدہ اُٹھانا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ اِس قسم کا فائدہ حاصل کرنا حرام تو نہیں ہے کیونکہ اِس معاملے میں (ہدیہ دینے اور لینے والے کے درمیان) کوئی شرط اور قرارداد نہیں ہوتی مگر اخلاقاً اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے متعدد احادیث میں مروی ہے کہ اس ربا سے مراد " ربائے حلال " ہے۔ بمقابلہ ربائے حرام " کیونکہ اُس میں شرط و قرار داد ہوتی ہے۔

آیت بالا کی تفسیر میں ایک حدیث کتاب تہذیب الاحکام میں امام جعفر صادقؑ سے یوں منقول ہے:

هو هديتك الى الرجل تطلب منه الثواب افضل منها فذالك ربًا يؤكل۔

اگر کسی کو ہدیہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم اُس آدمی سے زیادہ منفعت حاصل کرو تو یہ ربائے حلال ہے۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے ایک اور حدیث یوں منقول ہے:

الرّبا ربابان احدهما حلال، والاٰخر حرام، فامّا الحلال فهو ان يقرض الرجل اخاهُ قرضاً يريد ان يزيده ويعوضه باكثر مما يأخذه بلا شرط بينهما، فان اعطاه اكثر ممّا اخذه على غير شرطٍ بينهما فهو مباحٌ لهٗ وليس له عندالله ثوابٌ فيما اقرضه، وهو قوله فلا يربوا عندالله، وامّا الحرام فالرجل يقرض قرضاً ويشترط ان يرد اكثر ممّا اخذه فهذا هوالحرام۔

"ربا" دو طرح کا ہے۔ ایک حلال اور دوسرا حرام۔ حلال وہ ہے کہ انسان اپنے کسی مسلمان بھائی کو اس اُمید پر قرض دے کہ جب وہ یہ رقم واپس دے گا تو اصل پر کچھ اضافہ کر دے گا۔ مگر قرض دہندہ اور مقروض کے درمیان اس قسم کی کوئی شرط نہ ہو۔ اس صُورت میں اگر قرض لینے والا غیر مشروط طور پر اصل زر پر کچھ اضافہ کرکے واپس کرتا ہے تو فاضل رقم قرض دہندہ کے لیے حلال ہے۔ لیکن اس صُورت میں اُسے وہ ثواب نہیں ملے گا جو ایک مُسلمان بھائی کی بوقت ضرورت مدد کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ آیۂ قرآنی " فلا یربوا عندالله " کا یہی مفہوم ہے۔ مگر — حرام ربا وہ ہے کہ انسان کسی کو اس شرط پر قرض دے کہ وہ اصل زر پر اتنی رقم اضافہ کرکے واپس کرے گا۔ یہ "ربا" حرام ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے کہ یہاں "ربا" سے مراد ربائے حرام ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مفہوم قرآنی یہ ہے کہ "ربا" اور مخلصانہ انفاق میں موازنہ و مقابلہ کیا جائے۔ وہ یہ کہ "ربا" اگرچہ بظاہر افزائش مال کا موجب ہے مگر یہ افزائش خدا کے نزدیک بے قدر ہے۔ حقیقی قدر و منزلت انفاق فی سبیل اللہ کی ہے۔ ان مطالب کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آیت کو حرمت سُود کے مسئلے کی تمہید یا مقدمہ سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبرؐ کی ہجرت سے قبل وہ صرف ایک اخلاقی نصیحت کے طور پر بیان ہوا تھا۔ مگر ہجرت کے بعد قرآن کی تین سُورتوں (سورہ بقرہ، آل عمران و نساء) میں بتدریج اُس کی حُرمت بیان ہوئی ہے۔ (اسی بنا پر ہم نے بھی تفسیر نمونہ کی جلد اوّل صفحہ ۶۲۹، (اُردو ترجمہ) پر اس کا ذکر کیا ہے)۔

لیکن ان دو معانی میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ البتہ آیت مذکور کی تفسیر ایسے وسیع معنی میں کی جا سکتی ہے کہ جس میں ربائے حلال اور ربائے حرام ہر دو شامل ہیں اور یہ دونوں " انفاق فی سبیل اللہ " کے مقابلے میں رکھے جا سکیں لیکن آیت

کے الفاظ پر نظر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تفسیر اوّل ہی زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا کام کیا گیا ہے جس کا کوئی ثواب تو نہیں مگر وہ مباح ہے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک اس عمل کی پاداش نہیں ہے۔ اس کلام کی رُوح سے روشن ہے کہ یہ ربائے حلال ہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے، جس میں نہ کوئی ثواب ہے نہ گناہ اور اس میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو خدا کے خشم و غضب کا باعث ہو۔ روایاتِ اسلامی میں اس قسم کے معاملات کی مثالیں موجود ہیں۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ آیت میں جو کلمہ " مضعفون " استعمال ہوا ہے، اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن اس مقام پر " مضاعف کنندہ یعنی بڑھانے والا " کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اُس فرد کے معنی میں ہے جو مضاعف اور کئی گنا اجر پانے والا ہے۔ کیونکہ زبانِ عربی میں بعض اوقات اسم فاعل " مالکِ شے " کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے " موسر " وہ شخص جس کے پاس مال بکثرت ہو۔

یہ امر بھی نظر سے پس پردہ نہ رہے کہ کلمہ " ضعف و مضاعف " عربی زبان میں صرف دو چند کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دوگنا کے علاوہ کئی گنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے اور لبند آیت کم از کم دس گنا مفہوم ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

من جآء بالحسنة فلهٗ عشر امثالها (انعام — ۱۶۰)

اور یہ اجر بصورت قرض اٹھارہ گنا تک ملتا ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

على باب الجنّة مكتوب القرض بثمانية عشر والصدقة بعشر

بہشت کے دروازے پر تحریر ہے کہ قرض کا اجر اٹھارہ گنا ہے اور صدقے کا دس گنا ہے[1]

اور یہ اجر انفاق فی سبیل اللہ کی صورت میں سات سو گنا تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ سے یہ ثابت ہے۔

⁂

زیر بحث آخری آیت میں بار دیگر مبدأ و معاد کا ذکر ہے جو کہ اس سورہ کی بہت سی آیات کا بُنیادی موضوع ہے۔ اس آیت میں خدا کو چار اوصاف سے مُتصف کیا گیا ہے تاکہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات ہو اور وقوعِ معاد پر بھی دلیل قائم ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا ہی کی وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اُس کے بعد تمہارے لیے رزق مہیا کیا۔ پھر تمہیں وہ مار دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ (الله الّذی خلقکم ثمّ رزقکم ثمّ یمیتکم ثمّ یحییکم)۔ جن کو تم نے خدا کا شریک قرار دیا ہے کیا اُن میں سے کسی میں بھی یہ قدرت ہے کہ وہ یہ کام کرسکے: (هل من شرکائکم من یفعل من ذالکم من شیءٍ؟)۔

[1] نور الثقلین، جلد ۴، صفحہ ۱۹۰۔

خدا کی ذات اُن شرکا سے جو تم اُس کے لیے تجویز کرتے ہو منزہ اور برتر ہے: (سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون).

یہ امرِ مسلّم ہے کہ مشرکین میں سے کسی کا بھی یہ اعتقاد نہ تھا کہ فاعلِ تخلیق بُت ہیں، یا یہ کہ اُنھیں رزق پہنچانا بتوں کے اختیار میں ہے یا اُن کی حیات و مرگ کے مختار وہ ہیں کیونکہ وہ اُن خود ساختہ معبودوں کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ اور شفاعت کنندہ سمجھتے تھے، نہ کہ خالقِ آسمان و زمین اور نہ روزی دہندہ۔ اس لیے قرآن میں یہ سوالات استفہام انکاری ہیں اور سوالات کی رُوح جواب میں نفی کی متقاضی ہے۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس عہد کے مشرکین جن سے یہ خطاب ہے وہ حیات بعد الموت کے معتقد نہ تھے تو پھر قرآن کی اس آیت میں خدا کی تین صفات بیان کرکے حیات بعد الموت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

ممکن ہے کہ یہ اُسلوب بیان اس وجہ سے ہو کہ (ہم نے مسئلہ معاد کی بحثوں میں ثابت کیا ہے) معاد اور حیات بعد از مرگ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے قرآن نے اُن مشرکین کے معتقدات کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ فطرتِ انسانی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

علاوہ بریں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ماہر خطیب جب کسی ایسے شخص سے ہم کلام ہوتا ہے جو کسی مسئلے کا منکر ہو تو وہ اثباتِ حق کے لیے اُس مسئلے کو دوسرے ایسے حقائق کے ساتھ ملا کر ذکر کرتا ہے جو مدِ مقابل کے لیے قابلِ قبول ہوتے ہیں اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا نفس اثر پذیری کے لیے آمادہ ہو چکا ہے تو پھر وہ اُس اثبات طلب مسئلے پر قاطعیت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ تاکہ وہ مخاطب کے ذہن نشین ہو جائے اور اُس سے انکار بن نہ پڑے۔

ان سب اُمور کے علاوہ خدا کی اُس قدرتِ خلاقی میں جس نے بار اوّل زندگی بخشی ہے اور اُس اختیار میں جس سے وہ بعد از مرگ زندگی عطا کرے گا ناقابلِ انقطاع تعلق ہے اور اسی منطقی رابطے کی وجہ سے دونوں زندگیوں کا ایک ہی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔

بہرحال قرآن کہتا ہے: جب کہ (تخلیق، رزق، حیات و موت) یہ جُملہ اُمور خدا کے اختیار میں ہیں تو عبادت و پرستش بھی صرف اُسی کی ہونی چاہیئے

نیز "سُبحانہٗ و تعالیٰ عما یشرکون" سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اُن مشرکین نے ذاتِ احدیت کے مرتبے کو غیر معمولی طور پر اُس کے مقامِ ارفع سے نیچے گرا دیا تھا اور اس ذات کو اپنے خُود ساختہ معبودوں کی صف میں جگہ دے دی تھی۔

۴۱۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○

۴۲۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ○

۴۳۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ○

۴۴۔ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ○

۴۵۔ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ○

ترجمہ

۴۱۔ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اُنھیں اُن کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے۔ شاید کہ وہ خُدا کی طرف رجوع کریں۔

۴۲۔ ان سے کہہ دو: زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو تم سے

پہلے تھے۔ اُن میں سے اکثر مشرک تھے۔

۴۳۔ تم اس دن سے پہلے جو خدا کی طرف سے آکر رہے گا اور [illegible] سے کوئی روک نہیں سکتا اپنا رُخ مستقیم اور پائیدار دین کی طرف کیے رہو۔ اور [illegible] روز لوگ مختلف جماعتوں میں بٹ جائیں گے۔

۴۴۔ جس شخص نے کفر کیا اُس کا کفر اسی کے لیے زیاں [illegible] اور جو لوگ کہ اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں وہ (خدا کے اجر و ثواب کو) اپنے [illegible] کے لیے مہیا کرتے ہیں۔

۴۵۔ یہ اس لیے ہے تاکہ خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے [illegible] عمالِ صالح انجام دیتے ہیں اپنے فضل سے جزا دے۔ یقیناً وہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

لوگوں کے اعمال ہی سرچشمۂ فساد ہیں:

گزشتہ آیات میں شرک کا ذکر تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ مفاسد کی جڑ توحید [illegible] اور شرک اختیار کرنا ہے۔ اس لیے زیرِ نظر آیات میں اوّل یہ کہا گیا ہے کہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں خشکی [illegible] فساد ظاہر ہو گیا ہے۔ (ظھر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی الناس)۔

خدا چاہتا ہے کہ لوگ اپنے اعمال کا ردِّ عمل دیکھیں اور جو کام اُنھوں نے [illegible] سے بعض کا نتیجہ چکھیں۔ (اس طرح) شاید اُن کی آنکھیں کھلیں اور اللہ کی طرف رجوع ہوں: (لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون)۔

یہ آیت فساد اور گناہ کے باہمی ربط کے متعلق ایک وسیع معنیٰ کی حامل [illegible] کے گناہ اور بداعمالیوں کا یہ نتیجہ نہ تو سرزمینِ مکّہ و حجاز کے لیے مخصوص ہے اور نہ عصرِ پیغمبرؐ کے لیے [illegible] میں "قضیہ حقیقیہ" ہے جس میں محمول کا موضوع سے ربط و تعلق بیان کیا جاتا ہے۔

بالفاظِ دیگر۔ زمین پر جہاں بھی فساد ظاہر ہوتا ہے، وہ لوگوں کی بداعمالیوں [illegible] ہے۔ اگر انسان غور کرے تو اس نتیجے میں بھی تربیت کا ایک پہلو ہے تاکہ لوگ اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ دیکھ کر [illegible] اور خدا کی طرف رجوع کریں۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت کا پس منظر وہ قحط اور خشک سالی ہے جو پیغمبر کی بددعا کے نتیجے میں [illegible] مکّہ کو پیش آئی تھی۔ اُس وقت بارش ہونا بند ہو گئی تھی، بیابان خشک سے خشک تر ہو گئے تھے یہاں تک کہ اُنھیں بحیرۂ احمر میں مچھلی کا شکار بھی نہیں ملتا تھا۔

بالفرض اگر یہ واقعہ تاریخی طور پہ صحیح بھی ہو، تب بھی ایک جزوی واقعہ ہے جس پر آیت صادق آتی ہے اور یہ واقعہ اس آیت کو کسی مخصوص قوم یا جماعت کے فساد و گناہ تک محدود نہیں کرتا، نہ اس کا مصداق کسی خاص زمان و مکان تک ہے اور نہ اِمساکِ باران اور خشک سالی تک محدود ہے۔

اِس آیت کے متعلق جو نقطۂ نگاہ ہم نے سطورِ بالا میں بیان کیا ہے اُس سے آشکار ہے کہ اِس آیت کی تفسیر کے تحت اہلِ قلم نے [illegible] محدود اور مقامی واقعات کو اِس کا مصداق قرار دیا ہے وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض مفسرین نے زمین پر فساد ("فساد فی البر") سے مُراد قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل مراد لیا ہے اور سمندر میں فساد (فساد فی البحر) سے وہ واقعہ مراد لیا ہے جو حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ میں ہوا کہ ایک بادشاہ نے ملاحوں کی کشتیاں ضبط کر لی تھیں۔

یا یہ کہ بعض مفسرین نے "فساد فی الارض و فساد فی البحر" کے معنیٰ لکھتے ہوئے بانیانِ فساد کا ذکر کر دیا ہے اور ایسے حکمران مراد لیے ہیں جو اپنی اغراض کے لیے زمین اور سمندر کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔

اِس مقام پر یہ امکان ہے کہ اِس قسم کے افراد موجبِ فساد ہوں، جو دنیا پرست اور خوشامد پسند ہوں اور اُن کے زور کی وجہ سے لوگ اُن کی اطاعت اور فرماں برداری کی ذلّت کو قبول کر لیں۔

لیکن حقیقتِ امر یہ ہے کہ آیت کا احاطۂ مصداق اتنا محدود نہیں ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے "فساد فی البحر" کے معنیٰ میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اُن میں سے بعض کا یہ قول ہے کہ "بحر" سے مُراد وہ شہر ہیں۔ جو سمندر کے کنارے واقع ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ "بحر" سے مُراد حاصل خیز، پُرباغ و زراعت کے علاقے ہیں۔ ہمارے نزدیک کلمہ "بحر" کے معنیٰ میں یہ تکلّفات بلا دلیل ہیں کیونکہ اس کلمہ کے معنیٰ مشہور ہیں۔ "بحر" سمندر کو کہتے ہیں۔ سمندروں میں کئی طرح سے فساد رُونما ہو سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ سمندر سے جو فوائد پہنچتے ہیں وہ کم ہو جائیں، دُوم یہ کہ اُس کے طوفان و تلاطم سے نقصان پہنچے۔ سوم یہ کہ سمندری لڑائیاں ہوں جیسا کہ آج کل جنگی بحری بیڑے لڑتے ہیں۔ آبدوزیں ہیں جو تباہی لاتی ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے:

حیات دواب البحر بالمطر فاذا کف المطر ظھر الفساد فی البحر والبر و ذالک اذا کثرت الذنوب والمعاصی۔

سمندر میں رہنے والی مخلوق کی زندگی کا مدار بارش پر ہے۔ جب بارش نہیں ہوتی سمندر اور خشکی دونوں میں فساد برپا ہو جاتا ہے اور یہ اُس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کے گناہ کثیر ہو جاتے ہیں۔[1]

[1] تفسیر قمی طبق نقل تفسیر المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۲۱۰

حدیث مذکورہ بالا میں سمندری حیوانات کی زندگی کا جو ربط نزول باراں سے بیان کیا گیا ہے وہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جب بارش کم ہوتی ہے تو سمندر میں مچھلیوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے بعض ساحل نشینوں کو کہتے سُنا ہے کہ :۔

سمندر کو بارش کا فائدہ صحرا سے زیادہ پہنچتا ہے۔

یہ امر کہ برّ و بحر میں فساد رُونما ہونے کا انسانوں کے گناہوں سے کیا ربط ہے، ہمارے پاس اِس کی اور توجیہات بھی ہیں۔ جن کا اِن شاء اللہ نکات کی بحث میں ذکر آئے گا۔

٭

آیت مابعد میں زمین پر سیر کا حکم بایں مصلحت دیا گیا ہے کہ قوموں کے ارتکاب گناہ کی وجہ سے زمین پر ظہورِ فساد سے جو نتائج رُونما ہوئے اُس کے شواہد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اِس ضمن میں پیغمبرِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے کہہ دو : تم زمین میں سفر کرو اور گزشتہ اُمّتوں کے حالات کی تحقیق کرو اور اُن کے اعمال اور اُن کے نتائج کی تفتیش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تم سے پہلے جو قومیں ان مقامات میں آباد تھیں اور شرک و انکار پر مُصر تھیں اُن کا انجام کیا ہوا :
(قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة الذین من قبل کان اکثرھم مشرکین)۔

اُن کے ویران شدہ قصور و محلّات کو بہ نظرِ عبرت دیکھو اور دیکھو کہ اُنھوں نے جو خزانے جمع کیے تھے وہ لُٹ چکے ہیں۔ مشاہدہ کرو کہ اُن کی وہ جماعت جسے اپنی قوت اور توانائی پر ناز تھا پراگندہ ہوگئی ہے اور دیکھو کہ اُن کی قبریں ٹوٹ پھوٹ کر ویران ہوگئی ہیں اور اُن کی ہڈیاں گل سڑ گئی ہیں۔

ذرا دیکھو اور غور کرو کہ اُن قوموں کے شرک اور ظلم و ستم کا انجام کیا ہوا۔ جائے عبرت ہے کہ اگر وہ پرندوں کے آشیانے جلاتے تھے تو اِن صیادوں کے گھر بھی کیسے برباد ہوئے ہیں۔

"البتہ اُن میں سے اکثر افراد مُشرک تھے": (کان اکثرھم مشرکین) اور یہ شرک اُم الفساد اور اُن کی تباہی کا باعث ہُوا۔

اِس مقام پر یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیات ماقبل میں جہاں خدا کی نعمتوں کا ذکر تھا اُس وقت ترتیب یہ تھی کہ پہلے انسان کی تخلیق کو بیان کیا، پھر اُسے روزی دینے کا ذکر کیا: (اللہ الذی خلقکم ثم رزقکم) مگر آیات زیرِ نظر میں جب خدا کے عذاب و سزا کا ذکر ہو رہا ہے تو پہلی تنبیہ یہ ہے کہ خدا قوموں کے گناہوں کی سزا میں پہلے تو اُن سے اپنی نعمتیں سلب کر لیتا ہے۔ اُس کے بعد اُن کے شرک کی وجہ سے اُنھیں ہلاک اور نابود کر دیتا ہے۔

یہ ترتیب بایں معنی ہے کہ نعمتِ الٰہی کی پہلی منزل تخلیق ہے اُس کے بعد اپنے بندوں کو روزی رسانی ہے مگر جب وہ اپنی بخشش کو واپس لیتا ہے تو پہلے اُن سے وہ نعمات جو وجہِ حیات ہیں سلب کر لیتا ہے۔ اُس کے بعد اُن سرکش اور گمراہ اقوام کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اِس آیت میں "اکثرھم مشرکین" کہا گیا ہے۔ اِن الفاظ کی وجہ یہ ہے کہ یہ سُورہ مکّی ہے اور اُس

زمانے میں مسلمان بحیثیت تعداد و شمار اقلیت میں تھے۔ اس لیے اکثرھم مشرکین کہہ کر مُسلمانوں میں یہ اطمینانِ قلب پیدا کرنا مقصود تھا کہ مشرکین کی کثرت سے ہراساں نہ ہوں۔ کیونکہ خدا نے گزشتہ زمانوں میں ان جیسے مشرکین کی بڑی بڑی جماعتوں کو تباہ و نابود کر دیا ہے۔ نیز اِن الفاظ میں اُس عہد کے اہلِ طغیان کے لیے تنبیہ بھی ہے کہ جاؤ زمین میں چل کر دیکھو کہ تمہاری ہم مسلک ماقبل قوموں کا کیا انجام ہوا۔

٭

چونکہ نصیحت حاصل کرنا، خوابِ غفلت سے بیدار ہونا اور پھر خدا کی طرف رجوع کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے آیت مابعد میں خدا پیمبرِ اکرمؐ کی طرف رُوئے سخن کر کے یہ فرماتا ہے : تم اپنا رُخ مستقیم اور پائیدار دین (وہ دین جو توحیدِ خالص کی تعلیم دیتا ہے) کی طرف کیے رہو، اُس دن کے آنے سے قبل جسے ارادۂ الٰہی سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ خدا کا پروگرام مُعطّل ہو سکتا ہے۔ اُس روز لوگ پراگندہ اور گروہ در گروہ ہو جائیں گے۔ ایک گروہ بہشت میں اور دوسرا گروہ دوزخ میں جائے گا: (فاقم وجھك للدین القیم من قبل ان یأتی یوم لا مرد له من الله یومئذ یصدعون)[1]

اِس آیت میں دین کی صفت "قیّم" بیان کی گئی ہے۔ "قیّم" کے معنی ثابت اور استوار کے ہیں۔

لہٰذا "فاقم وجھك للدین القیم" جملۂ تاکیدی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ چونکہ آئینِ اسلام اہلِ عالم کے نظامِ حیات کو استوار اور اُن کی مادّی اور رُوحانی حوائج کو پورا کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس سے منحرف نہ ہونا۔

نیز یہ کہ آیت کے مخاطب جنابِ رسالت مآبؐ ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبرؐ کو یہ تاکید ہے تو دوسرے سمجھ لیں کہ پھر اُن کی کیا حیثیت ہے۔

نیز یہ کہ آیتِ فوق میں کلمہ "یصدعون" استعمال ہوا ہے۔ یہ فعل مضارع ہے جس کا مادّہ "صدع" ہے جس کے وضعی معنیٰ برتن کو توڑنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کلمہ ہر قسم کی پراگندگی اور تفرقہ کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا۔

اِس آیت میں اِس کلمہ کا مفہوم یہ ہے کہ بروزِ قیامت اہلِ بہشت اور مستحق النار لوگوں کے گروہ الگ الگ ہو جائیں گے۔ پھر اِن دونوں جماعتوں کی بھی بہشت کے اور دوزخ کے درجات کے لحاظ سے درجہ بندی ہو جائے گی۔

اِس کے بعد آنے والی آیت میں اس امر کی تشریح ہے کہ بروزِ قیامت لوگ کس طرح جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : جس نے کفر کیا اس کا نقصان خود اُسی کو پہنچے گا: (من کفر فعلیه کفره)۔

---

[1] آیت کے جز "لا مرد له من الله" میں کلمہ "مرد" مصدر میمی ہے مگر اس جگہ بمعنی اسم فاعل استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس کے یہ معنی ہوں گے "لا راد له من الله" اس مقام پر ضمیر "له" کا مرجع "یوم" ہے لہٰذا اجمالاً جملے کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص بھی خدا کو اُس دن کے برپا کرنے سے روک نہیں سکتا۔ یعنی خدا کو بروزِ قیامت کوئی بھی دادرسی، اعمال کی جزا و سزا دینے سے روک نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو خدا ہی اپنے وعدہ سے پھرنے والا ہے کہ اُس روز حساب کو موقوف کر دے اور نہ کسی غیر ہی میں یہ طاقت ہے۔ پس اُس روز کا آنا حتمی ہے۔ (غور کیجئے گا)

لیکن وہ لوگ جو اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں، وہ اِن اعمال کے ذریعے اجرِ الٰہی کو اپنے لیے مہیا کرتے ہیں:
(ومن عمل صالحاً فلانفسھم یمھدون) ۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ " یمھدون " کا مادہ " مھد " (بروزنِ عہد) ہے ۔ یہ اسم ہے۔ گہوارہ اور جھولے کو یا شیر خوار بچہ کے سُلانے کی جگہ کو کہتے ہیں ۔

بعدازاں اس کے معنیٰ وسیع ہوگئے اور مھد و مھاد ہر آرام دہ اور آسائش بخش جگہ کے معنیٰ میں استعمال ہونے لگا۔ اسی جہت سے مومنین صالح اور اہلِ بہشت کے لیے یہ کلمہ استعمال کیا گیا ہے۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ انسان یہ گمان نہ کرے کہ اُس کے ایمان وکُفر یا اعمالِ زشت وزیبا کا خدا پر کچھ اثر ہوتا ہے ۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے اعمالِ صالح سے شاد و خوشنود اور اعمالِ سیۂ سے غمگین ہوتا اور تکلیف اُٹھاتا ہے ۔

٭ ٭ ٭

یہ امر توجہ طلب ہے کہ جہاں کفار کا ذکر ہے ، جملہ " من کفر فعلیہ کفرہٗ " پر ہی اکتفا کی گئی ہے لیکن جب اہلِ ایمان کا ذکر آتا ہے تو آیت مابعد میں بالوضاحت یہ بیان ہے کہ اُنھیں صرف بوزن اعمال ہی جزا نہیں مِلے گی بلکہ خدا اُنھیں ایسی نعمات کثیر عطا فرمائے گا جو اُس کے فضل وکرم کے شایانِ شان ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ خدا اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں اپنے فضل وکرم سے جزائے خیر دے گا: (لیجزی الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات من فضلہ) ۔

یہ امر مسلم ہے کہ خدا کے اِس فضل سے کفار مستفید نہ ہوسکیں گے۔ کیونکہ خدا کفار کو دوست نہیں رکھتا: (انہٗ لا یحب الکافرین) ۔

بہرکیف یہ امر بدیہی ہے کہ خدا عادل ہے اِس لیے وہ کفار اور مشرکین کے ساتھ بھی عدل کے ساتھ سلوک کرے گا۔ اور اُنھیں اتنی ہی سزا مِلے گی جتنی کے وہ مستحق ہیں۔ مگر وہ خدا کے فضل اور اس کی نعمات سے محروم رہیں گے۔

چند اہم نکات

۱۔ گناہ و فساد کا باہمی ربط : انسان سے جو بداخلاقی یا بداعمالی بھی سرزد ہوتی ہے اُس کا معاشرے کی حالت پر اور اس ذریعے سے افراد کی حالت پر اثر پڑتا ہے اور یہ اثر معاشرے کے اجتماعی نظام میں فساد کا باعث ہوتا ہے ۔

اخلاقی گناہ ، بداعمالی اور قانون شکنی غیر صحت بخش اور مسموم غذا کی مانند ہے جس کا انسان کے نظامِ جسمانی پر مُضر اثر پڑتا ہے اور اُس کے ردِ عمل سے کسالتِ صحت میں مُبتلا ہوجاتا ہے ۔ مثلاً :

دروغ گوئی سے انسان کا اعتماد جاتا رہتا ہے ۔

امانت میں خیانت سے معاشرتی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں ۔ آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اِس سے انسان

میں استبداد اور خودسری کا مادّہ پیدا ہوجاتا ہے جو آخرکار رنگ لاتا ہے۔ انسان اپنے فرض کو فراموش کردیتا ہے اور کمزوروں اور زیر دستوں کے حقوق سلب کرتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں لوگوں کے دلوں میں اُس کے خلاف کینہ اور عداوت کے جذبات اُبھرتے ہیں اور جس معاشرے میں ہرطرف کینہ اور عداوت مسلط ہو اُس کی بُنیاد متزلزل ہو جاتی ہے ۔

خلاصہ تحریر یہ ہے کہ : ہر بدعملی خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اُس کا ردِ عمل معاشرہ اور فرد دونوں کے حق میں مُضر ہوتا ہے۔ اِسی لیے آیت " ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس " کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے۔ (" گناہ اور فساد میں یہی فطری ربط ہے ") ۔

لیکن اِسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو مذکورہ بالا مضرتوں کے علاوہ ایسے زیاں آور اثرات کا سلسلہ بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں کہ نگاہِ ظاہر بیں یہ پہچان بھی نہیں ہوسکتی کہ اُن اثرات کا گناہوں سے کیا ربط ہے ۔

مثلاً : روایات میں مذکور ہے کہ " قطع رحم " عمر کو کوتاہ کردیتا ہے ۔ مالِ حرام کھانا قلب کو سیاہ اور زناکاری اور فحاشی کا چلن انسانوں کی فنا کا باعث ہوتا ہے اور روزی کو کم کر دیتا ہے ۔[1]

اِس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاٰجال

جو لوگ بسبب گناہ مرتے ہیں اُن کا شمار اُن سے زیادہ ہے جو طبعی موت سے مرتے ہیں ۔[2]

قرآن شریف میں ایک اور مقام پر اس مضمون کو ایک اور پہلو سے بیان کیا گیا ہے :

ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولٰکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون

اگر وہ لوگ جو شہروں اور آبادیوں میں بستے ہیں ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی برکات کھول دیتے ۔ لیکن اُنھوں نے تو ہماری آیات کی تکذیب کی تو ہم نے بھی اُنھیں اُن کے اعمال کی سزا دی ۔ (اعراف ۹۶)

زیرِ بحث آیت میں کلمہ " فساد " میں مفاسد اجتماعی ، بلائیں اور سلب برکات ، تمام چیزیں شامل ہیں ۔ اس مقام پر ایک اور نکتہ قابلِ توجہ ہے ۔ وہ یہ کہ زیرِ بحث آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آفات اور بلاؤں کے نزول سے

---

[1] رسول اللہؐ سے ایک حدیث منقول ہے کہ :

زنا کی چھ سزائیں ہیں جن میں سے تین دنیا میں ملتی ہیں اور تین آخرت میں۔ دُنیاوی سزائیں یہ ہیں کہ انسان سے نورانیت سلب ہو جاتی ہے اُسے موت جلد آجاتی ہے [illegible] اس کی روزی منقطع ہو جاتی ہے اور آخرت کی سزائیں یہ ہیں کہ اس سے حساب میں سختی ہوگی، اُس پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ (سفینۃ البحار مادہ زنیٰ)

[2] سفینۃ البحار (مادہ ذنب)

انسانوں کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح کہ وہ جب اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھیں گے تو خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے اور تقویٰ و طہارت اختیار کریں گے۔

ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ جملہ آفات و مصائب اسی قسم کے ہیں۔ لیکن اُن میں کچھ اس قسم کے فلسفے کے حامل ہیں۔

البتہ ان کے دیگر پہلو بھی ہیں جن کے بارے میں ہم نے متعلقہ مقام پر بحث کی ہے[1]

۲۔ زمین پر سیاحت میں پوشیدہ حکمتیں : قرآن مجید میں زمین پر سیاحت کا چھ مقام پر ذکر ہے اور وہ ہے سورہ آلِ عمران، انعام، نحل، نمل، عنکبوت اور سورۂ رُوم میں۔

ان میں ایک مقام پر یعنی سورۂ عنکبوت کی آیہ بیس میں تو انسانوں کو سیاحت کا اس لیے حکم دیا گیا ہے تا کہ وہ اُن اسرار و رموز کا مشاہدہ کریں جو اللہ کی مخلوقات میں پنہاں ہیں۔

اور دیگر پانچ مقامات پر یہ ہدایت اس لیے کی گئی ہے تا کہ لوگ دُنیا کی جابر، ستم شعار اور عصیاں کوش اقوام کے دردناک اور بلا زدہ انجام کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔

انسانوں کی رُوحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے قرآن میں خصوصیت سے کائنات کی محسوسات و ملموسات کا ذکر کیا گیا ہے قرآن مسلمانوں کو خصوصاً یہ حکم دیتا ہے کہ اپنی زندگی کے محدود دائرے سے باہر نکل کے اس وسیع دُنیا کی سیر و سیاحت کریں۔ وہ دوسری قوموں کے اعمال، اسلوبِ حیات اور رفتارِ زندگی کو دیکھیں اور اس پر بھی غور کر کے عبرت حاصل کریں کہ اقوام و ملل کی کج رفتاری اور عصیاں کوشی کا انجام کیا ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں شیطانی طاقتوں (طاقتور اقوام) نے اپنے نفع اندوزی کے دامنِ حرص کو پھیلانے کے لیے دُنیا کی تمام اقوام، تمام ممالک اور زمین کے ہر حصّے کی تحقیق کی ہے اور اُن کی تہذیب و تمدّن، مادّی ذرائع، صنعت و حرفت اور عسکری صنعت و قوّت غرض ہر پہلو سے تفتیش کی ہے اور پھر اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

قرآن یہ درس دیتا ہے کہ ان جبّار اور خُون آشام قوموں کے بجائے (اے مسلمانو!) تم زمین پر پھیل جاؤ اور اُن کے شیطانی منصوبوں کے بجائے رحمانی درس حاصل کرو۔

دوسروں کی زندگی سے عبرت حاصل کرنا شخصی تجربے سے زیادہ اہم اور زیادہ قدر رکھتا ہے۔ کیونکہ شخصی تجربہ تو نقصان اُٹھا کر ہی حاصل ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کی زندگی سے زیان و نقصان برداشت کیے بغیر عبرت حاصل ہوتی ہے۔

زمین پر سیاحت کے بارے میں قرآن کا حکم عین اُن اصولوں کے مطابق ہے جو آج کل علمائے علم الانسان نے اختیار کیے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کتاب میں اصولی مسائل پڑھانے کے بعد طلبا کو سیاحت کے لیے لے جاتے ہیں تا کہ وہ بچشم خُود مطالعہ کریں۔

البتہ آج کل ایک اور قسم کی سیاحت کا رواج ہوا ہے۔ اس کا نام ٹُورزم TOURISM رکھا ہے۔ اِس سیاحت کا

---

[1] آفریدگارِ جہان — بحث آفات بلاء۔

رواج شیطانی تہذیب کی مالک قوموں کی طرف سے کسبِ دولت اور ثروتِ حرام کمانے کے لیے ہوا ہے۔ اُن کے زیادہ مقاصد غیر اخلاقی ہوتے ہیں۔ مثلاً نازیبا و ناشائستہ ثقافت کی ترویج، عیاشی، ہوس رانی، عادات کی بے لگامی اور دوسرے ناشائستہ مشاغل۔ اس قسم کی سیاحت تباہ کُن ہے۔

اِس کے برخلاف اسلام اُس قسم کی سیاحت کا حامی ہے جس کا مقصد صحت مند تہذیب کی اشاعت، تجربات سے باہمی استفادہ، جہانِ انسانیت میں اسرارِ تخلیق کی جستجو، عالمِ طبیعی کی تحقیق اور فاسد و ستمگر اقوام کے دردناک انجام سے عبرت حاصل کرنا ہو۔

اس مقام پر اس نکتے کا ذکر بے محل نہیں ہے کہ اسلام میں ایک اور قسم کی "سیاحت" اور جہاں گردی کی مذمت جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے :

لا سیاحة فی الاسلام

اسلام میں سیاحت نہیں ہے[1]

اس حدیث کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے کہ جو تمام عمر یا زندگی کے ایک حصّے کے لیے معاشرتی زندگی سے منقطع ہو جاتے تھے اور کوئی حاصل خیز مشغلہ اختیار نہ کرتے تھے۔ بلکہ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ مارے مارے پھرتے تھے راہبوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرے پر بوجھ بنے رہتے تھے۔

بہ الفاظ دیگر یہ لوگ "راہبانِ سیّار" تھے۔ اُن راہبوں کے بالعکس جو گرجوں میں مقیم رہ کر معاشرتی تعلقات ترک کرکے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جنہیں "راہبانِ ثابت" کہا جا سکتا ہے۔ مگر اسلام ایک عملی دین ہے وہ رہبانیت اور ترک دنیا کا مخالف ہے۔ اس لیے وہ اِس قسم کی سیاحت کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

۳۔ دینِ قیّم اور آئینِ محکم : زیرِ بحث آیات میں پیغمبر اکرمؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کُلی توجہ اُس آئین کی طرف رکھیں جو مستقیم، محکم اور استوار ہے۔ اور جس میں کسی قسم کی کج روی اور راہِ راست سے منحرف ہونے کا احتمال نہیں ہے نیز اُس کی بُنیادیں غیر متزلزل ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیات میں "دین" کے اور اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً : سُورۂ یونس کی آیہ ۱۰۵ میں دین کو کلمۂ "حنیف" سے متصف کیا گیا ہے۔ (یعنی وہ دین جس میں کسی قسم کی کج روی نہیں ہے

---

[1] مجمع البحرین تحت مادّہ سیح۔

رسول اللہؐ سے ایک اور حدیث منقول ہے :

سیاحة امتی الغزو والجهاد

یعنی اگر میری اُمّت مادّی زندگی سے منہ موڑنا چاہتی ہے تو پھر کیوں جہاد کی طرف نہ جاتے اور کیوں بیابانوں میں فضول مرتی پھرے۔

سورہ زمر کی آیت ۳ میں اُسے "خالص" کہا گیا ہے۔

الا للّٰہ الدّین الخالص

سورہ نحل کی آیت ۵۲ میں کلمہ "واصب" استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں وہ آئین جو تغیّر ناپذیر اور فنا و زوال سے بری ہے: (ولہ الدّین واصبًا)۔

سورہ حج کی آیت ۷۸ میں اسلام کو ایسا آئین بتایا گیا ہے۔ جس میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں ہے:

وما جعل علیکم فی الدّین من حرج

اِن صفاتِ مذکورہ میں سے ہر صفت جسمِ اسلام کا ایک پہلو ہے۔ یہ تمام پہلو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

اِس لیے تتبع کے لیے ایسے ہی دین کو منتخب کرنا چاہیئے اور اُس کی تعلیمات کی تحصیل میں سعی کرنی چاہیئے اور اُس کے تحفظ میں جان لڑا دینی چاہیئے۔

۴۔ روزِ قیامت ٹل نہیں سکتا: آیاتِ مذکورہ بالا میں روزِ قیامت کے متعلق یہ ذکر آیا ہے کہ "یومٌ لا مردّ لہ من اللّٰہ" وہ ایسا دن ہے کہ خدا کو اس کے برپا کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ اس کے عمل وقوع میں کوئی حائل ہوسکتا ہے۔ اور نہ کسی میں یہ قدرت ہوگی کہ اُس روز کے محاسبے سے فرار ہوکر پھر دنیا میں آجائے۔

قرآن کی دُوسری آیات میں بھی روزِ قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ شوریٰ آیت ۴۴ میں مذکور ہے کہ:

جب ظالم خدا کے دردناک عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے:

ھل الیٰ مردّ من سبیل

کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم پھر دُنیا کی طرف لوٹ جائیں؟

اسی طرح سورہ شوریٰ کی آیت ۴۷ میں قیامت کی تعریف میں "یوم لا مردّ لہٗ من اللّٰہ" کہا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمِ ہستی میں انسان متعدد مراحل سے گزرتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مرحلہ مابعد سے مرحلہ ماقبل کی طرف عود کر جائے، نہ صرف انسان بلکہ جملہ کائنات کے لیے، یہ خدا کی تخلّف ناپذیر سنت ہے۔

مثلاً: ایک بچّہ جو شکمِ مادر سے عالمِ وجود میں آیا ہے خواہ وہ باعتبارِ ترکیب جسمانی کامل ہو یا ناقص، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ پھر بصورتِ جنین واپس لوٹ جائے؟ یا وہ میوہ جو شاخِ درخت سے ٹوٹ کر گر گیا ہے، خواہ پختہ ہو یا خام، کیا وہ پھر واپس ہوکر اسی شاخ سے متوصل ہوسکتا ہے؟

انسان کا اِس جہانِ فانی سے اُس جہانِ باقی کی طرف منتقل ہونا بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی یہاں سے انتقال کے بعد پھر کسی طرح بھی اس کی بازگشت نہیں ہوسکتی اور یہی وہ حقیقت ہے کہ انسان اس پر غور کرے تو وہ لرزہ براندام ہوجاتا ہے اور یہی حقیقت اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہے۔

۴۶۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

۴۷۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

۴۸۔ اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝

۴۹۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ۝

۵۰۔ فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

ترجمہ

۴۶۔ اس کی (عظمت و قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دہندہ بنا کر بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت کے لُطف سے آشنا کرے (اور سیراب کرے) اور اسی کے حکم سے کشتیاں چلیں۔ تم اس کے فضل سے استفادہ کرو ممکن ہے کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

۴۷۔ ہم نے تم سے پہلے اُن کی قوم کی طرف رسُول بھیجے۔ وُہ اُن کے پاس ہماری روشن دلیلیں لے کر گئے (مگر جب پند و نصائح نے کوئی فائدہ نہ بخشا تو) ہم نے مجرمین سے انتقام لیا (اور ہم نے مومنین کی مدد کی) اور مومنین کی مدد کرنا ہم پر ہمیشہ فرض ہے۔

۴۸۔ وہ خدا ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں پھر انہیں آسمان کی وسعت میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور پھر اُنہیں تہ در تہ کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن بادلوں کے بیچ میں سے بارش کے قطرے گرنے لگتے ہیں۔ جب خدا (اس حیات بخش بارش کو) اپنے بندوں میں جنہیں وہ چاہتا ہے، اُن پر برساتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

۴۹۔ ہر چند کہ وہ اس سے قبل کہ اُن پر بارش نازل ہو، مایوس تھے۔

۵۰۔ رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو کہ وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد کس طرح زندہ کر دیتا ہے (اور وہی ذات (جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا، بروز قیامت) مُردوں کو زندہ کرے گی اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

تفسیر

خدا کے آثارِ رحمت کو دیکھو:

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں دلائل توحید باری تعالیٰ کا قابلِ لحاظ حصہ سات آیتوں میں بیان ہوا ہے۔ اُن میں سے ہر آیت "ومن آیاتہ" کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ان آیات میں سے چھ پر صفحاتِ ما قبل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اب آخر میں ہم سب سے آخری ساتویں آیت پر غور کرتے ہیں۔

آیت ما قبل الذکر میں ایمان اور عمل صالح کا بیان تھا۔ دلائل توحید بھی اس سلسلے میں برائے تاکید ہوں گے۔

خداوند کریم فرماتا ہے کہ: خدا کی عظمت و قدرت کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہواؤں کو بشارت دہندہ بنا کر بھیجتا ہے۔ (ومن آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات)۔

وہ ہوائیں بارش کے جلو میں حرکت کرتی ہیں، بادل کے ٹکڑوں کو گھیر کر لاتی ہیں اور باہم پیوست کرتی ہیں۔ پھر انہیں خشک اور پیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ بادل صفحہ آسمان پر چھا جاتے ہیں اور فضا کا درجہ حرارت تبدیل ہو جاتا ہے پھر بارش ہونے لگتی ہے۔

ممکن ہے کہ شہروں میں رہنے والے امیر لوگوں کے لیے بشارت دہندہ ہواؤں کی پیش قدمی زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن بیاباں گرد تشنہ کام لوگ جو قطراتِ باراں کے منتظر اور نیازمند رہتے ہیں اُن کی ذہنی کیفیت مختلف ہے۔

جیسے ہی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور بادلوں کو اپنے ہمراہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ اور دوسرے مقامات کی نباتات پر جو بارش ہو چکی ہے، اس کی خوشبو اپنے ساتھ لاتی ہیں تو اُن ساکنانِ بیاباں کے دل میں برقِ اُمید چمکنے لگتی ہے۔

اگرچہ آیاتِ قرآنی میں ہواؤں کے عمل بشارت کو اکثر مقامات پر محض نزولِ باراں سے مختص کیا گیا ہے۔ لیکن کلمہ "مبشرات" کو صرف ان ہی معانی میں محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہوائیں اپنے ساتھ دیگر خوش خبریاں بھی لاتی ہیں۔

مثلاً، ہوائیں ــــ فضا کی گرمی اور سردی کو معتدل کر دیتی ہیں۔

ہوائیں ــــ فضا میں پھیلے ہوئے تعفن کو وسیع فضا میں بکھیر کر فضا کو صاف کر دیتی ہیں۔

ہوائیں ــــ سورج کی تپش کو کم کر دیتی ہیں اور نباتات کو شدتِ حرارت سے جلنے سے محفوظ رکھتی ہیں۔

علاوہ بریں درختوں سے جو آکسیجن گیس خارج ہوتی ہے، ہوا اُسے انسانوں تک سوغات کی صورت میں پہنچاتی ہے۔ اور ــــ انسان اپنی سانس سے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج کرتے ہیں اسے نباتات کی خوراک بنا دیتی ہے۔

ہوائیں بہت سی نباتات میں مادۂ تولید کو داخل کرتی ہیں۔ یعنی نر و مادہ کے نطفوں کو باہم مخلول کر دیتی ہیں۔

ہوائیں چکیاں چلاتی ہیں اور کاشتکار اُن کے وسیلے سے گندم کو بھوسے سے صاف کرتے ہیں۔

ہوائیں قدرتی نباتات کے بیجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑا کے لے جاتی ہیں اور اُنھیں بیابانوں میں پھیلا دیتی ہیں۔

ہوائیں ـــ بادبانی کشتیوں کو مسافروں اور بارِگراں سمیت ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتی ہیں ۔ ـــ یہاں تک کہ اس زمانے میں جب کہ بحری جہاز مشینی ذرائع سے چلنے لگے ہیں، جہازوں کی رفتار پر بادِ شُرط یا بادِ مخالف کا اثر پڑتا ہے ۔

دریں صُورت ہوائیں مختلف جہات سے انسان کے لیے بشارت آور ہیں ۔
آیت کے آخری الفاظ یہ ہیں : خدا چاہتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کا ذائقہ چکھائے اور یہ کہ کشتیاں اُسی کے حکم سے چلیں اور تم اُس کے فضل سے بہرہ یاب ہو سکو۔ ہے کہ اس طرح تم اُس کا شکر ادا کرو ۔(ولیذیقکم من رحمتہ ولتجری الفلک بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون) ۔
ہوائیں مویشیوں کی پرورش اور کاشتکاری کے لیے گوناں گوں نعمات کا باعث ہیں ۔ نیز وہ حمل و نقل کا وسیلہ بھی ہیں نتیجۃً تجارتی امور میں پیش رفت کا سبب بنتی ہیں ۔ قرآن میں ان فوائد کی طرف تین جملوں سے اشارہ کیا گیا ہے :

اوّل : لیذیقکم من رحمتہ
دوم : لتجری الفلک بامرہ
سوم : لتبتغوا من فضلہ

توجہ طلب یہ امر ہے کہ یہ سب برکات اُس وقت نمودار ہوتی ہیں جب ہوا کرۂ زمین پر حرکت کرتی ہے ۔
مگر انسان کسی نعمت کی بھی اُس وقت تک قدر نہیں کرتا جب تک وہ اس سے سلب نہ ہو جائے ۔ جب تک ہوا بند نہیں ہو جاتی تو اُس وقت تک انسان کو شعور نہیں ہوتا کہ اُس پر کون سی نعمت نازل ہو رہی ہے ۔ اگر انسان خوبصورت ترین باغ میں بھی بیٹھا ہو اور ہوا چلنی بند ہو جائے تو وہ جگہ اُس کے لیے نمونۂ زنداں بن جاتی ہے ۔ اور اگر قید خانے میں بھی نسیم جاں بخش چلے تو وہ جگہ راحت بخش ہو جاتی ہے ۔ قید خانے میں تکلیف کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہاں تازہ ہوا کا گزر نہیں ہوتا ۔
اگر سمندروں کی سطح پر ہوا بند ہو جائے اور تموّجِ بحر ساکت ہو جائے تو سمندری مخلوق کی زندگی آکسیجن کی کمی کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے ۔ اور سمندر ایک گندے پانی کا تالاب بن جائے ۔
فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ "ولیذیقکم من رحمتہ " میں نکتہ یہ ہے کہ چکھائی تھوڑی سی چیز جاتی ہے ۔ جس سے مُراد یہ ہے کہ خدا کے نزدیک یہ تمام دنیا اور اس کی نعمتیں نہایت قلیل ہیں اور خدا کی رحمت واسعہ دوسری دُنیا کے لیے مخصوص ہے ۔

۞ ۞ ۞

اِس کے بعد کی آیت میں پیمبرانِ الٰہی کی بعثت کا ذکر ہے ۔ مگر آیت ۴۸ میں پھر ہواؤں کے چلنے کا بیان آجاتا ہے ۔ ممکن ہے کہ آیت ۴۷ کا ایسی دو آیات کے درمیان واقع ہونا جن میں ہواؤں کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے ، محض جملہ معترضہ کے طور پر ہو ۔ جیسا کہ اس کے متعلق بعض مفسّرین کی بھی یہی رائے ہے ۔
علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے کہ اِن مباحث کے ساتھ مسئلہ نبوّت کا ذکر مبدأ و معاد کے مسائل کی تکمیل کے نقطۂ نظر

سے ہو ۔ جن کا اس سُورہ میں مکرر ذکر ہوا ہے (جیسا کہ بعض دیگر مفسّرین کی رائے بھی ہے) ۔
نیز یہ امکان بھی ہے کہ یہ ذکر اُن لوگوں کی تنبیہ کے لیے ہو جو خدا کی نعمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہوئے بھی کفرانِ نعمت کرتے ہیں ۔

بہر حال آیت نمبر ۴۷ میں فرمایا گیا ہے : ہم نے تم سے پہلے بھی اُن کی قوم کی طرف رسول بھیجے ۔ (ولقد ارسلنا من قبلک رسلاً الیٰ قومھم) ۔
اور یہ رسول اُن اقوام کے پاس معجزات اور روشن و آشکار عقلی دلائل لے کر آئے ۔ (فجاءوھم بالبیّنات) ۔
اُن اقوام میں سے ایک جماعت تو ایمان لائی اور ایک گروہ مخالفت پر آمادہ ہو گیا ۔ لیکن جب اِن کفار پر پند و نصائح اور تنبیہات کا کچھ اثر نہ ہوا تو پھر ہم نے مجرموں سے انتقام لیا ۔(فانتقمنا من الّذین اجرموا) ۔
مگر ہم نے مومنین کی مدد کی اور مومنین کی مدد کرنے کا فرض ہم پر ہمیشہ عائد ہوتا ہے ۔(وکان حقاً علینا نصر المؤمنین) ۔

جملہ بالا میں کلمہ "کان " استعمال ہوا ہے جو اس سُنّتِ الٰہی کے محکم ہونے کی علامت ہے ۔ اس کے بعد کلمہ "حق " استعمال ہوا ہے اور پھر " علینا " جو کہ حق کی توضیح کرتا ہے ۔ کلمات کی یہ ترتیب درحقیقت اِس موضوع کے لیے پے در پے تاکیدات ہیں ۔
ترتیب الفاظ میں "حقاً علینا "ـ نصر المؤمنین " پر مُقدّم ہے ۔ جو حصر کی دلیل ہے اور تاکید موکّدہ ہے ۔ اِس مقام پر حصر و تاکید سے مراد یہ ہے کہ بطورِ مُسلّم ہم نے مومنین کی مدد کرنا اپنا فرض قرار دیا ہے اور مومنین کے لیے کسی اور کی مدد کی احتیاج کے بغیر ہم اپنے وعدے کو عملی جامہ پہنائیں گے ۔
یہ جملہ ضمنی طور پر اُن مُسلمانوں کی دلجوئی اور تسلّی کے لیے ہے جو اُس زمانے میں کفارِ مکّہ کی ایذا رسانیوں کے تحت سخت مبتلائے مصائب تھے ۔ یہ کفار تعداد اور وسائل میں بہت آگے تھے ۔
اگر نفسیاتی نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دُشمنانِ خدا کا گناہ و عصیان میں مبتلا ہونا ہی مومنین کی فتح و نصرت کی دلیل ہے ۔ کیونکہ یہی گناہ اور انحراف ازراہِ راست بطور کیفرِ کردار اُن کفار کے وجود کا استیصال کر دے گا یعنی اُن کا گناہ ہی اُن کی نابودی کے اسباب مہیا کر دے گا اور اُن پر خدا کا عذاب نازل ہو گا ۔

۞ ۞ ۞

اس کے بعد آیت ۴۸ میں پھر ہوا چلنے کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے ۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے : وہ خدا ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لائیں ۔(اللہ الذی یرسل الریاح فتثیر سحابًا) ۔
پھر وہ بادلوں کو آسمان کی وسعت میں اپنی مصلحت کے مطابق پھیلا دیتا ہے ۔(فیبسطہٗ فی السّمآء کیف یشآء) ۔
پھر اُن بادلوں کے ٹکڑوں کو مجتمع کر کے تہ بہ تہ کر دیتا ہے ۔(ویجعلہٗ کسفاً)[1]

[1] کسف جمع کسفہ (بروزنِ جملہ) بمعنی قطعہ اس مقام پر بادل کے وہ ٹکڑے مُراد ہیں جو تہ در تہ ہوتے ہیں ۔ جن کی وجہ سے بادل بھاری ہو کر برسنے لگتا ہے ۔

تم دیکھتے ہو کہ اس بادل کے ہجوم میں سے قطرات باراں خارج ہوتے ہیں: (فتری الودق یخرج من
خلالہ)[1]

قدرت نے نزول باراں کے لیے ہوا کو ایک پورا منصوبہ سونپ دیا ہے۔ اس پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ سمندر سے
بادلوں کے ٹکڑوں کو خشک اور پیاسی زمین کی طرف لاتی ہے۔ پھر انھیں صفحۂ آسمان پر پھیلا دیتی ہے۔ بعدازاں اُن کو الگ
الگ تہ در تہ جمع کر دیتی ہے۔ پھر بادلوں کے اطراف کے ماحول کو سرد کرکے بادلوں کو برسنے کے قابل بنا دیتی ہے۔
بادلوں کی مثال تجربہ کار "چوپانوں" کی سی ہے کہ وہ جنگل میں چرنے والی بھیڑوں کو اِدھر اُدھر سے جمع کرتے ہیں۔
پھر انھیں معین راستے پر ہانکتے ہیں پھر باڑے میں لاکر اُن کا دُودھ دوہتے ہیں۔

جملہ — فتری الودق یخرج من خلالہ
جس کے معنی یہ ہیں کہ "تو بارش کے خرد ترین قطرات کو دیکھتا ہے جو گھنگور گھٹا سے برستے ہیں۔"
ممکن ہے کہ اِس بیان سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہو کہ بادلوں کا حجم اور ہوا کی شدتِ حرکت اس حد تک نہیں ہے
کہ وہ قطرات باراں کو ٹپکنے اور زمین پر آنے سے روک لیں۔ بلکہ پانی کے یہ چھوٹے چھوٹے ذرات اُس طوفان اَبر و باد کے
باوجود جس نے فضائے آسمان کو گھیر رکھا ہے، زمین پر آنے کے لیے اپنا راستہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قطرات باراں پیاسی زمین
پر آہستہ آہستہ اس طرح گرتے ہیں کہ زمین سیراب ہو جاتی ہے اور کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچتا۔
ہوا کا وہ طوفان جو بڑے بڑے درختوں کو اکھاڑ پھینکتا اور پہاڑوں کی چٹانوں کو ہلا دیتا ہے، وہ بارش کے لطیف اور
ننھے ذرات کو اپنے درمیان سے گزرنے دیتا ہے تاکہ وہ زمین تک پہنچ جائیں۔
اِس مقام پر یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ جب آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو آنکھ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ
یہ الگ الگ ٹکڑے ہیں۔ لیکن — جس وقت ہم ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں کے بیچ میں سے گزرتے ہیں یا اُن
کے اُوپر پہنچ جاتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اِن کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔
آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا اس حیات بخش بارش کو اُن بندوں تک پہنچاتا ہے جنھیں وہ یہ نعمت بخشنا چاہتا ہے
تو وہ خوش ہو جاتے ہیں: (فاذا اصاب بہ من یشآء من عبادہ اذا ہم یستبشرون)۔

ہر چند کہ وہ لوگ نزولِ باراں سے قبل مایوس اور ناامید تھے: (وان کانوا من قبل ان ینزل علیھم
من قبلہ لمبلسین)[2]

اس مایوسی اور اس بشارت کا وہی لوگ اچھی طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ جن کی زندگیوں کا انحصار بیابان گرد عربوں
کی طرح اِن قطرات باراں ہی پر ہے۔
جس وقت یاس اور ناامیدی نے ایسے لوگوں پر اپنا منحوس سایہ ڈالا ہوا ہوتا ہے اور وہ خود، اُن کے پالتو جانور اور

[1] وَدْق (بروزن حلق) پانی کے غبار کی مانند چھوٹے چھوٹے ذرات۔ یا بارش کے پراگندہ قطرات۔
[2] مُبلس مادہ "ابلاس" بمعنی یاس و ناامیدی۔

مزروعہ زمین بوجہ قحط آب تشنہ ہوتی ہیں کہ اتنے میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چلتا ہے جو بارش کا پیش رو ہوتا ہے۔ وہ ہوائیں
بارش کی خوشبو اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ چند لمحے ہی گزرتے ہیں کہ آسمان پر بادل پھیل جاتے ہیں، وہ گھنگور اور بھاری ہو
جاتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں۔ گڑھے صاف پانی سے بھر جاتے ہیں۔ چھوٹی بڑی ندیاں اس نعمت سماوی سے لبریز ہو
جاتی ہیں۔ خشک زمینوں اور ان بیابان گرد لوگوں کے دلوں میں تازہ زندگی کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، دِلوں میں اُمید کی بجلی
چمکنے لگتی ہے۔ دلوں سے ناامیدی اور مایوسی ڈھل جاتی ہے۔

اِس آیت میں کلمہ "قبل" کی تکرار غالباً تاکید کے لیے ہے۔ منشاء یہ ہے کہ بارش سے چند لمحے پہلے جی ہاں چند
لمحے پہلے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ لیکن جیسے ہی بارش ہوتی ہے، اُن خشک لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ دیکھیے
انسان کتنا کمزور موجود ہے اور اس کا خدا کس قدر مہربان ہے۔
فارسی زبان میں تاکید کے لیے زمانے کا مکرر ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً — ہم کہتے ہیں کہ "کل تک" جی ہاں کل ہی تک
فلاں شخص میرا دوست تھا۔ مگر اب سخت دشمن ہو گیا ہے۔ اس تکرار سے انسان کی تغیرِ حالت کا اظہار منظور ہوتا ہے

⁂

زیرِ نظر آیات میں سے آخری آیت میں پیغمبرِ اسلامؐ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ: رحمتِ الٰہی کے آثار کو دیکھ
کہ وہ زمین کو اُس کی موت کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے۔ (فانظر الیٰ اٰثار رحمۃ اللہ کیف یحی الارض بعد
موتھا)۔

کلمہ "فانظر" استعمال کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ نزول باراں کے سبب سے جب مُردہ زمین زندہ ہوتی ہے تو
اُس میں رحمتِ الٰہی کے آثار اِس قدر نمایاں اور آشکار ہیں کہ انسان کو بغیر جستجو سرسری نظر سے دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتے ہیں
نیز یہ کہ بارش کو "رحمتِ الٰہی" کہا گیا ہے۔ یہ باعتبار نتیجہ ہے کیونکہ وہ مختلف جہات سے باعث برکت ہے۔ مثلاً:
بارش — خشک زمین کی آبیاری کرتی اور نباتات کے بیجوں کی پرورش کرتی ہے۔
بارش — درختوں کو حیات تازہ بخشتی ہے۔
بارش — ہوا کو گرد و غبار سے پاک کر دیتی ہے اور انسان جس ماحول میں جیتا ہے اُسے دھو کر صاف کر دیتی ہے
بارش — نباتات کو دھو کر اُنھیں طراوت بخشتی ہے۔
بارش — ہوا کو مرطوب و ملائم اور ہلکا کرکے انسان کے سانس لینے کے قابل بنا دیتی ہے۔
بارش کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد چشموں اور کاریز کی صورت میں زمین پر بہنے لگتا ہے۔
بارش سے سیلاب آتا ہے۔ نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ یہ پانی جب ڈیم میں جمع ہو جاتا ہے تو اُس سے بجلی پیدا کی
جاتی ہے۔ جس سے روشنی حاصل ہوتی ہے اور مشینوں کو حرکت دی جاتی ہے۔
قرآن کی دوسری آیات میں بھی بارش کو "رحمت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان مقامات میں سے سورہ فرقان کی آیت ۴۸
اور سورہ نمل کی آیت ۶۳ ہے۔

سورہ شوریٰ کی آیت ۲۸ میں مذکور ہے :-

وهوالّذی ینزّل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہٗ

وہ خدا ہی کی ذات ہے جو بارش کو نازل کرتی ہے۔ اس کے بعد کہ لوگ
نااُمید ہوگئے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔

اس کے بعد اس تعلق کی جہت سے جو مبدأ و معاد کا اس قسم کے مسائل سے ہے ، آیت کے آخر میں اس بات کا اضافہ کیا گیا ہے : جس ذات نے مردہ زمین کو نزول باراں سے زندہ کر دیا وہی بروز قیامت مردوں کو بھی زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ (ان ذالك لمحی الموتیٰ وهو علیٰ کل شیءٍ قدیر) ۔

اس مقام پر فعل مضارع کے بجائے " محی " اسم فاعل استعمال ہوا ہے ۔ جس کے پہلے لام تاکید ہے ۔ اس سے انتہائی تاکید مقصود ہے۔

آیاتِ قرآنی میں ایسا بارہا نظر سے گزرا ہے کہ مسئلہ معاد کو ثابت کرنے کے لیے یہ واقعہ بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ مُردہ زمین نزول باراں کے بعد زندہ ہو جاتی ہے ـــــ چنانچہ ـــ سورہ قٓ کی آیت ۱۱ میں مُردہ زمینوں کی زندگی کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے :

كذالك الخروج

بروز قیامت مردوں کا زندہ ہونا بھی اسی کی مانند ہے۔

نیز سورہ " فاطر " کی آیت ۹ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے :

كذالك النشور

بروز قیامت نشور اسی طرح ہو گا ۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قانونِ حیات و مرگ ہر مقام پر یکساں ہے ۔ اللہ کی ذاتِ پاک جو بارش کے چند قطرات سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور اُس میں جوشِ نمو اور حرکتِ بالیدگی پیدا کر دیتی ہے ۔ قدرت کے اس عمل کی ہر سال اور کبھی ہر روز تکرار ہوتی رہتی ہے۔ اُسی ذات میں یہ قدرت ہے کہ موت کے بعد انسانوں کو بھی زندہ کر دے ۔ حق یہ ہے کہ ہر شکل میں موت و حیات اُسی کے اختیار میں ہے۔

یہ درست ہے کہ ظاہراً زمین زندہ نہیں ہوتی بلکہ " حیاتِ ارض " کا مفہوم یہ ہے کہ نباتات کے جو بیج زمین میں پنہاں ہوتے ہیں وہ پرورش پاتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے بیج زمین کے اجزاء کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور یہ اجزاء رُوحِ نباتی بن کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ نیز ان ہی نباتات کے منتشر اور پاشیدہ اجزاء از سرِ نو زمین کو قوتِ حیات بخشتے ہیں۔

درحقیقت منکرین معاد کے پاس بجز استبعاد کے اور کوئی دلیل نہ تھی اور قرآن مجید میں ان کے استبعاد کی نفی اور شکست کے لیے ایسی مثالیں دی گئی ہیں۔

۵۱۔ وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوا مِن بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ۝

۵۲۔ فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۝

۵۳۔ وَمَا أَنتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ۝

۵۴۔ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ ۝

ترجمہ

۵۱۔ اگر ہم (گرم اور جلانے والی) ہوا بھیجیں کہ اُس کے اثر سے وہ اپنی زراعت اور باغات کو زرد اور پژمردہ دیکھیں تو وہ ناشکری کرنے لگتے ہیں۔

۵۲۔ اور تم مُردوں کو اپنی بات نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو جب وہ مُنہ موڑ لیں ۔

۵۳۔ اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے نکال کر ہدایت کر سکتے ہو۔ تم صرف اُن ہی لوگوں کو اپنی بات سُنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں ۔

۵۴۔ وہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں کمزور حالت میں پیدا کیا۔ پھر کمزوری کے بعد اُس نے قوت عنایت کی۔ پھر قوت کے بعد کمزوری اور پیری کا وقت دیا۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علیم و قدیر ہے۔

تفسیر

مُردے اور بہرے تیری بات نہیں سُنتے:

ازبسکہ گزشتہ آیات میں بابرکت ہواؤں کا ذکر تھا جو پُر برکت بارشوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں مگر زیرِ نظر آیات میں پہلی آیت میں زیاں رساں ہواؤں کا ذکر ہے۔ اِس ضمن میں خدا فرماتا ہے اگر ہم ہوا بھیجیں (کہ جو گرم اور جھلسا دینے والی یا سرد و خشک ہو) اور اُس کے اثر سے یہ لوگ اپنے باغات اور زراعت کو زرد اور پژمردہ دیکھیں تو ناشکرگزاری کرنے لگتے ہیں اور اِس روش پر قائم رہتے ہیں: (ولئن ارسلنا ریحًا فرأوہ مصفرًا لظلوا من بعدہ یکفرون)۔

یہ لوگ کم ظرف ہیں۔ اِن کا حال یہ ہے کہ نزولِ باراں سے قبل مایوس اور شکستہ خاطر ہوتے ہیں اور جب مینہ برس جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی دن لُو چلنے لگے اور وقتی طور پر وہ اذیت میں مبتلا ہو جائیں تو فریاد کرنے لگتے ہیں اور خدا کی شکایت کرنے لگتے ہیں۔

اِس کے برعکس راست باز مومنین کا یہ حال ہے کہ جب اُنھیں خدا کی کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کرتے ہیں اور مصیبتوں میں صبر کرتے ہیں۔ مادّی زندگی کے نشیب و فراز سے اُن کے ایمان میں ذرہ بھر خلل نہیں پڑتا۔ اور ضعیف الایمان کور دلوں کی طرح ہوا کے ایک موافق جھونکے سے مومن اور دوسرے مخالف جھونکے سے کافر نہیں ہو جاتے۔

کلمہ "مصفرًا" کا مادہ "صفرہ" (بروزن "مسفرہ") ہے۔ اِس کے معنیٰ زرد رنگ کے ہیں۔ بعض مفسّرین کے نزدیک "رأوہ" کی ضمیر کا مرجع درخت اور گھاسیں ہیں جو مضرت رساں ہوائیں چلنے سے بہت جلد پژمردہ اور زرد ہو جاتی ہیں۔

بعض مفسّرین کا یہ خیال ہے کہ "رأوہ" کی ضمیر کا مرجع اَبر ہے کیونکہ زرد رنگ کے بادل نازک ہوتے ہیں جو برستے نہیں ہیں۔ ان کے برخلاف کالے اور گھنے بادل خُوب برستے ہیں۔

بعض مفسّرین اِس ضمیر کا مرجع "ریح" (ہوا) کو سمجھتے ہیں کیونکہ معمول کی ہوائیں تو بے رنگ ہوتی ہیں لیکن بادِسموم جو بیابان کا گرد و غبار بھی اپنے ساتھ اُڑا لاتی ہے، زرد رنگ کی ہوتی ہے۔

اِس مقام پر ایک اور احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ کلمہ "مصفر" کے معنیٰ "خالی" بھی ہیں۔ جیسا کہ راغب اصفہانی

نے مفردات میں لکھا ہے کہ خالی برتن، غذا سے خالی پیٹ یا خون سے خالی رگوں کو "صفر" (بروزن سفر) کہتے ہیں۔ بنابرایں "مصفر" کا معنیٰ ہے وہ ہوائیں جو بارش سے خالی ہوں۔

اِس صورت میں "رأوہ" کی ضمیر کا مرجع "ریح" (ہوا) ہے (یہ مقام غور طلب ہے)۔ ہمارے خیال میں تفسیرِ اوّل سب سے زیادہ مشہور ہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ برسنے والی اور مفید ہواؤں کے لیے "ریاح" کلمہ جمع استعمال ہوا ہے۔ لیکن زیاں رساں ہوا کے لیے کلمہ مفرد "ریح" آیا ہے۔

اِس کی یہ وجہ ہے کہ اکثر ہوائیں مفید ہی ہوتی ہیں اور بادِ سموم کبھی کبھی مہینوں یا سالوں میں ایک مرتبہ چلتی ہے۔ لیکن مفید ہوائیں تو ہمیشہ چلتی ہی رہتی ہیں۔

یا ممکن ہے کہ "ریاح" بصورت جمع اِس لیے استعمال کیا گیا ہو کہ مفید ہواؤں کا اس صورت میں مفید اثر ہوتا ہے کہ پے در پے چلتی رہتی ہیں۔ جب کہ مُضر ہوا ایک ہی مرتبہ چل کر اپنا تباہ کن اثر چھوڑ جاتی ہے۔

اِس آیت کے ذیل میں ایک آخری نکتہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ آیت نمبر ۴۸ میں کلمہ "یستبشرون" جو نفع بخش ہواؤں کے ذکر میں استعمال ہوا ہے اور جملہ "لظلوا من بعدہ یکفرون" (اس کے بعد وہ اپنے کفر پر قائم رہتے ہیں) اِس آیت میں آیا ہے۔ ان دونوں کا فرق قابلِ لحاظ ہے۔

ان کلمات کے استعمال میں جو تفاوت ہے اُس سے ثابت ہے کہ ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ خدا کی پے در پے نعمتوں کو دیکھتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ ایک دن کے لیے یا صرف ایک بار کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو شکایت کرنے اور رونے دھونے لگتے ہیں اور کفر کی طرف اس طرح مائل ہو جاتے ہیں۔ گویا اُنھوں نے کبھی اسے چھوڑا ہی نہ تھا۔

ان لوگوں کی مثال ایسے افراد کی سی ہے کہ جو ساری عمر صحت مند اور سلامتی سے رہتے ہیں۔ مگر کبھی خدا کا شکر ادا نہیں کرتے۔ لیکن ـــــ اگر کبھی ایک رات کے تیز بخار میں مبتلا ہو جائیں تو جو کفر اور اَن کہنی بھی اُن کی زبان پر آتی ہے، بکتے رہتے ہیں اور بے دانش اور ضعیف الایمان لوگوں کا یہی حال ہے۔

اِس موضوع پر ہم نے اسی سورہ کی آیت ۳۵ اور سورہ ہُود کی آیت ۹، ۱۰ اور سُورہ حج کی آیت ۱۱ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

* * *

اِس کے بعد کی دو آیات میں آیت ماقبل کے مضمون کی مناسبت سے انسانوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

اوّل: وہ لوگ جو اگرچہ جسمانی اعتبار سے زندہ ہیں لیکن بااعتبار قلب و رُوح مُردہ ہیں کہ وہ ادراکِ حقائق سے قاصر ہیں۔

دوم: وہ لوگ کہ اُن کے کان تو ہیں مگر وہ کلمۂ الحق سُننا نہیں چاہتے۔

سوم : وہ گروہ جن کی آنکھیں چہرۂ حق کو دیکھنے سے محروم ہیں

چہارم : راست باز مومنین کا گروہ جو دلہای دانا ۔ گوشہای شنوا اور چشم ہائے بینا رکھتے ہیں ۔

پہلی بات یہ کہی ہے کہ : اپنی حق باتیں مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور جن کے قلب مُردہ ہوچکے ہیں اُن پر تمہاری نصیحتوں کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا۔ (فانك لاتسمع الموتٰی) ۔

نیز یہ کہ "تم اپنی بات بہروں کو بھی نہیں سُنا سکتے ۔ بالخصوص اُس وقت کہ جب وہ کلمۂ حق سُننے سے پُشت پھیرلیں" (ولاتسمع الصمّ الدعآء اذا ولوا مدبرین) ۔

اسی طرح تمہارے امکان میں یہ بھی نہیں کہ تم اندھوں کو گمراہی سے نکال کر راہِ راست کی ہدایت کرو: (وماانت بھادی العمی عن ضلالتھم) ۔

تم اپنے کلماتِ حق صرف اُن لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں: (ان تسمع الّا من یؤمن بأیاتنا فھم مسلمون) ۔

جس طرح کہ ہم نے اس سے قبل بھی کسی مقام پر کہا ہے کہ قرآن مادی حیات و مرگ اور ۔ ظاہری بینائی اور سماعت کے علاوہ ایک برتر حیات و مرگ اور دید و شنید کا قائل ہے کہ انسان کی سعادت اور بدبختی کا انحصار ان آخر الذکر حواسِ باطنی پر ہے ۔

جس شخص کا دل بیدار ہے اس کی نظر مادّی اور جسمانی فوائد پر نہیں رہتی بلکہ اُس کا نقطہ نگاہ رُوحانی اور معنوی ہوتا ہے ۔

ادراکِ حقیقت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کا قلب آمادہ ہو اور اُس کی آنکھ بینا اور کان سُننے والے ہوں ۔

اگر کسی شخص کا دل کثرتِ گناہ ، دماغ کی سنگینی اور غرور کی وجہ سے مُردہ اور اس کی رُوح خوابیدہ ہوچکی ہے اور اُس میں ادراکِ حقیقت اور امتیازِ حق و باطل کی استعداد ہی نہیں رہی ۔ تو اگر تمام انبیاء اور اولیاء بھی جمع ہوکر تمام آیاتِ الٰہی اُسے سنائیں تو اُس پر کچھ بھی اثر نہ ہوگا ۔

اگر قرآن میں حواسِ خمسہ میں سے صرف دو حواسِ ظاہر کا اور قوتِ ادراک کا ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عالمِ خارجی سے جو معلومات حاصل کرتا ہے اُن کا بیشتر حصہ ان ہی دو حواس (بصارت و سماعت) یا وجدان اور تحلیلِ عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ آیاتِ بالا میں راہِ راست سے انحراف اور عدمِ ادراکِ حقیقت کے تین مراحل بیان کیے گئے ہیں جن میں سے **مرحلہ اول** یعنی حالتِ مرگ ، شدید ہے اور مرحلہ سوم یعنی نابینائی خفیف ہے ۔

مرحلہ اوّل : " دل کی موت " ہے کہ قرآن میں مُردہ دل لوگوں کو " موتیٰ " کہا گیا ہے کہ ان کے اندر نفوذِ حق کا کوئی امکان ہی نہیں ہے ۔

مرحلہ دوم : " عدمِ سماعت " ہے ۔ بالخصوص وہ بہرے کہ جنھوں نے کلمۃ الحق سے رُوگردانی کر لی ہے اور دُور بھاگ رہے ہیں ۔ اُن کی گراں گوشی کا یہ حال ہے کہ نزدیک کی شدید چیخ پکار اُن کے کانوں پر جس کے اثر ہونے کا امکان

ہوسکتا تھا اُن پر اُس کا بھی اثر نہیں ہوتا ۔

البتہ ان بہروں کا گروہ مردوں کے مانند نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کبھی علامت یا اشارے سے اُنھیں کوئی بات سمجھائی جاسکے ۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے حقائق ایسے ہیں کہ اُنھیں ایماء و اشارہ سے سمجھایا نہیں جاسکتا ۔ بالخصوص اس حالت میں کہ مخاطب پُشت پھیر لے ۔

مرحلہ سوم : عدمِ بصارت (نابینائی) ہے ۔ یہ ملحوظ رہے کہ اندھوں کے ساتھ ، مُردوں کی نسبت ، زندگی بسر کرنا آسان تر ہے کیونکہ کم از کم ان کے کان تو کھُلے ہوتے ہیں اور اُن کے سامنے بہت سے مطالب بیان کیے جاسکتے ہیں ۔ مگر ___ پھر بھی :

دیکھنا اور سُننا برابر تو نہیں ۔

علاوہ بریں اندھے کے سامنے کسی شے کی کیفیت کا بیان کر دینا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ مادی اشیا کی حقیقت اُن کے دیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آتی ۔ بعض بسیط تصورات کا بھی یہی حال ہے ۔ مثلاً اندھے سے کہا جائے کہ دائیں طرف یا بائیں طرف چلو تو اس حکم پر عمل کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات معمولی سی غلطی سے وہ کسی گڑھے میں جا گرے گا ۔

قرآن مجید میں " موت و حیات " کا جو تصور ہے ہم نے اُسے سورہ نحل کی آیات ۸۰ اور ۸۱ کے تحت بالتشریح بیان کیا ہے ۔ اور وہابیوں کے اس کمزور اعتراض کا ذکر بھی کیا ہے ۔ جو وہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ سے توسّل کے خلاف ان آیات زیرِ بحث اور دیگر آیات کے حوالے سے کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے ثابت ہے کہ مُردے مُطلقاً کچھ نہیں سمجھتے مگر ہم نے ثابت کیا ہے کہ " انسان " اور خصوصاً پیشوایانِ بزرگ اِس دُنیا سے سفر کرنے کے بعد ایک " برزخی زندگی " گزارتے ہیں ۔ قرآن اور احادیث کی بہت سی اسناد اس پر گواہ ہیں اور حیاتِ برزخی میں اُن کی استعداد ادراک و بصیرت حیاتِ دُنیادی کی نسبت وسیع تر ہو جاتی ہے ۔

(مزید توضیح کے لیے جلد ۸ میں آیات مذکورہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے) ۔

اس مقام پر ہمیں اس جُملے کا اضافہ بھی کرنا چاہیئے کہ تمام مسلمان اپنی نمازوں میں تشہد پڑھتے وقت پیغمبر گرامیؐ کو مخاطب کر کے اُن پر اِن الفاظ سے سلام بھیجتے ہیں : " السلام علیك ایھاالنبی و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہ " ۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ تخاطب حقیقی ہے نہ کہ مجازی اور سلام اُس ذات کے لیے ہے جو سُنتی اور ادراک کرتی ہے ۔ اس لیے پیغمبر اکرمؐ کو بصورتِ خطاب سلام کرنا اِس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی رُوحِ مقدس ہم سب کے سلاموں کو سُنتی ہے ۔ اور کسی جہت سے بھی ہم اِن خطابوں کو مجاز پر محمول نہیں کرسکتے ۔

⁂

زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت جس میں توحید باری تعالیٰ کی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو دلیلِ فقر و غنا کہلاتی ہے اِس دلیل سے خُدا اِن تمام دلائل کی جو اثباتِ توحید کے لیے اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں تکمیل کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے : ذاتِ الٰہی وہی ہے جس نے تم کو جب پیدا کیا تو تم ضعیف و ناتوان تھے ۔ اسی نے تمہیں اس ضعف و ناتوانی کے عرصے کے

بعد قوت اور توانائی عطا کی کہ تمہارے شباب اور جوانی کا زمانہ آگیا۔ اس دور کے بعد پھر اضمحلال قویٰ کا زمانہ آیا اور تم پر ضعفِ پیری غالب آگیا۔ (اللہ الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعفٍ قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعفاً و شیبۃ)۔

وہی خدا ہے کہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور وہی عالم و قادر ہے (یخلق ما یشآء وھو العلیم القدیر)۔

تم آغازِ حیات میں اتنے ضعیف و ناتوان تھے کہ اپنے اوپر سے مکھی بھی نہیں اُڑا سکتے تھے اور نہ اپنے منہ کی رال کو صاف کر سکتے تھے اور تمہاری یہ حالت جسمانی اور فکری لحاظ سے "لا تعلمون شیئاً" کے مصداق تھی (یعنی تم کچھ نہیں جانتے) یہاں تک کہ تم اپنے ماں باپ کو جو دائماً تمہاری نگہداشت کرتے تھے نہیں پہچانتے تھے۔

لیکن ـــــ رفتہ رفتہ تم میں نمو، بالیدگی اور توانائی پیدا ہوگئی۔ تمہارا جسم قوی ہوگیا۔ اور ـــ تم میں عقل، قوتِ متفکرہ اور وسیع ادراک پیدا ہوگیا۔

تاہم ـــــ تم اس طاقت و توانائی کا تحفظ نہیں کر سکتے تھے۔ تمہاری مثال ایسی ہے کہ ایک آدمی دامنِ کوہ سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے اور وہ پھر وہاں سے نیچے آجائے۔ تمہارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ عہدِ طفلی کے ضعف و ناتوانی سے جوانی کی توانائی تک ترقی کرتے ہو۔ پھر زوال شروع ہو جاتا ہے اور جسمانی و روحانی ضعف و ناتوانی کے قعر میں گر پڑتے ہو۔

زندگی میں یہ تغیرات اور نشیب و فراز اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ نہ تو وہ قوت و توانائی تم نے اپنے ارادے سے پیدا کی تھی اور نہ اس ضعف و ناتوانی پر تمہیں اختیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان جملہ تغیرات کا منبع کوئی اور ہی ذات ہے۔ اور تمہاری ہر جہت سے بے بسی اس امر کی دلیل ہے کہ تمہارے وجود کے پہیے کو کوئی اور ذات ہی گھماتی ہے اور تمہاری ہر کیفیتِ حیات عارضی ہے۔

امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ نے اپنے نورانی اقوال میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

عرفت اللہ سبحانہ بفسخ العزائم وحل العقود ونقض الھمم[1]

میں نے اپنے خدا کو محکم ارادوں کے فسخ ہونے، مشکلات کے حل ہونے اور قوی ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام ہونے سے پہچانا۔

میں ان تغیرات سے سمجھ گیا کہ اختیارِ مطلق کسی اور ہی ذات کے اختیار میں ہے۔

ہمیں اپنے معاملات میں کچھ اختیار نہیں۔ مگر اتنا ہی جتنا اُس نے بخشا ہے۔

یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ـــــ آیت ۵۴ میں جب بار دوم کلمہ "ضعف" آیا ہے تو اُس کے ساتھ کلمہ "شیبۃ" کا اضافہ بھی ہے جس کے معنٰی پیری ہیں۔ لیکن جب بار اول "ضعف" کہا تھا تو وہاں طفولیت کا ذکر نہیں ہے۔

غالباً اس ترتیب میں یہ مصلحت ہے کہ ضعفِ پیری بہت اذیت رساں ہے۔ کیونکہ ضعفِ طفلی کے برعکس ضعفِ پیری کا انجام مرگ و فنا ہے۔ دوم یہ کہ تجربہ کار اور سال خوردہ لوگوں سے جو توقعات وابستہ ہوتی ہیں وہ بچوں سے نہیں ہوتیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۲۵۰۔

حالانکہ بعض اوقات بلحاظِ ضعف و ناتوانی اُن کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ یہ مقام بہت عبرت انگیز ہے۔

آیت ۵۴ کا آخری جملہ۔ جس میں خدا کے علم اور قدرت کا ذکر ہے وہ معناً بشارت بھی ہے، تنبیہ بھی۔ تنبیہ اس جہت سے ہے کہ خدا تمہارے جملہ اعمال اور نیتوں سے آگاہ ہے اور اُن اعمال کی [illegible] دینے پر قادر ہے۔

۵۵۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ○

۵۶۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

۵۷۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○

۵۸۔ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ○

۵۹۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۶۰۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۵۵۔ اور جس روز قیامت برپا ہوگی تو گناہ گار قسمیں کھائیں گے کہ وہ (عالمِ برزخ میں) ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ وہ اسی طرح ادراکِ حقیقت سے محروم رہتے تھے۔

۵۶۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیاہے وہ کہیں گے کہ تم فرمانِ خُدا کے مطابق روزِ قیامت تک (عالمِ برزخ میں) رہے ہو اور اب یہ اُٹھنے کا دن ہے مگر تم جانتے نہ تھے۔

۵۷۔ اُس روز ظالموں کا عُذر کچھ فائدہ نہ دے گا اور اُن کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے گی۔

۵۸۔ ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔ اگر تم اُن کے سامنے کوئی آیت پیش کرتے ہو تو یہ کافر کہتے ہیں کہ تم تو جھوٹے ہو (اور یہ سب جادو ہے)۔

۵۹۔ اس طرح خُدا اُن لوگوں کے دلوں پر جو علم نہیں رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔

۶۰۔ جب کہ حالت یہ ہے تو تم صبر کرو کیوں کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ تمہیں غضب ناک نہ کریں (اور اپنی جگہ سے ہلا نہ دیں)۔

تفسیر

وُہ دن جب کہ عُذر خواہی بے سُود ہوگی:

ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ میں "مبدا و معاد" کی بحثیں کپڑے کے تانے بانے کی طرح باہم یکدگر مربوط ہیں۔ زیرِ نظر آیات میں مبدا و معاد کی اُن بحثوں پر جو قبل ازیں گزر چکی ہیں، مسئلہ قیامت کا مزید اضافہ کیا گیا ہے اور اُس روز مجرموں کا جو دردناک حال ہوگا، اُس کی منظر کشی کی گئی ہے۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ : جس روز قیامت برپا ہوگی. مجرمین قسمیں کھائیں گے کہ ہم تو عالم برزخ میں فقط ایک گھنٹہ ہی رہے ہیں ۔ (ویوم تقوم الساعة یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعة) ۔

البتہ وہ اپنی گزشتہ زندگی میں بھی اسی طرح ادراک حقیقت سے محروم رہے تھے ۔ (کذالك كانوا یؤفكون).

روز قیامت کو قرآن میں " ساعة " کہا گیا ہے ۔ جیسا کہ ہم نے کسی ماقبل مقام پر کہا ہے کہ یہ کلمہ یا تو اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ قیامت ایک لحظے میں ناگہانی طور پر آجائے گی ۔ یا یہ مراد ہے کہ بندوں کے اعمال کا حساب سریع وقوع ہوگا کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے ۔ کلمہ " ساعت " عربی زبان میں زمانے کے ایک خفیف جزء کے لیے بولا جاتا ہے۔[1]

" مالبثوا غیر ساعة " میں مقام توقف کا ذکر نہیں ہے ۔ اس لیے بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ " توقف در دنیا " مراد ہے کہ حقیقت میں یہاں کی زندگی ایک لحظہ زودگزر سے زیادہ نہیں ہے ۔ لیکن آیہ مابعد اس امر کی روشن دلیل ہے کہ " توقف " سے مراد جہاں برزخ میں ٹھہرنا ہے یعنی وہ عالم مراد ہے جو موت کے بعد اور یوم قیامت کے درمیان ہوگا کیونکہ " لقد لبثتم فی کتاب الله الی یوم البعث " سے ثابت ہے کہ تقیم اور مقام دونوں کی انتہا روز قیامت تک ہے ۔ اس لیے برزخ ہی صحیح ہے ۔ (غور کیجیے گا)

یہ بھی ملحوظ رہے کہ عالم برزخ سب کے لیے یکساں نہ ہوگا ۔ ایک گروہ ایسا ہے جو برزخ میں باشعور زندگی بسر کرتا ہے ۔ لیکن دوسرا گروہ ایسا ہے کہ گویا سو رہا ہے اور قیامت میں خواب سے بیدار ہوگا اور ہزارہا سال کو ایک ساعت سمجھے گا ۔[2]

اس مقام پر دو باتوں کا ذکر اور ضروری ہے ۔ اول یہ کہ مجرمین ایسی جھوٹی قسم کیونکر کھا لیں گے ؟

اس کا جواب بالکل واضح ہے ۔ وہ یہ کہ :۔

وہ مجرمین درحقیقت یہی سمجھیں گے کہ زمانہ قیام برزخ بہت قلیل تھا کیونکہ اس مقام پر ان کی حالت محوِ خواب کی طرح ہوگی ۔ مثلاً :

کیا اصحاب کہف نے جو مومن اور صالح لوگ تھے طویل خواب سے بیداری کے بعد یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ سوتے رہے ہیں ؟

نیز یہ کہ انبیائے ماسلف میں سے ایک نبی (جن کا حال سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۹ میں آیا ہے) جو دنیا سے سفر کرنے کے بعد ایک سو سال کے بعد پھر زندہ ہوگئے تھے ۔ کیا انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان دونوں زندگانیوں کے درمیان فاصلہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ہے ۔

---

[1] اس مضمون کے متعلق مفصل بحث اسی سورہ روم کی آیت نمبر ۱۴ کے تحت کی گئی ہے ۔

[2] " برزخ " کے متعلق جلد ۸ سورہ مؤمنون کی آیت نمبر ۱۰۰ کے تحت مفصل بحث کی گئی ہے اور اس آیت میں جو نکتہ ہے وہ بھی تشریح سے بیان کیا گیا ہے ۔

اندریں حال اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ برزخ کی مخصوص حالت کے پیش نظر مجرموں کا تصور بھی بوجہ ناواقفیت ایسا ہی ہو ۔

اسی لیے آیت مابعد میں یہ مضمون ہے کہ مومنین آگاہ اُن سے کہیں گے کہ تمہیں غلط فہمی ہے ۔ تم تو برزخ میں روز قیامت تک رہے ہو اور آج ہی وہ روز قیامت ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ نکتہ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے جملہ " كذالك كانوا یؤفكون " کی تفسیر بھی واضح ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ کلمہ " افک " کے وضعی معنی حقیقت کو دگرگوں کرنا اور حق سے منحرف ہونے کے ہیں ۔ یہ مجرمین بھی برزخ میں اپنی وضع کی وجہ سے ، حقیقت کا ادراک نہ کر سکیں گے اور انھیں اس مقام پر مدتِ قیام کا اندازہ ہی نہ ہوگا

وہ مطالب جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیے ان کو نظر میں رکھا جائے تو ان طولانی بحثوں سے اعتنا کی ضرورت نہیں ہے جو انھوں نے اس امر کو موضوع قرار دے کر کی ہیں کہ " مجرمین بروز قیامت عمداً جھوٹ کیوں بولیں گے " ؟

کیونکہ آیت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے " دروغ عمدی " ثابت ہو

البتہ قرآن میں بروز قیامت مجرمین کے دروغ و کذب کا ذکر بھی نظر آتا ہے ۔ جس کا مفصل جواب ہم نے جلد ۳ میں سورۂ انعام کی آیت ۲۳ کے تحت دیا ہے ۔ دیگر یہ کہ اس بحث کا ان آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

❖ ❖ ❖

آیت مابعد میں اس جواب کا ذکر ہے ۔ جو حق آگاہ مومنین اُن مجرمین کو دیں گے جو عالم برزخ اور قیامت کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں ۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے : وہ لوگ کہ جنھیں علم و ایمان دیا گیا ہے کہیں گے کہ تم لوگ حکم خدا کے مطابق روز قیامت تک عالم برزخ میں رہے ہو اور آج روز قیامت اور قبروں سے اُٹھنے کا دن ہے مگر تم اس حقیقت کو نہ جانتے تھے ۔ (وقال الذین اوتوا العلم والایمان لقد لبثتم فی کتاب الله الی یوم البعث فهذا یوم البعث ولكنكم كنتم لا تعلمون) ۔

اس آیت میں کلمہ " علم " کو " ایمان " پر مقدم رکھا گیا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم ہی اساس ایمان ہے ۔

دیگر یہ کہ " فی کتاب الله " سے ممکن ہے کہ " کتاب تکوینی " مراد ہو یا کُتب آسمانی مراد ہوں یا دونوں مراد ہوں ۔ یعنی خدا کے تکوینی اور تشریعی حکم کے مطابق یہ مقدر تھا کہ تم اتنی مدت برزخ میں رہو ۔ اس کے بعد تم بروز قیامت محشور ہو ۔[1]

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ " الذین اوتوا العلم والایمان " کا مصداق کون لوگ ہیں ؟

بعض مفسرین نے اس سے فرشتے مراد لیے ہیں ۔ جو علم اور ایمان دونوں رکھتے ہیں اور ایک دوسری جماعت نے

---

[1] آیا اس آیت کے کلمات کی نسبت میں تقدیم و تاخیر ہے ؟ اس بارے میں اہل علم میں اختلاف ہے ۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ فی کتاب الله جملہ " اوتوا العلم والایمان " سے متعلق ہے ۔ تب معنی یہ ہوں گے کہ : جو لوگ کہ کتاب اللہ کا علم رکھتے ہیں " اور اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہ بات کہتے ہیں مگر بعض مفسرین جملہ مذکور " لبثتم " سے متعلق سمجھتے ہیں ۔ ہم نے بھی سطور بالا میں یہی مفہوم مراد لیا ہے کیونکہ تقدیم و تاخیر کے لیے کوئی واضح قرینہ ہونا چاہیے اور اس مقام پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے ۔

مومنین حق آگاہ مراد لیے ہیں۔ ہمارے نزدیک دوسرے معنی زیادہ واضح ہیں۔

بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "الذین اوتوا العلم والایمان" سے امیرالمومنین حضرت علی
علیہ السلام اور آئمہ طاہرین مراد ہیں۔ اس تفسیر میں جن ذوات کو آیت کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے وہ اس کا روشن مصداق ہیں
مگر اس سے آیت کا وسیع مفہوم، محدود نہیں ہو جاتا۔

اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ عالمِ برزخ کے متعلق دو گروہوں میں وجہِ اختلاف کا
سبب یہ ہے کہ گروہ اول جو عالمِ برزخ میں وقت قیام کو صرف ایک ساعت سمجھتا ہے، وہ عذابِ الٰہی کا خوف ہے اور یہ
خواہش رکھتا ہے کہ جتنی بھی زیادہ دیر ہو جائے اچھا ہے اور دوسرا گروہ جو طول وقت کی حقیقت سے آگاہ ہے وہ چونکہ بہشت اور
اس کی جاودانی نعمتوں کا منتظر ہے اسے یہ مدتِ قیام بہت طویل معلوم ہوتی ہے[1]

٭ ٭ ٭

بہرحال جس وقت مجرمین یہ دیکھیں گے کہ روزِ قیامت کے دردناک عواقب ان کے روبرو ہیں تو وہ عذرخواہی اور توبہ کرنے
لگیں گے۔ لیکن — قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ: اس روز ظالموں کو ان کی عذرخواہی کچھ فائدہ نہ دے گی اور ان کی توبہ بھی قبول
نہ ہوگی۔ (فیومئذٍ لاینفع الذین ظلموا معذرتھم ولاھم یستعتبون)[2]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں بہ تصریح بیان کیا گیا ہے کہ مجرموں کو عذرخواہی کی اجازت ہرگز
نہیں دی جائے گی:

ولا یؤذن لھم فیعتذرون (مرسلات۔ ۳۶)

لیکن اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے: ان کی عذرخواہی کچھ مفید نہ ہوگی۔ اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عذرخواہی
تو کریں گے مگر انھیں اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا

ان آیات میں کچھ تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ قیامت کے مختلف مراحل ہوں گے۔ کسی ایک مرحلے میں ان مجرمین کو عذرخواہی
اور بولنے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی اور ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔ البتہ ان کے دست و پا، اعضا و جوارح اور وہ زمین
جس پر انھوں نے گناہ کیا ہے ان کے اعمال کا حال بیان کریں گے لیکن دوسرے مرحلے میں ان کی زبان کھل جائے گی اور عذرخواہی
کرنے لگیں گے۔ مگر بے سود۔

ان کا عذر یہ ہوگا کہ اپنے گناہوں کو کفر و نفاق کے آئمہ ضلالت کے سر تھوپیں گے اور ان سے کہیں گے کہ "اگر تم
نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔"

[1] تفسیر فخر رازی۔ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "یستعتبون" کا مادہ عتب" (بروزن "حتم") ہے۔ اس کے وضعی معنی دل بے چینی کے ہیں۔ جب یہ کلمہ باب افعال میں آتا ہے (اعتاب) تو اس کے معنی بے چینی کو دور کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ لسان العرب" میں یہ تصریح ہے کہ جب یہ کلمہ استفعال (استعتاب) میں چلا جائے تب بھی اس کے معنی دلی بے چینی کو دور کرنے کے ہی ہیں۔ اس کے مجازی معنی "استرضا" یعنی کسی کی رضا طلب کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں اور آیت زیر بحث میں انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی مجرمین قیامت میں توبہ نہ کر سکیں گے۔

سورۂ سبا آیت ۳۱:

لولا انتم لکنا مؤمنین

لیکن وہ آئمہ ضلالت ان کے جواب میں کہیں گے:

انحن صددناکم عن الھدٰی بعد اذ جاءکم

کیا ہم نے تمہیں اس وقت ہدایت سے روک دیا تھا جب وہ تمہارے قریب
آگئی تھی اور تم اسے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے؟ (سبا۔ ۳۲)

یہ مجرمین کبھی اپنی عذرخواہی میں کوشش کرتے ہوئے راہِ راست سے اپنے انحراف کو شیطان کے سر تھوپیں گے
اور اس نے ان کے دل میں جو وسوسے ڈالے ہیں ان پر اسے ملامت کریں گے۔ مگر ابلیس انھیں یہ جواب دے گا:

فلا تلوموني ولوموا انفسکم

تم مجھے نہیں بلکہ اپنے نفوس کو ملامت کرو۔ (ابراہیم۔ ۲۲)

میں نے تمہیں کسی کام پر مجبور تو نہیں کیا تھا۔ میں نے تو تمہیں صرف دوستانہ دعوت دی تھی۔ اور۔ تم نے اسے
قبول کر لیا۔

٭ ٭ ٭

اگلی آیت میں ان تمام مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس سورۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ خداوندِ عالم فرماتا ہے:
ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں (مثلاً وعدہ و وعید، امر و نہی، بشارت و انذار، آیاتِ
آفاق و انفس، دلائل مبداء و معاد اور غیب کی خبریں حاصل کلام یہ کہ قرآن میں ہر اس بات کا ذکر ہے جس کا انسانی نفوس پر
اثر ہو سکتا ہے) (ولقد ضربنا للناس فی ھٰذا القراٰن من کل مثل)۔

درحقیقت قرآن کلیۃً اور بالخصوص سورۃ روم کہ ہم جس کی تفسیر کے اختتام کے مرحلے میں ہیں، ایسے مسائل کا مجموعہ ہے
جو انسانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ اور ہر طرزِ فکر اور ہر عقیدے کے لوگوں کو بیدار کرنے والے ہیں۔

قرآن — درس ہائے عبرت، مسائل اخلاق، عملی پروگرام اور امورِ اعتقادی کا ایسا مجموعہ ہے جس میں یہ مسائل اس اسلوب
سے بیان کیے گئے ہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے سے فکرِ انسانی میں نفوذ کر جائیں اور انھیں راہِ سعادت پر گامزن کر دیں۔

مگر اس کے باوجود ایک گروہ ایسا ہے کہ ان کے تاریک اور سیاہ دلوں پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم ان
کے سامنے جو آیت اور حق کی نشانی بھی پیش کرو گے تو یہ کفار یہی کہیں گے کہ تم اہلِ باطل ہو اور تم جو کچھ کہتے ہو بے بنیاد
باتیں ہیں: (ولئن جئتھم بایۃٍ لیقولن الذین کفروا ان انتم الا مبطلون)۔

آیت میں کلمہ "مبطلون" ایک جامع لفظ ہے جس میں مشرکین کے تمام ناروا الزامات، تہمتیں اور لیبل شامل ہیں
مثلاً: دروغ، سحر اور جنون کا اتہام، کلامِ الٰہی کو خرافاتی افسانے اور اساطیر الاولین کہنا۔ یہ جملہ امورِ باطل اس ایک کلمہ میں جمع ہیں۔
یہ مسلّم ہے کہ کفار کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ پیمبرانِ خدا کو ان اتہامات میں سے کسی ایک سے متہم کرتے رہتے ہیں

تاکہ چند روز تک اس وسیلے سے پاک دل لوگوں کو حق ... غافل رکھ سکیں۔

آیت میں کلمہ "انتم" ضمیر جمع استعمال ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے پیمبر اور راست باز مومنین ہر دو مراد ہوں اور ممکن ہے کہ جملہ انبیاء، پیشوایانِ الٰہی اور طرفدارانِ حق مراد ہوں۔ کیونکہ کفار کا ہٹ دھرم گروہ تو مکتب دین کے تمام طرفداروں ہی کا مخالف تھا۔

❁ ❁ ❁

آیہ مابعد میں اس گروہ کی مخالفت حق کی وجہ بالوضاحت بیان کی گئی ہے۔ گروہ کفار کی خیرہ سری، اُن کے قلب کا قبولِ حق سے گریز اور ہر حقیقت سے دشمنی اس وجہ سے ہے کہ کثرتِ گناہ اور کج فکری کی وجہ سے ان کی حس قبولِ حق و امتیاز مُردہ ہوگئی ہے۔ اب اُن کو کسی طرح بھی ادراکِ حقیقت ہوتا ہی نہیں ہے۔

خدا ایسے لوگوں کے دلوں پر جو علم و آگاہی نہیں رکھتے مُہر لگا دیتا ہے۔ (کذالک یطبع اللہ علیٰ قلوب الذین لا یعلمون)۔

کلمہ "یطبع" کا مادہ "طبع" ہے۔ اس کے معنی ہیں مُہر لگانا۔

یہ دستور پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ ہم کسی شے کو اس طرح محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی اسے نہ چھوئے اور اس میں مطلقاً تصرف نہ کرے تو اگر اُسے کسی کپڑے میں سیتے ہیں یا کاغذ میں لپیٹتے ہیں تو اُس کے جوڑ پر اور اگر صندوق میں بند کرتے ہیں تو قفل پر لاکھ سے مُہر لگا دیتے ہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ اُس بنڈل یا صندوق کو بغیر مہر توڑے کھولنا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر مہر توڑی جائے گی تو فوراً بات کھل جائے گی

قرآن میں ایسے قلوب کی حالت کو جن میں قبولِ حق کی صلاحیت ہی نہیں رہی اور ایسے لوگوں کی کیفیت کو جن میں نہ عقل ہے، نہ علم، نہ وجدان نیز جن کے ہدایت یافتہ ہونے کی کوئی توقع ہی نہیں رہی بطور کنایہ مُہر کردہ ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیاتِ گزشتہ میں علم کو ایمان کی اساس کہا گیا ہے اور اس آیت میں جہل کو کفر اور عدم قبولِ حق کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

❁ ❁ ❁

سورۂ روم کی آخری آیت میں (جو زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت بھی ہے) پیمبرِ گرامی اسلام کو دو اہم احکام اور ایک عظیم بشارت دی گئی ہے۔ تاکہ آں جناب کو اس جنگ و پیکار میں جو اُس زمانہ میں جاہل، بے خرد اور سنگ دماغ کفار سے مسلسل جاری تھی، استقامت اور استقلال عطا ہو۔

پہلا حکم یہ ہے کہ آپ جملہ حوادث، تمام آزار و زحمات اور ہر قسم کی ناروا تہمتوں کے مقابلے میں صبر کیجئے! (فاصبر)۔

کیونکہ صبر و شکیبائی اور استقامت ہی کامیابی کی اصلی کلید ہے۔ اور اس غرض سے کہ پیمبرِ اکرم تبلیغ اسلام کی راہ میں زیادہ سرگرم ہو جائیں اضافہ کیا گیا ہے: خدا کا وعدہ یقیناً حق ہے (انّ وعد اللہ حقٌ)۔

خدا فرماتا ہے کہ ہم نے آپ سے اور مومنین سے فتح و کامرانی، زمین کی خلافت اور کفر پر اسلام کے غلبے کا وعدہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ نور کو ظلمت پر اور علم کو جہل پر غلبہ حاصل ہوگا۔

اس مقام پر کلمہ "وعد" سے مُراد وہ وعدے ہیں جو قرآن میں مومنین کی فتح یابی کے بارے میں بار بار کیے گئے ہیں من جملہ اُن کے ہم اسی سُورہ کی آیت ۴۷ میں پڑھتے ہیں:

وکان حقاً علینا نصر المؤمنین

مومنین کی مدد کرنا ہمیشہ ہم پر فرض رہا ہے اور ہے۔

اسی طرح سورہ مؤمن کی آیت ۵۱ میں ہے:

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیاۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد

ہم اپنے رسُولوں اور مومنین کی اس دنیا کی زندگی میں اور بروزِ قیامت جب کہ گواہ پیش ہوں گے مدد کریں گے۔

نیز سُورۂ مائدہ کی آیت ۵۶ میں ہے:

فانّ حزب اللہ ھو الغالبون

بہ تحقیق حزبِ خدا ہی فتح مند ہے

دُوسرا حکمِ الٰہی یہ ہے کہ آپ کفار سے اس سخت اور مسلسل جنگ میں اپنے اعصاب پر قابو رکھیں اور طبیعت کی متانت اور اطمینانِ قلب کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ ایمان نہیں رکھتے وہ تمہیں غصہ ور اور تندخو نہ بنا دیں۔ (ولا یستخفنّک الذین لا یوقنون)۔

اس قسم کے لوگوں کے مقابلے میں آپ کا فرض بردباری، تحمّل، حوصلہ اور حفظِ متانت ہے کہ جو ایک پیمبر کے شایانِ شان ہے۔ "لا یستخفنّک" کا مادہ "خفت" ہے بمعنی "سُبکی"۔

رسُولِ کریمؐ کو ہدایت ہے کہ آپ اس قدر ثابت قدم اور خوددار رہیں کہ یہ لوگ آپ کو سبک نہ سمجھنے لگیں اور آپ کو اپنے مقصد کی راہ سے ہٹا نہ سکیں۔ آپ اپنی راہِ نصبُ العین میں محکم اور استوار رہیئے۔ کیونکہ وہ لوگ تو یقین نہیں رکھتے اور آپ یقین و ایمان کا مرکز ہیں۔

اس سورہ کا مومنین کی دُشمنوں پر فتح کے وعدے سے آغاز ہوا تھا اور کامیابی کے وعدے ہی پر اس کا اختتام ہوتا ہے مگر اس فتح مبین کی شرطِ اصلی رسولؐ اور مومنین کا صبر و استقامت بیان کی گئی ہے۔

❁ ❁ ❁

- پروردگارا تو ہمیں بھی ایسا صبر اور استقامت عطا کر کہ مشکلات و حوادث کے طوفان ہمارے استقلال میں خلل انداز نہ ہو سکیں۔
- خداوندا — ہم تیری ہی ذاتِ پاک کے دامنِ تحفظ میں پناہ لیتے ہیں۔

تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا شمار اُن لوگوں میں ہو جن پر کسی وعظ، نصیحت، عبرت اور تخویف کا اثر ہی نہیں ہوتا۔
بارالٰہا — دُشمن باہم مربوط اور متحد ہیں اور طرح طرح کے شیطانی اسلحے سے مسلح ہیں۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ تو ہمیں بیرونی دُشمنوں اور اندرونی شیطانوں پر فتح عنایت کر۔ آمین — یارب العالمین!

سُورہ روم کی تفسیر کا اختتام ہوتا ہے۔ ۲۱ ذیقعد ۱۴۰۲ ہجری

تفسیر نمونہ ——— جلد ۱۶
کے ترجمے کا اختتام ———
اس حقیر پر تقصیر ——— سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم
کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا۔
بروز ——— جمعہ
بوقت ——— ساڑھے دس بجے صبح
بتاریخ ——— ۸ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۶ ہجری
بمطابق ——— ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۸۵ عیسوی
بمکان ——— سیٹھ نوازش علی۔ ۸۱۔ ای
(ان کے بیٹے محمد رضا مولی کی شادی خانہ آبادی کے روز)
والحمد للہ اولًا و آخرًا والصلوٰۃ علی النبی وآلہ سرمدًا ابدًا

سید صفدر حسین نجفی

سُورۂ لقمان

◎ ——— مکہ میں نازل ہوئی

◎ ——— اس کی ۳۴ آیات ہیں

سُورہ لقمان کے مضامین

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا لیکن علماء مثلاً شیخ طوسی نے تفسیر تبیان میں اس کی تھوڑی سی آیات مثلاً چوتھی آیت جو نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں ہے یا فخرالدین رازی نے اس چوتھی آیت کے علاوہ ستائیسویں آیت کو بھی مستثنیٰ کیا ہے یہ آیت خداوند عالم کے وسیع علم کے بارے میں بحث کرتی ہے لیکن اس قسم کے استثناء کی کوئی واضح دلیل نہیں ملتی۔ کیونکہ نماز اور اپنے کلی مفہوم کے لحاظ سے زکوٰۃ مکہ میں بھی موجود تھیں اور خداوند عالم کے وسعت علم کی حقیقت بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

اسی بناء پر سورہ لقمان مکی ہونے کے لحاظ سے دوسری مکی سورتوں کے مضامین پر مشتمل ہے اور اس میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد مثلاً "مبدء" و "معاد" اور "نبوت" کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے۔

بطور کلی اس سورۃ کے مضامین پانچ حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

پہلے حصّہ میں حروف مقطعات کے ذکر کے بعد عظمت قرآن اور خاص صفات کے حامل مومنین کے لیے قرآن کا ہدایت اور رحمت ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کے بارے میں بھی گفتگو موجود ہے جو ان آیات کے بارے میں سختی اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور جنہیں قرآن نے بہروں سے تشبیہ دی ہے۔ اور ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی غلط سرگرمیوں کی بدولت لوگوں کو قرآن سے منحرف کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے حصّہ میں آسمانوں کی تخلیق اور انہیں بغیر کسی ستون کے برقرار رکھنے اور زمین میں پہاڑ پیدا کرنے، مختلف جانور معرض وجود میں لانے، بارش نازل کرنے اور نباتات وغیرہ اگانے کا تذکرہ ہے۔

تیسرے حصّہ میں خلاق عالم کی صفات اور قدرت کی مناسبت سے حضرت لقمان کے کچھ حکمت آمیز ارشادات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نصیحتیں اس مرد خدا نے اپنے فرزند سے کیں۔ چنانچہ ان نصائح میں توحید کے تذکرے اور شرک کے ساتھ محاذ آرائی کی منزل سے لے کر ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لانے، سخت قسم کے حوادث کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرنے، لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے، تواضع اور فروتنی اختیار کرنے اور تمام امور میں اعتدال پیدا کرنے تک کا حکم موجود ہے۔

چوتھے حصّہ میں ایک بار پھر توحید کے دلائل پیش کئے گئے ہیں اور آسمان و زمین کی تسخیر اور خداوند عالم کی وافر نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں ایسے بت پرستوں کی منطق کی مذمت کی گئی ہے جو صرف اپنے بڑوں کی تقلید میں گمراہی کی وادی میں سرگرداں ہیں اور انہی سے خداوند عالم کی خلاقیت کا اقرار لینے کا ذکر ہے جو عبودیت کی بنیاد اور اساس ہے۔

نیز اس سلسلہ میں قرآن اسی حصّہ میں خداوند عالم کے وسیع اور غیر متناہی علم سے ایک واضح مثال کے ذریعہ پردہ اٹھاتا ہے اور اسی سلسلے میں کائنات کی آفاقی نشانیوں کے ذکر کے علاوہ توحید فطری کا ذکر بھی موجود ہے جس کی تجلی انسان کے امواج بلا میں گرفتار ہونے کے

وقت ہوتی ہے اور اس بارے میں یہاں نہایت عمدہ پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔

پانچویں حصّہ میں معاد اور موت کے بعد زندگی کی طرف مختصر لیکن دل ہلا دینے والا اشارہ موجود ہے جو تنبیہ دار کر رہا ہے کہ اس دنیاوی زندگی پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ آخرت کی سرائے جاودانی کی فکر میں رہنا چاہیئے۔

یہاں پر پروردگار عالم کے علم غیب کے اس حصّے کو بیان کیا گیا ہے جو انسان کے چند امور سے متعلق ہے۔ ان امور میں سے انسان کی موت کا لمحہ بھی ہے اور وہ بچہ بھی جو ابھی شکم مادر میں ہے۔ خدا ان سب کیفیات سے باخبر ہے۔ اسی مطلب پر یہ سورہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ اس سورہ کو "سورہ لقمان" سے موسوم کرنے کی وجہ وہی اہم اور پرمغز گفتگو ہے جو حضرت لقمان کی نصیحتوں پر مشتمل ہے اور یہ واحد سورہ ہے جس میں اس مرد دانا کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

سُورہ لقمان کی فضیلت:

اس سورہ کی فضیلت میں بہت سی روایات پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہلبیتؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ حدیث پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے:

من قرء سورة لقمان، كان لقمان له رفيقًا يوم القيامة، و اعطى من الحسنات عشرًا عشرًا بعدد من عمل بالمعروف و عمل بالمنكر.

"جو شخص سورہ لقمان پڑھے، حضرت لقمان قیامت میں اس کے رفیق اور دوست ہوں گے اور جن لوگوں نے نیک یا بد اعمال انجام دیئے ہیں (امر بمعروف اور نہی از منکر کے حکم کے بعد) ان کی تعداد کے مطابق دس گنا نیکیاں اسے دی جائیں گی"[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام سے منقول ہے:

من قرء سورة لقمان في ليلة وكل الله به في ليلته ثلاثين ملكًا يحفظونه من ابليس وجنوده حتى يصبح فاذا قرئها بالنهار لم يزالوا يحفظونه من ابليس و جنوده حتى يمسى.

"جو شخص رات کو سورہ لقمان کی تلاوت کرے تو خداوند عالم تیس فرشتوں کو اس کی حفاظت کے لیے صبح تک شیطان اور اس کے لشکر کے مقابلہ کے لیے مامور کر دیتا ہے۔ اور اگر دن کو اس کی تلاوت کرے تو تیس فرشتے غروب آفتاب تک شیطان اور اس کے لشکر سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔"[2]

ہم بارہا عرض کر چکے ہیں اور اب بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی ایک سورت پڑھنے کے اس قدر فضائل، اس قدر ثواب اور اعزاز اس بناء پر ہیں کہ چونکہ تلاوت، فکر و نظر اور غور و فکر کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور غور و فکر عمل کرنے کا مقدمہ ہے۔ ورنہ محض زبانی فرفر پڑھ لینے سے ان تمام فضیلتوں کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔

---

[1] مجمع البیان ج ۸ ص ۳۱۲۔ [2] نورالثقلین جلد ۴ صفحہ ۱۹۳۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ الٓمّٓ ○

۲۔ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِیۡمِ ○

۳۔ هُدًى وَّرَحۡمَةً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ○

۴۔ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ○

۵۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ الم۔

۲۔ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں (مطالب سے لبریز اور محکم آیات)۔

۳۔ نیک لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت کا سبب ہیں۔

۴۔ وہی جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

۵۔ وہی لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔

تفسیر

نیکوکار کون لوگ ہیں؟

یہ سورہ قرآن مجید کی عظمت و اہمیت کے ذکر کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور حروف مقطعات کا اس کی ابتداء میں ہونا بھی اس

حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ یہ آیات جو الف با جیسے سادہ سے حروف سے مرکب ہیں اس قسم کے عظیم اور اعلیٰ معنا حامل بھی ہیں جو انسانوں کی تقدیر یکسر بدل کر رکھ دیتی ہیں: (الم)۔

لہٰذا حروف مقطعات کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں" (تلك ایات الکتاب الحکیم)۔ "تلك" عربی زبان میں دور کے اشارے کے لیے آتا ہے اور جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ یہ تعبیر خاص طور پر ان آیات کی عظمت و اہمیت کر رہی ہے۔ گویا یہ آیات آسمان کی سی بلندی اور نہایت ارفع مقام کی حامل ہیں۔

"کتاب" کو "حکیم" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یا تو اس کے مندرجات کا استحکام ہے کیونکہ باطل ہرگز اس تک حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ہر قسم کی خرافات اور بیہودگی اس سے کوسوں دور ہے۔ یہ کتاب سوائے حق کے کوئی بات نہیں کہتی اور راہ حق کے کسی چیز کی دعوت نہیں دیتی۔ ٹھیک "لھو الحدیث" (لغو اور بیہودہ باتوں) کے مقابلے میں ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

یا پھر اس معنی میں ہے کہ یہ قرآن ایک دانشمند اور حکیم و دانا عالم کی طرح ہے جو خاموش رہ کر بھی بہ ہزار زبان گفتگو کرتا ہے تعلیم دیتا ہے، پند و نصیحت کرتا ہے، تشویق و ترغیب دلاتا ہے، عذاب سے ڈراتا ہے اور عبرت انگیز داستانیں بیان کرتا ہے۔ خلاصہ یہ سب یہ ہر لحاظ سے حکمت سے لبریز ہے۔ اور یہ آغاز حضرت "لقمان حکیم" کی باتوں سے براہ راست مناسبت رکھتا ہے جن کا اس سو میں تذکرہ ہے۔

البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "حکمت" کے دونوں معانی مراد لیے جائیں۔

بعد والی آیت نزول قرآن کا اصلی مقصد یوں بیان کرتی ہے: "یہ کتاب حکیم نیکوکاروں کے لیے سبب ہدایت و رحمت ہے" (ھدًی و رحمة للمحسنین)۔

"ہدایت" درحقیقت مقدمہ اور تمہید ہے "رحمت پروردگار" کے لیے کیونکہ انسان پہلے نور قرآن کی روشنی میں حقیقت کو معلوم کر ہے اور اس پر عقیدہ رکھتا ہے اور اسے اپنے عمل کا پیش خیمہ بناتا ہے اس کے بعد اپنے پروردگار کی وسیع رحمت اور بے انتہا نعمتوں کا حقدار بنتا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیہ میں قرآن مجید کو "محسنین" کے لیے ہدایت اور رحمت کا سبب شمار کیا گیا ہے اور سورہ نمل کی ابتداء میں "مؤمنین" کے لیے باعث ہدایت و بشارت بتایا گیا ہے: (ھدًی و بشری للمؤمنین)

اور سورہ بقرہ کی ابتداء میں "متقین" کے لیے سبب ہدایت ذکر کیا گیا ہے: (ھدًی للمتقین)

ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف تعبیریں اس لیے ہوں کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر حقائق کو قبول اور تسلیم کرنے کی روح انسان میں پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی طبیعی طور پر کوئی ہدایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر حق کو قبول کرنے کے اس مرحلہ سے گزر جائیں اور ایمان کا مرحلہ آجائے تو پھر ہدایت کے علاوہ نعمات خداوندی کی بشارت بھی موجود ہوگی۔

اور اگر ایمان اور تقویٰ کے مراحل سے گزر کر عمل صالح کی حد تک جا پہنچیں تو وہاں رحمت خدا میں بھی اضافہ ہوگا۔

اسی بناء پر اوپر والی تین آیات بندگان خدا کے تدریجی کمال اور ارتقائی مراحل میں سے سلسلہ وار تین مراحل کو بیان کرتی ہیں۔ حق کو

قبول کرنے کا مرحلہ، ایمان کا مرحلہ اور عمل صالح کا مرحلہ۔ اور قرآن ان تینوں مراحل میں بالترتیب "ہدایت" "بشارت" اور "رحمت" کا سرمایہ ہے
(غور کیجئے)۔

بعد والی آیت محسنین کو تین اوصاف سے کے ساتھ متصف کرتے ہوئے کہتی ہے" وہ ایسے لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے
ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"۔(الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم بالاٰخرۃ ھم یوقنون)۔
ان کا خالق کے ساتھ نماز کے ذریعہ اور مخلوق کے ساتھ زکوٰۃ کے ذریعہ اٹوٹ رابطہ ہے اور قیامت کی عدالت کے بارے میں
یقین ان کا قوی سبب ہے کہ وہ گناہ سے پرہیز اور فرائض کر ادا کرتے ہیں۔

اور محل بحث آخری آیت میں "محسنین" کی عاقبت اور انجام کار کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ" وہ اپنے پروردگار کے طریق ہدایت پر
ہیں اور وہی رستگاری اور فلاح پانے والے ہیں"۔(اولٓئک علی ھدًی من ربھم واولٓئک ھم المفلحون)۔
"اولٓئک علی ھدًی من ربھم" کا جملہ ایک طرف تو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ پروردگار ان کی ہدایت کا ضامن ہے
اور دوسری طرف "علیٰ" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ گویا ہدایت ان کے لیے ایک راہوار اور مرکب ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر
مکمل طور پر اسی پر مسلط ہیں۔

اور یہاں پر اس "ہدایت" کا فرق اس ہدایت سے جو اسی سورہ کے آغاز میں آئی ہے، واضح ہو جاتا ہے کیونکہ پہلی ہدایت حق کے
قبول کرنے کی آمادگی ہے اور یہاں پر بیان شدہ ہدایت مقصد تک پہنچنے کا سرنامہ ہے۔
یاد رہے کہ "اولٓئک ھم المفلحون" کا جملہ جو عربی ادب کے مطابق حصر کی دلیل ہے اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ
نجات اور فلاح کی راہ بس یہی ہے یعنی نیک لوگوں کی راہ، ان کی راہ جو خدا اور خلق خدا کے ساتھ قریبی رابطہ رکھتے ہیں، اور ان کی راہ جو
مبدا، اور معاد پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔

۶۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۖ وَّیَتَّخِذَھَا ھُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ
عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ۝

۷۔ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسْتَکْبِرًا کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا
کَاَنَّ فِیْٓ اُذُنَیْہِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝

۸۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ جَنّٰتُ النَّعِیْمِ ۝

۹۔ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

ترجمہ

۶۔ بعض لوگ باطل اور بیہودہ باتیں (باقاعدہ) خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو جہالت و نادانی کی بناء پر گمراہ کریں اور
آیات الٰہی کا استہزاء کریں اور مذاق اڑائیں۔ ان کے لیے ذلیل اور خوار کرنے والا عذاب ہے۔
۷۔ جس وقت اس پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ تکبر کی بناء پر ان سے منہ موڑ لیتا ہے گویا اس نے سنا
ہی نہیں۔ گویا اس کے کان بالکل بہرے ہیں۔ اسے دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔
۸۔ (لیکن) جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں نعمتوں سے بھرے ہوئے بہشت کے
باغات ان کے لیے ہیں۔

۹۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہ خدا کا مسلّم اور یقینی وعدہ ہے اور وہی عزیز و حکیم (ناقابل شکست اور دانا) ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ زیر بحث پہلی آیات "نضر بن حارث" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، جو ایک تاجر شخص تھا اور تجارت

کی غرض سے ایران کا سفر کیا کرتا تھا اور ساتھ ہی ایرانیوں کی داستانیں قریش کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ اگر محمد اس ، تمہارے
سامنے عاد و ثمود کی داستانیں بیان کرتا ہے تو میں تمہیں رستم اور اسفندیار کے قصے کہانیاں اور کسریٰ اور سلاطین عجم کی خبریں سناتا ہوں چنانچہ
وہ اس کے گرد بیٹھ جاتے اور قرآن کو چھوڑ کر اس کی داستانوں کو خوب غور سے اور کان لگا کر سنتے تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیات کا یہ حصہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوا ہے جس نے ایک گویا لونڈی خرید رکھی تھی جو وہ دن رات
گانے گا گا کر اسے یاد خدا سے غافل رکھتی تھی۔

عظیم مفسر طبرسی مرحوم اس شان نزول کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ وہ حدیث جو پیغمبر اسلامؐ سے اس سلسلے میں نقل ہوئی ہے
وہ اسی نظریے کی تائید کرتی ہے کیونکہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں :

لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعهن ، و اثمانهن حرام و قد نزل تصدیق ذلك فی کتاب الله " و من
الناس من یشتری لهو الحدیث ...

گانے والی کنیزوں کو تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا اور اس طریقے سے حاصل کی ہوئی آمدنی سب کچھ حرام ہے۔ اور یہ
آیت اسی مطلب پر شاہد ہے : (و من الناس من یشتری لهو الحدیث ...)۔

تفسیر

غنا شیاطین کے بڑے جالوں میں سے ایک جال ہے :

ان آیات میں گفتگو اس گروہ کے بارے میں ہے جو "محسنین" اور "مومنین" کے گروہ کے بالکل مدمقابل قرار دیئے گئے ہیں جن کا
ذکر گزشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔

یہاں پر گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے سرمائے کو بیہودہ اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اپنے
لیے دنیا و آخرت کی بدبختی مول لیتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے "بعض لوگ وہ ہیں جو باطل اور بیہودہ باتیں خرید کرتے ہیں تاکہ خلق خدا کو جہالت اور نادانی کی بنا پر راہ خدا سے
گمراہ کریں" : (و من الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله بغیر علم) "اور یہ آیاتِ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں" : (و
یتخذها هزوًا)[1]

اور آیت کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے "ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے" : (اولئك لهم عذاب مهین)۔

باطل اور بیہودہ باتوں کی خریداری یا تو اس طرح ہے کہ وہ واقعاً باطل اور خرافات سے بھرپور داستانیں پیسے دے کر حاصل

---

[1] یتخذها کی ضمیر " آیات الکتاب " کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا گزشتہ آیات میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور بعض مفسرین کا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ "سبیل" کی طرف لوٹتی ہے جو قرآن مجید میں کبھی مذکر اور کبھی مونث استعمال ہوا ہے۔

کرتے ہیں جیسا کہ "نضر بن حارث" کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔

اور یا اس طرح سے ہے کہ لہو و لعب اور راگ و رنگ کی محفلیں گانے والی کنیزیں خرید کر منعقد کرتے ہیں جیسا کہ اسی آیت کے شان
نزول کے ضمن میں پیغمبر اکرمؐ کی حدیث بیان ہو چکی ہے۔

یا وہ مال و دولت کو اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ اس غیر شرعی مقصد یعنی باطل اور بے ہودہ باتوں تک رسائی
ضرور حاصل کریں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ دل کے اندھے باطل اور لغویات کو تو گراں ترین قیمت ادا کر کے بھی خرید لیتے ہیں لیکن آیات الٰہی
اور حکمت سے بھرپور اقوال جو خداوند عالم نے بلا قیمت انہیں دیئے ہیں ، اُن کی پرواہ تک نہیں کرتے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں پر (اشتراء) یعنی خریداری کو کنایہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو جس سے مراد اس مقصد تک پہنچنے کے لیے
ہر قسم کی سعی و کوشش ہے۔

لیکن "لهو الحدیث" کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کی باتوں یا سرگرم رکھنے اور غافل کرنے والی راگ و رنگ کی سُروں اور آہنگوں
کو بھی شامل ہے جو انسان کو بے ہودگی یا برائی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ چاہے وہ غنا ہو ، گانا ہو ، شہوت انگیز و ہوس آلود لحن اور
آہنگیں ہوں یا ایسی تقریریں اور تحریریں جو آہنگ و طرز کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے مفہوم و مطالب کے لحاظ سے انسان کو برائیوں کی
طرف کھینچ کر لے جائیں۔

یا دونوں طریقوں سے جیسا کہ عام گانے والوں کی تصنیفات اور عشقیہ اشعار ہوتے ہیں۔ اور ان کے مضامین بھی گمراہ کن ہوتے ہیں اور
آہنگیں اور سریں بھی۔

یا وہ واہیات اور خرافات قصے کہانیاں اور داستانیں ہوتی ہیں جو لوگوں کو خدا کے مقرر کردہ "صراط مستقیم" سے انحراف کا سبب
بنتی ہیں۔

یا تمسخر آمیز اور ہنسی مذاق پر مبنی باتیں جو حق کو مٹانے اور ایمان کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ابوجہل اور
اس کے احباب کے بارے میں ابھی بیان کر چکے ہیں کہ وہ قریش کی طرف منہ کر کے کہتا تھا :

" آیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں وہ "زقوم" کھلاؤں جس سے محمدؐ تمہیں ڈراتے ہیں ؟"

پھر وہ کسی کو بھیج کر " مکھن اور خرما" منگوالیتا اور کہتا " یہ وہی زقوم ہے " اور اس طرح سے وہ آیات الٰہی کا مذاق اڑاتا تھا۔

بہرحال " لهو الحدیث " ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام مذکورہ اشیاء اور امور کو شامل ہے۔ اور اگر اسلامی روایات اور مفسرین
کے اقوال میں ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے تو وہ ہرگز آیت کے مفہوم کے انحصار اور محدودیت کی دلیل نہیں ہے۔

جو احادیث اہل بیت اطہار (ع) سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو اس لفظ کے مفہوم کی وسعت کو بیان کرتی ہیں۔
منجملہ ان کے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے :

الغناء مجلس لا ینظر الله الی اهله، و هو مما قال الله عز وجل " و من الناس من یشتری لهو الحدیث
لیضل عن سبیل الله ۔

غنا اور لہو ولعب کی محفل ایسی محفل ہے جس کے اہل پر خدا (اپنے لطف وکرم) کی نگاہ نہیں ڈالتا۔ اور یہ اسی آیہ کا مصداق ہے کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو بیہودہ باتوں کو خرید کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے گمراہ کردیں [1]

"الحدیث اللھو" کی بجائے "لھوالحدیث" کو بیان کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا اصل مقصد تو وہی لہو ولعب ہے بات یا گفتگو تو اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

"لیضل عن سبیل اللہ" کا جملہ بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو اعتقادات ... کرنے کو بھی شامل ہے جیساکہ ابھی نضر بن حارث اور ابوجہل کی داستان میں بیان ہو چکا ہے۔ اور اخلاقی طور پر گمراہ کرنے کو بھی شامل ہے جیسا کہ غنا کے بارے میں مذکور احادیث میں آیا ہے۔

"بغیر علم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ گمراہ اور منحرف گروہ اپنے باطل مذہب پر بھی ایمان نہیں رکھتا بلکہ صرف جہالت اور اندھی تقلید کی وجہ سے دوسروں کی پیروی کرتے ہیں اور ایسے جاہل ہیں کہ دوسروں کو بھی اپنی جہالت اور نادانی میں پھنساتے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے اگر ہم "بغیر علم" کی تعبیر کو گمراہ کرنے والوں کی صفت قرار دیں۔ لیکن بعض مفسرین کا یہ احتمال بھی ہے کہ شاید "گمراہ ہونے والوں" کی صفت ہے۔ یعنی وہ جاہل اور بے خبر لوگوں کو لاشعوری طور پر وادی انحراف وباطل کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

یہ بے خبر لوگ کبھی کبھار اس سے بھی آگے چلے جاتے ہیں یعنی وہ صرف ان سرگرمیوں، کھیل کود اور غافل کرنے والی حرکتوں پر ہی قانع نہیں ہوتے بلکہ اپنی فضول، لایعنی اور بے ہودہ باتوں کو آیات الٰہی کے مذاق اور تمسخر کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جس کی طرف اوپر والی آیت کے آخر میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے" ویتخذ ھا ھزوًا "

باقی رہا "عذاب" کو "مھین" (خوار اور رسوا کرنے والا) کے ساتھ موصوف کرنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا کو جرم کے مانند ہونا چاہیئے۔ انہوں نے آیات الٰہی کی توہین کی تو خدا نے بھی ان کے لیے وہی سزا معین کی ہے جو دردناک ہونے کے علاوہ ذلت آمیز بھی ہے۔

بعد والی آیت، آیات الٰہی کے مقابلہ میں اس گروہ کے ردعمل کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ درحقیقت لہوالحدیث کے مقابلہ میں ان کے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے فرماتا ہے "جس وقت ان کے سامنے آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ متکبرانہ انداز میں منہ پھیر لیتا ہے گویا اس نے ہماری آیات کو سنا ہی نہیں، گویا اس کے کان بہرے ہیں" اور وہ بالکل ہی کوئی بات نہیں سنتا: (واذا تتلیٰ علیه اٰیاتنا ولّٰی مستکبرًا کان لم یسمعھا کانّ فی اذنیه وقرًا)۔

اور آخر میں اس شخص کی سزا اور دردناک عذاب کو اس طرح بیان کرتا ہے "اس کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو" (فبشرہ بعذاب الیم)۔

"ولّٰی مستکبرًا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کا روگردانی کرنا اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے دنیاوی مفادات اور ہوس رانی پر زد پڑ رہی ہوتی ہے بلکہ معاملہ تو اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ یہ کہ خدا و آیاتِ خدا کے مقابلہ میں استکبار وتکبر جو عظیم ترین گناہ ہیں اس کے عمل میں موجود ہیں۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ پہلے تو یہ کہا ہے کہ "وہ اس طرح آیات الٰہی سے بے اعتنائی کرتے ہیں گویا انہیں سنا ہی نہیں اور مکمل طور

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۲۲۸ (باب تحریم الغناء)۔

پر بے اعتنائی کے ساتھ ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں" پھر مزید کہتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ان آیات کو سنتا ہی نہیں بلکہ وہ بالکل بہرہ ہے اور کوئی بات نہیں سن پاتا۔

اس قسم کے افراد کی سزا بھی ان کے اعمال سے مطابقت رکھتی ہے کہ جس طرح ان کا عمل اہل حق کے لیے دردناک تھا خدا نے اس کی سزا بھی دردناک مقرر کی ہے کہ انہیں دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "بشر" (خوشخبری دیدو) کی تعبیر خدا کے دردناک عذاب کے سلسلہ میں ایسے مستکبرین کے کام کے شایان شان ہے جو آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے اور ابوجہل جیسے افراد جو "زقوم جہنم" کی "مکھن اور خرما" سے تفسیر کرتے تھے۔

بعد والی آیات میں سچے مومنین کے حالات کی تفصیل وتشریح کی طرف لوٹتا ہے کہ ابتداء میں جن کے ساتھ یہ تقابل شروع ہوا آخر میں اختتام بھی انہی پر کرتا ہے، فرماتا ہے" جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیا تو نعمت سے بھرپور جنت کے باغات ان کے لیے ہیں" (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لھم جنّات النعیم)۔

جی ہاں! یہ گروہ مومناں، بے ایمان مستکبرین اور دل کے اندھوں کے بالکل برعکس ہے جو نہ تو دنیا میں خدا کے ... نشانیوں کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی خدا کے بھیجے پیغمبروں کے ارشادات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں بلکہ یہ مومن لوگ بیدار عقل وخرد اور چشم بینا ... شنوا کے حکم سے جو خدا نے انہیں عطا فرمائے ہیں آیات الٰہی پر ایمان بھی لاتے ہیں اور اپنے اعمال صالحہ میں انہیں استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ مرحلے کی بات یہ ہے کہ وہ مستکبرین "عذاب الیم" کے اور یہ مومنین "جنات نعیم" کے مستحق ہیں۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنت کے پرنعمتوں بھرے باغات ان کے لیے جاودانہ اور ہمیشہ کے لیے ہیں "ہمیشہ ان میں رہیں گے" (خالدین فیھا)۔

"یہ خدا کا اٹل اور مسلّم وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہوسکتی" (وعد اللہ حقًّا)۔ خدا نہ تو جھوٹا وعدہ کرتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے وعدہ کی وفائی سے عاجز ہے کیونکہ "وہ عزیز" صاحب قدرت اور حکیم و آگاہ ہے" (وھوالعزیز الحکیم)۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ مستکبرین کے بارے میں "عذاب" بصورت مفرد ذکر ہوا ہے اور صالح العمل مومنین کے بارے میں "جنات" کو جمع کی صورت میں بیان کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی رحمت ہمیشہ اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

خلود اور خدا کے وعدہ حق پر تاکید کرنا بھی "رحمت" کے "غضب" پر زیادہ ہونے کی تاکید ہے۔ "نعیم" جو "نعمت" کے ... سے ہے ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی مادی اور معنوی نعمتوں کو شامل ہے یہاں تک کہ ان نعمتوں کو بھی جو اس دنیا کے زندان ... میں محبوس و مقید لوگوں کے لیے قابل ادراک ہیں۔ "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "نعیم" "بہت سی نعمتوں" کے معنی میں ہے (النعیم النعمة الکثیرة)

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ غنا کی حرمت :

اس میں شک نہیں کہ غنا (گانا) مشہور شیعہ علماء کی نظر میں حرام ہے اور اجماع و اتفاق کی حد تک شہرت رکھتا ہے۔

بہت سے علماء اہل سنت بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ استثناء کے بھی قائل ہوئے ہیں اور شاید ان میں سے بعض استثناء
درحقیقت استثناء نہ ہوں بلکہ ان کا شمار غنا کے موضوع سے خارج ہو۔ (جسے اصطلاح میں "تخصص" کے لحاظ سے خارج کہا جاتا ہے)۔
"قرطبی" زیر بحث آیات کے ذیل میں اس بارے میں یوں کہتے ہیں "بعض لوگوں کے درمیان جو غنا اور گانا معمول ہے وہ وہ ہے
جب عورتوں کے بارے میں عشقیہ اشعار، ان کے حسن و جمال کی تعریف اور شراب و کباب اور دوسرے محرمات کا تذکرہ ہو۔ تو ایسی صورت میں
تمام علماء اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ کیونکہ یہ لہو و لعب اور غنائے مذموم کا مصداق ہے۔ لیکن اگر ان امور سے خالی ہو تو اس کا کچھ حصہ عید اور شادی
کے جشنوں میں جائز ہوتا ہے۔ اور اسی طرح مشکل کاموں کے انجام دینے کے وقت فرحت اور نشاط بخشنے کے لیے گاتے ہیں جیسا کہ تاریخ
اسلام میں خندق کھودنے کے سلسلہ میں ملتا ہے یا جو اشعار "انجشہ" نے قافلوں کے مکہ کی طرف چلنے کے وقت حجۃ الوداع کے موقعہ
پر اونٹوں کے لیے پڑھے تھے لیکن موجودہ زمانہ میں جو کچھ "صوفیا" کے درمیان معمول ہے کہ وہ اس سلسلہ میں انواع و اقسام کے آلات طرب و
نشاط استعمال کرتے ہیں، حرام ہے[1]

قرطبی نے استثناء کی جو صورت بیان کی ہے مثلاً "حدی خوانی" (مخصوص آوازیں گانا، جو اونٹوں کے چلاتے وقت گایا جاتا ہے)
یا وہ مخصوص اشعار جو مسلمان خندق کھودتے وقت خاص طرز میں پڑھتے تھے احتمال قوی یہ ہے کہ یہ نہ تو غنا کی جزء تھے اور نہ ہیں۔ اسی طرح وہ
اشعار بھی غنا نہیں جو مخصوص آوازیں مذہبی جلسوں، جشنوں اور عزاداری کے مواقع پر پڑھے جاتے ہیں۔
اسلامی مصادر کے لحاظ سے غنا کی حرمت پر ہمارے پاس بہت سے دلائل موجود ہیں جن میں سے ایک تو وہی اوپر والی آیت
ومن الناس من یشتری لھو الحدیث ۔۔۔۔ ہے نیز اور بھی قرآنی آیات ہیں جو کم از کم ان روایات کی رو سے جو ان آیات کی تفسیر
میں وارد ہوئی ہیں غنا اور گانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں۔ یا ان کی رو سے غنا اور گانا حرام ہوتا ہے۔
ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:
واجتنبوا قول الزور (حج ۳۰) والی آیت کی تفسیر میں فرمایا: قول الزور، الغناء۔
"باطل بات، غنا ہی تو ہے"۔[2]
نیز آپ ہی نے آیہ والذین لا یشھدون الزور (فرقان-۷۲) کی تفسیر میں فرمایا:
"اس سے مراد غنا ہے"۔[3]
اور اسی زیر بحث آیت کی تفسیر میں متعدد روایات امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ اور امام علی رضا علیہم السلام سے منقول ہیں کہ
"لھو الحدیث" کے مصداقوں میں سے ایک مصداق جو "عذاب مہین" کا سبب ہے غنا اور راگ رنگ بتایا گیا ہے[4]
علاوہ ازیں، آیات کی تفسیر سے ہٹ کر اور بھی بہت سی روایات اسلامی کتابوں میں ملتی ہیں جو زوردار انداز میں غنا کی حرمت
کو بیان کرتی ہیں۔
ایک حدیث جو جابر بن عبداللہ انصاری نے پیغمبر اسلام سے بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں:
کان ابلیس اول من تغنی "شیطان وہ پہلا شخص ہے جس نے گانا گایا"[5]

[1] تفسیر قرطبی ج ۸ صفحہ ۵۱۳۴ [2]، [3]، [4]، [5] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵ تا ۲۲۷-۲۳۱- باب ۹۹ تحریم الغناء۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:
بیت الغناء لاتؤمن فیہ الفجیعۃ، ولا تجاب فیہ الدعوۃ، ولا یدخلہ الملک
"جس گھر میں گانا گایا جاتا ہو وہ موت اور مصائب و آلام سے محفوظ نہیں ہوتا اور نہ تو اس میں دعا قبول ہوتی
ہے اور نہ ہی فرشتے داخل ہوتے ہیں"۔[1]
ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:
الغناء یورث النفاق و یعقب الفقر
"غنا روح نفاق کو پروان چڑھاتا اور فقر و فاقہ اور بدبختی وجود میں لاتا ہے"۔[2]
امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپؑ نے گانے والی عورت اور جو شخص اسے اجرت دیتا ہے
اور جو اس کی کمائی کھاتا ہے ان سب کو ملعون اور رحمت خدا سے دور لوگوں کے زمرے میں شمار فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
المغنیۃ ملعونۃ، ومن اداھا ملعون، واکل کسبھا ملعون[3]
اہلسنت کے مشہور منابع میں بھی اس بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔
منجملہ ان کے وہ روایت ہے جو "درمنثور" میں محدثین کی کثیر جماعت سے ابوامامہ کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے جس
میں آپؐ فرماتے ہیں:
لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعھن واثمانھن حرام۔
"گانے والی عورتوں کو تعلیم دینا حلال نہیں ہے اور اسی طرح ان کنیزوں کی خرید و فروخت اور وہ چیز جو
اس کے مقابلے میں لی جائے نیز حرام ہے"۔[4]
اس سے ملتے جلتے معانی کو مؤلف "التاج" نے ترمذی اور امام احمد سے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: التاج جلد ۵ صفحہ ۲۸۷
"ابن مسعود" نے پیغمبر اسلامؐ سے نقل کیا ہے آپؐ نے فرمایا:
الغناء ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء البقل
"غنا اور راگ رنگ، روح نفاق کو دل میں اس طرح پروان چڑھاتا ہے جس طرح پانی سبزہ جات کو"۔[5]
مجموعی طور پر جو روایات اس بارے میں نقل ہوئی ہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ تواتر کی حد تک جا پہنچتی ہیں۔ اسی بنا پر اکثر علماء اسلام
نے اس کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، علاوہ شیعہ علماء کے جو تقریباً اس بارے میں متفق القول ہیں، اس کی حرمت، ابوحنیفہ سے بھی منقول
ہے۔ اور جس وقت اہلسنت کے مشہور امام، احمد سے غنا کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا:
ینبت النفاق "انسان کے اندر روح نفاق کو اگاتا ہے"
اسی طرح اہلسنت کے ایک اور امام، مالک نے اسی سوال کے جواب میں فرمایا:

[1]، [2] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵-۲۳۰۔ [3] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۲۸ [4] درمنثور ذیل آیہ زیر بحث۔ [5] ...

یفعله الفساق ”فاسق لوگ ہی اس کے پیچھے جاتے ہیں“

اور امام ”شافعی“ نے تو صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ:

”گانے والوں کی شہادت (گواہی) قابل قبول نہیں ہے اور یہ خود ان کے فسق کی دلیل ہے“

شافعی کے اصحاب سے بھی نقل ہوا ہے کہ وہ اس بارے میں ان کا فتویٰ حرمت پر مبنی جانتے ہیں، برخلاف اس کے جو بعض لوگوں نے خیال کیا ہے[1]

۲- غنا کیا ہے؟

حرمت غنا کے بارے میں تو چنداں مشکل نہیں، مشکل امر تو غنا کے موضوع کی تشخیص ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر اچھی اور خوبصورت آواز غنا ہے؟

یقیناً ایسا نہیں ہے، کیونکہ اسلامی روایات میں بھی ہے اور مسلمانوں کی سیرت بھی اسی بات کو بیان کرتی ہے کہ قرآن، اذان اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو اچھی اور زیبا آواز سے پڑھنا چاہیئے۔

کیا غنا ہر وہ آواز ہے جس میں ”ترجیع ہو“ (گلے میں آواز کی الٹ پھیر جسے اصطلاح میں آواز کا پھیرنا یا گٹکری مارنا کہا جاتا ہے)، یہ بھی ثابت نہیں۔

اس بارے میں جو کچھ فقہاء اور اہل لغت کے بیانات سے مجموعی طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ غنا، طرب انگیز آہنگوں، سُروں، لہو اور باطل کو کہتے ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں وہ آہنگیں اور طرزیں ہیں جو فسق وفجور اور اہل گناہ وفساد کی محفلوں کے لائق اور شایان ہیں، غنا میں شامل ہیں۔

بالفاظ دیگر غنا اس آواز کو کہا جاتا ہے جو انسان کے اندر شہوانی طاقتوں کو ہیجان میں لائیں اور انسان اس حالت میں محسوس کرے کہ اگر اس آواز کے ساتھ ساتھ شراب اور جنسی لذات بھی ہوں تو مکمل طور پر مناسب ہوگا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ کبھی ایک ”آہنگ“ وطرز خود بھی غنا، لہو اور باطل ہے، اور اس کے مشمولات اور مضامین بھی، وہ اس لحاظ سے کہ عشقیہ اور فساد انگیز اشعار کو مطربانہ آہنگوں اور طرزوں کے ساتھ پڑھا جائے۔ اور کبھی صرف آہنگ وطرز غنا ہوتی ہے اس طرح سے کہ اچھے مطالب پر مبنی اشعار یا قرآنی آیات، دعا اور مناجات کو اس طرز کے ساتھ پڑھیں جو عیاش اور بدکار افراد کی محافل کے لائق ہوتی ہیں تو ان دونوں صورتوں میں حرام ہے۔ (غور کیجئے)۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات غنا کے دو معنی کئے جاتے ہیں ”عام معنی“ اور ”خاص معنی“ خاص معنی تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی شہوت کو بھڑکانے والی اور فسق وفجور کی محفلوں سے تعلق رکھنے والی آہنگیں، طرزیں اور سُریں، لیکن اس کا عام معنی ہر قسم کی اچھی آواز ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے غنا کی عام معنی سے تفسیر کی ہے اس کی دو قسمیں کی ہیں، ”حلال غنا“ اور ”حرام غنا“

[1] تفسیر روح المعانی اسی آیہ کے ذیل میں۔

حرام غنا سے مراد وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور حلال غنا سے مراد زیبا اور اچھی آواز ہے جو فساد انگیز بھی نہ ہو اور فسق وفجور کی محفلوں سے بھی اس کا تعلق نہ ہو۔

تو اس بنا پر تقریباً اصل تحریم غنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے صرف اس کی تفسیری نوعیت میں اختلاف ہے۔

البتہ (دوسرے مفاہیم کی طرح) غنا کے مشکوک مصداق بھی ہیں جہاں انسان واقعاً نہیں جان سکتا کہ فلاں آواز فسق وفجور کی محافل سے تعلق رکھتی ہے یا نہیں؟ تو اس صورت میں اصل برائت کے حکم کے تحت اس پر حلال ہونے کا حکم لگایا جائے گا، (البتہ تعریف بالا کے مطابق غنا کے عرفی مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد)۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حماسی (یعنی حربی آوازیں، طرزیں اور آہنگیں جو جنگ یا ورزش وغیرہ کے میدانوں سے تعلق رکھتی ہیں) کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ملتی۔

البتہ غنا کے سلسلہ میں کئی ایک مباحث ہیں از قبیل ان چند مستثنیات کے جن کے بعض علماء قائل ہیں اور بعض قائل نہیں ہیں، اسی طرح کئی اور مسائل جن کا تعلق فقہ سے ہے۔

آخری بات جس کا تذکرہ ہم یہاں پر ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس کا تعلق صرف اور صرف غنا اور گانے سے ہے، (رہا موسیقی اور اس کے آلات کا استعمال وہ ایک علیٰحدہ بحث ہے جو ہمارے اس موضوع سے باہر ہے۔

۳- حُرمت غنا کا فلسفہ:

”غنا“ کے مفہوم میں ان شرائط کے ساتھ مکمل غور وخوض سے کہ جن کی تفصیل وتشریح ہم بیان کر چکے ہیں، اس کی حرمت کا فلسفہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اگر اس میں تھوڑا سا بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو اس کے مندرجہ ذیل مفاسد اور تباہکاریوں کا پتہ چلتا ہے:

الف: اخلاقی تباہ کاریوں کی رغبت: تجربہ بتاتا ہے اور تجربہ ہی بہترین شاہد ہے کہ بہت سے افراد غنا اور راگ کی سروں اور طرزوں سے متاثر ہو کر تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ کو چھوڑ کر خواہشات نفسانیہ کی تکمیل کا رخ کر چکے ہیں۔

عام طور پر مجالس غنا انواع واقسام کی خرابیوں کا مرکز ہیں اور جو چیز ان خرابیوں کو وسعت بخشتی ہے وہ غنا ہی ہے۔

بعض غیر ملکی اخبارات کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ راگ ورنگ کی کسی محفل میں جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھا تھے وہاں پر غنا کی ایک ایسی طرز لگائی گئی کہ اس سے ان کے جذبات اس قدر بھڑک اٹھے کہ وہ بے قابو ہو کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر جنسی برائیوں کا ارتکاب کیا کہ قلم ان کے ذکر سے شرماتا ہے۔

تفسیر ”روح المعانی“ میں ”بنی امیہ“ کے کسی سردار سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ اس نے امویوں سے کہا راگ رنگ اور گانے بجانے سے پرہیز کرو کیونکہ یہ شرم وحیا کو کم، شہوت میں اضافہ اور شخصیت کو بے آبرو کر دیتے ہیں، شراب کے جانشین ہیں اور وہی سب کچھ کر گزرتے ہیں جو مستی کرتی ہے[1]

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۱ صفحہ ۶۰۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ راگ رنگ اس قدر بری چیزیں ہیں؟ انہیں یہ لوگ بھی سمجھ چکے تھے۔

اور اگر اسلامی روایات میں ہمیں بارہا یہ چیز نظر آتی ہے کہ غنا اور راگ دل میں روح نفاق کی پرورش کرتا ہے تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ روح نفاق وہی فساد سے آلودہ اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے کنارہ کشی اختیار کرنے والی روح ہوتی ہے۔

نیز اگر روایات میں آیا ہے کہ جس گھر میں گانا گایا جاتا ہے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے تو بھی اسی فساد کی آلودگی کی وجہ ہوتی ہے کیونکہ فرشتے خود پاک ہیں اور پاکیزہ چیزوں کے طالب ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس قسم کے آلودہ ماحول سے بیزار ہوتے ہیں۔

ب۔ یادِ خدا سے غفلت: بعض اسلامی روایات میں غنا کی تفسیر میں اسے "لہو" بھی کہا گیا ہے، تو یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ غنا انسان کو شہوات میں اس طرح مست کر دیتا ہے کہ وہ یادِ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔

اُوپر والی روایات میں ابھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ "لھو الحدیث" "سبیل اللہ" سے "ضلالت" گمراہی کا ایک عامل اور "عذاب الیم" کا موجب ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

کل ما الھی عن ذکر اللہ فھو من المیسر۔ ہر وہ چیز جو انسان کو یادِ خدا سے غافل (اور شہوات نفسانیہ میں داخل) کر دے وہ قمار یا جوئے کے حکم میں ہے۔[1]

ج۔ اعصاب پر اس کے مضر اثرات: غنا اور موسیقی درحقیقت اعصابی نشے کے اہم عامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں منشیات کبھی تو منہ کے ذریعہ یا پینے کی وجہ سے انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہیں (جیسے شراب ہے)۔

کبھی سونگھنے یا قوت شامہ کے ذریعہ (جیسے ہیروئن ہے)۔

کبھی انجکشن INJECTION کے ذریعہ (جیسے مارفین ہے)۔

اور کبھی قوت سامعہ (کانوں) کے ذریعہ (جیسے راگ و رنگ اور غنا و گانا ہے)۔

اسی بناء پر کبھی کبھی غنا اور اس کی مخصوص طرزیں انسان کو نشے میں اس قدر غرق کر دیتی ہیں کہ اس میں مستی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے البتہ بعض اوقات اس مرحلے تک نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی معمولی سا نشہ ضرور آ ہی جاتا ہے۔

اسی بنا پر غنا میں منشیات کے بہت سے مفاسد پائے جاتے ہیں چاہے وہ خفیف ہوں یا شدید۔ مشہور موسیقی دانوں کے حالات زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی عمر کے دوران تدریجاً ایسی روحانی تکالیف اور پریشانیوں سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے اعصاب کھو بیٹھتے ہیں بلکہ کچھ لوگ تو نفسیاتی بیماریوں میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ اپنے عقل و شعور کو کھو بیٹھتے ہیں اور پھر دیارِ جنون کی طرف اس پار ہو جاتے ہیں۔ کچھ مفلوج، عاجز اور ناتواں ہو جاتے ہیں۔ اور بعض تو موسیقی کے دوران ہی خون کے دباؤ BLOOD PRESSURE میں مبتلا ہو کر ناگہانی سکتے کا شکار ہو جاتے ہیں۔[2]

بعض کتب جو انسانی اعصاب پر موسیقی کے مضر اثرات کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں، ان میں موسیقی دانوں اور گلوکاروں کی ایک جماعت کے بارے میں آیا ہے کہ وہ اپنا پروگرام پیش کرتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے۔[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۵۔ [2] کتاب تاثیر موسیقی بر روان و اعصاب صفحہ ۲۶۔ [3] تاثیر موسیقی بر روان و اعصاب صفحہ ۹۲ اور مابعد۔

خلاصہ یہ کہ اعصاب پر غنا اور موسیقی کے مضر اثرات، جنون کی پیدائش، خون کے دباؤ اور دوسری ناپسندیدہ تحریکات اس کثرت سے ہیں کہ ان پر زیادہ بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

موجودہ دور میں اس قسم کی اموات کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ دور کی نسبت اس زمانہ میں ناگہانی اموات کی تعداد زیادہ ہے اور اس اضافے کے متعدد عوامل ہیں جن میں سے ایک عالمی سطح پر موسیقی اور غنا کی افزائش ہے۔

۴۔ غنا، استعمار کا ایک حربہ ہے:

عالمی استعمار ہمیشہ سے عوام خاص کر نوجوان نسل کی بیداری سے دہشت زدہ ہے، اس بنا پر وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے اپنے وسیع پروگراموں میں معاشرے کو غفلت، لاعلمی اور ناآگاہی اور انواع و اقسام کی غلط سرگرمیوں کو شامل کئے ہوئے ہے تاکہ اس طرح سے وہ ان کا بیڑہ غرق کر دے۔

چنانچہ موجودہ دور میں اشیاء منشیات صرف تجارتی اہمیت کی حامل ہی نہیں رہیں بلکہ استعمار کا ایک اہم سیاسی حربہ بھی ہیں۔ فحاشی کے مراکز کا قیام، جوئے اور قمار بازی کے کلبوں CLUBES کی وسعت اسی طرح کی دوسری غلط سرگرمیاں ہیں جن میں سے غنا اور موسیقی کو رواج عام دینا بھی شامل ہے اور وہ استعمار کے عظیم آلات میں سے ایک ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے افکار کو مفلوج کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اسی بنا پر دنیا بھر کے ریڈیوز کے اوقات کا بیشتر حصہ موسیقی پروگرام پر مشتمل ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ عامہ کا ایک اہم اور عمدہ موضوع ہے۔

۱۰۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا وَ اَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَ بَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ○

۱۱۔ هٰذَا خَلۡقُ اللّٰهِ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ○

ترجمہ

۱۰۔ آسمانوں کو قابل رؤیت ستونوں کے بغیر خلق کیا اور زمین میں پہاڑ رکھے تاکہ تمہیں لرزا نہ دے اور ہر قسم کے حرکت کرنے والے کو اس پر پھیلا دیا۔ اور ہم نے آسمانوں سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ ہم نے روئے زمین پر مختلف قسم کے قیمتی نباتات کے جوڑے جوڑے اگائے۔

۱۱۔ یہ خدا کی خلقت ہے لیکن مجھے دکھاؤ کہ خدا کے علاوہ جو معبود ہیں انہوں نے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ لیکن ظالم تو واضح گمراہی میں ہیں۔

تفسیر

دوسروں نے کیا پیدا کیا؟

اس بحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قرآن اور اس پر ایمان کے بارے میں تھی موجودہ دو آیات میں توحید کے بارے میں ایک اور دلیل کا ذکر ہے جو عقیدہ کی نہایت بنیادی اصل ہے۔

پہلی آیت میں پروردگار عالم کی آفرینش کے پانچ حصوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو آپس میں اٹوٹ رشتہ رکھتے ہیں (آسمان کی

خلقت، کرات کا فضا میں معلق ہونا، زمین کا اپنی جگہ برقرار رہنا، پہاڑوں کی پیدائش اور پھر جانداروں کی تخلیق، اس کے بعد پانی اور نباتات کی پیدائش جو ان کی غذا کا ذریعہ ہیں)، چنانچہ فرماتا ہے:

خدا نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر پیدا کیا ہے جو قابل رؤیت ہوں (خلق السماوات بغیر عمد ترونها)۔

"عمد" (بر وزن قمر) عمود کی جمع ہے جس کا معنی ہے ستون، اور اسے "ترونها" کے ساتھ مقید کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ آسمان مرئی (دیکھے جانے والے) ستون نہیں رکھتے۔ بالفاظ دیگر اس کے ستون تو ہیں لیکن قابل رؤیت نہیں۔ چنانچہ اس سے پہلے بھی ہم سورہ رعد کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ یہ تعبیر قانون جاذبہ و دافعہ (کشش ثقل) کی جانب ایک لطیف اشارہ ہے جو نظر نہ آنے والے بہت ہی قوی ستونوں کی طرح آسمانی کرات کو اپنی جگہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اس حدیث میں جسے "حسین بن خالد" نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل کیا ہے اس معنی کی تصریح موجود ہے۔ امام نے فرمایا:

سبحان الله ألیس الله یقول بغیر عمد ترونها؟ قلت بلی، فقال: ثم عمد ولکن لا ترونها

"سبحان اللہ! کیا خدا نہیں فرماتا بغیر ستونوں کے کہ جنہیں تم مشاہدہ کرو؟"

راوی کہتا ہے، میں نے عرض کیا جی ہاں! تو فرمایا:

پس ستون ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔[1][2]

بہر حال اوپر والا جملہ قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے جس کی مزید تفصیل سورہ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں (جلد ۵ صفحہ ۱۶۱ میں) لائے ہیں۔

اس کے بعد "پہاڑوں کی آفرینش" کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے "خدا نے زمین میں پہاڑ رکھے ہیں تاکہ زمین تمہیں مضطرب اور متزلزل نہ کرے" (والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم)[3]۔

یہ اور اس قسم کی دوسری قرآنی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پہاڑ زمین کے ٹھہراؤ اور ثبات کا ذریعہ ہیں۔ موجودہ زمانے میں علمی لحاظ سے بھی یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ پہاڑ متعدد جہات سے ثبات زمین کا سبب ہیں۔

اس لحاظ سے بھی کہ ان کی جڑیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں جو ایک محکم زرہ کی طرح کرۂ زمین کو اندرونی حرارت سے پیدا ہونے والے دباؤ کے مقابلہ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوتے تو نہایت خطرناک اور تباہ کن زلزلے اس قدر ہوتے کہ شاید کسی بھی انسان کو زندگی گزارنے کی مجال ہی نہ ہوتی۔

اور اس لحاظ سے بھی کہ یہ مضبوط اور محکم طبقہ چاند اور سورج کی کشش کے دباؤ کا سختی سے مقابلہ کرتا ہے اور اگر پہاڑ نہ ہوتے

---

[1] "تفسیر برہان" جلد ۲ صفحہ ۲۷۸۔ [2] جو لوگ آیہ بالا کو مطلق ستونوں کی نفی کی دلیل سمجھتے ہیں مجبور ہیں کہ آیت میں تقدیم و تاخیر کے قائل ہوں۔ اور کہیں کہ آیہ دراصل یوں ہے "خلق السماوات ترونها بغیر عمد" جو یقیناً خلاف ظاہر ہے۔ [3] "تمید" "مید" (بروزن "صید") کے مادہ سے اشیاء عظیم کے تزلزل و اضطراب کے معنی میں ہے اور "ان تمید بکم" کا جملہ نحوی لحاظ سے (لئلا تمید بکم) ہے۔

تو زمین کی خاکی پوست میں سمندروں جیسے عظیم مدوجزر پیدا ہوتے جو انسان کے لیے زندگی کو ناممکن بنا دیتے۔

اور اس لحاظ سے بھی کہ آندھی اور طوفان کے دباؤ کو کم کر دیتے ہیں، اور زمین سے ملحق ہوا کے باہمی ملاپ کو زمین کی وضعی حرکت کے موقعہ پر کم سے کم حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو صفحہ ارضی خشک اور بے آب وگیاہ صحراؤں کے مانند تمام دن رات تباہ کن طوفانوں، آندھیوں اور جھکڑوں کی آماجگاہ ہوتا۔[1]

اب جبکہ غیر مرئی (دکھائی نہ دینے والے) ستونوں کی وجہ سے آسمان کے سکون اور پہاڑوں کے ذریعہ زمین کے سکون کی نعمتوں کی بات پوری ہو گئی تو زندہ موجودات کی آفرینش اور ان کے آرام وسکون کی نوبت آتی ہے کہ وہ سکون اور آرام وہ ماحول اور عرصہ حیات میں قدم رکھتے ہیں چلا فرماتا ہے" اور روئے زمین میں ہر چلنے والے کو پھیلایا"۔ (و بث فیھا من کل دابۃ)۔

"من کل دابۃ" کی تعبیر چلنے پھرتے والے جانوروں کی زندگی کے مختلف اور گوناگوں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔ ان جانداروں سے لے کر جو اس قدر چھوٹے ہیں کہ آنکھ سے نظر نہیں آتے اور ہمارے سارے ماحول کو پُر کر رکھا ہے، غول پیکر اور کوہ پیکر جانوروں تک جو عظیم الجثہ ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح وہ جانور جن کے رنگ اور چہرے مختلف ہوتے ہیں کچھ تو فضا میں اڑنے والے پرندے اور زمین پر رینگنے والے اور گوناگوں حشرات کہ جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ دنیا ہے اور مسائل زندگی کو لاکھوں آئینوں میں منعکس کرتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی واضح ہے کہ چلنے پھرنے والے یہ جاندار آب وغذا کے محتاج ہیں لہٰذا بعد والے جملوں میں ان دو موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ روئے زمین پر انواع واقسام کی نباتات کے قیمتی جوڑے اگائے"۔ (وانزلنا من السمآء ماء فانبتنا فیھا من کل زوج کریم)۔

اور اس طرح سے تمام چلنے پھرنے والے جانداروں خصوصاً انسان کی زندگی کی بنیاد کو پانی اور نباتات تشکیل دیتے ہیں لہٰذا یہ بیان کر رہا ہے، ایسا دسترخوان جو انواع واقسام کی غذاؤں کے ساتھ تمام روئے زمین پر بچھا ہوا ہے جس میں سے ہر ایک آفرینش وخلقت کے لحاظ سے پروردگار کی عظمت وقدرت پر دلیل ہے۔

قابل توجہ یہ کہ پہلے تین حصوں کی آفرینش کے بیان میں افعال کو غیب کے صیغوں کے ساتھ بیان کیا ہے، جب نزول باراں اور نباتات کی پرورش کے مسئلہ پر پہنچا ہے تو افعال کو متکلم کی صورت میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور ہم نے ہی زمین میں نباتات کو اگایا"۔

یہ خود فصاحت کا ایک فن ہے کہ مختلف امور کے ذکر کے وقت انہیں دو یا چند مختلف شکلوں میں بیان کرتے ہیں تاکہ سننے والے کو کسی قسم کی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا احساس نہ ہو۔ علاوہ ازیں یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ بارش کے نزول اور نباتات کی پرورش پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

یہ آیت ایک بار پھر "عالم نباتات میں زوجیت" کی طرف اشارہ کرتی ہے جو قرآن کے علمی معجزات میں سے ایک ہے کیونکہ

---

[1] مزید وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد ۵ صفحہ ۴۲۰ کے بعد کے صفحات کا مطالعہ فرمائیں۔

اس زمانے میں عالم نباتات میں زوجیت (نر و مادہ کی جنس کا وجود) کا تصور وسیع طور پر ثابت نہیں ہوا تھا اور قرآن ہی نے اس سے پردہ اٹھایا ہے۔ (اس مسئلہ کے سلسلہ میں مزید تشریح کے لیے سورہ شعراء کی آیہ ۷ کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ۸ کا مطالعہ فرمائیں)۔

یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ نباتات کے جفت کی "کریم" کے ساتھ توصیف، انواع واقسام کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو ان میں موجود ہیں۔

عالم آفرینش میں خدا کی عظمت اور خلقت کے مختلف پہلوؤں کے ذکر کے بعد روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے اور ان کو جواب دہ قرار دے کر ان سے جواب طلبی کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ خدا کی آفرینش وخلقت ہے لیکن مجھے یہ دکھاؤ کہ اس کے علاوہ جو معبود ہیں انہوں نے کسی چیز کو خلق کیا ہے؟" (ھٰذا خلق اللہ فارونی ماذا خلق الذین من دونہ)۔

یقیناً وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ اس جہان کی مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز بتوں کی تخلیق ہے اسی بنا پر وہ توحید خالقیت کے تو معترف تھے لیکن اس حالت میں وہ کس طرح عبادت میں شرک کی توجیہ کر سکتے تھے؟ کیونکہ خالقیت کی توحید، ربوبیت کی توحید اور مدبر عالم کی یکتائی یہ سب کچھ عبودیت میں توحید کی دلیل ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں اُن کے عمل کو ظلم وگمراہی پر مبنی شمار کرتے ہوئے کہتا ہے "لیکن ظالم واضح گمراہی میں ہیں"۔ (بل الظالمون فی ضلال مبین)۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ "ظلم" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو کسی چیز کو اس کے غیر محل میں قرار دینے کو شامل ہے اور چونکہ مشرکین عبادت کو اور گاہے تدبیر عالم کو بتوں کے اختیار میں قرار دیتے تھے۔ لہٰذا عظیم ترین ظلم وضلالت کے مرتکب تھے۔

یاد رہے اوپر والی تعبیر "ظلم" و "ضلالت" کے درمیان باہمی رابطے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کیونکہ انسان جب اس دنیا میں عینی موجودات کی حیثیت اور اُن کے موقع ومحل کو نہ پہچانتے یا پہچاننے تو سہی لیکن اس کی رعایت نہ کرے اور ہر چیز کو اس کے اپنے مقام میں نہ دیکھے تو یقیناً یہ ظلم اس کی ضلالت وگمراہی کا سبب بن جائے گا۔

۱۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○

۱۳۔ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○

۱۴۔ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○

۱۵۔ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۔ ہم نے لقمان کو حکمت دی (اور ان سے کہا) خدا کا شکر ادا کرو، اور جو شکر ادا کرے وہ اپنے فائدہ کے لیے شکر ادا کرے گا۔ اور جو شخص کفران کرے (تو خدا کو کوئی نقصان نہیں دیتا) کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

۱۳۔ اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا جبکہ وہ اسے وعظ و نصیحت کر رہے تھے۔ بیٹا! کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دو کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

۱۴۔ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں وصیّت کی، اس کی ماں زحمت پر زحمت اٹھا کر حاملہ ہوئی (حمل کے زمانے میں ہر روز نت نئی تکالیف کی متحمل ہوتی تھی)۔ اور اس کے دودھ پلانے کی مدّت دو سال میں مکمّل ہوتی ہے۔ (جی ہاں! ہم نے اسے وصیّت کی) کہ میرا شکر اور ماں باپ کا شکریہ ادا کرو کیونکہ تم سب کی بازگشت میری طرف ہے۔

۱۵۔ اور جس وقت وہ دونوں کوشش کریں کہ کسی کو تم میرا شریک قرار دو کہ جس سے تم آگاہی نہیں رکھتے (بلکہ جانتے ہو کہ باطل ہے) تو ان کی اطاعت نہ کرنا، تاہم دنیا میں ان کے ساتھ شائستہ طرز پر سلوک کرو۔ اور ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو میری طرف آتے ہیں۔ اس کے بعد تم سب کی بازگشت میری طرف ہے اور میں تمہیں اس عمل سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیتے تھے۔

تفسیر

ماں باپ کا احترام:

گزشتہ مباحث توحید و شرک اور اہمیت و عظمت قرآن اور اس آسمانی کتاب میں استعمال ہونے والی حکمت کے بارے میں تھے۔ اسی مناسبت سے زیر بحث اور چند بعد والی آیات میں "لقمان حکیم" کے بارے میں اور اس مرد خدا کے چند نصائح، توحید کی عظمت اور شرک سے برسرپیکار رہنے کے سلسلے میں درمیان میں آئی ہیں۔ اور اہم اخلاقی مسائل کہ جن میں لقمان کی اپنے بیٹے کو پند و نصائح کا بیان ہے۔ یہ دس نصیحتیں جو چھ آیات کے اندر بیان ہوئی ہیں اعتقادی مسائل کو بھی دلکش طور پر بیان کرتی ہیں اور دینی فرائض اور ذمہ داریوں کے اصول اور اخلاقی مباحث کو بھی۔

اس بارے میں کہ "لقمان" کون تھے اور کن خصوصیات کے حامل تھے؟ انشاء اللہ آگے چل کر نکات کی بحث میں بیان کریں گے۔ یہاں پر تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک سلجھے ہوئے، سنجیدہ اور مہذب انسان تھے جو ہوائے نفس کے میدان مقابلہ میں سرخرو اور کامیاب ہوئے۔ اور خدا نے ان کے دل پر علم و حکمت کے چشمے جاری کر دیے۔ ان کے مقام عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ خدا نے ان کے پند و نصائح کو اپنے ارشادات کے ساتھ ذکر کیا ہے اور آیات قرآن کے اندر بیان فرمایا ہے۔ جی ہاں! جب انسان کا دل پاکیزگی اور تقویٰ کے زیر اثر نور حکمت سے روشن ہو جائے تو خدا کے ارشادات اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور وہی کچھ کہتا ہے جو خدا کہتا ہے، اور وہی سوچتا ہے جو خدا

پسند کرتا ہے۔

اس مختصر سی وضاحت کے ساتھ آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے "ہم نے لقمان کو حکمت دی اور انہیں کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو کیونکہ جو شخص نعمت کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لیے کرتا ہے۔ اور جو شخص کفران نعمت کرتا ہے وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق تعریف ہے: (ولقد اٰتینا لقمان الحکمة ان اشکر لله ومن یشکر فانما یشکر لنفسه ومن کفر فان الله غنی حمید)"[1]

رہا یہ سوال کہ "حکمت" کیا ہے؟ تو جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ "حکمت" کے بہت سے معانی بیان ہوئے ہیں مثلاً "عالم ہستی کے اسرار کی پہچان"، "حقائق قرآن سے آگاہی"، "گفتار و عمل کے لحاظ سے حق تک پہنچنا" اور "خدا کی معرفت اور پہچان"۔

لیکن ان تمام معانی کو ایک جگہ پر جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور حکمت کی تفسیر میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس حکمت کے بارے میں قرآن نے گفتگو کی ہے اور خدا نے لقمان کو عطا فرمائی ہے، وہ مجموعہ ہے "معرفت علم، پاکیزہ اخلاق، تقویٰ اور ہدایت کا نور"۔

ایک حدیث میں اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہشام بن حکم سے ارشاد فرماتے ہیں کہ "حکمت سے مراد فہم و عقل ہے"۔[2]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

اوتی معرفة امام زمانه یعنی حکمت یہ ہے کہ لقمان اپنے زمانہ کے امام اور خدائی رہبر کی معرفت رکھتے تھے۔[3]

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا حکمت کے وسیع مفہوم میں شمار ہوتا ہے اور آپس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

بہرحال "لقمان" نے اس حکمت کا حامل ہونے کی بناء پر اپنے پروردگار کا شکر شروع کیا، وہ نعمات الٰہی کے اہداف اور نتائج کو جانتے تھے۔ اور انہیں ٹھیک اسی راہ میں کہ جس کے لیے وہ پیدا ہوئی تھیں استعمال میں لائے۔ اور اصولی طور پر حکمت اسی چیز کا نام ہے۔

"ہر چیز کو اس کی جگہ پر استعمال کرنا" اس بناء پر "شکر" و "حکمت" کی بازگشت ایک ہی نقطہ کی طرف ہوتی ہے۔

ضمنی طور پر آیت ہی نعمتوں کے "شکر" اور "کفران" کا نتیجہ اسی صورت میں بیان ہوا ہے کہ "شکر نعمت خود انسان کے اپنے فائدہ کے لیے ہے" اور "کفران نعمت اس کے اپنے نقصان میں ہے" کیونکہ خداوند عالم تو تمام دنیا سے بے نیاز ہے اگر کائنات کی ہر چیز شکر گزاری کرے تو اس کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوگا اور "اگر تمام کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبریائی پر گرد نہیں

---

[1] "ان اشکر لله" کے جملہ میں کوئی چیز مقدر ہے یا نہیں؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "قلنا له" کا جملہ اس سے پہلے مقدر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مقدر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ "ان اشکر" کے جملہ میں خود "ان" تفسیریہ ہے، کیونکہ شکر گزاری عین حکمت ہے اور حکمت عین شکر گزاری (اور دونوں تفسیریں قابل قبول ہیں)۔ [2] اصول کافی جلد اول صفحہ ۱۳ (کتاب العقل والجهل حدیث ۱۲)۔ [3] نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۔۔

بیٹھ سکتی"۔

"ان اشکر لله" کے جملہ میں "لام"، "لام اختصاص" ہے اور "لنفسه" کی "لام"، "لام نفع" ہے۔ اسی بناء پر شکر گزاری کا نفع اور فائدہ جو کہ آخرت کے ثواب کے علاوہ دوام نعمت اور اس کا اضافہ ہے، خود انسان کی طرف لوٹتا ہے۔ جیسا کہ "کفران" کا زیان اور نقصان صرف اسی کے دامنگیر ہوتا ہے۔

"غنی حمید" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عام افراد کا شکر ادا کرنے والا یا تو کوئی چیز نعمت دینے والے کو دیتا ہے یا اگر نہیں دیتا تو اس کا مقام لوگوں کی نگاہ میں ضرور بلند کرتا ہے لیکن خدا کے بارے میں ان دونوں میں سے کوئی چیز صادق نہیں آتی۔ وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب تعریف کرنے والوں کی ستائش و تعریف کے لائق اور مستحق ہے۔ فرشتے اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور موجودات کے تمام ذرات اس کی حمد و تسبیح میں مشغول ہیں۔ اور اگر کوئی انسان "زبان قال" سے کفران کرے تو اس کا ذرہ برابر بھی اس پر اثر نہیں پڑتا۔ جبکہ اس کے وجود کے تمام ذرات "زبان حال" سے اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔

قابل توجہ یہ نکتہ ہے کہ "شکر" "مضارع" کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے جو کہ دوام اور استمرار کی علامت ہے اور "کفر" "ماضی" کے صیغہ کے ساتھ جو ایک مرتبہ پر بھی صادق آتا ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک بار کا کفران ممکن ہے کہ دردناک انجام کا سبب بن جائے۔ لیکن شکر گزاری ضروری ہے اور اسے ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے تاکہ انسان ارتقاء کے تدریجی مراحل کو طے کرتا رہے۔

حضرت لقمان اور ان کے مقام علم و حکمت کے تعارف کے بعد ان کی پہلی نصیحت جو ان کے اپنے بیٹے کے لیے ہے وہ اہم ترین وصیت ہے اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے "اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو موعظہ کرتے ہوئے کہا بیٹا! کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دے کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے": (واذ قال لقمان لابنه وهو یعظه یابنی لا تشرك بالله ان الشرك لظلم عظیم)۔

لقمان کی حکمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ سب سے پہلے اہم اور بنیادی اعتقادی مسئلہ کی طرف جائے اور وہ ہے "توحید" کا مسئلہ۔ توحید تمام اطراف اور جہات سے، کیونکہ تخریب پر مبنی اور خدا کے خلاف ہر تحریک کا سرچشمہ شرک ہے، خواہ وہ دنیا پرستی ہو یا مقام پرستی، ہوا پرستی اور ان جیسے دوسرے امور جو شرک کا شعبہ شمار ہوتے ہیں جس طرح کہ تمام صحیح، تعمیری اور تربیتی تحریکوں کی اساس توحید ہے یعنی دل کو صرف خدا سے وابستہ رکھنا، اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کے غیر سے ناتا توڑنا اور تمام بتوں کو اس کی کبریائی کے آستان پر چکنا چور کرنا۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ لقمان حکیم نفی شرک کی یہ دلیل ذکر کرتے ہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے اور وہ بھی خدا کے بارے میں ایسی تعبیر کے ساتھ جو کئی لحاظ سے تاکید کی حامل ہے۔[1]

اور اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ بے قدر و قیمت چیز کو اس کے مقابلہ میں قرار دیا جائے اور مخلوق کے بارے میں یہ کہ اسے گمراہی کی طرف کھینچ کر لے جائیں اور اپنے منحرفانہ اعمال کے ذریعہ انہیں گمراہی کی طرف لائیں، ان پر ظلم و ستم کریں اور اپنے

---

[1] "ان" اور "لام" اور "جملہ کا اسمیہ ہونا" ہر ایک تاکید پر دلالت کرتا ہے۔

بارے میں یہ کہ پروردگار کی عبودیت کے شرف اور عزّت وعظمت سے ہٹ کر اس کے غیر کی پرستش کرکے خود کو قعر ذلت میں گرا دیں۔
بعد والی دونوں آیات درحقیقت جملہ معترضہ ہیں جو لقمان کے پند ونصائح کے درمیان خدا کی طرف سے بیان ہوئی ہیں لیکن بے ربط
معانی میں نہیں بلکہ خداوند عالم کا کلام ہے جو لقمان کی باتوں سے واضح ربط رکھتا ہے، کیونکہ ان دو آیات میں ماں باپ کے وجود کی نعمت
ان کی زحمات، خدمات اور حقوق اور اللہ کے "شکر" کے ساتھ والدین کے "شکریہ" کو بھی قرار دیا ہے۔
علاوہ ازیں لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کی ہیں وہ ان کے پُرخلوص ۔ نے پر بھی دلالت کرتی ہیں کیونکہ اولاد کے ساتھ والدین
کو ولی محبّت، قلبی لگاؤ اور خلوص دل سے پیار ہوتا ہے، قطعاً ناممکن ہے کہ وہ اولاد کی بہتری کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی سکیں۔
پہلے فرماتا ہے کہ "ہم نے انسان کو ہم نے ماں باپ کے بارے میں سفارش اور وصیت کی": (ووصینا الانسان بوالدیہ)۔
اس کے بعد ماں کی حد سے زیادہ تکالیف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے" ان کی ماں نے اسے ایسی حالت میں حمل
کیا کہ ہر روز اس کے ضعف اور کمزوری پر نئے ضعف کا اضافہ ہوتا" (حملتہ امہ وھناً علی وھن)[1]
علمی لحاظ سے بھی اور تجربہ کی رو سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ مائیں ایام حمل کے دوران کمزوری اور سستی میں مبتلا
ہو جاتی ہیں کیونکہ اپنی جان کا شیرہ اور ہڈیوں کا گودہ شکم میں موجود اپنے بچے کی پرورش کے ساتھ مخصوص کر دیتی ہیں اور اپنے وجود کے سارے
حیاتیاتی مواد کا بہترین حصّہ اسے پیش کرتی رہتی ہیں۔
اسی بنا پر مائیں حمل کے زمانہ میں مختلف قسم کے وٹامنز کی کمی کا شکار ہو جاتی ہیں اور اگر اس کی تلافی نہ کی جائے تو انہیں کئی تکالیف
اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ یہی عمل زمانہ رضاعت (یعنی دودھ پلانے) کے دوران میں بھی جاری رہتا ہے کیونکہ دودھ
عورت کی جان کا شیرہ ہوتا ہے۔
لہٰذا اس کے بعد کہتا ہے کہ" اس کے دودھ پلانے کے اختتام کا زمانہ دو سال ہے": (وفصالہ فی عامین)۔
جیسا کہ قرآن کی ایک دوسری جگہ بھی اشارہ ہوا ہے": والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین" مائیں اپنی اولاد
کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی"۔ (البقرہ۔ ۲۳۳)
البتہ مراد مکمل دودھ پلانے کی مدت ہے اگرچہ ممکن ہے کہ اس سے کم مدت بھی انجام پائے۔
بہرحال مائیں ان ۳۳ ماہ (حمل اور دودھ پلانے کی مدت) میں اپنے بچے کے لیے روحانی اور جسمانی ہر طرح سے خدمت کرکے
عظیم ترین قربانی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔
قابل توجہ یہ بات ہے کہ ابتدا میں تو ماں اور باپ دونوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے لیکن تکالیف اور خدمات کے بیان
کے موقعہ پر صرف ماں کی زحمات کا ذکر کرتا ہے: تاکہ انسان کو ماں کے ایثار وقربانی اور عظیم حق کی طرف متوجہ کیا جائے۔

---

[1] "وھناً علی وھن" کا جملہ ہو سکتا ہے کہ لفظ "ام" کا "حال" ہو اور لفظ "ذات" کو مقدر (پوشیدہ) مانا جائے۔ تو اس وقت مکمل جملہ یوں بنے گا" حملتہ امہ ذات وھن علی وھن" اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ" وھن" کے مادہ سے مقدر (پوشیدہ) فعل کا مفعول مطلق ہو۔ تو پھر اس صورت میں جملہ یوں ہوگا۔" تھن وھناً علی وھن"۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ" ہم نے اسے وصیت کی کہ میرا شکر بھی ادا کرو اور ماں باپ کا بھی: (ان اشکرلی ولوالدیک)۔
میرا شکر ادا کرو کہ میں تمہارا خالق اور منعم ہوں اور اسی قسم کے مہربان ماں باپ تجھے دیئے ہیں اور اپنے ماں باپ کا بھی شکریہ ادا کرو
جو اس فیض کا واسطہ اور تمہاری طرف میری نعمتوں کے منتقل کرنے کا ذریعہ ہیں۔
کس قدر توجہ طلب اور معنی خیز ہے یہ کہ ماں باپ کے شکریہ کو بالکل ہی خدا کے شکر کے ساتھ اور اس کے پہلو میں ذکر فرمایا ہے۔
آیت کے آخر میں جو ایک قسم کی تنبیہ اور عتاب سے خالی نہیں فرماتا ہے" تم سب کی بازگشت میری طرف ہے": (الی المصیر)۔
جی ہاں! اگر تم نے یہاں کسی قسم کی کوتاہی کی تو وہاں پر ان حقوق، تکالیف اور خدمات کے بارے میں باز پرس کی جائے گی اور ذرے
ذرے کا حساب لیا جائے گا جہاں تمہیں خدا کی نعمتوں کے شکر اور اسی طرح ماں باپ کے وجود کی نعمت اور ان کے پاک اور بے آلائش
تشکر کے سلسلہ میں خدائی حساب سے عہدہ برآ ہونا ہے۔
بعض مفسرین نے یہاں ایک نکتہ کی طرف توجہ کی ہے کہ قرآن مجید میں والدین کے حقوق کی رعایت پر تو بار بار تاکید کی ہے لیکن اولاد
کے بارے میں بہت کم سفارش نظر آتی ہے (سوائے ایک موقعہ پر کہ جس میں اولاد کو قتل کرنے سے روکا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک
منحوس اور بری عادت تھی) تو یہ اس بنا پر ہے کہ اپنے زبردست پیار کی وجہ سے بہت کم ممکن ہوتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو فراموش کر دیں
جبکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین جب بہت بوڑھے اور بے کار ہو جاتے ہیں تو اولاد انہیں فراموش کر دیتی ہے اور یہ ان کے لیے دردناک
ترین حالت اور اولاد کے لیے بدترین ناشکری شمار ہوتی ہے[1]
اور ماں باپ کے بارے میں نیکی کی وصیت سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ عقائد، کفر اور
ایمان کے مسئلہ میں بھی ان کی پیروی کی جائے یا نرمی برتی جائے؟ لیکن بعد والی آیت میں فرماتا ہے" جس وقت وہ ۔۔۔ سعی وکوشش
کریں کہ کسی چیز کو میرا شریک قرار دو کہ جس سے (کم از کم) آگاہی نہیں رکھتے تو ان کی اطاعت نہ کرو": (وان جاھدٰک علیٰ ان تشرک
بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما)۔
کبھی بھی انسان اور اس کے والدین کے رابطے کو خدا کے رابطے پر مقدم نہ کرنا اور نہ ہی رشتہ داری کی محبت اعتقاد پر حاکم ہو۔
" جاھداک " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کبھی کبھی اس بنا پر کہ وہ اپنی اولاد کی سعادت چاہتے ہیں کوشش
کرتے ہیں کہ انہیں اپنے غلط عقائد کی طرف گھسیٹیں اور یہ چیز ہر ایک والدین کے بارے میں دکھائی دیتی ہے۔
اولاد کا فرض بنتا ہے کہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ کے آگے نہ جھکیں اور اپنے فکری استقلال کو محفوظ رکھتے ہوئے عقیدہ توحید کا کسی
چیز سے تبادلہ نہ کریں۔
ضمناً ۔ "مالیس لک بہ علم" (یعنی وہ چیز کہ جس کا تمہیں علم نہیں) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر بالفرض شرک کے باطل
ہونے کو مدنظر نہ بھی رکھا جائے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہے ہی کہ اس کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں بن سکتی اور نہ ہی کوئی بہانہ جو شخص اس کے
اثبات پر دلیل قائم کر سکتا ہے۔

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۶ صفحہ ۴۸۶۔

علاوہ ازیں اگر شرک کی کوئی حقیقت ہوتی تو یقیناً اس کے اثبات پر کوئی دلیل ضرور ہوتی اور اس قسم کی کسی دلیل کا نہ ہونا یقیناً اس کے بطلان کی دلیل ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اس فرمان سے یہ وہم و گمان پیدا ہو کہ مشرک ماں باپ کے سامنے سختی اور بے احترامی کا استعمال کیا جانا چاہیئے؟ تو فوراً ہی کہتا ہے کہ شرک اور کفر کے مسئلہ میں ان کی پیروی نہ کرنا مطلقاً قطع رابطہ کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کے باوجود "ان کے ساتھ دنیا میں شائستگی کا سلوک کرو" (وصاحبھما فی الدنیا معروفاً) دنیا داری اور مادی زندگی میں ان سے صرومحبت سے پیش آؤ اور نرمی کا سلوک کرو اور مذہبی امور میں ان کے افکار اور نظریات کے سامنے نہ جھکو۔ یہ ٹھیک اعتدال کا نقطۂ اصلی ہے جس میں خدا اور ماں باپ کے حقوق کا حسین امتزاج ہے۔

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے "ایسے لوگوں کی پیروی کرو جنہوں نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ (واتبع سبیل من اناب الیّ)

کیونکہ "اس کے بعد تم سب کی بازگشت میری طرف ہے اور میں تمہیں اس عمل سے آگاہ کروں گا جو تم انجام دیا کرتے تھے" اور اس کے مطابق ہی جزا اور سزا دوں گا۔ (ثم الیّ مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعملون)۔

اوپر والی آیات میں پے درپے کے اثبات و نفی اور امر و نہی اس لیے ہیں تاکہ مسلمان اس قسم کے مسائل کہ جن میں ابتدائی نظر میں دو ضروری فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں تضاد کا تصور ہوتا ہو، صحیح خطوط کو تلاش کریں اور تھوڑی سی بھی افراط و تفریط کے بغیر صحیح راہ پر گامزن ہو جائیں، اور قرآن مجید میں اس قسم کی جزئیات کو اس باریک بینی اور ظرافت و لطافت کے ساتھ بیان کرنا اس کی فصاحت و بلاغت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔

بہرصورت اوپر والی آیت مکمل طور پر سورہ عنکبوت کی آیت ۸ کے عین مشابہ ہے جس میں خدا کہتا ہے: (ووصّینا الانسان بوالدیه حسناً وان جاھداك لتشرك بی مالیس لك به علم فلا تطعھما الیّ مرجعکم فانبئکم بما کنتم تعملون)۔

بعض تفسیروں میں مذکورہ آیت کا شان نزول منقول ہے جسے ہم سورہ عنکبوت کی آیت ۸ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ لقمان کون تھے؟ حضرت لقمان کا نام قرآن مجید کی اس سورت کی دو آیات میں آیا ہے۔ آیا وہ پیغمبر تھے یا صرف ایک دانا اور صاحب حکمت انسان تھے؟ قرآن میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، لیکن ان کے بارے میں قرآن کا لب ولہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے کیونکہ عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں رسالت، توحید کی طرف دعوت، شرک اور ماحول میں موجود بے راہ روی سے نبرد آزمائی، رسالت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کسی قسم کی اجرت کا طلب نہ کرنا نیز امتوں کو بشارت و انذار کے مسائل وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں، جبکہ لقمان کے بارے میں ان مسائل میں سے کوئی بھی بیان نہیں ہوا۔ صرف ان کے پند و نصائح بیان ہوئے ہیں جو اگرچہ خصوصی طور پر تو ان کے اپنے بیٹے کے لیے ہیں لیکن ان کا مفہوم عمومی حیثیت کا حامل ہے اور یہی چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صرف ایک مرد حکیم و دانا تھے۔

جو حدیث پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل ہوئی ہے اس طرح درج ہے:

حقًا اقول لم یکن لقمان نبیًا، ولکن کان عبدًا کثیر التفکر، حسن الیقین، احب الله فاحبه ومن علیه بالحکمة .... یعنی سچی بات یہ ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جو زیادہ غور و فکر کیا کرتے، ان کا ایمان و یقین اعلیٰ درجے پر تھا، خدا کو دوست رکھتے تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور اللہ نے انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا.....

بعض تواریخ میں ہے کہ لقمان مصر اور سوڈان کے لوگوں میں سے سیاہ رنگ کے غلام تھے باوجودیکہ اُن کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا لیکن روشن دل اور مصفا روح کے مالک تھے وہ ابتدائے زندگی سے سچ بولتے اور امانت کو خیانت سے آلودہ نہ کرتے اور جو امور اُن سے تعلق نہیں رکھتے تھے اُن میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے[1]

بعض مفسرین نے اُن کی نبوت کا احتمال دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ واضح شواہد اس کے خلاف موجود ہیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص نے لقمان سے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر جانور چرایا کرتے تھے؟ آپ نے جواب میں کہا ایسا ہی ہے! اس نے کہا تو پھر آپ کو یہ سب علم و حکمت کہاں سے نصیب ہوئے؟ لقمان نے فرمایا: قدر الله، واداء الامانة وصدق الحدیث والصمت عما لا یعنینی۔ اللہ کی قدر، امانت کی ادائیگی، بات کی سچائی اور جو چیز مجھ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے سے![2]

حدیث بالا کے ذیل میں آنحضرت سے ایک روایت یوں بھی نقل ہوئی ہے کہ:

ایک دن حضرت لقمان دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے کہ اچانک انہوں نے ایک آواز سنی کہ اے لقمان! کیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم آپ کو زمین میں خلیفہ قرار دے تاکہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں؟ لقمان نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اختیار دے دے تو میں عافیت کی راہ کو قبول کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ذمہ داری میرے کندھے پر ڈال دے گا تو یقیناً میری مدد بھی کرے گا اور مجھے لغزشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔

فرشتوں نے اس حالت میں کہ لقمان انھیں دیکھ رہے تھے کہا اے لقمان کیوں (ایسا نہیں کرتے)؟ تو انھوں نے کہا اس لیے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا سخت ترین منزل اور اہم ترین مرحلہ ہے اور ہر طرف سے ظلم و ستم کی موجیں اس کی طرف متوجہ ہیں اگر خدا انسان کی حفاظت کرے تو وہ نجات پا جائے گا لیکن اگر خطا کی راہ پر چلے تو یقیناً جنت کی راہ سے منحرف ہو جائے گا اور جس شخص کا سر دنیا میں جھکا ہوا اور آخرت میں بلند ہو اس سے بہتر ہے کہ جس کا سر دنیا میں بلند اور آخرت میں جھکا ہوا ہو اور جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے تو نہ تو وہ دنیا کو پا سکے گا اور نہ ہی آخرت کو حاصل کر سکے گا۔

---

[1] "قصص قرآن" (شرح حالات لقمان)۔
[2] "مجمع البیان" اسی آیت کے ذیل میں۔

فرشتے لقمان کی اس دلچسپ گفتگو اور منطقی باتوں سے متعجب ہوئے۔ لقمان نے یہ بات کہی اور سو گئے اور خدا نے نورِ حکمت اُن کے دل میں ڈال دیا جس وقت بیدار ہوئے تو اُن کی زبان پر حکمت کی باتیں تھیں..... [1]

۲۔ لقمان کی حکمت کا ایک نمونہ بعض مفسرین نے یہاں لقمان کے پند و نصائح کے سلسلے میں جو سورہ کی آیتوں میں بیان کی گئی ہیں اس مردِ خدا کی حکمت آمیز باتوں کا ایک حصہ بیان کیا ہے کہ ہم اس کا خلاصہ یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

الف۔ لقمان اپنے بیٹے سے اس طرح کہتے ہیں۔

یا بنی ان الدنیا بحر عمیق، وقد هلك فیها عالم کثیر، فاجعل سفینتك فیها الایمان بالله، واجعل شراعها التوکل علی الله، واجعل زادك فیها تقوی الله، فان نجوت فبرحمة الله و ان هلکت فبذنوبك!

بیٹا، دنیا ایک گہرا اور عمیق سمندر ہے جس میں بہت سی مخلوقات غرق ہو چکی ہیں لہٰذا اس سمندر میں تمہارا سفینہ خدا پر ایمان ہونا چاہیئے جس کا بادبان خدا پر توکل، جس کا زادِ راہ خدا کا تقویٰ اور پرہیزگاری ہو اگر تم نے اس سمندر سے نجات پالی تو سمجھو کہ رحمتِ خدا کی برکتوں سے ہے اور اگر ہلاک ہو گئے تو جانو کہ اپنے گناہوں کی بدولت ہے۔[2]

یہی مطلب کتاب کافی میں امام موسیٰ کاظمؑ کے ارشادات کے ضمن ہشام بن حکم سے زیادہ مکمل صورت میں لقمان حکیم سے نقل ہوا ہے فرمایا: یا بنی ان الدنیا بحر عمیق، قد غرق فیها عالم کثیر، فلتکن سفینتك فیها تقوی الله، و حشوها الایمان و شراعها التوکل، و قیمها العقل، و دلیلها العلم، و سکانها الصبر۔ بیٹا! دنیا ایک عمیق اور گہرا سمندر ہے جس میں بہت بڑی دنیا غرق ہو چکی ہے اس سمندر میں تمہاری کشتی خدا کا تقویٰ ہونا چاہیئے اور زاد و توشہ، ایمان، اس کا بادبان توکل، ناخدا عقل اور راہنما علم اور اس کے سکان صبر و شکیبائی ہیں۔[3]

ب۔ ایک اور گفتگو میں اپنے بیٹے سے مسافرت کے آداب میں کہتے ہیں:

بیٹا! جب تم سفر کرو تو اپنے ساتھ اسلحہ، لباس، خیمہ اور پانی پینے اور سینے پرونے کے وسائل اور ضروری دوائیاں کہ جس سے تم خود اور تمہارے ساتھی استفادہ کر سکیں لے لیا کرو۔ اور اپنے ہم سفر لوگوں کے ساتھ خدا کی نافرمانی کے سوا باقی تمام امور میں ہاتھ بٹایا کرو۔

بیٹا! جب کسی گروہ کے ساتھ سفر کرو تو اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص ۳۱۹ زیر بحث آیہ کے ضمن میں۔ [2] مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔
[3] اصول کافی جلد اول ص ۱۳ (کتاب العقل والجہل)۔

کے ساتھ پیش آیا کرو۔

جو زادِ راہ تمہارے پاس ہے اس میں سے سخاوت کیا کرو۔

تمہارے ساتھی جب بھی تمہیں بلائیں تو فوراً ان کو جواب دیا کرو۔

اگر تمہاری امداد کے طالب ہوں تو ان کی مدد بھی کیا کرو۔

جتنا ہو سکے سکوت اختیار کرو۔

نماز زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔

سواری اور آب و غذا کہ جو تمہارے پاس ہو اس میں سخاوت سے کام لیا کرو۔

اگر تم سے حق کی گواہی طلب کریں تو گواہی دے دیا کرو۔

اگر مشورہ چاہیں تو صحیح اور صائب نظریہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اچھی طرح غور و فکر اور سوچ بچار کے بغیر جواب نہ دیا کرو۔ اور اپنی ساری فکری قوتوں کو مشورے کے جواب کے لیے استعمال کیا کرو۔ کیونکہ جو شخص مشورہ طلب کرنے والوں کو اپنے خالص ترین نظریہ سے نہ نوازے تو خدا تشخیص اور سوچ بچار کی نعمت اس سے چھین لیتا ہے۔

جب دیکھو کہ تمہارے ساتھی ایک راستے پر چل رہے ہیں اور سعی و کوشش میں مصروف ہیں تو تم بھی کوشش میں لگ جاؤ۔ اپنے سے بڑوں کا کہنا مانو۔

اگر تم سے کوئی شخص جائز اور شرعی تقاضا کرتا ہے تو ہمیشہ اس کا مثبت جواب دیا کرو اور کبھی بھی "نہ" مت کہو، کیونکہ نہ کہنا عجز و ناتوانائی کی نشانی اور ملامت کا سبب ہے....

کبھی بھی نماز کو اول وقت سے تاخیر کے ساتھ نہ پڑھا کرو، اور اپنے اس فرضے کو فوراً ادا کیا کرو۔

جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو خواہ تم سخت ترین حالات میں ہو۔

جس غذا کو کھانا چاہتے ہو کھانے سے پہلے امکانی صورت میں اس سے کچھ مقدار راہ خدا میں دیا کرو۔

کتاب خدا کی تلاوت کیا کرو اور یادِ خدا سے غافل نہ ہو جاؤ۔[1]

ج۔ یہ داستان بھی لقمان کے بارے میں مشہور ہے جس زمانے میں وہ غلام تھے اور اپنے آقا کے لیے کام کر رہے تھے ایک دن آقا نے ان سے کہا کہ ایک گوسفند میرے لیے ذبح کرو اس کے اعضاء میں سے دو بہترین عضو میرے لیے لے آؤ چنانچہ انہوں نے گوسفند کو ذبح کیا اور اس کی زبان اور دل اس کے لیے لے آئے چند دن کے بعد ایک اور گوسفند کے ذبح کرنے کا حکم دیا لیکن کہا اس کے بدترین عضو میرے لیے لے آؤ تو لقمان نے پھر گوسفند کو ذبح کیا اور وہی زبان اور دل اس کے لیے لے گئے اس نے تعجب کیا اور اس ماجرے کے بارے میں سوال کیا تو لقمان نے جواب میں کہا دل اور زبان اگر پاک رہیں تو وہ ہر چیز سے بہتر ہیں اور

---

[1] گزشتہ حوالہ۔

اگر ناپاک ہو جائیں تو ہر چیز سے خبیث تر ہیں[1]

آخر میں ہم اس گفتگو کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

خدا کی قسم وہ حکمت جو لقمان کو خدا کی طرف سے عنایت ہوئی تھی ان کے نسب، مال و جمال اور جسم کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ وہ ایک ایسے مرد تھے جو حکم خدا کی انجام دہی میں قوی اور طاقتور تھے۔ گناہ اور شبہات سے اجتناب کیا کرتے تھے، ساکت اور خاموش رہتے تھے، خوب غور و خوض کے ساتھ دیکھا کرتے تھے، بہت زیادہ سوچا کرتے تھے۔ نیز ہن اور دن رات کے اول حصے میں کبھی نہیں سوتے تھے اور مجالس میں دستکبرین کی طرح تکیہ نہیں لگاتے تھے۔ اور آداب کو پورے طور پر مد نظر رکھتے تھے۔ لعاب دہن نہیں پھینکتے تھے۔ کسی چیز سے نہیں کھیلتے تھے۔ اور کبھی بھی غیر مناسب حالت میں انہیں نہیں دیکھا گیا ..... جب بھی دو آدمیوں کو لڑتا جھگڑتا دیکھتے ان کے درمیان صلح کرا دیتے اگر کسی سے کوئی اچھی بات سنتے تو ضرور اس کا حوالہ، ماخذ اور تفسیر و تشریح اس سے پوچھتے۔ فقہاء اور علماء کے ساتھ زیادہ نشست و برخاست رکھتے ..... ایسے علوم کی طرف جاتے جن کے ذریعہ ہوائے نفس پر غالب آسکیں، اپنے نفس کا علاج قوت فکر و نظر، سوچ بچار اور عبرت سے کرتے اور صرف ایسے کام کی طرف جاتے جو اس کے (دین یا دنیا کے) لیے سود مند ہوتا۔ جو امور ان سے متعلق نہیں ہوتے تھے ان میں ہرگز دخل اندازی نہ کرتے۔ اس بنا پر خدا نے انہیں حکمت و دانائی عطا فرمائی[2]

---

[1] تفسیر "بیضاوی" و ثعلبی۔ لیکن تفسیر مجمع البیان نے لقمان کی گفتگو کا صرف پہلا حصہ نقل کیا ہے۔

[2] "مجمع البیان" (خلاصہ کے ساتھ)۔

۱۶۔ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝

۱۷۔ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

۱۸۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝

۱۹۔ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝

ترجمہ

۱۶۔ بیٹا! اگر رائی کے دانہ کے برابر (نیک یا بد عمل) ہو اور پتھر کے دل میں یا آسمانوں اور زمین کے گوشہ میں قرار پائے خدا اسے (قیامت میں حساب کے لیے) لے آئے گا اور خدا نہایت ہی باریک بین و آگاہ ہے۔

۱۷۔ بیٹا! نماز کو قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کرو اور ان مصائب کے مقابلے میں جو تجھے پہنچیں باستقامت اور صابر ہو کیونکہ یہ ایسے کاموں میں سے ہیں جو اہم اور اساسی ہیں۔

۱۸۔ بیٹا! بے اعتنائی کے ساتھ لوگوں سے روگردانی نہ کرو اور غرور کے ساتھ زمین پر نہ چلو کیونکہ خدا کسی متکبر اور مغرور کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۹۔ بیٹا! چلنے میں اعتدال کو پیش نظر رکھو اپنی آواز کو دھیما رکھو اور ہرگز اونچی آواز سے نہ بولو) کیونکہ بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے۔

تفسیر

پہاڑ کی طرح ڈٹ جاؤ اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو:

لقمان کی پہلی نصیحت مسئلہ توحید اور شرک سے نبرد آزمائی کے سلسلہ میں اور دوسری نصیحت حساب وکتاب اعمال ومعاد کے بارے میں ہے جو "مبدا و معاد" کے حلقہ کی تکمیل کرتا ہے۔

جناب لقمان کہتے ہیں" بیٹا! اگر نیک و بداعمال یہاں تک کہ رائی کے دانے کے وزن کے برابر ہوں پتھر کے اندر یا آسمان کے گوشے میں یا زمین کے اندر کسی جگہ بھی خدا ان کو دادگاہ قیامت میں حاضر کرے گا اور اس کا حساب وکتاب کرے گا۔ کیونکہ خدا لطیف باریک بین اور آگاہ وخبیردار ہے" (یا بنی انها ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السماوات او فی الارض یأت بها الله ان الله لطیف خبیر)۔

"خردل" (رائی) ایک پودا ہے جس کے بہت چھوٹے سیاہ دانے ہوتے ہیں جو چھوٹا ہونے کی وجہ سے کمی اور حقارت میں ضرب المثل ہے۔

اس طرف اشارہ ہے کہ نیک اور بدعمل جس قدر چھوٹے اور کم قیمت اور جس قدر مخفی و پنہاں ہیں مثل رائی کے دانے کے جو پتھر کے اندر زمین کی گہرائیوں میں یا آسمان کے گوشہ میں مخفی ہو خداوند لطیف وخبیر جو عالم ہستی کی تمام چھوٹی بڑی موجودات سے آگاہ ہے اُسے حساب وکتاب اور سزا وجزا کے لیے حاضر کرے گا اور کوئی چیز اُس کے ہاں گم نہیں ہوتی!

ضمیر "انها" کی "حسنات و سیئات" (اور نیک و بداعمال) کی طرف لوٹتی ہے[1]

انسان کے اعمال سے پروردگار کا آگاہ ہونا اور تمام نیکیوں اور بدیوں کا پروردگار عالم کی کتاب علم میں محفوظ ہونا اور اس کائنات میں کسی چیز کے نابود نہ ہونے کی طرف توجہ، تمام انفرادی واجتماعی اصلاحات کی اصل و بنیاد اور اچھائیوں کی طرف لے جانے کا طاقتور محرک ہے اور شر ورو برائیوں سے روکنے کی بڑی طاقت۔

"سماوات" و "ارض" کا ذکر "صخرہ" کے بعد درحقیقت خاص کے بعد عام کے ذکر کرنے کے قبیل سے ہے۔

"اصول کافی" میں امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے فرماتے ہیں:

اتقوا المحقرات من الذنوب، فان لها طالبا، یقول احدکم اذنب و استغفر، ان الله

---

[1] بعض نے احتمال دیا ہے کہ اوپر والی ضمیر یا تو ضمیر شان وقصہ ہے اور یا مفہوم شرک کی طرف لوٹتی ہے اور دونوں احتمال بعید ہیں۔

عزوجل یقول سنکتب ما قدموا و آثارهم و کل شیء احصیناه فی امام مبین، و قال عزوجل انها ان تك مثقال حبة من خردل فتکن فی صخرة او فی السماوات او فی الارض یأت بها الله ان الله لطیف خبیر : چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرو کیونکہ آخر کار کوئی اس کو بھی دریافت کرے گا۔ تم میں سے بعض لوگ کہتے ہیں ہم گناہ تو کرتے ہیں لیکن اس کے بعد استغفار کر لیتے ہیں حالانکہ خداوند عزوجل فرماتا ہے ہم تمام اس کو جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اسی طرح ان کے تمام آثار غرض کہ سب کچھ کو ہم نے لوح محفوظ میں محفوظ کر دیا ہے۔

نیز فرمایا ہے اگر اچھے اور برے اعمال جتنی کہ رائی کے دانہ کے برابر ہوں پتھر کے اندر یا آسمان کے کسی گوشہ میں یا زمین کے اندر خدا اُن کو حاضر کرے گا۔ کیونکہ خدا لطیف وخبیر ہے[1]

مبداء و معاد جو تمام مکتبی اعتقادات کی اساس ہے کی بنیادوں کو محکم طور پر بیان کرنے کے بعد اہم ترین عمل یعنی مسئلہ نماز کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں" بیٹا نماز کو قائم کرو" (یا بنی اقم الصلٰوة)۔

کیونکہ نماز تمہارے خالق کے ساتھ تمہارا اہم ترین رابطہ ہے۔ تمہارے دل کو بیدار اور روح کو صاف وشفاف اور زندگی کو منور کرتی ہے۔ تمہاری جان سے گناہوں کے آثار کو دھو ڈالتی ہے تمہارے دل کے خانہ میں نور ایمان کی روشنی ڈالتی ہے اور تمہیں فحشا و منکرات سے روکتی ہے۔

نماز کے پروگرام کے بعد ایک اہم ترین اجتماعی فریضہ امر بمعروف اور نہی از منکر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں" لوگوں کو نیکیوں اور معروف کی دعوت دو اور منکرات اور برائیوں سے روکو" (و أمر بالمعروف وانه عن المنكر)۔

ان تین اہم عملی احکام کے بعد ایک ایسے اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا ہے جسے ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہوتی ہے، اور وہ ہے صبر واستقامت، فرمایا۔" مصائب ومشکلات کے مقابلے میں جو تم پر نازل ہوتے ہیں صابر وشکیبا رہو کیونکہ یہ چیز ہر انسان کے حتمی فرائض اور بنیادی کاموں سے ہے" (واصبر علی ما اصابك ان ذالك من عزم الامور)۔

مسلم ہے کہ تمام اجتماعی کاموں میں خصوصاً امر بمعروف اور نہی از منکر کے پروگرام میں بہت زیادہ مشکلات ہوتی ہیں اور مفاد پرست حکام گناہوں سے آلودہ اور متکبر و خود پسند لوگ آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے بلکہ امر بمعروف اور نہی از منکر کرنے والوں کے درپے آزار ہو کر متہم کرنے پر اُتر آتے ہیں لہٰذا صبر واستقامت اور شکیبائی کے بغیر ان مشکلات پر کسی وقت بھی قابو نہیں پایا جاسکتا۔

"عزم"، محکم ارادے کے معنی میں ہے اور "عزم الامور" کی تعبیر یہاں پر یا تو ان کاموں کے معنی میں ہے جن کے متعلق پروردگار کی طرف سے تاکیدی حکم دیا گیا ہے اور یا ایسے کام جن کے بارے میں انسان کو عزم صمیم اور آہنی ارادہ رکھنا چاہیے معنی خواہ کچھ ہو دونوں میں اہمیت کی طرف اشارہ ہے یعنی انسان آہنی عزم اور تصمیم راسخ رکھتا ہو۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰۲

" ذالک " کی تعبیر صبر و شکیبائی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو جو اوپر والی آیت میں ذکر ہوئے ہیں، منجملہ ان کے نماز، امر بمعروف اور نہی من المنکر ہے۔ لیکن قرآن کی بعض دوسری آیات میں یہ تعبیر صبر کے مسئلہ کے بعد بیان ہوئی ہے جو پہلے احتمال کو تقویت پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد لقمان اپنے اور دوسرے لوگوں سے متعلق اخلاقی مسائل کو بیان کرتے ہیں اور سب سے پہلے تواضع، فروتنی اور خندہ پیشانی سے پیش آنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہتے ہیں "بے اعتنائی کے ساتھ لوگوں سے روگردانی نہ کرو" (لا تصعر خدک للناس) "اور مغرورانہ انداز میں روئے زمین پر نہ چلو" (ولا تمش فی الارض مرحا) "کیونکہ خدا کسی متکبر اور مغرور کو دوست نہیں رکھتا" (ان اللہ لا یحب کل مختال فخور)۔

" تصعر " " صعر " کے مادہ سے ہے جو دراصل ایک قسم کی بیماری ہے جو اونٹ کو لاحق ہوتی ہے جس سے وہ اپنی گردن ٹیڑھی کرتا ہے۔

" مرح " (بروزن فرح) نعمت سے پیدا ہونے والے غرور اور مستی کے معنی میں ہے۔

" مختال " " خیال " اور " خیلاء " کے مادہ سے ہے۔ ایسے شخص کے معنی میں ہے جو دوسروں پر اپنی بڑائی جتائے۔

فخور، فخر کے مادہ سے اس معنی میں ہے کہ جو شخص دوسرے کے مقابل فخر کرتا ہے (مختال اور فخور میں فرق یہ ہے کہ پہلے کا تعلق ذہن میں پیدا ہونے والے متکبرانہ خیالات سے ہوتا ہے اور دوسرے کا تعلق تکبر آمیز اعمال سے ہے)۔

اور اس طرح سے لقمان حکیم یہاں دو بری اور ناپسندیدہ صفات کی طرف جو معاشرے کے صمیمانہ روابط کے منقطع ہونے کا سبب ہیں اشارہ کرتے ہیں ایک تو تکبر اور بے اعتنائی اور دوسری غرور اور خود پسندی ہے۔ اور اس سلسلے میں دونوں مشترک ہیں جو انسان کو توہم، خیال اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے کی دنیا میں غلطاں کر دیتی ہیں اور دوسروں سے اس کے روابط کو منقطع کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

خصوصاً "صعر" کے اصلی اور لغوی مادہ کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے ناپسندیدہ صفات ایک قسم کی نفسیاتی اور اخلاقی بیماری اور تشخیص و تفکر میں ایک قسم کی بے راہروی ہے۔ ورنہ روح اور نفس کے لحاظ سے ایک صحیح اور سالم انسان کبھی بھی اس قسم کے تصورات اور خیالات میں گرفتار نہیں ہوتا۔

کہے بغیر واضح ہے کہ " لقمان " کی مراد صرف لوگوں سے روگردانی کرنا یا مغرورانہ انداز میں مٹک مٹک کر چلنا ہی نہیں بلکہ تکبر اور غرور کے تمام مصادیق کے ساتھ نبرد آزمائی بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس قسم کی صفات سب سے پہلے اپنے آپ کے عادی اور روزانہ کی حرکات کی نشاندہی کرتی ہیں لہٰذا ان مخصوص مظاہر کو ہی بیان فرمایا ہے۔

بعد والی آیت میں دو اور اخلاقی پروگرام بیان کئے ہیں جو مثبت پہلو کے حامل ہیں، گزشتہ پروگراموں کے مقابلہ میں جو منفی پہلو رکھتے ہیں فرماتا ہے، "بیٹا! چلنے پھرنے میں اعتدال کا راستہ اختیار کرو" (واقصد فی مشیک)۔

"اور بات کرنے میں بھی اعتدال کو مدنظر رکھو اور آواز دینے میں بھی آہستگی اختیار کرو، اور شور مچا کر بلند آواز سے نہ پکارو " (واغضض من صوتک)۔

"کیونکہ بدترین آواز گدھوں کی ہے" ————————— (ان انکر

الاصوات لصوت الحمیر)[1]،[2]

درحقیقت ان دو آیات میں دو صفات سے نہی اور دو صفات کے بارے میں امر ہوا ہے۔

"نہی" "اپنے آپ کی برتری" اور "خودپسندی" سے کہ جن میں سے ایک تو اس بات کا سبب بنتی ہے کہ انسان خدا کی مخلوق کے ساتھ تکبر کرے اور دوسری سبب بنتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو حد کمال میں تصور کرے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے لیے تدریجی کمال اور ارتقاء کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنا دوسروں سے موازنہ نہ کرے۔

اگرچہ یہ دونوں صفات عام طور پر جڑواں ہوتی ہیں اور ان کی اصل (جڑ) مشترک ہے لیکن کبھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جاتی ہیں۔

اور "امر" "عمل" اور "گفتگو" میں اعتدال کی رعایت کا، چونکہ چلنے پھرنے اور گفتگو کرنے میں اعتدال درحقیقت مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور جس شخص میں واقعاً یہ چار صفات پائی جاتی ہوں وہ موفق، خوش قسمت اور کامیاب انسان ہوتا ہے جو لوگوں میں محبوب اور بارگاہ خدا میں معزز ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ممکن ہے کہ ہماری زندگی کے ماحول میں گدھے کی آواز سے بھی زیادہ تکلیف دہ آوازیں ہوں (مثلاً جب دھاتوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ان سے ایسی آواز نکلتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اس کے بدن کا گوشت گر رہا ہے) لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ آوازیں نہ تو عمومی ہوتی ہیں اور نہ ہی ہر موقع و محل پر رونما ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں تکلیف دہ ہونے اور زیادہ قبیح ہونے میں بھی فرق ہے۔ اور سچ مچ عام آوازوں میں سے جنہیں انسان سنتا ہے سب سے زیادہ قبیح اور بری گدھے کی آواز ہی ہوتی ہے۔ اور مغرور اور بے وقوف لوگوں کے نعرے اور شور و غوغا اسی آواز سے مشابہت رکھتے ہیں۔

نہ صرف اونچا اور بے ہنگم ہونے کے لحاظ سے قبیح نہیں بلکہ کبھی بلاوجہ ہونے کے لحاظ سے بھی ہے۔ کیونکہ بعض مفسرین کے بقول دوسرے جانوروں کی آواز عام طور پر بوقت ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ جانور کبھی بلاوجہ، بغیر کسی قسم کی ضرورت اور بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے وقت بے وقت ہینگنا شروع کر دیتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکر ہوا ہے کہ جب گدھے کی آواز بلند ہوتی ہے اس وقت وہ شیطان کو دیکھتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہر جانور کی آواز تسبیح ہوتی ہے سوائے گدھے کی آواز کے۔

بہرحال ان تمام باتوں سے ہٹ کر جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ تمام آوازوں میں اس کی آواز ہی قبیح ہے۔ اور یہ بات کسی بحث و گفتگو کی محتاج نہیں۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہوا ہے کہ یہ آیت بلند آواز کے ساتھ چھینکنے یا بولتے وقت شور مچانے سے تفسیر ہوئی ہے تو درحقیقت اس کے روشن مصداق کا بیان ہے۔[3]

---

[1] "حمیر" " حمار " کی جمع ہے جس کا معنی ہے گدھا۔ [2] " انکر " افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ اگرچہ یہ صیغہ عام طور پر مفعول کے معنی میں نہیں آتا لیکن عیوب کے باب میں یہ صیغہ شاذ و نادر آ ہی جاتا ہے۔ ("انکر" "منکر" کا افعل التفضیل ہے)۔

[3] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

چند اہم نکات

۱۔ چلنے پھرنے کے آداب: یہ ٹھیک ہے کہ چلنا پھرنا ایک عام اور سادہ سا مسئلہ ہے لیکن یہی سادہ مسئلہ انسان کے اندرونی حالات اور اخلاق و اطوار اور بسا اوقات اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ پہلے بھی ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے عادات و اطوار اس کے اعمال کے اندر منعکس ہوتے ہیں اور کبھی ایک چھوٹا سا معمولی عمل بھی اس کی گہری عادات کی غمازی کرتا ہے۔

اور چونکہ اسلام زندگی کی تمام جہات کو توجہ کا مرکز قرار دیتا ہے لہٰذا اس سلسلہ میں اس نے کسی بھی چیز کو فروگزاشت نہیں کیا۔

ایک حدیث میں رسول خدا سے مروی ہے:

”من مشی علی الارض اختیا لا لعنه الارض ومن تحتها ومن فوقها“

”جو شخص غرور و تکبر کے ساتھ زمین پر چلتا ہے تو زمین اور زمین کے اندر کی اور اس کے اوپر کی چیزیں سب اس پر لعنت کرتی ہیں“[1]

پھر ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے:

نهی ان یختال الرجل فی مشیه وقال من لبس ثوبا فاختال فیه خسف الله به من شفیر جهنم وکان قرین قارون لانه اول من اختال۔

پیغمبرؐ نے مغرورانہ اور متکبرانہ انداز میں چلنے سے روکا ہے اور فرمایا جو شخص لباس پہنے اور اس کے ساتھ تکبر دکھائے تو خداوند عالم اسے جہنم کے کنارے سے زمین کی تہہ میں بھیجے گا اور وہ قارون کا مقرب اور ساتھی ہوگا۔ کیونکہ قارون پہلا شخص تھا جس نے کبر و غرور کی بنیاد رکھی[2]

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

خدا نے ایمان کو انسان کے اعضاء و جوارح پر واجب کیا اور ان کے درمیان اسے تقسیم کیا منجملہ ان کے انسان کے پاؤں پر واجب کیا ہے کہ گناہ اور معصیت کی طرف نہ جائیں بلکہ رضائے خدا کی راہ میں اٹھیں، اسی لیے قرآن فرماتا ہے ”زمین میں تکبر سے نہ چلو“ نیز فرمایا ہے ”چلنے میں اعتدال کی راہ کو پیش نظر رکھو“[3]

ایک دوسری روایت میں یہ ماجرا پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ ایک کوچہ سے گزر فرما رہے تھے لوگوں کو دیکھا کہ ایک دیوانے کے گرد جمع ہیں اور اس کی طرف دیکھ رہے ہیں فرمایا:

علی ما اجتمع هؤلاء ”یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟“

---

[1] ثواب الاعمال اور امالی صدوق از بحوالہ نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰۷۔ [2] ثواب الاعمال و امالی صدوق بحوالہ تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۲۰۷۔ [3] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۸ باب الایمان مبثوث لجوارح البدن کلها۔

عرض کیا گیا کہ علی المجنون یصرع ”ایک دیوانے کے لیے جو اعصابی حملہ کا شکار ہے!“

پیغمبرؐ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا:

ماهذا بمجنون الا اخبرکم بمجنون حق المجنون ”یہ تو دیوانہ نہیں ہے! تم چاہتے ہو کہ واقعی مجنوں کا تم سے تعارف کراؤں؟“

انہوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا:

ان المجنون: المتبختر فی مشیه، الناظر فی عطفیه، المحرك جنبیه بمنکبیه فذالك المجنون وهذا المبتلی ”حقیقی مجنون تو وہ ہے جو غرور سے شانے جھٹک کر چلتا ہے، ہمیشہ اپنے پہلوؤں کی طرف دیکھتا ہے، اپنے بازوؤں کو اپنے کندھوں کے ساتھ ہلاتا ہے، اور کبر و غرور اس کے سارے وجود سے ٹپکتا ہے، ایسا شخص واقعی دیوانہ ہے، جسے تم دیکھ رہے ہو، یہ تو بیمار ہے“[1]

۲۔ گفتگو کے آداب: لقمان کے پند و نصائح میں بات کرنے کے آداب کے ضمن میں اشارہ کیا گیا تھا۔ اور اسلام میں اس مسئلہ کے لیے ایک وسیع باب کھولا گیا ہے۔ منجملہ اس کے یہ ہے کہ جب تک بات کرنا ضروری نہ ہو تو سکوت بہتر ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

السکوت راحة للعقل ”سکوت، فکر کے آرام و راحت کا باعث ہے“[2]

ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے مروی ہے کہ:

من علامات الفقه العلم والحلم والصمت، ان الصمت باب من ابواب الحکمة۔

”عقل و فہم کی نشانیوں میں سے آگاہی، بردباری اور خاموشی ہے۔ سکوت اور خاموشی حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے“[3]

لیکن دوسری روایات میں یہ بات بھی زور دے کر کہی گئی ہے کہ:

”جن موقعوں پر گفتگو کرنا ضروری ہے مؤمن کو کبھی بھی خاموشی اختیار نہیں کرنا چاہیے“

”پیغمبروں کو بات کرنے کی دعوت دی گئی ہے نا کہ سکوت کی“

”جنت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ برمحل بات کرنا ہے“[4]

۳۔ معاشرتی آداب: پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے ذریعہ اسلامی روایات میں جس قدر تواضع، حسن خلق اور بوقت ملاقات نرمی کا مظاہرہ اور رہن سہن میں سختی نہ برتنے کے مسئلے کو اہمیت دی گئی ہے

---

[1] بحار الانوار جلد ۶، صفحہ ۵۰۔ [2] وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۵۳۲۔ [3] و [4] وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۵۳۲۔

اتنی بہت کم چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے۔

بہترین اور ناطق دلیل اس سلسلے میں خود اسلامی روایات ہیں جن کا ایک نمونہ ہم یہاں پر نظر نواز کرتے ہیں:

ایک شخص پیغمبر اکرم (ص) کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یارسول اللہ اوصنی فکان فیما اوصاہ ان قال الق اخاک بوجه منبسط "مجھے نصیحت کیجئے" تو آپ نے فرمایا اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ روئی کے ساتھ ملاقات کرو[1]

ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے:

ما یوضع فی میزان امرء یوم القیامة افضل من حسن الخلق۔ قیامت کے دن کوئی چیز کسی کے ترازوئے عمل میں حسن خلق سے برتر و بالاتر نہیں رکھی جائے گی[2]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مذکور ہے:

البر وحسن الخلق یعمران الدیار ویزیدان فی الاعمار۔ نیکوکاری اور حسن خلق گھروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں[3]

نیز رسول خدا سے منقول ہے:

اکثر ما تلج به امتی الجنة تقوی الله وحسن الخلق۔ جو چیز میری امت کے زیادہ سے زیادہ بہشت میں داخل ہونے کا سبب بنے گی وہ خدا کا تقویٰ اور حسن خلق ہے[4]

تواضع اور فروتنی کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

زینة الشریف التواضع۔ شرافت مآب انسانوں کی زینت فروتنی اور تواضع ہے[5]

آخر میں ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام بیان فرماتے ہیں:

التواضع اصل کل خیر نفیس، ومرتبة رفیعة... ولو کان للتواضع لغة یفهمها الخلق لنطق عن حقائق ما فی مخفیات العواقب... ومن تواضع لله شرفه الله علی کثیر من عباده... ولیس لله عزوجل عبادة یقبلها ویرضاها الا وبابها التواضع۔

فروتنی اور تواضع ہر خیر و سعادت کی جڑ ہے، تواضع ایک بلند مقام و مرتبہ ہے اور اگر تواضع کی کوئی زبان ہوتی کہ جسے لوگ سمجھتے تو بہت سے اسرار نہانی اور کاموں کی عاقبت کو بیان کرتی ..... جو شخص خدا کے لیے فروتنی کرے خدا اس کو اپنے بہت سے بندوں پر برتری بخشے گا... کوئی ایسی عبادت نہیں جو مقبول بارگاہ خدا اور اس کی رضا کا موجب ہو مگر یہ کہ وہ فروتنی کی راہ ہی سے داخل ہوتی ہے[6]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۴ ص ۱۷۱۔ [2] و [3] و [4] اصول کافی جلد ۲ باب حسن الخلق ۸۱ و ۸۲۔ [5] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۱۲۰، [6] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۱۲۰۔

۲۰۔ اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَاَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ○

۲۱۔ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ الشَّيۡطٰنُ يَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ○

۲۲۔ وَمَنۡ يُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ○

۲۳۔ وَمَنۡ كَفَرَ فَلَا يَحۡزُنۡكَ كُفۡرُهٗ ؕ اِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ فَنُنَبِّئُهُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ○

۲۴۔ نُمَتِّعُهُمۡ قَلِيۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّهُمۡ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ○

ترجمہ

۲۰۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے ان چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور اپنی نعمتوں کو چاہے وہ ظاہری ہوں یا باطنی، تم پر بچھا دیا ہے اور زیادہ کر دیا ہے، لیکن بعض لوگ بغیر کسی علم و دانش اور ہدایت اور واضح کتاب کے خدا کے بارے میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں۔

۲۱۔ جس وقت ان سے کہا جائے جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں نہیں ! ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے کہ جس پر اپنے آباء (واجداد) کو پایا ہے، کیا اگر شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف بھی دعوت دے (پھر بھی پیروی کریں گے؟)۔

۲۲۔ جو شخص اپنی روح کو خدا کے سپرد کر دے جبکہ وہ نیکوکار ہو اس نے محکم دستہ (اور وسیلہ) کو پکڑا ہے (اور قابل اطمینان سہارے کا سہارا لیا ہے) اور تمام کاموں کی عاقبت خدا کی طرف ہے۔

۲۳۔ اور جو شخص کافر ہو جائے تو اس کا کفر تجھے غمگین نہ کر دے، ان سب کی بازگشت ہماری طرف ہے۔ اور ہم انہیں ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں (اور ان کے برے نتائج سے) آگاہ کریں گے۔ بیشک خدا دلوں کے راز سے بھی خوب واقف ہے۔

۲۴۔ ہم تھوڑے سے دنیاوی فائدے کو ان کے اختیار میں دے دیں گے پھر انہیں عذاب شدید کے برداشت کرنے پر مجبور کریں گے۔

تفسیر

قابلِ اطمینان سہارا:

حضرت لقمان کے مبدأ و معاد اور راہ و رسم زندگی اور اجتماعی و اخلاقی پروگراموں کے سلسلہ میں دس نکاتی پند و نصائح کے اختتام پر قرآن ان کی تکمیل کے لیے خدائی نعمتوں کے بیان کی طرف جاتا ہے، تاکہ لوگوں کے احساس شکرگزاری کو اجاگر کرے وہ شکر جو "معرفۃ اللہ" کا منبع اور اس کے فرمان کی اطاعت کا سبب ہے۔[1]

روئے سخن تمام انسانوں کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین میں موجود چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ وہ تمہارے مفادات کے لیے سرگرم عمل رہیں"؟ (الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السماوات و ما فی الارض)۔

انسان کے لیے آسمانی اور زمینی موجودات کی تسخیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو اُن امور کو بھی شامل ہے جو اس کے قبضہ و اختیار میں ہیں، اور وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے انہیں اپنے مفادات کی راہ میں استعمال کرتا ہے، جیسے زمین کے بہت سے موجودات۔ یا وہ امور جو انسان کے اختیار میں نہیں ہیں لیکن خدا نے انہیں مامور کیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت کریں، جیسے سورج اور چاند وغیرہ۔ اس بناء پر تمام موجودات انسانوں کی منفعت کی راہ میں فرمان خدا کے مطابق مسخر ہیں، چاہے وہ حکم انسان سے مسخر ہوں

---

[1] بعض مفسرین مثلاً "آلوسی" "روح المعانی" اور "فخر رازی" "تفسیر کبیر" میں زیر بحث آیات کو لقمان کی وصیتوں سے پہلے ذکر شدہ آیات سے مربوط جانتے ہیں جن میں مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ خدا کی مخلوق ہے، تم نشاندہی کرو کہ بتوں نے کیا کچھ بنایا ہے؟" اور زیر بحث آیات میں کہتا ہے "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے" لیکن اس آیت کا ذیل اور اس کے بعد والی آیات اور روایات جو اس کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، وہ آیت کے مفہوم کی عمومیت کے ساتھ زیادہ سازگار ہیں۔

یا نہ ہوں۔ اور اس طرح سے "لکم" میں "لام" اصطلاح کے مطابق "لام منفعت" ہے۔[1]

آگے چل کر مزید کہتا ہے "خدا نے اپنی نعمتوں کو خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، وسیع اور زیادہ کیا ہے" (واسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ)۔

"اسبغ" مادہ "سبغ" (بروزن صبر) اصل میں کھلی اور کشادہ پیراہن یا زرہ اور وسیع و کامل کے معنی میں ہے اور پھر وسعت و فراوانِ نعمت پر بھی بولا جانے لگا ہے۔

یہ کہ یہاں "ظاہری" و "باطنی" نعمتوں سے مراد اس آیت میں کیا ہے؟ اس پر مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے۔ بعض "ظاہری نعمت" اس چیز کو سمجھتے ہیں جو کسی بھی شخص کے لیے قابل انکار نہیں ہے۔ جیسے خلق، حیات اور انواع و اقسام رزق وغیرہ اور "باطنی" نعمتیں ان امور کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو غور و فکر اور سوچ بچار اور مطالعہ کے بغیر قابل ادراک نہیں ہیں۔ (جیسے بہت سی روحانی طاقتیں اور تعمیری غریزے۔

بعض نے نعمت "ظاہر" اعضاء ظاہر کو اور نعمت "باطن" دل کو شمار کیا ہے۔

بعض دوسروں نے "نعمت ظاہر" چہرہ کی زیبائی اور خوبصورتی، قد و قامت کی راستی اور اعضاء کی سلامتی اور نعمت "باطن" "معرفۃ اللہ" کو تسلیم کیا ہے۔

ہم پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں۔ جبکہ ابن عباس نے آنحضرتؐ سے اس سلسلے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

اے ابن عباس! نعمت ظاہر، اسلام اور پروردگار کی طرف سے کامل اور منظم خلقت اور وہ رزق و روزی ہے، جو اس نے تم پر ارزانی کی ہیں۔ اور نعمت باطن تمہارے بُرے اعمال پر پردہ پوشی اور لوگوں کے سامنے تمہیں رسوا نہ کرنا ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

نعمت ظاہر پیغمبرؐ، معرفۃ اللہ اور توحید ہے، جسے پیغمبرؐ لائے ہیں۔ اور نعمت باطن و پوشیدہ ہم اہل بیت کی ولایت اور ہماری دوستی کا عہد و پیمان ہے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ ان تفاسیر کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کے مفہوم کو محدود کیے بغیر ان میں سے ہر ایک ظاہری اور باطنی نعمت کے ہر مصداق کو بیان کرتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جو خدا کی ان عظیم نعمتوں کا انکار کرتے ہیں جو انسان کا اندر اور باہر سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور حق کے ساتھ لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرماتا ہے "بعض ایسے لوگ

---

[1] انسان کے لیے تسخیر موجودات کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۵ سورۂ رعد کی آیت ۲ کے ذیل میں بھی ہم نے بحث کی ہے۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[3] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

... جو خدا کے بارے میں بغیر علم ودانش اور ہدایت و واضح کتاب کے ، مجادلہ کرتے ہیں : (ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر) ۔

اور بجائے اس کے کہ ان تمام ظاہری اور باطنی نعمتیں بخشنے والے کو پہچانے جہالت وسرکشی کی بناء پر شرک اور کفر کا رُخ کرتے ہیں ۔

" علم " و " ھدایت " اور " کتاب منیر " کے درمیان کیا فرق ہے ؟ شاید بہترین بیان یہ ہو کہ علم ایسے ادراکات کی طرف اشارہ ہے ، جنہیں انسان اپنی عقل وخرد کے ذریعے سے درک کرتا ہے اور " ھدی " ایسے خدائی اور آسمانی معلمین ورہبران اور علماء کی طرف اشارہ ہے جو اس کی راہ میں انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں ۔ اور " کتاب منیر " سے وہ آسمانی کتابیں مراد ہیں جو وحی کے ذریعہ انسان کے دل وجان کو منور کرتی ہیں ۔

حقیقت میں یہ ضدی اور ہٹ دھرم گروہ نہ خود علم ودانش رکھتا ہے ، نہ کسی راہبر و رہنما کا اتباع کرتا ہے اور نہ ہی وحی الٰہی سے مدد لیتا ہے ۔ چونکہ راہ ہدایت ان تینوں چیزوں میں منحصر ہے ، لہٰذا ان کے ترک کرنے سے انسان گمراہی اور شیاطین کی وادی میں کھینچ کر چلا جاتا ہے ۔

بعد والی آیت میں اس گمراہ گروہ کی بودی اور کمزور منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے : اور جس وقت اُن سے کہا جائے جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے ، اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں : نہیں ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے ، جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے : (واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اٰباءنا) ۔

اور چونکہ ان کے جاہل ومنحرف بزرگوں کی پیروی اور پروا لے ہدایت آفرین تین طریقوں میں سے کسی کی بھی جز نہیں ، لہٰذا قرآن اسے راہ شیطان کے عنوان سے ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے " کیا حتیٰ اگر شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کی طرف دعوت دے تو پھر بھی انہیں اس کا اتباع کرنا چاہیئے ؟ " (اولو کان الشیطان یدعوھم الی عذاب السعیر) [1]

حقیقت میں قرآن نے بیمار بڑوں کی سُنّت اور ان کے طور واطوار کی پیروی کے نقاب کو اُلٹ دیا ہے ۔ جو ظاہر بظاہر فریب پر مبنی ہے اور ان کے عمل کے واقعی چہرہ کو نمایاں کر دیا ، یعنی وہی جہنم کی راہ اختیار کرنے میں ہی شیطان کی پیروی ہے ۔

جی ہاں ! شیطان کی راہبری ہی اس بات کے لیے تنہا کافی ہے کہ انسان اس کی مخالفت کرے ، اگرچہ وہ حق کی طرف دعوت کے پردوں میں کیوں نہ لپٹی ہوئی ہو ۔ کیونکہ وہ یقیناً ایک گمراہ کن نقاب ہے جس کے اندر سے جہنم کی آگ کے لیے دعوت دی جا رہی ہے اور جہنم کی آگ کی طرف دعوت دینا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے ۔ اگرچہ دعوت دینے والا مجہول الحال ہو ۔ لیکن اگر دعوت دینے والا شیطان ہو اور اس کی دعوت بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف ہو تو بات صاف ظاہر ہے ۔ کیا کوئی عقلمند انسان اللہ کے پیغمبروں کی بہشت کی طرف دعوت کو چھوڑ کر شیطانی دعوت کے پیچھے جہنم کی طرف جا سکتا ہے ؟

---

[1] مفسرین عام طور پر " لو " کو یہاں " لو شرطیہ " کے معنی میں لیتے ہیں ، جس کی جزاء محذوف ہے اور جملہ کی تقدیر یوں ہے : (لو کان الشیطان یدعوھم الی عذاب السعیر اتتبعونہ)

اس کے بعد دو گروہوں یعنی خالص مومن اور گناہوں سے آلودہ کفار کے حالات کو بیان کر کے اُن کا آپس میں تقابل کرتا ہے اور اس بارے میں بھی تقابل کرتا ہے کہ جو لوگ شیطان کے پیروکار اور اپنے بزرگوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں ، قابل توجہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے " جس شخص نے اپنے دل وجان کو خدا کے سپرد کر دیا اور پروردگار عالم کے آستان پر سرتسلیم خم کر دیا ۔ جبکہ وہ محسن اور نیکوکار بھی ہے تو اس نے محکم دستے کو پکڑ لیا ہے " (ومن یسلم وجھہ الی اللہ وھو محسن فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ) ۔

" خدا کے لیے اپنے چہرے کو تسلیم اور خم کرنے " سے مراد حقیقت میں پروردگار کی ذات پاک کی طرف اپنے تمام وجود کے ساتھ مکمل توجہ کی طرف اشارہ ہے ۔ کیونکہ " وجھہ " (جس کا معنی چہرہ ہے) چونکہ بدن کا شریف ترین عضو اور حواس انسانی کا اہم ترین مرکز ہے ۔ لہٰذا انسان کی ذات سے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے ۔

" ھو محسن " کی تعبیر ایمان کے بعد عمل صالح کے ذکر کی قسم سے ہے ۔

محکم عروہ اور دستہ کو پکڑنا اس حقیقت کے متعلق ایسی لطیف تشبیہ ہے کہ انسان مادیت کے گہرے گھڑے سے نکلنے اور معرفت ، معنویت اور روحانیت کی بلند ترین چوٹی تک پہنچنے کے لیے ایک محکم اور قابل اطمینان وسیلہ کا محتاج ہے اور یہ وسیلہ ایمان اور عمل صالح کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی ۔ ان کے علاوہ باقی سب کچھ فرسودہ ، پارہ پارہ ہونے والا ، سقوط اور موت کا سبب ہیں ۔ علاوہ ازیں صرف وسیلہ ہی کو بقا حاصل ہے ۔ اس کے علاوہ سب کچھ فانی اور نابود ہونے والا ہے ۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے " تمام کاموں کی عاقبت خدا کی طرف ہے " : (والی اللہ عاقبۃ الامور) ۔

اس حدیث میں جو تفسیر برہان میں اہل سنت کے طریقوں سے امام علی بن موسیٰ رضاؑ کے ذریعہ پیغمبر اسلام سے نقل ہوئی ہے ، اس طرح آیا ہے :

" سیکون بعدی فتنۃ مظلمۃ ، الناجی منھا من تمسک بالعروۃ الوثقیٰ . فقیل یارسول اللہ وما العروۃ الوثقیٰ ؟ قال ولایۃ سید الوصیین . قیل یارسول اللہ ومن سید الوصیین ؟ قال امیر المؤمنین . قیل یارسول اللہ ومن امیر المؤمنین ؟ قال مولی المسلمین وامامھم بعدی ، قیل یارسول اللہ ومن مولی المسلمین وامامھم بعدک ؟ قال اخی علی بن ابی طالب " ع ۔

" میرے بعد تاریک اور ظلمانی فتنہ رونما ہوگا ، صرف وہ لوگ اس سے نجات حاصل کریں گے ۔ جو عروۃ الوثقیٰ اور مضبوط دستہ کو پکڑ لیں گے ۔ عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول ! عروۃ الوثقیٰ کیا ہے ؟ فرمایا سید اوصیاء کی ولایت ! لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ ! سید اوصیاء کون ہے ؟ فرمایا امیر المومنین ! عرض کیا امیر المومنین کون ہے ؟ فرمایا مسلمانوں کا مولیٰ اور میرے بعد ان کا امام و پیشوا ! پھر انھوں نے اس بناء پر کہ زیادہ صریح جواب حاصل کریں ، عرض کیا وہ کون ہے ؟ فرمایا میرا بھائی علی بن ابی طالب (ع) ۔ [1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۲۷۹ ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

اور روایات بھی اس سلسلے میں کہ "عروۃ الوثقیٰ" سے مراد اہل بیتؑ یا آل محمدؐ یا اولاد حسینؑ میں سے آئمہ کی دوستی ہے، نقل ہوئی ہیں۔[1]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی تفسیریں اپنے واضح مصداق کا بیان ہوتی ہیں اور توحید وتقوٰی وغیرہ جیسے دوسرے مصادیق کی متضاد نہیں ہیں۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "جو شخص کافر ہو جائے اور ان واضح حقائق کا انکار کرے، اس کا کفر آپ کو غمگین نہ کر دے: (ومن کفر فلا یحزنک کفرہ)۔

کیونکہ آپ نے اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح انجام دے دیا ہے۔ اب وہ ہے کہ جو اپنے اوپر ظلم و ستم کرتا ہے۔

اس قسم کی تعبیریں جو قرآن مجید میں بارہا آئی ہیں نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جو مشاہدہ کرتے تھے کہ ایک جاہل، ضدی، ہٹ دھرم اور کفر مزاج گروہ ان واضح و روشن دلائل اور نشانیوں کے باوجود خدا کی راہ کو ترک کر کے بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو پیغمبر اسلامؐ کو اس سے سخت رنج پہنچتا، اور وہ اس قدر غمگین ہوتے کہ بارہا خدا ان کی دل داری کرتا اور تسلّی دیتا ہے، اور دل سوز رہبر کی یہی راہ و رسم تو ہوتی ہے۔

نیز "اے پیغمبر! آپ اس سے بھی پریشان نہ ہوں کہ اگر ایک گروہ دنیا میں باوجودیکہ کفر اختیار کرتا اور ظلم ڈھاتا ہے پھر بھی خدائی نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور سزا و عذاب میں مبتلا نہیں۔ کیونکہ ابھی دیر نہیں ہوئی۔

"ان سب کی بازگشت ہماری طرف ہے اور ہم انھیں ان کے اعمال اور ان کے تلخ اور منحوس نتائج سے آگاہ کریں گے"! (الینا مرجعھم فننبئھم بما عملوا)۔

ہم نہ صرف ان کے اعمال سے آگاہ ہیں بلکہ ان کی نیتوں اور دل کے اندرونی اسرار سے بھی باخبر ہیں۔ "کیونکہ خدا اس سے جو سینوں کے اندر ہے آگاہ ہے: (ان اللہ علیم بذات الصدور)۔

یہ تعبیر کہ خدا لوگوں کو قیامت میں ان کے اعمال سے باخبر کرے گا یا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اس سے باخبر کرے گا، قرآن مجید کی بہت سی آیات میں نازل ہوا ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "ننبئکم" "نبا" کے مادے سے ہے۔ مفردات راغب کی تصریحات کے مطابق "نبأ" اس خبر کو کہتے ہیں جو اہم مضمون اور فائدہ کی حامل ہو اور صریح و آشکار ہو اور ہر قسم کے جھوٹ سے خالی ہو۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تعبیرات اس طرف اشارہ ہیں کہ خداوند عالم قیامت میں انسانوں کے اعمال کو اس طرح فاش کرے گا کہ کسی کے لیے بھی کسی قسم کے اعتراض و انکار کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ لوگ جو کچھ اس دنیا میں انجام دیتے ہیں اور عام طور پر اسے فراموش کر دیتے ہیں، سب کو بعینہ (ہو بہو) ظاہر کرے گا اور حساب و جزا کے لیے حاضر کرے گا۔

یہاں تک کہ جو کچھ انسان کے دل میں گزرتا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی شخص بھی اس سے آگاہ نہیں ہوتا وہ سب کچھ ان کے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر برہان صفحہ ۲۰۸ اور ۲۰۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

گوش گزار کرے گا۔

پھر مزید کہتا ہے کہ ان کا دنیاوی زندگی سے بہرہ ور ہونا آپ کو تعجب اور حیرت میں نہ ڈال دے "ہم تھوڑی سی متاع دنیا ان کے اختیار میں دے دیتے ہیں۔ اور متاع دنیا جتنا بھی زیادہ ہو، پھر بھی کم اور ناچیز ہے۔ پھر انھیں جبری طور پر عذاب شدید کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے۔ مسلسل اور دردناک عذاب کی طرف"! (نمتعھم قلیلا ثم نضطرھم الی عذاب غلیظ)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ وہ یہ تصور نہ کریں کہ وہ اس جہان میں خدا کے قبضۂ قدرت سے خارج ہیں۔ بلکہ وہ خود چاہتا ہے کہ انھیں آزمائش، اتمام حجت اور دوسرے مقاصد کے لیے آزاد رکھے اور ان کی یہ متاع قلیل بھی اس کی طرف سے ہے۔ اس گروہ کی حالت جو ذلت و خواری اور جبر و اکراہ کے ساتھ خدا کے شدید اور سخت عذاب کی طرف کھینچا جائے گا، ان لوگوں کی حالت سے کتنی مختلف ہے، جن کا سارا وجود خدا کے اختیار میں ہے اور انہوں نے عروۃ الوثقیٰ کو پکڑ رکھا ہے اور دنیا میں پاک و پاکیزہ اور نیکی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آخرت میں رحمت خدا کے جوار میں نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

۲۵۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

۲۶۔ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

۲۷۔ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

۲۸۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۗ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝

۲۹۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى وَأَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

۳۰۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ۝

ترجمہ

۲۵۔ اگر تم ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے؟ تو یقیناً

وہ کہیں گے اللہ نے۔ کہہ دو، الحمد للہ! (کہ تم خود معترف ہوئے) لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۲۶۔ اللہ کے لیے وہ کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق حمد و ستائش ہے۔

۲۷۔ جو کچھ روئے زمین پر درخت ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں اور سمندر ان کے لیے سیاہی بن جائے۔ اور سات دیگر سمندروں کا اضافہ کیا جائے۔ یہ سارے ختم ہو جائیں گے لیکن خدا کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ خدا عزیز و حکیم ہے۔

۲۸۔ تم سب کی دوبارہ خلقت و زندگی ایک فرد کی زندگی سے زیادہ نہیں ہے، خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔

۲۹۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور ہر ایک معین اور مقررہ (وقت تک اپنی) حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہے، جسے تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۳۰۔ یہ سب کچھ اس امر کی دلیل ہے کہ خدا حق ہے، اور اس کے علاوہ جس کو وہ پکارتے ہیں باطل ہے اور خدا بلند مقام اور عظیم مرتبے والا ہے۔

تفسیر

پروردگار کی دس صفات:

اوپر والی چھ آیات میں خدا کی صفات کا ایک مجموعہ بیان ہوا ہے جو حقیقت میں دس اچھے صفات یا اسماء حسنیٰ میں سے دس اسماء کو بیان کرتا ہے: غنی، حمید، عزیز، حکیم، سمیع، بصیر، خبیر، حق، علی اور کبیر۔

یہ تو ہوا ایک لحاظ سے، رہا دوسرا پہلو تو پہلی آیت میں خدا کی "خالقیت" کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے اور دوسری آیت میں اس کی "مالکیت عامہ" سے تیسری آیت میں اس کے بے انتہا "علم" سے اور چوتھی و پانچویں آیت میں اس کی غیر متناہی قدرت سے اور آخری آیت میں نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جو ذات ان صفات کی حامل ہے، وہ "حق" ہے اور جو اس کے علاوہ ہے، وہ باطل ناچیز اور حقیر ہے۔

اس اجمالی بحث کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم آیت کی تشریح کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اگر ان سے سوال کرو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے تو یقیناً وہ جواب دیں گے کہ "اللہ" نے: (ولئن سألتهم من خلق السماوات والارض ليقولن الله)۔

یہ تعبیر جو دوسری قرآنی آیات میں بھی نظر آتی ہے (جیسے سورۂ عنکبوت آیت ۶۱ تا ۶۳، سورۂ زمر آیہ ۳۸، سورۂ زخرف آیت ۹) جہاں ایک طرف اس امر کی دلیل ہے کہ مشرک لوگ خالق کی توحید کے ہرگز منکر نہیں تھے۔ اور بتوں کی خالقیت کے قائل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف عبادت میں شرک اور بتوں کی شفاعت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

وہاں دوسری طرف توحید کے فطری ہونے اور تمام انسانوں کی فطرت میں نور الٰہی کی تجلّی کی دلیل بھی ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے۔ اب جبکہ وہ خالق کی توحید کے معترف ہیں "تو کہہ دے کہ حمد و ستائش اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، جو ہر چیز کا خالق ہے نہ کہ بتوں کے ساتھ جو خود مخلوق ہیں لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے اور وہ نہیں سمجھتے کہ عبادت کو خالق عالم کے لیے منحصر ہونا چاہیئے: (قل الحمد لله بل اكثرهم لا يعلمون)۔

اس کے بعد حق تعالیٰ کی "مالکیت" کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ فرماتا ہے: "خدا کے لیے ہے تمام وہ کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے:" (لله ما في السماوات والارض)۔

واضح رہے کہ وہ ذات جو "خالق" اور "مالک" ہے، وہی امورِ جہاں کی مدبر بھی ہے اور اس طرح سے توحید اپنی تینوں قسموں (توحیدِ خالقیت، توحیدِ مالکیت اور توحیدِ ربوبیت) سمیت ثابت ہو جائے گی۔

اور جو ذات ان صفات کی حامل ہے، وہ ہر چیز سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کے لائق ہو گی، اسی بنا پر آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا غنی و حمید ہے": (ان الله هو الغني الحميد)۔

وہ غنی مطلق اور ہر لحاظ سے حمید ہے۔ کیونکہ جو نعمت و عطا و بخشش جہان میں ہے، اسی کی طرف لوٹتی ہے اور ہر شخص جو کچھ رکھتا ہے اس کی طرف سے ہے اور تمام اچھائیوں کے خزانے اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اور یہی اس کے غنا اور تونگری کی زندہ دلیل ہے۔

اور چونکہ "حمد" کا معنی کسی اچھے کام کی تعریف و ستائش ہے، جو ارادہ و اختیار کے ساتھ کسی سے انجام پاتا ہے اور اس عالم میں جو اچھائی اور نیکی ہمیں نظر آتی ہے وہ چونکہ پروردگارِ عالم کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی تعریف اور ستائش بھی اسی کے لیے ہی ہو گی۔ یہاں تک کہ اگر ہم پھول کی زیبائی اور خوبصورتی کی تعریف کرتے ہیں یا ملکوتی عشق کی کشش کی توصیف کرتے ہیں یا کسی ایثار و قربانی کرنے والے شخص کے کام کی عظمت کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو درحقیقت اسی کی ہی ستائش و تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ زیبائی ہو یا وہ قوت جاذبہ اور عظمت سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے۔ پس وہی "حمید علی الاطلاق" ہے۔

بعد والی آیت خدا کے غیر متناہی اور بے پایاں علم کی تصویر کشی کرتی ہے۔ جو ایک بہت ہی واضح اور روشن مثال کے ساتھ مجسم ہوتی ہے۔ لیکن پہلے اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسے علی بن ابراہیم کی تفسیر کے مطابق "یہودیوں کے ایک گروہ نے جس وقت مسئلہ رُوح کے بارے میں پیغمبرؐ سے سوال کیا اور قرآن نے ان کے جواب میں کہا (قل الروح من امر ربي وما اوتيتم من العلم الا قليلا) "رُوح میرے پروردگار کا امر اور حکم ہے اور علم سے تمہارا حصہ بہت ہی تھوڑا ہے"؛ تو یہ گفتگو ان پر گراں گزری اور پیغمبرؐ سے پوچھا کہ یہ حکم صرف ہمارے بارے میں ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ سب کو شامل ہے (یہاں تک کہ ہمیں بھی)۔

لیکن انھوں نے مزید کہا: اے محمدؐ! آپ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ بھی علم کا تھوڑا سا حصہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو قرآن عطا ہوا ہے اور ہمیں بھی تورات دی گئی ہے۔ آپ کے قرآن میں آیا ہے "جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی ہے"، یہ باتیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں تو اس مقام پر (ولو ان ما في الارض من شجرة اقلام) (زیرِ بحث) آیت نازل ہوئی اور واضح کیا کہ انسان کا علم جتنا بھی وسیع ہو، خدا کے علم کے مقابلہ میں ایک بے مقدار ذرہ سے زیادہ نہیں، جو کچھ تمہارے نزدیک بہت زیادہ ہے، وہ خدا کے ہاں بہت ہی کم ہے۔[1]

اس طرح کی ایک اور روایت ایک دوسرے طریق سے ہم نے سورۂ کہف کی آیت ۱۰۹ کے ذیل میں بیان کی ہے۔

بہرحال قرآن مجید خدا کے غیر متناہی علم کی تصویر کشی کرتے ہوئے، اس طرح کہتا ہے: "جتنے کچھ رُوئے زمین پر درخت ہیں، قلم ہو جائیں اور سمندر اس کے لیے سیاہی بن جائیں اور سات سمندروں کا اس پر اضافہ ہو جائے تاکہ وہ علم خدا کو لکھیں۔ یہ سب ختم ہو جائیں گے لیکن کلماتِ خدا ختم نہیں ہوں گے۔ خداوند عالم عزیز و حکیم ہے": (ولو ان ما في الارض من شجرة اقلام والبحر يمده من بعده سبعة ابحر ما نفدت كلمات الله ان الله عزيز حكيم)۔

"يمده" "مداد" کے مادہ سے سیاہی یا کوئی دوسرا رنگین مادہ ہوتا ہے، جس کے ساتھ لکھتے ہیں اور دراصل "مد"

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ ص ۲۰۹۔

سے جو کشش کے معنی میں ہے لیا گیا ہے۔ کیونکہ خطوط قلم کی کشش کے ذریعہ کاغذ کے صفحہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس کے لیے ایک اور معنی بھی نقل کیا ہے اور وہ تیل ہے جو چراغ میں ڈالتے ہیں، اور وہ چراغ کی روشنی کا سبب بنتا ہے اور دونوں معنی حقیقت میں ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہیں "کلمات" جمع ہے "کلمہ" کی اور اصل میں ان الفاظ کے معنی میں ہے، جن کے ساتھ انسان بات کرتا ہے اور پھر وہ اس سے زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ہر وہ چیز ہے، جو کسی مطلب کو بیان کر سکے اور چونکہ اس جہان کی گوناگوں مخلوقات میں سے ہر چیز خدا کی پاک ذات اور اس کے علم و قدرت کو بیان کرتی ہے۔ لہٰذا ہر موجود کو "کلمۃ اللہ" کہا جاتا ہے، خصوصاً صاحبانِ شرافت و عظمت موجودات کے بارے میں یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں سورۂ نساء کی آیت ۱۷۱ میں ہم پڑھتے ہیں: انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ (اور اس جیسا معنی سورہ آل عمران کی آیت ۴۵ میں آیا ہے)۔

اس کے بعد اسی مناسبت سے "کلمۃ اللہ" پروردگارِ عالم کے علم و دانش کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اب ہمیں ٹھیک طرح سے غور و فکر کرنا چاہیئے کہ ایک انسان کی تمام معلومات کو معرضِ تحریر میں لانے کے لیے کبھی تو ایک قلم سیاہی کی کچھ مقدار کے ساتھ کافی ہو رہتا ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اُسی ایک قلم سے دوسرے انسان بھی اپنی معلومات کے مجموعہ کو کاغذ کے صفحہ پر لے آئیں لیکن قرآن کہتا ہے۔ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ بسا اوقات ایک تنومند درخت کے تنوں اور شاخوں سے ہزاروں بلکہ لاکھوں قلم وجود میں آسکتے ہیں، رُوئے زمین کے تمام عظیم درختوں اور جنگلوں کی تعداد کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے کہ جن سے کائنات کے پہاڑ، دشت اور صحرا اٹے پڑے ہیں۔ پھر ان سے تیار ہونے والے قلم اور اسی طرح اگر رُوئے زمین کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں، جو تقریباً کرہ ارض کے تین چوتھائی حصہ پر محیط عمیق اور گہرے ہیں۔ تو لکھنے کے لیے اس وقت کس قدر عجیب و غریب کیفیت رونما ہو گی اور علم و دانش کی کتنی مقدار کو لکھا جا سکے گا؟ خصوصاً اس وقت ان کے ساتھ سات دوسرے سمندروں کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ جن میں سے ہر ایک سمندر روئے زمین کے تمام سمندروں کے برابر ہو اور خاص کر جب اس امر کو مدِ نظر رکھا جائے کہ یہاں پر سات کا عدد شمار کے معنی میں نہیں، بلکہ کثرت اور زیادتی کے معنی میں ہے اور بے شمار سمندروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تو ایسی صورت میں واضح ہو جاتا ہے کہ علمِ الٰہی کی وسعت کس قدر عظیم اور ناپید کنارہ ہے اور پھر یہ کہ یہ سب تو ختم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے علوم پھر بھی ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔

کیا کسی لامتناہی کے لیے اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی جا سکتی ہے؟ ہر عدد اس قدر واضح اور ناطق ہے کہ اس کے ساتھ انسانی فکر کی لہریں بے کراں اور لامحدود آفاق کی طرف پرواز کر جاتی ہیں اور خود انسان کو حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈبو دیتی ہیں۔

اس واضح ترین بیان کی طرف توجہ کرنے سے انسان محسُوس کرتا ہے کہ خدائی علم کے سامنے تو اس کی معلومات ایسی ہیں جیسے کسی لامتناہی کے سامنے ایک صفر کی ہوتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کر اسے زیب دیتا ہے کہ کہے "میرا علم و دانش وہاں تک جا پہنچا ہے کہ میں نے اپنی نادانی کو پا لیا ہے" یہاں تک کہ اس واقعیت کو بیان کرنے کے لیے قطرہ اور سمندر کی تشبیہ بھی ناکافی نظر آتی ہے۔

منجملہ لطیف نکات کے جو آیت میں نظر آتے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ لفظ "شجرۃ" مفرد کی شکل میں اور "اقلام" جمع کی صورت میں آیا ہے تاکہ قلموں کی تعداد کی فراوانی کو بیان کرے۔ جو ایک درخت کے تنوں اور شاخوں سے وجود میں آتے ہیں۔

اور نیز "البحر" کی تعبیر مفرد کی صورت میں اور اس پر "الف و لام جنس" اس لیے ہے کہ یہ روئے زمین کے تمام سمندروں کو شامل ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ تمام دُنیا کے سمندر آپس میں مربوط و متصل ہیں اور در واقع ہیں۔ ایک ہی وسیع و عریض سمندر کے حکم میں ہیں۔

اور مزید بات یہ ہے کہ "قلموں" کے بارے میں اضافی اور کمک کرنے اور مدد کرنے والے قلموں کی بات نہیں کی۔ بلکہ سمندروں کے بارے میں سات دوسرے سمندروں کی گفتگو درمیان میں آئی ہے۔ وہ اس لیے کہ لکھتے وقت قلم کا مصرف کم اور سیاہی کا مصرف زیادہ ہوتا ہے۔

لفظ "سبع" (سات) کا انتخاب لغت عرب میں تعداد کی کثرت اور زیادتی بیان کرنے کے لیے ہے اور یہ شاید اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ زمانہ میں لوگ منظومۂ شمسی کے کروں کی تعداد کا عدد سات سمجھتے تھے۔ (اور حقیقت میں موجودہ زمانہ میں بھی آلات لگائے بغیر منظومۂ شمسی میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ سات کروں سے زیادہ نہیں) اور پھر یہ کہ "ہفتہ" سات دنوں کی ایک کامل سیٹ سے زیادہ نہیں ہے اور تمام کرۂ ارض کو بھی سات حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اور اس کا نام سات "اقلیم" رکھا ہوا تھا۔ ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اکائیوں میں سے سات کا عدد ایک کامل عدد کے عنوان سے اور تعداد کی کثرت بیان کرنے کے لیے کیوں استعمال ہوا۔[1]

پروردگار کے غیر متناہی علم کے ذکر کے بعد اس کی بے انتہا قدرت کی بات درمیان میں لاتے ہُوئے فرماتا ہے۔ "تم سب کی خلقت و آفرینش نیز موت کے بعد تم سب کا اُٹھنا ایک فرد کی مثال سے زیادہ نہیں ہے۔ خدا سننے اور دیکھنے والا ہے": ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ ان اللہ سمیع بصیر۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کفار قریش کی ایک جماعت مسئلہ معاد پر تعجب کرتی اور اسے بعید سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ خدا نے ہمیں مختلف شکلوں میں پیدا کیا ہے اور گوناگوں مراحل کے اندر ایک دن ہم نطفہ تھے، پھر علقہ ہُوئے۔ اس کے بعد لوتھڑا بنے اور پھر تدریجی طور پر مختلف صورتوں میں اس دُنیا میں آئے تو کس طرح ہم سب کو خدا ایک ہی لمحہ میں نئی خلقت دے گا؟ تو زیرِ بحث آیت نازل ہوئی اور اس کا جواب دیا۔

درحقیقت وہ اس نکتہ سے غافل تھے کہ "سخت" و "آسان" اور "چھوٹے" اور "بڑے" جیسے لفظوں کے مفہوم ہمارے جیسی موجودات کے لیے ہیں جو محدود قدرت رکھتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی غیر متناہی قدرت کے سامنے میں برابر ہیں۔ خلقت خواہ ایک شخص کی ہو یا کئی اشخاص کی، ایک موجود کی خلقت ایک لمحہ میں ہو یا سالہا سال کے دوران میں اس کی بارگاہ قدرت میں سب ایک جیسا ہے۔

اگر کفار کا تعجب اس بنا پر ہے کہ یہ مختلف طبیعتیں، گوناگوں شکلیں اور انواع و اقسام کی شخصیتیں اور وہ بھی انسان کے خاک اور مٹی ہو جانے اور خاک کے منتشر ہو جانے اور ایک دوسرے سے مل جانے کے بعد کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے

---

[1] "پروردگار کے لامتناہی علم" کے سلسلہ میں جلد ۷ سورہ کہف کی آیت ۱۰۹ میں ہم نے گفتگو کی ہے۔

سے جدا ہوں اور ہر چیز اپنی جگہ کی طرف لوٹ آئے ؟ تو اس کا جواب خدا کا غیر متناہی علم اور لازوال قدرت دیتی ہے۔

اس نے موجوداتِ عالم کے درمیان روابط کچھ اس طرح برقرار کیے ہیں کہ ایک اکائی مثل ایک مجموعہ کے، اور ایک مجموعہ مثل ایک اکائی کے ہے۔

اصولی طور پر اس جہان کا باہمی اتصال و ارتباط کچھ اس طرح ہے کہ ہر کثرت ایک آن میں وحدت کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور تمام انسانوں کی خلقت بھی اسی طرح اس اصول اور فارمولے کے تابع ہے، جس طرح ایک انسان کی خلقت۔

اور اگر ان کا تعجب زمانہ کے اختصار کے لحاظ سے ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ مراحل جو انسان حالتِ نطفہ سے لے کر جوانی کے دور تک کئی برسوں میں طے کرتا ہے مختصر سے لمحات میں طے کرے ؟ تو اس کا جواب بھی پروردگار کی قدرت دیتی ہے۔

جہاں تک ہم جاندار کی دنیا میں انسانی بچوں کو دیکھتے ہیں کہ انہیں ایک طویل مدت گزارنا چاہیئے تاکہ وہ چلنا پھرنا اچھی طرح سیکھ سکیں یا نوعِ غذا سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے برعکس جب پرندوں کے بچوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنا سر انڈے سے باہر نکالتے ہی اور پیدا ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور چلنے پھرنے لگتے ہیں بلکہ غذا کھانے میں وہ اپنی ماں کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ یہ امور نشان دہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل کی خدا کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔

اس آیت کے آخر میں خدا کے "سمیع و بصیر" ہونے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مشرکین کی طرف سے ہونے والے ایک اور اعتراض کا جواب ہو اور وہ اس طرح، کہ چلو مان لیا کہ تمام انسان اپنی گوناگوں اور مختلف تخلیقی خصوصیات کے باوجود ایک وقت مقررہ پر اپنی قبروں سے باہر آجائیں گے، لیکن اُن کے اعمال اور اقوال کا کس طرح محاسبہ کیا جائے گا جو وجود میں آنے کے بعد فوراً نیست و نابود ہو جاتے ہیں ؟

تو قرآن جواب دیتا ہے کہ خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔ اُس نے ان کی تمام باتیں سُنی ہیں اور اُن کے تمام اعمال دیکھے ہیں (علاوہ ازیں اس جہان میں مطلق فنا اور نابودی نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ ان کے اعمال و اقوال ہمیشہ موجود رہتے ہیں)۔

اس سے قطع نظر اُوپر والا جُملہ ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو حیلوں بہانوں سے کام لیتے ہیں کہ یاد رکھو یہ جو تم تمام لوگوں کے افکار کو مسموم کر رہے ہو، خدا تمہاری اس زہریلی گفتگو سے بے خبر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جو کچھ تم دل میں رکھے ہوئے ہو اور زبان پر نہیں لاتے، خدا اس سے بھی آگاہ ہے۔

بعد والی آیت تاکید اور خدا کی وسیع قدرت کے لیے ایک اور بیان ہے۔ روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ خدا رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے:" (الم تر ان الله یولج اللیل فی النھار و یولج النھار فی اللیل)۔

نیز کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ" خدا نے سُورج اور چاند کو انسانوں کے مفادات کے لیے مسخر کیا ہے؛" (وسخر الشمس والقمر)۔

" اور ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت تک اپنی حرکت کو جاری رکھے ہُوئے ہے؛" (کل یجری الیٰ اجل مسمّیٰ)۔

" اور یہ کہ خدا اس سے کہ جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے:" (وان الله بما تعملون خبیر)۔

" ولوج" اصل " دخول" کے معنی میں ہے۔ اور رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں ہو سکتا ہے کہ تدریجی اضافہ اور سال بھر میں رات دن کے کم اور زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ کہ تدریجاً ایک میں کمی اور دوسرے میں غیر محسوس شکل میں اضافہ ہوتا ہے تاکہ چاروں موسم اپنی خصوصیات اور بابرکت آثار کے ساتھ ظاہر ہوں (صرف رُوئے زمین کے دو خطّے ایسے ہیں کہ جن میں نہ تو یہ تدریجی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی چار موسم، ایک تو قطبِ شمالی ہے اور دوسرا قطبِ جنوبی، جہاں سارے سال میں چھ ماہ رات اور چھ ماہ دن ہوتا ہے اور دوسرا بالکل ہی باریک خطِ استوا ہے، جہاں سال بھر میں رات دن یکساں ہوتے ہیں) اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ زمینی فضا میں رات کا دن میں اور دن کا رات میں تبدیل ہونا ناگہانی شکل میں صورت پذیر نہیں ہوتا تاکہ انسان اور زندہ موجودات کو مختلف خطرات کا سامنا کرنا پڑے، بلکہ سُورج کی شعاعیں طولِ فجر کے وقت پہلے تاریکی کی گہرائیوں میں داخل ہوتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ تمام آسمان کو گھیر لیتی ہیں دن کے اختتام اور رات کے آغاز کے بالکل برعکس۔

یہ تدریجی اور مکمل منظم سوچا سمجھا انتقال قدرتِ خدا کے مظاہر میں سے ہے۔

البتہ ان دونوں تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ دونوں مل کر ہی آیت کا معنی دے رہی ہوں۔

انسانوں کے لیے "شمس" و "قمر" اور باقی آسمانی کرات کی تسخیر کے بارے میں، جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، مراد انسان کی خدمت کی راہ میں تسخیر ہو اور دوسرے لفظوں میں "سخر لکم" میں "لام" "لام نفع" ہے نہ کہ " لام اختصاص" اور یہ تعبیر قرآن میں سُورج، چاند، رات، دن، نہروں اور دریاؤں اور کشتیوں کے بارے میں آئی ہے اور یہ سب انسانی شخصیت کی عظمت اور خدا کی نعمتوں کی وسعت کو بیان کرتی ہیں کہ زمین و آسمان کے تمام موجودات حکم خدا کے آگے سر جھکائے فرمانبرداری میں مصروف ہیں۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر انصاف سے بعید ہو گا کہ انسان خدا کا فرمانبردار نہ ہو[1]

" کل یجری الیٰ اجل مسمّیٰ"، کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ چاق و چوبند حساب شدہ اور منظم نظام ابد تک جاری و ساری نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی دن اسے ختم ہونا چاہیئے اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی دُنیا بھی ختم ہو جائے گی۔ وہی کچھ ہو گا جو "سورہ تکویر" میں کہا گیا ہے:

" اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت "

" جس وقت سُورج بے نور ہو جائے گا اور ستارے سیاہ اور تاریک ہو جائیں گے۔"

(ان الله بما تعملون خبیر) ہماری مندرجہ بالا گفتار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جملہ پر غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اس کا اسی بحث کے ساتھ کیسا تعلق ہے۔ کیونکہ وہ خدا جس نے باعظمت سُورج اور چاند کو اس منظم حساب و کتاب کے ساتھ چلایا ہوا ہے اور رات دن کو مخصوص نظم و ضبط کے ساتھ لاکھوں کروڑوں سال سے ایک دوسرے میں وارد کرتا

---

[1] " انسان کے لیے سُورج چاند اور دوسرے موجودات کی تسخیر کے بارے میں جلد نمبر ۱۰ سورۂ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں اور سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۲ ، ۳۳ ، صـ ۹۴ میں ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔ (اردو ترجمہ)

آرہا ہے، اس سے کس طرح ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال سے بے خبر رہ جائے؟ جی ہاں! وہ ان کے اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کی نیات وافکار اور تصورات کو بھی۔

آیت کے آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے نتیجے کے طور پر فرماتا ہے "یہ امور اس چیز کی دلیل ہیں کہ خدا حق ہے اور اس کے علاوہ جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں، باطل ہیں اور خدا بلند مقام اور بزرگ مرتبہ والا ہے" (ذالک بان اللہ ھو الحق وان ما یدعون من دونہ الباطل وان اللہ ھو العلی الکبیر)[1]

گذشتہ آیات میں خداوندِ عالم کی خالقیت، مالکیت اور غیر متناہی علم وقدرت کے بارے میں بحث سے ثابت ہوگیا ہے کہ "حق" صرف وہی ہے اور اس کے علاوہ سب زائل، باطل، محدود اور حاجت مند و نیازمند ہے۔ اور "علی وکبیر" کہ جو ہر چیز سے برتر اور توصیف وتعریف سے بالاتر ہے، وہ اسی کی پاک ذات ہے۔ شاعر کے بقول ؎

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل وکل نعیم لا محالۃ زائل

"آگاہ رہو کہ خدا کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باطل ہے اور ہر نعمت آخر کار زوال پذیر ہے"

اس بات کو فلسفی تعبیر میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

حق اصلی اور پائیدار وجود کی طرف اشارہ ہے اور اس جہان میں وہ وجودِ حقیقی جو قائم بالذات اور ثابت، برقرار اور جاودانی ہو وہ صرف وہی ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے بالذات کوئی وجود نہیں رکھتا اور عین بطلان ہے کہ جو اپنی ہستی کو اس وجودِ حق سے وابستگی کی بناء پر ظاہر کرتا ہے اور جس لمحہ وہ اپنی نظر لطف ان سے اٹھالے تو وہ فنا و نیستی کی تاریکیوں میں مٹ کر نابید ہو جائیں۔

تو اس طرح دوسرے موجودات کا ارتباط حق تعالیٰ کے وجود کے ساتھ جس قدر زیادہ ہوگا، اسی نسبت سے وہ زیادہ حقانیت کسب کریں گے۔

بہر حال جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیات خدا کی برجستہ صفات میں سے دس صفات کا مجموعہ اور اس کے اسماء حسنیٰ میں سے دس نام ہیں اور ہر قسم کے شرک کی نفی اور تمام مراحل عبودیت میں توحید کے لزوم پر قوی دلائل پر مشتمل ہیں۔

---

[1] "با" (بان اللہ ھو الحق) میں اگرچہ بادی النظر میں "باء سببیت" نظر آتی ہے اور شاید اسی بناء پر بعض مفسرین نے (جیسے آلوسی نے روح المعانی میں) اس آیت کے مضمون کو گذشتہ مطلب کا سبب قرار دیا ہے، لیکن آیات کا سیاق اور گذشتہ صفات کا ذکر یعنی خالقیت و مالکیت و علم و قدرت اور عالمِ خلقت میں اس کی نشانیاں بظاہر یہ ہے کہ وہ سب اس نتیجہ کے گواہ تھے۔ اس بناء پر اس آیت کا مضمون گذشتہ آیات کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب۔

۳۱۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

۳۲۔ وَ اِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ۝

ترجمہ

۳۱۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر کے سینے پر بحکم خدا اور اس کی نعمت کی برکت سے چلتی ہیں، وہ تمہیں اپنی آیات کا ایک حصہ دکھانا چاہتا ہے۔ **بیشک اس میں تمام صبر و شکر کرنے والوں کیلیے (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔**

۳۲۔ اور جس وقت (دریائی سفر میں) بادلوں کی طرح کوئی موج انھیں چھپا دے (اور ان کے سر کے اوپر آجائے) تو وہ خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، لیکن جس وقت اس نے انھیں خشکی کی طرف نجات دی تو بعض اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں (اور اپنے ایمان کے وفادار رہتے ہیں، جب کہ دوسرے بعض بھول جاتے ہیں اور کفر کی راہ اختیار کر لیتے ہیں) اور ہماری آیات کا کوئی شخص سوائے عہد شکن کفر کرنے والے کے اور کوئی انکار نہیں کرتا۔

تفسیر

گرداب بلا میں!

ایک بار پھر زیر بحث دو آیات میں خدا کی نعمتوں اور آفاق و انفس میں توحید کے دلائل کے متعلق گفتگو ہے۔
پہلی آیت میں دلیل نظم کے متعلق ہے اور دوسری آیت میں توحید فطری کے، اور مجموعی طور پر ان مباحث کی تکمیل کرتی ہے جو گذشتہ آیات میں ہو چکی ہیں۔

کہتا ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں دریاؤں کے سینے پر خدا کے حکم اور اس کی نعمت کی برکت سے چلتی ہیں۔" (الم تر ان الفلك تجری فی البحر بنعمة الله)۔[1]

مقصد یہ ہے کہ اپنی عظمت کی آیات کا ایک پہلو تمھیں دکھائے: (لیریکم من آیاته)

جی ہاں "ان میں نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو بہت صبر کرنے والے شکیبا اور شکر گزار ہیں": (ان فی ذالك لآيات لكل صبار شكور)۔

اس میں شک نہیں کہ کشتیوں کا سمندروں کے سینہ پر چلنا قوانین آفرینش کے ایک مجموعہ کا نتیجہ ہے۔ وہ یوں کہ:

۱۔ ہواؤں کا منظم ہو کر چلنا۔

۲۔ مخصوص وزن کی لکڑی یا وہ مواد جس سے کشتی بناتے ہیں۔

۳۔ خود پانی کا اپنا بوجھ۔

۴۔ پانی پر تیرنے والے اجسام پر پانی کا دباؤ۔

اور جس وقت ان امور میں سے کسی ایک میں خلل پیدا ہو جائے تو کشتی سمندر میں ڈوب جاتی ہے یا الٹ جاتی ہے اور یا وسط سمندر میں حیران و سرگرداں رہ جاتی ہے۔

لیکن جس خدا نے سمندروں کو انسان کی مسافرت اور ایک حصے سے دوسرے کی طرف اشیاء کے حمل و نقل کے لیے بہترین شاہراہ قرار دیا ہے، وہی خدا مذکورہ حالات پیدا کرتا ہے، جن میں سے ہر ایک یقیناً خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

سمندروں میں قدرت خدا کی عظمت اور اس کے مقابلے میں انسان کی پستی اس قدر ہے کہ گذشتہ زمانہ میں جب کہ صرف ہوا کی قوت سے کشتی چلانے میں استفادہ ہوتا تھا، اگر ساری دنیا کے لوگ جمع ہو کر بھی تند ہوا کی حرکت کی مخالف کی سمت میں اسے چلا کر سمندر کے اندر تک لے جانا چاہتے تو نہیں لے جا سکتے تھے۔

---

[1] "بنعمة الله" میں ہو سکتا ہے "با سببیت" ہو اور یا "با مصاحبت" ہو لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی جب کہ بحری جہازوں میں انجن کی طاقت ہوا کی جگہ لے چکی ہے، پھر بھی سمندری طوفان اس قدر سخت ہوتے ہیں کہ وہ عظیم ترین جہازوں کو بھی اپنی راہ سے ہٹا دیتے ہیں اور بسا اوقات ان کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

اور یہ جو آیت کے آخر میں "صبار" اور "شکور" (بہت زیادہ صبر کرنے والا اور بہت زیادہ شکر گزار) ایسی صفات کا ذکر ہوا ہے تو یہ یا تو اس بنا پر ہے کہ دنیاوی زندگی مجموعہ ہے "بلا" و "نعمت" کا، جن میں سے ہر ایک آزمائش کا ذریعہ ہے۔ سخت حوادث کے مقابلہ میں صبر و استقامت اور نعمتوں کے مقابلہ میں شکر گزاری انسان کے مجموعی فرائض کو تشکیل دیتے ہیں۔

اس لیے ایسی ایک حدیث ہے جسے بہت سے مفسرین نے پیغمبر اسلام سے نقل کیا ہے کہ

"الايمان نصفان نصف صبر ونصف شكر"

"ایمان کے دو حصے ہیں، آدھا صبر اور آدھا شکر ہے"۔[1]

اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ خلقت کے خدا کی باعظمت آیات کے ادراک کرنے کے لیے کسی سبب کی ضرورت ہے، جیسے منعم کا شکر جو زیادہ سے زیادہ غور و فکر کے لیے صبر و شکیبائی کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

کشتیوں کے دریا میں چلنے کی نعمت کے بیان کے بعد جو گذشتہ زمانہ میں بھی اور موجودہ زمانہ میں بھی انسانوں اور مال و اسباب کے حمل و نقل کا عظیم اور مفید ترین وسیلہ ہیں، اسی مسئلہ کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جس وقت وہ کشتی پر سوار ہوں اور سمندروں کے درمیان پہنچ جائیں اور سمندر میں طوفان آ جائے اور کوہ پیکر امواج بادلوں کی طرح ان کے سروں پر چھا جائیں تو وہ خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں": (واذا غشيهم موج كالظلل دعوا الله مخلصين له الدين)۔

"ظلل" "ظلّہ" (بروزن قلّہ) کی جمع ہے، جن کے مفسرین نے کئی معانی بیان کیے ہیں:

"راغب" "مفردات" میں کہتے ہیں۔ "ظلّہ" اس بادل کے معنی میں ہے کہ جو سایہ ڈالتا ہے۔ اور زیادہ تر ناخوشگوار واقعات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بعض نے اسے مادہ "ظل" سے سائبان کے معنی میں لیا ہے۔

اور بعض نے اسے پہاڑ کے معنی میں لیا ہے۔

اگرچہ زیر بحث آیت کے رابطہ میں ان معانی کا آپس میں زیادہ فرق نہیں، لیکن پھر بھی جب دیکھا جاتا ہے کہ قرآن میں بارہا یہ لفظ سایہ فگن بادلوں کے معنی میں آیا ہے اور "غشیهم" (انھیں ڈھانپ لیا) کی تعبیر جو بادل کے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر قریب تر نظر آتی ہے۔

یعنی سمندر کی عظیم موجیں اس طرح اٹھتی اور ان کے اطراف کو یوں گھیر لیتی ہیں گویا بادلوں نے ان کے سر پر سایہ کیا ہوا ہے

---

[1] تفسیر مجمع البیان، قرطبی، فخر رازی اور صافی۔

ایسا سایہ جو دحشت ناک اور ہول انگیز ہے۔

یہ وہ مقام ہے، جہاں انسان اپنی تمام ظاہری طاقتوں کے باوجود اس نے جو اپنے لیے جمع کر رکھی ہیں یا اپنے آپ کو ضعیف و ناچیز اور ناتواں پاتا ہے۔ ہر جگہ سے اس کا ہاتھ کٹ چکا ہوتا ہے۔ تمام عادی اور مادی وسائل بے کار ہو جاتے ہیں امید کا کوئی پہلو باقی نہیں رہ جاتا۔ سوائے اس نور کے کہ جو اس کی جان کے اندر اور اس کی فطرت کی گہرائی سے چمکتا ہے۔

یہ غفلت کے پردوں کو ہٹا دیتا ہے اور اس کے دل کو روشن کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ کوئی ہے، جو تجھے رہائی اور نجات دے سکے:

وہی ذات کہ سمندر کی موجیں جس کے تابع فرمان ہیں اور پانی، ہوا اور مٹی اس کے لیے سرگرداں نہیں۔

یہ وہ مقام ہے، جہاں خالص توحید انسان کے سارے دل کا احاطہ کر لیتی ہے اور وہ دین اور عبادت کو صرف اُسی کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے "جس وقت خدا نے انھیں اس ہلاکت سے نجات دے دی، موجیں ماند پڑ گئیں اور صحیح و سالم ساحل نجات تک پہنچ گئے تو لوگ دو گروہ ہو گئے بعض نے اعتدال کی راہ اختیار کی اور اس عہد و پیمان کے جو دل میں ان حساس لمحات میں خدا سے کیے پابند و وفادار رہتے ہیں"۔ (فلما نجاھم الی البر فمنھم مقتصد)[1]

لیکن دوسرا گروہ ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے اور دوبارہ شرک و کفر کا لٹیرا لشکر اس کے دل کی مملکت پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت اس روایتی آیت کو "عکرمہ" بن ابی جہل" کے اسلام لانے کی طرف اشارہ سمجھتی ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر چونکہ پیغمبر اکرمؐ نے چار افراد کے علاوہ سب لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا اور جن چار افراد کے بارے میں سزائے موت کا حکم تھا، ان میں ایک عکرمہ بن ابوجہل تھا۔ ان کے بارے میں حکم تھا کہ جہاں کہیں انھیں پاؤ ختم کر دو۔ کیونکہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے برخلاف کسی قسم کی ریشہ دوانی، کینہ پروری اور جرم و گناہ کا کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا) یہ حکم سن کر عکرمہ کو مجبوراً مکہ سے بھاگنا پڑا۔

بحیرہ احمر پر پہنچ کر کشتی پر سوار ہو گیا، سمندر میں خطرناک تیز ہوا چلی، اہلِ کشتی نے ایک دوسرے سے کہا، آؤ بتوں سے اپنا ناطہ توڑ کر صرف لطفِ "خدا" کے دامان سے متمسک ہو جائیں۔ کیونکہ ہمارے لیے ان خداؤں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

"عکرمہ" نے کہا اگر توحید کے علاوہ ہمیں سمندر سے کوئی نجات نہیں دے سکتا تو خشکی پر بھی نہیں دے سکتا۔ بارِ الہا! میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تو نے اس مصیبت سے نجات دے دی تو میں محمدؐ کے پاس جا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ کیونکہ اسے میں رحیم اور کریم سمجھتا ہوں۔

آخر کار اس نے نجات پائی اور خدمتِ پیغمبرؐ میں آکر مسلمان ہو گیا۔[2]

---

[1] "مقتصد" "مقصد" کے مادہ سے کام میں اعتدال اور وعدہ وفا کے معنی میں ہے۔

[2] "مجمع البیان" ذیل آیہ زیر بحث" اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ج ۴ ص ۵ میں بھی یہی ماجرا مختصرے فرق کے ساتھ آیا ہے (عکرمہ بن کے کمرے زیر کے ے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے "ہماری آیات کا سوائے پیمان شکن کفران کرنے والوں کے کوئی انکار نہیں کرتا"۔ (وما یجحد بآیاتنا الا کل ختار کفور)۔

"ختار" "ختر" (بروزن "چتر") کے مادہ سے ہے جو عہد شکنی کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ مبالغہ کا صیغہ ہے، کیونکہ مشرکین اور گناہ گار بارہا مصائب میں خدا کی طرف رجوع کرتے اور خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں اور نذریں مانتے ہیں لیکن جس وقت طوفان حوادث تھم جاتے ہیں تو اپنا عہد و پیمان توڑ دیتے ہیں اور خدا کی نعمتوں کو کفران کے سپرد کر دیتے ہیں اور یہ ان کا بارہا کا معمول ہے۔

حقیقت میں "ختار" و "کفور"، کہ جو اس آیت کے ذیل میں آئے ہیں "صبار" اور "شکور" کے بالکل مقابل میں آئے ہیں۔ جو گذشتہ آیت کے ذیل میں آچکے ہیں (کفران شکر گزاری کے مقابلہ میں، اور "عہد شکنی" شکیبائی اور عہد و پیمان پر باقی رہنے کے مقابلہ میں ہے) جو اپنے اندر فطری ایمان کے جلوہ گر ہونے کے وقت کوشش کرتے ہیں کہ اس نورِ الٰہی کو دوبارہ خاموش نہ ہونے دیں اور اس کے اُوپر حجاب اور پردے نہ پڑنے دیں۔

۳۳- يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝

۳۴- إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ

۳۳- اے لوگو! خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں نہ باپ اپنے بیٹے کے اعمال کی جزاء کا بار اُٹھائے گا اور نہ بیٹا باپ کی جزاء میں سے کسی چیز کا۔ یقیناً خدا کا وعدہ حق ہے۔ لہٰذا دنیاوی زندگی تمھیں فریب نہ دے اور شیطان تمھیں مغرور نہ کرے۔

۳۴- قیامِ قیامت کے وقت سے آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور وہی ہے جو بارش کو نازل کرتا ہے اور جو کچھ ماؤں کے رحم میں ہے اسے جانتا ہے، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس زمین پر مرے گا

صرف خدا ہی عالم و آگاہ ہے۔

تفسیر

خدا کے علم کی وسعت:

ان دو آیات میں جو سورۂ لقمان کی آخری آیات ہیں پہلے مجموعی طور پر اور ایک اجمالی صورت میں گذشتہ پند و نصائح اور توحید و معاد کے دلائل کے ذریعہ تمام انسانوں کو خدا اور قیامت کے دن کی طرف متوجہ کرتا ہے، پھر دنیا اور شیطان کی طرف سے پیدا ہونے والے غرور و تکبر سے ڈراتا ہے اور اس کے بعد علمِ خدا کی وسعت اور تمام چیزوں کو اس کی شمولیت اور اس کی عمومیت کو بیان کرتا ہے فرماتا ہے "اے لوگو! خدا سے ڈرو"۔ (یا ایھا الناس اتقوا ربکم)۔

"اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں نہ تو باپ اپنے بیٹے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے گا۔ نہ ہی بیٹا باپ کی ذمہ داری میں سے کسی چیز کا متحمل ہوگا"۔ (واخشوا یومًا لا یجزی والد عن ولدہ ولا مولودٌ ھو جازٍ عن والدہ شیئًا)۔

حقیقت میں پہلا فرمان مبدا کی طرف توجہ ہے اور دوسرا معاد کی طرف۔

پہلا حکم انسان میں خبردار رہنے کی قوت کو زندہ کرتا ہے اور دوسرا پاداش و کیفر اور جزاء سزا کے احساس کو، اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ ایک خبیر اور آگاہ ذات اس کے تمام اعمال کو دیکھتی اور جانتی ہے اور اسے محفوظ کرتی جاتی ہے، اور دوسری طرف سے عدل و انصاف کا محکمہ اس کے تمام چھوٹے بڑے اعمال کی چھان بین کرے گا تو اس قسم کا انسان بہت کم گناہ کا اور بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے۔

"لا یجزی" کا جملہ جزاء کے مادہ سے ہے اور لغوی طور پر "جزاء" دو معنی کے لیے آتا ہے، ایک تو کسی چیز کے مقابلہ میں پاداش و کیفر یعنی سزا اور جزاء دینے کے معنی میں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے جزاہ اللہ خیرًا: خدا اسے اچھی پاداش (جزاء) دے۔

اور دوسرا کفایت کرنا جانشین ہونا اور تحمل کرنا، جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں آیا ہے لا یجزی والد عن ولدہ "کوئی باپ اپنے بیٹے کی ذمہ داری اور مسئولیت کو قبول نہیں کرے گا اور اس کی جگہ پر نہیں بیٹھے گا اور اس کی کفایت نہیں کرے گا"۔

ہوسکتا ہے کہ دونوں معنی ایک ہی اصل کی طرف پلٹتے ہوں۔ کیونکہ جزاء اور سزا بھی عمل کی جانشین اور اس کے برابر ہوتی ہیں۔ (غور کیجئے گا)

بہرحال اس دن ہر شخص اس طرح اپنے آپ کے ساتھ معروف و مشغول اور اپنے اعمال کے پیچ و خم میں گرفتار ہوگا کہ دوسرے کی طرف توجہ بھی نہیں کر سکے گا۔ یہاں تک کہ باپ اور بیٹا جو آپس میں نزدیک ترین رابطہ رکھتے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی دوسرے کا خیال نہ ہوگا۔

یہ آیت بعینہ اسی آیت کی طرح ہے جو سورۂ حج کی ابتداء میں آئی ہے، جس میں قیامت اور اس کے زلزلہ کے بارے میں کہا گیا ہے: (یوم ترونہا تذھل کل مرضعۃ عمّا ارضعت) "جس دن تم اسے دیکھو گے کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی"۔

قابل توجہ یہ ہے کہ "باپ" کے بارے میں "لا یجزی" (فعل مضارع) کی تعبیر کرتا ہے اور بیٹے کے بارے میں "جاز" (اسم فاعل) کی تعبیر ہے۔ یہ تعبیر کا فرق ہو سکتا ہے گفتگو میں تنوع کے طور پر یا باپ کے مقابلہ میں بیٹے کے فرائض اور ذمہ داری کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اسم فاعل زیادہ دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں محبت پدری سے یہ توقع ہے کہ کم از کم کچھ صورتوں میں تو بیٹے کے عذاب کو برداشت کرے۔ جیسا کہ دنیا میں اس کی نامناسب چیزوں کو اپنی جان پر لے لیتا تھا۔ لیکن بیٹے کے بارے میں توقع ہے کہ وہ باپ کی زیادہ سے زیادہ ناپسندیدہ باتوں اور سختیوں کو اس کے بے شمار حقوق کی وجہ سے متحمل ہو جائے گا، جبکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اس دن ایک دوسرے کی کم سے کم مشکل بھی حل نہیں کرے گا۔ اور ہر ایک اپنے اعمال میں گرفتار اور اپنے گریبان میں جھانک رہا ہوگا۔

آیت کے آخر میں انسان کو دو چیزوں سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا کا وعدہ حق ہے۔ مبادا کہیں تمہیں زندگی فریب دے اور شیطان دھوکہ دینے والے": (ان وعد اللہ حق فلا تغرنکم الحیٰوۃ الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور)۔

واقع میں یہاں پر دو نواہی نظر آتی ہیں جو ان دو اوامر کے مقابلہ میں ہیں، جو آیت کے ابتداء میں تھے، کیونکہ اگر خدا کی طرف توجہ حساب و کتاب اور جزاء و سزاء کا خوف انسان میں زندہ ہو جائے تو پھر اس کے بارے میں راہ راست سے انحراف اور بے راہ روی کی رغبت باقی نہیں رہتی، مگر دو راستوں سے ایک تو یہ کہ دنیا کی چمک دمک اور رنگینی اس کی نگاہوں میں حقائق اور واقعات کو بالکل برعکس بنا کر پیش کرے اور اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کی قدرت اس سے سلب کرے۔ وہی بات کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ دوسرا یہ کہ شیطانی وسوسے اسے فریب اور دھوکہ میں مبتلاء کر کے اسے مغرور اور مبدء و معاد سے کوسوں دور کر دیں۔

اگر ارتکاب گناہ کے یہ دونوں راستے بند ہو جائیں تو پھر کوئی خطرہ بھی اسے چیلنج نہیں کر سکتا اور اس طرح سے اوپر والے چار احکام آدمی کی نجات کے پروگرام کا مکمل مجموعہ فراہم کر دیتے ہیں۔

گذشتہ آیت میں قیامت کے سلسلہ میں ہونے والی بحث کی مناسبت سے اس سورہ کی آخری آیت میں بھی ایسے علوم کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے جو پروردگار کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کہتا ہے "قیام قیامت کے وقت کی آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے": (ان اللہ عندہ علم الساعۃ)۔

"اور وہی ہے جو بارش کو نازل کرتا ... اور اس کے نزول کے تمام جزئیات سے آگاہ ہے": (وینزل الغیث)۔

اور نیز "وہی ہے جو ایسے بچوں سے کہ جو رحم مادر میں ہوتے ہیں (ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ) آگاہ ہے": (و یعلم ما فی الارحام)۔

اور "کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟" (وما تدری نفس ماذا تکسب غدًا)۔

"اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا": (وما تدری نفس بای ارض تموت)۔

"خدا عالم اور آگاہ ہے": (ان اللہ علیم خبیر)۔

گویا یہ آیت مجموعی طور پر اس سوال کا جواب ہے جو قیامت کے بارے میں پیش ہوا ہے۔ وہی سوال جو مشرکین قریش نے پیغمبر سے بار بار کیا اور کہا "متٰی ھو" (قیامت کا دن کب ہوگا)؟ (اسراء۔ ۵۱)

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کوئی شخص خدا کے علاوہ قیام قیامت کی گھڑی اور وقت سے آگاہ نہیں ہے اور دوسری صریح آیات کے مطابق خدا نے اس علم کو سب سے مخفی رکھا ہے:

(ان الساعۃ اٰتیۃ اکاد اخفیہا) "بے شک قیامت آئے گی اور میں چاہتا ہوں کہ اس کو مخفی رکھوں": (طٰہٰ۔ ۱۵)

تاکہ غرور و غفلت کبھی بھی افراد بشر کے دامن گیر نہ ہوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ نہ صرف قیامت کا مسئلہ تم سے پوشیدہ ہے بلکہ تمہاری روزمرہ کی زندگی اور نزدیک ترین مسائل میں سے جو تمہاری موت و حیات سے سروکار رکھتے ہیں، بہت سے مطالب ایسے ہیں جن سے تم بے خبر ہو۔

بارش کے زندگی عطا کرنے والے قطرات کے نزول کا وقت جن سے تمام جانداروں کی زندگی وابستہ ہے، تم میں سے کسی پر بھی آشکار نہیں اور تم تو صرف اندازے، اٹکل پچو اور وہم و گمان کے ساتھ اس کے بارے میں بحث کرتے ہو۔

اسی طرح شکم مادر میں تمہاری پیدائش کے وقت اور جنین کی خصوصیات سے کوئی آگاہ نہیں ہے۔

اور نیز آئندہ نزدیک یعنی تمہارے کل کے حوادث نیز موت، زندگی کو الوداع کہنے کا مقام سب سے پوشیدہ ہے۔

جب تم اپنی زندگی سے ان کے نزدیک ترین مسائل کی اطلاع نہیں رکھتے تو کون سے تعجب کی بات ہے کہ قیام قیامت کے لمحہ سے بے خبر رہو؟[1]

---

[1] یہ ٹھیک ہے کہ اوپر والی آیات میں "ینزل الغیث" (خدا بارش کو نازل کرتا ہے) کے جملہ میں علم خدا کے مسئلہ کے بارے میں گفتگو نہیں ہے اسی بناء پر بعض نے اس جملہ کو ان جملوں کے درمیان استثناء کے طور پر قدرت خدا کے بیان کے لیے نہ کہ اس کے علم کے لیے سمجھا ہے۔ لیکن ادھر پانچ جملوں کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور دوسری طرف سے متعدد روایات جو نہج البلاغہ اور دوسری کتب میں آئی ہیں، اور کہ جن کی طرف عنقریب اشارہ کریں گے، اس چیز پر قرینہ ہیں کہ وہ جملہ بھی علم خدا کے ساتھ مربوط ہے۔

تفسیر "درمنثور" میں منقول ہے کہ قبیلہ "بنی مازن" سے "وارث" نامی ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور کہا "اے محمد! قیامت کب برپا ہوگی؟ علاوہ ازیں ہمارے شہر خشک سالی کا شکار ہو چکے ہیں، کب نعمت سے مالامال ہوں گے؟ نیز جس وقت میں آیا ہوں میری بیوی حاملہ تھی کب اسے بچّہ پیدا ہوگا؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ آج میں نے کیا کام کیا ہے؟ لیکن یہ بتاؤ کہ کل کیا کروں گا؟ خلاصہ یہ کہ میں جانتا ہوں کہ میں کہاں پیدا ہوا ہوں۔ تم بتاؤ کہ میں کس سرزمین میں مروں گا؟

تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا ان تمام امور کا علم خدا کے پاس ہے۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ **غرور و فریب کی قسمیں** : اوپر والی آیات تنبیہ کرتی ہیں کہ دُنیاوی زندگی کی چمک دمک تمھیں فریب میں مبتلا نہ کردے، پھر شیطان کے دھوکہ دینے کی بات ہے اور اس کی نسبت خطرے کا الارم ہے۔ کیونکہ لوگوں کی چند قسمیں ہیں،

بعض اتنے ضعیف و ناتواں ہوتے ہیں جن کے فریب اور دھوکے کے لیے صرف دنیا کے زرق و برق کا مشاہدہ ہی کافی ہوتا ہے۔

لیکن بعض دوسرے جو مزاحمت کی طاقت رکھتے ہیں، تو ان کے لیے زرق برق کے علاوہ شیطانی وسوسوں کا اضافہ بھی ہوتا ہے اور اندرونی اور بیرونی شیطان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہیں تاکہ وہ انھیں دھوکہ دے سکیں۔ اوپر والی آیت کی تعبیر ایسے سب کے لیے تنبیہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "غرور" (بروزن جسور) ہر فریب اور دھوکہ دینے والی چیز کو کہتے ہیں، اور یہ جو اس کی شیطان کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے، درحقیقت اس کے واضح مصداق کا بیان ہے ورنہ ہر فریب کار انسان، دھوکہ دینے والی کتاب، ہر وسوسہ پیدا کرنے والا مقام و مرتبہ اور ہر وہ چیز جو انسان کو گمراہ کر دے، اس لفظ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے یا یہ کہ شیطان کے مفہوم کو اس قدر وسعت دیں کہ ان تمام امور کو شامل ہو جائے۔

اس لیے راغب مفردات میں کہتے ہیں "غرور" ہر وہ چیز ہے جو انسان کو مغرور کر دے اور فریب میں مبتلا کر دے خواہ وہ مال ہو یا مقام و مرتبہ یا شہوت اور شیطان۔ اور شیطان کے ساتھ اس کی جو تفسیر ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان خبیث ترین فریب کار ہے۔

اور بعض لوگوں نے "غرور" کی دُنیا کے ساتھ جو اس کی تفسیر کی ہے تو دنیا کے فریب اور دھوکہ دینے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ نہج البلاغہ میں ہم پڑھتے ہیں "تغر و تضر و تمر" فریب دیتی ہے، ضرر پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔[2]

۲۔ **دُنیا کی فریب کاری** : اس میں شک نہیں کہ زندگانی دنیا کے بہت سے مظاہر غرور آمیز ہوتے ہیں اور غفلت

---

[1] تفسیر درمنثور بحوالہ تفسیر المیزان جلد ۱۶ صـ ۲۵۴۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۵۴۔

پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھار تو اس طرح انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں کہ اپنے ماسوا باقی ہر ایک چیز سے غافل کر دیتے ہیں۔

اسی بناء پر بعض اسلامی روایات میں حضرت امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے کہ جس وقت آپ سے لوگوں نے سوال کیا "ای الناس اثبت رأیًا" کون شخص تمام لوگوں میں سے صاحب فکر و رائے اور تدبیر کے لحاظ سے زیادہ ثابت قدم ہے تو آپ نے فرمایا "من لم یغرہ الناس من نفسہ ولم تغرہ الدنیا بتشویقھا" وہ شخص کہ جسے فریب کار لوگ فریب نہ دے سکیں اور دُنیا کی رغبت اسے دھوکہ نہ دے سکے۔[1]

لیکن اس کے باوجود اسی فریب کار دُنیا کے مختلف مناظر کے اندر زبان حال سے بولنے والے کچھ ایسے مناظر بھی ہیں جو اس جہان کی ناپائیداری اور اس کے کھوکھلے زرق و برق کو واضح ترین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ حوادث جو ہر ہوش مند انسان کو بیدار کر سکتے ہیں بلکہ جو ہوش مند نہیں انھیں بھی ہوشیار کر دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے، حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے کسی سے سُنا کہ وہ دنیا کی مذمت کر رہا تھا اور اسے فریب کار بتا رہا تھا تو آپ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

ایھا الذام للدنیا المغتر بغرورھا، المخدوع باباطیلھا، اتغتر بالدنیا ثم تذمھا؟ انت المتجرم علیھا ام ھی المتجرمۃ علیک؟ متی استھوتک ام متی غرتک؟ ابمصارع اٰبائک من البلی ام بمضاجع امھاتک تحت الثری...؟

ان الدنیا دار صدق لمن صدقھا، ودار عافیۃ لمن فھم عنھا، ودار غنی لمن تزود منھا، ودار موعظۃ لمن اتعظ بھا، مسجد احباء اللہ، ومصلی ملائکۃ اللہ، ومھبط وحی اللہ، ومتجر اولیاء اللہ.....

اے دنیا کی مذمت کرنیوالے! اس کی دل فریبیوں کے فریب خوردہ، اس کی رام کہانیوں کا دھوکہ کھائے ہوئے! کیا بات ہے کہ دُنیا پر فریفتہ بھی ہو اور اس کی مذمت بھی کر رہے ہو؟ کیا تم اس پر گناہ کی تہمت لگا رہے ہو، یا وہ تمھیں مجرم ٹھہرا رہی ہے؟ اس نے تمھیں کب متوالا کیا؟ یا کب تمھارا دل لبھایا؟ کیا اس وقت جب تمھارے آباء سال خوردہ ہو کر ڈھیر ہوئے یا اس وقت جب تمھاری مائیں (منوں) مٹی کے نیچے ہمیشہ کو سو گئیں؟ کتنے ہی بیماروں کی تم نے (دل سے) خدمت کی۔ اور کتنے ہی مریضوں کی ہاتھوں سے تیمارداری کی؟ تم چاہتے تھے کہ وہ شفایاب ہو جائیں اور ان کے علاج کے لیے اطباء سے مشورے طلب کرتے پھرتے تھے۔ وہ بھی اس دن جب سے تمھاری دوا ان کے کسی کام نہ آئی۔ نہ ان پر تمھارا رونا دھونا ہی مفید ہوا۔ ان میں سے کسی کو بھی تمھاری مہربانی کا فائدہ نہ پہنچا اور نہ تمھاری مراد ہی بر آئی اور تم اپنا زور لگا بیٹھے، مگر کسی کو (موت سے) نہ بچا سکے۔ اور دنیا نے اس (مرنے والے) کو تمھارے لیے مثال بنا دیا اور اس کی موت کو تمھاری موت کا نقشہ بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا تباہ کا گھر ہے۔ مگر اس کے لیے جو اس سے نباہ کرے اور دارِ

---

[1] من لا یحضرہ الفقیہ (بحوالہ نور الثقلین جلد ۴ صـ ۲۱۷

عافیت ہے اس کے لیے جو اس کی حقیقت کو سمجھے اور دولت کدہ ہے اس کا جو اس سے زادِ آخرت حاصل کر سکے۔

اور عبرت کا گھر ہے اس کے لیے جو اس سے سبق سیکھے۔ (دنیا) خدا کے دوستوں کی مسجد ہے، اللہ کے ملائکہ کی جائے نماز ہے، وحی خدا کے اترنے کی جگہ ہے اور خدا کے اولیا، کی تجارت گاہ ہے۔

۳- یہ پانچ علوم خدا کے ساتھ مخصوص ہیں: اس سے قطع نظر کہ اوپر والی آیت کا لب ولہجہ حکایت کرتا ہے کہ قیامت، بارش کے نزول، رحم مادر میں جنین کی کیفیت، وہ امور کہ جنہیں انسان آئندہ انجام دے گا اور اس کی موت کی جگہ سے آگاہی اور اس کا علم خدا کے اختیار میں ہے اور خدا کے علاوہ کسی اور کو ان تک کوئی رسائی نہیں، وہ روایات بھی جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، نیز اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں۔

منجملہ ان کے ایک حدیث میں ہے (ان مفاتیح الغیب خمس لا یعلمهن الا اللہ وقرأ هذه الآیة) غیب کی چابیاں پانچ ہیں کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

نہج البلاغہ کی ایک اور روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت حضرت علیؑ آئندہ کے واقعات کے بارے میں خبر دے رہے تھے۔ تو ایک صحابی نے عرض کیا یا امیرالمومنین آپ غیب کی خبر دے رہے ہیں؟ اور آپ علم غیب سے آشنا ہیں؟

امام نے "بنی کلب" کے اس شخص سے مسکرا کر فرمایا:

یا اخا کلب! لیس هو بعلم غیب، وانما هو تعلم من ذی علم، وانما علم الغیب علم الساعة وماعدده اللہ سبحانه بقوله ان اللہ عنده علم الساعة ...... فیعلم اللہ سبحانه مافی الارحام، من ذکر او انثی، وقبیح او جمیل، وسخی او بخیل، وشقی او سعید، ومن یکون فی النار حطبا وفی الجنان للنبیین مرافقا: فهذا علم الغیب الذی لا یعلمه احد الا اللہ، وماسوی ذلک فعلم علمه اللہ نبیه فعلمنیه ودعالی بان یعیه صدری وتضطم علیه جوانحی۔!

اے بھائی کلبی! یہ علم غیب نہیں ہے، بلکہ یہ اس (رسول) سے حاصل کی ہوئی باتیں ہیں جو خزانہ علم (الٰہی) تھے۔ علم غیب تو قیامت کا وقت اور ان چیزوں کے جاننے کا نام ہے، جنہیں خداوندِ عالم نے اپنے ارشاد " ان اللہ عنده علم الساعة .... الخ میں شمار کیا ہے۔

پس خدا ہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے؟ نر ہے یا مادہ؟ بدصورت ہے یا خوبصورت؟ سخی ہے یا بخیل؟ شقی ہے یا نیک اور کون جہنم کا ایندھن بنے گا؟ اور کون جنت میں نبیوں کے ساتھ ہوگا؟ پس یہ ہے وہ علم غیب جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، رہا دوسری چیزوں کا علم تو وہ (ہم جانتے ہیں) خدا نے اپنے نبی کو عطا فرمایا اور نبی نے مجھے تبلادیا اور میرے لیے دعا فرمائی کہ میرا سینہ انھیں اس طرح محفوظ رکھے، جیسے ترکش تیروں کو محفوظ رکھتا ہے اور میری پسلیاں

---

[1] مجمع البیان" ذیل آیت زیر بحث۔

انہیں سمیٹے رہیں[1]

اس روایت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ لوگوں کی ان پانچ امور سے عدم آگاہی سے مراد ان کی تمام خصوصیات ہیں مثلاً اگر کسی دن ایسے وسائل و ذرائع انسان کے اختیار میں آجائیں (جب کہ ابھی تک وہ دن نہیں آیا) اور جنین کے لڑکے یا لڑکی ہونے سے قطعی طور پر آگاہ ہو جائیں تو کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ جنین سے آگاہی یہ ہے کہ اس کے تمام جسمانی خصوصیات بدصورتی اور خوبصورتی سلامتی و بیماری اندرونی استعدادیں علمی و فلسفی و ادبی ذوق اور دوسرے روحانی اوصاف اور کیفیات جان لیں اور یہ امر خدا کے علاوہ کسی اور کے بس میں نہیں ہے۔

اسی طرح یہ کہ بارش کب ہوگی؟ اور کون سے علاقہ پر برسے گی؟ اور ٹھیک ٹھیک کتنی مقدار دریا، صحرا، درہ، کوہ و بیاباں میں برسے گی؟ خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا!

اور کل اور آئندہ دنوں کے حوادث اور ان کی خصوصیات و جزئیات بھی اسی طرح ہیں۔

اور یہاں سے اس سوال کا جواب جو عام طور پر یہاں پیش آتا ہے، اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ ہم تاریخوں اور متعدد روایات میں پڑھتے ہیں کہ صرف ائمہ اہل بیت ہی نہیں بلکہ ائمہ کے علاوہ دوسرے اولیاء اللہ نے اپنی موت کے متعلق خبر دی یا اپنے مومن کو بیان کیا، جن میں سے کربلا سے تعلق رکھنے والے واقعات بھی ہیں؟ چنانچہ ہم نے کئی روایات میں پڑھا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ، امیرالمومنینؑ اور انبیاء ماسلف نے امام حسینؑ اور ان کے یار و انصار کی اس سرزمین میں شہادت کی خبر دی ہے۔

اور کتاب اصولِ کافی میں ایک باب ائمہ کی اپنی وفات کے وقت سے آگاہی کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان بعض امور سے آگاہی علم اجمالی کی صورت میں ہوتی ہے اور وہ بھی تعلم الٰہی کے طریق سے، تو اس کا خدا کی ذات پاک سے مخصوص تفصیلی علم کے ساتھ کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے۔

اور پھر یہ کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ ان کا یہ اجمالی علم بھی ذاتی اور استقلالی نہیں۔ بلکہ بالعرض اور خدا کی طرف سے تعلیم کی وجہ سے ہوتا ہے کہ جتنا خدا چاہتا اور مصلحت سمجھتا ہے۔[2]

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آپ کے صحابی نے سوال کیا کہ کیا امام علم غیب جانتا ہے:

"قال لا، ولکن اذا اراد ان یعلم الشیء اعلمه اللہ ذلک"

"فرمایا نہیں، امام علم غیب" ذاتی طور پر" نہیں جانتا۔ لیکن جب بھی کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اسے آگاہ کر دیتا ہے"[3]

علم غیب اور انبیاءؑ و ائمہ کے علم کی کیفیت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں، جن کے متعلق متعلقہ آیات کے ذیل میں ہم بحث کریں گے۔ لیکن مسلم ہے کہ ان کے درمیان کچھ ایسے علوم ہیں کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۸۔

[2] اصول کافی جلد اوّل ص ۲۰۲ باب ان الائمة یعلمون متی یموتون۔

[3] اصول کافی جلد اوّل ص ۲۰۱ باب نادر فیه ذکر الغیب۔

بھی آگاہ نہیں ہے۔[1]

پروردگارا! ہمارے دل کی آنکھ علم و دانش کے نور سے منور فرما اور اپنے بے پایاں علم کا ایک گوشہ مرحمت فرما۔

خداوندا! ایسا کر کہ اس دُنیا کا زرق و برق ہمیں فریب نہ دے اور دھوکہ باز شیطان اور ہوائے نفس ہمیں مغرور نہ کرے۔

بارالہا! ایسا کر دے کہ ہم ہمیشہ تیرے احاطہ علمی سے آگاہ رہیں اور تیرے حضور تیری رضا کے خلاف کوئی کام انجام نہ دیں۔

سورۂ لقمان کا اختتام

۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۳ ہجری

[1] کتاب "اصول کافی" میں ہمیں متعدد روایات ملتی ہیں کہ خدا ایسا علم بھی رکھتا ہے، جس سے اس کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں اور کچھ علم ایسا ہے، جس کی ملائکہ انبیاءؑ اور ائمہؑ کو اس نے تعلیم دی ہے۔ جلد اوّل ص ۱۹۹ باب ان الائمة یعلمون جمیع العلوم التی خرجت الی الملائکة۔

سُورۂ الٓمٓ سجدة

اس سورت کی ۳۰ آیات ہیں

اور

مکہ میں نازل ہوئی

اس سُورۃ کے نام

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو اس کی کسی آیت کا استثنا بھی نہیں کیا ہے۔ لیکن بعض نے آیہ ۱۸ تا ۲۰ کو مدنی سمجھا ہے اور ان کا نظریہ ہے کہ یہ تین آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ حالانکہ ان آیات میں ان کے مدنی ہونے کا کوئی قرینہ اور نشانی نظر نہیں آتی۔

اس سورہ کا نام بعض روایات میں اور مشہور مفسرین کی زبان میں "سورہ سجدہ" یا "الم سجدہ" ہے۔ اور کبھی اسے "حم سجدہ" سے جدا بیان کرنے کے لیے اور "سجدہ لقمان" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیونکہ یہ سورہ لقمان کے بعد قرار پایا ہے۔

بعض روایات میں اسے الم تنزیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

"فخر رازی" اور "آلوسی" نے تو اس کے ناموں میں سورہ "مضاجع" کا نام ذکر کیا ہے (اس سورہ کی آیت نمبر ۱۶ تتجافی جنوبھم عن المضاجع ..... کی مناسبت سے)۔

سورۂ سجدہ کی تلاوت کی فضیلت:

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام سے یوں مذکور ہے:

"من قرأ الم تنزیل وتبارک الذی بیدہ الملک، فکانما احیا لیلۃ القدر"

"جو شخص سورۂ الم تنزیل اور "تبارک الذی" کو پڑھے تو گویا اس نے شب قدر جاگ کر گزاری"[1]

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر بن محمد صادق سے اس طرح نقل ہوا ہے:

"من قرأ سورۃ السجدۃ فی کل لیلۃ جمعہ اعطاہ اللہ کتابہ بیمینہ

[1] مجمع البیان جلد ۸ ص ۳۲۴۔

ولم یحاسبہ بما کان منہ۔ وکان من رفقاء محمد واھل بیتہ"

"جو شخص سورہ سجدہ ہر شب جمعہ پڑھے خدا اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا اور اس کے گزشتہ گناہوں کو بخشش دے گا اور محمد و اہل بیت محمد علیہم السلام کے دوستوں میں ہو گا۔"[1]

چونکہ اس سُورہ میں مبدء و معاد اور قیامت کے دن مجرمین کے عذاب و سزا اور ہوشیار و بیدار کرنے والے دروس مومنین اور کافرین سے متعلق وسیع اور تفصیلی مباحث آئی ہیں، یقیناً اس کی تلاوت انسان کی اس حد تک اصلاح کر سکتی ہیں کہ ان تمام فضائل اور اعزازات کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اور اس کا بیدار کرنے والا اگر شب قدر کی بیداری کے مانند ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اصحاب یمین کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے اور پیغمبر اور ان کی آل کی دوستی اور رفاقت کے اعزاز وافتخار کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن تلاوت ایسی جو سوچ و بچار کا سرچشمہ ہو اور سوچ و بچار ایسی جو نیت، ارادے اور تحریک کا منبع ہو۔

سورہ سجدہ کے مندرجات:

یہ سورہ چونکہ "مکی" سورتوں میں سے ہے۔ لہٰذا دوسری مکی سورتوں کی طرح اپنے اصلی خطوط یعنی "مبدء و معاد" اور "بشارت و انذار" کے مباحث پر مشتمل ہے اور بطور مجموعی اس میں چند مباحث توجہ طلب ہیں:

۱۔ سب سے پہلے عظمتِ قرآن کے بارے میں گفتگو ہے اور اس کا پروردگار عالمین کی طرف سے نازل ہونے اور دشمنی کے الزامات کی نفی ہے۔

۲۔ اس کے بعد آسمان و زمین میں خدا کی نشانیوں اور اس کائنات کے چلانے کے سلسلہ میں بحث ہے۔

۳۔ ایک اور بحث انسان کی "مٹی" اور "نطفہ کے پانی" اور "خدا کی رُوح" سے خلقت اور علم و دانش کو حاصل کرنے کے ذرائع یعنی آنکھ، کان اور عقل کا خدا کی طرف سے عطیہ ہونا ہے۔

۴۔ اس کے بعد قیامت اور اس کے پہلے کے حوادث یعنی موت اور اس کے بعد یعنی سوال و جواب حساب کے بارے میں گفتگو ہے۔

۵۔ مؤثر اور ہلا دینے والی بشارت و انذار کی مباحث ہیں۔ جن میں مومنین کو جنت الماوی کی نوید دیتا ہے اور فاسقین کو جہنم کی آگ سے ڈراتا ہے۔

۶۔ اسی مناسبت سے بنی اسرائیل کی تاریخ اور حضرت موسٰی علیہ السلام کی سرگزشت اور اسی امت کی کامیابیوں کی طرف مختصر سا اشارہ بھی ہے۔

۷۔ دوبارہ بشارت و انذار کی بحث کے پیشِ نظر گزشتہ اُمتوں میں سے ایک گروہ کے حالات اور اس کے

[1] مجمع البیان جلد ۸ نمبر ۸ ص ۳۲۵۔

دردناک انجام کی طرف اشارہ ہے۔

۱۹ اور۲۱۔ دوبارہ مسئلہ توحید اور عظمت خدا کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور "ضدی و ہٹ دھرم دشمنوں" کو متنبہ کرنے کے بعد سورت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

تو اس طرح سے اس سورہ کا اصل مقصد مبدء و معاد پر ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کرنا اور اس کے ذریعے تقویٰ کی طرف تحرک کی ایک قوی موج ایجاد کرنا ہے۔ جس سے لوگ طغیان اور سرکشی سے باز آجائیں اور اپنے بلند انسانی مرتبہ کی قدر و قیمت کو پہچانیں۔ جس کی اسلام کی ابتدائی تحریک کے ایام میں سرزمین مکہ کے ماحول کے لیے ازحد ضرورت تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓمّٓ ۝

۲۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۳۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

۴۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۵۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ الم۔

۲۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے

اور اس میں شک و تردید نہیں ہے۔

۳۔ لیکن وہ کہتے ہیں (محمدؐ نے) خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ لیکن (انھیں جاننا چاہیئے) کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق بات ہے، تاکہ تم ایسے گروہ کو ڈراؤ جس کی طرف تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے شاید (وہ پند و نصیحت حاصل کرکے) ہدایت پا جائیں۔

۴۔ خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا ہے، پھر عرش (قدرت) پر قرار پایا۔ تمہارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے، کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

۵۔ اس جہان کے امور کی آسمان سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے، پھر اس دن جس کی مقدار ہزار سال ہے، ان سالوں کے (حساب سے) جو تم شمار کرتے ہو، اس کی طرف لوٹ جائے گا (اور دنیا ختم ہو جائے گی)۔

تفسیر

عظمت قرآن اور مبدء و معاد:

اس سورہ میں ہم "حروف مقطعات" (الف۔ لام۔ میم) سے ایک بار پھر رُوبرو ہو رہے ہیں اور یہ پندرھویں دفعہ ہے کہ ہم قرآنی سورتوں کے آغاز میں اس قسم کے حروف دیکھ رہے ہیں۔

سورہ بقرہ کے آغاز (اس تفسیر کی جلد اوّل) اور آل عمران (جلد دوم) اور اعراف (جلد ششم) میں ہم ان حروف کی مختلف تفسیروں سے تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ جو بحث قرآن کی اہمیت کے سلسلہ میں ان حروف کے فوراً بعد آئی

ہے، ایک بار پھر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ "الٓمٓ" قرآن کی عظمت اور پروردگار عالم کی عظیم قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس قسم کی عظیم اور مطالب سے لبریز کتاب جو حضرت محمد مصطفےٰؐ کا جاودانی معجزہ ہے "الف بائی" ایسے سادہ حروف سے وجود میں آئی ہے اور جن پر ہر ایک کی دسترس ہے۔

فرماتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں (تنزیل الکتاب لا ریب فیہ من رب العالمین)۔[1]

واقع میں یہ آیت دو سوالوں کا جواب ہے۔ گویا پہلے اس آسمانی کتاب کے مضامین اور مندرجات کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو جواب میں کہتا ہے۔ اس کے مندرجات اور مضامین حق ہیں اور اس میں کم ترین شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس کے وجود میں لانے والے کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو جواب میں کہتا ہے۔ یہ کتاب "رب العالمین" کی طرف سے ہے۔

یہ تفسیر بھی محتمل ہے کہ "من رب العالمین" کا جملہ "لا ریب فیہ" کے لیے دلیل ہو گویا کوئی سوال کرتا ہے کہ کس بناء پر یہ کتاب حق ہے۔ تو کہتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ عالمین کے اس پروردگار کی طرف سے ہے، جس کے وجود سے حق اور حقیقت جلوہ گر ہوتے ہیں۔

ضمناً خدا کے تمام اوصاف میں سے "رب العالمین" کی صفت پر دارو مدار اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب عجائبات عالم کا مجموعہ اور عالم وجود کے حقائق کا نچوڑ ہے، کیونکہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ قرآن نہیں چاہتا کہ یہاں صرف دعوے پر قناعت کرے۔ بلکہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ "عیاں راچہ بیان" کے مصداق خود اپنی کتاب کے مضامین ہی اس کی حقانیت اور صداقت کے گواہ ہیں۔

پھر اس تہمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جو بار بار مشرکین اور بے ایمان منافقین اس عظیم آسمانی کتاب پر باندھتے تھے۔ "وہ کہتے ہیں محمدؐ نے خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ حالانکہ یہ پروردگار عالمین کی طرف سے نہیں ہے" (ام یقولون افتراہ)۔[2]

ان کے بے دلیل دعوے کے جواب میں کہتا ہے "وہ افترا نہیں ہے، بلکہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق

---

[1] "تنزیل الکتاب" مبتدائے محذوف "ھذا" کی خبر ہے اور "لا ریب فیہ" اس کی صفت اوّل اور "من رب العالمین" دوسری صفت ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ہو سکتا ہے تینوں یکے بعد دیگرے خبریں ہوں۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔ بہر حال تنزیل مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں آیا ہے اور کتاب کی طرف اس کی اضافت صفت کی موصوف کی طرف اضافت کے قسموں سے ہے یہ احتمال بھی ہے کہ شاید مصدر اپنے اصلی معنی میں آکر مبالغہ کا معنی بتا رہا ہو۔

[2] "ام" یہاں "بل" کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ تقدیری طور پر یہ جملہ یوں ہو سکتا ہے (ایعترفون بہ ام یقولون افتراہ) (تفسیر فخر رازی و ابو الفتوح) لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

بات ہے: "بل ھوالحق من ربك"۔

اور اس کی حقانیت کی دلیل خود اس میں آشکار و نمایاں ہے۔

پھر اس کے نزول کے ہدف اور مقصد کو بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے "ہدف اور مقصد یہ تھا کہ ایک گروہ کو تو انذار کرے اور ڈرائے کہ جنھیں تجھ سے پہلے انذار کرنے والا نہیں آیا ہے، شاید وہ پند و نصیحت اور ہدایت حاصل کریں" (لتنذر قوما ما اتاھم من نذیر من قبلك لعلھم یھتدون)۔

اگرچہ پیغمبر اسلام کی دعوت "بشارت" یعنی خوشخبری بھی ہے اور "انذار" بھی یعنی ڈرانا بھی۔ اور پیغمبر "بشیر" سے زیادہ "نذیر" ہے لیکن گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کے مقابلہ میں "انذار" پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

"ھوالحق من ربك" کا جُملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی حقانیت کی دلیل خود اسی میں مشہود ہے اور "لعلھم یھتدون" کا جُملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن ہدایت کے لیے صرف سرزمین ہموار کرتا ہے لیکن مصمم ارادہ تو بہرحال خود انسان ہی کرتا ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ اس قوم سے کونسی قوم مراد ہے جن کی طرف پیغمبر اسلام سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟

۲۔ علاوہ ازیں کیا خود قرآن نہیں کہتا:

"وان من امة الا خلا فیھا نذیر"

"کوئی امت ایسی نہیں تھی کہ جس میں ڈرانے والا نہ آیا ہو" (فاطر ـ ۲۴)

پہلے سوال کے جواب میں مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مراد قبیلہ قریش ہے، جس میں پیغمبر اسلام سے پہلے کوئی انذار کرنے اور ڈرانے والا نہیں تھا۔

لیکن دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد دورِ فترت ہے (یعنی حضرت عیسٰی کے قیام اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا درمیانی زمانہ)۔

لیکن ان دونوں جوابوں میں سے کوئی بھی جواب صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ سوال کرنے والے کے نظریہ کے مطابق زمین کبھی بھی حجتِ خدا سے خالی نہیں رہتی اور ہر دور میں پیغمبر یا وصی پیغمبر اتمام حجت کے لیے انسانوں کے درمیان موجود رہتے ہیں۔

اس بناء پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نذیر" سے مراد کوئی عظیم پیغمبر ہو جو اپنی دعوت کو آشکارا اور معجزات کے ساتھ اور وسیع و عریض ماحول میں ظاہر کرے اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کا انذار کرنے والا جزیرہ نمائے عرب اور قبائل "مکہ" کے درمیان ظاہر نہیں ہوا۔

اور دوسرے سوال کے جواب میں یوں کہنا چاہیئے "وان من امة الا خلا فیھا نذیر" کے جُملہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر اُمت میں انذار کرنے والا موجود رہا ہے۔ لیکن یہ کہ وہ ہر جگہ ذاتی و شخصی طور پر بھی موجود ہو، یہ ضروری نہیں ہے۔ یہی بات کہ خدائے عظیم کے پیغمبروں کی دعوت کی صدا ان کے اوصیاء کے ذریعے دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچ جائے کافی ہے۔

یہ بات ٹھیک اس طرح ہے کہ ہم کہیں کہ ہر اُمت میں اولو العزم پیغمبر بھی تھے اور آسمانی کتاب بھی۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تاریخی طور پر اس پیغمبر کی صدا اور اس کی آسمانی کتاب اس کے نمائندوں اور اوصیاء کے ذریعہ سے اس ساری اُمت تک پہنچی ہے۔

عظمت قرآن اور رسالت پیغمبر اکرمؐ کے بعد اسلام کے ایک اور اہم ترین بنیادی عقیدہ یعنی توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کو بیان کرتے ہُوئے اس طرح کہتا ہے "خدا وہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین اور ہر اس چیز کو چھ دنوں میں پیدا کیا جو ان دونوں کے درمیان ہے" (الله الذی خلق السماوات والارض وما بینھما فی ستة ایام)۔[1]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں چھ دنوں سے مراد "چھ دور" ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ "دن" کے معانی میں سے ایک معنی روز مرہ کے استعمال میں "دور" بھی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں، ایک دن تھا کہ استبدادی ٹولہ حکومت کرتا تھا اور آج "شورائی نظام" ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں، استبدادی ٹولے ہزار ہا سال حکومت کرتے رہے ہیں لیکن اسے "ایک دن" سے تعبیر کرتے ہیں:

اور دوسری طرف یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ آسمان و زمین پر مختلف دور گزرے ہیں:

ایک دن نظامِ شمسی کے تمام کُرّات ایک پگھلے ہُوئے تودے کی صورت میں تھے۔

تو دوسرے دن سیارے سُورج سے الگ ہو گئے اور اس کے اطراف گردش کرنے لگے۔

ایک دن زمین آگ کا ایک ٹکڑا تھی۔

دوسرے دن ٹھنڈی اور سرد ہو کر نباتات اور حیوانات کی زندگی کے قابل بن گئی، پھر زندہ موجودات مختلف مراحل میں وجود میں آئے۔

(ہم اس معنی کی تشریح اور اسی طرح چھ ادوار کی تفصیل چوتھی جلد کے صفحہ ۱۳۰ پر سُورۂ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں)۔

واضح ہے کہ پروردگار کی بے انتہاء قدرت اس سارے جہان کی ایجاد کے لیے ایک مختصر سے لمحہ بلکہ اس سے بھی کم تر کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ تدریجی نظام عظمتِ خدا اور اس کے علم اور تمام مراحل میں اس کی تدبیر کو بہتر طریقہ سے بیان کر سکتا ہے۔

مثلاً اگر "جنین" ایک ہی لمحہ میں اپنے تکامل و ارتقاء کے تمام ادوار کو طے کر کے متولد ہو جاتا ہے تو اس کے عجائبات انسان کی نظر سے دور رہ جاتے ہیں۔ لیکن جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ ان نو ماہ کے دوران میں ہر دن اور ہر ہفتہ نئے نئے

---

[1] لفظ اللہ اس جُملہ میں مبتداء ہے اور "الذی" اس کی خبر ہے، اس جُملہ کی ترکیب میں اور احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ "اللہ" خبر ہے مبتداء محذوف کی۔ یا یہ کہ اللہ مبتداء ہے اور اس کی خبر "مالکم من دونه من ولی" ہے لیکن یہ دونوں احتمالات چنداں مناسب نظر نہیں آتے۔

عجائب وغرائب شکل اور حالات اپنے اندر لیتا ہے اور پیچھے بعد دیگرے عجیب وغریب اور مختلف مراحل سے گزرتا ہے تو آفریدگار کی عظمت سے ہم بہتر طور پر آشنا ہوتے ہیں۔

مسئلہ افرینش وخلقت کے بعد عالم ہستی پر "حاکمیت خدا" کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"پھر خدا عرش پر مستقر ہوا اور سارے عالم ہستی پر حکومت کی": (ثُمَّ استوٰى على العرش)۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لفظ "عرش" اصل میں بلند پایہ تختوں کے معنی میں ہے اور عام طور پر کنایہ ہوتا ہے۔ قدرت اور طاقت سے جیسا کہ روزمرہ تعبیرات میں ہم کہتے ہیں۔ فلاں شخص کے تخت کے پائے گر گئے یعنی اس کی قدرت اور طاقت ختم ہوگئی ہے۔

اس بناء پر خدا کا عرش پر قرار پانا اس کے جسمانی معنی میں نہیں ہے کہ خدا بادشاہوں کی طرح کوئی تخت رکھتا ہو اور اس کے اوپر بیٹھا ہو۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ جہان ہستی کا خالق بھی ہے اور سارے عالم پر اس کی حکومت بھی ہے۔ [1]

اور آیت کے آخر میں "توحید" "ولایت" و "شفاعت" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرکے مراحل توحید کو مکمل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس کے علاوہ تمہارا کوئی ولی وشفیع نہیں ہے": (ما لكم من دونه من ولي ولا شفيع)۔

اس واضح دلیل کے باوجود کہ جہان کی خالقیت اس کی حاکمیت کی دلیل ہے اور حاکمیت ولی، شفیع اور معبود کی توحید پر دلالت کرتی ہے، تو پھر تم کیوں بے راہ روی اختیار کرتے ہو اور بتوں کے دامن کو پکڑتے ہو۔ تم سوچتے سمجھتے کیوں نہیں: (افلا تتذكرون)۔

حقیقت میں توحید کے تین مراحل جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئے ہیں، ہر ایک مرحلہ ایک دوسرے کی دلیل شمار ہوتا ہے۔ توحید خالقیت، توحید حاکمیت کی دلیل ہے اور توحید حاکمیت ولی وشفیع ومعبود کی وحدانیت پر دلیل ہے۔

یہاں پر بعض مفسرین کے لیے ایک سوال پیش ہوتا ہے، جس کا جواب چنداں مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے اور وہ یہ کہ آیت کا آخری جملہ کہتا ہے کہ خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا ولی وشفیع صرف خدا ہے اور بس! تو کیا ممکن ہے کہ کوئی اپنے پاس کسی کی شفاعت کرے؟

(۱) اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ تمام شفاعت کرنے والوں کو اس کی اجازت سے شفاعت کرنا چاہیے۔ "من ذا الذي يشفع عنده الا باذنه" (بقرہ۔ ۲۵۵) اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ شفاعت اگرچہ ہوتی انبیاء اور اولیاء الٰہی کی طرف سے ہے لیکن لوٹتی ذات پاک کی طرف ہے۔ شفاعت چاہے گناہوں کی بخشش کے لیے ہو یا نعماتِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے۔

اس بات کی شاہد وگواہ وہ آیت ہے کہ جو ٹھیک اسی آیت کے مضمون میں سورۂ یونس کی ابتداء میں آئی ہے۔

---

[1] اس بات کی مزید وضاحت تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۱۳۰ (سورۂ اعراف آیہ ۵۴) کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

اور ہم وہاں پڑھتے ہیں:

"يدبر الامر ما من شفيع الا من بعد اذنه" (یونس۔ ۳)

"کوئی شفاعت کرنے والا اس وقت تک شفیع کہلائے گا۔ جب اس ذات کی اجازت ہوگی"۔

(۲) اس امر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ہم پروردگار کی بارگاہ میں توسل کے وقت اس کی صفات سے متوسل ہوتے ہیں اس کے رحمان، رحیم، غفار اور غفور ہونے اور اس کے فضل وکرم سے مدد چاہتے ہیں، گویا اس کے پاس خود ایسے ہی شفیع قرار دیتے ہیں۔ ہر چند کہ اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں۔ پھر بھی ان صفات کو اپنے اور اس کی پاک ذات کے درمیان واسطہ شمار کرتے ہیں۔

یہی چیز دعائے کمیل میں حضرت علیؑ کی پُر معنی عبارت میں آئی ہے:

"واستشفع بك الى نفسك"

"میں تیرے ذریعہ تجھ سے شفاعت کا طلب گار ہوں"۔

(۳) "شفیع" سے مراد یہاں ناصر اور یار و یاور ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یار و یاور اور ناصر صرف خدا ہے، اور بعض لوگوں نے یہاں شفاعت کو آفرینش وخلقت اور تکمیل نفوس کے معنی میں لیا ہے تو یہ درحقیقت اسی معنی کی طرف لوٹتا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں پہلے توحید پروردگار کی طرف اور پھر مسئلہ معاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو گزشتہ آیات میں توحید کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں (توحید خالقیت، توحید مالکیت، اور توحید عبودیت)۔ یہاں توحید ربوبیت کے ذکر سے وہ سلسلۂ گفتگو مکمل ہو جاتا ہے۔ یعنی جہانِ ہستی کا نظم ونسق صرف خدا ہی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

فرماتا ہے: "خدا اس جہان کے امور کو اپنے قرب کے مقام سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے": (يدبر الامر من السماء الى الارض)۔

دوسرے لفظوں میں خدا آسمان سے لے کر زمین تک تمام کائنات کو اپنے حیطۂ تدبیر اور نظم ونسق میں لیے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ اس جہان کا کوئی مدبر نہیں ہے۔ [1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے "پھر تدبیر امور کے لیے اس دن کہ جس کی مقدار ہزار سال ہے ان سالوں میں سے جنھیں تم شمار کرتے ہو، اس کی طرف لوٹے گا": (ثم يعرج اليه في يوم كان مقداره الف سنة مما تعدون)۔

اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مفسرین نے اوپر والی آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال پیش کیے ہیں۔ اور کئی احتمال

---

[1] پہلی تعبیر کے مطابق "سماء" مقام قرب خدا کے معنی میں ہے اور دوسری تعبیر کے مطابق "سماء" اسی آسمان کے معنی میں ہے۔ (غور کیجئے گا)

پیش کیے ہیں:

۱۔ بعض نے اسے اسی دنیا میں تدبیر عالم کے "قوس نزولی" اور "قوس صعودی" کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔
۲۔ بعض خدائی فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو آسمان وزمین کے درمیانی فاصلہ کو پانچ سو سال کی مدت میں طے کرتے اور اسی مدت میں واپس بھی آجاتے ہیں اور اس جہان کی تدبیر میں حکم خدا سے مشغول ہیں۔
۳۔ بعض اس عالم میں خدائی تدبیر کے دور کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ تدبیر کے مختلف ادوار ہیں اور پھر ایک دور کی مدت ایک ہزار سال ہے اور خدا ہر ہزار سال میں آسمان وزمین کے تدبیر امر کا اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور اس ہزار سالہ دور کے ختم ہونے پر دوسرے دور کا آغاز ہوجاتا ہے۔

یہ تفسیریں علاوہ اس کے کہ نا تمام اور مبہم مطالب کو پیش کرتی ہیں، کوئی قرینہ اور مخصوص شاہد بھی خود اس آیت یا دوسری آیات سے بھی پیش نہیں کرتیں۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرآن کی دوسری آیات کے قرینہ نیز ان روایات کی بنا پر جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں، اس آیت سے مراد کوئی اور چیز ہے اور یہ کہ خدا نے اس جہان کو خلق کیا ہے اور آسمان وزمین کو مخصوص تدبیر کے ساتھ نظم عطا کیا ہے اور انسانوں اور دوسرے زندہ موجودات کو لباس حیات پہنایا ہے۔ لیکن اس کائنات کے خاتمہ پر سب کچھ ختم کردے گا۔ سورج تاریک اور ستارے بے نور ہو جائیں گے اور قرآن کے بقول آسمانوں کو کاغذ کی طرح لپیٹ دے گا، یہاں تک کہ مذکورہ چیزیں اس جہان کے پھیلنے سے پہلے کی حالت میں آجائیں گی:

"یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب کما بدأنا اول خلق نعیدہ"

"وہ دن کہ جب آسمان کو طومار کی طرح ہم لپیٹ دیں گے، پھر جس طرح ہم نے خلقت کا آغاز کیا تھا اسے واپس پلٹا دیں گے"۔[1]

اور اس جہان کے لپیٹے جانے کے بعد ایک نئے نقشے اور زیادہ وسیع جہان کا اختراع ہوگا۔ یعنی اس دنیا کے اختتام پر ایک دوسرے جہان کا آغاز ہوگا۔

یہ معنی قرآن کی دوسری آیات میں بھی آیا ہے منجملہ ان کے سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۵۶ میں ہم پڑھتے ہیں:

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

"ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف سے ہیں اور اُسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے"۔

اور سورۂ روم کی آیہ ۲۷ میں اس طرح آیا ہے:

"وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ"

"وہ وہی ہے جو خلقت کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے واپس پلٹا دیتا ہے اور یہ بات اس کے لیے نہایت

[1] سورۂ انبیاء آیہ ۱۰۴۔

آسان ہے"۔

اور سورۂ یونس کی آیہ ۳۴ میں ہم پڑھتے ہیں:

"قل اللہ یبدؤا الخلق ثم یعیدہ فانی تؤفکون"

"کہہ دو خدا آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو واپس لوٹاتا ہے، پھر تم کیوں حق سے روگرداں ہوتے ہو"۔

ان تعبیرات اور اس طرح کی دوسری تعبیرات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو کہتی ہیں کہ تمام امور آخرکار خدا کی طرف لوٹ جائیں گے:

"والیہ یرجع الامر کلہ" (سورۂ ہود آیۃ ۱۲۳)

واضح ہوجاتا ہے کہ زیر بحث آیت میں کائنات کے آغاز وانجام اور روز قیامت کے بپا ہونے کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جسے کبھی "قوس نزولی" اور "صعودی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ "خدا اس جہان کے امر کی تدبیر آسمان سے زمین تک کرتا ہے۔ (آسمان سے ابتدا اور زمین پر انتہا ہوتی ہے) پھر یہ سب قیامت کے دن اس کی طرف پلٹ جائیں گے"۔

"تفسیر علی بن ابراہیم" میں اسی آیت کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں کہ تدبیر امور سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کی تدبیر کرتا ہے اور اس طرح امر ونہی جو شریعت میں بیان ہوئے ہیں اور تمام بندوں کے اعمال یہ تمام چیزیں قیامت کے دن واضح ہوں گی اور اس دن کی طوالت اس دن کے سالوں کے حساب سے ہزار سال ہوگی۔[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ "سورۂ معارج" کی آیت ۴ میں روز قیامت کے طول کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

"تعرج الملائکۃ والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ"

"فرشتے اور روح اس کی طرف عروج کریں گے، ایسے دن میں کہ جس کی مدت پچاس ہزار سال ہے"۔

تو کس طرح سے زیر بحث آیت کو جو اس کی مدت صرف ہزار سال معین کرتی ہے اور سورۂ معارج کی آیت کو آپس میں جمع کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب اس حدیث میں موجود ہے جو "امالی شیخ طوسی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"ان فی القیامۃ خمسین موقفا، کل موقف مثل الف سنۃ مما تعدون، ثم تلا ھذہ الآیۃ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ"

"قیامت میں پچاس موقف (اعمال کی دیکھ بھال اور حساب کے لیے محل توقف) ہیں کہ جن میں سے ہر موقف ہزار سال کی مقدار ہے، ان سالوں میں جنھیں تم شمار کرتے ہو، پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی، اس دن میں کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے"۔

[1] "تفسیر نور الثقلین" جلد ۴ ص ۲۲۰ اور "تفسیر صافی" ذیل آیت زیر بحث۔

البتہ ان تعبیروں کا اس مطلب سے کوئی تضاد نہیں ہوگا، جب ہزار سال اور پچاس ہزار سال کا عدد بیان گنتی کی صورت میں ہو، بلکہ ہر ایک میں کثرت اور زیادتی بیان کرنا مقصود ہو۔ یعنی قیامت میں پچاس موقف ہیں کہ جن میں سے ہر ایک پر انسان کو بہت زیادہ رُکنا پڑے گا۔

چند ایک نکات

"یُدبّر الامر" کی آیت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہمارے زمانے کے کچھ خود ساختہ مسلک کے پیروکاروں نے اپنے مسلک کی توجیہ کے لیے اوپر والی آیت کو دستاویز قرار دیتے ہُوئے عوام النّاس کو فریب دینے اور مغالطہ میں ڈالنے کے لیے اس آیت کو اپنے مقصد پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان کے اکثر مبلغین سے جب انسان رُو برو ہوتا ہے۔ منجملہ ان دلائل کے کہ جس کا وہ فوراً ڈوبتے کی طرح تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں، یہی آیت ہے (یدبر الامر من السماء الی الارض....) وہ کہتے ہیں۔

"امر" سے مراد اس آیت میں "دین اور مذہب" ہے اور "تدبیر" دین کے بھیجنے کے معنی میں ہے اور "عروج" دین کو اٹھانے اور نسخ کرنے کے معنی میں ہے۔ اور اس حساب سے کوئی مذہب ایک ہزار سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ہزار سال کے بعد اسے اپنی جگہ دوسرے مذہب کو دے دینی چاہیئے۔ اسی بناء پر وہ کہتے ہیں "ہم قرآن کو قبول کرتے ہیں" لیکن اسی قرآن کے مطابق ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد دوسرا مذہب آئے گا!

اب ہم چاہتے ہیں کہ ایک غیر جانب دار فرد کے عنوان سے مذکورہ آیت کا صحیح طریقے پر تجزیہ و تحلیل کریں اور دیکھیں کہ جس چیز کا یہ لوگ دعوےٰ کرتے ہیں، آیا آیت کا بھی اس چیز سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ اس بات سے قطع نظر کہ یہ معنی آیت کے مفہوم سے اس قدر دور ہے کہ خالی الذہن پڑھنے والے کی فکر و ذہن میں آ بھی نہیں سکتا۔

خوب غور و خوض کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جس چیز پر وہ آیت کو مطابقت دینا چاہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ آیت کے مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں، بلکہ بہت سی جہات سے واضح اشکالات سے بھی دوچار ہے۔

① لفظ "امر" کو دین و مذہب کے معنی میں لینا نہ صرف یہ کہ اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ قرآن کی دوسری آیات بھی اس کی نفی کرتی ہیں۔ کیونکہ دوسری آیات میں "امر" فرمان، آفرینش و خلقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے،

"انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون" (سورۂ یٰس آیت ۸۲)

"اس کا امر تو بس یہ ہے کہ جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرے تو کہتا ہے ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔"

اس آیت میں اور "سورۂ قمر" کی آیت ۵۰ اور "سورۂ مومنون" کی آیت ۲۷، "سورۂ اعراف" کی آیت ۵۴، "سورہ ابراہیم" کی آیت ۳۲ اور "سورہ نحل" آیت ۱۲، "سورہ روم" آیت ۲۵، اور "سورۂ جاثیہ" آیت ۱۲ اور بہت سی دوسری آیات میں "امر" امر تکوینی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ کہ دین و مذہب کی تشریع کے معنی میں۔

بنیادی طور پر جہاں آسمان و زمین اور آفرینش و خلقت وغیرہ کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، امر اس معنی میں آتا ہے۔ (غور کیجیے گا)

② لفظ "تدبیر" بھی خلقت و آفرینش اور کائنات کی وضع و کیفیت کو سنوارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ مذہب نازل کرنے کے معنی میں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی دوسری آیات میں (آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) دین و مذہب کے بارے میں بالکل لفظ تدبیر استعمال نہیں ہوا، بلکہ لفظ "تشریع" یا "تنزیل" یا "انزال" استعمال ہوا ہے؛

"شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحًا" (شوریٰ-۱۳)

"شریعت کا آغاز اس چیز سے ہوا، جس کی نوح کو وصیت کی تھی۔"

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون"

"جو شخص خدا کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہ کافر ہے" (مائدہ - ۴۴)

"نزّل علیک الکتاب بالحق مصدقًا لما بین یدیہ" (آلِ عمران ۳)

"برحق قرآن کو تجھ پر نازل کیا ہے، جو پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے"۔

③ محل بحث آیت سے پہلے اور بعد کی آیت عالم کی خلقت و آفرینش سے متعلق ہے، نہ کہ تشریع ادیان سے۔ کیونکہ قبل والی آیت میں چھ دن (دوسرے لفظوں میں چھ دور) میں آسمان و زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو تھی اور بعد والی آیات میں خلقت انسان کے متعلق گفتگو تھی۔

کہے بغیر واضح ہے کہ آیات کی مناسبت تقاضا کرتی ہے کہ یہ آیت بھی جو آیاتِ "خلقت" کے درمیان واقع ہوئی ہے مسئلہ خلقت اور آفرینش کے انتظامی امور سے مربوط ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب سینکڑوں سال پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں گوناگوں احتمالات کے باوجود کسی نے یہ احتمال نہیں دیا کہ یہ آیت تشریع ادیان سے مربوط ہے۔ مثلاً تفسیر "مجمع البیان" میں جو مشہور ترین اسلامی تفسیر ہے اور جس کے مؤلف کا تعلق سنہ چھ سو ہجری سے ہے اوپر والی آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے باوجود کسی بھی مسلم دانشور کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ اس آیت کا تعلق تشریع ادیان سے ہے۔

④ لفظ "عروج" "صعود کرنے اور اوپر جانے" کے معنی میں ہے، نہ کہ نسخ ادیان اور ان کے زائل ہونے کے معنی میں، اور قرآن میں کسی جگہ بھی "عروج" نسخ کے معنی میں نظر نہیں آیا یہ لفظ قرآن کی پانچ آیات میں ذکر ہوا ہے، لیکن کہیں بھی اس کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ادیان کے بارے میں وہی لفظ "نسخ" یا "تبدیل" وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر ادیان اور کتب آسمانی کوئی ایسی چیز نہیں جو مثلاً ارواح بشر کی طرح اختتام زندگی کے بعد فرشتوں کے ساتھ آسمان کی طرف پرواز کر جائیں، بلکہ نسخ شدہ دین اسی زمین پر موجود ہیں، ان کے صرف چند ایک مسائل منسوخ ہوئے ہیں، جبکہ ان کے اصول اپنی قوت کے ساتھ باقی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ "عروج" باوجودیکہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی نسخ ادیان کے معنی میں استعمال نہیں ہوا،

اصولی طور پر نسخ ادیان کے مفہوم کے ساتھ سازگار بھی نہیں ہے، کیونکہ منسوخ ادیان آسمان کی طرف عروج نہیں کرتے۔

⑤ ان سب کے علاوہ یہ معنی واقعیت عینی کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتا۔ گذشتہ ادیان کا ایک دوسرے سے فاصلہ کہیں پر بھی ایک ہزار سال نہیں تھا۔

مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے درمیان کا فاصلہ ۱۵۰۰ سال سے زیادہ تھا اور حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا فاصلہ ۶۰۰ سو سال سے کم تھا۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں، ان لوگوں کے قول کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی فاصلہ بھی ہزار سال کا نہیں بلکہ زیادہ بھی ہے۔

ایک اولو العزم نبی اور مخصوص شریعت کے بانی حضرت "نوحؑ" کا اولو العزم شریعت کے دوسرے بانی اور بت شکن ہیرو حضرت ابراہیم کے درمیان ۱۴۰۰ سال سے زیادہ فاصلہ ہے اور اسی طرح حضرت "ابراہیمؑ" اور حضرت "موسیٰؑ" کے درمیان فاصلہ ۵۰۰ سال سے کم لکھا ہے۔

اس موضوع سے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ نمونہ کے طور پر بھی گذشتہ مذاہب و ادیان کا ایک دوسرے کے ساتھ کا فاصلہ ایک ہزار سال نہیں تھا۔ "تو خود حدیث مفصل بخوان ازیں مجمل"

⑥ ان سب باتوں سے قطع نظر سید علی محمد باب کے جس دعوے کے لیے یہ سب لوگ ناروا توجیہات کے متحمل ہوئے ہیں، اس حساب سے بالکل سازگار نہیں ہے، کیونکہ خود انہیں کے اعتراف کے مطابق اس کے دعوے کی ابتداء ۱۲۶۰ ہجری قمری میں تھی۔ اور اس بات کے پیشِ نظر کہ پیغمبر اسلام کی دعوت کی ابتداء ہجرت سے ۱۳ سال قبل تھی تو ان دونوں کے درمیان فاصلہ ۱۲۷۳ سال بنتا ہے، یعنی ہزار سال سے ۲۷۳ سال زائد بنتے ہیں۔ اب وہ خود ہی بتائیں کہ ہم کس نقشے کے تحت ان ۲۷۳ سالوں کو ادھر اُدھر کریں ؟ اور کس طرح اتنے بڑے عدد کو نظر انداز کر دیں ؟

⑦ اور فرض کیجئے کہ ہم ان چھ اعتراضات کو بھی ایک طرف کیے دیتے ہیں اور اس قدر واضح اور روشن تجربات کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور صرف عقل و خرد کو فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں اور فرض کرتے ہیں کہ قرآن کے بجائے چاہتے ہیں کہ نبوت کے نئے دعوے داروں کے سامنے آنے والے لوگوں کی ذمہ داری کو واضح کریں اور کہیں کہ "ہزار سال گزرنے کے بعد نئے پیغمبر کے انتظار میں رہو"! تو کیا اس کا یہی راستہ تھا، جیسا مذکورہ آیت میں ذکر ہوا ہے، مطلب کو بیان کریں اور بارہ تیرہ صدیوں تک کوئی عالم اور غیر عالم اس آیت کے معنی سے ذرہ برابر بھی مطلع نہ ہو سکے اور ۱۲۷۳ سال گزرنے کے بعد صرف ایک گروہ "کشفِ جدید" کے عنوان سے جو صرف اور صرف اس کے نزدیک ہی قابل قبول ہے، اس سے پردہ اُٹھائے

کیا زیادہ عقل مندی کی بات نہیں تھی کہ اس جملہ کی جگہ پر یوں کہا جاتا۔ "تمھیں میں بشارت دیتا ہوں کہ ایک ہزار سال کے بعد ایک پیغمبر اس نام کا ظہور کرے گا"۔

جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے پیغمبر اسلام کے متعلق کہا:

" ومبشرا برسول یأتی من بعد اسمه احمد "

(سورۂ صف آیہ ۶)

بہر حال شاید یہ اس حد تک جتنا ہم نے بحث کی ہے، بحث کا محتاج نہ ہوتا، لیکن مسلمانوں کی نوجوان نسل کو عالمی استعمار کے ہتھکنڈوں اور اسلام کے مورچوں کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والے ساختہ مسالک کی چالوں سے خبردار کرنے کے لیے قدرے تفصیلی گفتگو کی تاکہ وہ ان کی اس منطق کے صرف ایک گوشہ سے باخبر ہو جائیں اور باقی کا وہ خود حساب کرلیں۔

۶۔ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

۷۔ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝

۸۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝

۹۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۔ وہ وہی خدا ہے کہ مخفی و آشکار سے باخبر ہے اور ناقابل شکست اور مہربان ہے۔

۷۔ وہ وہی ہے جس نے جس چیز کو پیدا کیا، اچھا پیدا کیا اور خلقتِ انسان کی ابتدا مٹی سے قرار دی۔

۸۔ پھر اس کی نسل کو ناچیز اور بے قدر و قیمت پانی کے نچوڑ سے خلق کیا۔

۹۔ پھر اس کے بدن کو موزوں بنایا اور اپنی روح میں سے اس میں پھونکا

اور تمھارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے، لیکن تم بہت کم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو۔

تفسیر

خلقت انسان کے حیران کن مراحل:

زیر بحث آیات پہلے تو اشارہ اور تاکید ہیں، ان توحیدی مباحث پر جو پہلے کی آیات میں گزر چکی ہیں جو چار مراحل میں خلاصہ ہوتی ہیں۔ (توحید خالقیت، حاکمیت، ولایت اور ربوبیت) فرماتا ہے: "وہ جیسے کہ ان صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، وہی ہے خدا کہ جو مخفی و آشکار سے باخبر ہے اور ناقابل شکست اور مہربان ہے"۔ (ذالك عالم الغيب والشهادة العزيز الرّحيم)۔

ظاہر ہے جو چاہتا ہے کہ آسمان و زمین کے امور کی تدبیر کرے اور ان پر حاکم اور ولایت، شفاعت اور خلاقیت کے قیام کا ذمہ دار ہو، اسے تمام چیزوں کے پنہاں و آشکار سے آگاہ ہونا چاہیئے، کیونکہ آگاہی اور وسیع علم کے بغیر ان امور میں سے کوئی بھی امکان پذیر نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایسی ذات کو "عزیز" (قدرت مند اور ناقابل شکست) ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان اہم کاموں کو انجام دے سکے۔

لیکن ایسی عزت و قدرت جو سنگدلی سے ملی ہوئی نہ ہو بلکہ رحمت اور لطف و کرم سے جڑواں ہو۔

بعد والی آیت بطور عموم آفرینش کے نظام احسن کی طرف بطور خاص اور خلقت انسان کے آغاز اور اس کے ارتقائی مراحل کی طرف بطور عام اشارہ ہے اور فرماتا ہے "وہ وہی ہے جس نے جس چیز کو پیدا کیا بہت اچھا پیدا کیا"۔ (الّذی احسن کل شیء خلقه)۔

ہر چیز کو جس شے کی ضرورت تھی اس نے دی، دوسرے لفظوں میں خلقت کے عظیم محل کی بنیاد کو "نظام احسن" یعنی ایسے نظم و ضبط پر استوار کیا، جس سے زیادہ کامل کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔

تمام موجودات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی اور ہر ایک کو وہی کچھ عطا فرمایا جو وہ زبان حال سے چاہتا تھا۔

اگر انسان کے وجود پر نگاہ کریں اور اس کے بدن کے مختلف کارخانوں میں سے ہر ایک کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوگا، کہ وہ ساخت، حجم، سالموں کی وضع اور کیفیت ان کی طرز کار بالکل اسی طرح خلق کیے گئے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اعضاء کے درمیان اس طرح مربوط نظام اور ہم آہنگی عطا کی ہے کہ وہ سب بغیر استثناء کے یا تو

ایک دوسرے پر موثر ہوتے ہیں اور یا ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔

اور یہی معنی بطور کلی تمام عالم پر حکم فرما ہے، باوجود یکہ اس کی مخلوقات خصوصاً زندہ موجودات کی دنیا میں تنوع پایا جاتا ہے اور بڑا فرق بھی۔

خلاصہ

دھندہ ای کہ بہ گل نکہت و بہ گل جان داد

بہ ہر کہ آنچہ سزا دید حکمتش آن داد!

وہ جس نے پھول کو خوشبو اور مٹی میں رُوح پھونکی جو جس چیز کے لائق تھا، خالق حکمت نے اسے وہی کچھ دیا، جی ہاں وہی ہے جو پھولوں کو انواع و اقسام کی دل انگیز خوشبوئیں عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو خاک اور مٹی کو رُوح اور جان دیتا ہے اور اس سے ایک آزاد اور باہوش انسان کو پیدا کرتا ہے اور اسی سیاہ مٹی سے کبھی انواع و اقسام کے پھول کبھی انسان اور کبھی دوسرے موجودات کی انواع پیدا کرتا ہے، یہاں تک کہ خود مٹی کو بھی اپنی حد تک جس چیز کا حامل ہونا چاہئے، اسی کی حامل ہے۔

اسی طرح کی گفتگو ہم سورہ طٰہٰ کی آیت ۵۰ میں حضرت موسیٰ و ہارون کے قول سے پڑھتے ہیں:

" ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدیٰ " (سورہ طٰہٰ)

"ہمارا پروردگار تو وہ ہے، جس نے ہر موجود کو جو کچھ اس کی آفرینش کے لیے ضروری تھا عطا کیا اور پھر اس کی تمام مراحل وجود میں رہبری کی"

یہاں پر ایک سوال برائیوں کی خلقت اور" کائنات کے احسن نظام" کے ساتھ سازگاری کی کیفیت کے بارے میں سامنے آتا ہے، جسے ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

اس کے بعد قرآن اس" آفاق" کے مقدمہ اور تمہید کو ذکر کرنے کے بعد" انفس" کی بحث میں وارد ہوتا ہے۔ اور جس طرح آفاقی آیات کی بحث میں توحید کی مختلف اقسام کے بارے میں گفتگو کی تھی، یہاں انسان کے بارے میں چند عظیم نعمتوں کی بات کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے" خدا نے انسان کی خلقت کی ابتدا مٹی سے فرمائی"۔ (وبدأ خلق الانسان من طین)۔

تاکہ اس سے ایک طرف تو اپنی قدرت کی عظمت بھی بیان کرے کہ اس قسم کی برجستہ مخلوق کو اس طرح کے سادہ اور معمولی قیمت کے موجود سے خلق کیا ہے اور اس" دل آویز"،"نقش کو" پانی اور مٹی" سے خلق فرمایا ہے۔

اور اس انسان کو تنبیہ اور خبردار بھی کرے کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟

واضح رہے کہ یہ آیت" آدم" کی خلقت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے، نہ کہ تمام انسانوں کے بارے میں کیونکہ ان کی نسل کو جاری رکھنا بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے اور اس آیت کا ظہور واضح دلیل ہے، انسان کی مستقل خلقت اور (کم از کم نوع انسانی کے بارے میں) تحول انواع کے مفروضہ کی نفی کے لیے یعنی نظریۂ ارتقاء کی نفی کی ہے۔

اگرچہ بعض لوگوں نے اس آیت کی اس طرح تفسیر کرنا چاہی ہے کہ وہ انواع کے ارتقاء کے ساتھ بھی سازگار ہو، کیونکہ انسان کی خلقت پست تر انواع کی طرف لوٹتی ہے اور پھر وہ پانی اور مٹی پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن آیت کی ظاہری تعبیر یہ ہے کہ" آدم" اور" مٹی" کے درمیان دوسری بے شمار انواع زندہ موجودات کا فاصلہ نہیں تھا بلکہ انسان کی خلقت بغیر کسی واسطہ کے مٹی سے ہی صورت پذیر ہوئی ہے۔

البتہ قرآن نے دوسری جاندار انواع کے بارے میں گفتگو نہیں کی ہے۔

یہ معنی سورہ آل عمران کی آیت ۵۹ کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ واضح ہو جاتا ہے، جہاں وہ کہتا ہے:

" ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب " (آل عمران)

" عیسیٰ کی باپ کے بغیر خلقت کوئی عجیب چیز نہیں ہے وہ آدم کی خلقت کی طرح ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا"

اور سورہ حجر کی آیہ ۲۶ میں فرماتا ہے:

" ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمأ مسنون "

" ہم نے انسان کو خشک مٹی سے کہ جو بدبودار مٹی سے پیدا ہوئی تھی بنایا ہے"

ان تمام آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی خلقت ایک مستقل مخلوق کی صورت میں خشک اور گیلی مٹی سے وجود میں آئی ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ تحول انواع کا مفروضہ ہرگز ایک قطعی و یقینی علمی مسئلہ کی صورت اختیار کیے ہوئے نہیں ہے تاکہ ہم اُوپر والی آیات کے ساتھ اس کے تضاد کی وجہ سے ان کی کسی اور طرح سے تفسیر کریں، دوسرے لفظوں میں جب تک واضح قرینہ ظواہر آیات کے برخلاف موجود نہ ہو تو انھیں ان کے ظاہری معنی پر ہی تطبیق کرنا ہوگی اور آدم کی مستقل خلقت کا مسئلہ بھی بالکل یہی ہے۔

بعد والی آیت نسل انسانی کی خلقت اور اولاد آدم کی ولادت کے بعد کے مراحل کی کیفیت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے:" پھر خدا نے اس کی نسل کو ناچیز اور بے قدر پانی کے نچوڑنے سے قرار دیا" (ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین)۔

یہاں" جعل" دراصل خلقت کے معنی میں ہے۔ اور" نسل" اولاد اور تمام مراحل میں اولاد در اولاد کے معنی میں ہے۔

" سلالہ" اصل میں ہر چیز کا خالص اور نچوڑ کے معنی میں ہے اور یہاں پر مراد آدمی کا نطفہ ہے۔ جو حقیقت میں اس کے کل وجود کا نچوڑ ہوتا ہے اور اولاد کی پیدائش مبدا اور نسل کو جاری رکھنے کا منبع ہے۔

یہ پانی جو ظاہراً بے قدر و قیمت اور اپنی ساخت اور اس میں تیرنے والے حیاتیاتی سالموں کے لحاظ سے اور مخصوص مائع اور سیال ترکیب کے لحاظ سے کہ جس میں سالمے تیرتے رہتے ہیں، بہت ہی ظریف اور حد سے زیادہ پیچیدہ ہے اور عظمت پروردگار اور اس کے علم و قدرت کی نشانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور لفظ" مھین" جو ضعیف، حقیر اور ناچیز کے معنی میں ہے، اس کی ظاہر وضع اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے ورنہ یوں تو مرموز ترین موجودات میں سے ہے۔

بعد والی آیت رحم کی دنیا میں انسانی ارتقاء کے پیچیدہ اور اسی طرح ان مراحل کی طرف اشارہ ہے، جو آدم نے

مٹی سے خلقت کے وقت طے کیے تھے. فرماتا ہے: " پھر انسان کے بدن کو موزوں بنایا ": (ثم سواہ)۔

" اور اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا ": (ونفخ فیہ من روحہ)۔

" اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے ": (وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ)۔

" لیکن بہت کم تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہو ": (قلیلاً ما تشکرون)۔

" سواہ " مادہ " تسویہ " سے تکمیل کرنے کے معنی میں ہے اور یہ ان تمام مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں انسان نطفہ کی صورت سے لے کر اس مرحلہ تک جبکہ اس کے بدن کے تمام اعضاء ظاہر ہوتے ہیں طے کرتا ہے اور اسی طرح وہ مراحل کہ جو آدم نے مٹی سے خلق ہونے سے لے کر نفخ رُوح تک طے کیے تھے۔[1]

" نفخ " (پھونکنے) کی تعبیر رُوح کے آدمی کے بدن میں رُوح کے حلول سے کنایہ ہے، گویا اسے ہوا اور تنفس سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگرچہ نہ یہ معنی مراد ہے اور نہ وہ۔

اور اگر کہا جائے کہ انسان کا نطفہ تو ابتداء ہی سے، جب کہ وہ رحم میں قرار پاتا ہے اور اس سے پہلے بھی تو ایک زندہ موجود ہے، تو پھر اس بناء پر نفخ رُوح کا کیا معنی ہے؟

تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ابتداء میں جب نطفہ منعقد ہوتا ہے تو صرف ایک قسم کی حیاتِ نباتی کا حامل ہوتا ہے، یعنی صرف غذا حاصل کرتا اور نشوونما پاتا ہے، لیکن نہ تو اس میں حس و حرکت جو " حیاتِ حیوانی " کی نشانی ہے اور نہ ہی قوت ادراک جو " حیاتِ انسانی " کی نشانی ہے، موجود ہوتی ہے۔

لیکن رحم میں نطفہ کا ارتقاء اس مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ حرکت کرنے لگتا ہے اور تدریجاً دوسری انسانی طاقتیں اس میں زندہ ہو جاتی ہیں اور یہ وہی مرحلہ ہے، جسے قرآن نفخ روح سے تعبیر کرتا ہے۔

" رُوح " کی " خدا " کی طرف اضافت اصطلاح کے مطابق " اضافت تشریفی " ہے یعنی ایک زبردست قیمتی اور باشرافت رُوح جو اس قابل ہے کہ اسے رُوحِ خدا کا نام دیا جائے انسان میں پھونکی جاتی ہے۔ اور یہ بات اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان اگرچہ " مادی جہات " کے لحاظ سے " تاریک مٹی " یا " بے قدر وقیمت پانی " سے ہے۔ لیکن معنوی اور روحانی لحاظ سے " روح الٰہی " کا حامل ہے۔

ایک طرف تو اس کا وجود مٹی پر اور دوسری طرف عرش پروردگار پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور ایک حیران کن معجون ہے،

---

[1] قابلِ توجہ یہ ہے کہ بعض نے اس آیت کو صرف جنینی ارتقاء کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض نے احتمال دیا ہے ممکن ہے کہ آدم کے مٹی سے پیدا ہونے کے بعد جو مراحل طے کئے ہیں، صرف اس کی ناظر ہو کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں بعینہ یہی تعبیرات خلقت آدم کے بارے میں آئی ہیں، لیکن دونوں کی طرف لوٹے تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ آدم کی مٹی سے خلقت بھی اور نطفہ کے پانی سے بھی اس کی نسل نے بھی ان مراحل کو طے کیا ہے اور طے کرتے رہتے ہیں۔

" کز فرشتہ سرشتہ و ز حیوان " (فرشتہ اور حیوان کا معجون مرکب ہے)، اور ان دو پہلوؤں کے حامل ہونے کی وجہ سے اس میں قوس صعودی و نزولی اور تکامل و انحطاط حد سے زیادہ وسیع ہے۔[1]

قرآن کے آخری مرحلہ میں جو خلقت انسان کا پانچواں مرحلہ شمار ہوتا ہے۔ کان اور آنکھ اور دل ایسی نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ بیاں مقصد ان اعضا کی خلقت نہیں ہے، کیونکہ یہ خلقت تو نفخ رُوح سے پہلے صورت پذیر ہوتی ہے۔ بلکہ مراد سننے، دیکھنے اور درک و خرد کی حس ہے۔

یہ جو تمام " ظاہری " اور " باطنی " حواس میں سے صرف ان تین پر اکتفا کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اہم ترین ظاہری حواس جو انسان اور اس کی بیرونی دنیا کے درمیان طاقت ور رابطہ قائم کرتے ہیں، وہ کان اور آنکھ ہیں۔ کان آوازوں کا ادراک کرتے ہیں — خاص کر تعلیم و تربیت ان کے ذریعے ہی انجام پاتے ہیں اور آنکھ بیرونی دنیا اور اس عالم کے مختلف مناظر کے دیکھنے کا ذریعہ ہے۔

اور عقل و خرد کی قوت انسان کے باطنی حواس میں سے اہم ترین حس ہے: جو دوسرے لفظوں میں وجود بشر پر حکمران ہے۔

جالبِ توجہ یہ کہ " افئدۃ " " فؤاد " کی جمع ہے کہ جو قلب (دل) کے معنی میں ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ظریف و عمدہ معنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے، جہاں " افروختگی " (روشنی) اور " پختگی " ہو۔

اور اس طرح سے خدا نے اس آیت میں شناخت اور معرفت کے اہم ترین آلات جو انسان کے وجود کے " ظاہر " و " باطن " میں ہیں، بیان کیے ہیں کیونکہ علومِ انسانی یا تو " تجربہ " کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، اور اس کا ذریعہ آنکھ اور کان ہیں۔

اور یا عقلی تجزیہ و تحلیل اور " استدلالات " کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان کا ذریعہ عقل و خرد ہے کہ قرآن میں وہ " افئدہ " سے تعبیر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ادراکات جو وحی، اشراق اور شہود کے طریقہ سے قلب انسان میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ وہ بھی انہی " افئدہ " کے وسیلہ سے ہوتے ہیں۔

اگر شناخت اور پہچان کے یہ ذرائع انسان سے چھین لیے جائیں تو اس کے وجود کی قدر و قیمت مٹھی بھر خاک اور سنگریزوں کی حد تک سقوط کر جائے گی۔ اسی بناء پر زیر بحث آیت کے آخر میں انسانوں کو ان عظیم نعمتوں کی شکر گزاری کے مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے۔ بہت کم اس کا شکر بجا لاتے ہو، جو اس طرف اشارہ ہے کہ جس قدر بھی ان عظیم نعمتوں کا شکر بجا لاؤ یہ پھر بھی کم ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۶ میں سورۂ حجر کی آیت ۲۹ کے ذیل میں بھی ہم بحث کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

مٹی سے آدمؑ کی خلقت کی کیفیت : اگرچہ قرآن کی مختلف آیات میں کبھی تو "مٹی" سے انسان کی خلقت کی گفتگو کی ہے (جیسے اوپر والی آیات میں) سورۂ اسراء کی آیت ۶۱ میں آدم و ابلیس کی داستان میں آیا ہے:

"فسجدوا الّا ابلیس قال ءاسجد لمن خلقت طینًا"

"تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ اس نے کہا، کیا میں اس کو سجدہ کروں جو مٹی سے پیدا شدہ ہے"؟ (سورۂ اسراء، ۶۱)

اور کبھی "پانی" سے خلقت کی گفتگو کی ہے۔ مثلاً "وجعلنا من الماء کلّ شیءٍ حیّ"

(انبیاء - ۳۰)

لیکن واضح رہے کہ یہ سب چیزیں ایک ہی مطلب کی طرف لوٹتی ہیں، یہاں تک کہ وہ جگہ بھی کہ جہاں آدمؑ کی "تراب" (مٹی) سے خلقت کی گفتگو ہے "ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب" (آل عمران - ۵۹) کیونکہ مراد گیلی مٹی ہے۔ (یعنی گارا ہے)۔

یہاں پر دو نکتے واضح ہو جاتے ہیں:

① جن لوگوں نے احتمال یہ دیا ہے کہ انسان کی مٹی سے خلقت سے مراد یہ ہے کہ افرادِ بشر نباتات سے براہ راست یا غیر مستقیم ... پر غذا حاصل کرتے ہیں اور نباتات بھی سارے مٹی سے ہیں ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں اور زیر بحث آیات کے قرینہ سے "خود آدم" کی خلقت کی طرف اشارہ ہیں جو مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔

② یہ تمام آیات "نظریۂ ارتقاء" کی نفی پر دلیل ہیں (کم از کم انسان کے بارے میں) اور نوع بشر جو "آدم" پر منتہی ہوتی ہے ایک مستقل خلقت کی حامل ہے۔

اور جن لوگوں نے یہ گمان کیا کہ مٹی سے خلقت والی آیات نوع انسانی کی طرف ہیں جو ہزارہا واسطوں سے اکیلے اور طاق سالمے والے موجودات کی طرف لوٹتی ہیں، اور وہ آخری مفروضات کی بنا پر سمندروں کے ساحلوں کی دلدل سے وجود میں آئے ہیں۔

باقی رہے خود حضرت آدم وہ ایک نمونہ تھے کہ انہیں نوع بشر کے درمیان سے منتخب کیا گیا۔ لیکن وہ کوئی مستقل خلقت نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کا امتیاز ان کے مخصوص صفات سے تھا، کسی طرح بھی آیاتِ قرآنی کے ظاہر سے سازگار نہیں ہے۔

ہم ایک بار پھر تاکید کرتے ہیں کہ تحول الانواع کا مسئلہ کوئی مسلم علمی قانون وکلیہ قاعدہ نہیں ہے، بلکہ صرف ایک مفروضہ ہے کیونکہ وہ چیز کہ جس کے ڈانڈے کئی لاکھ سال قبل قاعدہ تک جا ملتے ہیں، جو یقیناً قابل تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہے اور نہ ہی ثابت شدہ

علمی قوانین کی صف میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بلکہ ایک ایسا مفروضہ ہے کہ جو مختلف انواع و اجناس کے ظہور کی توجیہ کے لیے وجود میں آیا ہے اور اس کی قدر و قیمت صرف اسی قدر ہے کہ وہ عالم میں ظہور پذیر ہونے والی چیزوں کی اندازاً توجیہ کرتے ہیں۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ مفروضے ہمیشہ ایک حال پر باقی نہیں رہتے، بلکہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور نئے مفروضے ان کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔

اسی بناء پر کبھی بھی ایسے مفروضوں پر فلسفی مسائل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی، کیونکہ فلسفی مسائل کی بنیادیں ٹھوس اور محکم ہوتی ہیں۔

ہم ارتقاء الانواع کے مفروضہ کی بنیادوں اور ان کے غیر مستحکم ہونے کے بارے میں جلد ۶ صفحہ ۱۸۰ کے بعد کے صفحات "قرآن اور خلقت انسان" کے عنوان کے تحت سورۂ حجر کی آیت ۲۸ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

اس بحث کے آخر میں اس نکتہ کی یاد آوری ضروری سمجھتے ہیں کہ ارتقاء کے مفروضہ کا مسئلہ "توحید اور خدا شناسی" سے کسی قسم کا کوئی ارتباط نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ ماوراء طبیعت عالم کی نفی پر دلیل شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ اعتقاد توحیدی کہتا ہے کہ کائنات خدا کی طرف سے خلق ہوئی ہے اور خدا نے اسے موجودات کے تمام خواص عطا کیے ہیں اور خدا کی طرف سے تمام مراحل میں ان پر فیض نازل ہوتا ہے۔ اس معنی کو "ثبوت انواع" کے نظریہ کا مقصد بھی اسی طرح قبول کر سکتا ہے، جس طرح تحول انواع کے مفروضہ کا کوئی معتقد قبول کرتا ہے، صرف ایک مشکل جس سے تحول کا مفروضہ دوچار ہے، یہ کہ وہ اس تفصیل کے ساتھ میل نہیں کھاتا، جسے قرآن نے خلقت آدم کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کی تخلیق مٹی اور گارے سے ہوئی ہے۔

اس بناء پر ہم ارتقاء کے نظریہ کی صرف اسی دلیل سے نفی کرتے ہیں نہ کہ مسئلہ توحید کی مخالفت کی بناء پر۔ یہ بات تو تھی تفسیری لحاظ سے۔

رہا علمی (سائنسی) اعتبار سے، تو اس کی نفی کا تعلق، چونکہ اس کے ثبوت کے لیے قطعی دلائل موجود نہیں ہیں، لہٰذا ہم اس لحاظ سے بھی اس کی نفی کرتے ہیں۔

۱۰۔ وَقَالُوٓا۟ أَءِذَا ضَلَلْنَا فِى ٱلْأَرْضِ أَءِنَّا لَفِى خَلْقٍ جَدِيدٍۭ ۚ بَلْ هُم بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كَـٰفِرُونَ ○

۱۱۔ قُلْ يَتَوَفَّىٰكُم مَّلَكُ ٱلْمَوْتِ ٱلَّذِى وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ○

۱۲۔ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا۟ رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَٱرْجِعْنَا نَعْمَلْ صَـٰلِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ○

۱۳۔ وَلَوْ شِئْنَا لَـَٔاتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَىٰهَا وَلَـٰكِنْ حَقَّ ٱلْقَوْلُ مِنِّى لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ ٱلْجِنَّةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ ○

۱۴۔ فَذُوقُوا۟ بِمَا نَسِيتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هَـٰذَآ إِنَّا نَسِينَـٰكُمْ ۖ وَذُوقُوا۟ عَذَابَ ٱلْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۱۰۔ انھوں نے کہا کیا جس وقت ہم مر جائیں گے اور زمین میں گم ہو جائیں گے تو نئی زندگی پالیں گے؟ لیکن وہ تو اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار

کرتے ہیں (اور چاہتے ہیں کہ معاد کے انکار سے آزاد ہو جائیں اور اپنی ہوس رانی کو جاری و ساری رکھیں)۔

۱۱۔ کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مامور ہوا ہے، تمھاری (رُوح کو) قبض کرے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

۱۲۔ اور اگر تم ان مجرموں کو دیکھو، جس وقت کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سر نیچے کیے ہُوئے کہیں گے، پروردگار! جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا، ہم نے اسے دیکھا اور سُنا ہے، ہمیں واپس پلٹا دے، تاکہ ہم عمل صالح بجا لائیں، ہم قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔

۱۳۔ اگر ہم چاہتے تو ہر انسان کو (جبری طور پر اور) لازمی ہدایت دیتے۔ لیکن ہم نے (انھیں آزاد چھوڑ رکھا ہے اور) مقرر کیا ہے کہ دوزخ کو (بے ایمان اور گناہگار) جن و انس کے تمام افراد سے بھر دیں۔

۱۴۔ (اور ان سے کہو کہ عذابِ جہنم کو) چکھو۔ اس لیے کہ آج کی ملاقات کو تم نے فراموش کر دیا تھا، ہم نے بھی تمھیں فراموش کیا ہے اور ہمیشہ کے عذاب کو ان اعمال کی وجہ سے چکھو جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

تفسیر

ندامت اور بازگشت کا تقاضا:

یہ آیات معاد کے بارے میں ایک بولتی ہوئی ناطق بحث کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں۔ اس کے دوسرے جہان

ہیں" مجرمین" کی حالت کو بیان کرتا ہے اور مجموعی طور پر گذشتہ بحثوں کی تکمیل ہے جو" مبدا" کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ " مبدا و معاد" کی بحث قرآن مجید میں عام طور پر ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے۔

پہلے کہتا ہے " انہوں نے کہا کیا جس وقت ہم مرگئے اور مٹی ہو گئے اور زمین میں گم ہو گئے تو نئی پیدائش پائیں گے: (وقالوا ءاذا ضللنا فی الارض ءانا لفی خلق جدید)۔

" زمین میں گم ہو جانے" کی تعبیر (ضللنا فی الارض) اس طرف اشارہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد پانی مٹی کی طرح خاک ہو جاتا ہے اور اس کا ہر ذرہ عوامل طبیعی اور غیر طبیعی کی بناء پر ایک گوشہ میں جا پہنچتا ہے اور پھر اس کی کوئی چیز بھی باقی نظر نہیں آتی تاکہ اسے قیامت میں دوبارہ پلٹانے کا یقین دلائے۔

لیکن حقیقت میں وہ اپنے اس کام سے قدرت خدا کے منکر نہیں ہیں" بلکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں: (بل ھم بلقاء ربھم کافرون)۔

وہ چاہتے ہیں کہ پروردگار کی ملاقات کے مرحلہ کا انکار کریں جو حساب و کتاب اور ثواب و عقاب کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد عمل میں آزادی حاصل کریں تاکہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں انجام دیں۔

درحقیقت یہ آیت سورۂ قیامت کی پہلی آیات سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے جہاں قرآن نے کہا ہے:

" ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامہ بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوّی بنانہ بل یرید الانسان لیفجر امامہ یسئل ایان یوم القیامۃ"

" کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اس کی پراگندہ اور بکھری ہوئی ہڈیوں کو ہم جمع نہیں کر سکیں گے: ہم تو یہاں تک قادر ہیں کہ تمہاری انگلیوں کے پوروں (کے خطوط) پہلے نظام کی طرف پلٹا دیں۔ لیکن انسان کا ہدف و مقصد یہ ہے کہ وہ دن جو اس کے سامنے ہے (انکار قیامت کرکے) فسق و فجور اور گناہ کے ساتھ گزار دے۔ اس لیے پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی"۔ (سورۂ قیامت ۳ تا ۶)

اس بناء پر وہ استدلال کے لحاظ سے لولے لنگڑے نہیں بلکہ ان کی تن آسانی نے ان کے دل پر حجاب ڈال رکھا ہے اور ان کی بُری نیتیں مسئلہ معاد کے قبول کرنے سے مانع ہیں۔ ورنہ وہی خدا جس نے مقناطیس کو یہ اثر بخشا ہے کہ لوہے کے بہت ہی چھوٹے ذرات کو جو مٹی کے اندر چھپے ہوتے ہیں، انھیں ایک گردش سے اپنی طرف جذب کرکے آسانی کے ساتھ انھیں جمع کر لیتا ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ انسان کے جسم کے ذرات کے درمیان بھی اس قسم کی کشش پیدا کر دے؟

کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ایک انسان کے جسم میں موجود مختلف پانی (اور جسم انسانی کا اکثر حصہ پانی پر ہی مشتمل ہے) اور اسی طرح اس کے غذائی مواد میں سے ہر ایک، مثلاً ایک ہزار سال قبل اس کی ہر ہر جز اس عالم کے کسی گوشہ میں بکھری پڑی تھی۔ ہر قطرہ ایک سمندر میں اور ہر ذرہ ایک اقلیم اور برّاعظم میں، لیکن وہ بادل و بارش اور دوسرے قدرتی عوامل کے ذریعے جمع ہوئے اور آخرکار وجود انسان کو تشکیل دیا، تو کونسا مقام تعجب ہے کہ پراگندہ اور منتشر ہونے کے بعد دوبارہ پہلی حالت کی طرف پلٹ آئیں اور ایک دوسرے سے آملیں؟

بعد والی آیت ان کا جواب ایک دوسرے طریقے سے دیتی ہے کہتی ہے" یہ تصور نہ کرو کہ تمہاری شخصیت تمہارے اسی جسمانی بدن کے ساتھ ہے بلکہ تمہاری شخصیت کی اساس و بنیاد کو تمہاری رُوح تشکیل دیتی ہے اور وہ محفوظ ہے " کہہ دے کہ موت کا فرشتہ جو تم سب پر مقرر کیا ہے تمہاری (روح) قبض کرتا ہے۔ پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جاتے ہو" (قل یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون)۔

" یتوفاکم" کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو مادہ" توفی" (بروزن تصدی) میں ہے واپس لینے کے معنی میں ہے۔ موت فنا اور نابودی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ فرشتے کے ایک طرح سے آدمی کی رُوح کو قبضے میں لے لینے کے معنی میں ہے، وہ روح جو وجود انسان کے اہم اور بنیادی حصہ کو تشکیل دیتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن معاد جسمانی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور رُوح اور مادی جسم کی بازگشت کو قیامت میں قطعی اور یقینی سمجھتا ہے۔ لیکن اوپر والی آیت سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ انسانی شخصیت کی اساس یہ مادی اجزاء نہیں ہیں جنہوں نے تمہاری تمام فکر کو اپنی طرف مشغول کر رکھا ہے بلکہ وہ روحانی جوہر ہے، جو خدا کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔

اور خلاصہ کے طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اوپر والی یہ آیت معاد اور قیامت کے منکرین کو اس طرح جواب دیتی ہے کہ اگر تمہاری مشکل جسمانی اجزاء کا منتشر اور پراگندہ ہونا ہے تو تم خود قدرت خدا کو قبول کرتے ہو اور اس کے منکر نہیں ہو اور اگر اس پراگندگی کی وجہ سے انسان کی شخصیت کے اضمحلال اور نابودی والی مشکل ہے تو وہ بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح پر استوار ہے۔

یہ اعتراض مشہور شبہ" اٰکل و مأکول" سے ملتا جلتا ہے اور اس کا جواب بھی دو مقامات پر ایک دوسرے سے شباہت رکھتا ہے۔[1]

ضمناً اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ چند ایک قرآنی آیات میں" توفی" اور" قبض ارواح" کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے:

" اللہ یتوفی الانفس حین موتھا" (زمر- ۴۲)

" خدا جانوں اور نفسوں کو موت کے وقت لے لیتا ہے"۔

اور بعض آیات میں فرشتوں کی ایک جماعت کی طرف نسبت ہے:

" الذین تتوفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم" (نحل ۲۸)

وہ کہ فرشتے جن کی ارواح کو قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ ظالم و ستمگر لوگ ہیں"...)

---

[1] شبہ" اٰکل و مأکول" کے سلسلہ میں مزید وضاحت اور اس کے تفصیلی جواب کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۰ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

اور زیر بحث آیات میں قبض ارواح کی نسبت " ملک الموت " (موت کے فرشتہ) کی طرف دی گئی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تعبیروں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے " ملک الموت " جنس کا معنی رکھتا ہے اور ان تمام فرشتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یا پھر ان کے رئیس اور سب سے بڑے فرشتے کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ تمام فرشتے حکم خدا سے قبض روح کرتے ہیں، لہذا خدا کی طرف بھی نسبت دی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد ان کافر مجرم اور معاد کے منکرین کی کیفیت جو قیامت میں اس کے مختلف مناظر کو مشاہدہ کرنے سے ہوگی۔ اپنے کیے پر سخت نادم اور پشیمان ہوں گے۔ اس طرح مجسم اور ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ " اگر تو دیکھے مجرمین کو جس وقت کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے سر نیچے کیے ہوئے کہیں گے۔ پروردگارا جو کچھ تو نے وعدہ کیا تھا، اس کو ہم نے دیکھا اور سنا ہے۔ ہم اپنے کیے پر نادم ہیں۔ ہمیں واپس پلٹا دے تاکہ ہم عمل صالح انجام دیں۔ ہم اس جہان قیامت پر یقین رکھتے ہیں " (تو تم تعجب میں ڈوب جاؤ گے) (ولو ترٰی اذ المجرمون ناکسوا رء وسہم عند ربہم ربنا ابصرنا وسمعنا فارجعنا نعمل صالحًا انا موقنون)۔[1]

یقیناً آپ تعجب کریں گے کہ کیا یہ سر نیچے کئے ہوئے نادم اور پشیمان افراد وہی مغرور، سرکش اور منہ زور لوگ ہیں جو دنیا میں کسی حقیقت کے مقابلہ میں سر نہیں جھکاتے تھے؟ لیکن اب جبکہ قیامت کے مناظر کو دیکھیں گے اور مقام شہود پر پہنچ جائیں گے، تو کلی طور پر متغیر ہو کر بدل جائیں گے۔ لیکن یہ تغیر اور بیداری جلدی گزر جانے والی ہے اور قرآن کی دوسری آیات کے مطابق اگر اس جہان کی طرف پلٹ آئیں تو بھی اسی روش و طریقہ کو جاری رکھیں گے۔ (انعام ۔ ۲۸)

" ناکس " " نکس " (بروزن عکس) کے مادہ سے کسی چیز کا اوندھے منہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں سر نیچے کرنے کے معنی میں ہے۔

" ابصرنا " (ہم نے دیکھا ہے) کو " سمعنا " (ہم نے سنا ہے) پر مقدم رکھنا اس بناء پر ہے کہ قیامت میں پہلے انسان اس کے مناظر سے روبرو ہوگا اور پھر اس کے بعد خدا اور اس کے فرشتوں کی بازپرس کو سنے گا۔

ضمناً جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ " مجرمین " سے مراد یہاں کفار اور خصوصیت سے قیامت کے منکرین ہیں۔

بہر حال یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم آیات قرآنی میں اس مسئلہ سے روبرو ہو رہے ہیں کہ مجرمین نتائج اعمال کے اور عذاب الٰہی کے آثار کے مشاہدے سے سخت پریشان ہوں گے اور دُنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا کریں گے۔ حالانکہ سنت الٰہی کے لحاظ سے اس قسم کی بازگشت امکان نہیں رکھتی، جس طرح کہ نوزاد بچے کی بازگشت رحم مادر کی طرف اور درخت سے

---

[1] اس آیہ شریفہ میں " لو " شرطیہ ہے اور " ترٰی " کا جملہ اس کی شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیری طور پر اس طرح ہے۔ ولو ترٰی اذ المجرمون ...... لرأیت عجبا۔ ربنا ابصرنا کے جملہ کا بھی ایک محذوف ہے اور وہ در اصل " یقولون ربنا ابصرنا " ہے۔

جدا شدہ پھل کی بازگشت درخت کی طرف ممکن نہیں ہوتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مجرمین کا دنیا کی طرف بازگشت کا تقاضا صرف عمل صالح انجام دینے کے لیے ہے۔ اور اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قیامت میں سرمایۂ نجات صرف اعمال صالح ہی ہیں۔ ایسے اعمال جو پاک اور ایمان سے لبریز اور خالص نیت سے انجام پائیں۔

اور چونکہ ایمان کو قبول کرنے کے لیے آیت کا سارا اصرار اور زیادہ زور ممکن ہے، یہ توہم پیدا کرے کہ کیا خدا اس قدر قدرت و توانائی نہیں رکھتا کہ نور ایمان کا پرتو ان کے دل میں ڈال دے؟ تو بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: " اگر ہم چاہتے تو ہر انسان کو (جبری طور پر) ضروری ہدایت دے دیتے " (ولو شئنا لاٰتینا کل نفس ھداھا)۔

یقیناً ہم ایسی قدرت رکھتے ہیں لیکن ایسا ایمان جو ہمارے جبری طریقے سے وجود میں آئے تو ایسے ایمان کی چنداں قیمت نہیں ہے۔ لہذا ہم نے ارادہ کر لیا کہ بنی نوع انسان کو یہ اعزاز اور افتخار بخشیں کہ وہ " مختار " ہو اور ارتقائی مراحل اپنے قدموں سے طے کرے۔

لہذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: " میں نے انھیں آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن مقرر کر دیا کہ دوزخ کو بے ایمان اور گناہگار جن و انس کے تمام افراد سے بھر دوں " (ولٰکن حق القول منی لاملئن جھنم من الجنۃ والناس اجمعین)۔

جی ہاں انھوں نے اپنے غلط اختیار سے اس راہ کو طے کیا ہے لہذا وہ سزا اور عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اور ہم نے بھی قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ دوزخ کو ان سے بھر دیں۔

اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، اسی طرح قرآن مجید کی سینکڑوں آیات کو دیکھا جائے جو انسان کو مختار، صاحب ارادہ، مکلف بتکالیف شرعیہ اپنے اعمال کا جواب دہ، انبیاء، تہذیب نفس اور خود سازی کے ذریعہ قابل ہدایت و اصلاح سمجھتی ہیں تو اوپر والی آیت کے بارے میں ہر قسم کا توہم دور ہو جاتا ہے کہ یہ جبر کی دلیل ہے جیسا کہ فخر رازی وغیرہ نے خیال کیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اوپر والا دو ٹوک فیصلہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کہیں یہ تصور نہ کرنا کہ خدا کی رحمانیت و رحیمیت گناہوں سے آلودہ اور ستمگر مجرموں کی سزا اور عذاب سے مانع ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ آیات رحمت سے مغرور ہو جاؤ اور اپنے آپ کو خدا کی سزا اور عذاب سے معاف تصور کرو۔ کیونکہ اس کی رحمت کا اپنا مقام ہے اور غضب کا اپنا مقام۔

" لاملئن " کے جملہ کے اول میں لام قسم اور آخر میں نون تاکید کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ کو پورا کرے گا اور دوزخ کو ان دوزخیوں سے بھر دے گا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو حکمت کے خلاف ہے اس لیے بعد کی آیت میں کہتا ہے، ہم ان دوزخیوں سے کہیں گے کہ جہنم کا عذاب اس بنا پر چکھو کہ آج کی ملاقات کو تم بھول گئے تھے۔ اور ہم نے بھی تمھیں فراموشی کے حوالے کر دیا: (فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا انا نسینٰکم)۔

"اور نیز ہمیشگی کے عذاب کو ان اعمال کی وجہ سے چکھو، جنہیں تم انجام دیتے تھے"۔ (وذوقوا عذاب الخلد بما کنتم تعملون)۔

اس آیت سے ایک بار پھر معلوم ہوتا ہے، قیامت کی دادگاہ اور علامت کو بھول جانا ہی انسان کی بدبختی کا اصل سرچشمہ ہے اور یہی وہ صورت ہے کہ جس میں وہ اپنے آپ کو قانون شکنی اور مظالم کے سلسلہ میں آزاد سمجھتا ہے، نیز اس آیت سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ابدی اور ہمیشہ کی سزا و عذاب ان اعمال کی وجہ سے ہی ہے، جنہیں انسان خود انجام دیتا ہے۔ نہ کوئی اور چیز! [1]

ضمناً: بندوں کے بارے میں پروردگار کی خاموشی سے مراد یہاں خدا کی بے اعتنائی، ترکِ حمایت اور فریاد رسی نہ کرنا ہے۔ ورنہ سارا جہان ہمیشہ پروردگار کے سامنے ہے، اور اس کے بارے میں فراموشی ایک بے معنی سی بات ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ رُوح کا استقلال اور اس کی اصلیّت:

اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت جو موت کے فرشتہ کے ذریعے قبض ارواح پر دلالت کرتی ہے، انسان کی رُوح کے استقلال کی دلیل ہے۔

کیونکہ "توفی" سے تعبیر جو حاصل کرنا اور قبض کرنا کے معنی میں ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ بدن سے جدائی کے بعد رُوح نابود نہیں ہوتی بلکہ باقی رہ جاتی ہے اور اصولاً اوپر والی آیت میں انسان کو رُوح یا نفس سے تعبیر کرنا اس معنی پر ایک اور گواہ ہے کیونکہ مادہ پرستوں کے عقیدے کے مطابق رُوح سالموں کے "فزیکل اور کیمیکل" خواص کے علاوہ کچھ نہیں جو بدن کے فنا ہونے کے ساتھ نابود ہو جاتے ہیں جیسے گھڑی کے نابود ہونے کے ساتھ ہی اس کی سُوئی کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔

اس نظریے کے مطابق رُوح کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو انسانی شخصیت کی محافظ ہو بلکہ اس کے جسم کے خواص کی ایک جزء ہے، جو جسم کے ختم ہو جانے سے ختم ہو جاتی ہے۔

رُوح کی اصلیّت اور استقلال کے سلسلے میں ہمارے پاس متعدد فلسفی دلائل موجود ہیں۔ جن کا ایک گوشہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۵ کے ذیل میں جلد ۶ میں ہم بیان کر چکے ہیں، یہاں پر مقصود صرف اس موضوع پر نقلی دلیل کو بیان کرنا تھا اور اوپر والی آیت کا شمار اس معنی پر دلالت کرنے والی آیات میں ہوتا ہے۔

۲۔ موت کا فرشتہ (ملک الموت):

قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم فرشتوں کے ایک گروہ کے ذریعہ اس جہان کے امور کی تدبیر کرتا ہے جیسا کہ

---

[1] "خلود اور عذاب جاودانی کے فلسفہ" کے بارے میں جلد ۵ میں ــــ سورۂ ہُود آیت ۱۰۷ کے ذیل میں ہم ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

سورۂ نازعات کی آیت ۵ میں فرماتا ہے (فالمدبرات امراً) "قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکم خدا سے تدبیر کرتے ہیں"۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سنّت الٰہی اس پر ہے کہ وہ اپنی مشیت کو سبب کے ذریعہ سے عملی شکل دیتا ہے۔ اور فرشتوں میں سے ایک گروہ قبض ارواح کرنے والا ہے جن کی طرف سورۂ نحل کی آیت ۲۸ اور ۳۲ میں قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے اور ان سب میں سرفہرست "ملک الموت" قرار پاتا ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں، جن میں سے بعض کی طرف اشارہ ضروری نظر آتا ہے۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

لامراض والاوجاع کلها برید الموت ورسل الموت! فاذا حان الاجل اتی ملک الموت بنفسه فقال یا ایها العبد کم خبر بعد خبر! وکم رسول بعد رسول! وکم برید بعد برید! انا الخبر الذی لیس بعدی خبر۔

"بیماریاں اور درد و تکالیف سب موت کے قاصد اور اس کے بھیجے ہوئے ہیں، جس وقت انسان کی زندگی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور موت کا فرشتہ آجاتا ہے تو وہ اس فرشتہ کو دیکھ کر وحشت کرتا ہے (وہ اسے کسی پیشگی اطلاع دیئے بغیر خیال کرتا ہے لیکن) وہ کہتا ہے: اے بندۂ خدا کس قدر متواتر خبریں پے در پے تیرے پاس مسلسل پیغام رساں تیری طرف بھیجے ہیں۔ اب میں آخری خبر ہوں اور میرے بعد کوئی خبر نہیں ہے"۔

پھر وہ کہتا ہے" اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کرے۔ چاہے رضا و رغبت کے ساتھ یا جبر و اکراہ کے ساتھ" اور جس وقت موت کا فرشتہ اس کی رُوح قبض کرتا ہے اور اس کے عزیز و اقارب نالہ و شیون بلند کرتے ہیں تو وہ پکار کر کہتا ہے:

(علی من تصرخون؟ وعلی من تبکون؟ فوالله ما ظلمت له اجلاً ولا اکلت له رزقاً بل دعاه ربه) "کس پر تم چیخ پکار کر رہے ہو؟ اور کس کے لیے آنسو بہا رہے ہو؟ خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا ہے اور وہ ساری روزی کھا چکا ہے۔ اس کے پروردگار نے اسے دعوت دی ہے، اور اس نے اس کی دعوت کو قبول کیا ہے"۔

"فلیبک الباکی علی نفسه، وان لی فیکم عودات وعودات حتی لا ابقی فیکم احداً"۔

"اگر رونا چاہتے ہو تو اپنے آپ پر گریہ کرو، میں پھر بھی بارہا تمہارے پاس آؤں گا یہاں تک کہ تم میں سے ایک شخص کو بھی باقی نہیں چھوڑوں گا"۔ [1]

۲۔ ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ ایک انصاری شخص کی عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے، موت کے فرشتے کو اس کے سرہانے دیکھ کر فرمایا: میرے اس دوست سے نرمی کا سلوک کرو، کیونکہ یہ ایک با ایمان شخص ہے۔ ملک الموت نے عرض کی آپ کو بشارت ہو کہ میں تمام مومنین کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔ اور آپ

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت زیر بحث و تفسیر نور الثقلین ج ۴ ص ۲۲۵۔

جان لیجیے کہ جس وقت میں بعض اولاد آدم کی رُوح قبض کرتا ہوں تو اس کے گھر والے آہ و فریاد کرتے ہیں تو میں گھر کے پاس کھڑا ہو جاتا ہوں اور کہتا ہوں، اس میں میرا تو کوئی گناہ نہیں، بلکہ اس کی اپنی زندگی ختم ہو گئی ہے، بار ہا تمھاری طرف لوٹ کر آؤں گا خبردار، ہوشیار!

پھر کہتا ہے (ما خلق الله من اهل بیت مدر ولا شعر ولا وبر فی بر ولا بحر الا وانا اتصفحهم فی کل یوم ولیلة خمس مرات حتی انی لا عرف بصغیرهم وکبیرهم منهم بانفسهم) "خدا نے کسی بھی شہر و بیاباں، گھر اور خیمہ، خشکی اور دریا میں رہنے والے انسان کو پیدا نہیں کیا مگر یہ کہ میں ہر شبانہ روز میں پانچ مرتبہ بڑے غور کے ساتھ ان کی طرف نگاہ کرتا ہوں، یہاں تک کہ میں ان کے تمام چھوٹے بڑوں کو خود ان سے بہتر پہچانتا ہوں۔"[1]

اس مضمون کی دوسری روایات بھی مختلف اسلامی مآخذ میں موجود ہیں کہ جن کا مطالعہ تمام انسانوں کو متنبہ اور خبردار کرتا ہے تاکہ وہ جان لیں کہ ان کے اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ ایک مختصر سے لمحے میں تمام چیزیں ختم ہو جائیں۔

کیا ان حالات کے باوجود اس بات کا موقع ہے کہ انسان اس دُنیا کی چمک دمک پر فریفتہ اور طرح طرح کے ظلم و گناہ سے آلودہ ہو کر عاقبت کار سے غافل ہو جائے!

---

[1] تفسیر "درمنثور" بحوالہ المیزان جلد ۱۶ ص ۲۰۰۔

۱۵۔ اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۩ ○

۱۶۔ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ○

۱۷۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

۱۸۔ اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسْتَوٗنَ ○

۱۹۔ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

۲۰۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَقِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ کُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ ○

ترجمہ

۱۵۔ صرف وہی لوگ ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں کہ جنہیں جس وقت

آیات انھیں یاد دلائی جائیں تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالاتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔

۱۶۔ ان کے پہلو رات کو بستروں سے دُور رہتے ہیں (وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کرتے ہیں) اپنے پروردگار کو خوف و امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں روزی دی ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۱۷۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کیسی اہم جزائیں جو آنکھوں کی روشنی کا سبب بنتی ہیں، ان کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔ یہ ان اعمال کی جزا ہے جنہیں وہ انجام دیتے تھے۔

۱۸۔ کیا وہ شخص جو صاحب ایمان ہو، اس شخص کی طرح ہے جو فاسق ہے؟ نہیں! یہ دونوں کبھی بھی برابر نہیں ہو سکتے۔

۱۹۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیئے، اُن کے لیے دائمی بہشت کے باغات ہوں گے یہ (خدا کی طرف سے) ان کی میزبانی کا وسیلہ ہے، ان اعمال کے مقابلہ میں جنھیں وہ انجام دیتے تھے۔

۲۰۔ لیکن وہ لوگ جو فاسق ہو گئے (اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گئے) ان کی ہمیشہ کی جگہ آگ ہے، جس وقت چاہیں کہ اس سے نکلیں تو انھیں اس کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا، اس آگ کا عذاب چکھو جس کا تم انکار کرتے تھے۔

تفسیر

عظیم جزائیں جنہیں کوئی نہیں جانتا!

ہم سب کو معلوم ہے کہ قرآن کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ بہت سے حقائق کو ایسے دلنشین انداز میں ایک دوسرے کے تقابل اور موازنہ کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح ہر ایک کی سمجھ میں آ جائیں۔

گذشتہ آیات میں مجرمین اور کافرین کے بارے میں بیان شدہ تشریح کے بعد یہاں پر بھی برجستہ مومنین کی صفات اور ان کے اصول عقاید اور عملی پروگرام کو اختصار کے ساتھ دو آیات کے ضمن میں آٹھ صفات کے ذکر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔[1]

پہلے فرماتا ہے: "صرف وہی لوگ ہماری آیات پر ایمان لے آتے ہیں کہ جنہیں جب بھی ان آیات کی یاد دہانی کرائی جائے تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے" (انما یؤمن بایاتنا الذین اذا ذکروا بها خروا سجدًا وسبحوا بحمد ربهم وهم لا یستکبرون)۔

"انما" کی تعبیر جو عام طور پر حصر کے لیے ہے اس نکتہ کو بیان کرتی ہے کہ جب کوئی شخص ایمان کا دم بھرتا ہے لیکن ان خصوصیات کا حامل نہیں جو ان آیات میں آئی ہیں تو وہ سچے مومنین کی صف میں نہیں ہے بلکہ ایسا ضعیف الایمان شخص ہے جو کسی کھاتے میں شمار کے قابل نہیں۔

اس آیت میں ان کی صفات کے چار حصے بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ آیاتِ الٰہی کے سنتے ہی سجدہ میں گر پڑتے ہیں "سجدوا" کے بجائے "خرّوا" کی تعبیر ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ بیدار دل مومنین کا گروہ آیاتِ قرآن سننے کے وقت اس طرح شیفتہ اور پروردگار کے ارشادات کا مجذوب ہے کہ بے اختیار سجدہ میں گر پڑتا ہے اور اس راہ میں دل و جان کو ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے۔[2]

---

[1] توجہ رکھنا چاہیے کہ یہ آیت قرآن مجید میں "واجب سجدہ" کی پہلی آیت ہے۔ چنانچہ جو شخص اس ساری آیت کو پڑھے یا کسی دوسرے سے سنے تو واجب ہے کہ سجدہ کرے۔ البتہ اس میں وضو واجب نہیں ہے۔ لیکن احتیاط واجب یہ ہے کہ پیشانی ایسی چیز پر رکھے کہ جس پر سجدہ صحیح ہے۔

[2] "راغب" "مفردات" میں لکھتے ہیں "خرّ" دراصل "خریر" کے مادہ سے ہے، جو پانی وغیرہ کی اس آواز کے معنی میں ہے جو بلندی سے نیچے کی طرف گر رہا ہو اور اس تعبیر کو سجدہ کرنے والوں کے بارے میں استعمال کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ جس لمحہ بھی سجدہ کے لیے زمین پر گرتے ہیں، اسی وقت ان کی تسبیح کی صدا بلند ہوتی ہے۔

جی ہاں! ان کی پہلی خصوصیت اپنے محبوب و معبود کے ... عشق سوزاں اور لگاؤ ہے۔

یہی خصوصیت قرآن کی دوسری آیات میں انبیاء کی ایک برجستہ ترین صفت کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے، جیسا کہ خداوند عظیم انبیاء کے ایک گروہ کے متعلق کہتا ہے:

"اذا تتلی علیھم ایات الرحمٰن خروا سجدًا وبکیًا" (سورۂ مریم - ۵۸)

"جس وقت خداوند رحمان کی آیات ان پر پڑھی جاتی تھیں تو وہ خاک پر گر پڑتے اور سجدہ کرتے اور گریۂ شوق کرتے تھے۔"

اگرچہ لفظ "آیات" یہاں بطور مطلق ذکر ہوا ہے۔ لیکن واضح ہے کہ ان سے مراد زیادہ تر وہ آیات ہیں جن میں توحید کی دعوت ہے اور شرک سے نبرد آزمائی کی ترغیب۔

۲ و ۳۔ دوسری اور تیسری نشانی ان کی پروردگار کی "تسبیح" اور "حمد" ہے۔ ایک طرف جہاں وہ خدا کو نقائص سے پاک اور منزہ شمار کرتے ہیں تو دوسری طرف — اس کے صفاتِ کمال و جمال کی بنا پر اس کی حمد و ستائش کرتے ہیں۔

۴۔ ان کی ایک اور صفت تواضع، فروتنی اور ہر قسم کے استکبار سے دوری ہے۔ کیونکہ کبر و غرور کفر و بے ایمانی کے زینہ کی پہلی سیڑھی ہے اور حق و حقیقت کے سامنے جھک جانا ایمان کا پہلا قدم ہے۔

وہ لوگ جو تکبر اور خود پسندی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں، وہ نہ تو خدا کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی تسبیح و حمد بجالاتے ہیں اور نہ ہی اس کے بندوں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اپنے سامنے ایک عظیم بت رکھتے ہیں اور بڑا بت خود ان کی اپنی ذات ہے۔

اس کے بعد ان کی دوسری صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان کے پہلو رات کے وقت بستروں سے دور ہو جاتے ہیں۔" وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور بارگاہِ خدا کا رُخ کرکے اس سے راز و نیاز کرتے ہیں: (تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع)[1]

جی ہاں! جس وقت غافل لوگوں کی آنکھ سو رہی ہوتی ہے تو وہ رات کا ایک حصہ بیدار ہوتے اور اس وقت جبکہ زندگی کا کاروبار ٹھپ ہوتا ہے، فکری مشاغل کم سے کم حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور آرام و سکون اور خاموشی نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہوتا ہے اور عبادات میں ریا کا شائبہ بہت ہی کم ہوتا ہے اور خلاصہ یہ کہ اس وقت حضورِ قلب کے بہترین مواقع میسر ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنے پورے وجود کے ساتھ بارگاہ معبود کا رُخ کرتے ہیں اور اپنے معشوق و محبوب کے آستانے پر سر جھکا دیتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے، اس کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ اس کی یاد میں زندہ ہیں اور اپنے دل کے پیمانے

---

[1] "تتجافیٰ" مادہ "جفا" سے اصل میں اٹھانے اور دور کرنے کے معنی میں ہے۔ "جنوب" جمع ہے "جنب" کی جو پہلو کے معنی میں ہے اور "مضاجع" جمع ہے "مضجع" کی جو بستر کے معنی میں ہے اور بستر سے پہلو کا دور ہونا رات کے وقت بسترِ خواب سے اٹھنے اور پروردگار کی عبادت کرنے سے کنایہ ہے۔

کو اس کی مہر و محبت سے لبریز اور سرشار رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ اپنے پروردگار کو "خوف" "و امید" کے ساتھ پکارتے ہیں": (یدعون ربھم خوفًا وطمعًا)۔

جی ہاں! ان کی دو اور صفات "خوف" و "رجا" یا "ڈر" اور "امید" ہے۔ نہ تو اس کے غضب اور عذاب سے مامون رہتے ہیں اور نہ اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔ اس "خوف" اور "امید" کا توازن جو خدا کی راہ میں ان کے تدریجی کمال و ارتقاء اور پیش رفت کا ضامن ہے، ہمیشہ ان کے وجود میں کارفرما ہے۔

وجہ یہ ہے کہ امید پر خوف کا غلبہ انسان کو مایوسی اور سستی کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، اور رجاء اور طمع کا غلبہ اسے غرور و غفلت پر آمادہ کرتا ہے اور یہ دونوں خدا کی طرف انسان کے ارتقائی مراحل کے دشمن ہیں۔

آخری اور آٹھویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں: (ومما رزقناھم ینفقون)۔

نہ صرف یہ کہ اپنے مال ضرورت مندوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ اپنے علم و دانش، قوت اور قدرت، صحیح رائے اور تجربہ اور فکری ذخیرے کو ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

وہ خیر و برکت کا مرکز ہیں اور نیکیوں کے آبِ زلال یعنی صاف ستھرے پانی کا لازوال چشمہ ہیں کہ تشنہ کاموں کو سیراب اور محتاجوں کو اپنی ہستی کے مطابق بے نیاز کر دیتے ہیں۔

جی ہاں! ان کے اوصاف محکم عقیدہ، قوی ایمان، خدا سے حقیقی عشق، عبادت و اطاعت، کوشش و حرکت اور بندگانِ خدا کی ہر لحاظ سے مدد کرنے کا مجموعہ ہیں۔

پھر بعد والی آیت میں سچے مومنین کے عظیم اور اہم اجر کو بیان کرتا ہے، جو پہلے کی دو آیات میں مذکورہ نشانیوں کے حامل ہیں، ایک ایسی قابلِ توجہ تعبیر کے ساتھ جو ان کے اجر کی حد سے زیادہ اہمیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ فرماتا ہے، "کوئی شخص نہیں جانتا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک میں کیا اہم اجر و ثواب ان کے لیے چھپا رکھے گئے ہیں": (فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین)۔

یہ بڑا عظیم اور بلند تر اجر ہے جو ان کے اعمال کے بدلے میں دیا گیا۔

"کوئی شخص نہیں جانتا" کی تعبیر نیز "قرۃ اعین" (آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا باعث ہے) کی تعبیر ان نعمتوں کی بے حساب عظمت کو بیان کرتی ہیں، خصوصًا جب لفظ "نفس" سیاق نفی میں نکرہ کی شکل میں آیا ہے اور عموم کا معنی دے رہا ہے اور ملائکۂ مقرب اور اولیاء اللہ سمیت تمام نفوس کو شامل ہے۔

"نفس" کی طرف اضافت کے بغیر "قرۃ اعین" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خدا کی نعمتیں جو آخرت کے گھر کے لیے سچے مومنین کے ثواب اور اجر کے طور پر مقرر کی گئی ہیں، اس طرح ہیں کہ ہر ایک کی آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا سبب ہوں گی۔

"قرۃ" مادہ "قر" (بروزن حر) سے ٹھنڈک اور خنکی کے معنی میں ہے اور چونکہ مشہور ہے کہ محبت

اور شوق کے آنسو ہمیشہ ٹھنڈے اور خنک اور غم و حسرت کے آنسو گرم اور سوزاں ہوتے ہیں" قـرۃ اعین" کی تعبیر لُغت عرب میں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو انسان کی آنکھ کے ٹھنڈا ہونے کا سبب ہو۔ یعنی شوق اور محبت کے آنسو اپنی آنکھوں سے جاری کرتا ہے اور یہ انتہائی خوشحالی اور سرور کا لطیف کنایہ ہے۔

لیکن فارسی زبان میں اس قسم کی تعبیر موجود نہیں ہے بلکہ ہم کہتے ہیں، اس کی آنکھ کی روشنی کا سبب ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ فارسی کی یہ تعبیر "یوسف و یعقوب" کی قرآنی داستان سے لی گئی ہو کہ قرآن کے بقول جس وقت بشارت دینے والا یعقوب کے پاس آیا اور یوسف کا پیراہن ان کے چہرے پر رکھا تو ان کی نابینا آنکھیں روشن ہوگئیں۔ (سورۂ یوسف آیت ۹۶)

اور یہ تعبیر بھی زبردست سرور اور خوشی سے کنایہ ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"ان اللہ یقول اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت، ولا اذن سمعت، ولاخطر علی قلب بشر!

"خدا فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے ایسی نعمتیں فراہم کر رکھی ہیں کہ جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سُنا اور نہ ہی کوئی فرد بشر ان کے متعلق سوچ سکتا ہے! [1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، جسے عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں بھی پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آخر یہ عظیم ثواب و اجر کیوں مخفی رکھا گیا ہے؟

اس کے بعد موصوف اس سوال کے تین جواب دیتے ہیں:

۱۔ اہم اور نہایت قیمتی امور اس طرح ہیں کہ لفظوں سے آسانی کے ساتھ ان کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا لہٰذا بسا اوقات ان کا مخفی رکھنا زیادہ فرحت بخش اور فصاحت کی رُو سے زیادہ بلیغ ہے۔

۲۔ اصولی طور پر جو چیز آنکھوں کی ٹھنڈک اور روشنی کا باعث ہو، اس کا دامن اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ انسان کا علم و دانش اس کے تمام خصوصیات تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ چونکہ یہ اجر نماز تہجد کے لیے قرار دیا گیا ہے جو مخفی صورت میں ادا کی جاتی ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اس عمل کی جزا بھی عظیم اور مخفی ہو۔ توجہ رہے کہ گذشتہ آیت میں "تتجافی جنوبھم عن المضاجع" کا جملہ نماز شب کی طرف اشارہ ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"مامن حسنة الا ولها ثواب مبین فی القرآن، الا صلوٰة اللیل، فان

---

[1] اس حدیث کو طبرسی سمیت بہت سے مفسرین نے منجملہ ان کے "طبرسی" نے "مجمع البیان" میں "آلوسی" نے "روح المعانی" میں "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، مشہور محدثین "بخاری" اور "مسلم" نے بھی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

اللہ عز اسمه لم یبین ثوابها لعظم خطرها، قال: فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین".

"کوئی نیک عمل نہیں مگر یہ کہ اس کا واضح ثواب قرآن میں بیان ہوا ہے سوائے نماز تہجد کے۔ خدائے عظیم نے اس کے ثواب کو واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ یہ اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے، اس لیے فرماتا ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کیسے عمدہ ثواب جو آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک کا باعث ہیں، ان کے لیے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔ [1]

لیکن ان تمام چیزوں سے قطع نظر جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے، عالم قیامت ایک ایسا جہان ہے، جو اس جہان کی نسبت حد سے زیادہ وسیع ہے۔ دنیاوی زندگی اس کے مقابلے میں ایسی ہے جس طرح دُنیا کے مقابلے میں شکم مادر میں موجود بچّے کی زندگی، بلکہ وہ عالم اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اور اصولی طور پر ہم جیسے دُنیا کی چار دیواری میں مقید افراد کے لیے اس کے تمام اطراف و جہات قابل درک نہیں ہیں۔ بلکہ کسی کے لیے ابھی قابل تصور بھی نہیں۔

ہم نے صرف اس کے بارے میں بات سُنتے اور دُور سے ایک سایہ کے مانند اسے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب تک اس جہان والا ادراک اور نظر پیدا نہ کریں، اس کی اہمیت کا درک ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ بچّہ کے لیے شکم مادر میں بالفرض کامل عقل و ہوش رکھتا ہو تو اس دنیا کی نعمتوں کا ادراک ناممکن ہے۔

یہی تعبیر شہدائے راہ خدا کے بارے میں آئی ہے کہ جس وقت کوئی شہید زمین پر گرتا ہے تو زمین کہتی ہے، آفرین ہے اسے پاکیزہ رُوح پاکیزہ بدن سے پرواز کر رہی ہے۔ تیرے لیے بشارت اور خوشخبری ہو!" (ان لک مالا عین رأت، ولا اذن سمعت، ولاخطر علی قلب بشر) [2]

بعد والی آیت اس تقابل کو جو گذشتہ آیات میں تھا، زیادہ صراحت کے ساتھ واضح کرتے ہُوئے کہتی ہے: "کیا وہ شخص جو مومن ہے، مثل اس شخص کے ہے جو فاسق ہے؟ نہیں یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں"۔ (افمن کان مؤمنًا کمن کان فاسقًا لا یستوون)۔

یہ جُملہ استفہام انکاری کے طور پر بیان ہُوا ہے، وہ استفہام جس کا جواب ہر انسان کی عقل و فطرت سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے، اس کے باوجود پھر بھی تاکید کے لیے "لا یستوون" کا جُملہ ذکر کیا ہے جو ان کے برابر نہ ہونے کو مزید واضح کرتا ہے۔

اس آیت میں "فاسق"، "مؤمن" کے مقابلہ میں ذکر ہُوا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فسق ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، کہ جو کفر کو بھی شامل ہے اور دوسرے گناہوں کو بھی، کیونکہ یہ لفظ اصل میں "فسقت الثمرۃ" (یعنی پھل

---

[1] "مجمع البیان" محل بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان ذیل آیہ ۱۷۱ آل عمران جلد ۲۔ تفسیر نمونہ جلد ۳ اسی آیت کے ذیل میں۔

اپنے چھلکے سے باہر نکلا یا جب کھجور کی گٹھلی اپنے گودے سے جدا ہوا در باہر جا گرے) سے یہ جملہ لیا گیا ہے۔ پھر خدا اور عقل کے حکم کی اطاعت سے خارج ہونے پر اطلاق ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص کفر اختیار کرتا ہے یا گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ پروردگار اور عقل و خرد کے فرمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پھل جب تک اپنے چھلکے اور خول کے اندر رہتا ہے صحیح و سالم ہے اور جس وقت پوست و چھلکے سے خارج ہو جائے، خراب ہو جاتا ہے، تو اس بنا پر جو بھی انسان فاسق ہوتا ہے، فوراً خراب اور فاسد بھی ہو جاتا ہے۔

عظیم مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ایک دن " ولید بن عقبہ[1] نے حضرت علیؑ سے عرض کیا۔ انا ابسط منك لسانًا واحد منك سنانًا " میں آپ سے زیادہ وسیع و فصیح زبان اور زیادہ تیز نیزہ رکھتا ہوں"! اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں تقریر اور جنگ دونوں میں حضرت سے بڑھا ہوا ہے)۔

حضرت علیؑ نے اس کے جواب میں فرمایا لیس كما تقول یا فاسق " اے فاسق! جیسے تو کہتا ہے ویسا نہیں ہے "۔ (اس طرف اشارہ ہے کہ تو وہی شخص تھا، جس نے قبیلہ" بنی مصطلق" کی زکوٰۃ جمع کرنے کے وقت ان کے اسلام کے خلاف قیام کرنے کا الزام لگایا تھا اور خدا نے سورۂ حجرات کی آیت ۶ (یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا) ..... میں نے تیری تکذیب کی اور تجھے فاسق کہا۔[2]

بعض مفسرین نے یہاں اضافہ کیا ہے کہ آیہ" افمن كان مؤمنًا كمن كان فاسقًا" اس گفتگو کے بعد نازل ہوئی ہے اور" ولید" و" بنی المصطلق" کا واقعہ مدینہ میں رونما ہوا یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ایک مصداق پر تطبیق کے قبیل میں سے ہے۔

لیکن ان بعض مفسرین کے قول کے مطابق، جو اوپر والی آیت کو اور اس کے بعد والی دو آیات کو مدنی سمجھتے ہیں کوئی مشکل باقی نہیں رہ جاتی اور کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ تین آیات اوپر والی گفتگو کے بعد نازل ہوئی ہوں۔

بہر حال نہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کے عمیق ایمان میں کوئی بحث و اختلاف ہے اور نہ ہی" ولید" کے فسق میں جن دو دونوں کی طرف قرآنی آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں اس عدم مساوات اور برابر نہ ہونے کو زیادہ وسیع شکل میں بیان کرتے ہوئے آیا ہے:" باقی رہے وہ جو ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دیا، ان کے لیے بہشت جاوداں کے باغات ہوں گے۔ (اما الذین امنوا وعملوا الصالحات فلهم جنات

---

[1] عقبہ (بروزن عقدہ)۔

[2] اسی روایت کو مرحوم" طبرسی" نے مجمع البیان میں اور" قرطبی" نے اپنی تفسیر میں اور فاضل" برسوی" نے روح البیان میں نقل کیا ہے۔ قابل توجہ یہ کہ کتاب" الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" میں ہے کہ تفسیر قرآن سے آگاہ افراد کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ آیہ ان جاءکم فاسق بنبأ ولید بن عقبہ کے بارے میں قبیلہ بنی مصطلق کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

المأوی)۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ جنات مأوی ان کے انجام شدہ اعمال کے بدلے میں (نزلًا بما كانوا يعملون)۔ خدا کی ان کے لیے مہمانی کا ذریعہ ہیں۔

" نزل" کی تعبیر جو ایسی عمومًا چیز کے لیے بولی جاتی ہے جو مہمان کی خاطر تواضع کے لیے آمادہ کرتے ہیں اور یہ اس بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ مؤمنین کی جنت میں ہمیشہ مہمانوں کی طرح خاطر تواضع کی جاتی رہے گی، جبکہ دوزخی جیسا کہ بعد والی آیت میں آئے گا قیدیوں کی طرح ہیں۔ جس وقت باہر نکلنے کی خواہش کریں گے تو انھیں لوٹا دیا جائے گا۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ کہف کی آیہ ۱۰۲ میں اس طرح آیا ہے (انا اعتدنا جهنم للكافرين نزلًا) " ہم نے جہنم کو کافروں کی خاطر و تواضع کے لیے آمادہ کیا ہے"۔ حقیقت میں (فبشرهم بعذاب اليم) " انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے" کی قسم سے ہے جو کنایہ ہے اس بات سے کہ بجائے پذیرائی (خاطر تواضع) کے سزا و عذاب ملے گا اور بشارت کی کبھی انھیں تہدید کرتا ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ" نزل" وہ پہلی چیز ہے کہ جس سے نئے وارد ہونے والے مہمان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے (ہمارے زمانے میں وہی چائے اور شربت) اس بنا پر یہ امر اس کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ جنات مأوی اپنی تمام نعمات و برکات کے ساتھ ان خدائی مہمانوں کی پذیرائی کا پہلا مرحلہ ہے۔ اور ان نعمات کے بعد ایسے برکات ہیں کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔

" لهم جنات" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ خدا جنت کے باغات عاریۃً انھیں نہیں دیتا، بلکہ ہمیشہ کے لیے ان کی ملکیت میں دے دے گا۔ اس طرح سے کہ کبھی بھی ان نعمتوں کا زوال ان کے فکری سکون کو منتشر نہیں کرے گا۔

اور بعد والی آیت میں ان کے نقطہ مقابل کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے" لیکن وہ لوگ جو فاسق ہو گئے ہیں اور اپنے پروردگار کی اطاعت سے نکل گئے ہیں، ان کے لیے ہمیشہ رہنے کی جگہ جہنم کی آگ ہے"۔ (واما الذين فسقوا فمأواهم النار)۔

وہ ہمیشہ کے لیے اس وحشت ناک جگہ میں مقید اور محبوس ہیں۔ اس طرح سے کہ" جس وقت اس سے نکلنا چاہیں گے انھیں واپس لوٹا دیا جائے گا" (كلما ارادوا ان يخرجوا منها اعيدوا فيها)۔

اور انھیں کہا جائے گا کہ چکھو تم اس کے عذاب کو جس کا ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے" (وقيل لهم ذوقوا عذاب النار الذي كنتم به تكذبون)۔

دوبارہ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ عذاب الٰہی" کفر و تکذیب" کے مقابلہ میں آیا ہے اور اس کا ثواب و جزا" عمل" کے مقابلہ

---

[1] مأوی مادہ" اوی" (بروزن قوی) سے ایک چیز کے دوسرے چیز سے انضمام و مل جانے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مکان و مسکن اور رہائش گاہ کے لیے بولا گیا ہے۔

میں ہے۔

جو اس طرف اشارہ ہے کہ "تنہا" "ایمان" ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ وہ عمل کے لیے سبب بھی بنے۔ لیکن کفر اکیلا عذاب کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ عمل نہ بھی ہو۔

ایک نکتہ

عابد شب زندہ دار: (تتجافی جنوبھم عن المضاجع) "رات کے وقت ان کے پہلو بستر سے دور ہوتے ہیں" کے جملہ کی تفسیر میں روایاتِ اسلامی میں دو تفسیریں وارد ہوئی ہیں۔

ایک تفسیر "نمازِ عشاء" کی جو اس طرف اشارہ ہے کہ سچے مومنین نمازِ مغرب کے بعد اور عشاء سے پہلے بستروں پر نہیں جاتے کہ کہیں انھیں نیند نہ آجائے اور ان کی نمازِ عشاء ہاتھ سے نکل نہ جائے (کیونکہ اس زمانہ میں معمول تھا کہ رات کی ابتدا میں لوگ استراحت کرتے تھے اور پنجگانہ نمازوں کے درمیان استحبابی جدائی کے حکم کے مطابق نمازوں کو جداگانہ پڑھتے اور ہر ایک کو اس کی فضیلت کے وقت میں بجا لاتے تھے) اور جس وقت نمازِ مغرب کے بعد اور وقتِ عشاء سے پہلے سو جاتے تو ممکن ہوتا کہ نمازِ عشاء کے لیے بیدار نہ ہوں۔

اس تفسیر کو "ابن عباس" نے "درمنثور" کے مطابق پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے اور "امالی" "شیخ میں بھی" امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔[1]

لیکن زیادہ تر روایات اور مفسرین کے کلمات میں نمازِ شب اور تہجد کے لیے بستر سے اٹھنے کی تفسیر آئی ہے۔

ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے اس طرح ہم پڑھتے ہیں کہ آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا۔

"الا اخبرک بالاسلام اصلہ وفرعہ وذروۃ سنامہ"

"کیا تجھے اسلام کی اصل و فرع اور بلندترین چوٹی کا تعارف نہ کراؤں؟"

راوی نے عرض کیا قربان جاؤں ارشاد فرمایئے!

تو فرمایا۔

"اما اصلہ الصلٰوۃ وفرعہ الزکٰوۃ وذروۃ سنامہ الجہاد"

"اس کی اصل نماز اس کی فرع زکات اور اس کی بلند چوٹی جہاد ہے۔"

پھر آپ نے مزید فرمایا اگر تم چاہو تو تمام ابوابِ خیر کا تم سے تعارف کراؤں؟

راوی کہتا ہے میں آپ پر قربان جاؤں، ارشاد!

امام نے فرمایا:

---

[1] "درمنثور" اور "امالی شیخ" بحوالہ "تفسیر المیزان" جلد ۱۶ صفحہ ۲۸۳۔

الصوم جنۃ، والصدقۃ تذھب بالخطیئۃ، وقیام الرجل فی جوف اللیل بذکر اللہ، ثم قرأ "تتجافی جنوبھم عن المضاجع"

"روزہ جہنم کی آگ سے سپر اور ڈھال ہے، اور صدقہ گناہ کو مٹا دیتا ہے، اور انسان کا رات کی تاریکی میں اٹھنا اسے یادِ خدا میں ڈالتا ہے، پھر آپ نے "تتجافی جنوبھم عن المضاجع" کی آیت تلاوت فرمائی"۔[1]

تفسیر "مجمع البیان" میں "معاذ بن جبل" سے یوں نقل ہوا ہے کہ میں جنگ "تبوک" میں رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر تھا۔ گرمی نے سب کو پریشان کر رکھا تھا اور ہر شخص کسی نہ کسی کونہ میں پناہ لیے ہوئے تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ پیغمبر سب سے زیادہ میرے قریب ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے اور جہنم کی آگ سے دور رکھے۔

فرمایا تو نے بہت بڑا سوال کیا ہے۔ لیکن اس کا جواب ایسے شخص کے لیے مشکل نہیں، جس پر خدا نے آسان کیا ہو۔ پھر آپ نے مزید فرمایا:

"تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیئًا وتقیم الصلٰوۃ المکتوبۃ وتؤدی الزکٰوۃ المفروضۃ وتصوم شھر رمضان"

"خدا کی پرستش کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو، واجب نمازوں کو بجا لاؤ، واجب زکوٰۃ جو محتاجوں کا حق ہے ادا کرو اور ماہِ رمضان کے روزے رکھو۔"

اس کے بعد آپ نے فرمایا اگر چاہو تو خیرات کے دروازوں کی بھی تمہیں خبر دوں؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ضرور فرمایئے! فرمایا:

"الصوم جنۃ من النار والصدقۃ تکفر الخطیئۃ وقیام الرجل فی جوف اللیل یبتغی وجہ اللہ ثم قرأ ھٰذہ الاٰیۃ تتجافی جنوبھم عن المضاجع"

روزہ جہنم کی آگ سے ڈھال اور راہِ خدا میں خرچ کرنا گناہوں کا کفارہ اور رات کی تاریکی میں انسان کا خدا کی خوشنودی کے لیے قیام۔ پھر آپ نے "تتجافی جنوبھم عن المضاجع" والی آیت کی تلاوت کی۔[2]

اگرچہ کوئی مانع نہیں کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو کہ نمازِ عشاء کے لیے رات کے ابتدائی حصے میں بیدار

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب "دعائم الاسلام" حدیث ۱۵ صفحہ ۲۰ مدرک گذشتہ۔

[2] مجمع البیان ذیل آیات زیربحث و تفسیر نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۲۲۹۔

رہنے کو بھی شامل ہو اور وقت سحر نماز شب کے لیے اُٹھنے کو بھی، لیکن اگر "تتجافیٰ" کے مفہوم پر زیادہ غور کیا جائے تو دوسرا معنی ذہن میں بہتر منعکس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس جُملہ کا ظہور یہ ہے کہ پہلے ان کے پہلو بستر میں آرام وسکون میں ہوتے ہیں۔ پھر اس سے جُدا ہو جاتے ہیں اور یہ رات کے آخر حصّہ میں نماز شب کی ادائیگی کے لیے قیام کرنے کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ اس بنا پر پہلی روایات مفہوم کو وسعت دینے اور خصوصیت کو ختم کرنے کے قبیل سے ہیں۔

اگرچہ اس بابرکت نماز کی اہمیت کے بارے میں وہی اوپر والی چند روایات ہی کافی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اسلامی روایات میں جس قدر اس عبادت کو اہمیت دی گئی ہے، کسی اور عبادت کے بارے میں بہت ہی کم گفتگو ہوئی ہے۔

حق تعالےٰ کے سچے دوست راہ فضیلت کے راہی اس لیے سب ریا عبادت کو ہمیشہ ہی سے بہت زیادہ اہمیت دیتے آرہے ہیں جو دل کو نور اور جلا بخشتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس بابرکت عبادت سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی توفیق نہ رکھتے ہوں۔ لیکن کیا مانع ہے کہ بعض راتوں میں جب بھی یہ توفیق حاصل ہو، اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت جب خاموشی ہر جگہ حکم فرما ہو اور ہر قسم کے کاروبار ٹھپ ہوں، سب سچے عالم خواب میں ہوں اور ماحول حضور قلب اور خدا سے راز و نیاز کے لیے آمادہ ہو تو اٹھیں اور خانۂ خدا کے دروازے پر جائیں اور دل کو دوست کے عشق کے نور سے روشن کریں۔ [1]

---

[1] نماز شب کی اہمیت اور اس کے بجالانے کا طریقہ جلد ۶ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۹، کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں

۲۱- وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

۲۲- وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ۝

ترجمہ

۲۱- ہم انھیں (اس دنیا کا) نزدیکی عذاب (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے۔ شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔

۲۲- اس شخص سے بڑھ کر کون زیادہ ستمگر ہے، جسے اس کے پروردگار کی آیات کی یاد دہانی کرائی گئی ہو، لیکن وہ اس سے اعراض کرے۔ یقیناً ہم مجرمین سے انتقام لیں گے۔

تفسیر

تربیتی اور اصلاحی سزائیں:

گنا ہگاروں اور ان کی دردناک سزاؤں کے بارے میں تو گذشتہ آیات میں بحث ہو چکی ہے۔ موجودہ آیات میں ان کے بارے میں خدا کے ایک مخفی لطف کی طرف اشارہ ہے، جو دُنیا میں خفیف اور بیدار کرنے والی سزاؤں کی صورت میں ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ خدا ہرگز نہیں چاہتا کہ بندہ عذاب جاودانی میں گرفتار ہو۔ لہٰذا بندے کی نجات کے لیے اُسے بیدار کرنے والے ہر قسم کے وسائل کو بروئے کار لاتا ہے۔

. خدا اپنے پیغمبر بھیجتا ہے ، آسمانی کتابیں نازل کرتا ہے ، نعمت دیتا ہے ، مصیبت میں گرفتار کرتا ہے اور اگر ان میں سے کسی چیز سے فائدہ نہ اُٹھائیں تو پھر اس قسم کے اشخاص کا سوائے جہنّم کی آگ کے کوئی اور انجام نہیں ہے۔

فرماتا ہے "ہم انھیں دُنیا کا نزدیکی عذاب آخرت کے عذاب سے پہلے چکھائیں گے ، شاید وہ بیدار ہو کر پلٹ آئیں "
(ولنذیقنّھم من العذاب الادنٰی دون العذاب الاکبر لعلّھم یرجعون)۔

یقیناً "عذابِ ادنیٰ" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو زیادہ تر ان احتمالات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے جنہیں مفسرین نے بطور جداگانہ بیان کیا ہے۔

منجملہ ان کے اس سے مراد مصائب و درد اور رنج و غم ہیں۔

یا مکّہ کا سات سالہ شدید قحط اور خشک سالی ، جس میں مشرکین اس قدر گرفتار ہوئے کہ انھیں مجبوراً مردار لاشے کھانا پڑے یا وہ کاری ضربیں جو ان کے پیکر پر جنگِ "بدر" میں وارد ہوئیں۔

اس قسم کے دوسرے امور۔

باقی رہا وہ جو بعض نے احتمال دیا ہے کہ مراد "عذابِ قبر" یا "رجعت کا عذاب" ہے ۔ وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔ کیونکہ وہ "لعلھم یرجعون " (شاید وہ اپنے اعمال سے پلٹ آئیں) کے جُملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اس دُنیا میں بھی مختلف عذاب ہیں جن کے نزول کے وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ "عذاب استیصال" یعنی وہ عذاب جو سرکش اقوام کی نابودی کے لیے اس وقت نازل ہوتا ہے جب ان میں اصلاح کا کوئی وسیلہ کارگر ثابت نہیں ہوتا اور طبعاً اس قسم کا عذاب بھی آیت کے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔

باقی رہا "عذابِ اکبر" جو قیامت کے دن کا عذاب ہے تو وہ ہر سزا اور عذاب سے بہت بڑا اور زیادہ دردناک ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیوں "ادنیٰ" (زیادہ نزدیک) "اکبر" (زیادہ بڑے) کے مقابلہ میں قرار پایا ہے ۔ حالانکہ یا تو "ادنیٰ" "ابعد" (زیادہ دور) کے مقابلہ میں ہوتا یا "اصغر" "اکبر" کے مقابلہ میں قرار پاتا ؟ اس میں بھی ایک نکتہ مضمر ہے ، جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ دنیاوی عذاب دو اوصاف کا حامل ہوتا ہے "چھوٹا ہونا" اور "نزدیک ہونا" اور تہدید اور تنبیہ کے موقع پر مناسب نہیں ہوتا کہ اس کے چھوٹے پن کو مدّنظر رکھا جائے بلکہ اس کے نزدیک ہونے کو دیکھا جائے گا۔

اور عذابِ آخرت بھی دو اوصاف کا حامل ہوتا ہے "دُور ہونا" اور "بڑا ہونا" اور اس کے بارے میں بھی مناسب یہی ہے کہ اس کے بڑے ہونے کو مدِنظر رکھا جائے تاکہ "دور ہونے" کو (خوب غور کیجئے)

"لعلّھم یرجعون" کے جُملہ میں "لعل" کی تعبیر جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے ، اس بناء پر ہے کہ تنبیہ اور خبردار کرنے والے عذاب بیداری کے لیے علّت تامہ نہیں ہیں بلکہ علّت کی جُزء ہیں اور انھیں سازگار و آمادہ زمین کی ضرورت ہے جو اس شرط کے بغیر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے اور لفظ "لعل" اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً اسی آیت سے مصائب و آلام اور رنج و بلاؤں کا ایک اہم فلسفہ واضح ہو جاتا ہے جو توحید ، خدا شناسی اور عدل پروردگار کی مباحث میں زیادہ سوال انگیز مسائل میں سے ہے۔

نہ صرف بیان بلکہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے منجملہ ان کے سورہ اعراف کی آیت ۹۴ میں ہم پڑھتے ہیں :

"وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الّا اخذنا اھلھا بالبأساء والضرّاء لعلّھم یضرّعون "

"ہم نے کسی شہر اور دیار میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا ، مگر یہ کہ وہاں کے لوگوں کو مشکلات اور نقصِ و زیاں میں مبتلا کیا ہے تاکہ وہ بیدار ہوں اور خدا کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں "

اور چونکہ جس وقت بیدار کرنے والے وسائل میں سے کوئی بھی وسیلہ حتیٰ کہ ابتدائی عذاب بھی سُود مند ثابت نہیں ہوتا ، تو پھر اس گروہ کے ظالم ترین لوگوں سے پروردگار کے انتقام کے علاوہ کوئی راہ باقی نہیں رہ جاتی۔

بعد والی آیت میں اس طرح فرماتا ہے "کون سا شخص زیادہ ستمگر ہے اس شخص سے ، جسے اس کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے اعراض اور روگردانی کرے ؛" (ومن اظلم ممّن ذکّر بِاٰیاتِ ربّہٖ ثمّ اعرض عنھا)۔

"یقیناً ہم ان بے ایمان مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے " (انّا من المجرمین منتقمون)۔

حقیقت میں یہ ایسے لوگ ہیں جن پر نہ خدائی نعمتیں مؤثر ہیں اور نہ اس کا عذاب اور خبردار کرنے والی بلائیں اور مصائب ، اسی بنا پر ان سے زیادہ ظالم کوئی شخص نہیں ہے ۔ لہٰذا اگر ان سے انتقام نہ لیا جائے تو پھر کس سے لیا جائے ؟

ظاہر ہے کہ گذشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہاں "مجرمین" سے مراد مبدء یا معاد کے منکر اور بے ایمان گناہگار ہیں۔

آیاتِ قرآن میں بار بار ایک گروہ کا "اظلم" (سب سے بڑھ کر ظالم افراد) کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے اگرچہ اس کی مختلف تعبیریں ہیں ۔ لیکن واقع میں سب کی سب ایک اصل کی طرف لوٹتی ہیں ، اور وہ ہے کفر و شرک اور بے ایمانی کی جڑ اس بناء پر "ظالم ترین" کا مفہوم جو اصطلاح کے مطابق سب سے بڑھ کر بُری صفت ہے ، وہ مخدوش نہیں ہوتی۔

اوپر والی آیت میں "ثمّ" کی تعبیر جو عام طور پر فاصلہ کو بیان کرنے کے لیے ہے ، ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اس قسم کے افراد کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی موقع اور مہلت دی جاتی ہے۔ کبھی بھی ابتدائی مخالفتیں انتقامِ الٰہی کا سبب نہیں بنتیں ۔ لیکن ضروری فرصت اور مہلت کے ختم ہونے کے بعد خدا کے انتقام کے مستحق ہوں گے۔

ضمناً توجہ کرنا چاہیئے کہ "انتقام" کی تعبیر عربی لُغت کے لحاظ سے "سزا دینے" کے معنی میں ہے۔ اگرچہ "دلی تشفی" (اندرونی تپش کا بُجھانا) اس لفظ کے مفہوم میں روزمرہ کے استعمال کے لحاظ سے اس میں چھپا ہوا ہے لیکن اگر اس کے اصلی اور لغوی معنی کو دیکھا جائے تو اس میں موجود نہیں ہے

اسی لیے قرآن مجید میں یہ تعبیر خداوند عالم کے بارے میں بارہا استعمال ہوئی ہے حالانکہ وہ اس قسم کے مفاہیم سے برتر اور بالاتر ہے۔ وہ صرف حکمت و مصلحت کی بناء پر کام کرتا ہے۔

۲۳- وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○

۲۴- وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۛ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ○

۲۵- اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

ترجمہ

۲۳- ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی اور تجھے شک نہیں ہونا چاہیئے کہ اس نے آیاتِ الٰہی کو حاصل کر لیا۔ اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کا ذریعہ قرار دیا۔

۲۴- اور ان میں سے ہم نے ائمہ (اور پیشوا) منتخب کیے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے۔ اس بناء پر کہ انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔

۲۵- یقیناً تمھارا پروردگار ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ (اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی سزا دے گا)۔

تفسیر

امامت کا اہم ترین سرمایہ :

زیر بحث آیات میں حضرت "موسیٰ" اور "بنی اسرائیل" کی داستان کی طرف ایک مختصر سا اشارہ ہے تاکہ پیغمبر اسلام اور مومنین کی تسلی ہو اور ان کی دلداری کی جائے اور مشرکین کی تکذیب، انکار اور روڑے اٹکانے کے مقابلہ میں جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے، صبر و شکیبائی اور استقامت اور پائداری کی دعوت اور مومنین کے لیے بشارت بھی ہو کہ آخر کار وہ اس کا فراد ہٹ دھرم گروہ پر کامیابی حاصل کریں گے، جس طرح کہ بنی اسرائیل اپنے دشمنوں پر کامیاب ہوئے اور روئے زمین کے پیشوا اور امام و رہبر قرار پائے۔

اور چونکہ موسیٰؑ ایک عظیم پیغمبر ہیں کہ جن پر یہودی بھی ایمان رکھتے ہیں اور عیسائی بھی تو اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن و اسلام کی طرف اہل کتاب کی حرکت کا سبب بنیں۔

پہلے کہتا ہے "ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی" (ولقد اتینا موسی الکتاب)۔

"اس بنا پر آپ اپنے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ و تردد کو نہ آنے دیں کہ موسیٰؑ نے آیات الٰہی کو حاصل کر لیا"؛ (فلا تکن فی مریۃ من لقائہ)۔

"ہم نے موسیٰ کی آسمانی کتاب تورات کو بنی اسرائیل کی ہدایت کا ذریعہ قرار دیا"؛ (وجعلناہ ھدی لبنی اسرائیل)۔

"من لقائہ" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے اور اس سلسلے میں سات یا اس سے زیادہ احتمال دیئے گئے ہیں۔

لیکن جو احتمال سب سے زیادہ نزدیک نظر آتا ہے، یہ ہے کہ کتاب (یعنی تورات) کی طرف لوٹتی ہے اور مفعول کا پہلو رکھتی ہے اور اس کا فاعل موسیٰؑ ہے۔

اس بناء پر سارے جملہ کا معنی یوں ہوگا: "تجھے شک نہیں ہونا چاہیئے کہ موسیٰ علیہ السلام کتاب آسمانی کی لقاء کو پہنچا، اور جو چیز خدا کی بارگاہ سے ان پر القاء ہوئی تھی اسے حاصل کر لیا۔"

اس تفسیر کا ناطق گواہ یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں تین جملے وارد ہوئے ہیں پہلا اور آخری جملہ یقیناً تورات کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس بناء پر مناسب یہی ہے کہ درمیانی جملہ بھی اسی معنی کو بیان کرے نا کہ قیامت یا قرآن مجید کی بات کرے کیونکہ اس صورت میں جملہ معترضہ ہوگا اور ہم جانتے ہیں کہ جملہ معترضہ خلاف ظاہر ہے اور جب تک اس کی ضرورت نہ ہو اس کی طرف نہیں جانا چاہیئے۔

تنہا سوال جو اس تفسیر میں باقی رہ جاتا ہے وہ لفظ "لقاء" کے آسمانی کتاب کے بارے میں استعمال کا مسئلہ ہے، کیونکہ قرآن میں تمام طور پر یہ لفظ "اللہ" یا "رب" یا "آخرت" وغیرہ کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جو قیامت کی طرف اشارہ ہے۔

اور اسی بناء پر بعض مفسرین اس احتمال کو ترجیح دیتے ہیں کہ اوپر والی آیت نے پہلے تو موسیٰ پر تورات کے نزول کو بیان کیا ہے، پھر پیغمبر اسلام کو حکم دیا ہے کہ "لقاء اللہ" اور مسئلہ معاد میں شک و شبہ نہ کریں اور پھر از سر نو مسئلہ تورات کی طرف لوٹتا ہے۔

لیکن یقین جانیئے کہ اس صورت میں اس آیت کے جملوں کے درمیان مناسبت بالکل ختم ہو جائے گی اور ان کا باہمی رابطہ اور تعلق بالکل ختم ہو جائے گا۔

البتہ توجہ رکھنا چاہیئے کہ "لقاء" کا کلمہ اگرچہ قرآن میں کتب آسمانی کو حاصل کرنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا، لیکن "القاء" اور "متلقی" بارہا اس معنی میں استعمال ہوئے ہیں جیساکہ سورۂ قمر کی آیت ۲۵ میں ہم پڑھتے ہیں "ءالقی الذکر علیہ من بیننا" "کیا ہم سب کے درمیان میں سے قرآن مجید پر القاء ہوا ہے؟"

اور سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت سلیمانؑ کا خط ملکہ سبا کو ملا تو اس نے کہا:

"انی القی الی کتاب کریم"

"گرامی قدر خط مجھ پر القاء ہوا ہے۔" (نمل - ۲۹)

اور اسی سورہ کی آیت ۶ میں قرآن مجید کے بارے میں ہے:

"وانک لتلقی القراٰن من لدن حکیم علیم"

"تو قرآن کو خدائے حکیم و علیم سے تلقی کرتا ہے۔" (نمل - ۶)

اس بناء پر فعل "القاء" و "متلقی" بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں تک کہ خود فعل "لقاء" انسان کے نامہ اعمال کے بارے میں قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ اسراء کی آیت ۱۳ میں ہے:

"ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقاہ منشورا" (اسراء - ۱۳)

"قیامت کے دن اس انسان کے لیے ہم کتاب باہر نکالیں گے جسے کھلا ہوا دیکھے گا۔"

مجموعی طور پر جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس سے اس تفسیر کی ترجیح اوپر والی آیت میں دیئے گئے باقی سارے احتمالات پر واضح ہو جاتی ہے۔ [1]

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے "لقائہ" کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام کو سمجھا ہے۔ تو اس قول کی بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: "اے محمد تمہیں شک نہیں ہونا چاہیئے کہ تم موسیٰؑ سے ملاقات کرو گے۔" اور اس کو انھوں نے شب معراج کی موسیٰ سے ملاقات (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لیکن ہر صورت میں اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ پیغمبر اس قسم کے مسائل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اس قسم کی تعبیریں عموماً مقصد کی تائید اور دوسروں کے لیے نمونہ ہوتی ہیں۔

بعد والی آیت میں ان اعزازات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کو استقامت و ایمان کے زیر سایہ نصیب ہوئے تاکہ دوسروں کے لیے درس ہو فرماتا ہے۔" اور ان میں سے ہم نے امام اور پیشوا قرار دیئے کہ جنہوں نے ہمارے فرمان اور حکم سے خلق خدا کی ہدایت کے امور کو اپنے ذمہ لیا کیونکہ انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے"۔ (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا باٰياتنا يوقنون)۔

یہاں پر کامیابی کا راز اور پیشوائی اور امامت کی شرط دو چیزوں کو بیان کرتا ہے۔ ایک آیاتِ الٰہی پر ایمان و یقین اور دوسری صبر و استقامت۔

یہ چیزیں بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام امتوں اور ماضی حال و مستقبل کے مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ اپنے یقین کی بنیادوں کو محکم کریں اور ان مشکلات سے خوف زدہ نہ ہوں جو خطِ توحید بار آور کرنے کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ صبر و استقامت کو اختیار کریں تاکہ تاریخ عالم میں مخلوق کے امام اور امتوں کے رہبر اور رہنما قرار پائیں۔

"یھدون" (ہدایت کرتے ہیں) کی تعبیر فعل مضارع کی شکل میں اور اسی طرح "یوقنون" (یقین رکھتے ہیں) بھی فعل

(گذشتہ صفحہ کا باقی حاشیہ) یا قیامت کے دن کی ملاقات کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ لیکن یہ معنی مفہوم جملہ کے ساتھ مناسب نظر نہیں آتا،

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ

ضمیر کا مرجع "الکتاب" ہے اور اس سے مراد قرآن ہے۔ تو اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:

" اے پیغمبر اس سلسلہ میں کہ قرآن وحی الٰہی ہے شک و شبہ کو اپنے اندر راہ نہ دو۔"

یہ معنی اگرچہ اس سورہ کی ابتدائی آیات کے ساتھ مناسب ہے لیکن دوسرے جملوں کے ساتھ جو خود اس آیت میں ہیں چنداں مناسب نہیں ہے۔ علاوہ ازیں زیر بحث آیت میں "کتاب" تورات کے معنی میں ہے اور ضمیر کی سوئے قرآن بازگشت اس سے ہم آہنگی نہیں رکھتی۔ اور اس معنی کی یہ توجیہ کہ اس سے مراد مطلق آسمانی کتاب ہے، پھر بھی اس کے خلاف ظاہر ہونے میں کمی نہیں کرتی

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ

"لقائہٖ" کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے اور یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ معاد اور قیامت کے معاملہ میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرو۔ یہ معنی بھی اگرچہ گذشتہ آیات کے نامناسب نہیں ہے لیکن خود زیر بحث آیت کے مضمون کے ساتھ تقریباً کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتا۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے یہ جو بعض تفاسیر نے آیت کو موسیٰؑ اور پیغمبر اسلام کے پروگرام کے دو خطوط کے باہمی ربط کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ نیز ایک با ذوق مطلب تو ہے لیکن آیت کے الفاظ کے واقعی مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اہم تر پر واضح ترین تفسیر وہی ہے، جو ہم نے پیش کی ہے۔

مضارع کی صورت میں ان کی تمام عمر میں ان دو اوصاف کے دوام کی دلیل ہے، کیونکہ رہبری کا مسئلہ ایک لمحہ کے لیے بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے اور ہر ہر قدم پر رہبر اور لوگوں کے پیشوا کی ذات نت نئی مشکل سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا اسے چاہیئے کہ یقین اور دائمی استقامت کی قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرے اور امر الٰہی کے خطِ ہدایت کو دوام عطا کرے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مسئلہ ہدایت کو" امر الٰہی" سے مقید کرتے ہوئے فرماتا ہے "یھدون بامرنا" اور امر ہدایت میں اہم یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ خدا کا فرمان ہو نا کہ لوگوں کا اور نہ ہی اپنی خواہش اور دلی تمنا اور نہ ہی ہر کہ و مہ کی تقلید ہو۔

امام جعفر صادقؑ اپنی ایک حدیث میں قرآن مجید کے مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے" ائمہ اور پیشواؤں کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور زمانے میں ایک وہ امام جو امر خدا سے نا کہ لوگوں کے حکم سے ہدایت اپنے ذمہ لیتے ہیں اور امر خدا کو اپنے امر پر مقدم شمار کرتے ہیں۔ اور اس کے حکم کو اپنے حکم سے برتر قرار دیتے ہیں۔

اور دوسرے وہ امام جو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اپنے حکم کو فرمانِ حق پر مقدم کرتے ہیں اور اپنے فرمان کو حکم الٰہی سے پہلے قرار دیتے ہیں اور اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق اور کتاب اللہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔[1]

یہاں امر سے مراد امر تشریعی (خدا کے شرعی احکام ہیں) یا امر تکوینی (عالم آفرینش میں خدا کا حکم) ہے۔ ظاہر آیت میں تو وہی پہلا معنی ہے اور روایات و مفسرین کی تعبیریں بھی اسی معنی کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

لیکن بعض عظیم مفسر اسے "امر تکوینی" کے معنی میں بھی سمجھتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ آیات اور روایات میں ہدایت دو معنی کے لیے آئی ہے۔ "ارائہ طریق" (راستہ دکھانا) "وایصال الی المطلوب" (مقصد تک پہنچانا)۔

خدا کے مقرر کردہ پیشواؤں کی ہدایت بھی دو طریقوں سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ کبھی تو صرف امر و نہی پر قناعت کرتے ہیں اور کبھی لائق اور آمادہ دلوں میں باطنی تاثیر کے ذریعہ انھیں تربیت کے مقاصد اور روحانی درجات تک پہنچاتے ہیں۔

لفظ "امر" بعض قرآنی آیات میں "امر تکوینی" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

" انما امره اذا اراد شیئاً ان یقول له کن فیکون" (سورۂ یٰس آیت ۸۲)

" جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا فرمان صرف یہ ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔"

زیر بحث آیت میں "یھدون بامرنا" کا جملہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ ایسے امام اور پیشوا تھے جو

---

[1] ان الائمة فی کتاب الله عزوجل امامان: قال الله تبارك وتعالى وجعلناهم ائمة يهدون بامرنا، لا بامر الناس يقدمون امر الله قبل امرهم وحكم الله قبل حكمهم قال وجعلناهم ائمة يدعون الى النار يقدمون امرهم قبل امر الله وحكمهم قبل حكم الله ويأخذون باهوائهم خلاف ما فی کتاب الله عزوجل۔ (کافی جلد اول ص۱۶۸ باب ان الائمة فی کتاب الله امامان)

پروردگار کی قدرت سے آمادہ نفوس میں اثر کرتے تھے اور انھیں تربیت کرکے انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقاصد کی طرف لے جاتے ہیں۔[1]

یہ معنی فی نفسہٖ ایک قابلِ توجہ معنی ہے جو امورِ امامت اور فروغِ ہدایت میں سے ایک ہے۔ لیکن "یھدون بامرنا" کے جملہ کو اس معنی میں منحصر سمجھنا ظاہرِ آیت کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم لفظ "امر" کو اس جملہ میں اس لفظ کے وسیع معنی میں لیں۔ جو "امرِ تکوینی" اور "امرِ تشریعی" دونوں کو شامل ہو اور ہدایت کے دونوں معنی آیت میں جمع ہو جائیں۔ یہ معنی بعض ان احادیث کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے کہ جو آیت کی تفسیر میں ہم تک پہنچی ہیں۔

ہر حالت میں امام اور پیشوا کا اس مقام تک پہنچنا صرف یقین و استقامت کے پرتو میں ہی امکان پذیر ہے۔

البتہ جو بحث یہاں باقی رہ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ آیا بنی اسرائیل میں ائمہ اور پیشواؤں سے مراد انبیاء کرام ہیں جو اس قوم میں موجود تھے یا وہ علماء و دانش مند ہیں جو حکمِ الٰہی سے لوگوں کو نیکیوں کی ہدایت کرتے تھے؟

آیت اس بارے میں خاموش ہے۔ وہ صرف اس قدر کہتی ہے کہ ہم نے ان میں ایک جماعت کو امام اور ہادی قرار دیا ہے۔ لیکن "جعلنا" (ہم نے قرار دیا) کے جُملہ کی طرف توجہ کرتے ہُوئے زیادہ قریبی نظر آتا ہے کہ مراد پیغمبر ہیں جو خدا کی طرف سے اس مقام کے لیے منصوب تھے۔

اور چونکہ بنی اسرائیل نے دوسری امتوں کی طرح ان پیشوا ائمہ اور پیشواؤں کے بعد اختلاف شروع کر دیئے مختلف راستے طے کئے اور لوگوں کے درمیان فرقہ بندی کو ہوا دی۔ لہٰذا آخری محلِ بحث آیت میں تہدید آمیز لہجہ میں کہتا ہے "تیرا پروردگار ان کے درمیان قیامت کے دن ان اختلافات کے بارے میں جو اُن کے درمیان تھے، فیصلہ کرے گا۔" اور ہر شخص کو اس کے کیفرِ کردار تک پہنچائے گا۔

(ان ربک ھو یفصل بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

ہمیشہ حق کو "خواہشاتِ نفسانی" کے ساتھ مخلوط کر دینے سے ہی اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا قیامت کے دن تمام خواہشات اور ہوا و ہوس کافور ہو جائیں گی اور حق اپنی اصلی شکل و صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں خدا اپنے فرمان کے ذریعہ تمام اختلافات کو ختم کر دے گا۔ یہ معاد و قیامت کا ایک اور فلسفہ ہے۔ (غور کیجئے گا)

ایک نکتہ:

خدائی رہبروں کا صبر و استقامت: ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ زیرِ بحث آیات میں پیشواؤں اور ائمہ کے لیے دو شرائط ذکر ہوئی ہیں، پہلی صبر و استقامت اور دوسری آیاتِ الٰہی پر ایمان و یقین۔

صبر و استقامت کی بہت زیادہ شاخیں ہیں۔ یہ کبھی تو ان مصائب کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو خود انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔

[1] تفسیر المیزان جلد اوّل صفحہ ۲۷۵۔

کبھی ان رنج و غم اور تکالیف کے مقابلہ میں ہوتا ہے جو انسان کے دوست اور احباب اس کو دیتے ہیں۔

اور کبھی اس کے مقدس مقامات کے بارے میں طعن و تشنیع کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔

کبھی کج فکر اور کج اندیش لوگوں کی طرف سے تکلیف پہنچتی ہے۔

کبھی بدخواہوں کی طرف سے۔

کبھی جاہلوں اور نادانوں کی طرف سے۔

اور کبھی آگاہ اور سمجھدار بدخواہوں کی طرف سے!

خلاصہ یہ کہ ایک آگاہ اور دُور اندیش رہبر کو ان تمام مشکلات وغیرہ کے مقابلہ میں استقامت اختیار کرنا چاہیئے۔ کبھی بھی میدانِ حوادث سے نہ ہٹے، بے تابی اور جزع اور فزع نہ کرے، زمامِ اختیار ہاتھ سے نہ جانے دے، مایوس نہ ہو، اضطراب اور پشیمانی کا مظاہرہ نہ کرے تاکہ وہ اپنے عظیم مقصد تک پہنچ جائے۔

اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک جامع حدیث نقل ہوئی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

آپ نے اپنے ایک صحابی سے ارشاد فرمایا:

"جو شخص صبر کرتا ہے تو اس کا یہ صبر تھوڑی سی مُدت کے لیے ہوتا ہے (اس کے بعد کامیابی ہوتی ہے) اور جو شخص بے تابی کرتا ہے۔ تو اس کی بے تابی بھی مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے (آخر کار شکست ہے)۔"

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"تم پر لازم ہے کہ تمام امور میں صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرو، کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے حضرت محمدؐ کو مبعوث کیا اور انھیں صبر و مدارات کا حکم دیا۔"

اور فرمایا:

"جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کے مقابلہ میں صبر اختیار کرو اور ضرورت کی صورت میں ان سے الگ ہو جاؤ۔ لیکن اس حد تک بھی جدائی ٹھیک نہیں کہ وہ حق کی طرف دعوت دینے سے ہی روک دے۔"

نیز فرمایا:

"نیکیوں کا ہتھیار لے کر برائیوں کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ اس موقع پر جو لوگ تمھارے ساتھ عداوت اور دشمنی رکھتے ہیں صمیمی اور مخلص دوست کی مانند ہو جائیں اور اس مقام پر سوائے صابرین اور ان لوگوں کے اور کوئی نہیں پہنچ سکتا جن کے پاس ایمان کا ایک عظیم حصہ ہے۔"

پھر فرمایا:

"پیغمبرؐ نے صبر و شکیبائی اختیار کی، یہاں تک کہ لوگوں نے ان پر انواع و اقسام کی تہمت کے تیر چلائے (انھیں مجنون اور ساحر کہا، شاعر کہہ کر پکارا اور انھیں دعوتِ نبوت میں جھٹلایا) ان کی باتیں سن کر پیغمبر تنگ آگئے، خدا نے یہ ارشاد ان پر نازل کیا: "ہم جانتے ہیں کہ تمھارا سینہ ان کی باتوں سے تنگ ہو جاتا ہے لیکن تم اپنے

پروردگار کی تسبیح و حمد بجالاؤ اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (کیونکہ یہی عبادتیں تمھیں آرام و سکون بخشیں گی)۔

دوبارہ انھوں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کو متہم کیا تو آنجناب غمگین ہوئے تو خدا نے ان پر یہ ارشاد نازل کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں آپ کو غمگین کرتی ہیں۔ لیکن آپ جان لیں کہ ان کا مقصد آپ کو غمگین کرنا نہیں بلکہ یہ ظالم تو آیاتِ خدا کی تکذیب کرتے ہیں۔ آپ سے پہلے جو پیغمبر آئے تھے وہ بھی ان کی تکذیب کی آماجگاہ تھے لیکن انھوں نے صبر کیا۔ انھیں آزار دیا گیا۔ مگر انھوں نے صبر کیا یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد و نصرت آ پہنچی۔ پیغمبر نے پھر بھی صبر کیا۔ یہاں تک کہ وہ حد سے گزر گئے اور خدا کا نام بھی بُرے الفاظ کے ساتھ زبان پر جاری کیا اور تکذیب کی۔

پیغمبرِ اکرمؐ نے عرض کیا۔ خداوندا میں نے اپنے بارے میں، اپنے خاندان اور عزت و آبرو کے بارے میں صبر اختیار کیا لیکن تیرے مقامِ مقدس کے بارے میں بدزبانی پر صبر نہیں کر سکتا۔ پھر بھی خدا نے انھیں صبر کا حکم دیا اور فرمایا: "جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو"۔

پھر مزید کہتا ہے کہ اس کے بعد وہ پیغمبرؐ تمام حالات میں اور تمام مشکلات کے مقابلے میں صابر و شکیبا تھے، یہی وجہ ہے کہ یہاں انھیں بشارت دیتا ہے کہ تمھارے خاندان میں ائمہ اور پیشوا پیدا ہوں گے اور ان ائمہ کو بھی صبر کی وصیت کی۔ اسی موقع کے لیے پیغمبرؐ نے فرمایا:

"الصبر من الایمان کالرأس من الجسد"

"صبر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہوتی ہے۔"

اور آخرِ کار آپ کا یہی صبر و استقلال مشرکین پر آپ کی کامیابی کا سبب بنا اور ان ستم گاروں سے انتقام لینے کا حکم صادر ہوا جو قابلِ ہدایت نہیں تھے۔ اور ان کی زندگی کا روزنامچہ پیغمبرؐ اور ان کے رفقائے کار کے ہاتھوں لپیٹ دیا گیا۔ یہ تو دنیا میں ان کے صبر کی جزا تھی لیکن آخرت کا جو ثواب و جزا آپ کے لیے ذخیرہ کیا گیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔

پھر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"فمن صبر و احتسب لم یخرج من الدنیا حتی یقر اللّٰہ عینًا فی اعدائہ مع ما یدخرلہ فی الاٰخرۃ"

جو شخص صبر کرے اور اس صبر کو خدا کے کھاتے میں ڈال دے وہ دنیا سے اس وقت تک خارج نہیں ہوگا جب تک خداوندِ عالم اس کی آنکھوں کو اس کے دشمنوں کی شکست کے ذریعہ ٹھنڈا نہیں کر دیتا۔ لیکن آخرت کا وہ اجر اس کے علاوہ ہے جو اس کے لیے ذخیرہ کیا جا چکا ہے۔[1]

---

[1] "اصولِ کافی" جلد ۲ ص [illegible]، باب الصبر (خلاصہ کے ساتھ)۔

۲۶۔ اَوَلَمۡ یَہۡدِ لَہُمۡ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ ؕ اَفَلَا یَسۡمَعُوۡنَ ○

۲۷۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَی الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِہٖ زَرۡعًا تَاۡکُلُ مِنۡہُ اَنۡعَامُہُمۡ وَ اَنۡفُسُہُمۡ ؕ اَفَلَا یُبۡصِرُوۡنَ ○

۲۸۔ وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ○

۲۹۔ قُلۡ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُہُمۡ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ○

۳۰۔ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ انۡتَظِرۡ اِنَّہُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ ○ ع

ترجمہ

۲۶۔ کیا ان کی ہدایت کے لیے یہی کافی نہیں کہ ہم نے بہت سے افراد کو ہلاک کر دیا ہے، جو ان سے صدیوں پہلے گزر چکے ہیں؟ یہ ان کے (ویران شدہ) گھروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ اس میں (خدا کی قدرت اور اس کے دردناک عذاب کی نشانیاں ہیں) کیا وہ سنتے نہیں؟

۲۷۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک زمینوں کی طرف چلاتے

ہیں اور اس کے ذریعہ زراعتیں اگاتے ہیں کہ جن سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی۔ کیا وہ دیکھتے نہیں ؟

۲۸۔ اور وہ کہتے ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ تمھاری کامیابی اور فتح کب ہوگی۔

۲۹۔ کہہ دے کامیابی کے دن ایمان لانا کافروں کے لیے سودمند نہیں ہوگا اور انھیں کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی !

۳۰۔ اب جبکہ ایسا ہی ہے تو ان سے مُنہ پھیرلے اور منتظر رہ ، وہ بھی منتظر ہیں۔ (تو رحمت خدا کا منتظر رہ اور وہ اس کے عذاب کے منتظر رہیں)۔

تفسیر

ہماری کامیابی کا دن :

گذشتہ آیات میں بے ایمان مجرمین کی تنبیہ موجود تھی اور زیر بحث پہلی آیت بھی اسی تنبیہ کی تشریح اور تکمیل کے طور پر ہے فرماتا ہے۔ "کیا یہی بات ان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے کہ لوگوں میں سے بہت سے افراد جو ان سے صدیوں پہلے زندگی بسر کرتے تھے، ہم نے انھیں ہلاک کیا اور انھیں ان کے اعمال کی سزا دی" (اولم یھد لھم کم اھلکنا من قبلھم من القرون)[1]

"یہ ان کے ویران شدہ گھروں میں چلتے پھرتے ہیں" اور ان نفرین شدہ اقوام کے آثار اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں: (یمشون فی مساکنھم)[2]

---

[1] "لم یھد" کا فاعل ایک مفہوم ہے جو "کم اھلکنا من قبلھم" کے جملے سے سمجھا جاتا ہے۔ تقدیر یوں ہے "اولم یھدلھم کثرة من اھلکنا"۔

[2] اکثر مفسرین اس آیت کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، جس طرح ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "یمشون" کا جملہ ہلاک ہونے والوں کی حالت بیان کر رہا ہے یعنی ان کی حالت یہ تھی کہ وہ عذاب الٰہی سے پوری طرح بے خبر تھے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"عاد" "ثمود" کی عذاب میں مبتلا سرزمین اور "قوم لوط" کے ویران شدہ شہر شام کی طرف جاتے ہوئے ان کے راستوں میں موجود ہیں - جس وقت ان سرزمینوں سے گزرتے ہیں۔ جو ایک دن قدرتمند لیکن گمراہ آلودۂ گناہ اقوام کا مرکز تھیں۔ جتنا پیغمبر و انبیاء انھیں خبردار کرتے، اس کا کوئی اثر نہ ہوتا اور آخر کار عذاب الٰہی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ تو گویا بیابان کا ایک ایک سنگریزہ اور ان کے ویران شدہ قصور و محلات زبان حال کے ساتھ پکار پکار کر ان کی کفر آلود زندگی کا انجام بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مکمل طور پر اپنے کان کھو بیٹھے ہیں جو سن نہیں پاتے۔

اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے "اس موضوع میں قدرت خدا کی نشانیاں اور عبرت کے درس ہیں۔ کیا وہ سنتے نہیں ہیں ؟" (ان فی ذالک لاٰیات۔ فلا یسمعون)۔

بعد والی آیت میں ایک اہم ترین نعمت الٰہی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تمام زمینوں کی آبادی کا سبب اور تمام زندہ موجودات کی حیات کا ذریعہ ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ جس طرح خدا گنہگار لوگوں کی زمینوں کے ویران کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح ویران اور مُردہ زمینوں کے آباد کرنے اور اپنے بندوں کو ہر قسم کی نعمت و بخشش عطا کرنے پر بھی قادر ہے۔

فرماتا ہے "کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک اور بے آب و گیاہ زمینوں کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ فصلیں اگاتے ہیں کہ جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی غذا حاصل کرتے ہیں۔ کیا وہ دیکھتے نہیں ؟" (اولم یروا انّا نسوق الماء الی الارض الجرز فنخرج بہ زرعًا تأکل منہ انعامھم وانفسھم افلا یبصرون)۔

"جُرز" (بروزن "شتر") اس زمین کو کہتے ہیں جس سے ہر قسم کے سبزہ کی بیخ کنی کی جا چکی ہو یا بالفاظ دیگر جس میں کسی قسم کی گھاس پھونس نہ اگ سکے اور یہ دراصل "جرز" (بروزن "مرض") کے مادہ سے قطع کرنے یا کاٹ دینے کے معنی میں ہے۔

گویا ہر قسم کی گھاس اس سرزمین سے کاٹ دی گئی ہے یا خود زمین نے اس سبزے کو کاٹ دیا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں "نسوق الماء" (ہم پانی کو چلاتے ہیں) کی تعبیر بیان ہوئی ہے۔ جو اس طرف اشارہ ہے کہ پانی کی طبیعت اور اس کا مزاج اپنی سنگینی کی بنا پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ زمین کے اوپر اور گڑھوں میں موجود ہو اور اس کے سیال ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اسے زمین کی گہرائیوں کے اندر ہونا چاہیئے۔ لیکن جس وقت اسے ہمارا فرمان پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنی طبیعت کو چھوڑ کر ہلکے بخارمیں تبدیل ہو کر ہوا کے چلنے سے ہر طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔

جی ہاں یہی بادل جو آسمان کی بلندی میں ہیں درحقیقت میٹھے پانی کے عظیم سمندر ہیں۔ جو حکم خدا کے مطابق ہواؤں کی مدد سے خشک زمینوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔

سچ مچ اگر بارش نہ ہوتی تو بہت سی زمینیں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیکھ پاتیں۔ حتیٰ کہ اگر بالفرض دریا اور ندی نالے پانی سے

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) اور اپنے گھروں میں چل پھر رہے تھے کہ اچانک عذاب الٰہی آپہنچا اور انھیں ہلاک کر دیا۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

تو کوئی چیز تمہارے لیے باقی نہیں رہے گی۔

آخرکار اس سورہ (سورۂ سجدہ) کی آخری آیت کے ساتھ ناطق اور معنی خیز تہدید کے ذریعہ سورہ کو ختم کرتے ہُوئے کہتا ہے۔

"اسے پیغمبر! اب جبکہ ایسا ہے۔ ان سے مُنہ پھیر لو اور تم بھی منتظر رہو اور وہ بھی منتظر رہیں؛" (فاعرض عنهم وانتظر انهم منتظرون)۔

اب جبکہ نہ تو بشارت انہیں اثر کرتی ہے اور نہ انذار (ڈرانا) اور نہ ہی وہ اہلِ منطق و استدلال ہیں تاکہ وسیع عالم خلقت میں آثارِ الٰہی کے مشاہدہ کرنے سے اسے پہچانیں اور اس کے غیر کی پرستش ترک کردیں۔ اور نہ ہی بیدار ضمیر رکھتے ہیں کہ اپنی جان کے اندر سے بلند ہونے والے نغمۂ توحید پر کان دھریں۔ لہٰذا ان سے روگردانی کر کے مُنہ پھیر لیجئے اور اپنے خدا کی رحمت کے منتظر رہیئے اور وہ اس کے عذاب کے منتظر رہیں۔ کیونکہ وہ صرف عذاب کے لائق ہیں۔

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو حق کی اوّلین نشانی کو دیکھ کر اس کے سامنے جُھک جاتے اور ایمان لے آتے ہیں۔

بارالٰہا! تکبر، غرور، سرکشی اور ہٹ دھرمی کی رُوح ہم سب سے دور فرما۔

خداوند! کفر و استکبار اور استعمار کے لشکروں پر لشکرِ اسلام کو مکمل کامیابی جلد سے جلد عطا فرما۔

سورۂ سجدہ کا اختتام

۲ محرم الحرام ۱۴۰۴ – ۱۸ مہر ماہ ۱۳۶۲

سورۂ احزاب

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی

اور

۷۳ آیات پر مشتمل ہے

سورۂ احزاب
کی
وجہ تسمیہ اور فضیلت

یہ سورہ باتفاق علمائے اسلام مدینہ میں نازل ہوا اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی کل ۷۳ آیات ہیں اور چونکہ اس سورہ کا اہم حصہ جنگ احزاب (خندق) کے واقعہ کو بیان کرتا ہے، اس لیے اس کا یہ نام انتخاب ہوا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں کافی ہے کہ پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

"من قرء سورة الاحزاب وعلمها اهله ...... اعطی الامان من عذاب القبر"

"جو شخص سورۂ احزاب کی تلاوت کرے اور اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دے تو وہ عذاب قبر سے مامون رہے گا۔" [1]

اور امام صادقؑ سے بھی منقول ہے:

"من کان کثیر القرائة لسورة الاحزاب کان یوم القیامة فی جوار محمد (ص) واله وازواجه"

"جو شخص سورۂ احزاب کی زیادہ تلاوت کرتا ہے قیامت کے دن پیغمبر اکرم اور ان کے خاندان والوں کے جوار میں رہے گا۔" [2]

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کے فضائل اور اعزازات صرف بے روح اور ہر قسم کے فکر اور عمل سے عاری تلاوت کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتے۔ ایسی تلاوت کی ضرورت ہے جو غور و فکر کا مرکز ہو اور ایسا غور و خوض جو فکر انسانی کے افق کو اس طرح منور اور روشن کر دے کہ اس کا پرتو اس کے اعمال میں ظاہر ہو۔

[1] "مجمع البیان" جلد ۸ صفحہ ۳۳۴ (ابتداء سورۂ احزاب)۔
[2] "مجمع البیان" جلد ۸ صفحہ ۳۳۴ (ابتداء سورۂ احزاب)۔

سورۂ احزاب کے مندرجات:

یہ سورہ قرآن مجید کی عظیم سورتوں میں سے ایک ہے اور اسلامی اصول و فروع کے سلسلہ میں مختلف النوع اور بہت سے اہم مسائل کا تذکرہ کرتا ہے۔

جو بحثیں اس سورہ میں آئی ہیں انہیں سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ

سب سے پہلے پیغمبر [illegible] کو خدا کی اطاعت کرنے اور کفار کی پیروی اور منافقین کی پیش کشوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے اور [illegible] کہ وہ ان کی تخریب کاریوں کے مقابلہ میں اس کی حمایت فرمائے گا۔

دوسرا حصہ

زمانہ جاہلیت کے کچھ خرافات مثلاً ظہار کا مسئلہ جیسے طلاق اور عورت و مرد کے لیے ایک دوسرے سے جدائی کا [illegible] "منہ بولے بیٹے" کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس پر خط تنسیخ کھینچتا ہے اور [illegible] کے رشتوں کو حقیقی اور فطری رشتوں تک محدود کرتا ہے۔

تیسرا حصہ

جو اس سورہ کا اہم ترین حصہ ہے، جنگ احزاب اور اس کے ہلا دینے والے حوادث، مسلمانوں کی کفار پر معجزانہ فتح و کامرانی، منافقین کی تخریب کاری اور گوناں گوں بہانہ تراشی اور ان کی عہد شکنی سے تعلق رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں نہایت ہی جامع اور جاذب نظر دستور اور احکام بیان ہوئے ہیں۔

چوتھا حصہ

[illegible] اکرم سے متعلق ہے [illegible] مسلمانوں [illegible] اسوۂ حسنہ اور نمونہ عمل ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں قرآن انتہائی اہم دستور اور فرمان جاری کرتا ہے۔

پانچواں حصّہ

میں "زینب بنت جحش" کی داستان ہے جو ایک زمانہ تک پیغمبر کے مُنہ بولے بیٹے "زید" کی بیوی تھیں۔ پھر ان سے الگ ہوگئیں اور حکم خدا کے تحت پیغمبر سے ان کا عقد ہوا اور منافقین کے لیے دستاویز بن گئی کہ قرآن اس سلسلہ میں بہانہ جو افراد کو قاطع جواب دیتا ہے۔

چھٹا حصّہ

مسئلہ حجاب کی بات کرتا ہے، جس کا گذشتہ پانچ حصّوں سے بھی قریبی رابطہ ہے اور تمام صاحب ایمان عورتوں کو اس اسلامی دستور کی پابندی کی تلقین کرتا ہے۔

ساتواں حصّہ

اور آخری حصّہ "معاد" جیسے اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس عرصۂ عظیم میں راہِ نجات اور اسی طرح عظیم انسانی امانت یعنی اس کی ذمہ داری، فرائض کی بجا آوری اور ذمہ داری کی تشریح کرتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ

۲۔ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ

۳۔ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝

ترجمہ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمان اور رحیم ہے

۱۔ اے پیغمبرؐ! تقوٰے اختیار کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ خدا عالم اور حکیم ہے۔

۲۔ اور جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھیں وحی ہوتی ہے، اس کی پیروی کرو کیونکہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے۔

۳۔ اور خدا پر توکل کرو اور یہی کافی ہے۔ خدا انسان کا محافظ اور دفاع کرنے والا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے یہاں مختلف شانِ نزول نقل کیے ہیں جو تقریباً ایک ہی موضوع پر دلالت کرتے ہیں۔ منجملہ

ان کے انھوں نے کہا ہے کہ یہ آیات "ابوسفیان" اور بعض دوسرے کفر و شرک کے سرغنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

وہ جنگ "احد" کے بعد پیغمبر اسلام سے امان پا کر مدینہ میں داخل ہوئے اور "عبداللہ بن ابی" اور ان کے کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا محمد! اپنے اور ہمارے خداؤں [illegible] لات و عزّیٰ و منات نامی بتوں کو برا بھلا کہنے سے [illegible] ہاتھ اٹھا لیجئے اور کہیئے کہ وہ اپنے پرستش کرنے والوں کی شفاعت [illegible] کریں گے تاکہ ہم بھی آپ سے لڑائی جھگڑے سے دستبردار ہو جائیں۔ پھر جو کچھ آپ اپنے خدا کی تعریف و توصیف [illegible] کریں، آپ آزاد ہیں۔"

اس پیش کش سے پیغمبر اکرم [illegible] سخت [illegible] ہوئے [illegible] کہ مجھے اجازت دیجئے تاکہ [illegible] پیغمبر نے فرمایا "میں نے انھیں امان دی ہے [illegible] کوئی چیز ممکن نہیں [illegible] آپ نے حکم دیا [illegible] جائے تو [illegible]

تفسیر

صرف وحی الٰہی کی پیروی کریں!

خطرناک لغزشیں جو پیغمبروں کے [illegible] پائی ہیں، مخالفین کی طرف سے سودے بازی [illegible] کرتی ہیں اور ایسے ہی موقع پر [illegible] سے خطرے [illegible] پیش ہوتے رہتے ہیں اور دشمن [illegible] کرتا ہے کہ انھیں [illegible] راست [illegible] اور [illegible] کے لیے آئینہ [illegible] ہوتی ہے۔

"مشرکین مکہ" اور "منافقین مدینہ" نے بار ہا کوشش کی کہ سودے بازی پر مبنی پیش کشوں کے ذریعہ پیغمبر اسلام کو خط توحید سے منحرف کر دیں، منجملہ ان کے وہی پیش کش ہے جو اوپر شان نزول میں ذکر ہو چکی ہے۔

لیکن سورۂ احزاب کی پہلی آیات نے نازل ہو کر ان کی سازش کو ختم کر دیا اور اس پر پانی پھیر دیا، اور پیغمبر کو دو ٹوک انداز میں خط توحید کی روش پر کسی قسم کی سودے بازی کے بغیر جاری رکھنے کا حکم دیا۔

یہ آیات مجموعی طور پر پیغمبر اکرم کو چار اہم حکم دیتی ہیں۔

پہلا حکم: تقویٰ اور پرہیزگاری کے سلسلہ میں ہے جو دوسرے تمام پروگراموں کے لیے بنیادی [illegible] ہے۔ فرماتا ہے "اے پیغمبر! تقویٰ اختیار کرو" (یا ایھا النبی اتق اللہ)۔

"تقویٰ" درحقیقت [illegible] باطنی ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس ہے [illegible]

ا۔ مجمع البیان [illegible]

جو انسان کسی بھی اصلاحی پروگرام کے لیے حرکت نہیں کرتا۔

"تقویٰ" ہدایت اور آیاتِ الٰہی سے بہرہ ور ہونے اور فائدہ اُٹھانے پر آمادہ کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں "ھدًی للمتقین" یہ قرآن پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ تقویٰ کا آخری اور حقیقی مرحلہ ایمان اور احکام خداوندی پر عمل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا پہلا مرحلہ ان تمام مسائل سے پہلے قرار پاتا ہے کیونکہ انسان اگر اپنے اندر ذمہ داری کا احساس نہ کرے تو نہ پیغمبروں کی دعوت کی تحقیق کرنے کی زحمت کرتا ہے اور نہ ہی ان کی باتوں پر کان دھرتا ہے یہاں تک کہ "دفع ضرر محتمل" کا مسئلہ جسے علماء علم کلام و عقائد نے معرفتِ الٰہی کے لیے کوشش کی بنیاد کے طور پر ذکر کیا ہے، حقیقت میں تقویٰ کی ایک شاخ ہے۔

دوسرا حکم: کفار و منافقین کی اطاعت کی نفی ہے، خدا فرماتا ہے "کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو" (ولا تطع الکافرین والمنافقین)۔

اس آیت کے آخر میں اس موضوع کی تاکید کے لیے کہتا ہے "خدا عالم اور حکیم ہے" (ان اللہ کان علیمًا حکیمًا)۔

اگر وہ آپ کو ان کی پیروی ترک کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ اس کے لا متناہی علم و حکمت کی بناء پر ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان کی اس اطاعت اور سودے بازی میں کیا کیا دردناک مصائب اور کیسے کیسے بے شمار مفاسد پنہاں ہیں۔

بہرحال تقویٰ اور احساس ذمہ داری کے بعد پہلا فریضہ صفحۂ قلب کو غیر خدا کی محبت سے صاف اور پاک کرنا ہے اور اس سرزمین سے مزاحمت کرنے والے کانٹوں کی بیخ کنی کرنا ہے۔

تیسرے حکم میں عقیدۂ توحید کی تخم ریزی اور وحی الٰہی کی اتباع کرنے کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کرو" (واتبع ما یوحٰی الیک من ربک)۔

اور اچھی طرح خبردار رہو کہ "جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے" (ان اللہ کان بما تعملون خبیرًا)۔

اس بناء پر پہلے عفریت کو دل و جان سے نکالیں تاکہ اس میں فرشتہ آسکے۔ کانٹوں کو ختم کریں تاکہ پھولوں کی تخم ریزی ہو سکے۔

طاغوت کو دور کر کے اس سے خود کو پاک کرنا چاہیئے تاکہ اللہ کی حکومت اور نظامِ الٰہی اس کی جگہ لے سکے۔

اور چونکہ اس راہ پر چلنے کے لیے مصائب و مشکلات بہت زیادہ ہیں، سازشوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر روڑے اٹکائے جاتے ہیں، لہٰذا چوتھے حکم کو اس شکل میں صادر کرتا ہے۔ "خدا پر توکل کرو اور ان لوگوں کی سازشوں سے نہ ڈرو" (وتوکل علی اللہ)۔

"اور یہی کافی ہے کہ خدا انسان کا ولی و محافظ اور مدافع و حامی ہے" (وکفٰی باللہ وکیلًا)۔

اگر ہزار دشمن بھی آپ کو شہید کرنے کا ارادہ کر لیں، لیکن چونکہ میں آپ کا دوست اور یاور ہوں لہٰذا دشمنوں سے کبھی ہراساں نہ ہوں۔

اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبرؐ کی ذات ہے، لیکن واضح ہے کہ یہ تمام مومنین اور تمام عالم اسلام کے لیے یکساں حکم ہے۔ یہ ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے نجات بخش نسخہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے "یا ایھا" کا خطاب ان موارد کے ساتھ مخصوص ہے جہاں مقصد سب لوگوں کی توجہ کو کسی مطلب کی طرف مبذول کرنا ہو اگرچہ مخاطب ایک ہی شخص ہو بخلاف "یا" کے خطاب کے جس کا عام طور پر اطلاق ایسے موارد میں ہوتا ہے، جہاں مراد مخاطب کی ذات ہوتی ہے۔[1]

اور چونکہ زیر بحث آیات میں "یا ایھا" سے خطاب شروع ہوا ہے لہٰذا ان آیات کے مقصد کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔

عمومیت (سب) کے لیے ہونے کا ایک اور شاہد یہ ہے کہ "ان اللہ کان بما تعملون خبیرًا" کا جملہ جمع کی صورت میں آیا ہے یعنی "خدا تم سب کے اعمال سے آگاہ ہے۔" اگر صرف پیغمبر مخاطب ہوتے تو کہا جاتا کہ خدا تیرے عمل سے آگاہ ہے۔ (غور کیجئے گا)

کچھ کہے بغیر واضح ہے کہ پیغمبر کو یہ حکم دینے کا مقصد یہ نہیں کہ آنجناب تقویٰ کے بارے میں یا کفار و منافقین کی اطاعت ترک کرنے کے مسئلہ میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام لیتے تھے۔ بلکہ اس قسم کے احکام جہاں ایک طرف پیغمبر کے وظائف اور ذمہ داریوں کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ وہاں پر تمام مومنین کے لیے درس بھی ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۵ صفحہ ۱۹۱ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۴۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○

۵۔ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

۶۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○

ترجمہ

۴۔ خدا نے کسی شخص کے لیے دو دل اس کے وجود میں خلق نہیں کیے اور اس نے ہرگز تمھاری بیویوں کو جنہیں تم محل "ظہار" قرار دیتے ہو، تمھاری مائیں قرار نہیں دیا اور (نیز) تمھارے منہ بولے بیٹوں کو بھی حقیقی بیٹا قرار نہیں دیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جو تم صرف اپنی زبان سے کہتے ہو (جھوٹ اور بغیر ثبوت کے بات ہے) لیکن خدا حق بات کرتا ہے اور راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔

۵۔ انھیں ان کے باپوں کے نام کے ساتھ پکارا کرو، کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک زیادہ صاف ہے اور اگر تم ان کے باپوں کو نہیں پہچانتے تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں اور تمھارے موالی (دوست) ہیں، لیکن تم پر ان خطاؤں میں کوئی گناہ نہیں (جو ایسے موقع پر) تم سے سرزد ہوتی ہیں (اور بغیر توجہ کے تم دوسروں کے نام سے انھیں پکارتے ہو) لیکن جو کچھ تم جان بوجھ کر کہتے ہو (اس کا ضرور حساب لے گا) اور خدا غفور و رحیم ہے۔

۶۔ پیغمبر مؤمنین کی نسبت خود ان سے اولیٰ ہیں اور پیغمبر کی بیویاں ان (مؤمنین) کی مائیں شمار ہوتی ہیں اور رشتہ دار مومنین اور مہاجرین میں سے جو چیز خدا نے مقرر کی ہے، اس میں سے ہر ایک دوسرے سے اولیٰ نہیں، لیکن اگر تم چاہو کہ اپنے دوستوں کی نسبت نیکی کرو (اور اپنے اموال کا ایک

حصہ انھیں دے دو تو) یہ حکم، کتاب خدا میں لکھا ہؤا ہے۔

تفسیر

فضول دعوے:

گذشتہ آیات کے بعد جو پیغمبر کو حکم دیتی تھیں کہ صرف وحی الٰہی کی اتباع کریں، نہ کہ کفار و منافقین کی۔ تو زیر بحث آیات ہیں ان کی پیروی کے نتیجہ کو بیان کرتا ہے۔ ان کی پیروی انسان کو بڑی حد تک خرافات، باطل اور بے ہودگی کی دعوت دیتی ہے۔ جن میں سے تین موارد تو پہلی زیر بحث آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

ابتدا میں فرماتا ہے "خدا نے کسی شخص کے لیے بھی دو دل اس کے وجود میں قرار نہیں دیئے": ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ)۔

مفسرین کی ایک جماعت نے آیت کے اس حصہ کے شان نزول میں لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں "جمیل بن معمر" نامی ایک شخص تھا جو بلا کا حافظہ رکھتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ میرے اندر "دو دل" ہیں جن میں سے ہر ایک سے محمد کی نسبت بہتر سمجھ رکھتا ہے۔ اس لیے مشرکین قریش اسے "ذوالقلبین" (دو دل رکھنے والے) کا نام دیتے تھے۔

جنگ بدر کے دن جب مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے تو جمیل بن معمر بھی ان کے درمیان تھا۔ ابوسفیان نے اسے اس حالت میں دیکھا کہ اس کا ایک جوتا اس کے پاؤں میں تھا اور دوسرا ہاتھ میں لے کر بھاگ رہا تھا تو ابوسفیان نے اس سے کہا کیا بات ہے؟ اس نے کہا لشکر بھاگ گیا ہے۔ ابوسفیان نے پوچھا، پھر ایک جوتا ہاتھ میں اور دوسرا پاؤں میں کیوں کیے ہو؟ اس نے کہا سچ مچ میں تو اس طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ سمجھتا تھا کہ دونوں جوتے میرے پاؤں میں ہیں (معلوم ہوتا ہے کہ ان سب دعووں کے باوجود اس طرح اپنے ہاتھ پاؤں گم کر چکا تھا کہ ایک دل کی مقدار بھی کوئی چیز نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ ایسے مواقع پر دل سے مراد عقل ہوتی ہے)[1]

بہرحال کفار و منافقین کی پیروی اور وحی الٰہی کی اتباع کو ترک کرنا انسان کو اس قسم کے بے ہودہ اور فضول مطالب کی طرف دعوت دیتا ہے۔

لیکن اس سے قطع نظر اس جملہ کا ایک نہایت ہی عمیق اور گہرا معنی بھی ہے اور یہ کہ انسان ایک سے زیادہ دل نہیں رکھتا اور یہ دل ایک معبود کے عشق کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ لوگ جو شرک اور متعدد معبودوں کی دعوت دیتے ہیں ان کے متعدد

---

[1] "مجمع البیان" ذیل آیہ محل بحث اور "تفسیر قرطبی"۔

دل ہونے چاہئیں تاکہ ہر ایک کو ایک معبود کے عشق کا مرکز بنائیں۔

اصولی طور پر انسان کی شخصیت ایک صحیح و سالم واحد انسانی شخصیت ہے اور اس کی فکری لائن بھی ایک ہے۔ تنہائی اور اجتماع میں ظاہر و باطن میں اندر و باہر میں فکر و عمل میں غرض کہ سب میں ایک ہے اور اُسے ایسا ہونا چاہیئے۔ ہر قسم کا نفاق و دو گانگی انسان کے وجود پر ایک مسلط شدہ امر ہے اور اس کی طبیعت اور مزاج کے بالکل خلاف ہے۔

چونکہ انسان ایک سے زیادہ دل نہیں رکھتا لہٰذا اسے چاہیئے کہ اس کی مہر و محبت کا مرکز بھی ایک ہو اور ایک ہی قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔

ایک ہی معشوق و محبُوب کی الفت دل میں رکھتا ہو۔

ایک ہی مقررہ راستے پر زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔

ایک گروہ اور ایک ہی جماعت سے ہم آہنگ ہو ورنہ یہ افتراق اور مختلف راستے اور پراگندہ مقاصد اسے ایک نظری راہ سے ہٹا کر بے ہودگی اور انحراف کی طرف کھینچ کرلے جائیں گے۔

اس لیے ایک حدیث میں امیرالمومنین حضرت علیؑ سے اس آیت کی تفسیر میں ہم پڑھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

"لا یجتمع حبنا وحب عدونا فی جوف انسان، ان اللہ لم یجعل لرجل قلبین فی جوفہ، فیحب بھذا و یبغض بھذا فاما محبنا فیخلص الحب لنا کما یخلص الذھب بالنار لا کدر فیہ فمن اراد ان یعلم فلیمتحن قلبہ فان شارک فی حبنا حب عدونا فلیس منا ولسنا منہ"۔

ہماری دوستی اور ہمارے دشمن کی دوستی ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتی، کیونکہ خدا نے ایک انسان کے لیے دو دل قرار نہیں دیئے ہیں کہ ایک کے ساتھ کسی کو دوست رکھے اور دوسرے کے ساتھ کسی کو دشمن! ہمارے دوست ہماری محبت میں خالص ہیں۔ جیسا کہ سونا کٹھالی سے نکل کر کُندن بن جاتا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو جاننا چاہتا ہے، وہ اپنے دل کی آزمائش کرے۔ اگر ہمارے دشمنوں کی محبت کا کچھ حصّہ اس کے دل میں ہماری محبت کے ساتھ ملا ہوا ہے تو نہ وہ ہم سے ہے اور نہ ہم اس سے۔[1]

اس بناء پر ایک دل ایک ہی اعتقاد کا مرکز ہے اور وہ بھی ایک ہی عملی پروگرام پر عمل درآمد کرتا ہے کیونکہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان حقیقتاً کسی چیز کا معتقد تو ہو لیکن عملی شکل میں اس سے جُدا ہو اور یہ جو بعض لوگ ہمارے زمانہ میں اپنے لیے متعدد شخصیتوں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے فلاں عمل سیاسی لحاظ سے انجام دیا اور فلاں دینی لحاظ سے اور فلاں کام اجتماعی نقطۂ نظر سے، اس طرح سے وہ اپنے متضاد اعمال کی توجیہ کرتے ہیں۔ تو وہ بدکردار منافق ہیں جو چاہتے ہیں کہ قانونِ آفرینش و خلقت کو

---

[1] تفسیر "علی بن ابراہیم" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۲۴۔

روند ڈالیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں لیکن ان سب پر ایک ہی قانون حاکم ہونا چاہیئے۔

قرآن اس کے بعد زمانہ جاہلیت کی ایک اور بے ہودہ رسم اور خرافات کو بیان کرتا ہے اور وہ "ظہار" کی خرافات ہے۔ مرد جس وقت اپنی بیوی سے ناراض ہو جاتے اور چاہتے کہ اس سے نفرت کا اظہار کریں تو اس سے کہتے (انت علی کظھر امی) "تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے" اور اس بات کے ساتھ وہ اسے اپنی ماں کی طرح سمجھنے لگتے اور اس بات کو طلاق کے مانند خیال کرتے۔

قرآن اس آیت کے آخر میں کہتا ہے "خدا نے ہرگز تمھاری بیویوں کو جنھیں تم محل ظہار قرار دیتے ہو، تمہاری مائیں قرار نہیں دیا ہے اور ماؤں والے احکام ان کے لیے مقرر نہیں کیے: (وما جعل ازواجکم اللائی تظاھرون منھن امھاتکم)۔

اسلام نے اس زمانہ جاہلیت کے پروگرام کو صرف مسترد ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لیے سزا بھی مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص یہ بات کہے وہ ضروری کفّارہ ادا کیے بغیر اپنی بیوی کے پاس نہیں جا سکتا اور اگر کفّارہ بھی ادا نہ کرے اور بیوی کے پاس بھی نہ جائے تو بیوی "حاکم شریعت" کے ذریعہ سے اسے دو کاموں میں سے ایک کو قبول کرنے پر آمادہ کرسکتی ہے۔ یا تو باقاعدہ طور پر اور قانونِ اسلام کے مطابق اسے طلاق دے کر اس سے الگ ہو جائے۔ یا کفّارہ ادا کرکے حسب سابق اپنی ازدواجی زندگی کو جاری رکھے۔[1]

آخر یہ کیا بات ہوئی کہ انسان اپنی بیوی سے یہ جُملہ کہنے سے کہ "تو میری ماں کی طرح ہے" اس کو ماں کے حکم میں لے آئے؟ ماں اور بیٹے کا ایک فطری رابطہ ہوتا ہے جو لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس لیے سورۂ مجادلہ کی آیت ۲ میں صراحت سے کہتا ہے: "ان امھاتھم الا اللائی ولدنھم وانھم لیقولون منکرا من القول و زورا"۔

"ان کی مائیں تو وہ ہیں، جنہوں نے انھیں جنم دیا ہے اور وہ بُری اور باطل بات کہتے ہیں۔"

یہ بات کہنے سے اگر ان کا مقصد بیوی سے جدائی اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا کہ اس سے طلاق کا کام لیتے تھے تو عورت سے علیحدگی اس غلط اور ناشائستہ قول کی محتاج نہیں ہے۔ کیا ایک درست اور صحیح تعبیر کے ساتھ علیحدگی کے مسئلہ کو بیان نہیں کیا جاسکتا؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ظہار زمانۂ جاہلیت میں ایک دوسرے سے جدائی کا سبب نہیں ہوتا تھا بلکہ عورت کو معلق سرگرداں کی حالت میں قرار دینا ہوتا تھا اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو یہ گھناؤنا اور تکلیف دہ فعل بن جاتا ہے کیونکہ ایک بے معنی لفظ کے کہنے سے میاں بیوی کا باہمی رابطہ منقطع ہو جاتا اور بغیر اس کے کہ عورت مطلقہ ہو شوہر اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے۔[2]

پھر زمانۂ جاہلیت کی تیسری بے ہودہ اور فضول چیز کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔" خدا تمھارے مُنہ بولے بیٹوں کو تمھارے حقیقی بیٹے قرار نہیں دیتا: (وما جعل ادعیائکم ابنائکم)۔

---

[1] "ظہار" سے مربوط مسائل کے بارے میں مزید وضاحت انشاء اللہ سورۂ مجادلہ کی اس سے مناسب آیات کے ذیل میں آئے گی۔

[2] "تفسیر فی ظلال" جلد نمبر ۶ ص ۳۴۵ (ذیل آیت زیر بحث)۔

ان کی وضاحت یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں معمول تھا کہ کچھ لوگ چھوٹے بچوں کو اولاد کے طور پر انتخاب کرلیتے اور انھیں اپنا بیٹا کہہ کر
پکارتے تھے اور ایسا کرنے کے بعد تمام وہ حقوق جو ایک بیٹے کے کسی باپ پر ہوتے ہیں، اس کے قائل ہو جاتے تھے۔ وہ مُنہ
بولے باپ کے وارث ہوتے اور منہ بولے ان کے وارث ہوتے۔ ایسے باپ کی بیوی بیٹے پر اور ایسے بیٹے کی بیوی باپ
پر حرام ہو جاتی۔

اسلام نے غیر منطقی اور بے ہودہ قواعد و ضوابط کو سختی سے مسترد کردیا جیساکہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ پیغمبرؐ نے اس غلط طور
طریقے کی سرکوبی کے لیے اپنے مُنہ بولے بیٹے "زید بن حارثہ" کی بیوی سے مطلقہ ہونے کے بعد نکاح کرلیا تاکہ واضح ہو جائے
کہ یہ کھوکھلے الفاظ حقائق کو دگرگوں نہیں کرسکتے کیونکہ باپ بیٹے کا باہمی رابطہ ایک طبیعی اور فطری رابطہ ہوتا ہے جو الفاظ، عہد
پیمان اور امرہ بازی سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ بعد میں ہم بتائیں گے کہ پیغمبرؐ کا زید کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنے کے باعث دشمنان اسلام نے ایک بہت بڑا جنجال
کھڑا کردیا اور ان کے غلط پروپیگنڈے کے لیے ایک دستاویز بن گیا، لیکن یہ سب کچھ زمانہ جاہلیت کی اس غلط رسم کو مٹانے کے
لیے مہنگا ثابت نہیں ہوا۔

اس لیے قرآن اس جملے کے بعد کہتا ہے: "یہ ایسی بات ہے کہ جو تم زبان سے کہتے ہو"۔ (ذالکم قولکم
بافواهکم)۔

تم کہتے ہو فلاں میرا بیٹا ہے حالانکہ دل میں جانتے ہو کہ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ آواز کی یہ لہریں صرف تمہارے مُنہ کی فضا
میں گھوم پھر کر باہر نکل جاتی ہیں اور کسی بھی صورت میں یہ دل کی آواز نہیں ہوتی۔
یہ غلط اور فضول باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" لیکن خدا حق بات کہتا ہے اور راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے"۔ (واللہ
یقول الحق وھو یھدی السبیل)۔

حق بات اسے کہا جاتا ہے جو واقعیت عین کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو یا اگر کوئی طے شدہ معاملہ ہے تو وہ ہر لحاظ سے اس
معاملہ کی تمام مصلحتوں سے ہم آہنگ ہو اور معلوم ہے کہ زمانہ جاہلیت میں "ظہار" ایسا ناپسندیدہ مسئلہ یا "مُنہ بولا بیٹا" جو دوسروں
کی اولاد کے حقوق کو بڑی حد تک پامال کرتا تھا، نہ تو واقعیت عین رکھتا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا طے شدہ معاملہ تھا جس میں مصلحت
عامہ کو مدِ نظر رکھا گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن مزید تاکید اور اسلام کے صحیح اور منطقی خط کو واضح کرنے کے لیے یوں اضافہ کرتا ہے: "انھیں ان کے باپوں
کے نام سے پکارا کرو کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک زیادہ عادلانہ ہے"۔ (ادعوھم لاٰبائھم ھو اقسط عند
اللہ)۔

"اقسط" (زیادہ منصفانہ) کی تعبیر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اگر انھیں مُنہ بولے باپ کے ساتھ پکارو تو یہ منصفانہ فعل ہے اور
حقیقی باپ کے نام سے پکارو تو زیادہ منصفانہ ہے، بلکہ جیساکہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ "افعل التفضیل" کا صیغہ کبھی ایسے موقع پر
بھی استعمال ہوتا ہے کہ طرف مقابل میں صفت کا بالکل وجود نہیں ہوتا مثلاً کہا جاتا ہے:

"انسان احتیاط کرے اور اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے تو بہتر ہے"۔ تو اس بات کا یہ مفہوم نہیں کہ جان کو خطرے میں نہ
ڈالنا اچھا ہے لیکن احتیاط کرنا اس سے بہتر اور زیادہ اچھا ہے، بلکہ مراد "اچھے" اور "برے" کا ایک دوسرے سے تقابل اور
موازنہ ہے۔

اور "بہانے" کو دور کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر ان کے باپوں کو تم نہیں پہچانتے تو وہ تمہارے دینی بھائی اور موالی
ہیں"۔ (فان لم تعلموا اٰبائھم فاخوانکم فی الدین وموالیکم)۔
یعنی ان کے باپوں کو نہ پہچاننا اس چیز کی دلیل نہیں بنتا کہ دوسرے شخص کا نام "باپ" کے عنوان سے اس پر رکھ دیں بلکہ
انھیں دینی بھائی کے عنوان سے یا دوست اور آشنا کے طور پر خطاب کرو۔
"موالی" "مولا" کی جمع ہے اور مفسرین نے اس کے لیے متعدد معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اسے یہاں دوست کے معنی میں
اور بعض نے آزاد شدہ غلام کے معنی میں لیا ہے۔ (کیونکہ بعض مُنہ بولے بیٹے غلام تھے جنہیں خرید کر آزاد کر دیا جاتا اور چونکہ وہ اپنے
آقا کی توجہ کا مرکز ہوتے لہٰذا انھیں اپنے بیٹے کے طور پر پکارتے تھے۔
اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ "مولا" کی تعبیر اس قسم کے موارد میں کہ جہاں مقابلے میں آزاد شدہ غلام ہوں، اس وجہ
سے بھی کہ وہ آزادی کے بعد اپنا رابطہ اپنے مالک کے ساتھ برقرار رکھتے ایسا رابطہ جو قانونی لحاظ سے کئی ایک جہات میں رشتہ
داری کا جانشین ہو جاتا اور "ولاءِ عتق" سے تعبیر کرتے۔
اس لیے اسلامی روایات میں ہے کہ "زید بن حارثہ" کو پیغمبر اکرمؐ کے آزاد کرنے کے بعد بھی "زید بن محمدؐ" کے عنوان سے پکارا
جاتا، یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور اپنے والا حکم لایا۔ اس کے بعد پیغمبرؐ نے اس سے فرمایا تو "زید بن حارثہ" ہے، تو اب اسے لوگ
"مولیٰ رسول اللہ" (رسول اللہ کا آزاد کردہ) کہہ کر پکارتے تھے۔[1]
نیز علماء نے کہا ہے کہ "ابوحذیفہ" کا سالم نامی ایک غلام تھا جسے انھوں نے آزاد کرکے اپنا بیٹا بنالیا جس وقت اوپر والی یہ
آیت نازل ہوئی تو اسے "سالم" مولیٰ حذیفہ کا نام دیا گیا۔[2]
لیکن چونکہ انسان کبھی گذشتہ عادت کے ماتحت یا سبقت لسانی کی بناء پر یا بعض افراد کے نسبت میں اشتباہ کی وجہ سے ہوسکتا
ہے کہ کسی کو اس کے باپ کے علاوہ کسی اور سے نسبت دے دے اور یہ چیز انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ لہٰذا خداوند عادل
و حکیم ہے۔ ایسے شخص کو سزا نہیں دے گا۔ اس لیے آیت کے ذیل میں اضافہ کرتا ہے: "جس وقت اس موقع پر غلطی کے مرتکب ہو جاؤ
تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے"۔ (ولیس علیکم جناح فیما اخطاٴتم بہ)۔
لیکن جو کچھ تم جان بوجھ کر اور اپنے ارادہ و اختیار سے کہتے ہو، اس پر ضرور سزا دی جائے گی"۔ (ولٰکن ما
تعمدت قلوبکم)۔[3]

---

[1] "روح المعانی" جلد ۲۱ ص ۱۳۱ ذیل آیہ محلِ بحث۔

[2] "روح البیان" ذیل آیہ محلِ بحث۔

[3] مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ "ما" ... "موصول" ... [illegible]

"اور خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے"۔ (وکان اللہ غفوراً رحیماً)۔

تمہارے گذشتہ گناہوں کو بخش دے گا اور سہو و نسیان اور خطاؤں کو معاف کر دے گا۔ لیکن اگر اس حکم کے نازل ہونے کے بعد تم نے عمداً اس کی مخالفت کی اور افراد کو ان کے باپوں کے نام کے بغیر پکارا اور "منہ بولے بیٹے" اور منہ بولے باپ والی رسم کو جاری رکھا تو خدا تمہیں نہیں بخشے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ موضوع خطا ایسے موارد کو بھی شامل ہوگا، جب انسان محبت کی بنا پر کسی سے کہتا ہے "میرے بیٹے"! یا احترام سے کہتا ہے "میرے باپ"!

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ تعبیرات گناہ نہیں ہے۔ لیکن خطا کے عنوان سے نہیں بلکہ اس بنا پر کہ اس قسم کی تعبیرات کنایہ و مجاز کا پہلو رکھتی ہیں اور عام طور پر ان کا قرینہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہذا قرآن یہاں پر حقیقی تعبیرات کی نفی کرتا ہے نہ کہ مجازی کی۔

بعد والی آیت ایک اور اہم مسئلہ یعنی اس کے نظام "مواخات" کے ابطال کو پیش کرتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جس وقت مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اسلام نے ان کا تعلق مشرک رشتے داروں کے ساتھ کہ جو مکہ میں تھے، کلی طور پر توڑ دیا اور پیغمبرؐ نے حکم خدا سے مسئلہ اخوت و پیمان برادری ان کے درمیان کیا۔ اس طرح سے کہ "مہاجرین" و "انصار" کے درمیان (دو دو کرکے) پیمان اخوت و برادری باندھا گیا اور وہ دو حقیقی بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے وارث بنے لیکن یہ حکم عارضی اور صرف موجودہ سخت ترین حالات سے مخصوص تھا اور جس وقت اسلام نے وسعت پیدا کی ہے اور گذشتہ روابط تدریجاً برقرار ہوئے تو اب اس حکم کو باقی اور جاری رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

اوپر والی آیت نازل ہوئی اور "نظام مواخات" کو جو نسب کا جانشین تھا باطل کیا۔ اور وراثت وغیرہ کے حکم کو حقیقی رشتہ داروں کے ساتھ مخصوص کر دیا۔

اس بنا پر نظام اخوت و برادری اگرچہ ایک اسلامی نظام تھا (برخلاف منہ بولے بیٹے کے نظام کے جو ایک جاہلانہ نظام تھا) لیکن ضروری تھا کہ حد سے زیادہ خراب حالت کے برطرف ہونے کے بعد اسے باطل ہونا چاہیئے تھا اور ایسا ہی ہوا۔

البتہ زیر بحث آیہ میں اس نکتہ کے ذکر سے پہلے دو اور احکام یعنی "مؤمنین کی نسبت پیغمبرؐ کا اولیٰ ہونا" اور پیغمبر کی بیویوں کا ماں کی مانند ہونا" مقدمہ کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

فرماتا ہے "پیغمبر مؤمنین کی نسبت خود ان سے اولیٰ ہیں"۔ (النبی اولی بالمؤمنین من انفسهم)۔

اور ان کی بیویاں مؤمنین کی مائیں شمار ہوتی ہیں"۔ (وازواجه امهاتهم)۔

باوجود اس کے کہ پیغمبر بمنزلہ باپ کے اور ان کی بیویاں بمنزلہ ماؤں کے ہیں، لیکن کبھی بھی ان سے میراث نہیں لیتے تو کس طرح توقع رکھی جا سکتی ہے کہ منہ بولے بیٹے وارث بنتے ہوں۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) محذوف ہے اور تقدیری طور پر اس طرح تھا "لکن ما تعمدت قلوبکم فانکم تؤاخذون بہ"۔

پھر مزید کہتا ہے "رشتہ دار ایک دوسرے کی نسبت مؤمنین و مہاجرین میں سے اس میں جو خدا نے مقرر کیا ہے اولیٰ ہیں"۔ (و اولوا الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله من المؤمنین والمهاجرین)۔

لیکن اس کے باوجود اس بنا پر کہ کلی طور پر مسلمانوں پر راستہ بند نہ کریں اور دوستوں کے لیے اور ان کے لیے جن کے ساتھ ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق یا لگاؤ ہو تو کوئی چیز بطور میراث چھوڑ سکتے ہیں۔ اگرچہ وصیت کے طریق سے تہائی مال کی بابت ہی سہی۔ آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے "مگر یہ کہ تم چاہو کہ اپنے دوستوں کی نسبت کوئی نیک کام انجام دو" تو کوئی مانع نہیں ہے: (الا ان تفعلوا الی اولیائکم معروفاً)۔

اور آخری جملہ میں گذشتہ تمام احکام کی تاکید کے لیے یا آخری حکم کی تاکید کے لیے فرماتا ہے "یہ حکم کتاب الٰہی میں (لوح محفوظ یا قرآن مجید میں) لکھا جا چکا ہے"۔ (کان ذالك فی الکتاب مسطوراً)۔

یہ تھا خلاصہ اوپر والی آیت کی تفسیر کا۔ اب ہم ان مذکورہ چار احکام میں سے ہر ایک کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

الف:۔ مومنین کی نسبت پیغمبر کے اولیٰ ہونے سے کیا مراد ہے؟

قرآن نے اس آیت میں پیغمبر کے اولیٰ ہونے کو مسلمانوں کی نسبت مطلق طور پر ذکر کیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام اختیارات جو "انسان" اپنی بابت رکھتا ہے، "پیغمبر" خود اس سے بھی اولیٰ ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "امور اجتماعی کی تدبیر" کے مسئلہ میں یا "اولویت مسئلہ قضاوت" میں یا "حکم و فرمان کی اطاعت" کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ لیکن حقیقت واقع یہ ہے کہ ان تین امور میں سے کسی ایک تک محدود کرنے کی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اسلامی روایات میں اولویت کی "مسئلہ حکومت" کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے تو درحقیقت اس اولویت کی ایک شاخ کو بیان کرنا مقصود ہے[1]

لہذا کہنا چاہیئے کہ پیغمبر اسلام اجتماعی مسائل میں اور انفرادی و خصوصی مسائل میں بھی، حکومت سے مربوط مسائل میں بھی، قضاوت و دعوت سے متعلق مسائل میں بھی ہر انسان سے خود اس کی نسبت اولیٰ تھے اور آپ کا ارادہ اور خواہش خود اس کے ارادہ اور خواہش پر مقدم ہے۔

اور اس مسئلہ میں حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور خدا کا نمائندہ سوائے معاشرے اور فرد کی خیر و صلاح کے کچھ بھی مدنظر نہیں رکھتا اور کبھی بھی وہ ہوا و ہوس کا تابع نہیں ہوتا اور کسی وقت بھی اپنے مفادات کو دوسروں کے مفادات پر مقدم نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برعکس مفادات کی کشمکش و تضاد اور ٹکراؤ کی صورت میں اس کا پروگرام ہمیشہ امت کے لیے ایثار و قربانی اور فداکاری کا ہوتا ہے۔

یہ اولویت حقیقت میں مشیت الٰہی کی اولویت کی ایک شاخ ہے کیونکہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی جانب سے ہے۔

[1] یہ روایات "اصول کافی" اور کتاب "علل الشرائع" میں آئی ہیں (تفسیر نور الثقلین، جلد ۴ ص ۲۳۸، ۲۳۹ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

مزید برآں انسان اس وقت ایمان کی بلندی پر پہنچ سکتا ہے، جب اس کا مضبوط ترین تعلق اپنی ذات کے ساتھ عشق و محبت خدا کے تابع ہو اور اسی طرح اس کے نمائندوں کے ساتھ عشق و محبت کے تابع ہو۔

اسی لیے تو ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

"لا یؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعًا لما جئت بہ"

"تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جسے میں خدا کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔"[1]

نیز ایک اور حدیث میں آیا ہے:

"والذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من نفسہ ومالہ وولدہ والناس اجمعین"

"قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک حقیقت ایمان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے نزدیک خود اس سے، اس کے مال و اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔"[2]

نیز یہ بھی خود آنحضرتؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ما من مؤمن الا وانا اولی الناس بہ فی الدنیا والاٰخرۃ"

"کوئی مومن نہیں جب تک کہ میں دنیا و آخرت میں اس کے نزدیک خود اس کی نسبت اولیٰ نہ ہوں۔"[3]

قرآن بھی اسی سورہ احزاب کی آیت ۳۶ میں کہتا ہے:

"وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرًا ان یکون لهم الخیرة من امرهم"

"کسی با ایمان مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو پھر وہ اپنی طرف سے کوئی اختیار رکھتا ہو۔"

ہم ایک بار پھر یہ بات زور دے کر کہتے ہیں کہ اس بات کا یہ مقصد نہیں کہ خدا نے اپنے بندوں کو مکمل طور پر ایک فرد کی خواہشات کا پابند کر دیا ہے۔ بلکہ اس بات کے پیش نظر کہ پیغمبر مقام عصمت کا حامل ہوتا ہے اور "ما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی" (نجم ۳-۴) کا مصداق ہونے کی بنا پر جو کچھ بھی کہتا ہے سب خدا کا فرمان ہوتا ہے اور اس کی ہی

---

[1] تفسیر فی ظلال ذیل آیات محل بحث۔

[2] تفسیر فی ظلال ذیل آیات محل بحث

[3] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۵۰ تفسیر سورۂ احزاب، مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ...

جانب سے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ باپ سے بھی زیادہ دل سوز اور مہربان ہے۔

یہ اولویت درحقیقت لوگوں کے مفاد اور ان کے حق میں ہے، حکومت اور اسلامی معاشرہ کو چلانے کی صورت میں بھی اور انسان کے شخصی اور انفرادی مسائل میں بھی۔

اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ اولویت پیغمبر کے کاندھوں پر عظیم مسئولیت اور ذمہ داری ہے۔ اسی لیے مشہور روایت میں کہ جو شیعہ اور اہل سنت کی کتب میں وارد ہوئی ہے، پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انا اولی بکل مؤمن من نفسه، ومن ترک مالا فللوارث ومن ترک دینًا او ضیاعًا فالیّ وعلیّ۔"

"میں ہر مومن کے لیے اس کی نسبت اولیٰ ہوں، جو شخص اپنی طرف سے مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارث کے لیے ہے اور جو شخص قرض چھوڑ کر جائے یا اہل و عیال چھوڑ جائے تو ان کی کفالت میرے ذمہ ہے۔"[1]

(توجہ کرنا چاہیئے کہ یہاں پر "ضیاع" اہل و عیال کے معنی میں ہے جو سرپرست کے بغیر رہ گئے ہوں اور "دین" کی تعبیر اس سے پہلے بھی اس معنی پر واضح قرینہ ہے کیونکہ مراد مال کے بغیر قرض دار ہوتا ہے)

ب: دوسرا حکم پیغمبر کی بیویوں کے سلسلہ میں ہے کہ وہ تمام مومنین کے لیے (ماں کی حیثیت رکھتی ہیں البتہ معنوی اور روحانی مائیں ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر امت کے روحانی اور معنوی باپ ہیں۔

اس معنوی میں ربط اور رشتہ کی تاثیر صرف "حفظ احترام" اور پیغمبر کی بیویوں سے "ازدواج کی حرمت" کے سلسلہ میں ہے، جیسا کہ اسی سورہ کی آیات میں پیغمبر کی رحلت کے بعد ان کی ازواج سے نکاح کرنے کی تحریم کا صریح حکم آیا ہے۔ ورنہ مسئلہ میراث کے لحاظ سے اور اسی طرح دوسرے "نسبی" اور "سببی" محرمات کے لحاظ سے ذرہ برابر بھی اثر نہیں رکھتا، یعنی مسلمان حق رکھتے ہیں کہ پیغمبر کی بیٹیوں کے ساتھ شادی کریں۔[2] حالانکہ کوئی شخص اپنی ماں کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا، نیز محرمیت کا مسئلہ اور پیغمبر کی بیویوں کی طرف نگاہ کرنا ان کے محارم کے سوا کسی شخص کے لیے بھی جائز نہیں تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بی بی عائشہ سے کہا "یا امّہ" اے اماں۔ اس پر انہوں نے جواب دیا: میں تمہاری ماں نہیں ہوں، تمہارے مردوں کی ماں ہوں۔

---

[1] وسائل شیعہ جلد ۱۷ ص ۵۵۱ یہ بات امام صادق علیہ السلام سے پیغمبر گرامی اسلام سے نقل ہوئی ہے اور یہی مضمون مختصر سے فرق کے ساتھ تفسیر قرطبی اور روح المعانی میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے اور صحیح بخاری میں بھی ہے۔ دیکھیے جلد ۰ ص ۴۵ (تفسیر سورۂ احزاب) میں آیا ہے۔

[2] جیسا کہ حضرت علیؑ کی شادی آنحضرتؐ کی دختر سے ہوئی یا آپ کی نواسیوں کی شادیاں حضرت جعفر طیار کے ...

[3] "مجمع البیان" اور "روح المعانی" ...

یہ اا ۔رف ۔ ۔بے کہ اس تعبیر کا مقصد نکاح کی حرمت ہے اور یہ صرف اُمّت کے مردوں کے بارے میں صادق ہے۔
لیکن جیسا کہ ۔ نے کہا ہے کہ مسئلہ ازدواج کے علاوہ احترام اور بزرگ سمجھنے کا موضوع بھی پیشِ نظر ہے۔ اسی لیے مسلمان
عورتیں بھی ۔ ۔ ۔ ان کے احترام کے طور پر اپنی ماں کہہ کر خطاب کریں۔
ا ۔ ۔ ۔ کا شاہد خود قرآن ہے جبکہ کہتا ہے: "النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم"۔ پیغمبرؐ کی اولویت
تمام عورتوں اور مردوں کی نسبت ہے اور بعد والے جُملہ کی ضمیر بھی اسی عنوان کی طرف لوٹتی ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اسی
لیے عبد ۔ ۔ ہیں جو "اُمّ سلمہ" (پیغمبرؐ کی ایک بیوی) سے نقل ہوا ہے کہ وہ فرماتی ہیں۔
"۔ ۔ ا ام الرجال منکم والنساء"
"۔ ۔ تمہارے مردوں اور عورتوں کی ماں ہوں" [1]
یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ کہ کیا "ازواجہ امھاتھم" "پیغمبرؐ کی بیویاں مؤمنوں کی مائیں شمار ہوتی ہیں" کی تعبیر
اس کے ساتھ جو قبل کی چند آیات میں گزری ہے۔ تضاد نہیں رکھتی؟ کیونکہ وہاں فرماتا ہے: "وہ لوگ کہ جو کبھی اپنی بیویوں کو اپنی ماں کے
منزلہ قرار دیتے ہیں، باطل بات کہتے ہیں۔ ان کی ماں صرف وہی ہے جس سے وہ متولد ہوئے ہیں"۔ اس حالت میں کس طرح پیغمبر کی
بیویاں کہ جن سے مسلمان متولد نہیں ہوئے مائیں شمار ہوتی ہیں؟
اس سوال کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ کسی عورت کو ماں سے مخاطب کرنا یا تو جسمانی لحاظ سے ہوتا ہے
یا روحانی لحاظ سے۔ جسمانی لحاظ سے تو یہ معنی صرف اس صورت میں واقعیت رکھتا ہے کہ انسان اس سے متولد ہوا ہو۔ اور یہ وہی چیز ہے
جو گذشتہ آیات میں آئی ہے کہ انسان کی جسمانی ماں تو صرف وہ ہے کہ جس سے وہ پیدا ہوا ہے۔ لیکن روحانی ماں باپ تو وہ ہیں جو ایک
قسم کا معنوی حق اس پر رکھتے ہوں جس طرح پیغمبرؐ جو اُمّت کے روحانی باپ شمار ہوتے ہیں اور آپ ہی کی وجہ سے آپ کی بیویاں
ماں کا احترام رکھتی ہیں۔
جو اعتراض زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی طرف "ظہار" کے بارے میں تھا یہ تھا کہ جس وقت وہ اپنی بیویوں کو ماں کر کے
مخاطب کرتے تو یقیناً ان کی مراد معنوی ماں نہ ہوتا۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی کہ وہ جسمانی ماں کی طرح ہیں، اس لیے ایک قسم کی طلاق شمار کرتے
تھے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جسمانی صورت میں الفاظ کے کہہ دینے سے ماں نہیں بن جاتی بلکہ اس کی شرط تولد جسمانی ہے۔ اس بنا پر ان
کا یہ قول جُھوٹ اور باطل تھا۔ لیکن پیغمبرؐ کی بیویوں کے بارے میں اگرچہ وہ جسمانی مائیں نہیں ہیں لیکن پیغمبرؐ کے احترام کی وجہ سے وہ
روحانی مائیں تھیں اور ایک ماں ایسا احترام رکھتی تھیں۔
اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن آیندہ کی آیات میں پیغمبرؐ کی بیویوں سے شادی کرنے کو حرام قرار دیتا ہے، وہ بھی درحقیقت پیغمبرؐ
کے احترام کی قسموں میں سے ایک ہے جیسا کہ اس کی وضاحت آگے چل کر تفصیل کے ساتھ آئیگی۔ انشاءاللہ۔
البتہ اسلام میں ماں کی ایک اور قسم رضاعی ماں کے عنوان سے موجود ہے جس کی طرف سورۂ نساء کی آیت ۲۳ میں

[1] روح المعانی" ذیل آیات زیر بحث۔

اشارہ ہوا ہے کہ "وامھاتکم اللاتی ارضعنکم ۔ ۔ ۔" تو درحقیقت وہ جسمانی ماں کی ایک قسم ہے۔
ج: تیسرا حکم رشتہ داروں کی ایک دوسرے کی بابت میراث کے بارے میں اولویت کا مسئلہ ہے کیونکہ ابتداء اسلام میں
کہ مسلمان ہجرت کی وجہ سے اپنا رشتہ اپنے اعزاء و اقارب سے کم کر چکے تھے تو میراث کا قانون "ہجرت" اور "مواخات" کی بنیاد
پر منظم ہوا یعنی مہاجرین ایک دوسرے سے یا انصار سے جن سے برادری کا رشتہ جوڑ چکے تھے، میراث لیتے تھے۔ یہ ایک
عارضی حکم تھا جو اسلام کے وسعت پانے اور بہت سے گذشتہ رشتہ داری کے روابط کے برقرار ہو جانے سے ان کے
اسلام لانے کی بناء پر اب اس حکم کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں تھی (آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سورۂ احزاب ہجرت کے پانچویں
سال جنگِ احزاب کے سال نازل ہوا)۔
اس لیے اوپر والی آیت نازل ہوئی اور "اولوا الارحام" (رشتہ داروں) کی اولویت کو محکم کر دیا۔
البتہ کچھ قرائن موجود ہیں کہ یہاں اولویت سے مراد الزامی اولویت ہے نہ کہ استحبابی۔ کیونکہ علماء اسلام کا اجماع بھی
اس معنی پر ہے اور بہت سی روایات بھی جو اسلامی ماخذ میں وارد ہوئی ہیں، اس موضوع کو ثابت کرتی ہیں۔
یہاں اس نکتہ کی طرف بھی خوب غور کے ساتھ توجہ کرنا چاہیئے کہ یہ آیت غیروں کی نسبت رشتہ داروں کی اولویت کو بیان
کر رہی ہے نہ کہ میراث کے تین طبقات کی ایک دوسرے کی نسبت اولویت کے بیان کے لیے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں
"مفضل علیھم" مومنین و مہاجرین ہیں جو متن قرآن میں آئے ہیں: (من المؤمنین والمھاجرین)
اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا "بعض رشتہ دار دوسرے بعض سے میراث لینے میں غیر رشتہ داروں سے اولیٰ
ہیں"۔ باقی رہا یہ کہ رشتہ دار کس طرح میراث لیتے ہیں؟ اور کس معیار اور ضابطہ کے تحت؟ تو قرآن یہاں اس بارے میں ساکت ہے!
اگرچہ سورۂ نساء کی چند آیات میں اس کے بارے میں تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔ [1]
د: چوتھا حکم کہ اوپر والی آیت میں ایک استثناء کی شکل میں آیا ہے، دوستوں اور تعلق رکھنے والے افراد کو ان
اموال سے بہرہ مند کرنا ہے۔ جنہیں یادگار کے طور پر چھوڑ رہا ہے جو (الا ان تفعلوا الی اولیائکم
معروفاً) "مگر یہ کہ اپنے دوستوں کے ساتھ تم نیکی کرنا چاہو" کے جملہ سے بیان ہوا ہے اور اس کا واضح مصداق وہی حکم وصیت
ہے کہ جسے انسان اپنے تہائی مال کے حصے میں جس شخص کے بارے میں چاہے انجام دے سکتا ہے۔

[1] اسی بناء پر بعض فقہاء طبقاتِ میراث میں ایک دوسرے سے اولویت کی تعبیر کا استدلال درست نظر نہیں آتا، معلوم
ہوتا ہے کہ "اولیٰ ببعض" میں حرف "با" اس قسم کی غلط فہمی کا سبب ہوا اور بعض علماء نے گمان کر لیا ہے کہ
یہاں پر "مفضل علیھم" (جن پر فضیلت دی گئی) بعض وارث ہیں، حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ (مفضل
علیہ) من المؤمنین والمھاجرین لایا ہے۔ "البتہ اولوا الارحام کی تعبیر صرف یہ بات ظاہر کرتی ہے
کہ رشتہ داری ہی میراث کا معیار ہے۔ اور جس قدر رشتہ داری کا درجہ بلند ہوگا اسے اتنا ہی حق تقدم حاصل ہوگا۔

(غور کیجئے گا)

اس طرح سے جب میراث کی عمارت رشتہ داری کی بنیاد پر استوار کی گئی اور گذشتہ رشتوں کی قائم مقام ہوئی۔ پھر بھی
انسان کا رابطہ مکمل طور پر اپنے قلبی دوستوں اور مسلمان بھائیوں سے منقطع نہیں ہوتا۔ البتہ کیفیت و کمیت (مقدار اور
تعداد) خود اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے، لیکن پھر بھی اس کی شرط یہ ہے کہ مال کی ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو، البتہ اگر انسان
وصیت نہیں کرتا تو اس کے تمام اموال اس کے رشتہ داروں کے درمیان میراث کے قوانین کے مطابق تقسیم ہوں گے اور
ان کے لیے ثلث یعنی ایک تہائی مقصود نہیں ہوگی [1]

ایک نکتہ:

بہت سی روایات ائمہ اہل بیت سے اوپر والی آیت کی تفسیر میں اولوا الارحام کے بارے میں نقل ہوئی ہیں کہ ان میں سے
بعض میں یہ آیت "میراث مال" کے مسئلہ سے تفسیر ہوئی ہے جیسا کہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے۔ جبکہ بعض دوسری روایات
میں "خلافت و ملوکیت کی میراث" خاندان پیغمبر اور ائمہ اہل بیتؑ کے لیے تفسیر ہوئی ہے۔
منجملہ ان کے ہم ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے پڑھتے ہیں: جس وقت آپ سے اس آیت کی تفسیر کے متعلق سوال
ہوا تو امامؑ نے فرمایا:

"یہ فرزندان حسینؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے"
اور جب راوی نے سوال کیا کہ کیا یہ میراث اموال سے متعلق نہیں ہے؟ تو امامؑ نے ارشاد کیا:
"نہیں۔ یہ تو حکومت و ولایت کے بارے میں ہے۔"

واضح ہے کہ ان احادیث سے مراد میراث اموال کے مسئلہ کی نفی نہیں ہے بلکہ مراد اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے
کہ میراث ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو میراث اموال کو بھی شامل ہے اور میراث خلافت و حکومت کو بھی۔
اور یہ توارث بادشاہوں کے سلسلہ میں توارث سلطنت کی طرح نہیں ہے، یہاں تو شائستگی اور لیاقت کی بنا

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ ہے "الا ان تفعلوا" کے جملہ میں جو استثناء ہے وہ استثنا منقطع ہے
کیونکہ وصیت کا حکم میراث کے حکم سے علیحدہ ہے۔ لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر یہاں استثنا متصل ہو تو کوئی حرج نہیں۔
کیونکہ "اولوا الارحام" کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ رشتہ داران مالوں کی بابت جو میت سے باقی رہ جاتے
ہیں، غیروں کی نسبت اولیٰ ہیں۔ لیکن اگر وصیت کی ہو تو اس صورت میں "موصی لہ" تہائی ترکہ کی حدود تک رشتہ
داروں سے اولیٰ اور زیادہ حق رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت میں اس استثناء کے مشابہ ہے جو آیات میراث میں "من بعد وصیۃ ..."
میں آیا ہے۔

[2] ان احادیث کو مرحوم سید ہاشم بحرانی نے تفسیر برہان جلد ۳ ص ۲۹۰ اور ۲۹۳ میں نقل کیا ہے۔ منجملہ ان کے اوپر والی حدیث ہے
اور ستہویں حدیث بھی اسی سلسلہ احادیث میں سے ہے۔

پر توارث ہے۔ اسی لیے امامت کی اولاد میں سے صرف ان افراد کی حالت کو شامل ہے جو اس شائستگی کے حامل ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس
طرح حضرت ابراہیمؑ اپنی اولاد کے لیے خدا سے چاہتے ہیں اور خدا ان سے کہتا ہے کہ امامت و ولایت تیری اولاد میں سے اس گروہ
تک نہیں پہنچے گی جو ظالموں کی صف میں قرار پاتے ہیں۔ بلکہ ان میں پاکیزہ افراد سے مخصوص ہے۔
نیز اس چیز کے مشابہ ہے جو زیارات میں شہداء راہ خدا منجملہ امام حسینؑ کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر ہم کہتے ہیں: آپ پر
سلام ہو اے حسینؑ کہ آپ آدمؑ کے وارث، نوحؑ کے وارث، ابراہیمؑ کے وارث، موسیٰؑ کے وارث و عیسیٰؑ و محمدؐ کے وارث
ہیں... یہ میراث تو اعتقادی، اخلاقی معنوی اور روحانی پہلوؤں کے لحاظ سے میراث ہے۔

۷۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ

۸۔ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۧ

ترجمہ

۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تجھ سے اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسٰیؑ اور عیسٰیؑ بن مریم سے اور ان سب سے ہم نے محکم پیمان لیا (کہ تبلیغ و رسالت اور رہبری کی ادائیگی کے فرائض میں کوتاہی نہ کریں)۔

۸۔ تاکہ خدا سچوں کی صداقت کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تفسیر

خدا کا محکم عہد و پیمان:

چونکہ گذشتہ آیات میں پیغمبر اسلامؐ کے وسیع اختیارات "النبی اولی بالمومنین من انفسھم" کے عنوان کے تحت بیان ہوئے، زیر بحث آیات میں پیغمبر اسلامؐ اور باقی عظیم انبیاءؑ کے زبردست اور سنگین فرائض کو بیان کرتا ہے

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمیشہ اختیارات اور ذمہ داریاں لازم اور ملزوم ہوتے ہیں اور جس جگہ "حقوق" موجود ہوں، وہاں فرائض بھی ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی بھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اس بناء پر اگرچہ پیغمبر اسلام وسیع حق رکھتے ہیں تو اس کے مقابلہ میں اُن پر بھاری ذمہ داریاں بھی قرار دی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے "یاد کرو اس وقت کو، جب ہم نے پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا۔ اس طرح تجھ سے اور نوح، ابراہیم، موسٰی اور عیسٰی بن مریم سے جی ہاں ان سب سے ہم نے محکم پیمان لیا": (واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسٰی وعیسی ابن مریم واخذنا منھم میثاقًا غلیظًا)۔

اس طرح سے پہلے تو تمام انبیاءؑ کو مسئلہ میثاق میں پیش کرتا ہے۔ پھر پانچ اولوالعزم پیغمبروں کے نام لیے ہیں کہ سب سے پہلے پیغمبر اسلام کی ذات کا ذکر ان کی شرافت وعظمت کی وجہ سے جو وہ رکھتے ہیں آیا ہے۔ اس کے بعد چار دوسرے اولوالعزم پیغمبر زمانۂ ظہور کی ترتیب کے ساتھ (نوح، ابراہیم، موسٰی، اور عیسٰی) ذکر ہوئے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ عہد و پیمان سب کے لیے عمومی تھا، جو تمام انبیاء سے لیا گیا جبکہ اولوالعزم زیادہ تاکید کے ساتھ اس پیمان کے پابند تھے۔ ایسا پیمان جو "اخذنا منھم میثاقًا غلیظًا" کے جملہ کے ساتھ حد سے زیادہ تاکید کو ظاہر کرتا ہے۔[1]

اہم بات یہ ہے کہ یہاں ہم جانیں کہ وہ کونسا تاکیدی عہد و پیمان تھا جس کے تمام پیغمبر زیر بار ہیں؟ مفسرین نے اس مقام پر مختلف قسم کی گفتگو کی ہے۔ مجموعی طور پر جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ایک اصل کلی کی مختلف شاخیں ہیں اور وہ یہ پیمان تمام مراحل میں فریضہ تبلیغ و رسالت کی ادائیگی، لوگوں کی قیادت اور ہدایت کے فرائض کو پورا کرنا ہے۔

وہ پابند تھے اور ان کے فرائض میں شامل تھا کہ تمام انسانوں کو ہر چیز سے پہلے توحید کی دعوت دیں۔

نیز اس کے بھی پابند تھے کہ ایک دوسرے کی تائید کریں اور پہلے انبیاء اپنی امتوں کو بعد کے پیغمبروں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کریں جیسا کہ بعد والے پیغمبر سابقہ انبیاء کی دعوت کی تصدیق و تائید کریں۔

خلاصہ یہ کہ سب کی دعوت کا رُخ ایک ہو اور سب ایک ہی حقیقت کی تائید کریں اور امتوں کو ایک ہی پرچم کے گرد جمع کریں۔

اس بات کی شہادت باقی آیاتِ قرآن میں بھی مل سکتی ہے سورۂ آل عمران کی آیت ۸۱ میں ہم پڑھتے ہیں: (واذ اخذ الله میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتاب و حکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ و لتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علٰی ذالکم

---

[1] "میثاق" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، ایسے تاکیدی پیمان کے معنی میں ہے جو قسم و عہد سے توأم ہو اس بناء پر "غلیظًا" کا ذکر اس معنی پر مزید تاکید ہے۔

اصری قالوا اقررنا قال فاشھدوا وانا معکم من الشاھدین"۔

(اس وقت کو یاد کرو) جب خدا نے پیغمبروں (اوران کے پیروکاروں) سے پختہ عہد وپیمان لیا کہ جس وقت میں تمھیں کتاب وحکمت دوں اور پھر تمہاری طرف ایک پیغمبر آئے گا جو اس چیز کی تصدیق کرے گا جو تمھارے ساتھ ہے تو اس پر ایمان لے آنا اور اس کی نصرت بھی کرنا۔ پھر (خدا نے) ان سے کہا کیا تم نے اس موضوع کا اقرار کر لیا اور اس پر پختہ عہد و پیمان باندھ لیا ہے؟ تو انھوں نے کہا (ہاں) ہم نے اقرار کیا! تو خدا نے ان سے فرمایا (اس مقدس عہد وپیمان پر) گواہ رہو، میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔

اس طرح ایک اور معنی سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۷ میں بھی آیا ہے۔ جس میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے اہل کتاب سے عہد وپیمان لیا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے آیات الٰہی کو بیان کریں اور انھیں ہرگز نہ چھپائیں۔

اسی طرح سے خدا نے انبیاء سے بھی محکم عہد وپیمان لیا ہے کہ لوگوں کو توحید خدا، دین حق اور ادیان آسمانی کی وحدت کی طرف دعوت دیں، اور علماء اہل کتاب سے بھی کہ وہ جتنا ہو سکے دین الٰہی کو بیان کرنے کی کوشش کریں اور اسے چھپانے سے مکمل پرہیز کریں۔

بعد والی آیت بعثت انبیاء اور اس پختہ عہد وپیمان کے مقصد کو جو ان سے لیا گیا ہے اس طرح بیان کرتی ہے: "غرض یہ ہے کہ خدا سچوں کی صداقت کے بارے میں پوچھے اور کفار کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے"۔ (لیسئل الصادقین عن صدقھم واعد للکافرین عذاباً الیماً)۔

یہاں "صادقین" سے کون لوگ مراد ہیں؟ اور یہ سوال کیسا سوال ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفاسیر بیان کی ہیں، لیکن جو کچھ ان آیات اور قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مومنین ہیں جو اپنے دعووں کی سچائی میں عملی ثبوت پیش کریں۔ دوسرے لفظوں میں آزمائش کے میدان اور خدائی امتحان میں سرخرو اور سرفراز ہوں۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ:

اولاً: "صادقین" کا کلمہ یہاں پر "کافرین" کے مقابلہ میں آیا ہے اور مقابلہ کے قرینہ سے یہ معنی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ثانیاً: اسی سورہ (احزاب) کی آیت ۲۳ میں یوں پڑھتے ہیں،

"من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللّٰہ علیہ"

"مومنین میں سے ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اس عہد وپیمان میں سچے ہیں جو انہوں نے خدا کے ساتھ باندھا ہے اور اس عہد پر کاربند ہیں۔

پھر فوراً ہی آیت نمبر ۲۴ میں فرماتا ہے،

"لیجزی اللّٰہ الصادقین بصدقھم ویعذب المنافقین ان شاء او یتوب علیھم"

"مقصد یہ ہے کہ صادقین کو ان کے صدق کے بدلے اجر وجزا دے اور جب چاہے منافقین کو عذاب کرے یا ان کی توبہ قبول کرے"۔

ثالثاً: سورہ حجرات کی آیت پندرہ اور سورۂ حشر کی آیت آٹھ میں "صادقین" کا اچھے طریقے سے تعارف ہوا ہے۔

چنانچہ سورہ حجرات میں ہے:

"انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللّٰہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللّٰہ اولٰئک ھم الصادقون"

"واقعی مومن وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور جنہوں نے جان ومال کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیا۔ یہی صادقین ہیں۔

اور سورۂ حشر میں فرماتا ہے:

"للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللّٰہ ورضواناً وینصرون اللّٰہ ورسولہ اولٰئک ھم الصادقون"۔

"(وہ مال غنیمت جو جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے) مہاجر فقراء کے لیے ہے، وہی جو اپنے گھروں اور مالوں سے باہر نکالے گئے ہیں، اس حالت میں کہ وہ پروردگار کے فضل وکرم اور اس کی رضا کے طالب ہیں، جو خدا اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں وہی "صادقین" ہیں"۔

اس طرح سے واضح ہو گیا کہ "صادقین" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین خدا کی حمایت کے میدان میں جہاد، اور مشکلات کے سامنے استقامت اور ایستادگی، اور جان ومال کے خرچ کرنے میں اپنی صداقت اور راستگوئی کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔[1]

رہا یہ سوال کہ "صادقین سے صدق کے متعلق سوال کرنے" سے کیا مراد ہے؟ تو جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اگر اس کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آیا وہ اپنے اعمال میں خلوص نیت کو اور اپنے دعوے کی صداقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتے ہیں یا نہیں؟ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، جہاد میں، مشکلات کے مقابلہ میں، صبر و

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے آیت کے معنی میں ایک اور احتمال بھی دیا ہے کہ "صادقین" سے مراد یہاں پر خود انبیاء علیہم السلام ہیں، اور ان سے قیامت کے دن سوال ہوگا کہ انھوں نے کس حد تک اپنے عہد وپیمان پر عمل کیا ہے؛ لیکن مذکورہ بالا تینوں شواہد اس تفسیر کی نفی کرتے ہیں۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ ایک عام کلمہ ہے جس سے انبیاء اور مومنین دونوں مراد ہیں۔ لیکن جو تفسیر اوپر ذکر کی گئی ہے وہ اس سورہ کی آیات اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

شکیبائی میں، خصوصاً میدان جنگ کی سختیوں میں۔

یہ سوال کہاں اُٹھایا جائے گا اور کہاں صورت پذیر ہوگا؟ آیت کا ظاہر تو یہ بتاتا ہے کہ یہ سوال بروز قیامت پروردگار عالم کی دادگاہ عدل میں ہوگا! قرآن کی متعدد آیات بھی قیامت کے دن اس قسم کے سوال کے تحقق کی کلی طور پر خبر دیتی ہیں۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہ سوال عملی سوال کی حیثیت رکھتا ہو اور دُنیا میں ہی صورت پذیر ہو۔ کیونکہ انبیاً کی بعثت کے ساتھ ہی تمام اہل ایمان مسئول قرار پاتے ہیں اور ان کا عمل اس سوال کا جواب ہے کہ کیا وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

۹۔ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَةَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝

۱۰۔ إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ ٱلْأَبْصَـٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلْقُلُوبُ ٱلْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِٱللَّهِ ٱلظُّنُونَا۠ ۝

۱۱۔ هُنَالِكَ ٱبْتُلِىَ ٱلْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا۟ زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝

ترجمہ

۹۔ اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو، اس وقت کہ جب (عظیم) لشکر تمہاری طرف آئے۔ لیکن ہم نے سخت آندھی اور طوفان ان پر بھیجا اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ سکے (اور اس طرح سے انہیں درہم برہم کر دیا) اور جسے تم انجام دیتے ہو، خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

۱۰۔ اس وقت کو یاد کرو، جب وہ تمہارے (شہر کے) اوپر اور نیچے سے وارد ہوئے (اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا) اور اس وقت کو جب کہ آنکھیں شدت وحشت سے خیرہ ہو گئی تھیں اور جان لبوں تک پہنچ چکی تھی اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کر رہے تھے۔

۱۱- وہاں مومنین کی آزمائش کی گئی اور وہ سختی سے ہل گئے۔

تفسیر

میدان احزاب میں کڑی آزمائش :

یہ اور چند بعد والی آیات جو مجموعی طور پر سترہ آیات بنتی ہیں اور "مومنین" اور "منافقین" کے بارے میں خدا کی کڑی آزمائش اور عمل کے سلسلہ میں ان کے صدق گفتار کے امتحان کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں جس کے متعلق گذشتہ آیات میں بحث ہو چکی ہے۔

یہ آیات تاریخ اسلام کے ایک اہم ترین حادثہ یعنی جنگ احزاب کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، ایسی جنگ جو تاریخ اسلام میں ایک اہم تاریخی موڑ ثابت ہوئی اور اسلام و کفر کے درمیان طاقت کے موازنے کے پلڑے کو مسلمانوں کے حق میں جھکا دیا۔ اور اس کی کامیابی آئندہ کی عظیم کامیابیوں کے لیے کلیدی حیثیت اختیار کر گئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں دشمنوں کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد وہ کوئی خاص قابل ذکر کارنامہ انجام دینے کے قابل نہ رہ سکے۔

"یہ جنگ احزاب" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، تمام اسلام دشمن طاقتوں اور ان مختلف گروہوں کی طرف سے ہر طرح کا مقابلہ تھا کہ اس دین کی پیش رفت سے ان لوگوں کے ناجائز مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے۔

جنگ کی آگ کی چنگاری ... یہودیوں کے ایک گروہ کی طرف سے بھڑکی جو مکہ میں آئے اور قبیلہ "قریش" کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لڑنے پر اکسایا اور ان سے وعدہ کیا کہ آخری دم تک ان کا ساتھ دیں گے۔ پھر قبیلہ "غطفان" کے پاس گئے اور انھیں بھی کارزار کے لیے آمادہ کیا۔

ان قبائل نے اپنے ہم پیمان اور حلیفوں مثلاً قبیلہ "بنی اسد" اور "بنی سلیم" کو بھی دعوت دی اور چونکہ یہ سب قبائل خطرہ محسوس کیے ہوئے تھے، لہٰذا اسلام کا کام ہمیشہ کے لیے تمام کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تاکہ وہ اس طرح سے پیغمبرؐ کو شہید، مسلمانوں کو سرکوب، مدینہ کو غارت اور اسلام کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیں۔

مسلمانوں نے جب اپنے آپ کو ایک عظیم گروہ کے مقابلہ میں دیکھا تو حکم رسالت پناہؐ سے مشورہ کرنے بیٹھ گئے اور سب سے پہلے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی پیشکش پر مدینہ کے اطراف میں خندق کھودی گئی تاکہ دشمن اسے آسانی کے ساتھ عبور نہ کر سکے اور شہر لوٹ مار سے بچ جائے (اسی بنا پر اس جنگ کا ایک نام "جنگ خندق" بھی ہے)۔

مسلمانوں پر بہت سخت اور خطرناک لمحات گزر رہے تھے۔ جانیں لبوں تک آئی ہوئی تھیں، منافقین لشکر اسلام کے درمیان زبردست تگ و دو میں پڑے ہوئے تھے۔ دشمن کا انبوہ کثیر اور اس کے مقابلہ میں لشکر اسلام کی کمی

(لشکر کفر کی تعداد دس ہزار اور لشکر اسلام کی تین ہزار لکھی ہے)، دشمن کی تیاری، جنگی ساز و سامان اور ضروری وسائل کی فراہمی ایک سخت اور دردناک مستقبل کو مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر رہے تھے۔

لیکن خدا چاہتا تھا کہ یہاں پیکر کفر پر آخری ضرب پڑے اور منافقین کو مسلمانوں کی صفوں سے جدا کر دے، سازشی عناصر کا بھانڈا پھوڑ دے اور سچے مسلمانوں کو آزمائش کی بھٹی میں ڈالے۔

آخر کار یہ جنگ جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مسلمانوں کی کامیابی پر منتج ہوئی۔ حکم خدا سے سخت آندھی چلی جس نے کفار کے خیمے، تنبو اور تمام بساط زندگی کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ ان کے دلوں میں زبردست رعب و وحشت ڈال دی اور فرشتوں کی غیبی طاقتیں مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجیں۔

عمرو بن عبدود کے مقابلہ میں حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی قدرت نمائی جیسی عجیب و غریب خدائی طاقتوں کے مظاہرے کا اضافہ ہوا اور مشرکین کوئی کارنامہ سرانجام دیئے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اوپر والی سات آیات میں مشرکین کی سرکوبی کرنے والا تجزیہ و تحلیل پیش کیا گیا ہے اور اسلام کی فیصلہ کن کامیابی اور منافقین کی سرکوبی کو احسن انداز میں بیان فرمایا ہے۔

یہ تھی جنگ احزاب کی ایک جھلک جو ہجرت کے پانچویں سال واقع ہوئی۔[1]

یہاں سے ہم آیات کی تفسیر کی طرف جاتے ہیں اور اس جنگ کی دیگر تفصیلات اور نکات کو بحث کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں۔

قرآن اس ماجرا کو پہلے تو ایک ہی آیت میں خلاصہ کرتا ہے۔ پھر دوسری ۱۶ آیات میں اس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر خدا کی عظیم نعمت کو یاد کرو، اس موقع پر جب کہ (عظیم) لشکر تمہاری طرف آئے" (یا ایها الذین امنوا اذکروا نعمة الله علیکم اذ جاءتکم جنود)۔

"لیکن ہم نے ان پر آندھی اور طوفان بھیجے اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے۔ اور اس ذریعہ سے ہم نے ان کی سرکوبی کی اور انھیں تتر بتر کر دیا۔" (فارسلنا علیهم ریحًا وجنودًا لم تروها)۔

"اور خدا ان تمام کاموں کو جنہیں تم انجام دیتے ہو دیکھ رہا ہے (اور وہ کام بھی جو ہر گروہ نے اس عظیم میدان میں انجام دیئے) بصیر اور بینا ہے" (وکان الله بما تعملون بصیرًا)۔

---

[1] جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس تفصیل کا ایک اجمالی خاکہ ہے جسے اسلامی مورخین نے منجملہ "ابن اثیر" "کامل" میں درج کیا ہے۔

چند قابل غور مطلب:

۱۔ "اذکروا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ یہ آیات جنگ کے ختم ہونے اور کچھ وقت گزر جانے کے بعد نازل ہوئیں
یعنی اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا، اس کا اپنی فکر و نظر کے مطابق تجزیہ و تحلیل کریں
تاکہ اس کا گہرا اثر ہو۔

۲۔ "جنود" کی تعبیر زمانۂ جاہلیت کے مختلف گروہ اور قبائل کی طرف اشارہ ہے (مثلاً قریش، غطفان، بنی سلیم،
بنی اسد، بنی فزارہ، بنی اشجع اور بنی مرہ) جن میں مدینہ کے اندر رہنے والا یہودیوں کا قبیلہ بھی ہے۔

۳۔ "جنودًا لم تروھا" سے مراد جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے لیے آئے تھے، وہی
فرشتے تھے جن کا مومنین کی جنگ بدر میں مدد کرنا بھی صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۂ انفال
کی آیہ ۹ کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ نظر نہ آنے والا فرشتوں کا خدائی لشکر
باقاعدہ طور پر میدان میں داخل ہوا اور وہ جنگ میں بھی مصروف ہوا ہو بلکہ ایسے قرائن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ
وہ صرف مومنین کے حوصلے بلند کرنے اور ان کا دل گرمانے کے لیے نازل ہوئے تھے۔[1]

بعد والی آیت جو جنگ احزاب کی بحرانی کیفیت، دشمنوں کی عظیم طاقت اور ہیبت سے مسلمانوں کی شدید پریشانی
کی تصویر کشی کرتے ہوئے یوں کہتی ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب وہ تمہارے شہر کے اُوپر اور نیچے سے داخل ہو گئے۔
(اور مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا) اور اس وقت کو جب آنکھیں شدت وحشت سے پتھرا گئی تھیں اور جان لبوں تک
آئی ہوئی تھی اور خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے تھے": (اذ جاءوکم من فوقکم ومن
اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ
الظنونا)۔

بہت سے مفسرین اس آیت میں لفظ "فوق" کو مدینہ کی مشرقی جانب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ قبیلہ "غطفان"
ادھر سے وارد ہوا تھا۔ اور "اسفل" (نیچے) کو مغرب کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ "قریش" اور ان کے ساتھی وہیں سے
داخل ہوئے تھے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مکہ ٹھیک مدینہ کی جنوبی سمت میں واقع ہے لہٰذا مشرکین مکہ کے قبائل کو
جنوب سے آنا چاہیئے لیکن شاید شہر مدینہ میں داخل ہونے کے راستے کی کیفیت کچھ اس طرح تھی کہ انھوں نے شہر کا
تھوڑا سا چکر لگایا اور مغرب کی طرف سے شہر کے اندر آگئے۔ صورت حال خواہ کچھ بھی ہو، اوپر والا جملہ اسلام کے مختلف
دشمنوں کی طرف سے اس شہر کے محاصرہ کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں مذکورہ آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

"زاغت الابصار" کے بارے میں "لفظ" زاغت "زیغ" کے مادہ سے ایک طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے
جو ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو زبردست خوف اور وحشت کی صورت میں انسان پر طاری ہوتی ہے۔ اس
وقت اس کی آنکھیں ہر طرف سے ہٹ کر ایک معین نقطہ پر ٹھہر جاتی ہیں اور خیرہ ہو جاتی ہیں۔
"بلغت القلوب الحناجر" (دل حلق تک پہنچ چکے تھے) کا جملہ ایک عمدہ جملہ ہے جس طرح فارسی زبان میں
بھی ہے کہ (اس کی جان لبوں تک پہنچ گئی) ورنہ دل جس کا ایک مخصوص معنی ہے یعنی جو خون کی تقسیم کا مرکز ہے کسی بھی صورت
میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا اور نہ ہی کبھی حلق تک پہنچتا ہے۔

اور "تظنون باللہ الظنونا" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کیفیت سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے
لیے غلط قسم کے گمان پیدا ہو گئے تھے کیونکہ وہ ابھی تک ایمانی قوت کے لحاظ سے کمال کے مرحلہ تک نہیں پہنچ پائے
تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ وہ شدت سے متزلزل ہوئے۔
شاید ان میں سے کچھ لوگ گمان کرتے تھے کہ آخر کار ہم شکست کھا جائیں گے اور اس قدرت و قوت کے ساتھ دشمن
کا لشکر کامیاب ہو جائے گا۔ اسلام کے زندگی کے آخری دن آپہنچے ہیں اور پیغمبرؐ کا کامیابی کا وعدہ کبھی پورا ہوتا دکھائی
نہیں دیتا۔

البتہ یہ افکار و نظریات ایک عقیدہ کی صورت میں نہیں بلکہ ایک وسوسہ کی شکل میں بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں
پیدا ہو گئے تھے بالکل ویسے ہی جیسے جنگ اُحد کے سلسلہ میں قرآن مجید ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "وطائفة قد
اھمتھم انفسھم یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیة": یعنی تم میں سے ایک گروہ جنگ کے ان
بحرانی لمحات میں صرف اپنی جان کی فکر میں تھا اور جاہلیت کے دور کے گمانوں کی مانند خدا کے بارے میں غلط گمان رکھتے
تھے۔ (آل عمران آیہ ۱۵۴)

البتہ محل بحث آیت میں مخاطب یقیناً مسلمان ہیں اور "یاایھا الذین اٰمنوا" کا جملہ جو اس سے قبل کی
آیت میں ہے اس معنی کی دلیل ہے اور جنھوں نے اس کا مخاطب منافقین کو سمجھا ہے گویا انھوں نے یا تو اس نکتہ کی طرف
توجہ نہیں کی یا پھر خیال کیا کہ اس قسم کی بدگمانی ایمان اور اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی۔ حالانکہ اس قسم کے انکار کا وسوسہ
کی حد تک ظاہر ہونا اور وہ بھی سخت بحرانی حالات میں ایک فطری اور معمول کے مطابق بات ہے۔[1]
یہی وہ منزل تھی کہ خدائی امتحان کی بھٹی سخت گرم تھی جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے کہ "وہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ سخت ہل
گئے تھے": (ھنالک ابتلی المؤمنون وزلزلوا زلزالًا شدیدًا)۔
فطری امر ہے کہ جب انسان فکری طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو اس کا جسم بھی ان طوفانوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ بلکہ

---

[1] مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "ظنون" کا عمومی معنی اچھے اور بُرے گمان لیا ہے لیکن اس آیت میں اور اس سے بعد والی آیت میں موجود
قرائن بتاتے ہیں کہ مراد بُرے گمان ہیں۔

وہ بھی اضطراب اور تزلزل کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جب لوگ ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں تو وہ جہاں بھی بیٹھے ہوتے ہیں اکثر بے چین رہتے ہیں، ہاتھ ملتے رہتے ہیں اور اپنے اضطراب اور پریشانیوں کو اپنی حرکات سے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

اس شدید پریشانی کے [شواہد] میں سے ایک یہ بھی تھا جسے مورخین نے بھی نقل کیا ہے کہ عرب کے پانچ مشہور جنگجو پہلوان جن کا سرخیل عمرو بن عبد ود تھا، جنگ کا لباس پہن کر اور مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ میدان میں آئے اور "ھل من مبارز" (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟) کی آواز لگانے لگے۔ خاص کر عمرو بن عبد ود رجز پڑھ پڑھ کر جنت اور آخرت کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "کیا تم یہ نہیں کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں جائیں گے؟ تو کیا تم میں سے کوئی بھی جنت کے دیدار کا شوقین نہیں ہے؟" لیکن اس کے ان نعروں کے مقابلہ میں لشکر پر پوری طرح خاموشی طاری تھی اور کوئی بھی مقابلے کی جرأت نہیں رکھتا تھا سوائے علی بن ابی طالبؑ کے جو مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو عظیم کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ اس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

جی ہاں! جس طرح فولاد کو گرم بھٹی میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ نکھر جائے اسی طرح اوائل کے مسلمان بھی جنگِ احزاب جیسے معرکوں کی بھٹی میں سے گزریں تاکہ کندن بن کر نکلیں اور حوادثات کے مقابل میں جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کر سکیں۔

۱۲- وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝

۱۳- وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۝

۱۴- وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ۝

۱۵- وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝

۱۶- قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝

۱۷- قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝

ترجمہ

۱۲۔ اس وقت کو یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہتے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں جھوٹے وعدوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔

۱۳۔ اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا، اے اہلِ یثرب (مدینہ والو!) یہاں تمہارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ۔ اور ان میں سے ایک گروہ پیغمبر سے واپس پلٹ جانے کی اجازت لیتا اور کہتا تھا، ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ (جنگ سے) بھاگ جائیں۔

۱۴۔ وہ تو ایسے لوگ تھے کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف و جوانب سے ان پر وارد ہوتے اور ان کو شرک کی طرف لوٹ جانے کی پیشکش کرتے تو وہ ضرور قبول کر لیتے اور سوائے تھوڑی سی مدت کے اس راہ کے انتخاب کرنے سے دریغ نہ کرتے۔

۱۵۔ انھوں نے اس سے پہلے خدا سے عہد کیا تھا کہ وہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے۔ اور خدا کے عہد و پیمان کے بارے میں ان سے سوال کیا جائے گا (اور وہ اس کے سامنے جواب دہ

ہوں گے)۔

۱۶۔ کہہ دیجئے کہ اگر موت یا مارے جانے سے فرار کرتے ہو تو وہ تمہارے لیے سودمند نہیں ہے اور اس وقتی زندگی کے تھوڑے سے فائدہ کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔

۱۷۔ کہہ دیجئے کہ خدا کے ارادے کے مقابلہ میں کون تمہاری حفاظت کر سکے گا؟ اگر اس نے تمہارے لیے مصیبت یا رحمت کا ارادہ کر لیا ہے؟ اور خدا کے علاوہ تمہیں کوئی بھی سرپرست اور یار و یاور نہیں ملے گا۔

تفسیر

منافقین اور ضعیف الایمان میدانِ احزاب میں:

ہم کہہ چکے ہیں کہ امتحان کی بھٹی جنگِ احزاب میں گرم ہوئی اور سب کے سب اس عظیم امتحان میں گھر گئے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے بحرانی دور میں جو لوگ عام حالات میں ظاہراً ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں، کئی صفوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یہاں پر بھی مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت سچے مومنین کی تھی، ایک گروہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے منافقین کا تھا اور ایک گروہ اپنے گھر بار، زندگی اور بھاگ کھڑا ہونے کی فکر میں تھا۔ اور کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ دوسرے لوگوں کو جہاد سے روکیں۔ اور ایک گروہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ منافقین کے ساتھ اپنے رشتہ کو محکم کریں۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص نے اپنے باطنی اسرار اس عجیب "عرصۂ محشر" اور "یوم البروز" میں آشکار کر دیئے۔

گذشتہ آیات میں ضعیف الایمان مسلمانوں کی جماعت کے بارے میں اور بُرے وسوسوں اور بدگمانیوں کے بارے میں جو انھیں لاحق تھیں گفتگو ہو رہی تھی۔ اور قرآن پہلی زیرِ بحث آیت میں منافقین اور دل کے بیمار لوگوں کے بارے میں گفتگو کو بیان کر رہا ہے۔ فرماتا ہے۔ "اس وقت کو یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل بیمار تھے، کہتے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے سوائے جھوٹے وعدوں کے ہمیں کچھ نہیں دیا۔" (واذ یقول المنافقون والذین فی

قلوبھم مرض ما وعدنا اللہ ورسولہ الا غرورا)۔

جنگِ احزاب کی تاریخ میں آیا ہے کہ خندق کھودنے کے دوران میں جب ہر ایک مسلمان خندق کے ایک حصہ کو کھودنے میں مصروف تھا تو ایک مرتبہ پتھر کے ایک سخت اور بڑے ٹکڑے سے ان کا سامنا ہوا کہ جس پر کوئی ہتھوڑا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی تو آنحضرت بنفس نفیس خندق میں تشریف لے گئے اور اس پتھر کے پاس کھڑے ہو کر اور ہتھوڑا لے کر پہلی مرتبہ ہی اُس کے دل پر ایسی مضبوط چوٹ لگائی کہ اس کا کچھ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس سے ایک چمک نکلی جس پر آپؐ نے فتح و کامرانی کی تکبیر بلند کی۔ آپ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے ایک اور سخت چوٹ لگائی تو اس کا کچھ حصہ اور ٹوٹا اور اس سے بھی چمک نکلی۔ اس پر بھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی آپ کے ساتھ تکبیر کہی۔ آخر کار آپ نے تیسری چوٹ بھی لگائی جس سے بجلی کوندی اور باقی ماندہ پتھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر جناب سلمان فارسیؓ نے اس ماجرہ کے بارے میں دریافت کیا تو سرکار رسالت مآبؐ نے فرمایا: "پہلی چمک میں میں نے "حیرہ" کی سرزمین اور ایران کے بادشاہوں کے قصر و محلات دیکھے ہیں اور جبرائیل نے مجھے بشارت دی ہے کہ میری اُمت ان پر کامیابی حاصل کرے گی۔ دوسری چمک میں "شام اور روم" کے سُرخ رنگ کے محلات نمایاں ہوئے اور جبرائیل نے پھر بشارت دی کہ میری اُمت ان پر فتح یاب ہوگی۔ تیسری چمک میں مجھے "صنعا و یمن" کے قصور و محلات دکھائی دیئے اور جبرائیلؑ نوید دی کہ میری اُمت ان پر بھی کامیابی حاصل کرے گی، اے مسلمانو! تمھیں خوشخبری ہو!!

منافقین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کیسی عجیب و غریب باتیں ہیں اور کیا ہی باطل اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہے؟ مدینہ سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کو تو دیکھ کر تمہیں ان کے فتح ہونے کی خبر دیتا ہے حالانکہ اس وقت تم چند عربوں کے چنگل میں گرفتار ہو (اور خود دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے ہو) تم تو بیت الخلاء (خوف کی جگہ) تک نہیں جا سکتے کیا ہی خیال خام اور گمان باطل ہے)؟

تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا کہ یہ منافق اور دل کے مریض کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے سوائے دھوکہ فریب کے ہمیں کوئی وعدہ نہیں دیا۔ (وہ پروردگار کی بے انتہا قدرت سے بے خبر ہیں)۔[1]

اس وقت اس قسم کی بشارت اور خوشخبری سوائے آگاہ اور باخبر مؤمنین کی نظر کے (باقی لوگوں کے لیے) دھوکا اور فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پیغمبر کی ملکوتی آنکھیں ان آتشیں چنگاریوں کے درمیان سے جو کدالوں اور ہتھوڑوں کے

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص[illegible]، سیرۃ ابن ہشام میں بھی یہی واقعہ مختصر سے فرق کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ آنحضرتؐ نے فرمایا، بجلی کی پہلی کوند میں میں نے فتح یمن کو دیکھا اور دوسری کوند میں فتح شام و مغرب اور تیسری چمک میں مشرق (سرزمین ایران) کی فتح کو مشاہدہ کیا ہے۔ تاریخی لحاظ سے بھی ان تینوں علاقوں کی فتح ترتیب وار پایۂ تکمیل تک پہنچی ہے۔

خندق کھودنے کے لیے زمین پر لگنے سے نکلتی تھیں، ایران، روم اور یمن کے بادشاہوں کے قصور و محلات کے دروازوں کے کھلنے کو دیکھ سکتے تھے اور اپنی جان کو ہتھیلی پر لیے ہوئے بھی اُمت کو بشارت دے سکتے تھے اور آئندہ کے اسرار و رموز سے پردے بھی اُٹھا سکتے تھے۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ "الذین فی قلوبھم مرض" سے مراد وہ منافقین ہی تو ہیں اور اس جملہ کا ذکر درحقیقت "منافقین" کے لفظ کی وضاحت ہے جو پہلے آچکا ہے۔ نفاق کی بیماری سے بڑھ کر اور کونسی بیماری ہو سکتی ہے؟ کیونکہ صحیح و سالم اور خدائی فطرت رکھنے والے انسان کا صرف ایک ہی چہرہ ہوتا ہے دو یا دو سے زیادہ چہروں والا انسان بیمار ہوتا ہے جو ہمیشہ اضطراب، تضاد اور تناقض کا شکار رہتا ہے۔

اس بات کی گواہ وہ آیت ہے جو سورۂ بقرہ کی ابتداء میں آئی ہے اور منافقین کے بارے میں کہتی ہے:

"فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاً" (بقرہ - ۱۰)

ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا (ان کے اعمال کی بنا پر) ان کی بیماری میں اضافہ کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں منافقین اور دل کے بیمار لوگوں میں سے ایک خطرناک گروہ کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے جو دوسروں کی نسبت زیادہ خبیث اور آلودہ گناہ ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے "اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب (مدینہ) کے رہنے والو! یہاں تمہارے رہنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ" (واذ قالت طائفۃ منھم یا اھل یثرب لا مقام لکم فارجعوا)۔

خلاصہ یہ کہ دشمنوں کے اس انبوہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اپنے آپ کو معرکہ کارزار سے نکال کر لے جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاکت کے اور بیوی بچوں کو قید کے حوالے نہ کرو۔

اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف سے تو وہ انصار کے گروہ کو لشکرِ اسلام سے جُدا کر لیں اور دوسری طرف سے "انہی منافقین کا ٹولہ جن کے گھر مدینہ میں تھے، نبی اکرمؐ سے اجازت مانگ رہے تھے کہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنی اس واپسی کیلئے حیلے بہانے بنا رہے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے گھروں کے در و دیوار ٹھیک نہیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا اس طرح سے وہ میدان کو خالی چھوڑ کر فرار کرنا چاہتے تھے" (ویستاذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وما ھی بعورۃ ان یریدون الا فرارا)۔

لفظ "عورہ" "عار" سے ہے اور عورۃ اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے ظاہر کرنا ننگ و عار کا باعث ہو۔ وہ شگاف جو گھر کی دیواریں ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح سرحدوں کے نازک اور خطرناک مقامات اور وہ چیزیں جن سے انسان خوف کھاتا ہو، سب اسی زمرے میں آتے ہیں اور یہاں مراد وہ گھر ہیں جن کے قابلِ اطمینان در و دیوار نہ ہوں اور ہر وقت دشمن کے حملے کا خوف طاری رہتا ہو۔ منافقین اس قسم کا عذر پیش کر کے یہ چاہتے تھے کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں میں جا کر پناہ لیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ قبیلہ "بنی حارثہ" نے کسی شخص کو حضور رسالت پناہؐ کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصار میں سے کسی کا گھر بھی ہمارے گھروں کی طرح نہیں اور ہمارے اور قبیلہ "غطفان" کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو

مدینہ کی مشرقی جانب سے حملہ آور ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اجازت دیجیئے تاکہ ہم اپنے گھروں کو پلٹ جائیں اور جاکر اپنے بیوی بچوں کا دفاع کریں تو سرکار رسالتؐ نے انھیں اجازت عطا فرمادی۔

جب یہ بات انصار کے سردار "سعد بن معاذ" کے گوش گذار ہوئی تو انھوں نے پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں عرض کیا "سرکار! انہیں اجازت نہ دیجیئے، بخدا آج تک جب بھی کوئی مشکل درپیش آئی تو ان لوگوں نے یہی بہانہ تراشا، یہ جھوٹ بولتے ہیں" چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ واپس آجائیں۔

"یثرب" مدینہ کا قدیمی نام ہے، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس شہر کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے تک اس کا نام "یثرب" رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا نام "مدینۃ الرسولؐ" (پیغمبر کا شہر) پڑ گیا جس کا مخفف "مدینہ" ہے۔

اس شہر کے کئی ایک نام اور بھی ہیں۔ سید مرتضیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ان دو ناموں (مدینہ اور یثرب) کے علاوہ اس شہر کے گیارہ اور نام بھی ذکر کیے ہیں منجملہ ان کے "طیبہ" "طابہ" "سکینہ" "محبوبہ" "مرحومہ" اور "قاصمہ" ہیں۔ (اور بعض لوگ اس شہر کی زمین کو "یثرب" کا نام دیتے ہیں)[1]

چند ایک روایات میں آیا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اس شہر کو یثرب نہ کہا کرو"۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یثرب اصل میں "ثرب" (بروزن حرب) کے مادہ سے ملامت کرنے کے معنی میں ہے اور آپؐ اس قسم کے نام کو اس بابرکت شہر کے لیے پسند نہیں فرماتے تھے۔

بہرحال منافقین نے اہل مدینہ کو "یا اہل یثرب" کے عنوان سے جو خطاب کیا ہے وہ بلا وجہ نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس نام سے نفرت ہے۔ یا چاہتے تھے کہ اسلام اور "مدینۃ الرسولؐ" کے نام کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کریں۔ یا لوگوں کو زمانۂ جاہلیت کی یاد تازہ کرائیں۔

بعد والی آیت میں خداوند عالم اس گروہ کے ایمان کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اسلام کے اظہار میں اس قدر ضعیف اور ناتواں ہیں کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف و جوانب سے اس شہر میں داخل ہو جائیں اور مدینہ کو فوجی کنٹرول میں لے کر انہیں پیش کش کریں کہ کفر و شرک کی طرف پلٹ جائیں تو جلدی سے اس کو قبول کرلیں گے اور اس راہ کے انتخاب کرنے میں ذرا سا بھی توقف نہیں کریں گے"۔ (ولو دخلت علیہم من اقطارھا ثم سئلوا الفتنۃ لاٰتوھا وما تلبثوا بھا الا یسیرا)۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قدر ضعیف، کمزور اور غیر مستقل مزاج ہوں کہ نہ تو دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں اور نہ ہی راہِ خدا میں شہادت قبول کرنے کے لیے ایسے لوگ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنی راہ فوراً بدل لیتے ہیں۔

اسی بنا پر فتنہ کی لفظ سے مراد یہاں پر کفر و شرک ہی ہے جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات مثلاً سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۹۳ جیسی آیات میں آیا ہے۔

---

[1] مجمع البیان ج ۸ صفحہ ۳۴۶۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں "فتنہ" سے مراد مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے کہ اگر اس منافق ٹولے کو پیش کش کی جائے تو وہ فوراً اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے فتنہ پردازوں کے ساتھ تعاون کرنے لگ جائیں۔

لیکن یہ تفسیر "ولو دخلت علیہم من اقطارھا . . . " (کہ اگر مدینہ کے اطراف سے ان پر حملہ آور ہو جائیں . . .) کے ظاہری جملہ سے سازگار نہیں ہے اور شاید اسی بنا پر اکثر مفسرین نے اس سے پہلے معنی کو منتخب کیا ہے۔

پھر قرآن اس منافق ٹولے کو عدالت کے کٹہرے میں لاکر کہتا ہے: "انھوں نے پہلے سے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھا ہوا تھا کہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے اور اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہوئے توحید، اسلام اور پیغمبرؐ کے لیے دفاع میں کھڑے ہوں گے۔ کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا سے کیے گئے عہد و پیمان کے بارے میں سوال کیا جائے گا"؟ (ولقد کانوا عاھدوا اللہ من قبل لا یولون الادبار وکان عھد اللہ مسئولا)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس پیمان سے مراد وہی معاہدہ ہے جو "بنی حارثہ" نے جنگ اُحد کے دن خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کیا تھا جب کہ انھوں نے میدان سے پلٹنے کا ارادہ کیا تھا اور بعد میں پشیمان ہو گئے تھے اور عہد کیا تھا کہ پھر کبھی ان امور کے پیچھے نہیں جائیں گے۔ لیکن وہی لوگ جنگ احزاب کے میدان میں دوبارہ عہد شکنی کی فکر میں پڑ گئے۔[1]

بعض نے اس عہد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو جنگ بدر میں یا ہجرتِ پیغمبرؐ سے پہلے عقبہ میں آنحضرتؐ سے باندھا تھا۔[2]

لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوپر والی آیت ایک ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان کے ان معاہدوں کو بھی شامل ہے اور دوسرے معاہدوں کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

اصولی طور پر جو شخص ایمان لاتا اور رسولِ اسلامؐ کی بیعت کرتا ہے، درحقیقت وہ آپؐ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اسلام اور قرآن کا جان کی حد تک دفاع کرے گا۔

یہاں پر عہد و پیمان پر زیادہ تر زور اس لیے دیا گیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب تک بھی کیے گئے عہد و پیمان کا احترام کرتے تھے۔ تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص اسلام کا دعوٰے کرنے کے بعد اپنے معاہدہ کو پامال کر ڈالے؟

جب خدا نے منافقین کی نیت کو فاش کر دیا کہ ان کا مقصد گھروں کی حفاظت کرنا نہیں، بلکہ میدانِ جنگ سے فرار کرنا ہے تو انہیں دو دلیلوں کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

پہلے تو پیغمبرؐ سے فرماتا ہے۔ "کہہ دیجئے کہ اگر موت یا قتل ہونے سے فرار کرتے ہو تو یہ فرار تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ اور تم دنیاوی زندگی کے چند دن سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھاؤ گے"۔ (قل لن ینفعکم الفرار ان فررتم من الموت او القتل واذًا لا تمتعون الا قلیلا)۔

فرض کرو کہ تم جان بچاکر فرار کر بھی گئے تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو تمھاری اجل اور حتمی موت کا وقت آن پہنچا ہے

---

[1] تفسیر "قرطبی" اور "تفسیر فی ظلال القرآن" زیر بحث آیات کے ضمن میں۔
[2] "آلوسی" نے "روح البیان" میں اس قول کو نقل کیا ہے۔

تو تم جہاں بھی ہو گے، موت تمھارے دامن گیر ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ خود تمھارے اپنے ہی گھروں میں اور تمھارے بیوی بچوں کے پاس بھی تمھیں موت آ کر رہے گی۔ اندر یا باہر کا حادثہ تمھاری زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اور اگر اجل نہیں آئی تو ذلت، خواری اور رسوائی کے ساتھ یہ چار روزہ دنیاوی زندگی بسر کرنے اور دشمن کے چنگل میں اسیر ہو جانے کے بعد عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

درحقیقت یہ بیان اس بیان سے ملتا جلتا ہے جو جنگِ اُحد میں کمزور اساس منافقین کے ایک اور گروہ سے خطاب کی صورت میں نازل ہوا کہ،

"قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الٰی مضاجعھم"

یعنی؛ کہہ دیجئے کہ اگرچہ تم اپنے گھروں میں بھی ہو، پھر بھی وہ لوگ جن کے لیے قتل ہو جانا مقدر ہو چکا ہے تو ان کے بستروں تک پہنچ کر انہیں تہہ تیغ کر دیں گے۔ (آل عمران - ۱۵۴)

دوسرا یہ کہ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمھارا سارا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے اور تم اس کی قدرت و مشیت کے دائرہ اختیار سے ہرگز بھاگ نہیں سکتے۔

"اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دیجئے کون شخص خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں تمھاری حفاظت کر سکتا ہے، اگر وہ تمھارے لیے مصیبت یا رحمت چاہتا ہے؟" (قل من ذا الذی یعصمکم من اللہ ان اراد بکم سوءًا او اراد بکم رحمۃ)۔

جی ہاں! "وہ خدا کے علاوہ کوئی سرپرست اور یار و مددگار نہیں پائیں گے"۔ (ولا یجدون لھم من دون اللہ ولیًا ولا نصیرًا)۔

اب جبکہ تمام تقدیریں اس کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا جہاد کے سلسلہ میں اس کا فرمان جو دنیا میں بھی اور اللہ کی بارگاہ میں بھی باعث عزت و سرفرازی ہے، دل و جان سے قبول کرو۔ یہاں تک کہ اگر تمھیں اس راہ میں شہادت بھی نصیب ہو جائے تو اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو۔

۱۸۔ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ۟

۱۹۔ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۗ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۗ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۟

۲۰۔ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۗ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۟

ترجمہ

۱۸۔ خدا ان افراد کو اچھی طرح جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے ہیں اور ان کو بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف

آؤ (اور اپنے آپ کو معرکۂ جنگ سے باہر نکالو) وہ (کمزور افراد ہیں۔ اور) سوائے تھوڑی سی مقدار کے جنگ نہیں کرتے۔

۱۹۔ وہ تمھارے بارے میں ہر چیز میں بخیل ہیں اور جس وقت خوف اور بحران کے لمحات پیش آتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے ڈھیلے یوں چکر لگاتے ہیں، گویا (اپنے قالب کو چھوڑ رہے ہیں اور) ان پر موت کی غشی طاری ہے۔ لیکن جب خوف اور وحشت کی یہ حالت ختم ہو جاتی ہے تو وہ تمھارے خلاف غیظ و غضب سے لبریز تیز اور تند زبانیں کھولتے ہیں۔ (اور مالِ غنیمت سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتے ہیں) حالانکہ وہ اس میں بھی حریص اور بخیل ہیں وہ ہرگز ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا خدا نے ان کے اعمال کو حبط اور نابود کر دیا اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔

۲۰۔ وہ گمان کرتے ہیں کہ ابھی احزاب کا لشکر نہیں گیا اور اگر پلٹ آئیں تو یہ دوست رکھتے ہیں کہ بادیہ نشین بدوؤں کے درمیان منتشر اور مخفی ہو جائیں اور تمھاری خبریں حاصل کرتے رہیں اور اگر تمھارے درمیان رہیں تو سوائے تھوڑی سی دیر کے جنگ و پیکار نہ کریں۔

تفسیر

روکنے والا ٹولہ:

اس کے بعد منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنگِ احزاب کے میدان سے خود [illegible] کش ہوا اور دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی دعوت دیتا تھا۔ فرماتا ہے "خدا تم میں سے اس گروہ کو جانتا ہے جو کوشش [illegible] تے تھے کہ لوگوں کو جنگ سے منحرف کر دیں" (قد یعلم اللہ المعوقین منکم)۔

اور اسی طرح سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف آ [illegible] اس خطرناک جنگ سے دستبردار ہو جاؤ" (والقائلین لاخوانھم ھلم الینا)۔

وہی لوگ جو اہلِ جنگ نہیں ہیں اور سوائے کم مقدار کے اور وہ بھی بطور جبر و اکراہ یا دکھاوے کے جنگ کے لیے نہیں جاتے" (ولا یأتون البأس الا قلیلا)۔

"معوقین" "عوق" (بروزن شوق) کے مادہ سے کسی چیز سے روکنے اور باز رکھنے کے معنی [illegible] ہے۔ اور "باس" اصل میں سختی کے معنی میں ہے اور یہاں پر اس سے مراد "جنگ" ہے۔

اوپر والی آیت احتمالی صورت میں دو گروہوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک منافقین کے گروہ کی [illegible] جو مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھا ("منکم" کی تعبیر اس امر کی گواہ ہے) اور ان کی کوشش تھی کہ ضعیف الایمان [illegible] جنگ سے روکے رکھیں، یہ وہی "معوقین" تھے۔

دوسرے منافقین یا یہودیوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو میدان سے باہر بیٹھے ہوئے تھے [illegible] وقت اسلام کے مجاہد سپاہیوں سے آمنا سامنا ہوتا تو کہتے کہ ہمارے پاس آجاؤ اور اپنے آپ کو اس معرکہ سے نکا[illegible] یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف دوسرے جملہ میں اشارہ ہوا ہے)۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ شاید یہ آیت ایک ہی گروہ کی دو مختلف حالتوں کا بیان ہو۔ وہ لوگ جب [illegible] کے درمیان ہوتے ہیں تو انھیں جنگ سے روکتے ہیں اور جب ایک طرف ہو جاتے ہیں تو دوسروں کو [illegible] دعوت دیتے ہیں۔

ہم ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ ایک صحابیٔ رسولؐ کسی ضرورت کے تحت میدان "احزاب" سے [illegible] میں آیا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو دیکھا کہ اس نے اپنے سامنے روٹی، بھنا ہوا گوشت اور شراب رکھے ہوئے تھے، تو صحابی نے کہا تم تو یہاں عیش و عشرت میں مشغول ہو اور رسولِ خدا نیزوں اور تلواروں کے درمیان مصروفِ پیکار ہیں۔ [illegible] نے جواب میں کہا، اے بے وقوف! تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور مزے اڑاؤ۔ اس خدا کی قسم جس کی محمدؐ قسم [illegible] تا ہے وہ

اس میدان سے ہرگز پلٹ کر واپس نہیں آئے گا۔ اور یہ عظیم لشکر جو جمع ہو چکا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ سن کر وہ صحابی کہنے لگے تو جھوٹ بکتا ہے، خدا کی قسم میں ابھی رسول اللہ کے پاس جا کر تمہاری اس گفتگو سے باخبر کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے بارگاہِ رسالت میں پہنچ کر تمام ماجرا بیان کیا تو اوپر والی آیت نازل ہوئی۔

اس شانِ نزول کی بناء پر "اخوانھم" (ان کے بھائی) کا لفظ ہو سکتا ہے کہ حقیقی بھائی کے معنی میں ہو یا پھر ہم مسلک کے معنی میں ہو جیسا کہ سورۂ اسرار (بنی اسرائیل) کی آیت ۲۷ میں اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کو شیطانوں کے بھائی کا نام دیا گیا ہے: "ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین"

بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "ان تمام رکاوٹوں کا باعث یہ ہے کہ وہ تمھاری بابت تمام چیزوں میں بخیل ہیں" (اشحۃ علیکم)[1]

نہ صرف میدان جنگ میں جان قربان کرنے میں بلکہ وسائل جنگ مہیا کرنے کے لیے مالی امداد اور خندق کھودنے کے لیے جسمانی امداد حتیٰ کہ فکری امداد مہیا کرنے میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں۔ ایسا بخل جو حرص سے توأم ہوتا ہے اور ایسا حرص جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان کے بخل اور ہر قسم کے ایثار سے دریغ کرنے کے بیان کے بعد ان کے ان دوسرے اوصاف کو جو ہر عہد اور ہر دور کے تمام منافقین کے لیے تقریباً عمومیت کا درجہ رکھتے ہیں، بیان کرتے ہوئے کہتا ہے "جس وقت خوفناک اور بحرانی لمحات آتے ہیں تو وہ اس قدر بزدل اور ڈرپوک ہیں کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ ان کی آنکھوں میں ڈھیلے بے اختیار گردش کر رہے ہیں، اس شخص کی طرح جو جان کنی میں مبتلا ہو" (فاذا جاء الخوف رأیتھم ینظرون الیک تدور اعینھم کالذی یغشٰی علیہ من الموت)۔

چونکہ وہ صحیح ایمان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی زندگی میں ان کا کوئی مستحکم سہارا ہے، جس وقت کسی سخت حادثے سے دوچار ہوتے ہیں تو کلی طور پر اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں گویا چاہتے ہیں کہ ان کی روح قبض ہو جائے۔

پھر مزید کہتا ہے "لیکن یہی لوگ جس وقت کہ طوفان رک جاتا ہے اور حالات معمول پر آ جاتے ہیں تو تمھارے پاس یہ توقع لے کر آتے ہیں کہ گویا جنگ کے اصل فاتح یہی ہیں اور قرض خواہوں کی طرح پکار پکار کر اور سخت اور درشت الفاظ کے ساتھ مال غنیمت سے اپنے حصّہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس میں سخت گیر، بخیل اور حریص ہیں (فاذا ذھب الخوف سلقوکم بالسنۃ حداد اشحۃ علی الخیر)۔

---

[1] "اشحۃ" "شح" کے مادہ سے "شحیح" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسا بخل جس سے حرص ملا ہوا ہو۔ اور یہ لفظ اکثر مفسرین کے بقول یہاں محل اعراب کے لحاظ سے "حال" واقع ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بیان علت کے مقام میں حال ہو۔ (غور کیجئے گا)

"سلقوکم" "سلق" (بروزن خلق) کے مادہ سے کسی چیز کو غیظ و غضب سے کھولنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چاہے ہاتھ کا کھولنا ہو یا زبان کا۔ یہ تعبیر ان لوگوں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے جو آمرانہ اور تحکمانہ لب و لہجے میں چیخ و پکار کر کسی چیز کو طلب کرتے ہیں۔

"السنۃ حداد" تیز و تند زبانوں کے معنی میں ہے اور یہاں پر سختی کے ساتھ بات کرنے سے کنایہ ہے۔

آیت کے آخر میں ان کی آخری صفت کی طرف جو واقع میں ان کی تمام بدبختیوں کی جڑ اور بنیاد ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "وہ ہرگز ایمان نہیں لائے" (اولٰئک لم یؤمنوا)۔

"اور اسی بناء پر خدا نے ان کے اعمال نیست و نابود کر دیئے ہیں" (فاحبط اللہ اعمالھم)۔

کیونکہ ان کے اعمال ہرگز خدا کی منشأ اور ان کے خلوص پر مبنی نہیں ہیں اور "یہ کام خدا کے لیے بہت ہی آسان ہے" (وکان ذالک علی اللہ یسیرًا)۔

مجموعی طور پر ہم اس طرح نتیجہ نکالتے ہیں کہ "معوقین" (باز رکھنے والے) ایسے منافق تھے جن کی یہ صفات تھیں،

۱۔ بہت ہی کم تعداد کے علاوہ باقی کوئی بھی اہل جنگ و جہاد نہیں تھے۔
۲۔ وہ کبھی جان و مال کے لحاظ سے اہل ایثار و قربانی نہیں تھے۔ اور تھوڑی سے تھوڑی پریشانی کے متحمل بھی نہیں ہوتے تھے۔
۳۔ طوفانی اور بحرانی لمحات میں شدتِ خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو کلی طور پر کھو بیٹھتے تھے۔
۴۔ کامیابی کے موقع پر اپنے آپ کو تمام اعزازات کا وارث سمجھتے تھے۔
۵۔ چونکہ وہ بے ایمان تھے لہٰذا ان کے اعمال بھی بارگاہِ الٰہی میں بے قدر و قیمت تھے۔

یہی حال ہر دور اور زمانہ کے ہر معاشرہ کے منافقین کا رہا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی کیسی ظریفانہ انداز میں صفات بیان کی ہیں، جن کے ذریعہ ان کے ہم فکر لوگوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور موجودہ دور میں ہم اس کے کتنے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں !!

بعد والی آیت اس گروہ کی بزدلی اور خوف کی زیادہ فصیح انداز میں تصویر کشی کرتے ہوئے کہتی ہے۔ "وہ اس قدر وحشت زدہ ہو چکے ہیں کہ احزاب اور دشمن کے لشکروں کے پراگندہ ہو جانے کے بعد بھی یہ تصور کرتے ہیں کہ ابھی وہ نہیں گئے" (یحسبون الاحزاب لم یذھبوا)۔

وحشتناک اور بھیانک تصور نے ان کی فکر پر سایہ ڈالا ہوا ہے۔ گویا کفر کی افواج پے در پے ان کی آنکھوں کے سامنے قطار در قطار جاری ہیں، ننگی تلواریں لیے اور نیزے تانے ان پر حملہ کر رہی ہیں۔

یہ بزدل، جھگڑالو، ڈرپوک منافق اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں، جب کسی گھوڑے کے ہنہنانے یا کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز سنتے ہیں تو مارے خوف کے لرزنے لگتے ہیں کہ شاید احزاب کے لشکر واپس آ رہے ہیں۔

آگے چل کر کہتا ہے "اگر احزاب دوبارہ پلٹ کر آ جائے تو وہ اس بات پر تیار ہیں کہ بیابان کا رخ کر لیں اور بادیہ نشین بدوؤں

کے درمیان منتشر ہوکر پنہاں ہو جائیں"۔ (وان یأت الاحزاب یودوا لو انھم بادون فی الاعراب)۔
ہاں، ہاں وہ چلے جائیں اور وہاں جاکر رہیں اور ہمیشہ تمھاری خبروں کے جویا رہیں"۔ (یسئلون عن انبآئکم)۔
ہر مسافر سے تمھاری ہر ہر پل کی خبر کے جویا رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں احزاب ان کی جگہ کے قریب آ جائیں اور ان کا سایہ ان کے گھر کی دیواروں پر آ پڑے اور تم پر یہ احسان جتلائیں کہ وہ ہمیشہ تمھاری حالت اور کیفیت کے متلاشی تھے۔
اور آخری جملہ میں کہتا ہے کہ" بالفرض وہ فرار بھی نہ کرتے اور تمھارے درمیان ہی رہتے۔ پھر بھی سوائے تھوڑی سی جنگ کے وہ کچھ نہ کرتے"۔ (ولو کانوا فیکم ما قاتلوا الا قلیلا)۔
نہ ان کے جانے سے تم پریشان ہونا اور نہ ہی ان کے موجود رہنے سے خوشی منانا، کیونکہ نہ تو ان کی قدر و قیمت ہے اور نہ ہی کوئی خاص حیثیت، بلکہ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے۔
ان کی یہی تھوڑی سی جنگ بھی خدا کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی سرزنش اور ملامت کے خوف اور ظاہرداری یا ریاکاری کے لیے ہے کیونکہ اگر خدا کے لیے ہوتی تو اس کی کوئی حد و انتہا نہ ہوتی اور جب تک جان میں جان ہوتی وہ اس میدان میں ڈٹے رہتے۔

۲۱۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝
۲۲۔ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ۚ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝
۲۳۔ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝
۲۴۔ لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝
۲۵۔ وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝

ترجمہ

۲۱ تم لوگوں کے لیے رسول خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ تھا ان لوگوں کے لیے جو

رحمتِ خدا اور روزِ جزاء کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

۲۲۔ جب مؤمنین نے احزاب کے لشکر کو دیکھا تو کہا یہ وہی ہے جس کا خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور خدا اور اس کے رسول نے سچ فرمایا ہے اور اس چیز نے سوائے ان کے ایمان اور تسلیم کے کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۲۳۔ مؤمنین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ سے باندھے گئے عہد و پیمان پر صدقِ دل سے قائم ہیں، بعض اپنے عہد کو پورا کر گئے (اور انہوں نے اس کی راہ میں شربت شہادت نوش کر لیا) اور کچھ انتظار میں ہیں اور انہوں نے ہرگز اپنے عہد و پیمان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی۔

۲۴۔ مقصد یہ ہے کہ خدا سچوں کو ان کی سچائی کی بناء پر اجر دے اور جب چاہے منافقین کو عذاب دے۔ یا (اگر توبہ کریں تو) ان کی توبہ قبول کرے کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۵۔ خدا نے کافر احزاب کا منہ پھرا دیا وہ جلتے کڑھتے نامراد لوٹ گئے اور خدا نے اس میدان میں مؤمنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا۔ (انہیں فتح عطا کی) اور خدا طاقت ور اور ناقابلِ شکست ہے۔

تفسیر

جنگ احزاب میں سچّے مؤمنین کا کردار:

اب تک مختلف گروہوں اور ان کے جنگِ احزاب میں کارناموں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جن میں ضعیف الایمان مسلمان، منافق لوگ، کفر و نفاق کے سرغنے اور جہاد سے روکنے والے شامل ہیں۔

قرآن مجید اس گفتگو کے آخر میں "سچے مؤمنین" ان کے بلند حوصلوں، پامردوں، جرأتوں اور اس عظیم جہاد میں ان کی دیگر خصوصیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

اس بحث کی تمہید کو پیغمبر اسلامؐ کی ذات سے شروع کرتا ہے جو مسلمانوں کے پیشوا، سردار، اور اسوۂ کامل تھے، خدا کہتا ہے: "تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی اور (میدانِ احزاب میں) ان کا کردار ایک اچھا نمونہ اور اسوہ تھا، ان لوگوں کے لیے جو رحمتِ خدا اور روزِ قیامت کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں"۔ (لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الاٰخر و ذكر الله كثيرًا)۔

تمہارے لیے بہترین اسوہ اور نمونہ، نہ صرف اس میدان میں بلکہ ساری زندگی پیغمبر اسلامؐ کی ذات والا صفات ہے۔ آپ کے بلند حوصلے، صبر و استقامت، پامردی، زیرکی، دانائی، خلوص، خدا کی طرف توجہ، حادثات پر کنٹرول، مشکلات اور مصائب کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا، غرضیکہ ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لیے نمونۂ کامل اور اسوۂ حسنہ ہے۔

وہ ایسا عظیم ناخدا ہے کہ جب اس کی کشتی سخت ترین طوفانوں میں گھر جاتی ہے تو ذرہ برابر بھی کمزوری، گھبراہٹ اور سراسیمگی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ کشتی کا ناخدا بھی ہے اور اس کا قابل اطمینان لنگر اور چراغ ہدایت بھی۔ وہ اس میں بیٹھنے والوں کے لیے آرام و سکون کا باعث بھی ہے اور ان کے لیے راحت جان بھی۔

وہ دوسرے مؤمنین کے ساتھ مل کر کدال ہاتھ میں لیتا ہے اور خندق کھودتا ہے، بیلچے کے ساتھ پتھر اکٹھا کر کے خندق سے باہر ڈال آتا ہے، اپنے اصحاب کے حوصلے بڑھانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کے لیے ان سے مزاح بھی کرتا ہے، ان کے قلب و روح کو گرمانے کے حربی اور جوش و جذبہ دلانے والے اشعار پڑھ کر انھیں ترغیب بھی دلاتا ہے، ذکر خدا کرنے پر مسلسل اصرار کرتا ہے اور انھیں درخشاں مستقبل اور عظیم فتوحات کی خوشخبری دیتا ہے۔ انہیں منافقوں کی سازشوں سے متنبہ کرتا ہے اور ان سے ہمیشہ خبردار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

صحیح حربی طریقوں اور بہترین فوجی چالوں کو انتخاب کرنے سے لمحہ بھر بھی غافل نہیں رہتا۔ اس کے باوجود مختلف طریقوں

سے دشمن کی صفوں ... سے تجی نہیں چوکتا۔

جی ہاں! ... سے اور ان کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس میدان میں بھی اور دوسرے تمام میدانوں میں بھی۔

"اسوہ" ...

لفظوں میں کسی کی تا... اس حالت کے معنی میں ہے جو انسان دوسرے کی پیروی کے وقت اپناتا ہے۔ دوسرے ... نام ہے۔ اس بنا پر اس کا معنی مصدری ہوگا نا کہ وصفی اور "لقد كان لكم فی رسول اللہ اسوة ..." کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے لیے پیغمبرؐ خدا کی ذات میں اچھی اقتدا اور پیروی ہے۔ ان کی اقتداء کرنے سے اپنی ... "صراطِ مستقیم" کو اختیار کر سکتے ہو۔

جاذب نظر ... آیت میں اس اسوۂ حسنہ کو ان اشخاص کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے جو تین خصوصیات کے حامل ہوں یعنی اللہ ... امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حقیقت میں ... اس بات کا سبب ہے اور ذکر خدا اس کو دوام بخشتا ہے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ جن کا دل اسی قسم کے ایمان ... ہو، وہ پیغمبر کے نقش قدم پر چل نہیں سکتا۔ نیز اس راہ پر چلتے ہوئے بھی اگر ہمیشہ ذکر خدا نہ کرے اور شیاطین کو اپنے ... تاسی اور اقتدار کو جاری وساری نہیں رکھ سکے گا۔

یہ نکتہ بھی قابل تو... علی علیہ السلام باوجود اس جواں مردی اور شجاعت کے جو جنگ کے تمام میدانوں میں ان سے دیکھنے میں آئی ... زندہ مثال اسی جنگِ احزاب میں بھی دیکھنے میں آئی کہ جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔ ایک گفتگو میں فرما...

"کنا اذا ا... الباس اتقینا برسول اللہ فلم یکن احد منا اقرب الی ال... منہ"

جب بھی ... ہوتی تو ہم رسول اللہؐ کی طرف پناہ لیتے اور ہم سے کوئی شخص بھی ان سے زیادہ دشمن کے قریب ...؎

اس مقدمے اور ... مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے قرآن یوں فرماتا ہے: "جس وقت مومنین نے احزاب کے لشکروں کو دیکھا تو ... کہ ان پر گھبراہٹ طاری نہ ہوئی بلکہ کہا کہ یہ وہی چیز ہے جس کا خدا اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور جس کی پہلی ... ہو چکی ہے اور خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا ہے اور اس واقعے نے ان کے ایمان اور جذبۂ تسلیم کے علاوہ ... میں اضافہ نہیں کیا": (ولما رأ المومنون الاحزاب قالوا ھذا ما وعدنا اللہ ورسولہ و... ق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما)۔

یہ کونسا وعدہ تھا جو خدا اور ... نے کیا تھا؟

؎ نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ...

بعض کہتے ہیں کہ یہ اس گفتگو کی طرف اشارہ ہے جو پہلے پیغمبر اکرمؐ نے کی تھی کہ عنقریب ت... عرب اور تمہارے مختلف دشمن ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر تمہاری طرف آئیں گے۔ لیکن جان لو کہ آخر کار فتح تمہاری ہوگی۔

مومنین نے جب احزاب کے ہجوم کو دیکھا تو یقین کر لیا کہ یہ پیغمبر کا وہی وعدہ ہے اور کہا کہ اب ... وعدے کا پہلا حصہ وقوع پذیر ہو چکا ہے تو دوسرا حصہ یعنی فتح و کامرانی بھی یقیناً اس کے پیچھے پیچھے آئے گی۔ لہٰذا ان کے ایمان اور جذبۂ تسلیم میں اضافہ ہو گیا۔

دوسرا یہ کہ خدا نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۴ میں مسلمانوں سے فرمایا تھا:

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ آسانی کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاؤ گے، بغیر اس کے کہ کچھ حوادث مثل گذشتہ لوگوں کے حوادث کے تمہارے لیے ظاہر ہوں، وہی لوگ جو شدید پریشانیوں میں مبتلا ہوئے اور اس طرح سے ان کا عرصہ حیات ان کے لیے تنگ ہوا کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی مدد کہاں ہے۔"

خلاصہ یہ کہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم آزمائش کی سخت گھاٹیوں میں آزمائے جاؤ گے۔ ... احزاب کو دیکھ کر خدا اور رسولؐ کی گفتگو کی صداقت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا گیا۔

البتہ ان دونوں تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ ایک تو اصل میں خدا کا وعدہ ہے اور دوسرا اس کے پیغمبر کا وعدہ ہے اور یہ دونوں چیزیں زیرِ بحث آیت میں اکٹھی ... ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو جمع کرنا نہایت ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بعد والی آیت مومنین کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی اقتدا میں سب سے زیادہ پیش قدمی کرتے تھے، وہ خدا سے کیے ہوئے اپنے اس عہد و پیمان پر قائم تھے کہ وہ آخری سانس اور آخری قطرۂ خون تک فداکاری اور قربانی کے لیے تیار رہیں۔ فرمایا گیا ہے: "مومنین میں ایسے بھی ہیں جو اس عہد و پیمان پر قائم ہیں جو انھوں نے خدا سے باندھا ہے ان میں سے کچھ نے تو میدانِ جہاد میں شربتِ شہادت نوش کر لیا ہے اور بعض انتظار میں ہیں۔" (من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر)۔

"اور انھوں نے اپنے عہد و پیمان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی" اور نہ ہی ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی ہے: (وما بدلوا تبدیلا)۔

منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے برعکس کہ جنہیں طوفان حوادث اِدھر سے اُدھر پھینک دیتے ہیں اور جو روزانہ اپنے ناتواں دماغ میں نت نئے اور ناپاک منصوبے پروان چڑھاتے رہتے ہیں، یہ ثابت الایمان مومن پہاڑ کی طرح محکم اور استوار ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ جو عہد و پیمان انہوں نے اس کے ساتھ باندھا ہے وہ ہرگز ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

لفظ "نحب" (بروزن "عہد") عہد، نذر اور پیمان کے معنی میں ہے اور کبھی موت ... گر کر ...

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ آیت کن افراد کے بارے ہے۔

اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم ابوالقاسم حسکانی سند کے ساتھ حضرت علیؑ علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"فینانزلت (رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه) فانا والله المنتظر و مابدلت تبدیلا"

آیہ "رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه" ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور بخدا میں ہی وہ شخص ہوں جو (شہادت کا) انتظار کر رہا ہوں (اور قبل ازیں ہم میں سے حمزہ سیّد الشہداء جیسے لوگ مردانہ وار شربت شہادت نوش کر چکے ہیں) اور میں نے ہرگز اپنی روش اور اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی نہیں کی اور اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم ہوں۔[1]

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ "من قضی نحبه" کا جملہ شہداء بدر و احد کی طرف اشارہ ہے اور "منهم من ینتظر"، کا جملہ دوسرے سچے مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جو فتح یا شہادت کے انتظار میں تھے۔

"انس بن مالک سے بھی نقل ہوا ہے کہ ان کے چچا "انس بن نضر" جنگ بدر کے دن حاضر نہیں تھے۔ جنگ کے خاتمے پر جب انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے سخت افسوس کیا کہ وہ اس جہاد میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ تو اس وقت خدا کے ساتھ عہد کیا کہ اگر کوئی جنگ پیش آئی تو اس میں ضرور شریک ہوں گے اور جب تک جان میں جان ہے، میدان میں ڈٹے رہیں گے۔ لہٰذا انھوں نے دوسری جنگ (احد) میں شرکت کی اور جس وقت کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تو وہ ڈٹے رہے۔ بڑی بے جگری کے ساتھ لڑنے کے بعد مجروح ہوئے اور آخرکار درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔[2]

ابن عباس سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

"منهم من قضی نحبه" کا جملہ حمزہ بن عبدالمطلب، باقی شہداء احد اور انس بن نضر اور ان کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے۔[3]

ان تفسیروں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے جو تمام ان شہداء اسلام پر محیط ہے جو جنگ احزاب سے پہلے شربت شہادت نوش فرما چکے تھے۔ اور منتظرین بھی تمام وہ لوگ ہیں جو فتح و کامرانی اور شہادت کے انتظار میں زندہ رہے ہیں۔ اور پہلے گروہ کے سردار حضرت حمزہؑ اور دوسرے کے سردار

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ)

[1] مفردات راغب، مجمع البیان اور لسان العرب (نحب)

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[1] مجمع البیان آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، فی ظلال القرآن اور مجمع البیان (مختصر سے فرق کے ساتھ)

[3] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

جناب علی بن ابی طالبؑ قرار پاتے ہیں۔

اسی لیے تفسیر صافی میں آیا ہے:

"ان اصحاب الحسین بکربلا کانوا کل من اراد الخروج ودع الحسین وقال: السلام علیک یا بن رسول الله! فیجیبه وعلیک السلام ونحن خلفك، ویقرء "فمنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر""

اصحاب امام حسینؑ میں سے جو بھی کربلا میں میدان کی طرف جانا چاہتا تو امام عالی مقام سے الوداع کرتا اور کہتا آپؑ پر سلام ہو اے فرزند رسول! (سلام وداع کرتا) تو امام بھی انہیں جواب دیتے اور پھر اس آیت کی تلاوت کرتے: "فمنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر"۔[1]

کتب مقاتل سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السّلام نے دوسرے شہداء مثلاً مسلم بن عوسجہ کے جنازہ کے پاس بھی اور جس وقت "عبداللہ بن یقطر" کی خبر شہادت آپ کو ملی، اس وقت بھی اس آیت کو تلاوت فرمایا۔[2]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت اس قسم کا وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر زمانے کے تمام سچے مومنین پر محیط ہے۔ چاہے وہ ہوں، جنہوں نے جامۂ شہادت زیب تن کیا اور چاہے وہ ہوں جو بغیر کسی قسم کے تنزل کے اپنے خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جہاد و شہادت پر آمادہ رہے۔

بعد والی آیت میں مؤمنین اور منافقین کے اعمال کے نتیجے اور آخری ہدف کو ایک مختصر سے جملے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "لیجزی الله الصادقین بصدقهم ویعذب المنافقین ان شاء او یتوب علیهم ان الله کان غفورا رحیما"۔ "مقصد یہ ہے کہ خدا سچوں کو ان کی سچائی کی وجہ سے جزائے خیر دے اور منافقین کو جب چاہے عذاب دے۔ اور (اگر وہ توبہ کریں) تو انہیں بخش دے اور ان کی توبہ قبول کرے۔ کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے"۔

نہ تو مخلص مومنین کی سچائی اور وفاداری بغیر جزائے خیر کے رہے گی اور نہ ہی منافقین کی کمزوری اور تخریب کاری بغیر عذاب اور سزا کے رہے گی۔

قرآن توبہ کے دروازے اور بازگشت کی راہیں منافقین تک کے لیے کھلی رکھتا ہے، لہٰذا "ویتوب علیهم" کے جملہ کے ساتھ ان پر توبہ کے دروازے کھولتا ہے اور "غفور و رحیم" کے ساتھ اپنی توصیف کرتا ہے تاکہ ایمان، صدق اور شرعی فرائض پر عمل درآمد کا جذبہ ان میں بیدار کیا جائے۔

[1] تفسیر صافی آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین ج ۴ ص ۲۵۹۔

چونکہ یہ جملہ منافقین کے غلط اعمال کے نتیجے کے طور پر ذکر ہوا ہے لہٰذا بعض بزرگ مفسرین نے اس سے اس طرح استفادہ
کیا ہے کہ ممکن ہے بعض اوقات ایک عظیم ... آمادہ دلوں میں حق و حقیقت کی طرف حرکت، انقلاب اور بازگشت کا ذریعہ
بن جائے اور وہ ایسی برائی بن جانے جو ایک خیر اور نیکی کا نقطۂ آغاز ٹھہرے۔ [1]

زیر بحث آخری آیت جنگ احزاب کے سلسلہ میں حرف آخر کی صورت میں اس بحث کو ختم کرتی ہے۔ مختصر سی
باتوں میں اس ماجرے کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ "خدا نے کافروں کو ایسی حالت میں واپس لوٹایا کہ ان کے دل غیظ
و غضب سے لبریز تھے، وہ غم و غصہ کیا ... تھے اور وہ کسی ایسے نتیجے پر نہ پہنچ سکے جو ان کے پیش نظر تھا" (ورد
الله الذين كفروا بغيظهم لم ينالوا خيرا)۔

"غیظ" کا معنی غصہ ہے، اور کبھی غم ... کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یہاں پر دونوں معانی مراد ہیں۔ لشکر احزاب، لشکر اسلام
پر آخری فتح کا امید وار تھا لیکن ناکام ... غصہ کی حالت میں اپنے علاقوں کی طرف لوٹ گیا۔

یہاں پر "خیر" سے مراد ... البتہ لشکر کفر کی کامیابی کبھی بھی خیر نہیں تھی لیکن قرآن ان کی سوچ کی عکاسی
کرتے ہوئے اسے "خیر" سے تعبیر کرتا ہے ... طرف اشارہ ہے کہ وہ اس میدان میں کسی بھی قسم کی کامیابی سے ہمکنار نہیں
ہو سکے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "خیر" سے مراد "مال" ہے کیونکہ یہ لفظ کئی دوسرے مقامات پر بھی مال کے لیے بولا گیا
ہے جن میں سے سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۰ بھی ہے جسے آیۂ وصیت کہتے ہیں، اس میں ہے: "ان ترك خيرا الوصية
للوالدين"۔

کیونکہ لشکر کفر کے حملے کے اصل مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مدینہ کی غنیمتوں کو حاصل کریں اور اس سرزمین
کو غارت کریں۔

لیکن "خیر" کے مفہوم کو یہاں "مال" کے معنی میں محدود کرنے پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہاں پر اس
سے ہر قسم کی کامیابی مراد ہے جسے وہ مدنظر رکھے ہوئے تھے اور مال بھی ان سے ایک تھا جس سے وہ محروم رہے۔

بعد والے جملہ میں قرآن مزید کہتا ہے: "خدا نے اس میدان میں مؤمنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا" (وكفى
الله المؤمنين القتال)۔

اس قسم کے اسباب و عوامل فراہم کیے کہ کسی قسم کی ایسی سختی پیش نہ آئی جس سے مؤمنین کا زیادہ نقصان ہوتا اور
جنگ ختم ہو گئی، کیونکہ ایک طرف سے شدید طوفان اور سردی نے مشرکین کو درہم برہم کر دیا اور دوسری طرف خدا کے نظر
نہ آنے والے لشکر کے ذریعے رعب، خوف اور دہشت کو ان کے دلوں میں ڈال دیا اور تیسری طرف سے حضرت علی
ابن ابی طالب علیہ السلام کی ضرب دشمن کے سب سے بڑے پہلوان عمرو بن عبدود پر پڑی جس سے وہ دیارِ عدم میں

[1] تفسیر المیزان آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

جا پہنچا۔ اس سے ان کی امیدوں اور آرزوؤں کی عمارت دھڑام سے نیچے آگری۔ یہ امر اس بات کا سبب ہوا کہ وہ مدینہ
کا محاصرہ ترک کر کے اپنے اپنے قبائل کی طرف ناکام واپس پلٹ گئے۔

آیت کے آخری جملہ میں فرمایا گیا ہے: "خدا قوی اور ناقابل شکست ہے" (وكان الله قويا عزيزا)۔
ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ "قوی" تو ہوں لیکن "عزیز" یعنی ناقابل شکست نہ ہوں یعنی ان پر زیادہ قوی شخص کامیاب
ہو جائے۔ لیکن "ناقابل شکست طاقتور" صرف اور صرف خدا ہے جس کی طاقت اور قدرت لامتناہی ہے۔ وہی تو ہے
جس نے اس قسم کے بہت سخت اور خطرناک میدان میں اس قسم کی کامیابی مومنین کے نصیب کی کہ لڑائی، جنگ اور جان
دینے تک کی نوبت بھی نہ آئی۔

جنگِ احزاب کے چند اہم پہلو :

۱۔ جنگ کی اہمیت : جنگِ احزاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں تمام قبائل اور
مختلف اسلام دشمن طاقتیں نوخیز اسلام کی سرکوبی کے لیے متحد ہو گئی تھیں۔
جنگ احزاب کفر کی آخری کوشش، ان کے ترکش کا آخری تیر اور شرک کی قوت کا آخری مظاہرہ تھا۔ اسی بنا پر جب
دشمن کا سب سے بڑا پہلوان عمرو بن عبدود عالم اسلام کے دلیر مجاہد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مقابلے
میں آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"برز الايمان كله الى الشرك كله"۔

"سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے کفر اور شرک کے مقابلہ میں آگیا ہے"۔ [1]

کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فتح کفر کی ایمان پر یا ایمان کی کفر پر مکمل کامیابی تھی۔ دوسرے لفظوں
میں یہ فیصلہ کن معرکہ تھا جو اسلام اور شرک کے مستقبل کا تعین کر رہا تھا۔ اسی بنا پر دشمن کی اس عظیم جنگ اور کارزار
میں کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ابتکار عمل مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔
دشمن کا ستارۂ اقبال غروب ہو گیا اور اس کی طاقت کے ستون ٹوٹ گئے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ
حضرت رسول گرامی نے جنگِ احزاب کے خاتمے پر فرمایا:

"الآن نغزوهم ولا يغزوننا"

"اب ہم ان سے جنگ کریں گے اور ان میں ہم سے جنگ کی سکت نہیں ہے"۔ [2]

۲۔ لشکروں کی تعداد : بعض مؤرخین نے لشکر کفار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ لکھی ہے۔ مقریزی اپنی کتاب
"الامتاع" میں لکھتے ہیں:

[1] بحار الانوار کی جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۵ میں یہ حدیث "کراجکی" سے نقل کی گئی ہے۔

[2] تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۸۴۔

"صرف قریش نے چار ہزار جنگ جوؤں، تین سو گھوڑ [illegible] خندق کے کنارے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ قبیلہ بنی سلیم سات سو افراد کے [illegible] ان سے آ ملا۔ قبیلہ بنی فزارہ ہزار افراد کے ساتھ، بنی اشجع اور بنی مرہ [illegible] سو افراد کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور دوسرے قبائل نے بھی اپنے آدمی بھیجے [illegible] کی مجموعی تعداد [illegible] سے بھی زیادہ بنتی ہے۔"[1]

جبکہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی انہوں نے مدینہ کے قریب [illegible] پہاڑی کے دامن کو جو ایک بلند جگہ تھی اپنے اصلی لشکرگاہ کے طور پر منتخب کیا تھا جو خندق [illegible] کہ وہ اپنے تیر اندازوں کے ذریعہ خندق سے آنے جانے والوں پر کنٹرول کر سکتے تھے۔

ہر حال لشکر کفر نے مسلمانوں کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا [illegible] ایک روایت کے [illegible] دن دوسری کے مطابق پچیس دن اور بعض روایات کے مطابق ایک ماہ تک محاصرہ [illegible]

باوجودیکہ دشمن مسلمانوں کی نسبت مختلف پہلوؤں سے برتری رکھتا تھا [illegible] چکے ہیں، آخرکار ناکام ہو کر واپس پلٹ گیا۔

۳۔ خندق کی کھدائی:

جیسا کہ معلوم ہے کہ خندق کے کھودنے کا سلسلہ حضرت سلمان [illegible] کے مشورہ سے وقوع پذیر ہوا۔ خندق اس زمانے میں ملک ایران میں دفاع کا مؤثر ذریعہ تھا اور جزیرۃ العرب میں اس وقت تک اس کی مثال نہیں تھی اور عرب میں اس کا شمار نئی ایجادات میں ہوتا تھا۔ اطراف مدینہ میں اس کا کھودنا فوجی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ خندق دشمن کے حوصلوں کو پست کرنے اور مسلمانوں کو روحانی تقویت کا بھی ایک مؤثر ذریعہ تھی۔

خندق کے کوائف اور جزئیات کے بارے میں صحیح طور پر معلومات تک رسائی تو نہیں ہے البتہ مؤرخین نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ اس کا عرض اتنا تھا کہ دشمن کے سوار جست لگا کر بھی اس کو عبور نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی گہرائی یقیناً اتنی تھی کہ اگر کوئی شخص اس میں داخل ہو جاتا تو آسانی کے ساتھ دوسری طرف باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں مسلمان تیر اندازوں کا خندق والے علاقہ پر اتنا تسلط تھا کہ اگر کوئی شخص خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتا تو ان کے لیے ممکن تھا کہ اسے خندق کے اندر ہی تیر کا نشانہ بنا لیتے۔

رہی اس کی لمبائی تو مشہور روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس، دس افراد کو چالیس ہاتھ (تقریباً ۲۰ میٹر) خندق کھودنے پر مامور کیا تھا اور مشہور قول کے پیش نظر کہ لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی تو مجموعی طور پر اس کی لمبائی اندازاً بارہ ہزار ہاتھ (چھ ہزار میٹر) ہوگی۔

[1] بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ [illegible]۔

اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس زمانے میں نہایت ہی ابتدائی وسائل کے ساتھ اس قسم کی خندق کھودنا بہت ہی طاقت فرسا کام تھا خصوصاً جبکہ مسلمان خوراک اور دوسرے وسائل کے لحاظ سے بھی سخت تنگی میں تھے۔

یقیناً خندق کھودی بھی نہایت کم مدت میں گئی۔ یہ امر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ لشکر اسلام پوری ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے حملہ آور ہونے سے پہلے ضروری پیش بندی کر چکا تھا اور وہ بھی اس طرح سے کہ لشکر کفر کے مدینہ پہنچنے سے تین دن پہلے خندق کی کھدائی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

۴۔ بہت بڑی آزمائش کا میدان:

جنگ احزاب عام مسلمانوں اور ان لوگوں کے لیے جو اسلام کے دعوے دار تھے، آزمائش کی عجیب کسوٹی تھی۔ اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی جو کبھی کبھار دعوے تو غیر جانبدار ہونے کا کرتے تھے، لیکن باطنی طور پر دشمنان اسلام سے ملے ہوئے تھے۔

اس جنگ سے تینوں گروہ (سچے مؤمنین، ضعیف الایمان اور منافقین) کا موقف ان کے اعمال و کردار کے ذریعے مکمل طور پر نمایاں ہو گیا اور اسلامی اقدار پورے طور پر آشکار ہو گئیں۔ ان تینوں نے جنگ احزاب کی گرم بھٹی میں اپنے مخلص ہونے یا نہ ہونے کو ثابت کر دیا۔

اس حادثے کا طوفان اس قدر تند اور تیز تھا کہ کوئی بھی شخص جو کچھ اس کے دل میں تھا چھپا نہ سکا اور جن مطالب کے ظاہر ہونے کے لیے معمولی حالات میں سالہا سال کی ضرورت تھی وہ ایک مہینہ سے بھی کم مدت میں الم نشرح ہو کر سامنے آ گئے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبر نے اپنے صبر و استقامت، دلیرانہ مزاحمت، حوصلے، خدا پر توکل اور اپنے آپ پر اعتماد کا عظیم مظاہرہ کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے خندق کھودنے میں ان کے ساتھ مواسات اور ہم کاری کر کے اور جنگ کے مشکلات برداشت کر کے آپؐ نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ جو کچھ آپ اس سے پہلے اپنی تعلیمات کی صورت میں لا چکے ہیں، ان پر آپؐ کو صدق دل سے یقین ہے اور آپ ان کے وفادار ہیں اور جو کچھ آپ لوگوں سے کہتے ہیں، اس پر پہلے خود عمل کرتے ہیں۔

۵۔ حضرت علیؑ کی تاریخی جنگ:

اس جنگ کا ایک اہم واقعہ حضرت علیؑ کا دشمن کے لشکر کے نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدود کے ساتھ مقابلہ تھا۔ تاریخ میں آیا ہے کہ لشکر احزاب نے جن دلاوران عرب میں سے بہت طاقت ور افراد کو اس جنگ میں اپنی امداد کے لیے دعوت دے رکھی تھی، ان میں سے پانچ افراد زیادہ مشہور تھے: عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ، نوفل اور ضرار۔ یہ لوگ دوران محاصرہ ایک دن دست بدست لڑائی کے لیے تیار ہوئے، لباس جنگ بدن پر سجایا اور خندق کے ایک کم چوڑے حصے سے، جو مجاہدین اسلام کے تیروں کی پہنچ سے کسی قدر دور تھا، اپنے گھوڑوں کے ساتھ دوسری طرف جست لگائی اور لشکر اسلام کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے عمرو بن عبدود زیادہ مشہور اور نامور تھا۔ اس کی "کوئی ہے بہادر" کی آواز میدان احزاب میں گونجی اور چونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس کے مقابلے کے لیے تیار نہ ہوا لہٰذا وہ زیادہ گستاخ ہو گیا اور مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کا مذاق اڑانے لگا اور کہنے لگا،

تم جو کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں ہیں اور ہمارے مقتول جہنم میں تو کیا تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے میں بہشت میں بھیجوں یا وہ مجھے جہنم کی طرف روانہ کرے ؟

اور اس موقع پر اس نے اپنے یہ مشہور اشعار پڑھے :

ولقد بححت عن الندا بجمعکم ھل من مبارز!

ووقفت اذجبن المشجع موقف البطل المناجز!

ان السماحة والشجاعة فی الفتی خیر الغرائز !!

تمہارے اجتماع میں میں نے اتنا پکارا اور مبارز طلبی کی کہ میری آواز بیٹھ گئی۔

میں اس وقت اس جگہ پر کھڑا ہوں کہ بہادر نما جنگجو شجاع اس کی جگہ پر کھڑا ہونے سے گھبراتے ہیں۔

جی ہاں! شرافت اور شجاعت جواں مردوں کی بہترین خصلتیں ہیں۔

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کے شر کو مسلمانوں کے سر سے دور کر دے۔ لیکن حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی بھی اس کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوا تو آنحضرتؐ نے علی ابن ابی طالبؑ سے فرمایا: "یہ عمرو بن عبدود ہے" حضرت علیؑ نے عرض کی حضور! میں بالکل تیار ہوں خواہ عمرو ہی کیوں نہ ہو۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا: میرے قریب آؤ! چنانچہ علی علیہ السلام آپ کے قریب گئے اور آنحضرتؐ نے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنی مخصوص تلوار ذوالفقار انہیں عطا فرمائی اور ان الفاظ میں انہیں دعا دی :

" اللّٰھم احفظہ من بین یدیہ ومن خلفہ وعن یمینہ وعن شمالہ ومن فوقہ ومن تحتہ۔

" خدایا! علیؑ کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے اور اوپر اور نیچے سے حفاظت فرما۔

حضرت علی علیہ السلام بڑی تیزی سے عمرو کے مقابلہ میں یہ اشعار پڑھتے ہوئے میدان میں اترے۔

لا تعجلن فقد اتاک مجیب صوتک غیر عاجز!

ذو نیة و بصیرة والصدق منجی کل فائز

انی لارجو ان اقیم علیک نائحة الجنائز!

من ضربة غلاء یبقی صوتھا بعد الھزاھز

جلدی نہ کرو کیونکہ تیری پکار کا قوی اور طاقتور جواب دینے والا اب آ گیا ہے۔

وہ شخص جو پاک نیت، شائستہ بصیرت اور فاتح انسان کے لیے نجات دینے والی صداقت رکھتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ نوحہ کرنے والیوں کی نوحہ زاری تیرے جنازہ کے پاس بلند کراؤں گا۔

ایسی واضح ضربت سے کہ جس کی صدا جنگ کے میدانوں کے بعد بھی باقی رہے۔ اور ہر جگہ پہنچے۔

یہی وہ موقع تھا کہ پیغمبر ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا۔

" برز الایمان کلہ الی الشرک کلہ "

پورے کا پورا ایمان پورے کے پورے کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے[۱]

امیر المومنین علی علیہ السلام نے پہلے تو اسے اسلام کی دعوت دی جسے اس نے قبول نہ کیا۔ پھر میدان چھوڑ کر چلے جانے کو کہا۔ اس پر بھی اس نے انکار کیا اور اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھا آپؑ کی تیسری پیشکش یہ تھی کہ گھوڑے سے اتر آئے اور پیادہ ہو کر دست بدست لڑائی کرے۔

عمرو آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عرب میں سے کوئی بھی شخص مجھے ایسی تجویز دے گا۔ گھوڑے سے اتر آیا اور علی علیہ السلام پر اپنی تلوار کا وار کیا۔ لیکن امیر المومنینؑ نے اپنی مخصوص مہارت سے اس وار کو اپنی سپر کے ذریعے روکا۔ مگر تلوار نے سپر کو کاٹ کر آپؑ کے سر مبارک کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا۔ عمرو بن عبدود سے فرمایا، تو عرب کا زبردست پہلوان ہے، جب کہ میں تجھ سے تن تنہا لڑ رہا ہوں۔ لیکن تو نے اپنے پیچھے کن لوگوں کو جمع کر رکھا ہے۔ اس پر عمرو نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے عمرو کی پنڈلی پر تلوار کا وار کیا، جس سے وہ سرو قد زمین پر لوٹنے لگا۔ شدید گرد و غبار نے میدان کی فضا کو گھیر رکھا تھا۔ کچھ منافقین یہ سوچ رہے تھے کہ حضرت علیؑ، عمرو کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے تکبیر کی آواز سنی تو علیؑ کی کامیابی ان پر واضح ہو گئی۔ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے سر مبارک سے خون بہہ رہا تھا۔ اور لشکر گاہ اسلام کی طرف خراماں خراماں واپس آ رہے تھے۔ جبکہ فتح کی مسکراہٹ آپؑ کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اور عمرو کا بے سر پیکر میدان کے کنارے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

عرب کے مشہور پہلوان کے مارے جانے سے لشکر احزاب اور ان کی آرزوؤں پر ضرب کاری لگی۔ ان کے حوصلے پست اور دل انتہائی کمزور ہو گئے۔ اس ضرب نے ان کی فتح کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کامیابی کے بارے میں حضرت علیؑ سے ارشاد فرمایا:

" لو وزن الیوم عملک بعمل جمیع امة محمد لرجح عملک علی عملھم وذالک انہ لم یبق بیت من المشرکین الا وقد دخل ذل بقتل عمرو ولم یبق بیت من المسلمین الا وقد دخل عز بقتل عمرو!

اگر تمہارے آج کل کے عمل کو ساری اُمت محمد کے اعمال سے موازنہ کریں تو وہ ان پر بھاری

---

[۱] بحار الانوار جلد ۲۰ صفحہ ۲۱۵، ابن ابی الحدید : شرح نہج البلاغہ جلد نمبر ۴ صفحہ ۳۳۴، احقاق الحق جلد نمبر ۶ صفحہ ۹۔ یہ روایت ان کتب کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔

ہوگا۔ کیونکہ عمرو کے مارے جانے سے مشرکین کا کوئی ایسا گھر باقی نہیں رہا جس میں ذلت وخواری داخل نہ ہوئی ہو اور مسلمانوں کا کوئی بھی گھر ایسا نہیں ہے جس میں عمرو کے قتل ہو جانے کی وجہ سے عزت داخل نہ ہوئی ہو۔"[1]

اہلِ سنّت کے مشہور عالم، حاکم نیشاپوری نے اس گفتگو کو نقل کیا ہے۔ البتہ مختلف الفاظ کے ساتھ اور وہ یہ ہے:

"لمبارزة علی بن ابی طالب لعمرو بن عبد ود یوم الخندق افضل من اعمال اُمتی الی یوم القیامة "[2]

"یعنی علی ابن ابی طالب کی خندق کے دن عمرو بن عبدود سے جنگ میری امت کے قیامت کے اعمال سے افضل ہے۔"

آپ کے اس ارشاد کا فلسفہ واضح ہے، کیونکہ اس دن اسلام اور قرآن ظاہراً نابودی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ان کے لیے زبردست بحرانی لمحات تھے۔ جس شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فداکاری کے بعد اس میدان میں سب سے زیادہ ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا، اسلام کو اس خطرے سے محفوظ رکھا، قیامت تک اس کے دوام کی ضمانت دے دی، اس کی فداکاری سے شجرِ اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور پھر اسلام عالمین پر پھیل گیا لہٰذا سب لوگوں کی عبادتیں اس کی مرہون منت قرار پاگئیں۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے کسی آدمی کو پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ عمرو بن عبدود کے لاشے کو دس ہزار درہم میں خرید لائے، شاید ان کا یہ خیال تھا کہ مسلمان عمرو کے بدن کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو سنگدل ظالموں نے حضرت حمزہؓ کے بدن کے ساتھ جنگِ احد میں کیا تھا) لیکن رسول اکرمؐ نے فرمایا: اس کا لاشہ تمھاری ملکیت ہے، ہم مُردوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جس وقت عمرو کی بہن اپنے بھائی کے لاشے پر پہنچی اور اس کی قیمتی زرہ کو دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے بدن سے نہیں اتاری تو اس نے کہا:

"ماقتله الا کفو کریم"

"میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس کا قاتل کریم اور بزرگوار شخص ہی تھا۔"[3]

۶۔ پیغمبرِ اسلام کے فوجی اور سیاسی اقدام:

پیغمبر اکرمؐ کی اور مسلمانوں کی جنگِ احزاب میں کامیابی کے بہت سے عوامل تھے۔ مثلاً تائیدِ الٰہی جو آندھی اور شدید طوفان کے ذریعے

---

[1] بحارالانوار جلد ۲۰ صفحہ [illegible]۔

[2] مستدرک حاکم جلد نمبر ۳ صفحہ [illegible]۔

[3] اس حصے میں "احقاق الحق" جلد نمبر [illegible]، بحارالانوار جلد نمبر [illegible]، تفسیر المیزان جلد نمبر ۱۶ صفحہ [illegible]، حبیب السیر جلد اوّل اور فروغ ابدیت جلد نمبر [illegible] سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ہوئی اور اس نے احزاب کی تمام بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ نیز پروردگار کے نظر نہ آنے والے لشکر ان کے علاوہ اور بھی فوجی اور سیاسی عوامل تھے جن میں سے اہم ترین عامل خدا کی ذات پر ایمان اور عقیدہ تھا۔ بعض عوامل یہ تھے:

① حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کھودنے کی تجویز کو قبول کر کے عربوں کی جنگی تکنیک میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا، جو اس زمانے تک موجود نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی تکنیک تھی جس سے لشکرِ اسلام کے حوصلے بلند ہوئے اور سپاہ کفر کے چھکے چھوٹ گئے۔

② عمرو بن عبدود کا اسلام کے عظیم اور مایۂ ناز ہیرو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں مارا جانا اور اس کی موت سے لشکرِ احزاب کی امیدوں اور آرزوؤں پر پانی پھر جانا۔

③ لشکرِ اسلام کے باقاعدہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت بنائے گئے مورچے اور مناسب فوجی تکنیک اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن شہر مدینہ میں داخل نہ ہو سکا۔

④ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کامیابی کا اہم ترین عامل ایمان اور اللہ کی ذات پاک پر توکل تھا۔ اس کا بیج مسلمانوں کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بویا تھا۔ اس طویل جنگ میں مسلسل آیاتِ قرآن کی تلاوت ہوتی رہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلنشیں باتیں اہل ایمان کے سینوں میں ایمان و توکل کی آبیاری کرتی رہیں۔

⑤ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل آپ کی عظیم رُوح اور نفس پر اعتماد مسلمانوں کو قوت قلب اور تسکین خاطر عطا کر رہے تھے۔

⑥ اس پر مزید نعیم بن مسعود کی داستان لشکر احزاب میں تفرقہ ڈالنے اور اسے کمزور کرنے کا اہم اور موثر عامل تھی۔

۷۔ نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ:

نعیم جو تازہ مسلمان تھے اور ان کے قبیلۂ غطفان کو لشکرِ اسلام کی خبر نہیں تھی، وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ آپ مجھے جو حکم بھی دیں گے، میں حتمی کامیابی کے لیے اس پر کاربند رہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے جیسا شخص ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تم دشمن کے لشکر میں پھوٹ ڈال سکتے ہو تو ڈالو۔ کیونکہ جنگ پوشیدہ تدابیر کا مجموعہ ہے۔"

نعیم بن مسعود نے ایک عمدہ تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ وہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس گیا۔ جن سے زمانۂ جاہلیت میں ان کی دوستی تھی ان سے کہا بنی قریظہ! تم جانتے ہو کہ مجھے تمھارے ساتھ محبت ہے۔

انھوں نے کہا آپ سچ کہتے ہیں: ہم آپ کو اس بارے میں ہرگز کوئی الزام نہیں دیتے۔

نعیم بن مسعود نے کہا: قبیلہ قریش اور غطفان تمھاری طرح نہیں ہیں۔ یہ تمھارا اپنا شہر ہے۔ تمھارا مال اولاد اور عورتیں یہاں پر ہیں اور تم ہرگز یہ نہیں کر سکتے کہ یہاں سے کوچ کر جاؤ۔

قریش اور قبیلہ غطفان محمدؐ اور ان کے اصحاب کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آئے ہُوئے ہیں اور تم نے ان کی حمایت کی
جبکہ ان کا شہر کہیں اور ہے اور ان کے مال اور عورتیں بھی دوسری جگہ پر ہیں۔ اگر انھیں موقع ملے تو لُوٹ مار اور غارت گری کر کے
ساتھ لے جائیں گے۔ اگر کوئی مشکل پیش آ جائے تو اپنے شہر کو لوٹ جائیں گے، لیکن تم نے اور محمدؐ نے تو اسی شہر میں رہنا
اور یقیناً تم اکیلے ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تم اس وقت تک اسلحہ نہ اُٹھاؤ جب تک قریش سے کوئی معاہدہ
اور وہ اس طرح کہ وہ چند سرداروں اور بزرگوں کو تمھارے پاس گروی رکھ دیں تاکہ وہ جنگ میں کوتاہی نہ کریں۔

بنی قریظہ کے یہودیوں نے اس کو بہت سراہا۔

پھر نعیم مخفی طور پر قریش کے پاس گیا ابوسفیان اور قریش کے چند سرداروں سے کہا کہ تم اپنے ساتھ میری دوستی کی کیفیت سے
اچھی طرح آگاہ ہو۔ ایک بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، جسے تم تک پہنچانا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں تاکہ خیر خواہی کا حق ادا کر سکوں
لیکن میری خواہش یہ ہے کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔

انہوں نے کہا کہ تم بالکل مطمئن رہو۔

نعیم کہنے لگے: تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہودی محمدؐ کے بارے میں تمھارے طرزِ عمل سے اپنی برأت کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہودیوں
نے محمدؐ کے پاس قاصد بھیجا ہے اور کہلوایا ہے کہ ہم اپنے کیے پر پشیمان ہیں اور کیا یہ کافی ہوگا کہ ہم قبیلۂ قریش اور غطفان کے چند
سردار آپ کے لیے یرغمال بنالیں اور ان کو بندھے ہاتھوں آپ کے سپرد کر دیں تاکہ آپ ان کی گردن اڑا دیں۔ اس کے بعد
ہم آپ کے ساتھ مل کر ان کی بیخ کنی کریں گے؟ محمدؐ نے بھی ان کی پیش کش کو قبول کر لیا ہے۔ اس بنا پر اگر یہودی تمھارے پاس
کسی کو بھیجیں اور گروی رکھنے کا مطالبہ کریں تو ایک آدمی بھی ان کے سپرد نہ کرنا کیونکہ خطرہ یقینی ہے۔

پھر وہ اپنے قبیلہ غطفان کے پاس آئے اور کہا: تم میرے اصل اور نسب کو اچھی طرح جانتے ہو۔ میں تمھارا عاشق اور
فریفتہ ہوں اور میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمھیں میرے خلوصِ نیت میں تھوڑا سا بھی شک و شبہ ہو۔

انھوں نے کہا تم سچ کہتے ہو، یقیناً ایسا ہی ہے۔

نعیم نے کہا: میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن ایسا ہو کہ گویا تم نے مجھ سے نہیں سُنی۔

انھوں نے کہا مطمئن رہو۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا، وہ بات کیا ہے؟

نعیم نے وہی بات جو قریش سے کہی تھی، یہودیوں کے پشیمان ہونے اور یرغمال بنانے کے ارادے کے بارے میں
حرف بحرف ان سے بھی کہہ دی اور انھیں اس کام کے انجام سے ڈرایا۔

اتفاق سے وہ (ماہ شوال ۵ھ ہجری کے) جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات تھی۔ ابوسفیان اور غطفان کے سرداروں نے
ایک گروہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا: ہمارے جانور یہاں تلف ہو رہے ہیں اور یہاں ہمارے لیے ٹھہرنے کی کوئی
جگہ نہیں۔ کل صبح ہمیں حملہ شروع کرنا چاہیئے تاکہ کام کو کسی نتیجے تک پہنچائیں۔

یہودیوں نے جواب میں کہا: کل ہفتہ کا دن ہے اور ہم اس دن کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ علاوہ ازیں ہمیں اس بات کا
خوف ہے کہ اگر جنگ نے تم پر دباؤ ڈالا تو تم اپنے شہروں کی طرف پلٹ جاؤ گے اور ہمیں یہاں تنہا چھوڑ دو گے۔ ہمارے

ساتھ دینے کی شرط یہ ہے کہ ایک گروہ گروی کے طور پر ہمارے حوالے کر دو۔

جب یہ خبر قبیلۂ قریش اور غطفان تک پہنچی تو انھوں نے کہا، خدا کی قسم نعیم بن مسعود سچ کہتا تھا کچھ کالا کالا
ہے۔

لہٰذا انھوں نے اپنے قاصد یہودیوں کے پاس بھیجے اور کہا، بخدا ہم تو ایک آدمی بھی تمھارے سپرد نہیں کریں گے اور اگر
جنگ میں شریک ہو تو ٹھیک ہے شروع کرو۔

بنی قریظہ جب اس سے باخبر ہُوئے تو انھوں نے کہا، واقعاً نعیم بن مسعود نے حق بات کہی تھی۔ یہ جنگ نہیں کرنا چاہتے
یہ کوئی چکر چلا رہے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ لوٹ مار کر کے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں اور ہمیں محمدؐ کے مقابلے میں اکیلا چھوڑ جائیں۔
پھر انہوں نے پیغام بھیجا کہ اصل بات وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔ بخدا جب تک کچھ افراد گروی کے طور پر ہمارے سپرد
نہیں کرو گے، ہم بھی جنگ نہیں کریں گے۔ قریش اور غطفان نے بھی اپنی بات پر اصرار کیا۔ لہٰذا ان کے درمیان بھی اختلاف پڑ گیا۔
اور یہ وہی موقع تھا کہ رات کو اس قدر زبردست سرد طوفانی ہوا چلی کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے اور دیگچے چولہوں سے زمین پر آ پڑیں۔
یہ سب عوامل مل ملا کر اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا اور فرار کو ترجیح دینی پڑی۔ حتیٰ کہ
میدان میں ان کا ایک آدمی بھی نہ رہا۔[1]

۸۔ حذیفہ کا واقعہ:

بہت سی تواریخ میں آیا ہے، حذیفہ یمانی کہتے ہیں کہ ہم جنگ خندق کے ایام میں بھوک اور
تھکن، وحشت اور اضطراب سے اس قدر دوچار تھے کہ خدا ہی جانتا ہے۔ ایک رات
(لشکر احزاب میں اختلاف پڑ جانے کے بعد) پیغمبرؐ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو چھپ چھپا کر دشمن کی لشکر گاہ میں
جائے اور ان کے حالات معلوم کر لائے تاکہ وہ جنت میں میرا رفیق اور ساتھی ہو۔

حذیفہ کہتے ہیں خدا کی قسم کوئی شخص بھی شدتِ وحشت، تھکن اور بھوک کے مارے اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔
جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ حالت دیکھی تو مجھے آواز دی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا جاؤ
اور میرے پاس ان لوگوں کی خبر لے آؤ۔ لیکن وہاں کوئی اور کام انجام نہ دینا یہاں تک کہ میرے پاس آ جاؤ۔
میں ایسی حالت میں وہاں پہنچا جب کہ سخت آندھی چل رہی تھی اور طوفان برپا تھا اور خدا کے لشکر انھیں تہس نہس کر رہا تھا۔
خیمے تیز آندھی کے سبب ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ آگ بیابان میں پھیل چکی تھی۔ کھانے پینے کے برتن اُلٹ پلٹ گئے
تھے۔ اچانک میں نے ابوسفیان کا سایہ محسوس کیا کہ وہ اس تاریکی میں بلند آواز سے کہہ رہا ہے قریش! تم میں سے ہر
ایک اپنے پہلو میں بیٹھے ہُوئے شخص کو اچھی طرح سے پہچان لے تاکہ یہاں کوئی بیگانہ نہ ہو۔ میں نے پہل کر کے فوراً ہی اپنے
پاس بیٹھنے والے شخص سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا، میں فلاں ہوں، میں نے کہا بہت اچھا۔
پھر ابوسفیان نے کہا خدا کی قسم! یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، ہمارے اونٹ گھوڑے ضائع ہو چکے ہیں اور بنی قریظہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد نمبر ۳ صفحہ ۲۴۰ (تلخیص کے ساتھ)۔

نے اپنا پیمان توڑ ڈالا ہے اور اس طوفان نے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔

پھر وہ بڑی تیزی سے اپنے اونٹ کی طرف بڑھا اور سوار ہونے کے لیے اسے زمین سے اُٹھایا۔ وہ اس قدر جلدی میں تھا کہ اونٹ کے پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کو کھولنا بھول گیا۔ لہٰذا اونٹ تین پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا ایک ہی تیر سے اس کا کام تمام کر دوں ابھی تیر چلہ کمان میں جوڑا ہی تھا کہ فوراً آنحضرتؐ کا فرمان یاد آ گیا کہ جس آپؐ نے فرمایا تھا، کچھ کارروائی کیے بغیر واپس آ جانا کام صرف وہاں کے حالات ہمارے پاس لانا ہے لہٰذا میں واپس پلٹ گیا اور جا کر تمام حالات عرض کیے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا:

"اللّٰھم انت منزل الکتاب، سریع الحساب، اھزم الاحزاب اللّٰھم اھزمھم وزلزلھم"

"خداوندا! تو کتاب کو نازل کرنے والا اور سریع الحساب ہے، تو خود ہی احزاب کو نیست و نابود فرما! خدایا! انھیں تباہ کر دے اور ان کے پاؤں نہ جمنے دے"[1]

۹۔ جنگِ احزاب کے نتائج:

جنگِ احزاب تاریخِ اسلام میں ایک اہم موڑ اور سنگِ میل ثابت ہوئی جس میں فوجی اور سیاسی اعتبار سے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا بطورِ خلاصہ اس جنگ کے مفید نتائج چند جملوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

الف:۔ دشمن کی آخری کوششوں کا ناکام ہو جانا اور ان کی برتری کی آخری طاقت کا ٹوٹ جانا۔

ب:۔ منافقین کی سازش کا آشکار ہو جانا اور ان خطرناک داخلی دشمنوں کا مکمل طور پر بھانڈا پھوٹ جانا۔

ج:۔ جنگِ احد کی شکست کی تلخ یادوں کی تلافی۔

د:۔ دشمن کے دل میں مسلمانوں کی مزید طاقت اور ہیبت کا طاری ہو جانا۔

ھ:۔ جو معجزات مسلمانوں نے اس میدان میں دیکھے ان کی وجہ سے ان کے حوصلوں کا بلند ہو جانا۔

و:۔ مدینہ کے اندر اور باہر آنحضرتؐ کی حیثیت کا مسلّم ہو جانا۔

ز:۔ سرزمینِ مدینہ کا یہود بنی قریظہ کے شر سے صفایا کی راہ ہموار کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "اسوہ" اور "قدوہ" ہیں:

ہمیں معلوم ہے کہ لوگوں میں سے خدا کے بھیجے ہوئے افراد کا انتخاب اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ امتوں کے لیے نمونہ بن سکیں، کیونکہ انبیاء کی عملی تبلیغ اور دعوت کا اہم اور مؤثر ترین حصہ ان کی عملی دعوت ہوتی ہے۔ اسی بناء پر علماء مقامِ نبوت کے لیے عصمت کو ایک لازمی شرط سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ انھیں لوگوں کے لیے "اسوہ" اور مخلوق کے لیے "قدوہ" ہونا چاہئیے۔

[1] بحار الانوار، ج ۲۰ ص ۲۰۸۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء اور تاسی کا جو حکم آیا ہے وہ مطلق صورت میں ہے۔ جو آپؐ کی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے، اگرچہ اس کی شانِ نزول جنگِ احزاب ہے لیکن شانِ نزول آیات کے مفاہیم کو کبھی بھی اپنے ساتھ محدود نہیں کرتی۔

اسی لیے ہم اسلامی احادیث میں دیکھتے ہیں کہ پیروی کے سلسلے میں اہم سے اہم اور معمولی سے معمولی مسائل کا ذکر ہے۔

ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان الصبر علی ولاۃ الامر مفروض لقول اللہ عز وجل لنبیہ (ص) فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل، وایجابہ مثل ذلک علی اولیائہ واھل طاعتہ، لقولہ، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

"صبر و شکیبائی اسلامی حکام پر واجب ہے کیونکہ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے، صبر کرو جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر و شکیبائی اختیار کی ہے اور اسی چیز کو آپؐ کے دوستوں اور اطاعت گزاروں پر آپ کی پیروی کرنے کے حکم کے ساتھ واجب فرمایا ہے"[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ عشا پڑھتے تو وضو کا پانی اور اپنی مسواک اپنے سرہانے رکھ لیتے اور پانی کے برتن کو ڈھکنے سے ڈھانپ دیتے ۔۔۔۔

پھر آپؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نمازِ تہجد کی کیفیت بیان فرمائی اور آخر میں فرمایا:

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اسوۂ حسنہ ہے"[2]

واقعاً اگر ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو اپنے لیے اُسوہ قرار دے دیں، آپؐ کے ایمان و توکل خلوص و شجاعت، نظم و نظافت، زہد و تقویٰ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنالیں تو ہماری کایا پلٹ جائے اور ہماری زندگی روشن اور منور ہو جائے۔

آج سارے مسلمانوں پر خصوصاً باایمان اور پُرجوش نوجوانوں پر فرض ہے کہ وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو حرف بحرف پڑھیں اور اسے دل میں جگہ دے کر ہر لحاظ سے اپنے لیے اسوہ و نمونہ قرار دیں، کیونکہ سعادت

[1] نور الثقلین ج نمبر ۴ ص ۲۵۵ بحوالہ احتجاج طبری۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۳۵۶۔

کا اہم ترین وسیلہ اور کامیابی وکامرانی کی اصل کلید یہی ہے۔

خدا کو بہت یاد کرو:

خدا کو یاد کرنے کا حکم خصوصاً "ذکر کثیر" بار ہا قرآنی آیات میں آیا ہے اور اسلامی روایات میں بھی اسے بہت اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ حضرت ابوذرؓ سے ایک حدیث ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

"علیک بتلاوة کتاب اللہ وذکر اللہ کثیرًا فانّہٗ ذکر لک فی السماء ونور لک فی الارض"

"تم پر قرآن کی تلاوت اور بہت یادِ خدا لازم ہے۔ کیونکہ اس کے سبب آسمانوں میں (فرشتے) تمہیں یاد کریں گے اور زمین میں تمہارے لیے نور ہوگا۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

"اذا ذکر العبد ربہ فی الیوم مأة مرة کان ذلک کثیرًا؛"

"جب انسان خدا کو دن میں سو مرتبہ یاد کرے تو یہ ذکر کثیر شمار ہوگا۔"[2]

نیز ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

"الا اخبرکم بخیر اعمالکم وازکاھا عند ملیککم، وارفعھا فی درجاتکم، وخیر لکم من الدینار والدرھم، وخیر لکم من ان تلقوا عدوکم فتقتلونھم ویقتلونکم؟ قالوا: بلی یا رسول اللہ! قال: ذکر اللہ کثیرًا"

"کیا میں تمہیں تمہارے پروردگار کے ہاں بہترین اعمال اور پاکیزہ ترین کاموں کے متعلق نہ بتاؤں؟ وہ عمل جو تمہارا بالاترین درجہ اور تمہارے لیے درہم و دینار سے بہتر ہو حتیٰ کہ جہاد اور راہ خدا میں شہادت سے بھی بہتر ہے۔"

انہوں نے عرض کیا: ضرور۔

فرمایا: خدا کو زیادہ یاد کرنا۔[3]

[1] نور الثقلین جلد نمبر ۴ ص ۲۵۰، بحوالہ خصال۔

[2] سفینۃ البحار، جلد ۱ ص ۴۸۴

[3] سفینۃ البحار، جلد ۱ ص ۴۸۴۔

لیکن ہرگز یہ تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ ان تمام فضائل کے ساتھ ذکرِ پروردگار سے مراد صرف زبانی ذکر ہے۔ بلکہ اسلامی روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس سے مراد اس کے علاوہ قلبی اور عملی ذکر بھی ہے، یعنی جس وقت انسان کو کسی حرام کام کے ارتکاب کا سامنا ہو تو خدا کو یاد کرکے اسے ترک کر دے۔

مقصد یہ ہے کہ خدا انسان کی تمام زندگی میں حاضر و ناظر ہو اور نور پروردگار اس کی تمام زندگی میں جلوہ فگن ہو۔ ہمیشہ اس کی یاد میں گم ہو اور اس کے فرمان کو نصب العین قرار دے۔

مجالس ذکر سے مراد وہ مجالس نہیں، جہاں پر جاہلوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جائے اور خود ساختہ ذکر و افکار کا ورد شروع کر دے اور بدعتوں کو پھیلانے میں مصروف رہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بادروا الی ریاض الجنة؟"

"جنت کے باغوں کی طرف جلدی بڑھو"[1]

تو صحابہ نے عرض کیا:

"وما ریاض الجنة؟"

"جنت کے باغات کیا ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"حلق الذکر"

"مجالس ذکر ہیں"[2]

اس سے مراد وہ مجالس ہیں جن میں علوم اسلامیہ کا احیاء ہو، تربیتی و اخلاقی پروگرام پیش ہوں جن میں انسانوں کی تربیت اور اصلاح کی جائے تاکہ گناہگار گناہوں سے بچ جائیں اور راہ خدا پر چلیں۔[3]

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۸۶۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۸۶۔

[3] "ذکر اللہ" کی اہمیت اور اس کے مفہوم کے سلسلہ میں، تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۶۹۳ (اردو ترجمہ) میں بھی تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

۲۶۔ وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا ۝

۲۷۔ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِیَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ۝

ترجمہ

۲۶۔ خدا نے اہل کتاب میں سے جن کی (مشرکین عرب کی طرف سے) حمایت کی گئی، انہیں ان کے محکم قلعوں سے نیچے کھینچا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا (اور ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ) ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے ہو۔

۲۷۔ اور ان کی زمینوں، ان کے گھروں اور ان کے مالوں کو تمہارے اختیار میں دے دیا۔ اور (اسی طرح) اس زمین کو بھی جس میں تم نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

ایک اور عظیم کامیابی

مدینہ میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل رہتے تھے، بنی قریظہ، بنی النضیر اور بنی قینقاع۔

تینوں گروہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ آپ کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے، ان کے لیے جاسوسی نہیں کریں گے اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر امن و آشتی کی زندگی گزاریں گے لیکن قبیلہ بنی قینقاع نے ہجرت کے دوسرے سال اور قبیلہ بنی نضیر نے ہجرت کے چوتھے سال مختلف حیلوں بہانوں سے اپنا معاہدہ توڑ ڈالا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ آخر کار ان کی مزاحمت اور مقابلہ کی سکت ختم ہو گئی اور وہ مدینہ سے باہر نکال دیئے گئے۔

بنی قینقاع اذرعات شام کی طرف چلے گئے اور بنی نضیر کے کچھ لوگ تو خیبر کی طرف اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔[1]

اسی بناء پر ہجرت کے پانچویں سال جبکہ جنگِ احزاب پیش آئی تو صرف قبیلہ بنی قریظہ مدینہ میں باقی رہ گیا تھا۔ اور جیسا کہ جنگِ احزاب کی سترہ آیات کی تفسیر میں ہم نے کہا ہے، وہ بھی اس میدان میں اپنے معاہدہ کو توڑ کر مشرکین عرب کے ساتھ مل گئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں تلواریں سونت لیں۔

جب جنگِ احزاب ختم ہو گئی اور قریش، بنی غطفان اور دیگر قبائل عرب بھی رسوا کن شکست کے بعد مدینہ سے پلٹ گئے تو اسلامی روایات کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر لوٹ آئے اور جنگی لباس اتار کر نہانے دھونے میں مشغول ہو گئے تو اس موقع پر جبرائیل حکم خدا سے آپ پر نازل ہوئے اور کہا کیوں آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں جبکہ فرشتے ابھی تک آمادہ پیکار ہیں۔ آپ فوراً بنی قریظہ کی طرف جائیں اور ان کا کام تمام کریں۔

واقعاً بنی قریظہ کا حساب چکانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں تھا۔ مسلمان اپنی کامیابی پر خوش و خرم تھے، بنی قریظہ شکست کی شدید وحشت میں گرفتار تھے اور قبائل عرب میں سے ان کے دوست اور حلیف تھکے ماندے اور بہت ہی پست حوصلوں کے ساتھ شکست خوردہ حالت میں اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں جا چکے تھے اور کوئی نہیں تھا جو ان کی حمایت کرے۔

بہرحال منادی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ندا دی کہ نماز عصر پڑھنے سے پہلے بنی قریظہ

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۷۳ - ۱۳۷۔

کی طرف چل پڑے مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہوگئے اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی بنی قریظہ کے محکم و مضبوط [...] کو مسلمانوں نے اپنے محاصرے میں لے لیا۔

پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا۔ اس کے بعد جیسا کہ نکات کی بحث میں آئے گا، ان سب نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے سپرد کردیا۔ ان میں سے کچھ کو قتل کر دیا گیا اور مسلمانوں کی کامیابیوں میں ایک اور فتح کا اضافہ [...] اور سرزمین مدینہ ہمیشہ کے لیے ان منافق اقوام اور زبردست ہٹ دھرم اعداء کے ناپاک وجود سے پاک ہوگئی۔

زیرِ بحث آیات اس ماجرا کی طرف مختصر اور بلیغ اشارہ کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیات کامیابی کے حصول کے بعد نازل ہوئیں اور اس ماجرے کا تذکرہ خدا کی ایک عظیم نعمت اور عنایت کے طور پر ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جنہوں نے مشرکین عرب کی حمایت کی تھی، ان کے محکم و مضبوط قلعوں سے نیچے کھینچا"۔ (وانزل الذین ظاھروھم من اھل الکتاب من صیاصیھم)۔

"صیاصی" جمع ہے "صیصیہ" کی جو مضبوط قلعوں کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کا دفاع کے ہر ذریعے پر اطلاق ہونے لگا، جیسے بیل کے سینگ یا مرغے کی ٹانگ والا کانٹا۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے قلعے مدینہ کے پاس بلند اور اونچی جگہ پر بنا رکھے تھے اور ان کے بلند برجوں سے اپنا دفاع کرتے تھے۔ "انزل" (نیچے لے آیا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے۔ "خدا نے ان کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا"۔ (وقذف فی قلوبھم الرعب)۔

آخر کار ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا "کہ تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے کو اسیر بنا رہے تھے"۔ (فریقاً تقتلون وتأسرون فریقاً)۔

"اور ان کی زمینیں، گھر اور مال و متاع تمہارے اختیار میں دے دیا"۔ (واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم)۔

یہ چند جملے جنگ بنی قریظہ کے عام نتائج کا خلاصہ ہیں۔ ان خیانت کاروں میں سے کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوگئے، کچھ قید ہو گئے اور بہت زیادہ مال غنیمت جس میں ان کی زمینیں، گھر، مکانات اور مال و متاع شامل تھا، مسلمانوں کو ملا۔

ان غنائم کو "ارث" سے تعبیر کرنا اس بناء پر ہے کہ مسلمانوں نے ان کے حاصل کرنے میں کوئی زیادہ زحمت نہیں اٹھائی بلکہ آسانی کے ساتھ وہ تمام مال ان کے ہاتھ آگیا جو یہودیوں نے سالہا سال کے عرصے میں ظلم اور بیدادگری اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "اسی طرح وہ زمین بھی تمہارے اختیار میں دے دی، جس پر ہرگز تم نے قدم نہیں رکھا تھا"۔ (وارضاً لم تطئوھا)۔

"اور خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے"۔ (وکان اللہ علیٰ کل شیء قدیراً)۔

"ارضاً لم تطئوھا" سے مراد کونسی زمین ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے اسے سرزمین "خیبر" کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو بعد میں مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئی۔

بعض نے سرزمین مکہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

بعض اسے سرزمین "روم و ایران" جانتے ہیں۔

اور بعض سب سرزمینوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس دن سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کی قلمرو میں قرار پائیں گی۔

لیکن ان احتمالات میں سے کوئی بھی ظاہر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ آیت فعل ماضی کے قرینہ سے جو اس میں آیا ہے یعنی "اورثکم" اس بات کی شاہد ہے کہ یہ سرزمین اسی جنگ بنی قریظہ کے واقعے میں مسلمانوں کے تصرف میں آئی تھی۔ علاوہ ازیں سرزمین مکہ ایسی نہیں تھی کہ جس میں مسلمانوں نے قدم نہ رکھا ہو جبکہ قرآن کہتا ہے کہ ایسی زمین تمہارے قبضہ میں دی کہ جس میں تم نے قدم نہیں رکھا تھا۔ ظاہراً یہ جملہ ان مخصوص باغات و اراضی کی طرف اشارہ ہے جو بنی قریظہ کے قبضے میں تھے اور کوئی بھی ان میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا، کیونکہ یہود اپنے اموال کی حفاظت اور اس کا زبردست خیال رکھتے تھے۔

نیز اگر اس فتح و کامیابی کے ماضی میں ہونے سے صرف نظر کرلیں تو پھر زیادہ مناسب زمین خیبر سے تعلق رکھتی ہے جو بہت ہی مختصر عرصے میں یہودیوں سے لے لی گئی تھی اور مسلمانوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ (جنگِ خیبر ہجرت کے ساتویں سال وقوع پذیر ہوئی تھی)۔

چند اہم نکات

۱۔ جنگ بنی قریظہ کے علل و اسباب: قرآن مجید اس چیز پر گواہ ہے کہ اس جنگ کا اصل سبب بنی قریظہ کے یہودیوں کی جنگِ احزاب میں مشرکین عرب کی حمایت تھی، کیونکہ خدا فرماتا ہے:

"الذین ظاھروھم"

"وہ لوگ کہ جنہوں نے ان کی حمایت کی"....

اس کے علاوہ اصولی طور پر مدینہ کے یہودی دشمنان اسلام کا پانچواں ستون (FIFTH COLUMN) شمار ہوتے تھے۔ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈے میں کوشاں رہتے تھے اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کہ یہودیوں کے تین قبائل، بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ میں سے آخری گروہ جنگ

احزاب کے موقع پر مدینہ میں باقی رہ گیا تھا اور پہلا اور دوسرا گروہ بالترتیب ہجرت کے دوسرے اور چوتھے سال عہد شکنی کی وجہ سے
مدینہ سے نکال دیئے گئے تھے۔

ضروری تھا کہ یہ تیسرا گروہ جنہوں نے سب سے زیادہ کھلی عہد شکنی کی تھی اور دشمنانِ اسلام
سے الحاق کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، انھیں ان کے پست اعمال کی وجہ سے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔

۲۔ جنگِ بنی قریظہ کے واقعات :

ہم بتا چکے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگِ احزاب ختم ہوتے ہی مامور ہو گئے کہ بنی قریظہ کے یہودیوں کا حساب چکا دیں۔ لکھا ہے
کہ مسلمانوں نے بنی قریظہ کے قلعوں کی طرف اس قدر جلدی کی کہ بعض لوگ اپنی نمازِ عصر سے بھی غافل ہو گئے، اور مجبوراً
انھیں بعد میں قضا بجا لانی پڑی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کا حکم صادر فرمایا۔ پچیس دن تک محاصرہ
جاری رہا۔ قرآن کے فرمان کے مطابق خدا نے شدید رعب اور وحشت دشمنوں کے دلوں میں ڈال دی۔

کعب بن اسد کا شمار یہودیوں کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا، مجھے یقین ہے کہ محمدؐ ہمیں اس
وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم جنگ نہ کریں۔ لہٰذا میری تین تجاویز ہیں، ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لو۔

پہلی تجویز تو یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس پر ایمان لے آؤ اور اس کی پیروی اختیار کر لو۔ کیونکہ تم پر
ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے اور اس کی نشانیاں تمھاری کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو اس صورت میں تمھارے مال، جان
اور اولاد اور عورتیں محفوظ ہو جائیں گی۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ہرگز حکمِ تورات سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس کا تبادل اختیار کریں گے۔

اس نے کہا: اگر یہ تجویز قبول نہیں کرتے تو پھر آؤ اور اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالو تاکہ ان
کی طرف سے آسودہ خاطر ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑیں اور پھر دیکھیں کہ خدا کیا چاہتا ہے؟ اگر ہم مارے گئے تو اہل و عیال
کی جانب سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور اگر کامیاب ہو گئے تو پھر عورتیں بھی بہت بچے بھی بہت۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ان بے چاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیں؟ ان کے بعد ہمارے لیے زندگی کی قدر و
قیمت کیا رہ جائے گی؟

کعب بن اسد نے کہا: اگر یہ بھی تم نے قبول نہیں کیا تو آج چونکہ ہفتہ کی رات ہے (محمدؐ) اور اس کے ساتھی یہ خیال کریں
گے کہ ہم آج رات حملہ نہیں کریں گے، انھیں اس غفلت میں ڈال کر ان پر حملہ کر دیں شاید کامیابی حاصل ہو جائے۔

وہ کہنے لگے کہ یہ کام بھی ہم نہیں کریں گے۔ کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں ہفتہ کا احترام پامال نہیں کریں گے۔

کعب کہنے لگا: پیدائش سے لے کر آج تک تمھارے اندر عقل نہیں آسکی۔

اس کے بعد انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کی کہ ابو لبابہ کو ان کے پاس بھیجا جائے تاکہ
وہ ان سے صلاح مشورہ کریں۔

جس وقت ابو لبابہ ان کے پاس آئے تو یہودیوں کی عورتیں اور بچے ان کے سامنے گریہ و زاری کرنے لگے۔ اس

[بات] کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم محمدؐ کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟
[ابو ل]بابہ نے کہا ہاں اور ساتھ ہی اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا، یعنی تم سب کو قتل کر دیں گے۔

ابو لبابہ کہتے ہیں، جیسے ہی میں وہاں سے چلا تو مجھے اپنی خیانت کا شدید احساس ہوا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے
[پاس] نہ گیا بلکہ سیدھا مسجد کی طرف چلا اور اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور کہا: میں اپنی جگہ سے
[اس] وقت تک حرکت نہیں کروں گا جب تک خدا میری توبہ قبول نہ کرلے۔

آخر کار خدا نے اس کا یہ گناہ اس کی صداقت کی بنا پر بخش دیا۔ اور اسی سلسلے میں یہ آیت " واٰخرون اعترفوا
بذنوبھم ....." نازل ہوئی۔ (توبہ۔ ۱۰۲)

آخر کار بنی قریظہ کے یہودیوں نے مجبور ہو کر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

جناب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سعد بن معاذ تمہارے بارے میں جو فیصلہ کر دیں کیا وہ تمھیں قبول ہے؟
وہ راضی ہو گئے۔

سعد بن معاذ نے کہا کہ اب وہ موقع آن پہنچا ہے کہ سعد کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو نظر میں رکھے۔ بغیر حکمِ خدا
بیان کرے۔

سعد نے جس وقت یہودیوں سے دوبارہ یہی اقرار لے لیا تو آنکھیں بند کر لیں اور جس طرف پیغمبر کھڑے ہوئے تھے ادھر
رُخ کر کے عرض کیا، آپ بھی میرا فیصلہ قبول کریں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ضرور، تو سعد نے کہا، میں کہتا ہوں کہ جو لوگ مسلمانوں
کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ تھے (بنی قریظہ کے مرد) انھیں قتل کر دینا چاہیئے، ان کی عورتیں اور بچے قید اور ان کے اموال
تقسیم کر دیئے جائیں۔ البتہ ان میں سے ایک گروہ اسلام قبول کرنے کے بعد قتل ہونے سے بچ گیا۔[1]

۳۔ جنگِ بنی قریظہ کے نتائج :

ظالم اور ہٹ دھرم گروہ پر فتح دکامرانی مسلمانوں کے لیے نہایت مفید نتائج کی حامل تھی۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

ا : مدینہ کا داخلی محاذ ختم ہو گیا اور یہودی جاسوسوں سے مسلمان آسودہ خاطر ہو گئے۔
ب : مدینہ کے اندر مشرکینِ عرب کے اڈے منہدم ہو گئے اور اندرونی شورش سے ان کی امیدیں ختم ہو گئیں۔
ج : جنگ سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت سے مسلمانوں کی مالی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔
د : آئندہ کی کامیابیوں کے لیے راہ ہموار ہو گئی، خصوصاً خیبر کی فتح کے لیے۔
ہ : مدینہ کے اندر اور باہر دوستوں اور دشمنوں کی نگاہ میں حکومتِ اسلامی کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔

۴۔ آیات کی معنی خیز تعبیریں :

زیرِ نظر آیات میں مختلف تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ اس جنگ میں قتل ہونے والوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے " فریقًا تقتلون"

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۲۴۴ اور کامل ابن اثیر ج ۲ صفحہ ۱۸۵ (کچھ تلخیص کے ساتھ)۔

یعنی "فریقًا" کو "تقتلون" پر مقدم رکھا گیا ہے۔ حالانکہ قیدیوں کے بارے میں "فریقًا" کو اس کے فعل یعنی "تأسرون" سے مؤخر رکھا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس بارے میں کہا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ قتل ہونے والے زیادہ تر ان کے سرغنے تھے۔ لیکن قید ہونے والے غیر معروف افراد تھے۔ علاوہ ازیں یہ تقدیم و تاخیر سبب ہوئی کہ قتل اور قید جو ان پر کامیابی کے دو اہم عامل تھے ایک دوسرے کے ساتھ آگئے ہیں اور ان کے درمیان تناسب اور تعلق کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

نیز پہلی زیرِ بحث آیت میں، یہودیوں کو ان کے قلعوں سے نیچے لانا "قذف فی قلوبھم الرعب" (خدا نے ان کے دلوں میں رعب و وحشت ڈال دی) سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ فطری ترتیب اس کے برخلاف ہے یعنی پہلے رعب پیدا ہوتا ہے اور پھر ان محکم قلعوں سے نیچے آنا ہوتا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زیادہ اہم اور مسرورکُن تھا اور ان کے اصل مقصد کو تشکیل دیتا تھا، وہ ان کے بہت ہی مستحکم قلعوں کا ٹوٹنا تھا۔

"اورثکم ارضھم و دیارھم" کی تعبیر بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ تم بغیر اس کے کہ اس جنگ کے لیے کچھ بھی زحمت برداشت کرتے، خدا نے ان کی زمینیں، گھر اور مال و دولت سب کچھ تمہارے اختیار میں دے دیا۔

آخری آیت میں خدا کی لازوال قدرت کا ذکر ہے اور "وکان اللہ علٰی کل شیءٍ قدیرًا" اس طرف اشارہ ہے کہ اس نے ایک دن آندھی اور طوفان اور نظر نہ آنے والے لشکر کے ذریعہ احزاب کو شکست دی اور دوسرے دن رعب و وحشت کے لشکر سے ان کے حامیوں یعنی بنی قریظہ کے یہودیوں کا ستیاناس کر دیا۔

۲۸۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا○

۲۹۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا○

۳۰۔ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا○

۳۱۔ وَمَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا○

ترجمہ

۲۸۔ اے پیغمبرؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے، اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ ہدیہ دے کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں۔

۲۹- اور اگر تم خدا، اس کے پیغمبر اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو خدا نے تم میں سے نیکو کاروں کے لیے عظیم اجر مہیا کر رکھا ہے۔

۳۰- اے نبی کی بیویو! جو کوئی تم سے صریح گناہ اور بُرے کام کی مرتکب ہو گی، اس کا عذاب دُگنا ہو گا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔

۳۱- اور تم میں سے جو کوئی خدا اور اس کے رسول کے لیے خضوع و خشوع اختیار کرے گی اور عمل صالح بجا لائے گی، ہم اس کے اجر و جزاء کو دُگنا کریں گے اور اس کے لیے ہم نے با عظمت روزی فراہم کر رکھی ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کی کئی ایک شان نزول ذکر کی ہیں کہ جو نتیجہ کے لحاظ سے آپس میں قطعاً مختلف نہیں ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند جنگوں کے بعد بڑی مقدار میں غنیمتیں مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئیں تو ازواج پیغمبر نے آپ سے نفقہ میں اضافہ اور زندگی کے گوناگوں لوازم کے لیے مختلف تقاضے شروع کر دیئے۔ بعض تفاسیر کے مطابق حضرت اُم سلمہؓ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدمت گزاری کے لیے کنیز کا تقاضا کیا، میمونہؓ نے کوئی خاص لباس مانگا، زینب بنت جحش نے ایک خاص یمنی کپڑے کی فرمائش کی، حفصہؓ نے مصری جامہ طلب کیا، جویریہؓ نے ایک عمدہ لباس چاہا، سودہؓ نے خیبری گلیم کی درخواست کی۔ خلاصہ یہ کہ ہر ایک نے الگ الگ فرمائش کی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ اس قسم کی فرمائشوں کے سامنے جھک جانا جو عام طور پر ختم ہونے والی نہیں ہوتیں، "ہیئت نبوت" کو کیسے انجام سے دوچار کردیں گی لہٰذا آپ نے ان خواہشات کو پورا کرنے سے انکار کر دیا اور پورا ایک مہینہ ان سے کنارہ کشی اختیار کیے رکھی۔ یہاں تک کہ مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور دو ٹوک لیکن رحمت و رأفت کے لہجہ کے ساتھ انھیں خبردار کیا کہ اگر زیب و زینت سے آراستہ، دنیاوی زندگی چاہتی ہو تو تم پیغمبرؐ سے الگ ہو سکتی ہو اور جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو اور اگر خدا، رسول اور روز جزاء سے وابستہ رہنا چاہتی ہو تو پیغمبرؐ کے گھر کی سادہ لیکن پُر افتخار زندگی پر قانع ہو جاؤ اور پروردگار کے عظیم اجر و ثواب سے حصہ لیتی رہو۔

اس طرح سے ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توقع کا جو دامن پھیلایا ہوا تھا اس کے ضمن میں محکم اور دو ٹوک جواب دے دیا اور انھیں پیغمبرؐ کے گھر میں ٹھہرے رہنے اور الگ ہو جانے کے درمیان اختیار بھی عنایت فرما دیا۔

تفسیر

سعادت ابدی یا دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ:

آپ بھولے نہیں ہوں گے کہ اس سورہ کی شروع کی آیات میں خداوند عالم نے عزت و افتخار کا تاج پیغمبرؐ کی بیویوں کے سر پر رکھا ہے اور ان کا "ام المومنین" کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔ واضح رہے کہ ہمیشہ حساس اور افتخار آفریں مراتب کے ساتھ بھاری ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ ازواج رسولؐ کیونکر امہات المومنین ہو سکتی ہیں جب کہ ان کی قلب و نظر دنیا کی زیب و زینت پر فریفتہ ہوں اور جب وہ یہ خیال کریں کہ اگر مسلمانوں کو مال غنیمت حاصل ہو تو بادشاہوں کی بیویوں کی طرح اس کا بہترین حصہ انہیں مل جائے اور شہداء کی جاں نثاری اور مقدس خون کے صدقہ میں جو چیز ہاتھ آئی ہے وہ ان کے حوالہ کی جائے۔ جبکہ کئی لوگ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہوں؟

اس سے قطع نظر گذشتہ آیات کے مطابق نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے لیے اُسوہ و نمونہ ہیں بلکہ ان کے گھر والوں کو بھی دوسرے خاندانوں کے لیے اسوہ اور ان کی بیویوں کو دامن قیامت تک کی با ایمان عورتوں کے لیے مقتدا ہونا چاہیئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بادشاہ نہیں ہیں کہ ان کا شان و شوکت والا حرم سرا ہو اور ان کی بیویاں قیمتی جواہرات اور زیب و زینت کی دوسری چیزوں سے لدی پھندی ہوں۔

شاید ابھی تک مکہ کے کچھ مسلمان جو مہاجر ہو کر مکہ سے مدینہ آئے تھے صفہ (وہ مخصوص چبوترا کہ مسجد نبوی کے ساتھ تھا) میں راتیں بسر کرتے تھے۔ اس شہر میں ان کا کوئی خانہ و کاشانہ نہیں تھا۔ ان حالات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ آپ کی بیویاں آپؐ سے اس قسم کی توقعات رکھیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بیویوں نے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سخت کلامی کی حد کر دی اور یہاں تک کہہ دیا:

"لعلك تظن ان طلقتنا لا نجد زوجا من قومنا غيرك"

"شاید آپ یہ گمان کرتے ہیں کہ آپ ہمیں طلاق دے دیں تو ہمیں اپنی قوم قبیلے میں کوئی شوہر نہیں ملے گا"[1]

---

[1] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۲۸۔

اس موقع پر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے حکم سے مامور ہُوئے کہ وہ اس نظریہ کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور ا
کے سامنے ہمیشہ کے لیے پوزیشن واضح کردیں۔

بہرحال زیرِ بحث آیات میں سے پہلی پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہُوئے کہتی ہے:

اے پیغمبرؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں کسی لڑائی جھگڑے کے بغیر کچھ ہدیہ دے کر تمھیں اچھے طریقے سے جدا کیے دیتا ہوں"۔ (یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحًا جمیلًا)۔

"امتعکن" "متعہ" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہدیہ ہے، جو عورت کے شایانِ شان ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ مقررشدہ مہر پر مناسب ہدیہ دے دیں، اس قدر کہ وہ راضی اور خوش ہوجائیں اور ان کی علیحدگی دوستانہ ماحول میں ہو۔

"سراح" اصل میں "سرح" (بروزن شرح") ایسی نباتات کے معنی میں ہے جس کے پھل اور پتے ہوں، اور "سرحت الابل" کا معنی ہے "مَیں نے اونٹ کو چھوڑ دیا تاکہ وہ نباتات کے پتوں کو چرتا پھرے"۔ بعد ازاں اس لفظ کا زیادہ وسیع معنی ہوگیا، یعنی ہر چیز اور ہر شخص کو ہر قسم کی رہائی دینا اور چھوڑ دینا۔ کبھی یہ لفظ طلاق دینے کیلئے کنایہ کے طور پر بھی آتا ہے۔ "تسریح الشعر" بالوں کو کنگھی کرنے کے لیے بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی رہا کرنے اور چھوڑنے کا معنی پوشیدہ ہے۔

بہرحال زیرِ بحث آیت میں "سراح جمیل" سے مراد عورتوں کو اس انداز سے طلاق دینا ہے جس میں نیکی اور بھلائی ہو اور کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔

اس ضمن میں اسلامی فقہا اور مفسرین نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے کہ آیت میں اس سے مراد کیا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی ازواج کو باقی رہنے اور جدا ہوجانے کے بارے میں جو اختیار دیا تھا، اگر وہ جدائی اختیار کرلیتیں تو کیا خود ہی امر طلاق شمار ہوتا اور صیغۂ طلاق کے اجراء کی ضرورت نہ ہوتی؟ یا مراد یہ تھی کہ وہ ان دو راستوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرلیں۔ اگر جدائی کو انتخاب کرتیں تو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صیغۂ طلاق جاری کرتے ورنہ طلاق نہ ہوتی۔

اگر دیکھا جائے تو آیت ان دونوں امور میں سے کسی پر بھی دلالت نہیں کرتی اور بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت ازواجِ پیغمبرؐ کو گھر میں رہنے یا گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بارے میں اختیار دے رہی ہے۔ اور یہ حکم پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص ہے کیونکہ باقی لوگوں پر یہ حکم لاگو نہیں ہوتا۔ لیکن ان کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔

کیونکہ اس آیت اور آیاتِ طلاق کو جب باہم ملایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جدائی طلاق کے ذریعہ ہوگی۔

بہرحال یہ مسئلہ شیعہ اور اہلِ سُنّت فقہاء کے درمیان اختلافی ہے اگرچہ دوسرا قول یعنی طلاق کے ذریعے جدا

ہونا آیات کے ظاہری مفہوم کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں "اسرحکن" (میں تمھیں آزاد کردوں) کی تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں جدا کرنے پر اقدام فرماتے، خصوصًا جب کہ مادہ "تسریح" قرآن مجید میں ایک اور جگہ بھی طلاق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (البقرہ ۲۲۹)[1]

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے۔ "لیکن اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر کو چاہتی ہو اور آخرت کے گھر کو، نیز مادی لحاظ سے سادہ زندگی (جس میں محرومیتیں بھی ہیں) پر قانع ہو تو خدا نے تم میں سے نیک خواتین کے لیے عظیم جزاء اور اجر تیار کر رکھا ہے"۔ (وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الاٰخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجرًا عظیمًا)۔

درحقیقت ان چند جُملوں میں ایمان کی تمام بنیادیں اور مومن کا لائحہ عمل بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو خدا، پیغمبر اور روزِ قیامت پر ایمان واعتقاد کا ذکر ہے اور دوسری طرف عملی طور پر نیکوکاروں اور محسنین ومحسنات کی صف میں قرار پانا، تو اس بنا پر صرف خدا، آخرت کے گھر اور پیغمبرؐ کے ساتھ عشق اور لگاؤ کا اظہار کافی نہیں ہے، عملی زندگی بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونی چاہیئے۔

اس طرح خدا نے ازواجِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داریوں کو جنہیں صاحبِ ایمان عورتوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہونا چاہیئے، ہمیشہ کے لیے واضح کردیا ہے، یعنی زہد وپارسائی کا حامل ہونا اور دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ سے بے اعتنائی اور ایمان، عمل صالح اور روحانیت کی طرف خاص توجہ، اگر وہ ان صفات کی حامل ہیں تو پھر رہ جائیں اور رسولِ خدا کی زوجیت کے عظیم اعزاز کی حامل رہیں۔ ورنہ اپنی راہ لیں اور ان سے الگ ہوجائیں۔

اگرچہ اس گفتگو میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مخاطب ہیں، لیکن اپنے مضمون اور نتیجہ کے لحاظ سے سب پر محیط ہے۔ خصوصًا وہ لوگ جو مخلوق کی رہبری اور لوگوں کی پیشوائی کے مقامِ بلند پر فائز ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ دوراہے پر ہوتے ہیں کہ یا تو خوشحال زندگی تک پہنچنے کے لیے اپنی ظاہری حیثیت سے فائدہ اٹھائیں یا خدا کی رضا کے حصول اور مخلوق کی ہدایت کے لیے اپنے آپ کو ہر قسم کی محرومیوں کے لیے پیش کردیں۔

پھر بعد والی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کی سنگین ذمہ داریوں کو قرآن واضح عبارت کے ساتھ بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے: "اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی آشکارا گناہ اور فحش وغلط کام انجام دے گی، اس کا عذاب دُگنا ہوگا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے"۔ (یا نساء النبی من یأت منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لھا العذاب ضعفین وکان ذالک علی اللہ یسیرًا)۔

تم وحی کے گھر اور مرکزِ نبوت میں زندگی بسر کررہی ہو، اسلامی مسائل کے سلسلہ میں تمھاری معلومات پیغمبرِ خدا سے ہمیشہ نزدیک رہنے کی بنا پر عام لوگوں سے زیادہ ہیں، علاوہ ازیں تمہاری طرف دوسری عورتوں کی توجہ ہوتی ہے اور

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے فقہی کتب خصوصًا جواہر الکلام جلد ۲۹ صفحہ ۱۲۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

تم ان کے نزدیک نمونۂ عمل ہوتی ہو۔ اس بناء پر خدا کی بارگاہ میں تمہارا گناہ بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ہوگا کیونکہ [illegible] اور عذاب معرفت اور معلومات کے مطابق ملتے ہیں، اسی طرح ماحول پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ تمہیں آگاہی بھی زیادہ ہے [illegible] معاشرے پر اثر انداز ہونے کے لحاظ سے بھی تمہاری حیثیت بہت حساس ہے۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر تمہارے غلط اعمال ایک طرف تو پیغمبر کو آزردہ خاطر کریں گے اور دوسری طرف آنحضرت کی حیثیت کو مجروح کریں گے اور یہ بجائے خود ایک گناہ ہے جو دوسرے عذاب کا مستوجب ہوتا ہے۔

"فاحشة مبینة" سے مراد کھلے قسم کے گناہ ہیں اور واضح ہے کہ ان گناہوں کے مفاسد جو اہم شخصیت سے سرزد ہوتے ہیں، اس وقت زیادہ ہوتے ہیں جب وہ آشکارا اور ظاہر بظاہر ہوں۔

"ضعف و مضاعف" کے بارے میں نکات کی بحث میں گفتگو ہوگی۔

باقی رہا یہ فرمان کہ "یہ کام خدا پر آسان ہے" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی بھی یہ گمان نہ کرنا کہ تمہیں سزا دینا خدا کے لیے کوئی مشکل کام ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمہارا رابطہ اس سے مانع ہوگا، جس طرح دنیا کا دستور ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور قریبی رشتہ داروں کے گناہوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں یا انہیں بہت کم اہمیت دیتے ہیں۔ تو یہاں ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دو ٹوک فیصلہ ہے جو تم پر بھی نافذ ہے۔

البتہ اس کے برعکس کے بارے میں حکم ہوتا ہے: "اور جو کوئی تم میں سے خدا اور پیغمبر کے سامنے خضوع اور اطاعت کرے اور عمل صالح بجا لائے تو ہم اس کو دوگنا اجر دیں گے اور اس کے لیے ہم نے قیمتی رزق فراہم کر رکھا ہے" (و من یقنت منکن للہ ورسولہ وتعمل صالحا نؤتها اجرها مرتین و اعتدنا لها رزقا کریما)۔

"یقنت" "قنوت" کے مادہ سے ہے جس میں خضوع وادب سے ملی ہوئی اطاعت کا معنی پایا جاتا ہے۔[1] اور قرآن یہ لفظ استعمال کرکے انھیں یہ جتانا چاہتا ہے کہ وہ فرمانِ خدا و رسول کی مطیع بھی ہوں اور شرطِ ادب بھی مکمل طور پر ملحوظ رکھیں۔

یہاں پھر ہمیں یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ صرف ایمان اور اطاعت کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ "وتعمل صالحا" اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے آثار عمل میں بھی ظاہر ہوں۔

"رزق کریم" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام روحانی اور مادی نعماتِ الٰہی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس کا مفہوم "جنت" اس لیے کیا گیا ہے چونکہ بہشت ان تمام نعمات کا مرکز ہے۔

گناہ اور ثواب دوگنا کیوں؟

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبرؐ کی ازواج کے بارے میں کہتی ہیں کہ اگر وہ خدا کی اطاعت کریں

[1] مفردات راغب بہ مادۂ قنوت۔

تو ان کا اجر کئی گنا ہے اور اگر کسی آشکارا گناہ کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا کئی گناہ ملے گی۔ لیکن چونکہ اصل معیار تو مقام ومرتبہ اور اجتماعی حیثیت کا حامل ہوتا ہے لہذا یہ حکم ان افراد کے بارے میں بھی صادق آتا ہے جو معاشرے میں اچھی حیثیت اور مقام کے حامل ہوتے ہیں۔

اس قسم کے افراد کا تعلق صرف اپنی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ ان کا وجود دو جہات کا حامل ہوتا ہے۔ ایک جہت تو خود انہیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور دوسری جہت معاشرے سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا ان کی زندگی کا طرز عمل ہو سکتا ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت یا کسی کو گمراہ کر دے۔ اسی بناء پر ان کے اعمال دوہرا اثر رکھتے ہیں یعنی ایک تو انفرادی اثر اور دوسرا اجتماعی۔ اسی لیے ان میں سے ہر عمل جداگانہ اجر یا سزا کا حامل ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

"یغفر للجاهل سبعون ذنبا قبل ان یغفر للعالم ذنب واحد"

"جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے اس سے پہلے کہ عالم کا ایک گناہ بخشا جائے۔"[1]

اس سے قطع نظر ہمیشہ علمی سطح اور سزا و جزا کے درمیان قریبی رابطہ رہا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے:

"ان الثواب علی قدر العقل"

"اجر انسان کی عقل و آگاہی سے ملتا ہے۔"[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"انما یداق اللہ العباد فی الحساب یوم القیامة علی قدر ما اٰتاهم من العقول فی الدنیا"

"خداوندِ عالم قیامت کے دن بندوں کا حساب دنیا میں انہیں دی گئی عقل کے مطابق لے گا۔"[3]

یہاں تک کہ ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"عالم کی توبہ بعض مراحل میں قبول نہیں ہوگی اور آپ نے اس آیہ شریفہ سے استناد فرمایا: انما التوبة علی اللہ للذین یعملون السوء بجهالة (توبہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت اور نادانی سے برا کام انجام دیتے ہیں) (نساء ۱۷)۔"[4]

یہاں پر واضح ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے "مضاعف" یا "مرتین" کا مفہوم یہاں ثواب و عقاب کی

[1] اصول کافی جلد اول ص۴۷ باب لزوم الحجة علی العالم۔
[2] اصول کافی جلد اول ص۹ کتاب العقل والجہل۔
[3] اصول کافی جلد اول ص۱۱ کتاب العقل والجہل۔
[4] اصول کافی جلد اول ص۴۷ باب لزوم الحجة علی العالم۔

افزائش ہے۔ کبھی دوگنا اور کبھی اس سے زیادہ، بالکل ان اعداد کی طرح جن میں "کثرت" کا مفہوم ہوتا ہے۔ خصوصاً راغب کتاب مفردات میں "ضعف" کے معنی کے بارے میں کہتے ہیں:

"ضاعفته ضممت اليه مثله فصاعدًا"

"میں نے اسے مضاعف کیا یعنی اس کی مانند یا بیشتر اور کئی گنا کا اس میں اضافہ کیا۔"

(غور کیجئے گا)

مذکورہ روایت جس میں ہم نے عالم و جاہل کے گناہ کے فرق کے بارے میں ستر تک کے برابر کا ذکر کیا ہے، اس مدعا پر ایک اور گواہ ہے۔

اصولی طور پر افراد کی اجتماعی حیثیت اور ان کا معاشرتی مرتبہ نیز معاشرے میں ان کا اسوہ اور نمونہ ان کی سزا اور جزا میں کمی بیشی کا سبب بن جاتا ہے۔

اس بحث کو ہم امام سجاد علیؑ بن الحسین علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ کسی نے امامؑ سے عرض کیا:

"انكم اهل بيت مغفور لكم"

"آپ کا وہ خاندان ہے جسے خدا نے بخش دیا ہے۔"

امامؑ غصے میں آکر فرمانے لگے:

"نحن احرى ان يجرى فينا ما اجرى الله فى ازواج النبى (ص) من ان نكون كما تقول، انا نرى لمحسننا ضعفين من الاجر ولمسيئنا ضعفين من العذاب، ثم قرء الايتين"

"خداوندِ عالم نے جو حکم ازواجِ پیغمبرؐ کے بارے میں جاری کیا ہے، ہم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں بھی جاری ہو، نہ اس طرح جیسے تو کہتا ہے۔ ہم اپنے نیکوکاروں کے لیے دوہرے اجر کے اور بدکاروں کے لیے دوگنا عذاب اور سزا کے قائل ہیں۔ پھر آپ نے شاہد کے طور پر زیرِ بحث دو آیات کی تلاوت فرمائی۔[1]

[1] مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۵۴ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۲- يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ

۳۳- وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۚ

۳۴- وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۚ

ترجمہ

۳۲- اے نبی کی بیویو! اگر تقویٰ اپناؤ تو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، لہٰذا ہوس انگیز قسم کی گفتگو نہ کیا کرو، کہیں کوئی بیمار دل شخص تمہارے بارے میں لالچ میں نہ پڑ جائے اور صاف سیدھی بات کیا کرو

۳۳۔ اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو، اور پہلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے نہ نکلا کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو خدا تو یہی چاہتا ہے کہ نجاست اور گناہ تم اہل بیت سے دُور رکھے اور تمھیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے۔

۳۴۔ اور جو کچھ تمھارے گھروں میں آیاتِ خدا اور حکمت و دانش کی تلاوت کی جاتی ہے، اسے یاد رکھو اور خدا لطیف و خبیر ہے۔

تفسیر

ازواج نبیؐ کو کیسا ہونا چاہیئے:

گذشتہ آیات میں ازواج پیغمبرؐ کی حیثیت اور عظیم ذمہ داری کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں بھی یہ موضوع اسی طرح جاری و ساری ہے۔ ان چند آیات میں ازواج نبی کو سات اہم احکام دیئے گئے ہیں۔

پہلے ایک مختصری تمہید میں فرمایا گیا ہے۔ "اے ازواج پیغمبرؐ! اگر تقویٰ اپناؤ تو تم کسی عام عورت کی طرح نہیں ہو" (یانساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن)۔

ایک طرف رسول اللہ سے تمھاری نسبت ہے۔ دوسری طرف تم مرکزِ وحی میں موجود ہو، آیات قرآنی سنتی ہو اور تعلیمات اسلامی کو جانتی ہو۔ اسی خاص حیثیت کا حامل ہونے کے باعث تم تقویٰ اور گناہ دونوں میں تمام عورتوں کے لیے نمونہ اور مثال بن سکتی ہو۔

اس بناء پر تم اپنی حیثیت کو پہچانو اور اپنی بھاری ذمہ داری کو طاقِ نسیاں کے سپرد نہ کرو اور جان لو اگر تم نے تقویٰ اختیار کیا تو بارگاہِ خداوندی میں تمھارا بہت ہی مقام و مرتبہ ہوگا۔

اس مقدمے میں قرآن مخاطب کو اپنی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور انھیں ان کے مقام یاد دلاتا ہے۔ اس کے بعد پہلا حکم عفت و پاکدامنی کے سلسلے میں صادر کرتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ایک باریک نکتے کی

طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ اس بارے میں دوسرے مسائل خود بخود واضح اور روشن ہو جائیں۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے: "اس بناء پر ہوس انگیز انداز سے بات نہ کیا کرو کہ جس سے دل کے بیمار تمھارے بارے میں للچانے لگیں" (فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض)

بلکہ بات کرتے وقت دو ٹوک، سپاٹ اور معمول کے مطابق گفتگو کرو۔ پست عورتوں کی سی گفتگو نہ کرو جو کوشش کرتی ہیں کہ ہیجان انگیز اور تحریک خیز گفتگو ہو جس کے باعث شہوت پرست افراد گناہ کی سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

"الذی فی قلبہ مرض" (وہ شخص کہ جس کے دل میں بیماری ہے) کی تعبیر یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ جنسی جذبات کا اعتدال اور مشروع حد میں ہونا عین سلامتی ہے اور جب اس حد سے گزر جائے، تو پھر ایک قسم کی بیماری ہے۔ یہاں تک کہ وہ کبھی کبھار جنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے جسے "جنسی جنون" سے تعبیر کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں ماہرین نے ان نفسیاتی بیماریوں کی اقسام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جو اس طاقت کے حد اعتدال سے تجاوز اور مختلف جنسی آلودگیوں اور گندے ماحول میں پڑ جانے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں۔

آیت کے آخر میں دوسرے حکم کی یوں تشریح کی گئی ہے "تمھیں ایسی شائستہ گفتگو کرنا چاہیئے جو خدا اور پیغمبر اکرمؐ دونوں کی رضا کے مطابق اور حق و عدالت سے مزین ہو" (وقلن قولاً معروفاً)۔

حقیقت میں "لا تخضعن بالقول" کا جملہ گفتگو کے انداز اور "قلن قولاً معروفاً" گفتگو کے مطالب کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ "قول معروف" (اچھی اور شائستہ گفتگو) کا وسیع مفہوم ہے جو مذکورہ معنی کے علاوہ ہر قسم کی باطل، بے ہودہ، گناہ سے آلودہ اور حق کی مخالفت گفتار کی نفی ہے۔

یاد رہے کہ آخری جملہ ہو سکتا ہے کہ پہلے جملہ کی وضاحت ہو۔ مبادہ کوئی یہ خیال کرے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کا طرزِ تکلم غیر مردوں سے سخت یا خلافِ ادب ہونا چاہیئے، نہیں بلکہ ان کی گفتگو شائستہ، مؤدبانہ لیکن کسی تحریک آمیز پہلو کے بغیر ہونا چاہیئے۔

تیسرا حکم عفت و پاک دامنی کے سلسلہ میں ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ "تم اپنے گھروں میں رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح لوگوں کے سامنے نہ آؤ" اور اپنے بدن اور اس کی زینت کو دوسروں کے سامنے ظاہر نہ کرو۔ (وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی)۔

"قرن" "وقار" کے مادہ سے بوجھ کے معنی میں ہے اور گھروں میں ٹکے رہنے کے لیے کنایہ ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ لفظ "قرار" کے مادہ سے ہے، جو نتیجے کے لحاظ سے پہلے معنی سے چنداں مختلف نہیں۔[1]

---

[1] البتہ اگر اس صورت میں جب کہ قرار کے مادہ سے ہو تو اس کا فعل امر "اقررن" ہوگا کہ جس کی پہلی "راء" تخفیف کے عنوان سے حذف ہوئی ہے اور اس کا فتحہ قاف کی طرف منتقل ہوا ہے جس کی وجہ سے ہمزہ وصل کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ "قرن" ہوگیا ہے (غور کیجئے گا)

"متبرج" کا معنی ہے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا اور "برج" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور "بر[illegible]" کو کہتے ہیں جو سب کی نگاہوں کے سامنے ہو۔

باقی رہا یہ کہ جاہلیت اولیٰ سے کیا مراد ہے ؟ تو ظاہراً اس سے مراد جاہلیت ہے، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ [illegible] کے زمانہ سے پہلے تھی اور جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے کہ اس زمانے میں عورتیں ٹھیک طرح پردہ نہیں کرتی تھیں، دوپٹے کا ایک حصہ اپنی پشت پر اس طرح ڈال لیتی تھیں جس سے ان کا گلا، سینہ اور گردن کا ایک حصہ اور [illegible] دکھائی دیتے تھے۔ قرآن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کو اس قسم کے اعمال سے روکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک عام حکم ہے اور آیات کا ازواج پیغمبر کو مخاطب کرنا زیادہ تاکید کے لیے ہے اس طرح جیسے ہم کسی دانشور سے کہیں کہ آپ تو ایک عالم ہیں، جھوٹ نہ بولا کریں، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسر[illegible] لیے جھوٹ بولنے کی اجازت ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک عالم کو زیادہ سختی کے ساتھ اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

بہرحال یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ کوئی دوسری جاہلیت عربوں کی جاہلیت کی طرح درپیش ہے کہ جس کے آثار قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اپنی متمدن مادی دنیا میں بھی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ مفسرین کے سامنے چونکہ ایسی [illegible] نہ تھی لہٰذا وہ اس لفظ کی تفسیر میں بھی مشقت میں پڑے رہے اور وہ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیانی فاصلے کو "جاہلیت اولیٰ" تعبیر کرتے تھے۔ یا پھر داؤدؑ اور سلیمانؑ کے عصر کے درمیانی فاصلے کو جاہلیت کہتے تھے جس میں عورتیں ایسا لباس [illegible] پہن کر باہر نکلتی تھیں، جس سے بدن جھلکتا تھا، اس طرح سے وہ اسلام سے پہلے والی جاہلیت کو "جاہلیت ثانیہ" سمجھتے تھے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان تمام باتوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ "جاہلیت اولیٰ" وہی اسلام سے پہلے والی جاہلیت ہے کہ جس کی طرف قرآن میں کئی جگہوں پر ارشاد بھی ہوا ہے۔ (آل عمران ۱۴۲، مائدہ ۵۰ اور فتح ۲۶) اور "جاہلیت ثانیہ" وہ جاہلیت ہے جو بعد میں پیدا ہوگی (جیسا کہ ہمارا زمانہ ہے)۔ اس موضوع کی مزید تفصیل [illegible] کی بحث میں پیش کریں گے۔

آخر میں چوتھے، پانچویں اور چھٹے حکم کو بیان فرمایا گیا ہے "تم (پیغمبر کی بیویو !) نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" (واقمن الصلٰوۃ واٰتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہ)

اگر عبادات میں سے نماز اور زکوٰۃ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز خالق کے ساتھ اہم ترین رابطہ ہے اور زکوٰۃ بھی باوجود اس کے کہ ایک عظیم عبادت ہے، مخلوقِ خدا کے ساتھ ایک اور اٹوٹ رابطہ بھی ہے۔

باقی رہا "اطعن اللہ ورسولہ" تو یہ ایک کلی حکم ہے اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ تمام امور پر حاوی ہے۔

یہ تین احکام بھی واضح کرتے ہیں کہ زیرِ بحث احکام ازواج نبیؐ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ہیں۔ اگرچہ ازواج نبیؐ کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "اے اہل بیت! خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ نجاست اور گناہ کو تم سے دور رکھے اور تمہیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے" (انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرًا)۔

"انما" کی تعبیر جو عام طور پر "حصر" کے لیے ہے اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نعمت خاندان پیغمبر اکرم علیہم السلام سے مخصوص ہے۔

لفظ "یرید" پروردگار کے ارادۂ تکوینی کی طرف اشارہ ہے ورنہ ارادۂ تشریعی اہل بیت پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوگا، بلکہ سب لوگ بغیر کسی استثناء کے حکم شریعت کے تحت اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ ہر قسم کے گناہوں اور نجاستوں سے پاک رہیں۔

ہوسکتا ہے کہا جائے کہ ارادۂ تکوینی تو ایک قسم کے جبر کا موجب ہے، لیکن جب ان بحثوں کی طرف توجہ کی جائے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے معصوم ہونے کے بارے میں کی جاتی ہیں تو اس بات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور یہاں پر بطور خلاصہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ معصومین ایک طرف تو اپنے اعمال کی وجہ سے ایک قسم کی اکتسابی لیاقت کے حامل ہیں اور دوسری طرف اپنے پروردگار کی طرف سے ذاتی اور وہبی لیاقت رکھتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے لیے نمونہ و اسوہ بن سکیں۔

دوسرے لفظوں میں معصومین کی ہمت تائیداتِ الٰہی اور اپنے پاک اعمال کی وجہ سے ایسی ارفع و اعلیٰ ہے کہ گناہ پر قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود گناہ کی طرف نہیں جاتے۔ یوں سمجھیئے کہ کوئی عقلمند قطعاً تیار نہیں ہوگا کہ آگ کا انگارہ اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لے، باوجودیکہ اس میں نہ کوئی جبر ہے نہ اکراہ، بلکہ یہ ایسی حالت ہے جو کسی قسم کے جبر و اکراہ کے بغیر خود انسان کے وجود کے اندر سے اس کے علم و آگاہی اور فطری و طبعی مبادیات کی وجہ سے ابھرتی ہے۔

لفظ "رجس" ناپاک شئی کے معنی میں ہے خواہ وہ انسان کے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے ناپاک ہو یا عقلی حکم کی وجہ سے یا شریعت کی رُو سے یا ان سب وجوہ کے اعتبار سے۔[1]

یہ جو بعض نے "رجس" سے گناہ، شرک، بخل و حسد یا باطل اعتقاد وغیرہ مراد لیا ہے تو درحقیقت یہ اس کے مصادیق کا بیان ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم عام اور وسیع ہے اور ہر قسم کی نجاست اس کے معنی میں شامل ہے، کیونکہ الف لام یہاں جنس پر دلالت کرتا ہے۔

"تطہیر" کا معنی ہے پاک کرنا اور حقیقت میں نجاستوں اور ناپاکیوں کو دُور کرنے کے بارے میں تاکید ہے۔ نیز اس کا مفعول مطلق کی شکل میں ہونا یہاں اس معنی کی ایک اور تاکید شمار ہوتا ہے۔

باقی رہی "اہل بیت" کی تعبیر، تو تمام علماء اسلام اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ جناب پیغمبرؐ کے اہل بیت کی طرف اشارہ ہے یہی بات خود آیت کے ظاہر سے بھی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ "بیت" اگرچہ یہاں مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے سے اس سے مراد پیغمبر اکرم کا بیت اور گھر ہے۔[2]

---

[1] راغب نے کتاب مفردات میں رجس کے مادہ میں مذکورہ بالا معنی اور اس کے چار قسم کے مصداق کو بیان کیا ہے۔

[2] بعض نے "بیت" کو یہاں "بیت اللہ الحرام" اور کعبہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس کے اہل متقی افراد کو شمار کیا ہے۔ یہ بات آیات کے سیاق سے بہت ہی غیر مناسب ہے کیونکہ یہاں گفتگو پیغمبر اکرمؐ اور ان کے گھر کے بارے میں ہے نہ کہ بیت اللہ الحرام کے متعلق لہٰذا جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے۔

باقی رہا یہ کہ "اہل بیت پیغمبرؐ" سے مراد کون لوگ ہیں تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اسے ازواج کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں اور قبل و بعد کی آیات کو جو ازواج کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اس کا قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن ایک مطلب کی طرف توجہ کرنے سے اس نظریہ کی نفی ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ وہ ضمیریں جو قبل و بعد کی آیات میں آئی ہیں کی سب جمع مؤنث کی شکل میں ہیں جب کہ آیت کے اس حصے " انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرًا" کی ضمیریں سب جمع مذکر کی شکل میں ہیں اور یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں کوئی دوسرا معنی مراد ہے۔

اس لیے بعض دوسرے مفسرین نے اس سے وسیع تر نظریہ اختیار کرتے ہوئے آیت میں پیغمبرِ اکرمؐ کے سارے خاندان کو شامل سمجھا ہے چاہے وہ مرد ہوں یا آپ کی بیویاں۔

دوسری طرف بہت زیادہ روایات جو اہل سنت اور شیعہ منابع و مصادر میں وارد ہوئی ہیں ایک اور معنی دیتی ہیں اور پیغمبرِ اکرمؐ کے سارے خاندان کے شمول کی بھی نفی کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس آیت میں مخاطب صرف پانچ افراد ہیں، یعنی حضرت پیغمبر اکرم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

تو اس قدر وافر مقدار میں نصوص کے ہوتے ہوئے جو آیت کے مفہوم کی تفسیر کے لیے روشن و واضح قرینہ ہیں اس آیت کے لیے قابلِ قبول تفسیر وہی تیسرا معنی ہے یعنی آیت "خمسہ طیبہ" سے مختص ہے۔

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت پیغمبرؐ کی ازواج کی ذمہ داریوں کے ذکر کے بیچ میں یہ بات کیونکر آ گئی ہے کہ جس میں پیغمبرِ اکرمؐ کی بیویاں شامل نہیں ہیں؟

تو اس کا جواب بزرگ مفسر مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس طرح دیتے ہیں: یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ آیاتِ قرآن میں ہم ایسی آیات کا سلسلہ کر رہے ہیں کہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود مختلف موضوعات کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ قرآن ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح فصحاءِ عرب کے کلام و اشعار میں بھی اس کے وافر نمونے ملتے ہیں۔

تفسیر المیزان کے عظیم مؤلف نے اس پر ایک اور جواب کا اضافہ کیا ہے کہ جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ " انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس ...." کا جملہ ان آیات کے ساتھ نازل ہوا ہے، بلکہ روایات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ علیحدہ نازل ہوا ہے، لیکن پیغمبرِ اکرمؐ کے دور میں آیاتِ قرآن کی جمع آوری کے موقع پر یا اس کے بعد ان آیات کے ساتھ قرار دیا گیا ہے۔

اس سوال کا جو تیسرا جواب دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کی بیویوں سے کہے کہ تمہاری نسبت ایک ایسے گھرانے سے ہو گئی ہے کہ جس کے افراد معصوم ہیں۔ تو جو کوئی شجرِ عصمت کے سائے میں اور معصومین کے مرکز میں ہو وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ دوسروں کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ خبردار ہو اور اس بات کو نہ بھول جائے کہ جس کی نسبت ایسے خاندان سے ہو کہ جس میں پانچ پاک و معصوم ہستیاں موجود ہیں، اس کی ذمہ داریاں بہت بھاری ہیں۔ خدا اور خلقِ خدا اس سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہے۔

انشاءاللہ ہم نکات کی بحث میں ان سُنی و شیعہ روایات کے بارے میں تفصیل سے بحث کریں گے جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

آخری زیرِ بحث آیت میں ازواجِ پیغمبر کا ساتواں اور آخری حصہ بیان ہوا ہے اور ان سب کو خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے کہ بہترین موقع انھیں میسر ہے اس سے استفادہ کریں اور حقائق اسلام سے آگاہی حاصل کریں، چنانچہ فرمایا گیا ہے: "تمہارے گھروں میں خدائی آیات اور حکمت و علم کی تلاوت ہوتی ہے اسے یاد کرو" اور اس کے سائے میں اپنی اصلاح کرو، کیونکہ بہترین موقع تمہارے ہاتھ میں ہے" (واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من اٰیات اللہ والحکمۃ)۔

تم وحی کے مقام اور نورِ قرآن کے مرکز و منبع میں موجود ہو یہاں تک کہ اگر تم گھر میں بھی بیٹھی ہو تو بھی پیغمبرِ اسلامؐ کی زبانی تمہارے گھر کی فضا ان آیات سے گونج رہی ہے۔ لہٰذا تمھیں چاہیئے کہ شایانِ شان طریقے سے اسلامی تعلیمات اور پیغمبرؐ کے ارشادات سے بہرہ مند ہو جبکہ رسول اللہ کا ہر سانس درس ہے اور ہر بات ایک راہِ عمل متعین کرتی ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ "آیات اللہ" اور "حکمت" کے درمیان کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ دونوں الفاظ قرآن کی طرف اشارہ ہیں۔ البتہ "آیات" کی تعبیر اس کے اعجاز کے پہلو کو بیان کرتی ہے اور حکمت کی تعبیر اس کے عمیق اور گہرے مفہوم اور علم کو بیان کرتی ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ "آیات اللہ" آیاتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے اور "حکمت" سُنتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے حکیمانہ پند و نصائح کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ دونوں تفاسیر آیت کے مقام و الفاظ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، کیونکہ "تلاوت" کی تعبیر آیاتِ الٰہی سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی متعدد آیات میں آیات اور حکمت دونوں کے بارے میں نزول کی تعبیر آئی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۱ (وما انزل علیکم من الکتاب والحکمۃ) اسی طرح سورۂ نساء کی آیت ۱۱۳ میں بھی آیا ہے۔

خلاصہ کلام کے طور پر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "خدا لطیف و خبیر ہے" (ان اللہ کان لطیفًا خبیرًا)۔

اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہایت ہی گہرے اور باریک مسائل سے بھی باخبر اور آگاہ ہے اور تمہاری نیتوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے اور تمہارے سینوں کے اندرونی اسرار سے بھی باخبر ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب "لطیف" کی تفسیر ایسی ذات سے کی جائے جو باریک بین اور ذرّہ ذرّہ سے باخبر ہو، اور اگر صاحبِ لُطف مراد ہو تو یہ اس طرف اشارہ ہوگا کہ اللہ تم ازواجِ رسول کی نسبت لُطف و رحمت رکھتا ہے اور تمہارے اعمال سے "خبیر" اور آگاہ ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لطیف" آیاتِ قرآنی کے اعجاز کی بناء پر ہے اور "خبیر" اس کے حکمت آمیز مضمون کی بناء پر ہے۔ اس کے باوجود ان معانی کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ سب مطالب مفہومِ آیت میں جمع ہو سکتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ آیتِ تطہیر عصمت کی واضح دلیل: بعض مفسرین "رجس" کو آیت میں صرف شرک یا زنا جیسے گناہانِ کبیرہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جبکہ اس محدودیت کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ "الرجس" کا "اطلاق" (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا الف و لام، جنس کے لیے ہے) ہر قسم کی ناپاکی اور گناہ کا مفہوم لیے ہوئے ہے کیونکہ

ہر گناہ "رجس" ہے اسی لیے یہ لفظ قرآن میں "شرک" "الکحل والے مشروبات" "جوا" "نفاق" "حرام وناپاک گوشت" اور اس قسم کی دو[illegible] چیزوں کے معنی میں آیا ہے۔ (حج - ۳۰، مائدہ - ۹۰، توبہ - ۱۲۵، انعام - ۱۴۵)

اس طرف توجہ کرتے ہُوئے کہ خدائی ارادہ تخلف ناپذیر ہے اور "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس" کا جملہ اس کے حتمی ارادہ پر دلیل ہے خصوصاً "اِنما" کے لفظ کی طرف توجہ کرتے ہُوئے کہ جو حصر اور تاکید کے لیے ہے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ اہل بیت ہر قسم کے رجس و نجاست اور گناہ سے پاک ہوں اور اسی چیز کا نام عصمت ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ارادۂ الٰہی سے مراد حلال و حرام کے بارے میں اس کے احکام اور فرامین نہیں ہیں، کیونکہ یہ احکام تو سب کے لیے ہیں اور اہل بیت سے اختصاص نہیں رکھتے۔ اس بنا پر وہ لفظِ "انما" کے مفہوم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔

پس یہ مسلسل اور متواتر ارادہ ایک قسم کی خدائی امداد کی طرف اشارہ ہے جو اہل بیت کی عصمت اور اس کے دوام و تسلسل کے لیے ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ارادہ و اختیار کی آزادی کے بھی منافی نہیں ہے جیسا کہ ہم تشریح کر چکے ہیں۔

حقیقت میں آیت کا مفہوم وہی ہے جو "زیارتِ جامعہ" میں آیا ہے۔

"عصمکم اللہ من الذلل وامنکم من الفتن، وطھرکم من الدنس، واذھب عنکم الرجس، وطھرکم تطھیرًا"

"خدا نے لغزشوں سے تمھاری حفاظت کی اور انحراف و کج روی کے فتنے سے امان میں رکھا اور آلودگیوں سے پاک کیا تم سے ہر قسم کی ناپاکیوں اور نجاستوں کو دور کیا اور جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے تمھیں پاک رکھا۔"

اس وضاحت کے بعد اوپر والی آیت کے عصمت اہل بیت پر دلالت کرنے میں شک و تردد نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ آیتِ تطہیر کن افراد کے بارے میں ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ آیت اگرچہ ان آیات کے درمیان آئی ہے جو پیغمبرِ اکرمؐ کی ازواج سے مربوط ہیں لیکن اس کے سیاق کی تبدیلی ("جمع مونث" کی ضمائر کو "جمع مذکر" میں تبدیل کرنا) اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مضمون ان آیات سے بالکل الگ ہے۔

اس بنا پر ان لوگوں کا نظریہ بھی درست نہیں جو آیت کو پیغمبرِ اکرمؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ، حضرت حسن و حضرت حسین علیہم السلام سے مخصوص نہیں سمجھتے، اس کے لیے وسیع معنی کے قائل ہیں کہ آیت ان بزرگواروں کے بارے میں بھی ہے اور پیغمبرِ اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں بھی۔

ہمارے پاس بہت سی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت صرف ان بزرگواروں کے ساتھ مخصوص ہے اور ازواج پیغمبرِ اکرمؐ اس میں داخل نہیں ہیں اگرچہ شایانِ شان، احترام کے لائق ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے کچھ روایات قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

(الف) کچھ روایات وہ ہیں جو خود پیغمبرِ اکرمؐ کی ازواج سے نقل ہوئی ہیں اور بتاتی ہیں کہ جس وقت پیغمبرِ اکرمؐ اس آیت شریفہ کے بارے میں بات کرتے تو ہم آپ سے سوال کرتیں کہ ہم بھی اس کا مخاطب ہیں تو آپ فرماتے کہ تم اچھی تو ہو لیکن اس میں شامل نہیں ہو۔

ان میں سے ایک روایت ثعلبی نے اپنی تفسیر میں جناب "اُمّ سلمہ" سے نقل کی ہے۔

"پیغمبرِ اکرمؐ اپنے گھر میں تھے کہ حضرت فاطمہؑ ریشمی کپڑا لائیں تو رسول اللہ نے فرمایا اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں حسن

و حسینؑ کو بلاؤ۔ فاطمہؑ انھیں بھی بلا لائیں، پھر ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ان پر عبا ڈال دی اور کہا:

"اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی وعترتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرًا"

خداوندا یہ میرے اہل بیت ہیں اور میری عترت ہیں، ان سے ہر قسم کی نجاست دُور رکھ اور انھیں پاک رکھ جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے۔

اس موقع پر آیت "انما یرید اللہ" نازل ہوئی۔

میں نے کہا کیا میں بھی آپ کے ساتھ ہوں اے رسولِ خدا؟ فرمایا "انک الی خیر" تو خیر اور نیکی پر ہے، لیکن ان افراد کے زمرے میں شامل نہیں ہو۔

نیز ثعلبی حضرت عائشہ سے یوں نقل کرتے ہیں۔

"جس وقت بی بی عائشہ سے جنگِ جمل کے بارے میں اور اس تباہ کُن جنگ میں ان کے عمل دخل کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو (انھوں نے افسوس کے ساتھ) کہا یہ ایک تقدیر خداوندی تھی اور جب ان سے حضرت علیؑ کے بارے میں سوال ہوا تو کہا:

"تسئلنی عن احب الناس کان الی رسول اللہؐ وزوج احب الناس، کان الی رسول اللہ لقد رأیت علیًا وفاطمة وحسنًا وحسینًا علیھم السلام وجمع رسول اللہ (ص) بثوب علیھم ثم قال اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی وحامتی فاذھب عنھم الرجس و طھرھم تطھیرًا، قالت، فقلت یارسول اللہ! انا من اھلک قال تنحی فانک الی خیر"

"کیا مجھ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھتے ہو جو رسول اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب اور آنحضرتؐ کے نزدیک محبوب ترین خاتون کے شوہر تھے، میں نے اپنی ان آنکھوں سے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو دیکھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے انہیں ایک کپڑے کے نیچے جمع کیا اور فرمایا: خداوندا! یہ میرے اہل بیت اور میرے حامی و مددگار ہیں ان سے ہر قسم کے رجس کو دور رکھ اور انھیں آلودگیوں سے ایسا پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہوتا ہے۔

میں نے عرض کی: یارسول اللہ! کیا میں بھی آپ کے اہل بیت میں سے ہوں؟

فرمایا: پیچھے ہٹو! تم خیر پر ضرور ہو، لیکن ان میں شامل نہیں ہو[1]۔

اس قسم کی روایات صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اس آیت میں ازواجِ رسولؐ، اہل بیت کا جزو نہیں ہیں۔

(ب) حدیث کساء کے بارے میں بہت سی روایات اجمالی طور پر وارد ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیغمبرِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کو بلایا، یا وہ حضرات خود آپ کی خدمت میں آئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اوپر عبا ڈالی اور

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا :

" خداوندا! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ہر قسم کی رجس و آلودگی کو دور رکھ "۔

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ " انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس "۔

مشہور عالم، حاکم حسکانی نیشاپوری نے "شواہد التنزیل" میں ان روایات کو متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے اور مختلف راویوں سے جمع کیا ہے۔[1]

یہاں پر یہ سوال توجہ طلب ہے کہ آخر اہل بیت کو کساء کے نیچے جمع کرنے کا مقصد کیا تھا ؟

جواباً عرض ہے کہ گویا پیغمبر چاہتے تھے کہ اپنے اہل بیت کو مکمل طور پر نمایاں اور ممتاز کردیں اور بتادیں کہ یہ آیت صرف انہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مبادا کوئی شخص رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام گھروں اور ان تمام افراد کو جو آپ کے خاندان میں تھے، اس آیت کا مصداق سمجھ لے۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا :

" اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی وخاصتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرًا "

" خداوندا ! میرے اہل بیت یہی ہیں، ان سے ہر قسم کی نجاسات کو دور رکھ"۔[2]

(ج) بہت سی دوسری روایات میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ ماہ تک جب بھی صبح کی نماز کے وقت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو پکار کر کہتے :

" الصلٰوۃ یا اھل البیت ! انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرًا "

" نماز کا وقت ہے اے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو تم اہل بیت سے دور رکھے اور تمہیں ویسا ہی پاک رکھے، جیسے پاک رکھنے کا حق ہے"۔

اس حدیث کو حاکم حسکانی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے۔[3]

ایک اور روایت میں ابوسعید خدری کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے یہ سلسلہ آٹھ یا نو ماہ تک جاری رکھا۔[4]

مذکورہ بالا حدیث کو ابن عباس نے بھی آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔[5]

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۳۱۔

[2] تفسیر در منثور آیت زیر بحث کے ذیل میں۔

[3] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۱۔

[4] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۲۸ تا ۲۹۔

[5] در منثور زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت کا تکرار چھ، آٹھ یا نو ماہ تک مسلسل فاطمہ زہرا علیہا السلام کے گھر کے پاس اس بنا پر ہے، تاکہ یہ بات مکمل طور پر واضح ہوجائے اور آئندہ کسی شخص کے لیے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے کہ یہ آیت صرف انہی ذوات مقدسہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن کے گھر کا صدر دروازہ مسجد نبوی میں اس وقت بھی کھلتا تھا، جب آنحضرت کے حکم سے دوسروں کے دروازے مسجد کی طرف بند کر دیئے تھے، فطری بات ہے کہ بہت سے افراد ہمیشہ نماز کے وقت یہ بات وہاں پیغمبر کی زبانِ مبارک سے سنتے تھے۔ (غور کیجیئے گا)

مقامِ تعجب ہے کہ اس کے باوجود بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور ازواجِ رسول بھی اس میں شامل ہیں۔ جبکہ علماء اسلام کی اکثریت خواہ وہ شیعہ ہوں یا اہلِ سنت اسے پنجتن ہی میں محدود سمجھتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اگر یہ آیت ازواج کے لیے بھی ہوتی تو زوجہ رسولؐ جناب عائشہؓ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کسی نہ کسی مناسب موقع پر اس کا اظہار ضرور کیا ہوتا، کیونکہ روایات کے مطابق انھوں نے اپنے فضائل اور آنحضرتؐ سے اپنے رابطے کو بیان کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، جبکہ اس سلسلہ میں ان سے کسی قسم کی کوئی چیز روایت نہیں ہوئی۔

(د) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو صراحت کے ساتھ گواہی دیتی ہیں کہ : " نزلت فی خمسۃ فی رسول اللہ وعلی وفاطمۃ والحسن والحسینؑ "[1]

یعنی " یہ روایت صرف انہی پاک ہستیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یہ روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض محققین انہیں متواتر جانتے ہیں۔

جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اس کا مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احادیث کے مآخذ اور راوی جو آیت کو صرف پنج تن پاک میں منحصر سمجھتے ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، یہاں تک کہ "احقاق الحق" کی شرح میں ستر سے زیادہ احادیث اہلِ سُنت کی مشہور کتابوں سے جمع کی گئی ہیں اور شیعی مآخذ میں تو ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔[2]

کتاب " شواہد التنزیل" کے مؤلف نے جو برادران اہلسنت کے مشہور علماء میں سے ہیں اس سلسلے میں ۱۳۰ احادیث نقل کی ہیں۔[3]

ان سب امور سے قطع نظر بعض ازواج پیغمبرؐ نے اپنی زندگی کے دوران میں ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جو ہرگز مقامِ عصمت کے لائق نہیں۔ مثلاً جنگِ جمل کا واقعہ، جو امام وقت کے خلاف قیام تھا اور زبردست خون ریزی کا سبب بنا، بعض مؤرخین کے بقول اس جنگ میں سترہ ہزار افراد مارے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ کسی بھی طرح قابل توجیہ نہیں ہے یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود حضرت عائشہؓ بھی اس حادثے کے بعد اظہارِ ندامت کیا کرتی تھیں، جس کا ایک نمونہ گذشتہ مباحث میں پیش کیا جا چکا ہے۔

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۲۵۔

[2] احقاق الحق جلد ۲ اور اس کے حواشی کی طرف رجوع کریں۔

[3] شواہد التنزیل جلد ۲ ص ۱۰ سے لے کر ص ۹۲ تک رجوع کریں۔

حضرت عائشہ کا اسلام کی بزرگ ترین اور بافضیلت ترین خاتون جناب خدیجۃ الکبریٰ پر تنقید کرنا تاریخ اسلام کے سینے میں محفوظ ہے۔ یہ عیب جوئی اسلام کے گرامیٔ قدر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر ناگوار گزری کہ غضب سے آپؐ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔

" خدا کی قسم مجھے اس سے بہتر بیوی نصیب نہیں ہوئی، وہ اس وقت ایمان لائیں جب باقی لوگ کافر تھے اور اس وقت سارا مال میرے سپرد کر دیا جب سب لوگ مجھ سے کٹے ہوئے تھے۔ [1]

۳ ۔ خدا کا ارادہ تشریعی ہے یا تکوینی؟

ہم نے آیت کی تفسیر کے دوران میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس" میں ارادہ سے مراد ارادۂ تشریعی نہیں بلکہ ارادۂ تکوینی ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ذہن نشین کریں کہ ارادۂ تشریعی سے مراد خدا کے اوامر ونواہی ہیں۔ مثلاً خدا ہم سے نماز، روزہ، حج وجہاد وغیرہ چاہتا ہے اور یہی ارادۂ تشریعی ہے۔

معلوم ہوا کہ ارادۂ تشریعی کا ہمارے اعمال کے ساتھ تعلق ہوتا ہے نہ کہ خدا کے افعال کے ساتھ۔ حالانکہ زیرِ بحث آیت میں ارادے کا تعلق خدا کے فعل کے ساتھ ہے، قرآن کہتا ہے: خدا نے ارادہ کیا ہے کہ تم اہل بیت سے ہر قسم کی نجاست اور پلیدی کو دور رکھے اس بنا پر اس قسم کا ارادہ تکوینی ہونا چاہیئے جو عالم تکوین میں خدا کی مشیئت سے مربوط ہے۔

مزید برآں پاکیزگی اور تقوٰے کے سلسلہ میں ارادۂ تشریعی کا مسئلہ اہل بیتؑ کے ساتھ مخصوص نہیں رہتا، کیونکہ خدا نے تو سب لوگوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ پاک ہوں اور تقوٰے اختیار کریں اور یہ اہل بیتؑ کے لیے کوئی اعزاز نہیں ہوگا کیونکہ تمام مکلف اسی حکم میں شامل ہیں۔

بہرحال یہ موضوع یعنی ارادۂ تشریعی نہ صرف یہ کہ ظاہراً آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ گذشتہ آیات کے ساتھ بھی کسی طرح مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ وہ سب احادیث ایک اعلیٰ خصوصیت اور زبردست قدر وقیمت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں جو اہلبیت کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ بھی مسلم ہے کہ "رجس" یہاں پر ظاہری نجاست کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ باطنی ناپاکیوں کی طرف اشارہ ہے اور اسے شرک وکفر اور منافی عفت اعمال وغیرہ میں محدود نہیں کیا جاسکتا اور ہر قسم کے اعتقادی، اخلاقی اور عملی گناہ اور آلودگیاں اس میں شامل ہیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف غور سے توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ ارادۂ تکوینی جو خلقت وآفرینش کے معنی میں ہے، یہاں مقتضی کے مفہوم میں ہے نہ کہ علت تامہ کے معنی میں، جو موجب جبر واکراہ اور باعث سلب اختیار ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ مقام عصمت تقوائے الٰہی کی ایک حالت ہے جو پروردگار کی مدد سے انبیاء اور ائمہ میں پیدا ہوتی ہے، لیکن اس حالت کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ وہ گناہ نہ کر سکیں بلکہ وہ اس کام کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اپنے ارادہ واختیار

[1] صحیح بخاری اور صحیح مسلم "المراجعات ص ۲۲۹ خط ۷۲ کے مطابق۔

کے ساتھ گناہ کے نزدیک نہیں جاتے۔

بالکل اس ماہر طبیب کی مانند کسی زہریلی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا کیونکہ وہ اس کے یقینی خطرات سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی بصیرت اور فکری وروحانی تقاضے اس امر کا سبب بنتے ہیں کہ وہ اپنے ارادہ واختیار سے دست بردار ہو جائے۔

یہاں اس نکتے کو یاد دلانا بھی ضروری ہے کہ یہ خدائی تقویٰ اس کی خاص دین، عطیہ اور نعمت ہے جو اس نے انبیاء ومرسلین اور ائمہ اطہار علیہم السلام کو عطا فرمایا ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کو لیکن توجہ رہے کہ خدا نے یہ اعزاز انہیں رہبری اور قیادت کی بھاری ذمہ داری نبھانے کی بناء پر عطا فرمایا ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے اور یہ عین عدالت ہے بعینہٖ اس خاص امتیاز کے مانند جو خدا نے آنکھ کے نازک اور بہت ہی حساس پردوں کو دیا ہے، جن سے سارا بدن فائدہ اُٹھاتا ہے۔

علاوہ ازیں انبیاء اور ائمہ جس قدر اعزازات کے حامل ہیں اور عنایات الٰہیہ ان کے شامل حال ہیں اسی قدر ان کی ذمہ داری بھی سخت ہوتی ہے اور ان کا ایک ترک اولیٰ عام افراد کے ایک عظیم گناہ کے برابر شمار ہوتا ہے۔ یہی امر عدالت الٰہی کو واضح کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ ارادہ مقتضی کی صورت میں ارادۂ تکوینی ہے (نہ کہ علت تامہ) اور اس کے باوجود نہ تو موجب جبر ہے اور نہ ہی اعزاز کو سلب کرتا ہے۔

۴ ۔ بیسویں صدی کی جاہلیّت:

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت "الجاھلیۃ الاولیٰ" کی تفسیر کے سلسلے میں زیرِ بحث آیات میں شک وشبہ کا شکار ہوئی ہے۔ گویا وہ یہ باور نہیں کر سکے کہ ظہورِ اسلام کے بعد جاہلیت کی کوئی اور قسم بھی دنیا میں ظہور پذیر ہوگی جس کے سامنے اسلام سے پہلے عربوں کی جاہلیت بھی شرما جائے گی لیکن آج کے زمانے میں یہ امر ہمارے لیے جو بیسویں صدی کی جاہلیت کے وحشت ناک مظاہر کے شاہد ہیں پورے طور پر حل شدہ ہے اور اسے قرآن مجید کی معجزانہ پیش گوئیوں میں سے ایک شمار کرنا چاہیئے۔

اگر عرب جاہلیت اولیٰ کے زمانے میں جنگ اور غارتگری کا بازار گرم رکھتے تھے اور بطور مثال متعدد بار بازار عکاظ احمقانہ خوں ریزی کا مرکز بنا جس میں کچھ افراد قتل ہو گئے تو ہمارے زمانے کی جاہلیت میں ایسی عالمی جنگیں رونما ہوتی ہیں کہ بسا اوقات دو کروڑ افراد ان کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور اس سے زیادہ تعداد میں لوگ مجروح اور معذور ہو جاتے ہیں۔

اگر جاہلیت عرب میں عورتیں "تبرج بزینت" کرتی تھیں اور اپنے دوپٹے کو اس انداز سے استعمال کرتیں کہ سینہ، گلا، گردن کا ہار اور گوشوارے نمایاں ہو جاتے تو ہمارے زمانے میں ایسے کلب CLUB بھی ہیں جنہیں "برہنوں کے کلب" کا نام دیا جاتا ہے (جن کا نمونہ انگلستان میں موجود ہے) ہم نہایت معذرت کے ساتھ عرض کریں گے کہ ایسے کلبوں میں لوگ مادر زاد ننگے بن کر جاتے ہیں۔ ساحل سمندر کے پلاژوں، سوئمنگ پولوں حتیٰ کہ شارع عام پر ہونے والی اخلاق باختگی ناقابل بیان ہے۔

اگر عربوں کی جاہلیت کے دور میں "زنانِ آلودہ ذوات الاعلام" (جھنڈے تلے والی بدمعاش عورتیں، جو گناہ کی دعوت کی غرض سے اپنے مکانوں پر جھنڈے نصب کر دیتی تھیں) موجود تھیں، تو ہماری صدی کی جاہلیت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں تو جو اس بارے میں مخصوص روزناموں میں ایسے مطالب شائع کرتے ہیں جن کے ذکر سے قلم شرما جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں عربوں کی جاہلیت، شرافت نظر آتی ہے۔

قصہ کوتاہ، ہم ان مفاسد کی کیفیت کے بارے میں کیا کہیں جو ایمان سے خالی اس مادی اور مشینی تمدن میں پائے جاتے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے اور ہم اس مقدس تفسیر کو اس سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔

جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے ایسے لوگوں کی زندگی کی نشاندہی کرنے کے لیے مشتے نمونہ از خروارے تھا جو خدا سے اپنا ناتہ توڑ چکے ہیں اور ہزار ہا دانش گاہوں، علمی مراکز اور مشہور دانش مندوں کے باوجود اخلاقی فساد کی دلدل میں پھنس چکے ہیں یا جنسی فساد کی منجدھار میں ڈوب چکے ہیں۔ حتیٰ کہ خود انہی مراکز کے دانشور بھی ایسی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

۳۵۔ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۳۵۔ بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور صاحب ایمان مرد اور صاحب ایمان عورتیں، فرمانِ الٰہی کے مطیع مرد اور مطیع عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، باخشوع مرد اور باخشوع عورتیں، خرچ کرنے والے مرد اور خرچ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، وہ مرد جو اپنے دامن عفت کو آلودگی سے محفوظ رکھتے ہیں اور پاک دامن عورتیں، وہ مرد جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو زیادہ یادِ خدا میں رہتی ہیں خدا نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم فراہم کر رکھا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت کے مطابق جس وقت جعفر بن ابی طالبؑ کی زوجہ جناب اسماء بنت عمیس اپنے شوہر کے ہمراہ حبشہ سے واپس لوٹیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئیں۔ سب سے پہلے جو انہوں نے سوالات کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ "کوئی چیز عورتوں کے بارے میں بھی قرآن مجید میں نازل ہوئی ہے؟" ازواج رسولؐ نے جواب دیا کہ "نہیں" تو فوراً رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئیں کہ یا رسول اللہؐ! کیا عورتیں خسارے کا شکار نہیں"؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: "وہ کیسے"؟

اسماء نے عرض کیا: "قرآن مجید میں مردوں کی طرح ان کے بارے میں کوئی فضیلت نہیں آئی"۔

چنانچہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں اطمینان دلایا کہ عورت اور مرد بارگاہ رب العزت میں قرب و منزلت کے لحاظ سے یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور ان کی فضیلت اور برتری اعتقاد، عمل اور اسلامی اخلاق کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

تفسیر

اسلام میں عورت کا مقام:

ازواج رسولؐ کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں مذکورہ گفتگو کے بعد زیرِ نظر آیت میں عورتوں، مردوں اور ان کی برجستہ صفات کے متعلق ایک اور مفید گفتگو ہو رہی ہے۔ ان کی دس اعتقادی، عملی اور اخلاقی صفات کو شمار کر کے ان کے عظیم اجر کو آیت کے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ان دس صفات کا ایک حصہ ایمان کے مراحل کے بارے میں ہے (یعنی زبان سے اقرار، قلب و رُوح سے تصدیق اور ارکان کے ساتھ عمل)۔

اس کا دوسرا حصہ زبان و شکم اور جنسی شہوت پر کنٹرول کے بارے میں ہے کیونکہ یہ تینوں عوامل انسان کی زندگی اور اخلاق کے لیے نہایت ہی مؤثر اور فیصلہ کن نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک اور حصے میں محرومین کی حمایت اور سخت ترین حوادث میں استقامت یعنی صبر کا ذکر ہے جو ایمان کی جڑ ہے۔ آخر میں ان صفات کو اپنائے رکھنے اور انہیں دوام بخشنے یعنی ذکر پروردگار کے متعلق گفتگو ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں" (ان المسلمین والمسلمات)۔

مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں (والمؤمنین والمؤمنات) اور وہ مرد جو حکم خدا کے مطیع اور پیروکار ہیں اور وہ عورتیں جو فرمانِ حق تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں (والقانتین والقانتات)۔

اگرچہ اس آیت میں بعض مفسرین نے "اسلام" اور "ایمان" کو ایک ہی معنی میں لیا ہے لیکن واضح ہے کہ آیت میں تکرار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان سے مراد دو الگ الگ

چیزیں ہیں اور اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو سورہ حجرات آیہ ۱۴ میں آئی ہے:

" قالت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم "

" اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ابھی تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم اسلام لائے ابھی تو ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں اترا ہی نہیں

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام وہ زبانی اقرار ہے جو انسان کو مسلمانوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے اور اسی پر اسلامی احکام نافذ ہوتے ہیں، لیکن ایمان، دل کے ساتھ تصدیق کرنے کا نام ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس فرق کی طرف اشارہ ہوا ہے

ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی نے اسلام اور ایمان کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا کہ کیا یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں؟ تو امامؑ نے جواب میں فرمایا:

" جی ہاں ایمان، اسلام کے ساتھ ساتھ ہے لیکن ممکن ہے کہ اسلام، ایمان کے ساتھ نہ ہو۔

صحابی نے مزید وضاحت چاہی تو امام عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا:

" الاسلام شھادة ان لا الٰہ الّا اللہ والتصدیق برسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم، بہ حقنت الدماء، وعلیہ جرت المناکح والمواریث، وعلی ظاھرہ جماعة الناس، والایمان الھدی ما یثبت فی القلوب من صفة الاسلام، وما ظھر من العمل بہ

اسلام توحید کی شہادت اور رسالتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق ہے۔ جو شخص ان امور کا اقرار کرے، اس کی جان (حکومت اسلامی کی پناہ میں) محفوظ ہوگی اور مسلمانوں کا اس سے شادی بیاہ جائز ہوگا اور وہ مسلمانوں کی میراث لے سکتا ہے، لوگوں کا ایک گروہ اس ظاہری اسلام ہی کا مصداق ہے لیکن ایمان نورِ ہدایت اور ایسی حقیقت کا نام ہے جو دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور ایسے اعمال سے عبارت ہے جو ایمان کے پیچھے چلے آتے ہیں۔[1]

" قانت" "قنوت" کے مادہ سے ہے اور جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ ایسی اطاعت کے معنی میں ہے جس میں خضوع و خشوع پایا جاتا ہے۔ ایسی عبادت جو ایمان اور اعتقاد کے ساتھ بجا لائی جائے۔ یہ ایمان کے عملی پہلوؤں اور اس کے آثار کی جانب اشارہ ہے۔

اس کے بعد سچے مؤمنین کی ایک اہم ترین صفت یعنی زبان کی حفاظت کرنے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اور سچے مرد اور سچی عورتیں (والصادقین والصادقات)۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲ باب " ان الایمان یشرک الاسلام"۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے ایمان کی استقامت اور درستی اس کی زبان کی استقامت پر منحصر ہے۔ چنانچہ ... ہوتا ہے:

" لا یستقیم ایمان امرء حتی یستقیم قلبه، ولا یستقیم قلبه حتّٰی یستقیم لسانه "

" انسان کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل درست نہ ہو، جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اس کا دل درست نہیں ہوتا۔

چونکہ مشکلات کے مقابلے میں ایمان کی بنیاد صبر و شکیبائی ہے اور معنویت کے لحاظ سے صبر کا مقام و مرتبہ انسان کے بدن میں مثل "سر" کے ہے۔ لہٰذا ان کی پانچویں صفت کو یوں بیان کیا گیا ہے "اور صابر و شکیبا مرد اور صابر و با استقامت عورتیں (والصابرین والصابرات)۔

ہم جانتے ہیں کہ اخلاق کے آفات اور اس کے مصائب میں سے تکبر و غرور اور حب جاہ و مال بھی ہیں جب کہ اس کا متضاد "خشوع" ہے۔ لہٰذا چھٹی صفت یہ بتائی گئی ہے۔ "اور با خشوع مرد اور با خشوع عورتیں" (والخاشعین والخاشعات)۔

حبِّ جاہ کے علاوہ حبِّ مال بھی ایک عظیم آفت ہے جس کے چنگل میں پھنس جانا ایک زبردست المیہ ہوتا ہے بلکہ قید و بند سے کم نہیں ہوتا۔ اس کا متضاد "انفاق" اور حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔ اس لیے ساتویں صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے "اور انفاق کرنے والے مرد اور انفاق کرنے والی عورتیں" (والمتصدقین والمتصدقات)۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انسان ان کے شر سے محفوظ ہو جائے تو بہت سے شرور اور اخلاقی آفات سے بچ جاتا ہے اور وہ ہیں زبان، شکم اور جنسی خواہشات۔ پہلے حصہ میں چوتھی صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے، لیکن دوسرے اور تیسرے حصے میں سچے مؤمنین کی آٹھویں اور نویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔ "اور وہ مرد جو روزہ رکھتے ہیں اور وہ عورتیں جو روزہ رکھتی ہیں" (والصائمین والصائمات)۔

"اور وہ مرد جو اپنے دامن کو فحش آلودگیوں سے بچاتے ہیں اور وہ عورتیں جو پاک دامن ہیں" (والحافظین فروجهم والحافظات)۔

اور آخر میں دسویں اور آخری صفت بیان کی گئی ہے کہ جس سے عام گزشتہ صفات کا دوام وابستہ ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ "اور وہ مرد جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو زیادہ یاد کرتی ہیں" (والذّاکرین اللّٰه کثیرًا والذّاکرات)۔

جی ہاں! وہ خدا کے ساتھ ہر حالت میں اور تمام مقامات پر غفلت اور بے خبری کے پردوں کو اپنے دل سے ہٹا دیتے ہیں، شیاطین کے وسوسوں اور بے ہودہ خیالات کو دور کر دیتے ہیں۔ اور اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے، تو فوراً ان کی

---

[1] مجمع البیضاء جلد ۵ صفحہ ۱۹۳۔

تلافی کر دیتے ہیں تاکہ خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم سے ہٹ نہ جائیں

"ذکر کثیر" سے کیا مراد ہے؟ اسلامی روایات اور مفسرین کی گفتگو میں اس کی مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں جو بظاہر اس کا مصداق شمار ہوں گی اور اس لفظ کا وسیع مفہوم ان سب پر محیط ہوگا۔

منجملہ ان کے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مبارک حدیث ہے:

"اذا ایقظ الرجل اهله من اللیل فتوضأ وصلیا کتبا من الذاکرین اللّٰه کثیرًا والذاکرات"

جب کوئی مرد اپنی بیوی کو رات کے وقت بیدار کرے اور دونوں وضو کر کے نماز (تہجد) ادا کریں تو ان دونوں کا شمار ان مردوں اور عورتوں میں ہوگا جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کی تسبیح رات کو پڑھے تو وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔[2]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "ذکر کثیر" یہ ہے کہ:

"قیام و قعود کی حالت میں اور بستر پر جا کر خدا کو یاد کیا جائے۔"

تفسیر جو بھی ہو ذکر ہر حال فکر کی نشانی ہے اور فکر، عمل کا مقدمہ اور تمہید ہے اور مقصد قطعاً فکر و عمل سے خالی ذکر نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے مردوں اور عورتوں کے عظیم اجر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "خدا نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم فراہم کر رکھا گیا ہے" (اعد اللّٰه لهم مغفرة واجرًا عظیمًا)۔

خداوند عالم پہلے مرحلہ میں ان کے گناہوں کو دھو ڈالتا ہے جو ان کی روح کی آلودگی کا موجب بنتے ہیں۔ پھر انہیں عظیم اجر عطا کرتا ہے ایسا اجر جس کی عظمت خود اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ درحقیقت ان میں سے ایک میں ناگوار حالات کی نفی کا اور دوسرے میں خوشگوار حالات کے پیدا کرنے کا پہلو موجود ہے۔

"اجرًا" کی تعبیر ویسے ہی اس کی عظمت کی دلیل ہے اور پھر اس کو "عظیم" کی صفت کے ساتھ موصوف کرنا اس عظمت کی تاکید ہے اور پھر اس عظمت کو مطلق اور بغیر کسی قید کے ذکر کرنا اس کی وسعت داماں کی ایک اور دلیل ہے۔ واضح رہے، جس چیز کو خداوندِ عظیم، باعظمت شمار کرے وہ یقیناً انتہائی عظیم ہوگی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "اعد" (آمادہ کر رکھا ہے) فعل ماضی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جو یا تو اس اجر کے قطعی اور برخلاف نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یا پھر اس طرف اشارہ ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتیں ابھی سے مومنین کے لیے تیار ہیں۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔

خدا کی بارگاہ میں مرد اور عورت برابر ہیں :

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے منزلت کا پلڑا مردوں کے لیے بھاری قرار دیا ہے اور اسلامی کارناموں میں عورت کو چنداں مقام و منزلت حاصل نہیں۔ شاید انھیں یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اسلام میں بعض مقامات پر عورت اور مرد کے حقوق اور قوانین کے درمیان فرق ہے جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ وجہ اور خاص فلسفہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے فرق سے قطع نظر کہ جن کی مخصوص معاشرتی حیثیت اور خاص طبیعی حالت ہوتی ہے، انسانی پہلو اور روحانی مقامات کے لحاظ سے اسلام کی نظر میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مذکورہ بالا آیت اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کیونکہ مؤمنین کی خصوصیات اور اعتقادی، اخلاقی اور عمل کے اہم ترین بنیادی مسائل بیان کرتے وقت ترازو کے پلڑوں کے مانند مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے شانہ بشانہ قرار دیا گیا ہے اور ہر دو کے لیے بغیر کسی تھوڑی سی بھی تفاوت اور فرق کے یکساں اجر بیان کیا گیا ہے۔

بالفاظ دیگر مرد اور عورت کے جسمانی فرق کے مانند ان کے روحانی فرق کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور واضح بات ہے کہ یہ فرق انسانی معاشرے کے نظام کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ضروری ہے، جس کے نتائج عورت اور مرد کے حقوق کے بعض قوانین میں مرتب ہوتے ہیں لیکن اسلام عورت کی انسانی شخصیت کے بارے میں بعض گزشتہ عیسائی علماء کی طرح یہ سوال نہیں کرتا کہ کیا عورت واقعاً انسان ہے اور آیا اس کے اندر بھی انسانی رُوح پائی جاتی ہے؟ اسلام نہ صرف اس قسم کے سوال نہیں کرتا، بلکہ انسانی رُوح کے لحاظ سے مرد اور عورت کے درمیان کسی قسم کے فرق کا بھی قائل نہیں ہے۔ اسی لیے ہم سورۂ نحل کی آیہ ۹۷ میں پڑھتے ہیں:

"من عمل صالحًا من ذکر او انثٰی وھو مؤمن فلنحیینہ حیٰوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔"

"جو شخص نیک عمل کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ باایمان ہو تو ہم اس کو زندہ کریں گے اور اسے پاکیزہ زندگی بخشیں گے اور اسے اس کے بہترین عمل کا بدلہ دیں گے۔"

اسلام عورت کے لیے اسی طرح اقتصادی آزادی کا قائل ہے جس طرح مرد کے لیے، برخلاف گزشتہ بلکہ موجودہ زمانہ کے بہت سے قوانین کہ جن میں عورت کو کسی قسم کی اقتصادی آزادی نہیں دی گئی۔

اسی بناء پر اسلامی "علم الرجال" میں ہمیں ایسی صاحبانِ علم خواتین کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو فقہا اور راویوں کی صف میں موجود ہیں اور جنھیں ناقابلِ فراموش شخصیات کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

اگر ہم اسلام سے پہلے کی عرب تاریخ کی طرف لوٹیں اور اس معاشرے میں عورت کی کیفیت کے سلسلے میں تحقیق کریں کہ کس طرح وہ اپنے بہت سے بنیادی حقوق تک سے محروم تھی تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات تو وہ لوگ اس کے جینے کے حق کے قائل بھی نہیں تھے اور پیدا ہونے کے بعد اسے زندہ درگور کر دیتے تھے۔

اسی طرح اگر موجودہ دور میں عورت کی حالت دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ تمدن کے مٹھی بھر جھوٹے دعوے داروں نے عورت

کو ایک بے جان کھلونا سمجھا ہوا ہے اور بس!

یہیں پر پہنچ کر ہم اس امر کی تصدیق کریں گے کہ اسلام نے عورت کی کس قدر عظیم خدمت کی ہے اور عورت کی گردن پر اس کا کس حد تک حق بنتا ہے؟ [1]

[1] اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد نمبر ۱ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے ذیل میں اور جلد ۶ میں سورۂ نحل کی آیت ۹۷ کے ذیل میں بھی بحث کی گئی ہے۔

۳۶۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗۤ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ

۳۷۔ وَإِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْۤ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْۤ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○

۳۸۔ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۙ○

ترجمہ

۳۶۔ کوئی باایمان مرد اور باایمان عورت یہ حق نہیں رکھتے کہ خدا اور اس کا

رسول کسی امر کو لازم سمجھیں (تو وہ خدا کے فرمان کے مقابلے میں) اپنی طرف سے خود مختار ہوں اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ واضح گمراہی میں گرفتار ہے۔

۳۷۔ وہ وقت یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دی تھی اور تم نے بھی اس پر احسان کیا تھا، تم اس سے کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو (اور تم اسے یہ بات بار بار کہتے تھے) اور تم اپنے دل میں ایک چیز چھپائے ہوئے تھے کہ جسے خدا نے آشکار کرنا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ اس سے ڈرو۔ جس وقت زید اپنی بیوی سے جدا ہوا تو ہم نے اس کی بیوی کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ مومنین کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے مطلقہ ہونے کے بعد شادی کرنے میں کوئی مشکل باقی نہ رہے اور خدا کا فرمان تو پورا ہو کر رہتا ہے۔

۳۸۔ جو چیز خدا نے نبی پر فرض کی ہے، اس کے بارے میں پیغمبر پر کسی قسم کا جرم نہیں ہے، خدا کی سنت ان لوگوں کے بارے میں بھی جاری ہے جو اس سے پہلے تھے اور خدا کا فرمان ٹھیک ٹھیک اور حساب و کتاب کے مطابق ہے۔

شانِ نزول

اکثر اسلامی مؤرخین اور مفسرین کے مطابق زیرِ نظر آیات (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد) زینب بنت جحش اور آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ زمانۂ بعثت سے پہلے اور اس کے بعد جب کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ نے پیغمبرِ اسلام سے شادی

کی تو حضرت خدیجہؓ نے زید نامی ایک غلام خریدا، جسے بعد میں آنحضرتؐ کو ہبہ کر دیا۔

آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ چونکہ اس کے قبیلے نے اسے اپنے سے جدا کر دیا تھا، لہٰذا رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، جسے اصطلاح میں متبنیٰ کہتے ہیں۔

ظہورِ اسلام کے بعد زید مخلص مسلمان ہو گیا اور اسلام کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے اور اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ آخر میں جنگ موتہ میں ایک مرتبہ لشکرِ اسلام کے کمانڈر بھی مقرر ہوئے اور اسی جنگ میں شربت شہادت نوش کیا۔

جب سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کا عقد کرنا چاہا تو اپنی پھوپھی زاد، زینب بنت جحش بنت امیہ بنت عبدالمطلب سے اس کے لیے خواستگاری کی۔ زینب نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ آنحضرت اپنے لیے اسے انتخاب کرنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ خوش ہو گئی اور رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ آپ کی یہ خواستگاری تو زید کے لیے تھی تو سخت پریشان ہوئی اور انکار کر دیا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے بھی اس چیز کی سخت مخالفت کی۔

یہی وہ مقام تھا جس کے بارے میں زیر تبصرہ آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور زینب اور عبداللہ جیسے افراد کو تنبیہ کی کہ جس وقت خدا اور اس کا رسول کسی کام کو ضروری سمجھیں تو وہ مخالفت نہیں کر سکتے۔

جب انھوں نے یہ بات سُنی تو سرِ تسلیم خم کر دیا۔ (البتہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ شادی کوئی عام شادی نہیں تھی بلکہ یہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لیے ایک تمہید تھی کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں کسی باوقار اور مشہور خاندان کی عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی، چاہے وہ غلام کتنا ہی اعلیٰ قدر و قیمت کا مالک کیوں نہ ہوتا۔

لیکن یہ شادی زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی اور طرفین کے درمیان اخلاقی ناچاقیوں کی بدولت طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ اگرچہ پیغمبرِ اسلام کا اصرار تھا کہ یہ طلاق واقع نہ ہو لیکن ہو کر رہی۔

اس کے بعد پیغمبرِ اکرمؐ نے شادی میں اس ناکامی کی تلافی کے طور پر زینب کو حکم خدا کے تحت اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا اور یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

لیکن دوسری باتیں لوگوں کے درمیان چل نکلیں جنہیں قرآن مجید نے بعض زیر بحث آیات کے ذریعے ختم کر دیا، جن کی تفصیل انشاء اللہ ابھی آئے گی۔[1]

تفسیر

ایک بہت بڑی رسم ٹوٹتی ہے:

سب جانتے ہیں کہ اسلام کی رُوح تسلیم ہے اور وہ بھی حکم خدا کے سامنے غیر مشروط طور پر، یہ معنی قرآن کی مختلف آیات اور

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی، تفسیر المیزان، تفسیر فی ظلال القرآن، تفسیر فخر الرازی اور دوسری تفاسیر زیر بحث آیات کے ذیل میں، اسی طرح سیرۃ ابن ہشام، جلد اول ص ۲۶۴ اور کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۷۷۔

عبارات سے ظاہر ہوتا ہے، منجملہ ان کے مندرجہ بالا آیت ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "کسی ایماندار مرد اور باایمان عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کو ضروری سمجھیں تو حکم خدا کے سامنے ان کا اپنا اختیار چلے" (وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرًا ان یکون لهم الخیرة من امرهم)۔

انھیں چاہیئے کہ وہ اپنا ارادہ حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع کریں جیسا کہ ان کا وجود سراپا اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔

"قضی" یہاں پر قضائے تشریعی" قانون، فرمان اور فیصلہ دینے کے معنی میں ہے اور واضح سی بات ہے کہ نہ تو خدا لوگوں کی اطاعت اور تسلیم کا محتاج ہے اور نہ ہی پیغمبرِ اکرمؐ کو ان سے کسی قسم کا طمع، بلکہ حقیقت میں خود ان لوگوں کا اپنا فائدہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنے علم و معرفت کے محدود ہونے کی وجہ سے وہ باخبر نہیں ہو پاتے لیکن خدا تو جانتا ہے اور اپنے پیغمبرؐ کو حکم بھی دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے ایک ماہر طبیب بیمار سے کہتا ہے کہ میں اس صورت میں تمہارا علاج کروں گا جب تم میری ہدایت کو بسر و چشم قبول کرو گے اور اپنی طرف سے خود مختار نہیں ہو گے۔ درحقیقت یہ بات بیمار کے بارے میں طبیب کی دلی شفقت اور انتہائی دل سوزی کی دلیل ہوتی ہے اور خدا تو اس قسم کے طبیب سے بدرجہا اولیٰ اور برتر ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ واضح گمراہی کا شکار ہوگا۔" (ومن یعص الله ورسوله فقد ضل ضلالًا مبینًا)

وہ راہِ سعادت کھو دے گا اور بے راہروی اور بدبختی کا شکار ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے مہربان خدا اور اس کے رسولؐ کے فرمان کی پرواہ نہیں کی جو خیر و سعادت کا ضامن ہے۔ اس سے بڑھ کر اور واضح گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد زید اور اس کی بیوی زینب کی اس مشہور داستان کو بیان کیا گیا ہے جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حساس مسائل میں سے ایک ہے اور ازواجِ رسولؐ کے مسئلہ سے مربوط ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اس وقت کو یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دے رکھی تھی اور تم نے (بھی اے رسولؐ!) اسے نعمت دی تھی اور تم کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو" (واذ تقول للذی انعم الله علیه وانعمت علیه امسك علیك زوجك واتق الله)۔

نعمت خدا سے مراد وہی ہدایت اور ایمان کی نعمت ہے جو زید بن حارثہ کو نصیب ہوئی تھی اور پیغمبرؐ کی نعمت یہ تھی کہ آپ نے اسے آزاد کیا تھا اور اپنے بیٹے کی طرح اسے عزت بخشی تھی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زید اور زینبؓ کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا تھا اور یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ نوبت جدائی اور طلاق تک جا پہنچی۔ اگر "تقول" کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ فعل مضارع ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آنحضرتؐ بارہا بلکہ ہمیشہ اسے نصیحت کرتے اور روکتے تھے۔

کیا زینب کا یہ نزاع زید کی سماجی حیثیت کی بناء پر تھا جو زینب کی معاشرتی حیثیت سے مختلف تھی؟ کیونکہ زینب کا ایک مشہور و معروف قبیلہ سے تعلق تھا اور زید آزاد شدہ تھا۔ یا زید کی اخلاقی سختیوں کی وجہ سے تھا؟ یا ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی بلکہ دونوں میں روحانی اور اخلاقی موافقت اور ہم آہنگی نہیں تھی؟ کیونکہ ممکن ہے دو افراد اچھے تو ہوں لیکن فکر و نظر اور سلیقہ کے لحاظ سے ان میں اختلاف

ہو، جس کی بناء پر وہ اپنی ازدواجی زندگی کو آیندہ کے لیے جاری نہ رکھ سکتے ہوں؟

بہرحال مسئلہ اس حد تک پیچیدہ نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے "تم اپنے دل میں ایک چیز کو چھپائے ہوئے تھے جسے خدا آشکار کرتا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ خدا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرو": (وتخفی فی نفسك ما الله مبدیه وتخشی الناس والله احق ان تخشاه)۔

مفسرین نے اس مقام پر بہت سی باتیں کی ہیں اور بعض لوگوں کی تعبیرات میں لاپرواہی اور نافہمی کے سبب دشمن کے ہاتھ بہانے آگئے، حالانکہ ان قرائن سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ آیات کے شانِ نزول اور تاریخ میں یہ بات موجود ہے کہ پیغمبرؐ کی نظر میں تھا کہ اگر ان میاں بیوی کے درمیان صلح صفائی نہیں ہو پاتی اور نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے تو وہ اپنی پھوپھی زاد زینبؓ کی اس ناکامی کی تلافی اپنے ساتھ نکاح کی صورت میں کردیں گے، اس کے ساتھ آپؐ کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ لوگ دو وجوہ کی بنا پر آپؐ پر اعتراض کریں گے اور مخالفین ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کردیں گے۔

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زید آنحضرتؐ کا منہ بولا بیٹا تھا، اور زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق منہ بولے بیٹے کے بھی وہی احکام ہوتے تھے جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے بھی شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔

دوسری یہ کہ رسولِ اکرمؐ کیونکر اس بات پر تیار ہوسکتے ہیں کہ وہ اپنے ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد کریں جبکہ آپؐ کی شان بہت بلند و بالا ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ ارادہ حکم خداوندی سے کیا ہوا تھا اور آیت کے بعد والے حصے میں بھی اس بات کا قرینہ موجود ہے۔

اس بناء پر یہ مسئلہ ایک تو اخلاقی اور انسانی مسئلہ تھا اور دوسرے یہ زمانہ جاہلیت کی دو غلط رسموں کو توڑنے کا ایک نہایت ہی مؤثر ذریعہ تھا۔ (یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے ازدواج۔ اور آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد)۔

مسلّم ہے کہ پیغمبرؐ کو ان مسائل میں نہ تو لوگوں سے ڈرنا چاہیئے تھا اور نہ ہی فضا کے مکدر ہونے اور زہریلے پروپیگنڈا سے خوف زدہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بہرحال ایک فطری بات ہے کہ انسان اس قسم کے مواقع پر خصوصًا جہاں بیوی کے انتخاب کا مسئلہ ہو تو خوف و دہشت کا شکار ہو ہی جاتا ہے، خاص کر جب یہ احتمال ہو کہ ایک جنجال کھڑا ہوجائے گا اور آپؐ کے مقدس مشن کی ترقی اور اسلام کی پیش رفت کے لیے رکاوٹ کھڑی ہوجائے گی اور یہ بات ضعیف الایمان افراد کو متزلزل کردے گی اور ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوجائیں گے۔

اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "جس وقت زید نے اپنی حاجت کو پورا کرلیا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تو ہم اسے تمہاری زوجیت میں لے آئے تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے مطلقہ ہونے کے بعد مومنین کو ان سے شادی کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو": (فلما قضی زید منها وطرًا زوجناكها لكی لا یكون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائهم اذا قضوا منهن وطرًا)۔

یہ کام ایسا تھا جسے انجام پاجانا چاہیئے تھا" اور خدا کا فرمان انجام پاکر رہتا ہے": (وكان امر الله مفعولًا)۔

"ادعیاء" "دعی" کی جمع ہے جو منہ بولے بیٹے کے معنی میں ہے"، "وطر" ضرورت اور اہم حاجت کے معنی میں ہے اور زینبؓ کی طلاق اور جدائی کے بارے میں اس تعبیر کا انتخاب حقیقت میں لطفِ بیان کی وجہ سے ہے تاکہ "طلاق" کا لفظ جو عورتوں کے لیے بلکہ مردوں کے لیے بھی عیب ہے، صراحت کے ساتھ بیان نہ ہو، گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے احتیاج مند تھے کہ ایک مدت تک مشترکہ زندگی بسر کریں اور جب یہ احتیاج ختم ہوگئی تو ان کے درمیان جدائی واقع ہوگئی۔

"زوجناكها" (ہم اسے آپؐ کی تزویج میں لے آئے) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ازدواج، خدا کی طرف سے تھا۔ اسی لیے تاریخ میں آیا ہے کہ "زینب" رسول خدا کی دوسری بیویوں پر فخر و مباہات کرتی اور کہتی تھیں:

"زوجكن اهلوكن وزوجنی الله من السماء"

"پیغمبرؐ سے تمہارا نکاح تو تمہارے رشتہ داروں نے کیا ہے لیکن میرا نکاح اللہ نے آنحضرتؐ کے ساتھ آسمانوں میں کیا ہے۔[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے پوری صراحت کے ساتھ اس شادی کا اصل مقصد بیان کرتا ہے جو زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم توڑنے کے لیے تھی۔ یعنی منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ عورتوں سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں بہ خود ایک کلی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبرؐ کا مختلف عورتوں سے شادی کرنا کوئی عام سی بات نہیں تھی، بلکہ اس میں کئی ایک مقاصد کا ذکر کرنا مقصود تھا جو آپؐ کے مکتب کے مستقبل میں انجام سے تعلق رکھتا تھا۔

"كان امر الله مفعولًا" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں دوٹوک فیصلہ کردینا چاہیئے اور کرنے کا کام ضرور انجام پذیر ہونا چاہیئے۔ ایسے مسائل میں جو کلی اور بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کے سلسلہ میں دنیا کے شور شرابے اور جنجال کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال دینا چاہیئے۔

مذکورہ بالا آیت کی واضح تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے ضمن میں جو الزامات دشمن یا ناداں دوست لگاتے ہیں، وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور ان شاء اللہ اہم نکات کی بحث میں اس بارے میں مزید وضاحت کریں گے۔

آخری زیر بحث آیت گزشتہ مباحث کی تکمیل کے سلسلے میں یوں کہتی ہے، "خدا نے جو چیز پیغمبر پر واجب کردی ہے اس کے بارے میں ان کے لیے کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں ہے": (ما كان علی النبی من حرج فیما فرض الله له)۔

جب خداوندِ عالم انھیں کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے بارے میں کسی قسم کی رو رعایت جائز نہیں ہے کسی قسم کے چون و چرا کے بغیر اس پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔

آسمانی رہبروں کو خدائی احکام کے اجرا میں اِدھر اُدھر کی باتوں پر بھی کان نہیں دھرنا چاہیئے، غلط سیاسی فضا یا غلط قسم کے آداب و رسوم کو جو ماحول پر چھائے ہوئے ہیں، مدنظر نہیں رکھنا چاہیئے۔

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۲۱، قابل توجہ امر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زینبؓ سے شادی پانچویں ہجری میں ہوئی (حوالہ مذکورہ)۔

کیونکہ بعض اوقات اس قسم کے احکام انہی غلط رسومات کو مٹانے اور غلط اور رسواکن بدعتوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہوتے ہیں، انہیں ولا یخافون لومة لائم (مائدہ/۵۴) کا مصداق ہوتے ہوئے دنیا کی کسی سرزنش اور شور و غوغا خاطر میں نہ لاکر حکم انہی پر کاربند ہونا چاہیئے۔

اصولی طور پر اگر ہم یہ چاہیں کہ جب تک فرمان خدا کے لیے سب کی رضا اور خوشنودی حاصل نہ کرلیں، اس وقت تک کچھ نہ کریں تو یہ بات قطعاً ناممکن ہے، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو صرف اسی وقت راضی ہوتے ہیں جب ہم ان کی تمام خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلیں یا ان کے مکتب کے پیروکار ہو جائیں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔

"ولن ترضی عنك الیهود ولا النصاری حتی تتبع ملتهم"۔

"یہود و نصاریٰ ہرگز تجھ سے راضی نہیں ہوں گے، جب تک تو ان کے دین کی غیر مشروط پیروی نہ کرے"۔

(بقرہ/ ۱۲۰)

زیر بحث آیت کے بارے میں بھی معاملہ کچھ اسی طرح کا تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زینبؓ سے شادی کر لینے پر اس ماحول کے عام لوگوں کی نظر میں دو اعتراض تھے ایک تو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی جو ان کی نگاہ میں سگے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کے مترادف تھا اور یہ ایسی بدعت تھی، جسے ہر حالت میں توڑنا چاہیئے تھا اور دوسرا ایک باوقار شخصیت یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے شخص کا ایک آزاد شدہ غلام کی مطلقہ سے شادی کرنا۔ کیونکہ یہ چیز پیغمبر کو ایک غلام کے ہم پلہ قرار دیتی تھی اس غلط خیال کو بھی بہر صورت ختم ہونا چاہیئے تھا اور اس کی جگہ انسانی اقدار کو لینا چاہیے تھی اور میاں بیوی کا "کفو" ہونا صرف ایمان، اسلام اور تقوےٰ کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیئے تھا، اور یہی ہو کر رہا۔

اصولی طور پر کسی رسم و رواج کو توڑنے اور غیر انسانی آداب و رسوم کو ختم کرنے سے ہمیشہ ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا پیغمبروں کو کبھی ایسے ہنگاموں کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی لیے بعد والے جملہ میں فرمایا گیا ہے: انبیاء کے بارے میں یہ خدائی سنت گزشتہ امتوں میں بھی جاری رہ چکی ہے: (سنة الله في الذين خلوا من قبل)۔

گویا اے رسول! صرف آپ ہی ان مشکلات میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ تمام انبیاءؑ غلط رسم و رواج کو توڑتے وقت ان مشکلات سے دوچار ہوئے تھے۔

اس معاملہ میں سب سے بڑی مشکل صرف یہ نہیں تھی کہ ان دو غلط رسموں کو توڑا جائے، بلکہ آنحضرت کی شادی کا مسئلہ بیچ میں آجانے کی وجہ سے عیب جوئی کے لیے دشمن کے ہاتھ میں ایک اور بہانہ بھی آتا تھا۔ جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اسی قسم کے بنیادی مسائل کے فیصلہ کن ہونے کو ثابت کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

خدا کا حکم ہمیشہ جچا تلا اور صحیح صحیح پروگرام کے مطابق ہوتا ہے اور اسے نافذ العمل ہونا چاہیئے (وکان امر الله قدرًا مقدورًا)۔

ہوسکتا ہے کہ "قدرًا مقدورًا" کی تعبیر فرمان الٰہی کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں حکمت اور مصلحت کو مدِ نظر رکھا گیا ہو۔ لیکن زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس سے دونوں معانی مراد لیے جائیں یعنی فرمان خدا حساب و کتاب پر مبنی بھی ہے اور وہ بغیر کسی حیل و حجت کے نافذ العمل بھی ہے۔

پھر مزیدار بات یہ کہ تاریخی کتابوں میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب سے ازدواج کے سلسلے میں کھانے کی دعوت کا ایسا عمومی بندوبست کیا، جو اس سے پہلے کسی شادی کے موقع پر دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔[1]

اس طرح سے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ آپ کسی طرح بھی بے ہودہ اور فضول رسم و رواج سے مرعوب نہیں، بلکہ اس خدائی حکم کے نفاذ پر فخر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی نگاہ میں یہ بھی تھا کہ اس طرح سے زمانہ جاہلیت کی رسم کو توڑنے کی آواز تمام جزیرۃ العرب کے رہنے والوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔

چند اہم نکات

۱۔ جھوٹے افسانے: پیغمبر اسلامؐ کی زینب کے ساتھ شادی کی داستان قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کا ہدف منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کے ذریعے دورِ جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنا تھا، اس کے باوجود دشمنانِ اسلام نے اسے غلط رنگ دے کر ایک عشقیہ داستان میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح سے انہوں نے پیغمبر اکرم کی ذاتِ والا صفات کو آلودہ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے اور اس بارے میں مشکوک اور جعلی احادیث کا سہارا لیا ہے۔ ان داستانوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جس وقت رسولِ اکرمؐ زید کی احوال پرسی کے لیے اس کے گھر گئے اور جونہی آپؐ نے دروازہ کھولا تو آپ کی نظر زینبؓ کے حسن و جمال پر جا پڑی تو آپؐ نے فرمایا:

"سبحان الله خالق النور تبارك الله احسن الخالقين"۔

"منزہ ہے وہ خدا جو نور کا خالق ہے اور جاوید و بابرکت ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے"۔

ان لوگوں نے اس جملے کو زینبؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لگاؤ کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ عصمت و نبوت کے مسئلے سے قطع نظر بھی اس قسم کے افسانوں کی تکذیب کے واضح شواہد ہمارے پاس موجود ہیں:

پہلا یہ کہ حضرت زینبؓ، رسولِ پاکؐ کی پھوپھی زاد تھیں اور خاندانی ماحول میں تقریباً آپ کے سامنے بڑھی پلی تھیں اور آپؐ ہی نے زید کے لیے ان کی خواستگاری کی تھی۔ اگر زینبؓ حد سے زیادہ حسین تھیں اور بالفرض اس کے حسن و جمال نے پیغمبر اکرمؐ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا تو نہ تو اس کا حسن و جمال ڈھکا چھپا تھا اور نہ ہی اس ماجرے سے پہلے ان کے ساتھ آنحضرتؐ کا عقد کرنا کوئی مشکل امر تھا۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو زینب کو زید کے ساتھ شادی کرنے سے دلچسپی نہ تھی، بلکہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مخالفت کا اظہار صراحت کے ساتھ بھی کر دیا تھا اور وہ اس بات کو کاملاً ترجیح دیتی تھیں کہ زید کی بجائے رسول اللہ کی بیوی بنیں، کیونکہ جب آنحضرت زید کے لیے زینب سے خواستگاری کرنے آئے تو وہ نہایت خوش ہوگئیں، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ آپ ان سے اپنے

---

[1] عظیم مفسر طبرسی مرحوم "مجمع البیان" میں اس طرح نقل کرتے ہیں کہ:

"فتزوجها رسول الله ..... وما اولم على امرءة من نسائه ما اولم عليها، ذبح شاة واطعم الناس الخبز واللحم، حتى امتد النهار۔" (مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۶۱)

لیے خواستگاری کی غرض سے تشریف لائے ہیں، لیکن بعد میں قرآن کی آیت کے نزول اور خدا و پیغمبر کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے زید کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو گئیں۔

تو ان حالات کو سامنے رکھتے ہُوئے توہّم کی کونسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ آپ زینبؓ کے حالات سے بے خبر تھے؟ یا آپ ان سے شادی کی خواہش رکھتے ہُوئے بھی اقدام نہیں کر سکتے تھے؟

دوسرا یہ کہ جب زید نے اپنی بیوی زینبؓ کو طلاق دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا تو آپؐ نے بار بار اسے نصیحت کی اور طلاق دینے کے لیے روکا اور یہ چیز بجائے خود ان افسانوں کی نفی کا ایک اور شاہد ہے۔

پھر یہ کہ خود قرآن صراحت کے ساتھ اس شادی کا مقصد بیان کرتا ہے تاکہ کسی قسم کی دوسری باتوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ آیت بالا میں خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ زید کی مطلقہ بیوی کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی خاص بات تھی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے ڈرتے تھے، جبکہ انھیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہیے۔ خوفِ خدا کا مسئلہ واضح کرتا ہے کہ یہ شادی ایک فرض کی بجا آوری کے طور پر انجام پائی تھی کہ خدا کی ذات کے لیے شخصی معاملات کو ایک طرف رکھ دینا چاہیئے تاکہ ایک خدائی مقدس ہدف پورا ہو۔ اگرچہ اس سلسلے میں کور دل دشمنوں کی زبان کے زخم اور منافقین کی افسانہ طرازی کا پیغمبر کی ذات پر الزام ہی کیوں نہ آتا ہو۔ پیغمبرِ اکرم نے حکم خدا کی اطاعت اور غلط رسم کو توڑنے کی پاداش میں یہ ایک بہت بڑی قیمت ادا کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔

لیکن سچے رہبروں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں، جن میں انھیں ایثار اور فداکاری کا ثبوت دینا پڑتا ہے، اور وہ اس قسم کے لوگوں کے اتہامات اور الزامات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرح سے وہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ جائیں۔

البتہ اگر پیغمبر گرامی قدر نے زینبؓ کو بالکل ہی نہ دیکھا ہوتا اور نہ ہی پہچانا ہوتا اور زینب نے بھی آپؐ کے ساتھ ازدواج کے بارے میں رغبت کا اظہار نہ کیا ہوتا اور زیدؓ بھی انھیں طلاق دینے پر تیار نہ ہوتے (نبوت و عصمت کے مسئلہ سے ہٹ کر) پھر تو اس قسم کی گفتگو اور ان توہمات کی گنجائش ہوتی، لیکن پیغمبر کی تو وہ دیکھی دکھائی تھیں لہٰذا ان تمام امکانات کی نفی کے ساتھ ان افسانوں کا جعلی اور من گھڑت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں نبی اکرمؐ کی زندگی کا کوئی لمحہ یہ نہیں بتاتا کہ آپ کو زینب سے کوئی خاص لگاؤ اور رغبت ہو، بلکہ دوسری بیویوں کی طرح اور شاید ان میں سے بعض دوسری بیویوں کی نسبت ان سے کم رغبت رکھتے تھے اور ان افسانوں کی نفی پر یہ ایک اور دلیل ہے۔

آخری بات جس کی طرف ہم یہاں پر اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ اس غلط رسم کو مٹانا تو ضروری تھا، لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ خود آنحضرتؐ ہی اس کے لیے عملی اقدام اُٹھائیں۔ آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ اس مسئلے کو قانون کی صورت میں بیان کر دیتے اور دوسروں کو اپنے مُنہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے شادی کرنے کی ترغیب دلاتے۔

لیکن توجہ رکھنا چاہیئے کہ بعض اوقات ایک جاہلانہ اور غلط رسم کا خاتمہ خاص کر شادی بیاہ کے سلسلے میں اور وہ بھی ایسے افراد سے جو دنیا کی نگاہوں میں کم حیثیت ہوتے ہیں، صرف گفتگو سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ کام اچھا ہے تو

پیغمبر اسے خود کیوں نہیں انجام دیتے؟ اپنے آزاد شدہ غلام کی مطلقہ بیوی سے خود شادی کیوں نہیں کرتے؟ وغیرہ۔

اس قسم کے مواقع پر ایک عملی نمونہ اس طرح کے تمام اعتراضات کو ختم کر دیتا ہے، فیصلہ کن انداز میں وہ غلط رسم ٹوٹ جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ یہ عمل بذاتِ خود ایک قسم کی فداکاری اور ایثار بھی تھا۔

۲۔ حق کے سامنے جھک جانا ہی عین اسلام ہے:

اس میں شک نہیں کہ انسان کا فکری اور روحانی استقلال اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ غیر مشروط طور پر ہر کسی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، کیونکہ وہ بھی اس کی طرح کا انسان ہے اور ہو سکتا ہے کہ کئی مسائل میں وہ (جس کے سامنے جھکایا جا رہا ہے) غلطی میں مبتلا ہو۔

لیکن جب مسئلے کا سلسلہ عالم اور حکیم خدا اور اس کے پیغمبر تک جا پہنچتا ہو، جو خدا کے حکم کے ساتھ بولتا اور اس کے حکم کے مطابق قدم اُٹھاتا ہو تو اب مکمل طور پر سر تسلیم خم نہ کرنا گمراہی کی دلیل ہوگا، کیونکہ اس کا حکم اور فرمان ہر قسم کے شائبہ تک سے پاک ہوتا ہے۔ نیز اس سے قطع نظر کہ اس کا فرمان خود انسان ہی کے مفاد میں ہوتا ہے اور خدا کی پاک ذات کو تو کوئی چیز بھی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ تو کیا پھر بھی ممکن ہے کہ کوئی عقلمند انسان اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اپنے مفادات اور مصالح کو پامال کر دے؟

ان سب باتوں سے ہٹ کر، ہم اسی کی ملکیت ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کا دیا ہوا ہے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ ہم اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات دکھائی دیتی ہیں جو اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

کوئی آیت کہتی ہے:

"انما کان قول المؤمنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون۔" (نور۔ ۵۱)

"انبیاء کے حقیقی پیروکار وہی لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول کا حکم سن کر کہتے ہیں، ہم نے سنا اور اطاعت کی۔"

"فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔"

(النساء/ ۶۵)

"تمہارے پروردگار کی قسم وہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ تجھے اپنے اختلافات میں حاکم اور فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔ اور پھر تیرے کیے ہوئے فیصلے سے ذرہ برابر بھی ناراضی کا اظہار نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کریں۔"

کبھی قرآن کہتا ہے:

"ومن احسن دینا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن۔" (النساء/ ۱۲۵)

"کس شخص کا دین اس شخص سے بہتر ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ پروردگار کے سامنے جھک گیا، جبکہ وہ نیکو کار بھی ہے۔"

اصولی طور پر اسلام تسلیم کے مادہ سے لیا گیا ہے اور وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ اس بناء پر ہر شخص جس قدر حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اسی قدر روحِ اسلام سے بہرہ مند ہے۔

اس سلسلے میں لوگوں کی کئی قسمیں ہیں:

ایک گروہ صرف ان امور میں فرمانِ حق تعالیٰ کے سامنے جھکتا ہے، جن میں اس کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ مشرک ہوتے ہیں جنہوں نے اپنا نام "مسلم" رکھا ہُوا ہوتا ہے۔ ان کا کام "نؤمن ببعض ونکفر ببعض" کے مصداق احکامِ الٰہی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ ایمان بھی لاتے ہیں تو حقیقت میں اپنے مفاد کے لیے ایمان لاتے ہیں نہ کہ حکمِ خدا پر۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جن کا ارادہ اور خواہش خدا کے ارادے اور خواہش کے تابع ہوتی ہے۔

جس وقت ان کے مفادات فرمانِ حق سے متصادم دکھائی دیتے ہیں تو وہ اپنے مفادات سے دستکش ہو کر فرمانِ خدا کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ یہی سچے مؤمن اور پکے مُسلمان ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ مذکورہ دونوں گروہوں سے برتر اور افضل ہوتا ہے، یہ لوگ اصولی طور پر وہی کچھ چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے اور وہی ارادہ کرتے ہیں جو خدا کرتا ہے۔ یہی ان کی تمنا اور منتہائے مقصود ہوتا ہے، وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ صرف اسی چیز کو پسند کرتے ہیں جسے خدا پسند کرتا ہے اور اس چیز سے نفرت کرتے ہیں، جس سے خدا نفرت کرتا ہے۔

یہی لوگ اس کی بارگاہ کے خواص، مخلصین اور مقربین ہوتے ہیں۔ جن کا سارے کا سارا وجود رنگ توحید میں رنگا ہوتا ہے، اس کی محبت میں غرق اور اس کے جمال میں محو ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] اس سلسلہ میں ایک اور بحث بھی جلد ۲ میں سورہ نساء کی آیہ ۶۵ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

۳۹۔ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا ○

ترجمہ

۳۹۔ (گذشتہ پیغمبر کہ) جو خدائی پیغامات کی تبلیغ کرتے تھے اور (صرف) اسی سے ڈرتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے اور یہی کافی ہے کہ خدا حساب لینے والا (اور ان کے اعمال کا اجر دینے والا) ہے۔

تفسیر

سچّے مبلّغ کون ہیں؟

پہلی زیرِ بحث آیت میں اس گفتگو کی مناسبت سے جو گذشتہ آیات میں سے آخری آیت میں پیغمبروں کے بارے میں گزری تھی، انبیاء کے عمومی فرائض میں سے ایک اہم ترین فرض کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرمایا گیا ہے۔ "وہ (گذشتہ انبیاءؑ) ایسے لوگ تھے جو خدائی پیغامات کی تبلیغ کرتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور خدا کے علاوہ کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے"۔ (الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدًا الا اللہ)۔

آپؐ کو بھی پروردگار کے پیغاموں کی تبلیغ کے سلسلے میں کسی سے ذرہ بھر بھی نہیں گھبرانا چاہیئے، خدا آپؐ کو حکم دیتا ہے، کہ ایک جاہلانہ رسم کو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کر کے توڑیں اور زید کی مطلقہ بیوی زینب کے ساتھ شادی کرلیں اور اس فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کریں، کیونکہ نہ گھبرانا پیغمبروں کی سنت ہے۔

اصولی طور پر پیغمبروں کا کام بہت سے مراحل میں اس قسم کی رسومات کو توڑنا ہے۔ اگر وہ تھوڑے سے بھی خوف اور وحشت کا مظاہرہ کریں گے تو یقیناً اپنے فرائض کی بجا آوری میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ انھیں فیصلہ کن انداز میں آگے بڑھنا چاہیئے اور بدزبان لوگوں کی نازیبا باتوں کو برداشت کرنا چاہیئے، لوگوں کی افواہوں اور شور و غوغا کرنے والے کینہ فطرت اور مفسد لوگوں کی سازشوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہیئے۔ سب حساب و کتاب خدا کے پاس ہے، اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا

گیا ہے" یہی کافی ہے کہ خدا خود بندوں کے اعمال کا محافظ، محاسب اور ان کا جزا دینے والا ہے" (وکفی باللہ حسـ[illegible]

اس راہ میں انبیاء کے ایثار و قربانی کے حساب کی بھی حفاظت کرتا ہے، اس کا اجر بھی دیتا ہے اور دشمن کی نازیبا گفـ[illegible] یا وہ سرائی کا محاسبہ کرکے انھیں کیفر کردار تک پہنچاتا ہے۔

حقیقت میں "کفٰی باللہ حسیبًا" کا جملہ اس امر کی دلیل ہے کہ خدائی رہبروں کو اپنے دین کی تبلیغ میں پریشا[illegible] میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کی زحمتوں، تکلیفوں اور مشقتوں کا حساب کرنے اور جزا دینے والا خود خدا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "تبلیغ" سے مراد: اس سے مراد ابلاغ اور پہنچانا ہے اور جب تبلیغ "رسالات اللہ" سے ربط پیدا کر[illegible] کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے وحی کے ذریعے سے پیغمبروں کو تعلیم دی ہے وہی وہ لو[illegible] کو تعلیم دیں اور اُسے استدلال، انذار، بشارت اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کریں۔

۲۔ "خشیت" کا معنٰی: اس کا معنی ایسا خوف ہے جو تعظیم اور احترام کے ساتھ ہو۔ اس بنا پر اس کا خوف کا معنی الگ ہوگا جس[illegible] میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو اور کبھی کبھار یہ لفظ مطلق خوف کے معنی میں بھی آتا ہے۔

محقق طوسیؒ کی بعض تالیفات میں ان دو الفاظ کے فرق کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو در حقیقت اس کے عرفانی معنی کی غماز[illegible] نہ کہ اس کے لغوی معنی کی۔ وہ کہتے ہیں "خشیت اور خوف" اگرچہ لغت میں ایک ہی معنی (یا تقریبًا ایک معنی) میں ہیں۔ لیکن صاحب دل افر[illegible] کے نزدیک ان دونوں کے درمیان فرق ہے اور وہ یہ کہ "خوف" اس مجازات اور سزا سے باطنی قلق اور پریشانی کے معنی میں ہے[illegible] انسان گناہ کے ارتکاب یا اطاعت میں کوتاہی کی وجہ سے جس کی توقع رکھتا ہے اور یہ کیفیت اکثر لوگوں کی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے مراتب بہت مختلف ہیں اور اس کا اعلٰی مرتبہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

لیکن "خشیت" ایک ایسی کیفیت ہے جو خدا کی عظمت اور اس کی ہیبت کے ادراک اور اس کے فیض کے انوار سے دور[illegible] محروم رہنے کے خوف سے کسی انسان پر طاری ہو جاتی ہے اور یہ ایسی حالت ہے جو سوائے ان لوگوں کے جو ذات پاک کی عظمت اور اس کے مقام کبریائی سے واقف ہیں اور انھوں نے اس کے قرب کی لذت چکھی ہوئی ہو، کسی اور کو حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن نے اس حالت کو عالم اور آگاہ بندوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور کہا ہے:

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"

"اللہ سے خشیت کرنے والے بس علماء ہی ہیں۔" [1]

۳۔ ایک سوال کا جواب: ہوسکتا ہے، کہا جائے کہ یہ آیت اس گذشتہ جملے کی متضاد ہے جو گذشتہ آیات میں بیان ہوچکا ہے، کیونکہ یہاں ہے کہ خدا کے انبیاء صرف خدا ہی سے ڈرتے ہیں کسی اور

---

[1] مجمع البحرین مادہ "خشیت"۔

[illegible]سے نہیں ڈرتے جبکہ گذشتہ آیات میں ہے کہ تم اپنے دل میں ایسی چیز چھپائے ہوئے تھے جسے خدا نے آشکار کردیا۔ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ تمھیں خدا سے ڈرنا چاہیے "وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ"

لیکن دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے۔

پہلا یہ کہ اگر جناب پیغمبرؐ کو کسی قسم کا خوف تھا تو وہ صرف اس بنا پر کہ مبادا اس رسم کو توڑنا بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے ایمان میں مبانی اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جائیں۔ درحقیقت اس قسم کی خشیت کی بازگشت خوفِ خدا کی طرف ہوتی ہے۔

دوسرا یہ کہ انبیاء کرام خدائی پیغام کی تبلیغ میں ہرگز خوف اور دہشت کا شکار نہیں ہوتے لیکن اپنے ذاتی اور مخصوص مسائل میں ایسے خطرناک حالات سے دوچار ہونے کے وقت خوف و اضطراب کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، جیسے لوگوں کی زبانوں کے زخم یا حضرت موسٰی علیہ السلام کی طرح عصا کے اژدہا بن جانے کے بعد اضطراب کا اظہار، کیونکہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے پیشِ نظر خوف اور وحشت کا اظہار اگر درجہ افراط کو نہ پہنچے تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے، شجاع ترین افراد بھی اپنی زندگی میں اس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ معیوب خوف تو وہ ہوتا ہے جو اجتماعی زندگی میں خدائی فریضہ کی انجام دہی اور ذمہ داریوں کے نبھانے کے وقت پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ کیا انبیاء بھی تقیہ کرتے ہیں؟ کچھ لوگوں نے زیر بحث آیت سے یہ سمجھا ہے کہ انبیاء کے لیے تبلیغِ رسالت کے فریضے میں تقیہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے" ولا یخشون احدًا الا اللہ"

لیکن توجہ رکھنا چاہیئے کہ "تقیہ" کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم کا نام "تقیہ خوفی" ہے جس کی مذکورہ بالا آیت میں انبیاءؑ کی دعوت اور ابلاغ رسالت کے سلسلے میں نفی کی گئی ہے۔ لیکن تقیہ کی کچھ اور اقسام بھی ہیں جن میں سے ایک "تقیہ تحبیبی" اور "پوشیشی" ہے اور "تقیہ تحبیبی" سے مراد یہ ہے کہ انسان کبھی فریقِ مخالف کا دل جیتنے کے لیے اپنے عقیدے کو چھپاتا ہے تاکہ اسے فکری و نظری طور پر اپنا ہم نوا بنا سکے۔

اور "تقیہ پوشیشی" سے مراد یہ ہے کہ کبھی ہدف اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے منصوبوں اور ان کے مقدمات کو چھپایا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ عام ہو جائیں اور دشمن ان سے آگاہ ہوجائیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ منصوبے ناکام ہو جائیں۔

انبیاء کرامؑ خصوصًا پیغمبر اسلامؐ کی زندگی تقیہ کی اس قسم سے بھری پڑی ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ بہت سے مواقع پر جب آپؐ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتے تو اپنے مقصد کو مخفی رکھتے، جنگ کے تمام منصوبے مکمل طور پر معرضِ خفا میں رہتے اور استتار کا انداز یعنی مقصد کو چھپائے رکھنا جو تقیہ کی ایک قسم ہے، تمام مراحل میں نافذ ہوتا۔

بعض اوقات کسی حکم کے بیان کرنے میں ایک مرحلہ وار روش سے بھی استفادہ کرتے جو تقیہ کی ایک قسم ہے، مثلاً "تحریم ربا" (سود کی حرمت) اور "شرب خمر" (شراب پینے) کا مسئلہ ہے تو یہ ایک ہی مرحلہ میں بیان نہیں ہوئے، بلکہ فرمان الٰہی سے کئی مراحل میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ یعنی زیادہ ہلکے مرحلے سے شروع ہوکر اپنے آخری اور اصلی حکم تک جا پہنچے۔

بہر حال تقیہ کا ایک بہت ہی وسیع معنی ہے یعنی "مقصد کے حصول کو خطرے میں پڑنے سے بچانے کے لیے حقیقت چھپانا" اور یہ ایسی چیز ہے، جسے تمام عقلائے عالم نے اپنایا ہوا ہے اور خدائی رہبر اپنے مقدس مشن کو کامیاب کرنے کے لیے مراحل پر اپناتے ہیں۔ جبکہ توحید کے ہیرو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں ہے کہ جس دن بت پرست لوگ عید کے مراسم کی ادائیگی کے لیے شہر سے باہر جا رہے تھے تو آپ نے اپنے مقصد کو مخفی رکھا تاکہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بتوں کو پاش پاش کر دیں

نیز "مومن آلِ فرعون" نے حساس مواقع پر حضرت موسیٰ کی مدد کرنے اور انھیں قتل ہونے سے بچانے کے لیے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا جس کی وجہ سے قرآن نے انھیں عظمت کے ساتھ یاد کیا ہے۔

بہر حال صرف "خوف والا تقیہ" ہی پیغمبروں کے لیے جائز نہیں نہ کہ تقیہ کی دوسری اقسام بھی۔

اگرچہ اس سلسلے میں بہت سے سخن ہائے گفتنی ہیں لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک جامع فرمان کے ساتھ اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"التقیة دینی ودین ابائی، ولا دین لمن لا تقیة له والتقیة ترس الله فی الارض،
لان مؤمن ال فرعون لو اظهر الاسلام لقتل"

"تقیہ میرا اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ جو شخص تقیہ نہیں کرتا اس کا دین نہیں ہے، تقیہ خدا کی مضبوط ڈھال ہے کیونکہ اگر مومن آلِ فرعون اپنے ایمان کو ظاہر کرتے تو یقیناً قتل ہو جاتے (خطرہ کی صورت میں دینِ موسیٰ کی حفاظت کے سلسلے میں پیغامِ حق کا فریضہ انجام نہ پا سکتا)۔"[1]

تقیہ کے بارے میں ہم تفصیلی بحث جلد نمبر ۶ میں سورہ نحل کی آیت نمبر ۱۰۶ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

۵۔ تبلیغی امور میں کامیابی کی شرط:

اوپر والی آیت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ تبلیغی مسائل میں ترقی کے لیے بنیادی شرط قاطعیت، خلوص اور خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرنا ہے۔

جو لوگ خدائی امور کے مقابلہ میں ہر کہ ومہ کی خواہشات اور مختلف گروہوں کے بے بنیاد رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اپنی ناشائستہ تاویلوں کے ذریعے حق و عدالت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ کبھی بنیادی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ کوئی نعمت ہدایت کی نعمت سے بڑھ کر نہیں ہے اور کوئی خدمت اس نعمت کو کسی انسان کو دینے سے افضل نہیں ہے۔ اسی بناء پر اس کا اجر و ثواب سب سے برتر ہے ـــــ ہم ایک حدیث میں امیر المومنین سے پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ:

"جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا، جب تک کسی کو حق کی دعوت نہ دے دیں، اس وقت تک جنگ نہ کرنا۔"

"وایم الله لئن یهدی الله علی یدیك رجلاً خیر مما طلعت الشمس وغربت"

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۵۲۱ سورۂ مومن کی آیت ۲۰ کے ذیل میں۔

"یعنی خدا کی قسم اگر تمہارے ہاتھوں ایک شخص کو ہدایت مل جائے تو یہ تمہارے لیے ان تمام چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے جن پر سورج طلوع و غروب کرتا ہے۔"[1]

اس لیے ضروری ہے کہ سچے مبلغین لوگوں سے بے نیاز اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دار سے بے خوف ہو کر اپنا فریضۂ تبلیغ انجام دیں۔ کیونکہ "نیاز" اور "خوف" ہی ان کے افکار وارادہ پر ہر حالت میں اثر انداز ہوں گے۔

ایک مبلغ ربانی "وکفیٰ باللہ حسیبا" کے تقاضوں کے پیشِ نظر صرف یہ سوچتا ہے کہ اس کے اعمال کا حساب لینے والا صرف خدا ہے۔ اور یہی عرفان و آگاہی اسے اس نشیب و فراز والے راستے میں مدد دیتی ہے۔

[1] کافی (منقول از بحار الانوار جلد ۲۱ صفحہ ۳۶۱)

۴۰۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٤٠﴾

ترجمہ

۴۰۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم (وآخری پیغمبر) ہیں۔ اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

ختم نبوّت:

یہ آیت اس سلسلہ کی گفتگو کی آخری کڑی ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لیے خدا نے زید کی مطلقہ بیوی سے پیغمبر اکرمؐ کے عقد کے بارے میں بیان فرمائی ہے اور آخری جواب کے طور پر ایک مختصر لیکن جچا تلا جواب دیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر ایک اور اہم حقیقت کو ایک خاص مناسبت کی بناء پر ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے "ختم نبوّتؐ کا مسئلہ"۔

پہلے فرمایا گیا ہے ۔"محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں"۔ (ما کان محمد ابا احد من رجالکم)۔

نہ زید کے اور نہ کسی اور کے۔ اگر کسی دن لوگوں نے اسے محمدؐ کے بیٹے کا نام دیا ہے تو یہ صرف ایک عادت اور دنیادی رسم ورواج کے مطابق تھا، جسے اسلام کے آنے اور قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد ختم کر دیا گیا ہے، یہ فطری اور قرابت داری کا رابطہ نہیں ہے۔

البتہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی بیٹے بھی تھے، جن کا نام "قاسم" "طیب" "طاہر" اور "ابراہیم" تھا۔ لیکن مؤرخین کے مطابق وہ سب بالغ ہونے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسے۔ لہٰذا "رجال" (مردوں) کا نام ان پر صادق نہیں آتا[1]

[1] تفسیر قرطبی، و تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو بھی فرزند رسولؐ کہہ کر پکارا جاتا تھا، اگرچہ وہ بالغ بھی ہو گئے تھے۔ لیکن اس آیت کے نزول کے وقت ابھی بچے تھے، اسی بناء پر "ماکان محمد ابا احد من رجالکم" کا جملہ فعل ماضی میں آیا ہے اور قطعی طور پر اس وقت سب کے حق میں صادق آتا ہے۔

اور اگر بعض تعبیرات میں خود پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

"انا وعلی ابوا ھذہ الامۃ"

میں اور علی اس امت کے باپ ہیں۔

تو یقیناً اس سے مراد نسبی باپ نہیں، بلکہ یہ رشتہ تعلیم و تربیت اور رہبری کی بنیاد پر ہے۔

ان حالات میں زید کی مطلقہ بیوی سے شادی جس کا فلسفہ قرآن نے صراحت کے ساتھ غلط رسوم کو توڑنا بیان فرمایا ہے، کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے موضوع بحث بنا کر ہر کوئی اس کے خلاف لب کشائی کرے یا اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے کوئی دستاویز بنالے۔

آگے چل کر مزید فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر کا رابطہ تمھارے ساتھ صرف رسالت اور خاتمیت کی بناء پر ہے کیونکہ "وہ خدا کے رسول اور خاتم النبیین ہیں"۔ (ولٰکن رسول اللہ وخاتم النبیین)۔

اسی بناء پر آیت کی ابتدا کلی طور پر نسبی رابطے کو منقطع کرتی ہے اور اس کی انتہا اس معنوی رابطے کو ثابت کرتی ہے جو رسالت اور خاتمیت سے پیدا ہوتا ہے اور یہاں سے ہی آیت کے آغاز اور اختتام کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے ہٹ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ باوجودیکہ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لیکن ان کا تعلق باپ کے بیٹے کے ساتھ تعلق سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ آپ کا تعلق ایک رسول کی حیثیت سے ہے جو امت کے ساتھ ہوتا ہے اور رسول بھی ایسا جو جانتا ہے کہ پھر کوئی پیغمبر نہیں آنے گا۔ لہٰذا قیامت تک کی جو ضرورتیں اُمت کو درپیش آسکتی ہیں، اچھی طرح سے اور انتہائی دل سوزی کے ساتھ انھیں پورا کرنا ہے۔

البتہ عالم اور آگاہ خدا نے بھی وہ تمام چیزیں جو اس سلسلے میں ضروری تھیں، آپ کے اختیار میں دے دیں، خواہ وہ اصولی ہوں، یا فروعی، کلی ہوں یا جزئی۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔ "خدا ہر چیز سے عالم اور آگاہ تھا اور ہے"۔ (وکان اللہ بکل شیء علیما)۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "خاتم الانبیاء" کا معنی "خاتم المرسلین" بھی ہے۔ موجودہ دور کے نیا دین گھڑنے والے افراد، مسئلہ ختم نبوّت کو مخدوش کرنے کے لیے یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ قرآن نے سرکار رسالت مآبؐ کو "خاتم الانبیاءؐ" کہا ہے "خاتم المرسلین" نہیں کہا، حالانکہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کیونکہ رسالت کا درجہ نبوّت کے درجہ سے بالاتر ہے۔ (غور کیجیے گا)

ٹھیک اسی طرح جیسے ہم کہیں کہ فلاں شخص سرزمین حجاز میں نہیں ہے تو یقیناً وہ مکہ میں بھی نہیں ہو گا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ وہ مکہ میں نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ حجاز کے کسی اور علاقہ میں ہو۔ اسی بناء پر اگر حضور گرامی کو "خاتم المرسلین" کا نام دیا جاتا تو تصور میں آسکتا تھا کہ شاید وہ خاتم الانبیاء نہ ہوں، لیکن جب فرمایا گیا ہے کہ وہ "خاتم الانبیاء ہیں تو یقیناً خاتم المرسلین بھی ہیں۔ اور منطقی اصطلاح کے لحاظ سے "رسول" اور "نبی" کے درمیان "عام خاص مطلق" کی نسبت ہے۔

(ایک بار پھر غور کیجیے گا)

چند اہم نکات

۱۔ "خاتم" کیا ہے؟

"خاتم" (بروزن حاتم) ارباب لغت کی تصریحات کے مطابق اس چیز کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ کسی چیز کو ختم کیا جائے یا جس سے کاغذات وغیرہ کی مہر لگائی جائے۔

قدیم زمانے سے یہ معمول چلا آرہا ہے کہ جس وقت کسی خط یا برتن یا گھر کے دروازہ کو بند کیا جاتا ہے تاکہ کوئی اسے کھول نہ سکے تو دروازے یا قفل (یا تالے) کے اُوپر گوند جیسا مادہ رکھ کر اس پر مہر لگا دیتے ہیں، جسے موجودہ زمانے میں "لاکھ اور مہر" کہتے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ اس کے کھولنے کے لیے یقیناً لاکھ اور مہر کو توڑا جائے۔ اور جو مہر اس قسم کی چیزوں پر لگائی جاتی ہے اسے "خاتم" کہتے ہیں۔ چونکہ گذشتہ زمانے میں اس مقصد کے لیے کبھی کبھی سخت اور چکنی مٹی سے استفادہ ہوتا تھا لہٰذا لغت کی مشہور کتب میں "خاتم" کے معنی میں لکھا گیا ہے کہ "مایوضع علی الطینۃ" یعنی جو چیز مٹی پر لگائی جائے [1]

یہ سب کچھ اس بناء پر ہے کہ یہ لفظ "ختم" کی اصل سے "اختتام" کے معنی میں لیا گیا ہے اور چونکہ مہر لگانے کا کام خاتمے اور آخر پر قرار پاتا ہے لہٰذا "خاتم" کا نام اس وسیلے اور ذریعے کو دیا گیا ہے۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ "خاتم" کا ایک معنی انگوٹھی ہے تو وہ بھی اسی بناء پر ہے کہ بہت سے لوگ اپنی مہر کے نقوش اپنی انگوٹھیوں پر کندہ کرتے تھے اور انگوٹھی کے ذریعہ ہی خطوط وغیرہ پر مہر لگا دیتے تھے۔ اسی لیے پیغمبر اسلام، آئمہ ہدیٰ اور دوسری شخصیتوں کے حالات کے ضمن میں ان کی انگوٹھی کے نقش کی گفتگو بھی ہوتی ہے۔ مرحوم کلینی نے کتاب "کافی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے:

"ان خاتم رسول اللہ کان من فضۃ نقشہ محمد رسول اللہ"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی تھی جس کا نقش "محمد رسول اللہ" تھا۔ [2]

بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ چھٹی ہجری کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیے نقش والی انگوٹھی بنوائی اور یہ اس لیے تھا کہ آپ سے صحابہؓ نے عرض کیا کہ بادشاہ ایسے خطوط کو نہیں پڑھتے جو مہر کے بغیر ہوتے ہیں۔ [3]

کتاب "طبقات" میں بھی آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو وسعت دینے اور روئے زمین کے سلاطین کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ آپ کے لیے انگوٹھی تیار کی جائے جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ ہو۔ چنانچہ آپ اپنے خطوط پر اسی سے مہر لگاتے تھے۔ [4]

---

[1] لسان العرب اور قاموس اللغۃ مادہ "ختم" (الخاتم ما یوضع علی الطینۃ) "خاتم" وہ چیز ہوتی ہے جو گیلی مٹی پر لگائی جاتی ہے۔

[2] اس روایت کو بیہقی نے بھی سنن کی جلد ۱۰ ص ۱۲۸ میں نقل کیا ہے۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۳۸۶۔

[4] طبقات کبرٰی جلد ۱ ص ۲۵۸۔

اس بیان سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ خاتم کا موجودہ زمانے میں اگرچہ زینت اور زیور کے طور پر انگوٹھی پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کی اصل "ختم" سے لی گئی ہے جو "انتہا" کے معنی میں ہے اور اس زمانے میں ان انگوٹھیوں کو کہا جاتا تھا جن سے خطوط پر مہر لگاتے تھے۔

علاوہ ازیں یہ مادہ قرآن مجید میں بھی متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ ختم کرنے اور مہر لگانے کے معنی میں ہے۔ مثلاً:

"الیوم نختم علٰی افواھھم وتکلمنا ایدیھم" (یٰس / ۶۵)

آج (قیامت کے دن) ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گفتگو کریں گے۔"

یا

"ختم اللہ علٰی قلوبھم وعلٰی سمعھم وعلٰی ابصارھم غشاوۃ"

"خدا نے ان (منافقین) کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (اس لحاظ سے کوئی نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی) اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ (البقرہ / ۷)

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت اور آپ پر سلسلۂ انبیاءؑ ختم ہونے کے بارے میں زیر بحث آیت کی دلالت میں وسوسہ ڈالا ہے یا تو بالکل اس لفظ کے معنی سے بے خبر تھے یا پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ورنہ جو شخص عربی ادب سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ لفظ "خاتم النّبیین" واضح طور پر ختم نبوت پر دلالت کرتا ہے۔

اس صورت میں اگر اس تفسیر کے علاوہ آیت کی کوئی تفسیر کی جائے تو سبک، ہلکا اور بیگانہ مفہوم پیدا کرے گی۔ مثلاً اگر یہ کہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے انبیاء کی انگوٹھی تھے، یعنی پیغمبروں کی زینت شمار ہوتے تھے تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ انگوٹھی انسان کا ایک عام زینتی زیور ہوتی ہے جو کبھی بھی انسان کے برابر اور ہم پلہ قرار نہیں پا سکتی۔ لہٰذا اگر آیت کی یہ تفسیر کریں گے تو پیغمبر اسلام کو ان کے مقام و مرتبہ سے بہت گرا دیں گے۔ اس کے علاوہ یہ معنی لغت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لیے تو یہ لفظ پورے قرآن میں آٹھ مقام پر جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے، ہر جگہ "ختم کرنے" اور "مہر لگانے" کے معنی میں آیا ہے۔

۲۔ ختم نبوّت کے دلائل:

مندرجہ بالا آیت اگرچہ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کی دلیل اسی پر منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی دوسری آیات بھی اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور روایات بکثرت سے موجود ہیں۔ منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیت ۱۹ میں ہم پڑھتے ہیں:

"واوحی الیّ ھٰذا القراٰن لانذرکم بہ ومن بلغ"

"یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ تمہیں اور ان دوسرے لوگوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے میں ڈراؤں" (اور خدا کی طرف دعوت دوں)۔

"ومن بلغ" (تمام وہ لوگ جن تک یہ بات پہنچے) کی تعبیر کے مفہوم کی وسعت ایک طرف تو قرآن مجید اور پیغمبر اسلامؐ کی عالمی رسالت کو واضح کرتی ہے اور دوسری طرف ختم نبوت کو۔

دوسری آیات جو پیغمبر گرامی قدر کی عالمین کے لیے عمومی دعوت کو ثابت کرتی ہیں مثلاً:

"تبارك الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیرًا"

"جاوید اور بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ تمام اہلِ عالم کو ڈرائے۔"

(فرقان / ۱)

اور مثلاً

"وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرًا و نذيرًا" (سبا / ۲۸)

"ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر (تاکہ لوگوں کو جنت کی خوش خبری دیں اور جہنم سے ڈرائیں)

اور ارشاد الٰہی ہے:

"قل یا ایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعًا"

"اے پیغمبرؐ! کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں"۔ (اعراف / ۱۵۸)

"عالمین" "ناس" اور "کافۃ" کے مفہوم کی وسعت بھی اس معنی کی مؤید ہے، اس سے قطع نظر کہ ایک تو اس پر علماء اسلام کا اجماع ہے، دوسرے یہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں سے ہے اور تیسرے پیغمبرِ اسلام اور دیگر پیشواؤں سے کثرت سے روایات ملتی ہیں جو اس مطلب کو بہت واضح کرتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم ذیل کی چند روایات کو ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم پیغمبر اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث میں پڑھتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے:

"حلالی حلال الی یوم القیامة وحرامی حرام الی یوم القیامة"

"میرا حلال قیامت تک حلال ہے اور میرا حرام قیامت کے دن تک حرام ہے"۔[۱]

یہ تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے شریعت محمدیؐ بھی قائم و برقرار ہے۔

بعض مقامات پر مذکورہ بالا حدیث یوں بھی نقل ہوئی ہے:

"حلال محمد حلال ابدًا الی یوم القیامة وحرامه حرام ابدًا الی یوم القیامة لایکون غیرہ ولا یجیٔ غیرہ"

"حلالِ محمدؐ ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک حلال ہے اور آپؐ کا حرام کیا ہوا، ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک حرام ہے۔ اس کے علاوہ نہ کچھ ہوگا اور نہ ہی کوئی آئے گا۔"[۲]

۲۔ مشہور حدیث "منزلت" جو اہلِ تشیع اور اہلِ سُنت کی مختلف کتابوں میں حضرت علیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس کے مطابق جب آنحضرتؐ جنگِ تبوک میں شرکت کے لیے تشریف لے جارہے تھے اور حضرت علیؑ کو مدینہ میں اپنی جگہ اپنا نائب بنایا تھا تو یہ حدیث مسئلہ خاتمیت کو بھی مکمل طور پر واضح کرتی ہے، کیونکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

---

[۱] بحار الانوار جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۶۰ باب ۳۱، حدیث ۱۷۔

[۲] اصول کافی جلد اول (باب البدع والرائی والمقائیس) حدیث ۱۹۔

"انت منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انه لا نبی بعدی"

"یا علی! تم میرے نزدیک وہی منزلت رکھتے ہو جو ہارون کو موسٰی سے تھی لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے (اسی بنا پر تمہارے پاس سوائے نبوت کے ہارون کے باقی تمام مناصب موجود ہیں)۔"[۱]

۳۔ یہ حدیث بھی مشہور ہے اور اہلِ سنت کے بہت سے منابع میں نقل ہوئی ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا:

"مثلی ومثل الانبیاء کمثل رجل بنی بنیانًا فاحسنه واجمله فجعل الناس یطیفون به یقولون ما رأینا بنیانًا احسن من هذا الا هذه اللبنة، فكنت انا تلك اللبنة"

"گزشتہ انبیاءؑ کے مقابلے میں میری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت ہی خوبصورت اور دلکش مکان تعمیر کرے، لوگ اس کے گرد چکر لگائیں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے اور میں وہی آخری اینٹ ہوں"

یہ حدیث صحیح مسلم میں مختلف عبارتوں اور متعدد راویوں سے نقل ہوئی ہے یہاں تک کہ ایک جگہ پر اس کے ذیل میں ایک جملہ یہ بھی آیا ہے:

"وانا خاتم النبیین۔"

"میں خاتم الانبیاء ہوں"۔

ایک اور حدیث کے ذیل میں یہ جملہ بھی آیا ہے:

"جئت فختمت الانبیاء"

"میں آیا اور انبیاءؑ ختم ہوگئے"۔[۲]

نیز یہ صحیح بخاری (کتاب المناقب) میں مسند احمد ابن حنبل، سنن ترمذی، سنن نسائی اور کئی دوسری کتب میں منقول ہے اور نہایت ہی مشہور و معروف احادیث میں سے ہے۔ اسے شیعہ مفسرین، مثلاً مرحوم طبرسی اور اہلِ سنت مفسرین جیسے مرحوم قرطبی نے اپنی تفاسیر میں زیرِ بحث آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

۴۔ نہج البلاغہ کے بہت سے خطبات میں بھی ختمِ نبوت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جن میں سے خطبہ نمبر ۱۷۳ ہے جس میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یوں تعریف و توصیف کی گئی ہے:

---

[۱] اس حدیث کو محب الدین طبریؒ نے ذخائر العقبیٰ ص ۶۳ (مطبوعہ مکتبۃ القدس) میں، ابن حجر نے صواعق محرقہ ص ۱۷۷ (مطبوعہ مکتبۃ القاہرہ) میں تاریخ بغداد جلد ۷، ص ۴۵۲ (مطبوعہ السعادۃ) میں اور دوسری کتب مثلاً کنز العمال، منتخب کنز العمال اور ینابیع المودۃ میں بھی نقل کیا ہے (حدیث منزلت کے سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۶ میں سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۴۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۲] صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۷۹۰ و ص ۱۷۹۱ (باب ذکر کونہ خاتم النبیین از کتاب الفضائل)۔

" امین وحیہ وخاتم رسلہ وبشیر رحمتہ ونذیر نقمتہ "

وہ (حضرت محمد مصطفیٰؐ) وحی خدا کے امین، پیغمبروں کے خاتم، رحمت کی بشارت دینے والے اور اس کے عذاب سے ڈرانے والے تھے۔

نیز خطبہ نمبر ۱۳۲ میں یوں فرمایا ہے:

" ارسلہ علی حین فترۃ من الرسل، وتنازع من الالسن، فقفی بہ الرسل و ختم بہ الوحی "

" خدا نے انھیں گذشتہ انبیاء کے دور فترت کے بعد بھیجا، ایسے وقت میں جب مختلف مذاہب کے درمیان نزاع اور جھگڑا پیدا ہو گیا تھا، پس اللہ نے آپ کے ذریعے نبوت کی تکمیل فرمائی اور آپ ہی کے ذریعے وحی کو ختم کیا۔"

اور نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں گزشتہ انبیاء و مرسلین کے لائحہ عمل کو ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

" الی ان بعث اللہ سبحانہ محمداً رسول اللہ لانجاز عدتہ و اتمام نبوتہ "

" یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ و سبحانہ نے اپنے رسول حضرت محمدؐ کو اپنے وعدوں کی تکمیل اور سلسلہ نبوت کو ختم کرنے کے لیے مبعوث فرمایا۔"

۵۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے آخری حج اور آخری سال میں ایک جامع وصیت نامہ کی صورت میں لوگوں سے جو خطبہ بیان فرمایا، اس میں بھی ختم نبوت کے مسئلے کو صراحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

" الا فلیبلغ شاھدکم غائبکم لانبی بعدی ولا امۃ بعدکم "

حاضرین غائبین تک یہ بات ضرور پہنچا دیں کہ نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ ہی تمہارے بعد کوئی اُمت۔

پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اس حد تک بلند کیے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور بارگاہ خدا میں عرض کیا:

" اللّٰھم اشھد انی قد بلغت "

" خدایا گواہ رہنا کہ مجھے جو کچھ کہنا چاہیئے تھا کہہ دیا ہے۔" [1]

۶۔ ایک اور حدیث میں جو کتاب کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، اس میں ہے:

" ان اللہ ختم بنبیکم النبیین فلا نبی بعدہ ابداً وختم

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۱ ص ۳۸۱۔

بکتابکم الکتب فلا کتاب بعدہ ابداً "

" خدا نے تمہارے پیغمبرؐ کے ذریعے سلسلۂ انبیاء کو ختم کر دیا ہے۔ اس بناء پر ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور تمہاری آسمانی کتاب کے ساتھ آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، لہٰذا اس کے بعد ہرگز کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔" [1]

اسلامی ماخذ میں اس سلسلے کی بہت زیادہ احادیث ہیں یہاں تک کہ کتاب " معالم النبوۃ " میں ۱۳۵ احادیث علماء اسلام کی کتب سے جمع کی گئی ہیں جو پیغمبر اور اسلام کے بزرگ پیشواؤں کی طرف سے اس سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں۔ [2]

۲۔ چند سوال اور ان کے جواب:

ختم نبوت کے سلسلے میں مختلف سوالات پیش آتے ہیں جن کا ہم ذیل میں جائزہ لیں گے۔

۱۔ ختم نبوت، ارتقاء سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟ پہلا سوال جو اس بحث میں سامنے آتا ہے کہ آیا ممکن ہے، انسانی معاشرہ متوقف ہو جائے اور کسی خاص منزل پر جا کر رک جائے؟ کیا انسانی تکامل اور ارتقاء کی کوئی حد و حساب بھی ہے یا نہیں؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ موجودہ زمانے کے انسان گزشتہ دور کے لوگوں سے علم و دانش اور تمدن و ثقافت کے اعتبار سے فائق ہیں؟

تو ان حالات میں کیونکر ممکن ہے کہ دفتر نبوت کلی طور پر بند کر دیا جائے اور انسان اپنے ارتقائی مراحل میں نئے پیغمبروں کی رہبری سے محروم کر دیا جائے؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کبھی انسان اپنے فکر و تمدن کے بلوغ کے اس مرحلہ تک پہنچ سکتا ہے کہ آخری نبی، جو جامع اصول اور تعلیمات اسے دے، ان کی روشنی میں اسے کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہے، بلکہ انہی اصولوں سے مسلسل استفادہ کرنے سے وہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔

بعینہ اس طرح جس طرح انسان تعلیم کے مختلف شعبوں میں نئے معلم اور مربی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ مختلف تعلیمی ادوار کو گزار سکے لیکن جب ڈاکٹریٹ کے مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اور کسی ایک علم یا چند علوم میں صاحب نظر مجتہد اور ماہر ہو جاتا ہے تو پھر اس منزل پر تعلیم جاری رکھنے کے لیے اسے نئے استاد کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس تعلیم کے بل بوتے پر اپنی تحقیقات میں لگا رہتا ہے جو سابقہ استادوں خاص کر آخری استاد کے پاس سے حاصل کی تھی۔ اس طرح سے وہ اپنے ارتقاء کے مراحل کو طے کرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں راستے کی مشکلات کو ان کلی اصولوں کے ذریعہ حل کرتا رہتا ہے جو اس نے آخری اُستاد سے حاصل کیے تھے۔

اس بنا پر یہ ضروری نہیں ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نت نیا دین آتا رہے (غور کیجئے گا)

بالفاظ دیگر گزشتہ انبیاء میں سے ہر ایک نے انسان کے ارتقاء کے لیے کچھ نقشے اسے بتائے ہیں تاکہ وہ اس نشیب و فراز والے رستوں میں پیش رفت کر سکے، حتیٰ کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور تک اس میں ایسی اہلیت اور لیاقت پیدا ہو گئی

---

[1] اصول کافی جلد اوّل۔

[2] "معالم النبوۃ" "نصوص خاتمیت"۔

کہ اس آخری پیغمبرؐ کے لیے خدا کی طرف سے ایک مکمل اور جامع ترین نقشہ مل گیا جس کے ذریعے وہ راستے کی مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک جامع اور مکمل نقشہ ہوتے ہوئے کسی دوسرے نقشے کی ضرورت نہیں رہتی ہے اور یہ حقیقتاً اس تعبیر کا بیان یا وضاحت ہے جو ختم نبوت کے بارے میں روایات آئی ہیں، جن میں آنحضرتؐ کو قصرِ رسالت کی آخری اینٹ یا اس آخری اینٹ کا رکھنے والا بتایا گیا ہے۔

یہ سب دلائل تو کسی نئے دین کی نفی کے سلسلے میں تھے، رہا رہبری اور امامت کا مسئلہ جو ان قوانین اور اصول کے نفاذ کی نگرانی اور راہ ہدایت کے لیے لوگوں کی دستگیری کا نام ہے تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس سے انسان کسی بھی وقت بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے سلسلۂ نبوت کے خاتمے سے سلسلۂ امامت ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ ان اصولوں کی تشریح اور وضاحت اور انہیں ظاہری وجود عطا کرنے کے لیے امامت کی بہر حال ضرورت ہے جس سے استفادہ خدا کے کسی معصوم پیشوا اور رہبر کے بغیر ناممکن ہے۔

۲۔ ثابت قانون اور بدلتی ضرورتیں

۲۔ ثابت قانون اور بدلتی ضرورتیں: پہلے سوال میں پیش ہونے والے نظریۂ ارتقاء سے قطع نظر یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک جانتا ہے کہ مختلف زمان اور مکان کے تقاضے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی ضروریات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، جبکہ خاتم الانبیاءؐ کی شریعت کے قوانین ثابت اور لازوال ہیں، تو کیا یہ قوانین ہر دور کے انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا بھی اچھی طرح جواب دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمام اسلامی قوانین جزوی حیثیت کے حامل ہوتے اور ہر موضوع کے لیے علیحدہ علیحدہ جزوی احکام معین کیے ہوتے پھر تو اس سوال کی گنجائش تھی، لیکن چونکہ اسلام میں کچھ ایسے احکام بھی ہیں جن کے اصول کلی اور نہایت ہی وسیع دائرہ کے حامل ہیں جو بدلتی ہوئی ضروریات اور ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لہٰذا اس قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مثلاً زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے درمیان قانونی رابطے بڑھ رہے ہیں اور ہر روز نئے نئے معاہدے وجود میں آ رہے ہیں جن کا قرآن کے نزول کے وقت بالکل وجود نہیں تھا، مثلاً اس زمانے میں "بیمہ" نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس کی آج ایک نہیں، بلکہ کئی قسمیں ہیں۔[1]

اسی طرح مختلف قسم کی کمپنیاں ہیں جو موجودہ دور میں ضروریاتِ زمانہ کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں ایک کُلی اصول موجود ہے جو سورۂ مائدہ کی ابتداء میں "معاہدوں پر عمل کرنا ضروری ہے" کی صورت میں موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] البتہ اسلام میں بیمہ سے ملتے جلتے کئی ایک موضوع موجود ہیں، جو ایک خاص حد میں محدود ہیں، جیسے "ضامن جریرہ" کا مسئلہ ہے (قتل خطائے محض کی دیت کا عاقلہ (خاص قسم کے رشتہ داروں) سے متعلق ہونا) لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ اس مسئلے سے صرف ملتا جلتا ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا اوفوا بالعقود"

"اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاہدوں پر عمل کرو۔"

یہ حکم ہر قسم کے باہمی معاہدوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ البتہ اس کلی اصول کے لیے اسلام نے کچھ کلی شرائط بھی مقرر کی ہیں جنہیں مدنظر رکھنا ہوگا۔

اس بناء پر اس سلسلے میں ایک ثابت اور پائیدار کلیہ موجود ہے۔ اگرچہ اس کے مصادیق بدلتے رہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ہر روز اس کا ایک نیا مصداق مل جائے۔

دوسری مثال اسلام میں "قانون لاضرر" کے نام سے ایک مُسلّم قانون موجود ہے اور اسلامی معاشرہ میں جو حکم بھی کسی کے لیے ضرر اور نقصان کا سبب بن رہا ہو، اس قانون کے ذریعے اس کا سدِباب کیا جا سکتا ہے اور اس طرح سے بہت سے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر "معاشرتی نظام کی حفاظت اور واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے" اور "اہم ترین کو اہم پر مقدم کیا جائے" یہ چند ایک مسائل ایسے ہیں جو بہت سے مشکل ترین مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ تمام وسیع اختیارات جو "ولایت فقیہ" کے ذریعے اسلامی حکومت کو حاصل ہیں، ان کے ذریعے اسلام کے کلی اصولوں کے اندر رہ کر ان مشکلات کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ان امور میں سے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کے لیے ایک لمبی تفصیل کی ضرورت ہے، خصوصاً جبکہ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (اجتہاد کا معنیٰ ہے اسلامی ماخذ سے اسلامی احکام کا استنباط) لیکن ہم یہاں اس تفصیل میں نہیں جاتے کیونکہ اس طرح سے ہم اپنے مقصد سے دُور ہٹ جائیں گے، لیکن پھر بھی ہم نے اشارہ کر دیا ہے جو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہو سکتا ہے۔

۳۔ غیبی فیض سے محرومی

۳۔ غیبی فیض سے محرومی: ایک اور سوال یہ ہے کہ وحی کا نزول ہو یا عالمِ غیب اور ماوراء طبیعت سے ارتباط، عالمِ بشریت کے لیے خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا احسان اور اعزاز ہے اور تمام سچے مومنین کے لیے امید کا دریچہ ہے۔

تو کیا اس ارتباط کا منقطع ہو جانا اور امید کے اس دریچے کا بند ہو جانا پیغمبر خاتمؐ کے بعد آنے والے انسانوں کے لیے ایک عظیم محرومی نہ ہوگی؟

اس سوال کا جواب بھی ذیل کے نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

اوّلاً وحی اور عالمِ غیب سے رابطہ درحقیقت حقائق کے ادراک کے لیے ہے اور جب سب کہنے کی باتیں کہی جا چکی ہوں اور روز قیامت تک کی ضروریات کے تمام کلی اور جامع اصول پیغمبرِ اسلام علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کی روشنی میں بیان ہو چکے ہوں تو پھر اس رابطہ کے منقطع ہو جانے سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔

ثانیاً: جو کچھ نبوت کے خاتمے کے بعد ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا ہے، وہ ہے "نئی شریعت کے لیے وحی" یا "سابق شریعت کی تکمیل" نہ کہ عالمِ طبیعت کے ماوراء ہر قسم کے رابطہ کا انقطاع، کیونکہ ائمہ علیہم السلام بھی عالمِ غیب سے رابطہ رکھتے ہیں اور وہ سچے مومنین بھی جو تہذیبِ نفس کے ذریعے اپنے دلوں سے حجابوں کو دور کر کے کشف و شہود کے مناصب پر فائز ہو چکے ہیں۔

مشہور فیلسوف صدر المتالہین شیرازی "مفاتیح الغیب" میں یوں رقم طراز ہیں:

"وحی" اس معنی کے لحاظ سے کہ فرشتہ ماموریت اور پیغمبری کے لیے کان اور دل پر نازل ہوتا ہے، تو یہ سلسلہ اگرچہ منقطع ہو چکا ہے اور کسی پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کے فرمان کے نفاذ پر مامور کرتا ہے کیونکہ "اکملت لکم دینکم" کے حکم کے مطابق جو کچھ اس راستے سے انسان تک پہنچنا چاہیئے تھا، وہ پہنچ چکا ہے، لیکن الہام و اشراق کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا کیونکہ اس دروازے کا بند ہونا ممکن بھی نہیں۔[1]

اصولی طور پر یہ رابطہ نفس کے ارتقاء، روح کی جلا اور باطن کے صفا کا نتیجہ ہوتا ہے' جو صرف نبوت اور رسالت کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی بلکہ جس وقت بھی اس کے مقدمات اور شرائط فراہم ہو جائیں، یہ معنوی رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور بنی نوع انسان اس فیض سے کبھی محروم تھی اور نہ ہی ہوگی۔ (غور کیجیئے گا)

[1] مفاتیح الغیب ص۱۳۔

۴۱۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ۝

۴۲۔ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا ۝

۴۳۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝

۴۴۔ تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۖۚ وَ اَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِیْمًا ۝

ترجمہ

۴۱۔ اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو! خدا کو بہت یاد کرو۔

۴۲۔ اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

۴۳۔ وہ وہی ہے جو تم پر درود اور رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی (تمھارے لیے رحمت کا تقاضا کرتے ہیں) تاکہ تمھیں (جہالت، شرک اور گناہ کی) تاریکیوں سے (ایمان، علم اور تقویٰ کے) نور کی طرف رہنمائی کرے، وہ مومنین پر بہت ہی مہربان ہے۔

۴۴۔ ان کا تحیہ، سلام ہے جس دن وہ اس سے ملاقات کریں گے اور خدا نے ان کے لیے نہایت ہی قیمتی جزا مقرر کر رکھی ہے۔

تفسیر

خدا اور فرشتوں کا درود :

گذشتہ آیات میں تبلیغِ رسالت کے سلسلہ میں پیغمبرِ اسلام کی سخت ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب مندرجہ بالا آیات میں اس تبلیغ کے دامن کو سارے معاشرے میں وسعت دینے کے لیے مومنین کی کچھ ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے اور ان سب کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔"اسے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا کرو" (یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا)۔

اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو۔ (وسبحوہ بکرۃ واصیلا)۔

چونکہ مادی زندگی میں ان کے لیے غفلت کے عوامل بہت زیادہ ہیں اور شیاطین کے وسوسوں کے تیر ہر طرف سے چل رہے ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے "ذکرِ کثیر" کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے" ذکرِ کثیر" اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے یہ ہے کہ پورے وجود کے ساتھ خدا کی طرف توجہ ہو، نہ کہ صرف زبانی۔

ایسا ذکرِ کثیر جو انسان کے تمام اعمال پر سایہ فگن ہو اور اس پر نور اور روشنی ڈال رہا ہو۔ اس طرح سے قرآن پاک تمام مومنین کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ ہر حالت میں یادِ خدا میں مصروف رہیں۔ عبادت کے وقت اسے حضورِ قلب اور خلوصِ دل سے یاد کریں، اگر گناہ کے مقامات پر پہنچیں تو اسے یاد کر کے گناہوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اگر لغزش ہو جائے تو توبہ کریں اور راہِ حق کی طرف پلٹ آئیں۔ نعمت کے وقت اسے یاد کریں، اس کے شکر گزار ہوں، بلا و مصیبت کے وقت اسے یاد کریں۔ صابر و شاکر رہیں

خلاصہ یہ کہ اس کی یاد کو کبھی دل سے نہ بھلائیں جو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح اور الٰہی طرزِ عمل کا سبب ہے۔

ایک حدیث جسے صحیح ترمذی اور مسندِ احمد بن حنبل میں ابو سعید خدری کی وساطت سے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے، یوں ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا،

" ای العباد افضل درجۃ عند اللہ یوم القیامۃ "؟

" قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کس بندے کا درجہ سب سے افضل اور سب سے برتر ہوگا؟"

تو آپ نے ارشاد فرمایا،

" الذاکرون اللہ کثیرا "

"جو لوگ خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں"

ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا،

"یارسول اللہ! ومن الغازی فی سبیل اللہ

"یارسول اللہ! کیا اس قسم کے لوگ راہ خدا میں جہاد کرنے والوں سے بھی بلند مقام کے مالک ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا،

" لو ضرب بسیفہ فی الکفار والمشرکین حتی ینکسر ویختضب دما لکان الذاکرون اللہ افضل درجۃ منہ "

" اگر اپنی تلوار سے کفار و مشرکین کے پیکر پر اس قدر ضربیں لگائیں کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تب بھی وہ لوگ جو خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں، ان سے افضل ہیں"[1]

کیونکہ خالص جہاد بھی خدا کے ذکرِ کثیر کے بغیر ناممکن ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکرِ کثیر ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اگر بعض روایات میں تسبیح حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا (۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ) اور مفسرین کے بعض اقوال میں ذکرِ کثیر سے مراد "صفاتِ علیا" اور "اسمائے حسنیٰ" اور پروردگار کو ان چیزوں سے پاک بیان کرنا جو اس کے لائق نہیں یا اس قسم کے دوسرے امور ہیں تو یہ سب ذکر کے واضح مصداق کا بیان ہیں، نہ کہ آیت کے مفہوم کو خصوصیت سے ان مصادیق میں سے کسی کے ساتھ محدود کر دیا جائے۔

جیسا کہ آیات کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے "ہر صبح و شام خدا کی تسبیح" سے مراد یہ ہے کہ تسبیح کو دن رات جاری رکھا جائے اور ان دو اوقات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا دراصل دن کے آغاز اور اختتام کے طور پر ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی تفسیر نماز صبح و عصر وغیرہ سے کی ہے تو وہ بھی اس کا ایک مصداق ہے۔

اس طرح سے" خدا کا ذکرِ کثیر اور ہر صبح و شام اس کی تسبیح" پروردگار کی طرف دائمی توجہ اور اسے ہر عیب و نقص سے مبرا جانے بغیر نہیں ہو سکتی۔ نیز ہم سب جانتے ہیں کی خدا کی یاد انسان کی رُوح کے لیے اسی قدر اہم ہے جس قدر جسم کے لیے پانی اور غذا۔ چنانچہ سورہ رعد کی آیت ۲۸ میں آیا ہے:

" الا بذکر اللہ تطمئن القلوب "

" آگاہ رہو کہ صرف خدا کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے"

دلوں کے سکون و اطمینان کا نتیجہ بھی وہی ہے جو سورۂ فجر کی آیات نمبر ۲۷ تا ۳۰ میں آیا ہے:

" یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی "

" اے نفس مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جا، جب کہ تو رب سے راضی ہے، وہ تجھ سے راضی ہے پھر میرے بندوں کے زمرے میں شامل ہو کر میری بہشت میں داخل ہو جا۔

بعد والی آیت درحقیقت ذکر اور دائمی تسبیح کا نتیجہ اور علتِ غائی ہے، خدا فرماتا ہے۔ وہ وہی تو ہے جو تم پر درود و رحمت

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۶ ص ۳۵۳ بحوالہ درّ منثور۔

بھیجتا ہے، اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لیے رحمت کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ تمہیں وہ جہالت، کفر اور شرک کی تاریکیوں سے ایمان و تقوٰی کے نور کی طرف رہنمائی کرے (ھوالذی یصلّی علیکم وملائکتہ لیخرجکم من الظلمات الی النور)۔

"کیونکہ وہ مومنین کی بابت رحیم و مہربان ہے" اور اسی بنا پر ان کی ہدایت اور رہبری اس نے اپنے ذمہ لے لی ہے اور اپنے فرشتوں کو بھی ان کی امداد پر مامور کیا ہے: (وکان بالمؤمنین رحیمًا)۔

"یصلّی" "صلاۃ" کے مادہ سے ہے، یہاں توجہ اور مخصوص عنایت کے معنی میں ہے۔ یہ عنایت خدا کے بارے میں تو نزولِ رحمت ہے اور فرشتوں کے بارے میں استغفار اور تقاضائے رحمت ہے۔ جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۷ میں ہے: ویستغفرون للذین اٰمنوا" یعنی حاملینِ عرش مومنین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔

بہرحال یہ آیت ان مومنین کے لیے بشارتِ عظیم اور بڑی نوید ہے جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہتے ہیں، کیونکہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سیر و سلوک میں تنہا نہیں ہیں بلکہ لفظ "یصلّی" فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کا متقاضی ہے کہ مومنین ہمیشہ خدا اور اس کے فرشتوں کی رحمت کے زیرِ سایہ رہتے ہیں اور رحمت کے اس سائے میں ظلمت کے پردے شق ہوتے ہیں اور علم و حکمت، ایمان اور تقوے کا نور ان کے قلب و روح پر ضو فشانی کرتا ہے۔

جی ہاں! سالکینِ راہِ حق کے لیے یہ آیت بہت بڑی بشارت ہے اور انھیں نوید دیتی ہے کہ محبوب کی طرف سے زبردست کشش موجود ہے تاکہ بے چارے عاشق کی کوشش کسی نہ کسی نتیجہ تک پہنچ جائے۔ وہ راہِ خدا میں قدم اٹھانے والے مجاہدین کے لیے ضمانت ہے، کیونکہ ایسے لوگوں کا شمار خالص اور مخلص افراد کے زمرے میں ہوتا ہے جنہیں گمراہ کرنے سے شیطان نے پہلے دن ہی اپنے عجز و ناتوانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

"فبعزتك لا غوینھم اجمعین الّا عبادك منھم المخلصین"۔

"(خداوندا!) تیری عزت کی قسم سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ (ص / ۸۲-۸۳)

"وکان بالمؤمنین رحیما" کے جملے میں "کان" فعل ماضی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی طرف سے ہمیشہ مؤمنین پر ایک خاص رحمت رہتی ہے اور یہ اس بات کی ایک اور تاکید ہے جو آیت کے آغاز میں ہے۔ یہ خدا کی خاص رحمت ہی ہے کہ وہ مومنین کو اوہام، شہوات اور شیطانی وسوسوں کی تاریکیوں سے نکال کر یقین و اطمینان کے نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے کیونکہ اگر اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو تو خطرناک اور پیچیدہ راستہ کبھی طے نہ ہو سکے۔

موجودہ سلسلے کی آخری آیت میں مومنین کے مقام اور ان کی جزاء کی عمدہ اور مختصر عبارت میں تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدائی فرشتوں کا تحیہ ان کے لیے جس دن (قیامت) وہ اس سے ملاقات کریں گے، "سلام ہے"۔ (تحیتھم یوم یلقونہ سلام)۔

"تحیت" مادہ "حیات" سے "سلامتی" اور "ایک اور زندگی" کے لیے دعا کرنے کے معنی میں ہے (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ صـ۵۳۲ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں)۔

یہ ایسا سلام ہے جو عذاب اور ہر قسم کے درد و رنج اور پریشانی سے محفوظ ہے اور سکون و اطمینان سے ملا ہوا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "تحیتھم" مومنین کو آپس میں درود و سلام پیش کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن اگر گذشتہ آیات کو دیکھیں جن میں خدا اور ملائکہ کی اس جہان میں صلوٰۃ اور رحمت کی گفتگو تھی تو اس کا ظاہر یہ بتایا ہے کہ "یہ تحیہ" بھی اس کے فرشتوں کی جانب سے آخرت میں ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ رعد کی آیت ۲۳-۲۴ میں ہے۔

"والملائکة یدخلون علیھم من کلّ باب سلام علیکم بما صبرتم"۔

"اس دن فرشتے مومنین پر ہر دروازے سے وارد ہوں گے اور ان سے کہیں گے، تمہارے صبر کی وجہ سے تم پر سلام ہو"

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ "یوم یلقونہ" سے مراد قیامت کا دن ہے جسے "لقاء اللہ" کے دن کا نام دیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ تعبیر قرآنی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

اس تحیہ کے بعد جو در حقیقت آغاز کار سے مربوط ہے اس کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "خدا نے ان کے لیے بڑا قیمتی اجر فراہم کر رکھا ہے"۔ (واعدلھم اجرًا کریمًا)۔

یہ ایک ایسا جملہ ہے جس میں اختصار کے باوجود تمام چیزیں جمع ہیں اور خدا کی تمام نعمتیں اور ہر قسم کی بخششیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ ہر حال میں خدا کی یاد: جس وقت خدا کا نام لیا جاتا ہے، عظمت، قدرت، علم اور حکمت کی ایک دنیا کے دل میں روشن ہوتی ہے کیونکہ وہ اسماءِ حسنٰی اور اعلیٰ صفات کا حامل، تمام کمالات کا مالک اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزہ و مبرہ ہے۔

اس حقیقت کی طرف دائمی توجہ انسانی روح کو نیکیوں اور پاکیزگیوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور برائیوں اور قباحتوں سے روکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی صفات کا عکس انسانی روح میں تجلی کرتا ہے، ایسے عظیم معبود کی طرف توجہ اس کی بارگاہ میں دائمی حضور کے احساس کا موجب بنتی ہے اور اس احساس کے ذریعے ہی گناہوں سے انسان کا فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ روز بروز ان سے دور ہوتا جاتا ہے۔

اس کی یاد ہمیشہ اس کی نگرانی کی یاد آوری، اس کے حساب و کتاب اور جزا کی یاد، اس کے عدل و انصاف اور جنت و دوزخ کی یاد ہے۔ ایسی یاد ہے جو روح کو صفا اور دل کو نور و حیات عطا کرتی ہے۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں آیا ہے کہ ہر چیز کی ایک مقدار معین ہے، سوائے یادِ خدا کے کہ جس کا کوئی حد و حساب نہیں۔ اصولِ کافی کی روایت کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "ما من شیٔ الا ولہ حد ینتھی الیہ الّا الذکر، فلیس لہ حد ینتھی الیہ"

ہر ایک چیز کی ایک حد ہوتی ہے کہ جب وہ اس تک پہنچ جائے تو ختم ہو جاتی ہے، سوائے یادِ خدا کے کہ جس کی کوئی حد

نہیں ہے۔

پھر مزید فرماتے ہیں:

" فرض اللہ عزوجل الفرائض فمن اداھنّ فھو حدھن، وشھر رمضان فمن صامہ فھو حدہ والحجّ فمن حج حدہ، الا الذکر، فان اللہ عزّوجل لم یرض منہ بالقلیل ولم یجعل لہ حدًّا ینتھی الیہ، ثم تلا: یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا وسبحوہ بکرۃ واصیلًا"

" خدا نے واجب نمازوں کو فرض کیا ہے جو ان کو ادا کر دے اس نے ان کی حد کو پورا کر دیا، ماہِ رمضان کے جو روزے رکھ لے اس کی حد انجام پا گئی، جو شخص (ایک مرتبہ) حج بجا لائے تو وہی اس کی حد ہے سوائے " ذکرِ خدا" کے کہ خدا اسکی قلیل مقدار سے راضی نہیں ہوتا اور اس کے کثیر کے لیے بھی کسی حد کا قائل نہیں۔ پھر آپ نے اپنی گفتگو کے شاہد کے طور پر آیہ " یاایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا . . . . " تلاوت فرمائی۔ [1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی روایت کے ذیل میں اپنے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں نقل کرتے ہیں۔

آنجناب " کثیر الذکر" تھے۔ جس وقت ہم ان کے ساتھ چل رہے ہوتے تو وہ ذکرِ خدا کر رہے ہوتے اور کھانا کھاتے وقت ذکرِ خدا میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ جب لوگوں سے باتیں کر رہے ہوتے تو بھی ذکرِ خدا سے غافل نہ ہوتے . . . ."

آخر میں یہ پر مغز حدیث اس جملہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

" والبیت الذی یقرء فیہ القراٰن، ویذکر اللہ عزوجل فیہ تکثر برکتہ، وتحضرہ الملائکۃ، وتھجر منہ الشیاطین، ویضیء لاھل السماء کما یضیء الکوکب الدری لاھل الارض"

" جس گھر میں قرآن کی تلاوت اور خدا کی یاد ہو، اس میں برکت زیادہ ہوتی ہے فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین اس سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اور وہ گھر اہل آسمان کو یوں چمکتا دکھائی دیتا ہے، جیسے اہل زمین کو چمکتا ستارہ نظر آتا ہے"

(اس کے برعکس جس گھر میں تلاوتِ قرآن اور ذکرِ خدا نہیں ہوتا اس کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور فرشتے ہجرت کر جاتے ہیں اور شیاطین آ پڑاؤ ڈالتے ہیں)۔ [2]

---

[1] کافی جلد ۲ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل)۔

[2] کافی جلد ۲ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل)۔

یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ ایک حدیث میں یادِ خدا کو دنیا و آخرت کی تمام خیر کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

" من اعطی لسانًا ذاکرًا فقد اعطی خیر الدنیا والاٰخرۃ"

" جس شخص کو خدا نے ذکر کرنے والی زبان عطا کی ہے گویا اس کو دنیا و آخرت کی بھلائی دے دی گئی ہے"۔ [1]

یادِ خدا کی اہمیت کے سلسلے میں روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں کہ ان سب کو یہاں جمع کردیں تو ہم اپنے موضوع سے خارج ہو جائیں گے۔ اس گفتگو کو ہم حضرت صادق آلِ محمد کی ایک مختصر مگر جامع حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا:

" من اکثر ذکر اللہ عزوجل اظلہ اللہ فی جنتہ"

" جو شخص زیادہ یادِ خدا کرے تو خدا اسے اپنے لطف و کرم کے سائے میں بہشت بریں میں جگہ عطا فرمائے گا"۔ [2]

(جو لوگ اس سلسلے میں آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اصول کافی جلد دوم کے ان ابواب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو ذکر اللہ کے بارے میں ہیں، خصوصًا جس باب میں بتایا گیا ہے کہ اس شخص کو کبھی آفات و بلیات اپنا نشانہ نہیں بناتے جو ذکرِ خدا کرتے ہیں)۔

اس بات کو ایک بار پھر دہرانا ضروری ہے کہ ان سب خیرات و برکات کا تعلق یقینًا ایسے لفظی ذکر اور حرکتِ زبان سے نہیں ہے جو غور و فکر اور عمل سے خالی ہو بلکہ مقصود وہ ذکر ہے جس سے فکر کے سوتے پھوٹتے ہوں اور جس کا ردّ عمل انسانی اعمال سے واضح ہو جیسا کہ روایات میں اس معنی کی تصریح ہوئی ہے۔ [3]

۲۔ لقاء اللہ کیا ہے؟

ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں عام طور پر یہ تعبیر قیامت کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ پروردگار کے بارے میں حسی ملاقات کوئی مفہوم نہیں رکھتی کیونکہ وہ جسم ہے، نہ ہی عوارض جسم کا حامل، لہٰذا بعض مفسرین مجبورًا اصطلاح کے مطابق یہاں مضاف کو مقدر مان کر کہتے ہیں کہ " لقاء ثواب اللہ" یا " خدا کے فرشتوں کی ملاقات" ہے، لیکن یہاں پر " لقاء" کو " لقاء اللہ" کے حقیقی اور دل کی آنکھ کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔

کیونکہ قیامت کے دن تمام پردے ہٹ جائیں گے اور خدا کی عظمت اور اس کی نشانیاں ہر زمانے سے زیادہ روشن اور واضح طور پر جلوہ گر ہونگی۔ انسان باطنی شہود اور دل کی آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کے مقام پر پہنچ جائے گا اور ہر شخص اپنی معرفت اور عمل صالح کی مقدار کے مطابق اس شہود کے عالی مرحلے پر فائز ہوگا۔

اسی مناسبت سے جناب فخر رازی نے اپنی تفسیر میں نہایت ہی قابل توجہ بات بیان کی ہے جسے ہماری مذکورہ گفتگو کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اس دنیا میں انسان مادی امور اور تلاش معاش میں مستغرق ہونے کی وجہ سے عام طور پر خدا سے غافل ہو جاتا ہے لیکن

---

[1] کافی جلد ۲ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل)۔

[2] کافی جلد ۲ کتاب الدعاء باب ذکر اللہ عزوجل)۔

[3] خصائل صدوق مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۶، صفحہ ۳۵۳۔

قیامت میں جب یہ تمام امور برطرف ہو جائیں اور انسان فکر معاش سے بے نیاز ہو جائے گا تو اپنے پورے وجود کے ساتھ پروردگار عالم کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اور یہی "لقاء اللہ" کا معنی ہے۔[1]

یاد رہے جو کچھ ہم عرض کر چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں پر جو موت اور فرشتہ موت سے ملاقات کے لمحے کی طرف اشارہ سمجھا ہے، نہ تو وہ مذکورہ آیات سے مناسبت رکھتا ہے اور نہ ہی ان جیسی دوسری قرآنی آیات کی تعبیرات سے خصوصاً "یلقونہ" میں مفعول کی ضمیر مفرد کی صورت میں آئی ہے جو اس ذاتِ پاک خداوند متعال کی طرف اشارہ ہے، جبکہ روح کو قبض کرنے والے فرشتوں کے لیے جمع کا صیغہ ہوتا ہے اور اس سے قبل کی آیت میں لفظ "ملائکہ" جمع کی صورت میں آیا ہے (مگر یہ کہ کوئی کلمہ مقدر مانا جائے)۔

۳۔ مومنین کی جزا ابھی سے تیار ہے: "اعد لھم اجرًا کریمًا" کا جملہ واضح کرتا ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتیں ابھی سے پیدا ہو چکی ہیں اور مومنین کے انتظار میں ہیں، لیکن ممکن ہے یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ تیار رکھنا تو ایسے لوگوں کے لیے مناسب ہوتا ہے جو محدود قدرت کے مالک ہوتے ہیں اور مبادا ضرورت کے وقت فراہم کرنا چاہیں تو نہ کر پائیں لیکن پروردگار کی قدرت غیر محدود ہے، وہ جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرے تو حکم دیتا ہے "ہو جا" تو وہ فوراً ہو جاتی ہے وہاں ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو پھر اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں تیار ہونے کا کیا مقصد ہے؟

ج: ایک نکتے کی طرف توجہ اس مشکل کو حل کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کو تیار کر کے رکھنا ہمیشہ قدرت کے محدود ہونے کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ کبھی دل کو گرمانے اور زیادہ سے زیادہ دلی اطمینان اور بعض اوقات زیادہ سے زیادہ احترام و اکرام کی بناء پر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم کسی مہمان کو دعوت دیتے ہیں اور کچھ مدت پہلے اس کی تواضع کے وسائل تیار کرنے میں مصروف ہو جائیں، تو ہم اس کے لیے زیادہ احترام اور اہمیت کے قائل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کے آنے کے بعد تواضع اور پذیرائی کے وسائل مہیا کرنے میں لگ جائیں تو یہ خود ایک قسم کی بے اعتنائی، بے پرواہی اور ناقدری شمار ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود یہ بات اس سے مانع نہیں ہوگی کہ باایمان افراد اپنی خودسازی، معرفت اور پاکیزگی عمل میں جتنی زیادہ کوشش کریں گے، خدا کی طرف سے اجر و ثواب بھی اتنا تکامل اور ارتقاء پیدا کرتا جائے گا۔

---

[1] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۴۵۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝

۴۶۔ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝

۴۷۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۝

۴۸۔ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

ترجمہ

۴۵۔ اے پیغمبر! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا اور انذار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۴۶۔ اور تجھے اللہ کے حکم سے، اسی کی طرف دعوت دینے والا اور روشنی عطا کرنے والا چراغ قرار دیا ہے۔

۴۷۔ اور مومنین کو بشارت دے کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے عظیم فضل اور اجر ہے۔

۴۸۔ اور تو کفّار و منافقین کی اطاعت نہ کر اور نہ ہی ان کے آزار اور اذیتوں کی پرواہ کر خدا پر توکل کر اور یہی کافی ہے کہ خدا (تیرا) حامی اور مدافع ہے۔

تفسیر

رسول اللہ چراغِ فروزاں ہیں:

ان آیات میں روئے سخن پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف ہے لیکن اس کا نتیجہ مومنین کے لیے ہے۔ اور یہ آیات اُن گزشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہیں جن میں مومنین کی بعض ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ان چار آیات میں سے پہلی دو آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پانچ اوصاف بیان ہوئے ہیں اور دوسری دو آیات میں پانچ ذمہ داریوں اور فرائض کا تذکرہ ہے جو سب کے سب آپس میں مربوط اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ کو شاہد اور گواہ کے طور پر بھیجا ہے": (یاایھا النبی انا ارسلنٰک شاھدًا)۔

آنحضرتؐ ایک طرف سے تو امت کے اعمال پر گواہ ہیں کیونکہ آپؐ ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ جیساکہ ہم ایک اور جگہ پڑھتے ہیں:

"وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون"

"کہہ دیجئے کہ عمل کرتے رہو خدا، اس کا رسول اور مومنین (آئمہ معصومین) تمھارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔"

(توبہ/۱۰۵)

پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کے پاس اُمت کے اعمال کے پیش ہونے سے ان کے بارے میں ان کے علم و آگہی کی بات ثابت ہو جاتی ہے جس کی تفصیل اسی آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ہشتم میں آچکی ہے۔

دوسری طرف آپ گزشتہ انبیاءؑ پر شاہد ہیں جو خود اپنی امت کے گواہ تھے:

"فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بک علیٰ ھؤلاء شھیدًا"

"اس دن ان کی حالت کیسی ہوگی جس دن ہم ہر امت کے لیے ان کے اعمال پر گواہ طلب کریں گے اور آپ کو ان کے اعمال پر گواہ قرار دیں گے۔" (نساء/۴۱)

اور تیسری طرف آپ اپنے وجود مقدس، اوصاف حمیدہ، اخلاقِ حسنہ، اصلاحی پروگرام، روشن ماضی اور اعمال صالح کی وجہ سے اپنے مکتب کی حقانیت اور پروردگار کی عظمت و قدرت کے گواہ ہیں۔

پھر دوسری اور تیسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نے آپ کو بشارت دینے اور ڈرانے والا قرار دیا ہے": (ومبشرًا ونذیرًا)۔

نیک لوگوں کو پروردگار عالم کے بے انتہا اجر اور ہمیشہ کی سعادت و سلامتی اور قابل فخر کامیابی و کامرانی کی بشارت یعنی خوش خبری

دینے والا اور کفار و منافقین کو خدا کے دردناک عذاب، تمام وجودی سرمایوں کے ضیاع اور دنیا و آخرت میں بدبختی کے گڑھوں میں جا گرنے سے ڈرانے والا۔

جیساکہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ خوف و امید کو ہر جگہ ایک دوسرے سے ملا ہوا اور باہم مساوی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وجود انسانی کا آدھا حصہ تو فوائد کے حصول سے لگاؤ رکھتا ہے اور دوسرا نصف حصہ نقصان سے بچنے کی خواہش رکھتا ہے۔ "بشارت" کا سبب پہلا حصہ اور "انذار" کا سبب دوسرا حصہ ہے۔ وہ لوگ جو اپنے منصوبوں کاموں میں صرف ایک حصے پر انحصار کرتے ہیں دراصل انھوں نے انسان کی حقیقت کو پہچانا ہی نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے اس کی اس حرکت کے اسباب و علل کی طرف کوئی توجہ کی ہے۔ [1]

بعد والی آیت رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوتھی اور پانچویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہم نے آپ کو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی طرف دعوت دینے والا قرار دیا ہے اور روشنی عطا کرنے والا چراغ بھی": (وداعیًا الی اللہ باذنہ وسراجًا منیرًا)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ رسالت مآبؐ کا مقامِ شہود: آپ کے تمام اوصاف سے پہلے آیت میں اس مقام کا ذکر ہوا ہے کیونکہ یہ مقام صرف پیغمبر کے وجود اور ان کی رسالت کا محتاج ہوتا ہے اس کے علاوہ اسے کسی قسم کے تمہید اور مقدمہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس وقت آپ اس مقام و منزلت پر منصوب ہو جائیں گے تو آپ کا مذکورہ بالا جہات سے شاہد ہونا مسلم ہو جائے گا، البتہ مقام "بشارت" و "انذار" دو ایسے مقامات ہیں جو اس کے بعد وجودی صورت اختیار کرتے ہیں۔

۲۔ خدا کی طرف دعوت کا مرحلہ: یہ مرحلہ بشارت اور انذار کے بعد آتا ہے کیونکہ بشارت و انذار افراد کو حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب ترغیب اور تنبیہ کے ذریعے حق کو قبول کرنے کی آمادگی پیدا ہو جائے گی تو پھر خدا کی طرف دعوت شروع ہوگی، اور صرف ایسے ہی مقام پر دعوت مؤثر ہوگی۔

۳۔ دعوت اذنِ الٰہی سے: باوجودیکہ آنحضرتؐ کے تمام کام خدا کے اذن و فرمان سے انجام پاتے ہیں لیکن یہاں پر صرف دعوت کو اذنِ پروردگار سے مقید کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کا مشکل ترین اور اہم ترین کام کی طرف دعوت دینا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو ان کی خواہشات نفسانی کے برخلاف صحیح راستے پر چلانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر خدا کے اذن و فرمان اور یاوری و مدد کو شامل حال ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے صحیح انجام کو پہنچے۔ ضمناً یہ بھی واضح ہونا چاہیئے کہ پیغمبرؐ اپنی طرف سے نہیں بلکہ جو کچھ کہتے ہیں، اذنِ خدا سے کہتے ہیں۔ [2]

---

[1] اس سلسلے میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۹، کے ذیل میں ہم تفصیل بحث "دو اہم تربیتی اصول" کے عنوان سے کر چکے ہیں۔ (جلد اول دیکھیے)

[2] یہ احتمال بھی ہے کہ "باذنہ" کی قید گزشتہ تمام اوصاف کی طرف لوٹتی ہو۔ لیکن آیت کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ صرف "داعیًا الی اللہ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۴۔ آپ کا سراج منیر ہونا: "سراج" کا معنی "چراغ" اور "منیر" کا معنی "نورافشاں" ہے اور یہ پیغمبر گرامی کے معجزات، حقانیت کے دلائل اور دعوت کی صداقت کی نشانیوں کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ایسا روشن چراغ ہے جو اپنا گواہ خود آپ ہے تاریکیوں کو دُور کرتا ہے اور آنکھوں اور دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جس طرح آفتاب آمد دلیل آفتاب ہوتا ہے، ان کا وجود بھی ان کی حقانیت کی دلیل ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید میں چار مرتبہ لفظ سراج آیا ہے جن میں سے تین مقامات پر "سورج" کے معنی میں آیا ہے۔ جن میں سے سورۂ نوحؑ کی آیت ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

"وجعل القمر فیهن نورًا وجعل الشمس سراجًا"

"خدا نے چاند کو آسمان کا نور اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا ہے۔"

جیساکہ ہم نے عرض کیا ہے کہ "سراج" اصل میں چراغ کے معنی میں ہے جو گزشتہ زمانے میں فتیلے اور سرسوں کے تیل سے جلتا تھا اور موجودہ دور میں بجلی وغیرہ کی قوت سے نور اور روشنی کا سرچشمہ ہے، لیکن مفردات میں راغب کے بقول یہ لفظ تدریجاً نور اور روشنی کے ہر منبع پر بولا جانے لگا! در سُورج اس کا اطلاق اس بناء پر ہے کہ اس کا نور خود اسی کے اندر سے پھوٹتا ہے اور چاند کی طرح کسی اور منبع سے نور حاصل نہیں کرتا۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجودِ گرامی آفتاب تاباں کی طرح ہے جو جہالت، شرک اور کفر کی ظلمتوں کو انسان کی رُوح کے افق سے دُور کرتا ہے، لیکن جس طرح نابینا افراد سُورج کی روشنی سے استفادہ نہیں کر سکتے اور جس طرح چمگادڑ کی آنکھیں اس روشنی کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور وہ اس سے اپنے آپ کو چھپائے رکھتی ہے، اسی طرح دل کے اندھے اور ہٹ دھرم افراد بھی اس نور سے کبھی استفادہ نہیں کر سکتے۔ نہ پہلے اور نہ اب اور ابوجہل جیسے لوگ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ رسول پاکؐ کے قرآن پڑھنے کی آواز نہ سن سکیں۔ ہمیشہ ظلمت اور تاریکی اضطراب اور وحشت کا سبب ہوتی ہے، جبکہ نور اور روشنی سکون اور اطمینان کا باعث۔ چور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بیابان کے درندے بھی عام طور پر رات ہی کی تاریکی میں اپنے ٹھکانوں سے باہر آتے ہیں۔

تاریکی انتشار کا سبب ہے اور نور اجتماع کا باعث ہے۔ اسی بناء پر اگر کسی تاریک رات میں بیابان کے اندر ایک چراغ روشن کر دیا جائے تو تھوڑی دیر میں انواع واقسام کے حشرات اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

روشنی اور نور درختوں کی نشو ونما، پھولوں کی پرورش، پھلوں کے پکنے غرضیکہ تمام حیاتی فعل انفعال کا سرمایہ ہے۔

ذاتِ پیغمبر کو ایک منبع نور کے ساتھ تشبیہ دینا ان تمام مفاہیم کو ذہن میں منقش کر دیتا ہے۔

آپ کا وجودِ گرامی باعثِ سکون ہے، دین وایمان کے چوروں اور معاشرے کے بے رحم ستمگر بھیڑیوں کے بھاگ جانے کا سبب ہے، دل کی تسلی کا سرمایہ اور ایمان واخلاق کی روحانی پرورش اور نشو ونما کا ذریعہ ہے۔ غرضیکہ آپ ہی کے دم قدم سے زندگی اور اس کی چہل پہل کا مزہ ہے اور آپ کی تاریخ زندگی اس امر کا زندہ شاہد ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

ہم کہہ چکے ہیں کہ زیرِ بحث آیات میں سے دو آخری آیتوں میں آنحضرتؐ کی پانچ اہم ذمہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ

آپ کی پانچ صفات بیان کرنے کے بعد، پہلے مرحلے پر فرمایا گیا ہے "مومنین کو بشارت دیجئے کہ ان کے لیے خدا کی طرف سے فضل اور عظیم اجر ہے" (وبشر المؤمنین بانّ لهم من الله فضلًا کبیرًا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی بشارت کا سلسلہ صرف نیک مومنین کے اعمال کے اجر وجزا تک ہی محدود نہیں بلکہ خداوندِ عالم ان پر اپنے فضل وکرم کی اس قدر بخشش کرے گا کہ عمل اور اجر کے درمیان توازن کا معیار بالکل بدل جائے گا، جیساکہ قرآن کی دوسری آیات اس پر شاہد ناطق ہیں۔ قرآن ایک جگہ فرماتا ہے: "من جاء بالحسنة فله عشر امثالها" (انعام۔ ۱۶۰)

قرآن دوسری جگہ فرماتا ہے:

"مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة والله یضاعف لمن یشاء"

(بقرۃ/۲۶۱)

جس کے مطابق کبھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کا اجر سات سو گنا اور کبھی ہزار گناہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

بعض اوقات ثواب اس سے بھی اوپر چلا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

"فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین"

"کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس قدر ثواب اس کے لیے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوگا۔" (الم سجدہ/۱۷)

اس طرح سے خدا کے ایک فضل وکرم کی طرف نشاندہی کی گئی ہے جو کسی کے وہم وگمان میں نہیں آسکتا بلکہ اس سے بھی بلند تر اور بالاتر ثواب کی نشان دہی کی گئی ہے۔

قرآن اس کے بعد دوسرے اور تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو" (ولا تطع الکافرین والمنافقین)۔

اس میں شک نہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز کفار اور منافقین کی اطاعت نہیں کرتے تھے، لیکن معاملہ اس قدر اہم ہے کہ تاکید تو پیغمبرؐ کو کی جارہی ہے لیکن تنبیہ دوسروں کو۔ کیونکہ سچے رہبروں کو رستے میں جو اہم خطرات درپیش ہوتے ہیں وہ یا تو سودے بازی ہوتی ہے اور یا پھر ہتھیار ڈال دینا ہوتے ہیں اور ان خطرات کا سرچشمہ یا تو دھمکیاں ہوتی ہیں یا پھر مختلف طریقوں سے لالچ ہوتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھار تو انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ان دو راستوں میں سے کسی ایک کو اپنا ہی لینا چاہیئے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رہبر کی تمام محنت ضائع ہو جاتی ہے اور تمام کوششوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

تاریخِ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ کفار اور منافقوں کے مختلف گروہوں نے بارہا کوشش کی کہ پیغمبرِ اسلام کو بھی مذکورہ صورت حال سے دوچار کردیں۔ چنانچہ کبھی تو انھوں نے کہا کہ بتوں کو بُرا بھلا نہ کہیں اور کبھی یہ پیش کش کی کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی۔ کبھی کہتے کہ ہمیں مزید ایک سال کی مہلت دیں کہ اسی طرح عمل جاری رکھیں، پھر آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ کبھی پیش کش کرتے کہ آپ ان غریبوں فقیروں کو اپنے اطراف سے ہٹا دیں تاکہ مالدار اور با اثر لوگ آپ کے ہم نوا بن سکیں۔ اور

کبھی مالی امداد کی پیش کش کرتے کبھی عہدہ اور منصب و مقام اور خوبصورت عورتوں کی لالچ دیتے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلام کی سریع اور تیز پیش رفت اور کفر و نفاق کی بیخ کنی کی راہ میں خطرناک جال تھی۔ اگر آپ ان میں سے کسی کو مان لیتے۔ یا اپنی طرف سے ذرہ بھر نرمی اور جھکاؤ کا اظہار کرتے تو اسلامی انقلاب کی بنیادیں متزلزل ہو جاتیں، اس کی عمارت دھڑام سے گر جاتی اور آپ کی کوئی کوشش کسی بھی نتیجہ کو نہ پہنچ پاتی۔

پھر چوتھے اور پانچویں حکم میں فرمایا گیا ہے: "ان کے آزار اور تکلیف پہنچانے کی پرواہ نہ کریں، خدا پر توکل کریں۔ اور یہی کافی ہے کہ خدا آپؐ کا حامی اور دفاع کرنے والا ہے" (ودع اذاھم وتوکل علی اللہ وکفی باللہ وکیلا)۔

آیت کا یہ حصہ واضح کرتا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام پر جھکنے اور سر تسلیم خم کرنے کے لیے سخت دباؤ ڈالا اور انواع و اقسام کے آزار و تکالیف سے دوچار کر دیا اور وہ آزار کبھی تو زبان کے ذریعے زخم لگا کر اور بدزبانی کر کے اور کبھی جسمانی طور پر دکھ پہنچا کر، کبھی آپؐ کا اور آپ کے اعوان و انصار کا اقتصادی محاصرہ کر کے، غرضیکہ انھوں نے اذیتیں پہنچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ البتہ مکہ میں قیام کے دوران اذیتوں کا طریقہ اور تھا اور مدینہ میں اور تھا۔ کیونکہ "اذی" ایک ایسا لفظ ہے جو آزار اور تکلیف کی تمام قسموں کی نشاندہی کرتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ "اذی" ہر قسم کے ضرر کے معنی میں ہے جو کسی زندہ چیز یا اس سے وابستہ افراد کو پہنچے۔ وہ ضرر چاہے، جسمانی ہو یا جانی، دنیوی ہو یا اُخروی۔

البتہ یہ لفظ قرآنی آیات میں خصوصیت کے ساتھ زبانی ایذا اور تکلیف پہنچانے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۶۱ میں ہے:

"ومنھم الذین یؤذون النبی ویقولون ھو اذن"

"ان میں بعض لوگ پیغمبر کو اذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خوش لقین انسان ہیں اور ہر شخص کی بات پر کان دھرتے ہیں"

لیکن دوسری آیات میں یہ لفظ جسمانی تکلیف کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیہ نمبر ۱۶ میں ہے:

"والذان یأتیانھا منکم فاٰذوھما"

"وہ مرد اور عورتیں جو اس بُرے عمل (زنا) کا ارتکاب کرتے ہیں، انھیں آزار دو (ان پر شرعی حد جاری کرو)"

تاریخ کہتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدر اسلام کے مسلمانوں نے طرح طرح کی تکالیف کا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کبھی کسی کے آگے نہیں جھکے۔ ننگ و عار کو تسلیم نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے مقاصد جلیلہ میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

اس استقامت اور کامیابی کی وجہ صرف خدا پر توکل اور اس کی پاک ذات پر اعتماد تھا۔ وہ خدا جس کے ارادے کے آگے تمام مشکلات کافور ہو جاتی ہیں اور بقول شاعر:

اگر تیغ عالم بجنبد زجای نبرد رگی تا نخواہد خدای

"اگر ساری دنیا کی تلواریں حرکت میں آجائیں، جب تک خدا نہ چاہے، کسی کی ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتیں"۔

جی ہاں! انسان کا سہارا اور جائے پناہ اس قسم کا خدا ہونا چاہیئے اور بس!

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ زیر بحث آیت کا مضمون حکم جہاد سے منسوخ نہیں ہوا۔ (جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے) بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ آیات حکم جہاد کے کافی عرصہ بعد اور سورۂ احزاب سے متعلق واقعات کے ضمن میں نازل ہوئی ہیں اور ہر دور میں واجب العمل اور لازم الاجراء ہیں تاکہ خدائی پیشوا اپنی تمام تر قوتیں مخالفین کے اذیت ناک کاموں کو اہمیت دینے میں صرف نہ کریں۔ کیونکہ اگر وہ ان کی پرواہ کریں گے اور اپنی فعال صلاحیتیں ان کے مقابلے میں صرف کر دیں گے تو دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ دشمن تو چاہتا ہی یہ ہے کہ مخالف کے اذہان و افکار کو الجھا دے تا کہ اس طرح سے اس کی طاقت ضائع کر دے۔ یہی وہ منزل ہے جس کا واحد حل بے اعتنائی اور "دع اذاھم" والے فرمان پر عمل درآمد ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا پانچوں احکام جو آخری دو آیات میں ذکر ہوئے ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ مؤمنین کو باایمان قوتوں کے جذب کرنے کے لیے بشارت دینا، کفار اور منافقین سے کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنا اور نہ ہی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، ان کے آزار و تکلیف کی پرواہ نہ کرنا اور خدا کی ذات پر توکل کرنا، مجموعی طور پر ان میں مقصد تک پہنچنے کا راز پوشیدہ ہے اور یہ راہ حق کے راہیوں کے لیے ایک مکمل اور جامع دستور العمل ہے۔

۴۹۔ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝

ترجمہ

۴۹۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مؤمن عورتوں کے ساتھ نکاح کرو، اور ہم بستر ہونے سے پہلے انھیں طلاق دے دو تو تمھاری وجہ سے ان پر کوئی عدت نہیں ہے کہ جس کا تم حساب رکھو، انھیں مناسب ہدیہ دے کر شائستہ طریقے سے رخصت کر دو۔

تفسیر

طلاق کے کچھ احکام:

اس سورہ (احزاب) کی آیات کو صاف طور پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض میں تو پیغمبر کو خطاب کیا گیا ہے اور بعض میں تمام مؤمنین کو۔ اسی لیے کبھی "یا ایّھا النّبیّ" آیا ہے تو کبھی "یا ایّھا الّذین اٰمنوا"۔ ان آیات میں لازمی احکام ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی ذات بھی ان احکام میں مورد نظر تھی اور تمام مؤمنین بھی۔

زیر نظر آیت ان میں سے ہے، جن میں روئے سخن سب اہل ایمان کی طرف ہے، جبکہ گذشتہ آیات میں ظاہراً روئے سخن صرف رسول کریمؐ کی طرف تھا اور پھر آیندہ آیات میں دوبارہ پیغمبر اکرمؐ کو خطاب کی نوبت آئے گی اور اس سے "لف و نشر مرتب"

کی اصطلاح کے مطابق اس سورہ کا ایک حصہ تشکیل پاتا ہے۔

خدا فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، جس وقت ایمان دار عورتوں سے نکاح کرو اور ہم بستری سے پہلے ہی انہیں طلاق دے دو تو تمھاری وجہ سے ان پر کوئی عدت نہیں ہے کہ جس کا حساب تم مدّ نظر رکھو"! (یا ایھا الّذین اٰمنوا اذا نکحتم المؤمنات ثمّ طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فما لکم علیھن من عدّۃ تعتدونھا)۔

یہاں پر خدا مطلقہ عورتوں کی عدت کے حکم میں ایک استثناء بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اگر دخول سے پہلے طلاق واقع ہو جائے تو پھر عدت رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے عدت کا حکم بیان ہو چکا ہے۔

"مؤمنات" کی تعبیر اس بات کی دلیل نہیں کہ غیر مومن یا غیر مسلم عورتوں سے نکاح کلی طور پر ممنوع ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی اولیت کی طرف اشارہ ہو، اسی بناء پر یہ آیت کتابیہ عورتوں سے نکاح موقّف (متعہ) کی روایات اور مشہور فقہاء کے فتاویٰ سے متصادم نہیں ہے۔

یاد رہے کہ "لکم" (تمھارے لیے) اور اسی طرح "تعتدونھا" (عدت کا حساب کرتے ہو) کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے، عورت کا عدت رکھنا دراصل مرد کا ایک قسم کا حق شمار ہوتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ عورت واقع میں حاملہ ہو، اور عدت کو ترک کر کے دوسرے مرد سے ازدواج سبب بن جائے کہ بچے کی کیفیت غیر واضح ہو، لہٰذا مرد کا حق پامال ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ عدت کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے مرد اور عورت دونوں کو اس بات کی فرصت مل جائے گی کہ اگر طیش اور غصے کی وجہ سے نوبت طلاق تک جا پہنچی ہو تو وہ اس مدت میں اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی بھی کر سکیں۔ یہ عورت اور مرد دونوں کا حق ہے۔

رہا یہ اعتراض جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ اگر عدت مرد کا حق ہے تو اس کو ساقط بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ اعتراض ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ فقہ میں بہت سے ایسے حقوق ہیں، جن کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اس حق کے جو میت کے پسماندگان کو اس کے مال میں حاصل ہوتا ہے یا وہ حق جو فقراء کو زکوٰۃ میں حاصل ہوتا ہے، ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد ان عورتوں کے احکام میں سے ایک اور حکم کو بیان کرتا ہے، جن کو ہم بستری سے پہلے طلاق ہو جائے۔ اس کی طرف سورہ بقرہ میں بھی اشارہ ہو چکا ہے، فرمایا گیا ہے: انہیں (مناسب ہدیہ کے ساتھ) بہرہ مند کرو (فمتّعوھنّ)۔

اس میں شک نہیں کہ عورت کو مناسب ہدیہ دینا اس مقام پر واجب ہوتا ہے، جہاں اس کے لیے مہر معین نہ ہوا ہو۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں آیا ہے:

"لا جناح علیکم ان طلقتم النساء ما لم تمسوھنّ او تفرضوا لھنّ فریضۃ ومتعوھنّ"

تم پر گناہ نہیں ہے کہ اگر تم عورتوں سے اختلاط سے قبل یا تعیین مہر سے پہلے (کسی وجہ سے) طلاق دے دو، لیکن اس موقع پر انہیں (مناسب ہدیہ کے ساتھ) بہرہ مند کرو۔

اسی بناء پر زیر بحث آیت اگرچہ مطلق ہے اور ایسے مواقع بھی اس میں شامل ہیں، جن میں مہر کا تعین ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ لیکن

سورہ بقرہ کی آیت کے قرینے سے موجودہ آیت کو ایسے موقع کے لیے مخصوص کیا جائے گا، جہاں مہر مقرر نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اگر مہر معین ہو چکا لیکن دخول نہ ہوا ہو تو آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے (جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۷ میں آیا ہے)۔

لیکن بعض مفسرین اور فقہائنے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "مناسب ہدیہ دینے" کا حکم موجودہ آیت میں ایک عمومی حکم ہے یہاں تک کہ وہ مواقع بھی شامل ہیں، جن میں مہر مقرر کیا گیا ہے، البتہ ایسے مواقع پر مستحب ہوتا ہے اور جن مقامات پر مقرر نہیں کیا گیا، وہاں پر واجب ہوتا ہے، چنانچہ بعض آیات اور روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ [1]

اور اس ہدیے کی مقدار کیا ہونی چاہیئے؟ قرآن مجید اسے اجمالاً بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"متاعًا بالمعروف"

"مناسب ہدیہ" (بقرہ ۲۳۶)

اسی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے،

"علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ"

جو شخص استطاعت رکھتا ہے اس کی استطاعت کے مطابق جو تنگ دست ہے اس کی اپنی استطاعت کے مطابق۔

اسی بناء پر اگر اسلامی روایات میں گھر، ملازم اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہ اس کلیے کے مصداق ہیں جو شوہر کی استطاعت اور بیوی کے حالات کے مطابق مختلف ہوتے ہیں۔

اسی آیت کا آخری حکم یہ ہے کہ "مطلقہ عورتوں کو مناسب طریقے پر رخصت کردو اور ان سے اچھے انداز میں جدائی اختیار کرو:" (وسرحوھن سراحًا جمیلًا)۔

"سراح جمیل" کا معنی ہے محبت واحترام کے ساتھ علیحدہ کردینا اور ہر قسم کی سختی، ظلم اور بے احترامی سے اجتناب کرنا۔ خلاصہ یہ کہ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۹ میں آیا ہے کہ "بیوی کو یا تو مناسب طور پر اپنے پاس رکھنا چاہیئے یا پھر خیر وخوبی کے ساتھ اسے رخصت کردینا چاہیے":

"فامساك بمعروف او تسریح باحسان"

زوجیت کو برقرار رکھنا بھی انسانی معیار کے مطابق ہونا چاہیئے اور ایک دوسرے سے علیحدگی اور جدائی بھی۔ نہ یہ کہ جب

---

[1] مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۱ اور اس سلسلے کی متعدد روایات وسائل الشیعہ کی کتاب نکاح کے "ابواب مہور" میں سے باب ۵۰ (جلد ۱۵ صفحہ ۵۹) میں بھی موجود ہیں، منجملہ ان کے ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لکل مطلقۃ متعۃ الا المختلعۃ"

ہر مطلقہ کے لیے مناسب ہدیہ ہونا چاہیئے، سوائے اس عورت کے جو اپنا مہر یا کوئی اور چیز دے کر طلاق لینے میں اپنے شوہر کی رضامندی حاصل کرتی ہے۔

شوہر علیحدگی کا ارادہ کرے تو اپنی بیوی کے بارے میں ہر قسم کی بے مہری، ظلم وزیادتی، بدزبانی، سختی و درشتی کا مظاہرہ کرے، کیونکہ یہ یقیناً غیر اسلامی طریقہ کار ہے۔

بعض مفسرین نے "سراح جمیل" کو اسلامی تقاضوں کے مطابق طلاق انجام پانے کے معنی میں لیا ہے اور جو روایت علی بن ابراہیم کی تفسیر اور "عیون الاخبار" میں آئی ہے، اس میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ "سراح جمیل" اس معنی میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کا ایک واضح مصداق ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے "سراح جمیل" کو گھر سے باہر جانے کی اجازت اور نقل مکانی کے معنی میں سمجھا ہے۔ کیونکہ یہاں عورت عدت رکھنے کی پابند نہیں ہے۔ اسی بناء پر اس کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے، تاکہ وہ جہاں جانا چاہے جا سکے۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "سراح جمیل" اور اس قسم کی دوسری تعبیرات قرآن کی دوسری آیات میں حتی کہ ان عورتوں کے بارے میں بھی جنہیں عدت گزارنی چاہیئے وارد ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

"سراح" کے اصل اور لغوی معنی کے سلسلہ میں اور یہ کہ وہ کیوں متعارف اطلاقات میں چھوڑ دینے اور طلاق دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی سورہ (احزاب) کی آیہ ۲۸ کے ذیل میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

۵۰۔ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۝

ترجمہ

۵۰۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کی ان بیویوں کو حلال کیا ہے، جن کا حق مہر آپ ادا کر چکے ہیں اور اسی طرح وہ کنیزیں جو غنیمت کے ذریعے ہم نے آپ کو بخشی ہیں اور آپ ان کے مالک ہوئے ہیں آپ کے چچا کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموؤں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں کہ جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے، اور جس وقت کوئی باایمان عورت خود کو پیغمبر کے لیے ہبہ کر دے (اپنے لیے مہر کا تقاضا نہ کرے) نبی چاہے تو اس سے بیاہ کر سکتے ہیں، لیکن اس قسم کا نکاح صرف

آپ کی ذات کے لیے جائز ہے نہ کہ دوسرے مومنین کے لیے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان کے لیے ہم نے ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کون سا حکم مقرر کیا ہے (اور ان کی مصلحت کس بات کا تقاضا کرتی ہے) یہ اس بناء پر ہے تاکہ (ادائے رسالت میں) آپ کسی مشکل سے دوچار نہ ہوں، اور خدا بخشنے والا، اور بڑا مہربان ہے۔

تفسیر

آپ کے لیے کن عورتوں سے نکاح جائز ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیات کا ایک حصّہ پیغمبر اسلام اور ان کی ذمہ داریوں کو "لف ونشر مرتب" کی صورت میں بیان کرتا ہے، لہٰذا گذشتہ آیت میں عورتوں کو طلاق دینے کے سلسلے میں کچھ احکام ذکر کرنے کے بعد یہاں روئے سخن نبی پاکؐ کی طرف کرتے ہوئے سات ایسے مواقع کو بیان کیا گیا ہے، جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نکاح جائز ہے۔

۱۔ پہلے فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبرؐ! ہم نے آپ کے لیے آپ کی بیویوں کو حلال کیا ہے، جن کا حق مہر آپ ادا کر چکے ہیں" (یا ایھا النبی انا احللنا لک ازواجک اللاتی اٰتیت اجورھن)۔

ان بیویوں سے مراد بعد والے جملوں کے قرینے کے مطابق وہ عورتیں ہیں جن کی پیغمبرِ اکرمؐ کے ساتھ کسی قسم کی رشتہ داری نہیں تھی، لیکن انھوں نے آپ سے نکاح کیا اور شاید حق مہر ادا کرنے کا مسئلہ بھی اسی بناء پر تھا، کیونکہ رسم یہ تھی کہ غیر رشتہ داروں میں شادی کے موقع پر حق مہر نقد ادا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں حق مہر ادا کرنے میں جلدی کرنا خصوصاً اس صورت میں جب بیوی کو اس کی ضرورت ہو، بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہے اور طرفین کی باہمی رضامندی کی صورت میں شوہر کے ذمہ سارے کا سارا یا کچھ حصّے کی ادائیگی ملتوی بھی کی جاسکتی ہے۔

۲۔ "وہ کنیزیں جو غنائم اور انفال کے ذریعے خدا نے آپ کو بخشی ہیں" (وما ملکت یمینک مما افاء اللہ علیک)۔

"افاء اللہ" "فیء" (بروزن شیء) کے مادہ سے ہے اور ایسے مال کو کہا جاتا ہے جو بغیر مشقت کے ہاتھ آئے۔ اسی لیے جنگی غنیمتوں اور اسی طرح انفال (قدرتی وسائل دولت، جو اسلامی حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں اور ان

کا کوئی فرد واحد مالک نہیں ہوتا، پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں "فیء" بازگشت اور اچھی حالت کی طرف لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر "سایہ" کو "فیء" کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ برگشت اور لوٹنے کی حالت رکھتا ہے، آگے چل کر کہتے ہیں، بغیر کسی تکلیف اور محنت و مشقت کے حاصل شدہ مال کو بھی "فیٔ" کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی تمام خیر و خوبی کے باوجود بھی سائے کی مانند عارضی اور ختم ہونے والا ہوتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ جنگی غنائم میں کبھی کبھی زحمت اور مشقت زیادہ اٹھانا پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ پھر بھی دوسرے اموال کی نسبت سر دردی اور مشقت تھوڑی ہوتی ہے اور بعض اوقات بہت سے اموال ایک حملے میں ہاتھ آجاتے ہیں، لہٰذا انہیں "فیٔ" کہتے ہیں۔ کیا یہ حکم آنحضرتؐ کی ازواج میں سے کس کے بارے میں صادق آتا ہے؟ اس ضمن میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آپ کی بیویوں میں سے ایک ماریہ قبطیہ غنائم میں سے اور دوسری ازواج "صفیہ" اور "جویریہ" انفال میں سے تھیں جنہیں پیغمبر اکرمؐ نے غلامی کی قید سے آزاد کر کے اپنی زوجیت کے لیے قبول فرمایا اور غلاموں کو تدریجاً آزاد کرنے اور ان کا انسانی مقام ان کی طرف لوٹانے کے لیے یہ امر بذات خود اسلام کے عمومی پروگراموں کا ایک حصہ تھا۔

۳۔ "آپ کے چچا کی بیٹیاں، پھوپھیوں کی بیٹیاں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیاں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے، یہ بھی آپ پر حلال ہیں"۔ (وبنات عمك وبنات عماتك وبنات خالك وبنات خالاتك اللاتی هاجرن معك)۔

تو اس طرح سے تمام رشتہ داروں میں سے صرف چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد عورتوں سے اس شرط کے ساتھ ازدواج جائز ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی ہے۔

ان چار گروہوں میں محدودیت واضح ہے، لیکن "مہاجرت" کی شرط اس لیے ہے، کیونکہ اس زمانہ میں ہجرت ایمان کی دلیل تھی اور ہجرت نہ کرنا کفر کی۔ یا اس بنا پر ہے کہ ہجرت انھیں زیادہ اعزاز دیتی تھی اور آیت میں بھی ان عالی مقام اور صاحب فضیلت عورتوں کو بیان کرنا مقصود ہے جو آپ کی زوجیت کے لیے مناسب اور موزوں ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چاروں مواقع جو ایک کلی حکم کے طور پر آیت میں ذکر ہوئے ہیں، آیا پیغمبرؐ کی بیویوں میں مصداق خارجی بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ صرف ایک مقام جسے ذکر کیا جاسکتا ہے، وہ ہے آپ کا اپنی پھوپھی زاد زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح، جس کی داستان اسی سورہ میں گزر چکی ہے، کیونکہ جناب زینب، جحش کی بیٹی تھیں اور جحش آنحضرتؐ کی پھوپھی کا شوہر تھا۔[1]

---

[1] یہاں پر "عم" مفرد اور "عمات" جمع کی صورت میں آیا ہے اسی طرح "خال" مفرد اور "خالات" جمع آیا ہے۔ مفسرین نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں، جن کو فاضل مقداد نے کنز العرفان میں بھی نقل کیا ہے، لیکن سب سے بہتر وجہ یہ ہے کہ "عم" اور "خال" عام طور پر لغت عرب میں اسم جنس کی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ جبکہ "عمہ" اور "خالہ" اس طرح نہیں ہیں اور یہاں اہل لغت کا عام طریقہ ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ "جس وقت کوئی ایمان دار عورت اپنے آپ کو پیغمبر کے لیے ہبہ کردے (اور اپنے لیے کسی قسم کے حق مہر کا مطالبہ نہ کرے) اگر پیغمبر چاہیں تو اس سے عقد کر سکتے ہیں"۔ (وامراۃ مؤمنۃ ان وھبت نفسھا للنبی ان اراد النبی ان یستنکحھا)۔

"لیکن اسے پیغمبر! اس قسم کا نکاح صرف آپ کے لیے جائز ہے نہ کہ باقی مومنین کے لیے"۔ (خالصۃ لك من دون المؤمنین)۔

"ہم جانتے ہیں کہ ہم نے ان کے لیے ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں کون سا حکم مقرر کیا ہے" اور ان کی مصلحتوں کا کیا تقاضا ہے"۔ (قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم وما ملکت ایمانھم)۔

اسی بناء پر اگر ہم نکاح سے متعلق کچھ مسائل میں ان کے لیے بعض مواقع پر پابندی لگا دیتے ہیں تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک حکم اور قانون باقاعدہ حساب و کتاب کے تحت ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: "یہ اس بناء پر ہے کہ (فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے سلسلے میں) آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو (اور آپ اس فریضہ کی بجا آوری میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرسکیں)"۔ (لکیلا یکون علیك حرج)۔

"اور خدا بخشنے والا رحیم ہے"۔ (وکان اللہ غفورًا رحیمًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ رسول اللہ کی ایک خصوصیت: اس میں شک نہیں کہ "حق مہر کے بغیر بیوی بنانے" کی اجازت صرف پیغمبر اکرمؐ کو ہے اور یہ آپؐ کے مختصات میں سے ہے اور آیت بھی اس مسئلے میں بالکل واضح ہے۔ اسی بناء پر کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی عورت سے مہر (تھوڑا ہو یا زیادہ) کے بغیر عقد کرے۔ حتیٰ کہ اگر صیغہ عقد جاری کرتے وقت حق مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور کسی قسم کا قرینہ بھی نہ ہو تو "مہر المثل" دینا چاہیئے۔ "مہر المثل" سے مراد وہ حق مہر ہے جو اس جیسی عورتیں مختلف نوعیتوں کے تحت عام طور پر اپنے لیے مقرر کرتی ہیں۔

۲۔ اس حکم کا خارجی مصداق: اس کلی حکم نے پیغمبر اسلام کے بارے میں کوئی خارجی مصداق بھی پیدا کیا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین مثلاً ابن عباس اور کچھ دوسرے حضرات کا نظریہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کیفیت کے ساتھ کسی عورت سے نکاح نہیں کیا اور مذکورہ بالا حکم آپ کے لیے ایک ایسا کلی حکم تھا، جس سے کبھی بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔ جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے آپ کی ان تین چار ازواج کا نام لیا ہے، جو بغیر حق مہر کے آپ کی زوجیت میں آئیں۔ وہ "میمونہ بنت حارث" اور "زینب بنت خزیمہ" جن کا تعلق

(پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ) جسے ابن العربی نے بھی نقل کیا ہے (دیکھو کنز العرفان جلد ۲ صفحہ ۲۴۱) اور آلوسی نے روح المعانی میں بھی اس وجہ کو باقی تمام وجوہات پر ترجیح دی ہے۔

انصار سے تھا، بنی اسد کی ایک خاتون "ام شریک بنت جابر" اور "خولہ بنت حکیم" تھیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب خولہ نے اپنے آپ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بخش دیا تو جناب عائشہ کی احتجاج بلند ہوئی اور انھوں نے کہا:

" مابال النساء یبذلن انفسهن بلا مهر "

ان عورتوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ حق مہر کے بغیر اپنے آپ کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیتی ہیں؟

تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی لیکن جناب عائشہ نے حضرت رسالت مآب سے کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ اللہ آپ کے مقصد کو بہت جلد پورا کر دیتا ہے (یہ آپ پر ایک قسم کی طنز تھی)۔

تو آنحضرتؐ نے فرمایا:

" وانك ان اطعت الله سارع فی هواك "

" اگر تم بھی خدا کی اطاعت کرنے لگ جاؤ تو وہ تمہارے مقصد کو بھی جلد پورا کر دے"۔[1]

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی خواتین تو صرف روحانی اعزاز حاصل کرنے کی خواہاں تھیں، جو صرف رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہی انھیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی حق مہر کے آپ کی زوجیت کے لیے آمادہ ہوگئیں، لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے کہ تاریخی طور پر اس قسم کا خارجی مصداق مسلم نہیں ہے۔ جو چیز مسلم ہے وہ صرف یہ کہ خدا نے پیغمبر اکرمؐ کو اس قسم کی اجازت دے رکھی تھی رہا یہ سوال کہ اس کا فلسفہ کیا تھا؟ تو اس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

۳۔ ہبہ اور صیغہ کا نکاح: اس آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ صیغہ نکاح کا اجرا لفظ "ہبہ" کے ساتھ صرف پیغمبر کے ساتھ مخصوص تھا اور دوسرا کوئی بھی شخص اس قسم کے لفظ سے عقد نکاح جاری نہیں کر سکتا لیکن اگر عقد کا اجرا نکاح کے لفظ کے ساتھ انجام پائے تو پھر جائز ہے کہ حق مہر کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ حق مہر کے ذکر نہ کرنے کی صورت میں "مہر المثل" ادا کرنا چاہیئے۔ (جس کی حقیقت وہی ہے جو مہر المثل کی تصریح میں گزر چکی ہے)۔

۴۔ تعدد ازواج کا فلسفہ: مذکورہ بالا آیت کا آخری جملہ واقع میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان مخصوص احکام کے فلسفے کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ پیغمبر کے کچھ ایسے مخصوص حالات ہوتے ہیں جو دوسروں کے نہیں ہوتے اور یہی فرق بعض دوسرے احکام میں بھی فرق کا سبب بن جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہ جملہ آیا ہے:

" والله ما اری ربك الا یسارع فی هواك "

" خدا کی قسم میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ خدا نے آپ کی کسی خواہش کو جلد پورا نہ کیا ہو۔

اور آلوسی نے بھی "روح المعانی" میں مذکورہ آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے، چنانچہ اس قسم کی نامناسب اور چبھتی ہوئی گفتگو کا مفہوم کسی پر پوشیدہ نہیں لیکن آنحضرت اپنی عظمت اور جلالت قدر کی وجہ سے اس موقع پر بھی بڑی خوش اسلوبی اور متانت سے گزر جاتے ہیں۔

زیادہ واضح تعبیر میں قرآن کہتا ہے: مقصد یہ تھا کہ کچھ ان احکام کے ذریعے پیغمبر کے کاندھوں سے پابندیاں اور مشکلات ہٹا دی جائیں۔ یہ ایک ایسی لطیف تعبیر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا متعدد اور مختلف قسم کی عورتوں سے شادی کرنا درحقیقت آپ کی زندگی کی اجتماعی اور سیاسی مشکلات کے ایک سلسلے کو حل کرنے کے لیے تھا۔

کیونکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ جس وقت آنحضرتؐ نے ندائے اسلام بلند کی تو اس وقت آپؐ یکہ وتنہا تھے اور بہت مدت تک سوائے معدودے چند افراد کے آپ پر کوئی بھی ایمان نہیں لایا تھا۔ آپ اپنے زمانے اور ماحول کے تمام بیہودہ اور فضول نظریات اور عقاید کے خلاف ڈٹ گئے سب نے جہاد کرنے کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا فطری طور پر اس معاشرے کے تمام قبیلے اور قوم آپ کے خلاف متحد اور متفق ہو گئے۔

اب ضروری تھا کہ دشمنوں کے اس ناپاک اتحاد کو توڑنے کے لیے آپؐ اپنے وسائل بروئے کار لاتے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف قبائل کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرتے، کیونکہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے درمیان محکم ترین رابطہ رشتہ داری کا رابطہ شمار ہوتا تھا اور کسی قبیلے کے داماد کو اس قبیلے والے ہمیشہ اپنے میں سے سمجھتے تھے اور اس کی حمایت کرنا اپنا فریضہ جانتے تھے اور اسے چھوڑ دینا گناہ تصور کرتے تھے۔

ہمارے پاس بہت سے قرائن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی یہ شادیاں بہت سے موارد میں سیاسی اہمیت کی حامل تھیں اور بعض شادیاں مثلاً زینبؓ کے ساتھ ازدواج زمانۂ جاہلیت کی غلط رسوم کو توڑنے کے لیے تھی جس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۳۷ کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہے۔

اور کچھ دوسری شادیاں متعصب لوگوں اور ہٹ دھرم قوموں کی دشمنی میں کمی کرنے یا ان سے دوستی پیدا کرنے کے لیے تھیں واضح ہے کہ جو شخص ۲۵ سال کی عمر میں جو کہ عنفوان شباب کا دور ہوتا ہے، ایک چالیس سالہ بیوہ خاتون سے شادی کرتا ہے اور ۵۳ سال کی عمر تک اسی بیوہ خاتون کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی جوانی کی بہاریں گزارنے کے بعد جب بڑھاپے کی خزاں میں قدم رکھتا ہے تو متعدد شادیاں کرتا ہے۔ تو اس کا یہ عمل یقیناً کسی فلسفے سے خالی نہیں ہے اور کسی بھی حساب سے اسے جنسی لگاؤ سے متہم نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے باوجود کہ متعدد شادیاں اس زمانے کے عربوں میں ایک عام اور معمول کا طریقہ تھا۔ بلکہ بعض اوقات پہلی بیوی دوسری بیوی کی خواستگاری کے لیے جایا کرتی تھی اور ازواج کی تعداد پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور پھر آنحضرت کے لیے عالم جوانی میں متعدد شادیاں کرنے سے نہ کوئی اجتماعی اور معاشرتی مسئلہ حائل تھا نہ مالی حالت اور نہ ہی یہ کام کسی قسم کا کوئی عیب اور نقص شمار ہوتا تھا۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ تاریخ میں ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ایک ہی "باکرہ" عورت سے شادی کی تھی، جن کا نام عائشہ ہے، باقی سب بیویاں بیوہ تھیں، جو فطری طور پر جذبات کو ابھارنے کا باعث ہرگز نہیں بن سکتی تھیں۔[1]

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۱۹۱۔

بلکہ بعض تاریخوں میں یہاں تک بھی ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقد تو بہت سی خواتین سے ہُوا، لیکن بات صرف عقد کی حد تک محدود رہی اور بس! حتیٰ کہ کئی صورتوں میں تو صرف بعض قبائل کی عورتوں کی خواستگاری کو کافی سمجھا گیا ہے۔ [1]

وہ لوگ صرف اسی حد تک خوش تھے اور فخر و مباہات کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ کی کسی عورت کو پیغمبرؐ کی زوجہ ہونے کا شرف اور اعزاز حاصل ہُوا ہے۔ اس طرح سے ان کا معاشرتی تعلق پیغمبرِ اسلام کے ساتھ مزید مستحکم ہو جاتا اور وہ آنحضرتؐ کی حمایت اور ان کا دفاع کرنے میں زیادہ مصمم ہو جاتے۔

پھر یہ کہ آنحضرتؐ یقیناً عقیم نہیں تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے جو اولاد چھوڑی ہے وہ نہایت ہی کم ہے۔ حالانکہ اگر ان عورتوں سے یہ شادیاں جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ہوتیں تو چاہیئے تھا کہ آپ کے ہاں کثیر تعداد میں اولاد ہوتی۔

نیز یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان بیویوں میں سے بعض مثلاً حضرت عائشہؓ جس وقت آنحضرتؐ کی زوجیت میں آئیں تو اس وقت بہت ہی کم سن تھیں اور کئی سال گزارنے کے بعد ایک بیوی ہونے کے قابل ہوئیں، تو یہ امر واضح کرتا ہے کہ اس قسم کی بیویوں سے شادی کرنے کا کچھ اور ہی مقصد تھا اور وہ وہی تھا، جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

اگرچہ دشمنانِ اسلام نے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد ازدواج کو اپنے مطلب کا ثبوت قرار دے کر اپنے شدید ترین معاندانہ حملوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے اور کئی جھوٹے افسانے تراشے ہیں، لیکن ایک تو متعدد ازدواج کے زمانے میں رسولِ اکرمؐ کی پیرانہ سالی، دوسرے ان خواتین کے سن اور قبائلی کیفیت اور تیسرے وہ قرائن جو ابھی بیان ہو چکے ہیں، اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں اور معاندین کی سازشوں کو طشت ازبام کر دیتے ہیں۔

---

[1] بحار الانوار جلد نمبر ۲۲ ص ۱۹۲۔

۵۱۔ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا۝

ترجمہ

۵۱۔ اپنی بیویوں میں سے جس کے (مقررہ وقت کو) آپ چاہیں مؤخر کر سکتے ہیں اور جسے چاہیں اپنے پاس ٹھہرا سکتے ہیں اور ان میں سے جن بعض کو آپ نے اپنے سے الگ کر دیا ہے، اگر چاہیں تو اپنے پاس جگہ دے دیں، آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ خدائی حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ غمگین نہ ہوں اور جو کچھ آپ انھیں دے دیں وہ اس پر راضی ہوں۔ اور خدا اس چیز کو اچھی طرح جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے اور خدا بندوں کے تمام اعمال اور ان کی مصلحتوں سے باخبر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حلیم بھی ہے اور انھیں سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

شانِ نزول

اسی سورہ کی آیت ۲۸ اور ۲۹ کی تفسیر اور ان کی شانِ نزول کے بیان میں مفسرین کے بقول پیغمبرؐ اکرم کی بعض بیویوں نے

آپ سے عرض کیا کہ ہمارے نان ونفقہ اور اخراجات میں اضافہ کیجئے۔ (چونکہ ان کی نگاہ مالِ غنیمت پر لگی ہوئی تھی اور وہ یہ چاہتی تھیں کہ انہیں اس سے زیادہ ملنا چاہیئے) اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور صراحت کے ساتھ ان کے گوش گزار کر دیا کہ اگر وہ دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہیں تو ہمیشہ کے لیے پیغمبر سے الگ ہو جائیں اور اگر خدا، رسول اور روزِ جزا کو چاہتی ہیں تو پھر اسی سادہ زندگی کے ساتھ نباہ کریں۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اوقات کی تقسیم کے بارے میں بھی ان کے درمیان رقابت موجود تھی جو پیغمبر اکرم کو تمام پریشانیوں اور اہم مصروفیات کے ساتھ ساتھ زبردست مشکلات سے دوچار کیے ہوئے تھی اگرچہ آپ ان کے درمیان ضروری عدالت قائم رکھتے، لیکن پھر بھی وہ باتوں سے باز نہ آتی تھیں، لہٰذا زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور آنحضرت کو ان کے درمیان اپنے اوقات کی تقسیم میں پوری پوری آزادی دی گئی اور ساتھ ہی انھیں بھی خبردار کیا گیا کہ یہ خدائی حکم ہے لہٰذا اس سے نہ تو کسی کو پریشانی ہو اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا غلط نتیجہ اخذ کرسکیں۔[1]

تفسیر

ایک اور مشکل آسان ہوتی ہے:

پیغمبر اسلام جیسا عظیم خدائی رہبر جو سخت حوادث اور وسائل میں گھرا ہوا ہو اور اس کے دشمن اس کے خلاف خطرناک داخلی اور خارجی سازشوں میں مصروف ہوں تو وہ اپنی شخصی اور خصوصی زندگی کی طرف اپنی فکر کو زیادہ مشغول نہیں رکھ سکتا۔ اسے اپنی گھریلو زندگی میں نسبتاً سکون اور آرام کا حامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ جن مشکلات کے انبوہ میں گھرا ہوا ہے ان کا حل سکون واطمینان سے تلاش کر سکے۔

اگر کسی انسان کی خارجی زندگی آشفتگی کا شکار ہو اور گھریلو حالات بھی توجہ اپنی طرف مبذول کیے ہوئے ہوں تو ایسے طوفانی لمحات انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ آیات کی تشریح میں ہم ثبوت پیش کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد شادیاں زیادہ تر سیاسی اجتماعی اور انسانی ہمدردی کی بناء پر تھیں اور درحقیقت کارِ رسالت کا ایک حصہ تھیں، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات عورتوں کے درمیان اختلاف اور ان کی معمول کی زنانہ رقابتیں رسول اللہ کے گھر میں ایک طوفان کھڑا کر دیتیں اور آپ کی فکر اور ذہن کو اپنی طرف مبذول کر لیتیں۔

یہی وہ منزل ہے، جہاں خدا اپنے پیغمبرؐ کو ایک اور خصوصیت عطا فرماتا ہے، جس سے روز روز کے جھگڑوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کرکے آپ کو آسودہ خاطر اور فارغ البال کر دیا گیا۔ چنانچہ اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں: اگر آپ چاہیں تو ان عورتوں میں سے

---

[1] مجمع البیان اور دوسری تفاسیر سے اقتباس۔

ہر ایک (کے وقت) کو مؤخر کرکے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھیں تو ایسا کرسکتے ہیں اور جسے چاہیں اپنے پاس جگہ دے سکتے ہیں" (ترجي من تشاء منهن وتؤوي اليك من تشاء)۔

"ترجي" "ارجاء" کے مادہ سے تاخیر کے معنی میں ہے اور "تؤوي" "ایواء" کے مادہ سے کسی شخص کو اپنے پاس جگہ دینے کے معنی میں ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ تعدد ازدواج کے سلسلے میں احکام اسلام کا حکم یہ بھی ہے کہ شوہر اپنے اوقات کو ان کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم کرے اور اگر ایک رات ان میں سے ایک کے ہاں ہے تو دوسری رات دوسری کے پاس رہے۔ اس سلسلے میں عورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس موضوع کو اسلامی فقہ میں "حق قسم" کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رسولِ اسلامؐ کے خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طوفانوں اور بحرانوں سے بھرپور زندگی کے مخصوص حالات کی بناء پر مذکورہ بالا آیت کی رُو سے "حق قسم" کی رعایت، آیت کے ذریعے آپ سے ساقط ہوگئی تھی۔ خصوصاً جب آپ مدینہ میں موجود تھے۔ بیویاں بھی متعدد تھیں اور تقریباً ہر ماہ آپ کو کسی نہ کسی مسلط کردہ جنگ کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ آیت نے آپؐ کو مکمل اختیار دے دیا کہ آپ جس طرح چاہیں اپنے اوقات کو تقسیم کردیں۔ لیکن اس اختیار کے باوجود آپؐ کوشش کرکے عدل ومساوات فرماتے، تاریخِ اسلام میں اس کی مکمل تصریح موجود ہے۔

اس خدائی حکم سے پیغمبر اکرم کی بیویوں اور آپؐ کی داخلی زندگی کے ماحول کو سکون اور آرام ملا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے "جس وقت ان میں سے بعض کو ایک طرف کردیں اور پھر چاہیں کہ انھیں اپنے پاس جگہ دیں تو بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں" (ومن ابتغيت ممن عزلت فلا جناح عليك)۔

اس طرح سے نہ صرف یہ کہ ابتداء میں آپ کو اختیار ہے، بلکہ اسے جاری اور برقرار رکھنے میں بھی آپؐ کا یہ اختیار برقرار ہے اور اصطلاح کے مطابق اس اختیار کو "تخییر استمراری" کہتے ہیں نہ کہ "تخییر ابتدائی" اور اس وسیع اور کھلے اختیارات کے حامل حکم کے بعد آپ کا اپنی بیویوں کے سلسلہ میں ہر قسم کا عذر ختم ہو جاتا ہے اور آپ اپنی فکر کو مکمل طور پر رسالت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔

ازواج پیغمبرؐ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ انھیں رسولؐ کی زوجہ ہونے کے اعزاز کے علاوہ ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ اوقات کی تقسیم کے سلسلے میں آنحضرتؐ کو جو خصوصی اختیارات حاصل ہیں، وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں، جو ایک قسم کے ایثار اور فداکاری کا کھلا ثبوت ہے اور اس طرح ان پر نہ کوئی اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور نہ ہی یہ کوئی معیوب بات ہے۔ کیونکہ انہوں نے حکم خدا کو تسلیم کیا ہے۔ خدا فرماتا ہے۔ "یہ خدائی حکم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے ہے، اور یہ کہ کبھی غمگین نہ ہوں۔ بلکہ آپ جو کچھ انہیں دیں وہ سب اسی پر راضی ہوں" (ذالك ادنٰى ان تقر اعينهن ولا يحزن ويرضين بما اٰتيتهن كلهن)۔

کیونکہ:

اولاً: یہ ان سب کے لیے ایک عمومی حکم ہے اور اس میں کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا گیا۔

ثانیاً یہ حکم خدا کی طرف سے ہے جو نہایت اہم مصلحتوں کی بناء پر جاری کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر انہیں یہ حکم خوشی خوشی قبول کرلینا چاہیئے اور پریشانی کے بجائے اظہارِ مسرت کرنا چاہیئے۔

لیکن اس کے باوجود جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوشش کرتے کہ تقسیم اوقات کے سلسلے میں عدل و مساوات کو مدنظر رکھا جائے۔ البتہ چند ایک موارد ایسے بھی ملتے ہیں کہ جہاں پر مساوات کو نظر انداز کر دیا گیا، لیکن اس کا سبب کچھ خاص اور ہنگامی حالات تھے اور یہ ازواجِ رسولؐ کی خوشنودی کا ایک اور سبب تھا۔ کہ وہ دیکھتی تھیں کہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکمل اختیارات حاصل ہیں، لیکن پھر بھی حتی الامکان مساوات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اس سلسلۂ کلام کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے: جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر ہے اسے خدا جانتا ہے اور وہ بندوں کے تمام اعمال اور مصلحتوں سے باخبر ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اور بندوں کو عذاب و سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

(واللہ یعلم ما فی قلوبکم وکان اللہ علیماً حلیماً)

جی ہاں خدا جانتا ہے کہ تم خدا کے کس حکم پر دلی طور پر راضی ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو اور کس کو ناپسند کرتے ہو؟

وہ جانتا ہے کہ تم کن بیویوں کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہو اور کن کی طرف تھوڑے مائل ہو؟ اور ایسے میلانات کے موقع پر کس طرح حکم خدا کا لحاظ کرتے ہو؟

اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون لوگ پوشیدہ جگہوں میں بیٹھ کر پیغمبرؐ کے بارے میں اس قسم کے خدائی احکام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اور دل میں بھی آپ پر معترض ہیں اور کون خندہ پیشانی کے ساتھ ان سب کو قبول کرتے ہیں۔

اس بناء پر "قلوبکم" کی تعبیر بہت وسیع ہے۔ اس میں پیغمبرِ اسلام اور ان کی بیویاں بھی شامل ہیں اور وہ تمام مومنین بھی جو ان احکام کے ناتے تسلیم و رضا کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یا اعتراض اور انکار تو کرتے ہیں، لیکن اسے ظاہر نہیں کرتے۔

کیا یہ حکم آپؐ کی سب بیویوں کے بارے میں تھا؟

اسلامی فقہ میں خصائص پیغمبر کے باب میں یہ مسئلہ زیرِ بحث چلا آرہا ہے کہ آیا بیویوں کے درمیان اوقات کی مساوی تقسیم پیغمبرِ اسلامؐ پر بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح دوسرے مومنین پر یا نہیں اور یا آپؐ استثنائی اور اختیاری حکم کے حامل ہیں؟

ہمارے تمام فقہاء اور اہلِ سنت کے کچھ فقہا کے درمیان مشہور یہ ہے کہ آپ اس حکم سے مستثنیٰ تھے، اور اس کی دلیل میں وہ زیرِ بحث آیت کو پیش کرتے ہیں، جس میں خدا کہتا ہے:

"ترجی من تشاء منهن وتؤوی الیک من تشاء"

"جسے آپ چاہیں تاخیر میں ڈال دیں اور جسے چاہیں اپنے پاس رکھ لیں۔"

کیونکہ یہ جملہ پیغمبرِ اکرمؐ کی تمام ازواج کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد آیا ہے، لہٰذا اس بات کا متقاضی ہے کہ جمع مؤنث کی ضمیر "ھنّ" ان سب کی طرف لوٹے اور اسی مطلب کو فقہا اور بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔

لیکن بعض حضرات اس ضمیر کو ان بیویوں کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، جنہوں نے حق مہر کے بغیر اپنے آپ کو رسول اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ حالانکہ اوّلاً تو تاریخی اعتبار سے یہ ثابت نہیں کہ اس حکم نے کوئی خارجی موضوع پیدا بھی کیا ہے یا نہیں؟ اور بعض کا نظریہ ہے کہ صرف ایک ہی مورد تھا۔ جس میں صرف ایک خاتون اس صورت سے رسالت مآبؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں، بہر حال اصل مسئلہ تاریخی لحاظ سے ثابت اور مسلم نہیں۔

ثانیاً یہ تفسیر ظاہرِ آیت کے خلاف ہے اور علماء نے اس آیت کی شانِ نزول کا جو ذکر کیا ہے، اس سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی بناء پر قبول کرلینا چاہیئے کہ مذکورہ بالا حکم عام ہے اور سب ازواج کے بارے میں ہے۔

۵۲۔ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ؑ

ترجمہ

۵۲۔ اس کے بعد آپ پر کوئی اور عورت حلال نہیں ہے اور نہ ہی آپ اپنی بیویوں کو دوسری بیویوں سے تبدیل کر سکتے ہیں (کہ کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی کو اس جگہ لے آئیں) ہر چند ان کا حسن و جمال آپ کو بھلا لگے، سوائے ان عورتوں کے جو کنیز کی صورت میں آپ کے ملک میں آجائیں اور خدا ہر چیز کا ناظر اور نگہبان ہے (اس طرح سے ہم نے قبائل کے اس دباؤ کو تجھ سے اٹھا لیا ہے کہ آپ ان کے ہاں سے بیوی کا انتخاب کریں)۔

تفسیر

ازواج رسولؐ کے بارے میں ایک اور اہم حکم :

اس آیت میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مربوط احکام میں سے ایک اہم حکم بیان ہوا ہے، خدا فرماتا ہے: "اس کے بعد آپ پر کوئی دوسری عورت حلال نہیں ہے اور آپ کو حق نہیں پہنچتا کہ ان بیویوں کو دوسری بیویوں سے تبدیل کر لیں۔ اگرچہ ان کا حسن و جمال آپ کو بھلا لگے، سوائے ان عورتوں کے جو کنیز کی صورت میں آپ کے اختیار

میں آجائیں اور خدا ہر چیز پر ناظر اور نگہبان ہے: (لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن الا ما ملکت یمینک وکان اللہ علی کل شیء رقیبا)۔

مفسرین اور فقہاء نے اس آیت کی تفسیر میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور اسلامی مآخذ میں بھی اس بارے میں مختلف روایات آئی ہیں۔ ہم پہلے تو اس آیت کا ظاہر مطلب بیان کریں گے جو اس سے پہلی اور بعد میں آنے والی آیات کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوتا ہے (قطع نظر اس کے کہ مفسرین اس بارے میں کیا کہتے ہیں) پھر دوسرے مطلب کی طرف جائیں گے۔

"من بعد" کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد آپ کے لیے کوئی نئی شادی حرام ہے۔ اسی بناء پر لفظ "بعد" یا "بعد زمانی" کے معنی میں ہے، یعنی اس زمانے کے بعد آپ کے لیے کوئی نئی شادی حرام ہے۔ لہٰذا کسی نئی بیوی کو انتخاب نہ کریں۔ یا بعد اس کے کہ آپ نے اپنی بیویوں کو گزشتہ حکم خداوندی کے مطابق اختیار دے دیا ہے کہ یا تو آپ کے گھر میں سادہ زندگی گزاریں یا پھر علیحدہ ہو جائیں تو انھوں نے اپنی مرضی سے آپ کی زوجیت کو ترجیح دی ہے، تو اب اس کے بعد کسی اور عورت سے آپ کو شادی نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی ان میں سے کسی کو طلاق دے کر کسی اور بیوی کو اختیار کریں۔ بالفاظ دیگر نہ تو ان کی تعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی موجودہ بیویوں کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ اس حکم کا فلسفہ : یہ حد بندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کوئی نقص شمار نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک ایسا حکم ہے جس کا فلسفہ بہت ہی گہرا ہے، کیونکہ تاریخی شواہد کی بناء پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختلف افراد اور قبائل کی جانب سے مسلسل زور دیا جا رہا تھا کہ آپ اپنی زوجیت کے لیے ان کا رشتہ قبول فرمائیں اور مسلمان قبائل کا ہر شخص اس بات پر فخر محسوس کرتا تھا کہ ان کے خاندان کی کوئی عورت پیغمبر اسلام سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو، یہاں تک کہ جیسا ابھی بیان ہو چکا ہے کہ بعض عورتیں حق مہر کے بغیر تیار رہتیں کہ اپنے آپ کو "ھبہ" کے عنوان سے آنحضرتؐ کے حلقہ ازدواج میں دے دیں اور غیر مشروط طور پر آپؐ سے شادی کریں۔

البتہ ان قبائل سے رشتہ ازدواج ایک حد تک آنحضرتؐ کی ذات اور ان کے سیاسی، سماجی اور اجتماعی مقاصد کے لیے گرہ کشا تھا، لیکن فطری بات ہے کہ کوئی چیز اگر حد سے گزر جائے تو خود ایک مشکل بن جاتی ہے، چونکہ ہر قبیلے کی یہی خواہش تھی کہ آپؐ کو رشتہ دیں اور اگر نبیٔ اکرمؐ بھی ان سب کی خواہشات کو پورا کرنے لگ جاتے اور کچھ عورتوں کو صرف عقد کی صورت میں نہ کہ شادی اور بیاہ کی شکل میں اپنے دائرہ اختیار میں لے آتے تو اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اسی لیے تو خدائے حکیم ایک محکم قانون کے ذریعے آپ کو اس اقدام سے روک رہا ہے اور ہر قسم کے نئے ازدواج یا موجودہ عورتوں کی تبدیلی سے منع کر رہا ہے۔

اس دوران میں شاید کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے یہ بہانہ بناتے تھے کہ آپ کی بیویاں عام

طور پر بیوہ ہیں اوران میں سن رسیدہ خواتین بھی پائی جاتی ہیں۔ جو حسن و جمال سے محروم ہیں، لہذا مناسب ہے کہ آپ کسی حسین و جمیل عورت سے شادی کریں ۔قرآن خاص کر اس مسئلے کو مدنظر رکھ کر یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ اگر صاحب جمال عورتیں بھی ہوں تب بھی آپ ان سے حق ازدواج نہیں رکھتے۔

علاوہ ازیں حق شناسی کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ آپ کی بیویوں نے آپ کے ساتھ جس وفا کا ثبوت دیا اور دنیا کی ہر چیز پر سادہ اور روحانی زندگی کو ترجیح دی، خدا ان کے مقام کی حفاظت کے لیے پیغمبر اکرم کو اس قسم کا حکم دے رہا ہے۔

باقی رہا کنیزوں کے بارے میں آنجناب کا مجاز و مختار ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور پاک درحقیقت آزاد عورتوں کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا تھے۔ لہذا اس امر کی ضرورت نہیں تھی کہ اس حکم کو کنیزوں کے بارے میں بھی محدود کر دیا جائے۔ اگرچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس استثناء سے بھی استفادہ نہیں کیا گیا۔

یہ تھا وہ مفہوم جو آیت کے ظاہر سے واضح ہوتا ہے۔

۲۔ مخالف روایات:

متعدد روایات میں سے بعض تو سند کے لحاظ سے ضعیف اور بعض قابلِ غور ہیں ان کے مطابق "لا یحل لک النساء من بعد" کا جملہ ان عورتوں کی طرف اشارہ ہے، جن کی تحریم سورۂ نساء کی آیہ ۲۳ اور ۲۴ میں بیان ہو چکی ہے (یعنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہ) ان روایات کے بعض کے ذیل میں یہ صراحت ہوئی ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کچھ عورتیں تو دوسرے لوگوں پر حلال ہوں، لیکن وہی رسالت مآبؐ پر حرام ہوں؟ کوئی عورت آپ پر حرام نہیں سوائے ان کے جو سب پر حرام ہیں۔ [1]

البتہ بعید نظر آتا ہے کہ یہ آیت ان آیات کی طرف اشارہ ہو جو سورۂ نساء میں گزر چکی ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "من بعد" سے مراد سورۂ نساء میں حرام شدہ عورتوں کے علاوہ ہے۔

اس بناء پر بہتر یہی ہے کہ ان روایات کی تفسیر سے چشم پوشی اختیار کی جائے جو اخبار احادیث میں سے ہیں اور اصطلاحی الفاظ میں "اس کا علم اس کے اہل یعنی معصومینؑ پر چھوڑ دیں"، کیونکہ وہ روایات ظاہر آیات کے ساتھ میل نہیں کھاتیں اور ہمیں آیت کے ظاہر پر عمل کرنے کا حکم ہے اور مذکورہ اخبار و روایات ظنی ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بہت سے حلقوں کا نظریہ ہے کہ زیر بحث آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہر قسم کی نئی شادی کرنے کو حرام قرار دیا، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور آپ کو ازدواج کی اجازت مل گئی۔ لیکن آپؐ نے اس سے استفادہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہ اس آیت "انا احللنا لک ازواجک اللاتی اتیت اجورھن ..." کو مذکورہ حکم کا ناسخ مانتے ہیں جو زیر بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ لیکن ان کا نظریہ ہے کہ اگرچہ وہ آیت قرآن میں اس سے پہلے لکھی ہوئی ہے لیکن نازل اس کے بعد ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ فاضل مقداد "کنز العرفان" میں نقل کرتے ہیں کہ علماء کے درمیان مشہور فتویٰ اور نظریہ یہی ہے۔ [2]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۹۴، ص ۲۹۵۔

[2] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۴۴۔

یہ نظریہ ایک تو مذکورہ بالا روایات کے ساتھ واضح تضاد رکھتا ہے۔ دوسرے ظاہر آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ آیات کا ظاہر بتاتا ہے کہ "انا احللنا لک ازواجک" والی آیت زیرِ بحث آیت سے پہلے نازل ہوئی ہے اور نسخ کا مسئلہ قطعی و یقینی دلیل کا محتاج ہے۔

بہرحال آیت کے ظاہر سے زیادہ قابلِ اطمینان اور واضح ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے اور آیت کے مطابق ہر قسم کی نئی شادی یا بیویوں کی تبدیلی، اس اوپر والی آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اکرم کے لیے حرام ہو گئی تھی اور اس حکم میں بہت بڑی مصلحت پوشیدہ ہے، جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

۳۔ آیا نکاح سے پہلے عورت کو دیکھا جا سکتا ہے؟

مفسرین کی ایک جماعت نے "ولو اعجبک حسنھن" کے جملے کو اس مشہور حکم کی دلیل سمجھا ہے جس کی طرف اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی عورت سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اسے نکاح سے پہلے اس حد تک دیکھ سکتا ہے کہ جس سے اس کی شکل صورت اور جسمانی ساخت واضح ہو سکے۔

اور اس حکم کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اچھی طرح دیکھ بھال کر اپنی بیوی کا انتخاب کر سکے تاکہ بعد کی ندامت اور پشیمانی سے بچ جائے جس سے عہد و پیمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے فرمایا؛

جو شادی کرنا چاہتا تھا۔

"انظر الیھا فانہ اجدر ان یدوم بینکما"

"پہلے سے اس عورت کو دیکھ لیں، کیونکہ یہ چیز سبب بنے گی کہ تمہارے درمیان مودت اور الفت پائدار رہے۔" [1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا:

"کیا مرد کسی عورت کے ساتھ شادی کرنے کی غرض سے اسے غور سے دیکھ سکتا اور اس کے چہرے اور پشت کی طرف نگاہ کر سکتا ہے؟

تو فرمایا:

"نعم لا بأس ان ینظر الرجل الی المرأۃ اذا اراد ان یتزوجھا ینظر الی خلفھا والی وجھھا"

"ہاں کوئی حرج نہیں کہ جس وقت انسان کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے اسے دیکھ لے اور اس کے چہرے اور پشت کی طرف نگاہ کرے۔ [2]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۲۳۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۴ ابواب مقدمات النکاح باب ۳۶ حدیث ۴۔

البتہ اس سلسلے میں احادیث بہت موجود ہیں۔ لیکن بعض میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اس موقع پر شہوت اور لذت کی غرض سے نگاہ نہیں ہونی چاہیئے۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ حکم ان مواقع کے ساتھ مخصوص ہے، جب انسان واقعاً اس عورت کے بارے میں تحقیقات کرنا چاہے کہ اگر اس میں مطلوبہ شرائط پائی جائیں تو اس سے شادی کرے گا، لیکن اگر کسی نے ابھی تک شادی کا فیصلہ ہی نہیں کیا، تو وہ صرف شادی کے احتمال یا جستجو کے نام پر عورتوں کی طرف نظر نہیں کر سکتا۔

البتہ بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ ان نگاہوں کی طرف اشارہ ہے، جو اتفاقیہ طور پر کسی عورت پر جا پڑتی ہیں تو اس صورت میں یہ آیت مذکورہ حکم پر دلالت نہیں کرے گی، بلکہ اس حکم کا مسلک صرف روایات ہوں گی۔ لیکن "ولو اعجبك حسنهن" (اگرچہ ان کا حسن آپ کو بھلا معلوم ہو) کا جملہ اتفاقیہ اور غیر ارادی نگاہوں کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی دلالت اس سے پہلے والے حکم پر بعید نظر نہیں آتی۔

۵۳۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ۚ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ○

۵۴۔ إِنْ تُبْدُوا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ○

ترجمہ

۵۳۔ اے ایمان لانے والو! پیغمبر کے گھروں میں داخل نہ ہونا، مگر یہ کہ تمھیں کھانا کھانے کی اجازت دی جائے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مقررہ

وقت سے پہلے نہ آؤ اور) کھانے کے وقت کی انتظار میں نہ بیٹھو، لیکن جب تمہیں دعوت ہو تو داخل ہو جاؤ اور جس وقت کھانا کھالو تو نکل جاؤ اور (کھانا کھا لینے کے بعد) بحث و مباحثہ اور باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھو۔ یہ عمل پیغمبر کو پریشان کرتا ہے مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں لیکن خدا حق (کے بیان کرنے) سے نہیں شرماتا اور جس وقت وسائل زندگی میں سے کوئی چیز (عاریتاً) ان (رسول کی بیویوں) سے طلب کرو تو درمیان میں پردہ حائل ہونا چاہیئے یہ کام تمہارے اور ان کے دل کو زیادہ پاک رکھتا ہے۔ اور تم حق نہیں رکھتے کہ پیغمبر خدا کو آزار (واذیت) پہنچاؤ اور نہ ہی کبھی ان کے بعد ان کی بیویوں کو اپنی زوجیت میں لانا، کیونکہ یہ کام خدا کے نزدیک بہت بڑی جسارت ہے۔

۵۴۔ کسی چیز کو ظاہر کرو یا مخفی رکھو، خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں مفسرین نے یوں نقل کیا ہے:

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب بنت جحش سے ازدواج کے موقع پر دعوت ولیمہ کا اچھا خاصا بندوبست کیا۔ (ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ اہتمام اس بنا پر تھا، تاکہ زمانۂ جاہلیت کی اس غلط رسم کو توڑا جائے جو منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی کے ساتھ نکاح کی حرمت کے سلسلہ میں تھی اور اس رسم کو دو ٹوک اور فیصلہ کُن انداز میں ختم کر دیا جائے تاکہ معاشرے میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو جائے۔ نیز زمانۂ جاہلیت کی اس غلط رسم کو بھی ختم کر دیا جائے کہ آزاد کردہ غلاموں کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح معیوب ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص خادم انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ میں آپؐ کے اصحاب کو کھانے کی دعوت دوں، چنانچہ میں نے سب کو دعوت دی اور وہ ٹولیوں کی صورت میں آ کر کھانا کھاتے اور حجرے سے باہر نکل جاتے۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اب کوئی شخص باقی نہیں رہ گیا ہے کہ جسے میں نے دعوت دی ہو اور وہ نہ آیا ہو۔ تو آپؐ نے

فرمایا کہ بس ٹھیک ہے، اب دسترخوان بڑھاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو سب لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ لیکن تین افراد اسی طرح آپؐ کے حجرے میں بیٹھے رہے اور بحث و مباحثہ اور گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ جب ان کی گفتگو لمبی ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں بھی آپ کے ہمراہ کھڑا ہو گیا تاکہ وہ لوگ متوجہ ہو جائیں اور اُٹھ کر چلے جائیں، پیغمبر اکرمؐ باہر آ گئے حتیٰ کہ جناب عائشہ کے حجرے تک پہنچ گئے اور پھر لوٹ گئے۔ میں بھی آپ کی خدمت میں آیا اور دیکھا کہ وہ لوگ اسی طرح بیٹھے ہوئے ہیں تو زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور اس قسم کے مسائل کے سلسلے میں ضروری احکام کی تعلیم دی۔ [1]

نیز بعض قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ہمسائے اور کبھی دوسرے لوگ معمول کے مطابق چیزیں عاریتاً لینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض بیویوں کے پاس آتے۔ اگرچہ وہ اس زمانے کی سادہ زندگی کے مطابق کسی غلط کام کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، لیکن ازواجِ رسول کی قدر و منزلت کے پیشِ نظر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اور مومنین کو حکم دیا گیا کہ جب رسول اللہؐ کے ہاں ان کی کسی بیوی سے کوئی چیز لینا چاہیں تو پردے کی اوٹ سے لیں۔

ایک اور روایت میں ہے:

رسول اللہؐ کے بعض مخالفین نے کہا:

"پیغمبرؐ کیونکر ہماری بعض بیوہ عورتوں کو اپنے نکاح میں لے آئے ہیں۔ لہٰذا جب اس دُنیا سے ان کی آنکھیں بند ہوں گی تو ہم ان کی بیویوں سے شادی کریں گے۔"

اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور آپؐ کے بعد آپؐ کی بیویوں سے شادی کی کلی طور پر ممانعت کر دی گئی اور اس سازش کو بھی ناکام بنا دیا گیا۔ [2]

تفسیر

اس آیت میں ایک بار پھر روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور کچھ مزید احکام خصوصاً جو پیغمبرِ اکرمؐ اور خاندان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاشرت کے آداب سے متعلق ہیں۔ مختصر، واضح اور صریح جملوں میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ پیغمبرؐ کے گھروں میں بغیر اجازت کے ہرگز داخل نہ ہونا مگر جب تمہیں کھانا کھانے کے لیے اجازت دی جائے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ صحیح وقت پر آؤ نہ یہ کہ پہلے سے آ جاؤ اور کھانے کے وقت کے انتظار میں بیٹھے رہو۔ (یا ایها الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یؤذن لکم الی طعام غیر ناظرین اناه)۔ [3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۶۶ آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۳۶۶ و صفحہ ۳۶۸۔

[3] "اناه" "انی یأنی" کے مادہ سے کسی چیز کا موقع آ جانے کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر کھانے کی تیاری کے معنی میں ہے۔

قرآن اس طرح سے معاشرت کے ایک اہم ادب کو بیان کرتا ہے اور وہ بھی ایسے ماحول میں جہاں پر اس کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ گفتگو پیغمبر اکرمؐ کے گھر کے بارے میں ہے، لیکن مسلّم ہے کہ یہ حکم آپؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی موقع پر کسی کے گھر میں بھی بغیر اجازت کے داخل نہیں ہونا چاہیئے (جیسا کہ سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں بھی آیا ہے) حتیٰ کہ خود پیغمبر اکرمؐ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ جس وقت اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر میں جاتے تو باہر کھڑے ہو کر اجازت لیتے، بلکہ ایک دن جابر بن عبداللہ انصاری آپؐ کے ساتھ تھے، جہاں آپؐ نے اپنے لیے اجازت مانگی وہاں جابر کے لیے بھی اجازت طلب کی اور پھر اندر گئے۔[1]

علاوہ ازیں جس وقت مدعوئین کو کھانے کی دعوت ہو تو انہیں وقت شناس ہونا چاہیئے اور بے موقع و محل صاحب خانہ کے لیے اسباب زحمت فراہم نہیں کرنے چاہئیں۔

اس کے بعد دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "لیکن جب تمہیں دعوت دی جائے تو اندر جاؤ اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو نکل جاؤ"۔ (ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا)۔

یہ حکم درحقیقت گزشتہ حکم کی تاکید اور تکمیل ہے۔ یعنی نہ تو اس گھر میں بے وقت داخل ہونا چاہیئے، جہاں دعوت دی گئی ہے اور نہ ہی دعوت قبول کرنے میں بے پرواہی سے کام لینا چاہیئے اور نہ ہی کھانا کھا لینے کے بعد بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کی خلاف ورزی میزبانی کے لیے موجب زحمت ہے اور اخلاقی اصولوں کے بھی خلاف ہے۔

تیسرے حکم میں فرمایا گیا ہے: "کھانا کھا لینے کے بعد دل لگی اور گفتگو کی مجلس پیغمبرؐ کے گھر میں (اور کسی بھی دوسرے میزبان کے گھر میں) نہ جماؤ"۔ (ولا مستأنسین لحدیث)۔

البتہ ممکن ہے کہ خود میزبان اس قسم کی مجلس خلوص و محبت کا خواہاں ہو تو ایسی صورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے، گفتگو اس کی ہے جہاں صرف کھانا کھانے کی دعوت دی گئی ہے نہ کہ گپ شپ کی۔ تو اس قسم کے مقام پر کھانا کھا لینے کے بعد مجلسوں کو ترک کر دینا چاہیئے خصوصاً جبکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جیسا گھر ہو۔ جو عظیم ترین خدائی فرائض کے انجام پانے کا مرکز ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے مقام پر اسباب زحمت فراہم نہ کیے جائیں، جن سے وقت ضائع ہو۔ اس کے بعد اس حکم کی علت کو یوں بیان کیا گیا ہے "یہ کام پیغمبر خدا کو اذیت و آزار پہنچاتا ہے، مگر وہ تم سے شرم کرتے ہیں۔ لیکن خدا حق بیان کرنے میں رورعایت سے کام نہیں لیتا"۔ (ان ذالکم کان یؤذی النبی فیستحیی منکم واللہ لایستحیی من الحق)۔

البتہ رسول اللہ بھی ایسے مواقع پر بیان کرنے میں رورعایت نہیں کرتے جو ذاتی نہیں ہوتے، کیونکہ یہ اچھا نہیں لگتا کہ انسان اپنے بارے میں آپ بات کرے۔ البتہ دوسروں کے بارے میں ہو تو بات کرنا بھی مناسب ہوتا ہے۔

یہ آیت بھی ایسے ہی موقع کی مناسبت سے ہے۔ اخلاقی اصولوں کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا دفاع خود نہ کریں بلکہ خدا ان کا دفاع کرے۔

---

[1] کافی جلد ۵ صفحہ ۵۲۸۔

پھر چوتھا حکم پردے کے سلسلے میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: "جس وقت ازواج رسول سے ضروریات زندگی کی کوئی چیز طلب کرنا چاہو تو پردہ کی اوٹ میں طلب کرو"۔ (واذا سألتموھن متاعًا فاسئلوھن من وراء حجاب)۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربوں اور بہت سے دوسرے لوگوں میں سے معمول تھا کہ بوقت ضرورت ضروریات زندگی کی چیزیں وقتی طور پر ہمسایوں سے عاریتاً لی جاتی تھیں اور پیغمبرؐ اکرم کا گھر بھی اس طریقہ کار سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ کبھی کبھار لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے بھی چیزیں عاریتاً لے لیتے۔ واضح رہے کہ ازواج رسولؐ کا لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آنا اگرچہ اسلامی حجاب کے ساتھ ہی، کوئی اچھی بات نہیں تھی، لہٰذا حکم ہو گیا کہ آئندہ کے لیے یا تو پردہ کے پیچھے سے آ کر چیز لیا کریں۔ یا پھر دروازے کے پیچھے سے۔

یہاں پر جو نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں "حجاب" سے مراد عورتوں کا عام پردہ نہیں ہے۔ بلکہ اس پر ایک اضافی حکم ہے جو ازواج رسولؐ کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ یہ کہ لوگ اس بات کے پابند تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی حرمت کے پیش نظر جب کبھی آپ کی بیویوں سے کوئی چیز لینا چاہیں تو پردے کے پیچھے سے لیا کریں اور ازواج رسولؐ پردے کے ساتھ بھی لوگوں کے سامنے نہ آیا کریں۔

البتہ یہ حکم صرف ازواج رسولؐ سے مختص ہے اور عام عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی وہ اسلامی حجاب کے ساتھ عام لوگوں کے سامنے آ سکتی ہیں۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ لفظ "حجاب" روزمرہ کے استعمال میں عورت کے پردے کے معنی میں آتا ہے، لیکن لغت میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے فقہاء نے اسے اس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

"حجاب" لغت میں اس چیز کے معنی میں ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔[1]

اسی بنا پر جو پردہ انتڑیوں، دل اور پھیپھڑے کے درمیان موجود ہے اسے "حجاب حاجز" کا نام دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ ہر جگہ پردہ یا رکاوٹ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۴۵ میں ہے:

"جعلنا بینك وبین الذین لا یؤمنون بالاٰخرة حجابًا مستورًا"۔

"ہم نے تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے پوشیدہ: دیا ہے"۔

سورۂ صٓ کی آیہ ۳۲ میں ہے:

"حتّٰی توارت بالحجاب"

"یہاں تک کہ سورج افق کے پردے کے پیچھے پنہاں ہوا"۔

نیز سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں آیا ہے:

"وما کان لبشر ان یکلّمه اللّٰه الّا وحیًا او من ورائ حجاب"۔

---

[1] لسان العرب مادہ "حجب"۔

"کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے، مگر وحی کے ذریعے یا پس پردہ (غیب) سے۔"

فقہاء کے کلمات میں قدیم الایام سے اب تک عورتوں کے پردے کے بارے میں عام طور پر "ستر" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اسلامی روایات میں بھی یہی یا اس سے ملتی جلتی تعبیر آئی ہے اور عورتوں کے پردے کے بارے میں لفظ "حجاب" کا استعمال ایسی اصطلاح ہے جو زیادہ تر ہمارے زمانے میں رائج ہوئی ہے اور اگر کسی تاریخ میں یا روایت میں بھی مل جائے تو بہت کم ایسا ہوگا۔

دوسرا شاہد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصوصی خادم انس بن مالک کہتے ہیں کہ میں اس آیت حجاب کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہوں۔ کیونکہ جب جناب زینب کی پیغمبر اکرم سے شادی ہوگئی اور وہ آپ کے گھر میں آگئیں تو آپ نے دعوتِ ولیمہ کا بندوبست کیا، لوگوں نے کھانا کھا لیا، لیکن کچھ لوگ کھانا کھانے کے بعد اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

یا ایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی ۔ تا ۔ من وراء حجاب۔

تو اس وقت پردہ ڈال دیا گیا اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے[1]

ایک اور روایت میں انس کہتے ہیں:

"ارخی الستر بینی و بینہ"

"پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور لوگوں نے جب یہ دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور منتشر ہوگئے۔"[2]

اسی بناء پر اسلام نے مسلمان عورتوں کو پردہ نشینی کا حکم نہیں دیا اور عورتوں کے بارے میں "پردہ نشین" یا اس قسم کی دوسری تعبیریں اسلامی حیثیت نہیں رکھتیں، جو کچھ کسی مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے، وہی اسلامی پردہ ہے، لیکن ازواج رسول کا معاملہ کچھ اور ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بہت زیادہ تھے اور مفاد پرست ٹولہ اسی ٹوہ میں لگا رہتا تھا کہ کوئی موقع ہاتھ لگے اور ازواجِ رسول کو اپنی تہمت کا نشانہ بنائیں، تاکہ اس طرح سے سیاہ دل لوگوں کے ہاتھ میں دستاویز آجائے۔ لہٰذا انھیں یہ خاص حکم دیا گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں اُمت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ازواج رسول سے کوئی چیز طلب کرتے وقت ان سے پردے کی اوٹ میں بات کیا کریں۔ خصوصاً "وراء" کی تعبیر اس معنی کی گواہ ہے۔

اسی لیے قرآن مجید اس حکم کے بعد اس کے فلسفے کو یوں بیان کرتا ہے۔ "یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے بہتر ہے"۔ (ذالکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن)۔

اگرچہ تعلیل کی یہ قسم استحبابی کے منافی نہیں لیکن "فاسئلوھن" میں امر کے وجوب میں ظہور کو بھی متزلزل نہیں کرتی کیونکہ اس قسم کی تعلیل بعض اوقات دوسرے واجب احکام میں بھی آئی ہے۔

پانچویں حکم کو اس صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ تم حق نہیں رکھتے کہ رسول خدا کو تکلیف پہنچاؤ (وما کان لکم

[1] صحیح بخاری جلد ۷ ص ۱۴۹۔

[2] صحیح بخاری جلد ۷ ص ۱۴۹۔

ان تؤذوا رسول اللہ)۔

اگرچہ اذیت ناک اور تکلیف دہ عمل خود اسی آیت میں بیان ہوگیا ہے اور وہ ہے بے موقع و محل پیغمبرِ اسلامؐ کے گھر جانا، کھانا کھا لینے کے بعد بیٹھ جانا اور ان کے لیے مشکلات پیدا کرنا اور شانِ نزول والی روایات میں بھی آیا ہے کہ بعض دل کے اندھوں نے قسم کھائی تھی کہ آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کی بیویوں سے عقد کریں گے یہ ایک اور تکلیف دہ بات تھی۔ لیکن آیت کا مفہوم ہر حالت میں عام ہے اور ہر قسم کی تکلیف اور اذیت پہنچانے سے منع کرتا ہے۔

آخر میں چھٹا اور آخری حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج کے ساتھ شادی کی حرمت کے بارے میں یوں بیان ہوا ہے: "تم ہرگز یہ حق نہیں رکھتے کہ رسول اللہ کے بعد آپ کی بیویوں کو اپنے حلقہ ازدواج میں لاؤ، کیوں کہ یہ کام خدا کے نزدیک بہت بڑی جسارت والا ہے" (ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا ان ذالکم کان عند اللہ عظیما)۔

یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا نے کس طرح پیغمبر اکرم کی بیویوں کو آپ کے بعد شادی کے حق سے محروم کر دیا۔ جبکہ بوقت وفات آپ کی کچھ بیویاں جوان بھی تھیں؟

اس سوال کا جواب حرمت کے فلسفے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ:

اوّلاً۔ جیسا کہ آیت کی شان نزول سے معلوم ہو چکا ہے کہ بعض لوگ آنحضرتؐ سے انتقام لینے اور آپ کی ذاتِ اقدس کی توہین کرنے کے لیے اس قسم کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ آنحضرت کی عزت اور عظمت پر ضرب لگائیں۔

ثانیاً۔ اگر یہ مسئلہ جائز ہوتا تو کچھ لوگ رسول اکرمؐ کی بیوہ کو اپنے حلقۂ زوجیت میں لے آنے کے بعد ممکن تھا کہ اس اقدام سے ناجائز مفاد حاصل کرتے اور اسے وہ معاشرے میں اپنی جھوٹی شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے یا اس عنوان سے کہ رسول اللہ کے گھریلو حالات سے باخبر ہیں اور ان کی تعلیمات اور مکتب کی خصوصی معلومات انھیں حاصل ہیں۔ لہٰذا اسلام میں تحریف کا ارتکاب کرتے۔ یا منافق لوگ، معاشرے میں ایسی باتیں پھیلانا شروع کر دیتے جو آنحضور کے شایانِ شان نہ تھیں۔ (غور کیجیے گا)

اس متوقع خطرے کو اس وقت تقویت ملتی ہے، جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے بالکل تیار کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اس کا زبانی طور پر اظہار بھی کر دیا تھا اور کچھ لوگوں نے شاید ابھی دل میں رکھا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں جن اشخاص کا بعض اہل سنت مفسرین نے یہاں پر نام لیا ہے ان میں سے ایک طلحہ بھی تھا۔[1]

وہ خدا جو نہاں اور آشکارا اسرار سے آگاہ ہے، اس نے اس قبیح سازش کو ظاہر کرنے کے لیے ایک فیصلہ کن حکم صادر فرما دیا، جس سے ان تمام امور کا مکمل طور پر سدباب ہوگیا۔ اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے ازواج رسولؐ کو

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۵۲۱۰۔

"ام المومنین" کا لقب دے دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ ان سے عقد کرنا اپنی ماں سے ازدواج کرنے کے مترادف ہے۔

مذکورہ وجوہات کی بنا پر واضح ہو جاتا ہے کہ ازواجِ رسولؐ پر کیوں واجب قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ اس محرومیت کو خوشی خوشی گلے لگائیں؟

انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے اہم مسائل پیش آجاتے ہیں، جن کی خاطر اسے فداکاری اور قربانی کی مثالیں قائم کرنا پڑتی ہیں اور اپنے بعض مسلّم حقوق سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے، خاص طور پر جب عظیم اعزازات کے ساتھ عظیم اور سنگین ذمہ داریاں بھی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ازواجِ رسولؐ نے جب آپ سے عقد کر لیا تو انھیں ایک نہایت ہی عظیم اعزاز مل گیا. جب اس قدر عظیم اعزاز انہیں نصیب ہو گیا تو انہیں اسی قدر ایثار د قربانی کا مظاہرہ بھی کرنا چاہیئے تھا۔

اسی بنا پر ازواجِ رسولؐ، آپؐ کے بعد اسلامی اُمّہ کے درمیان نہایت ہی قابلِ احترام زندگی بسر کرتی رہیں اور اپنی اس کیفیت سے بہت ہی خوش تھیں اور نئے ازدواج سے محرومی کو اس اعزاز کے مقابلے میں حقیر اور ناچیز سمجھتی تھیں۔

خداوندِ عالم دوسری آیت میں لوگوں کو بڑی سختی کے ساتھ خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے "اگر کسی چیز کو تم آشکار اور ظاہر کرو یا مخفی رکھو، خدا بہرحال ان تمام امور سے آگاہ ہے" (ان تبدوا شیئًا او تخفوہ فان اللہ کان بکل شیءٍ علیمًا)۔

یہ گمان نہ کرو کہ خدا اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں اذیت ناک اور تکلیف دہ منصوبوں سے باخبر نہیں، وہ تو ان سے بھی باخبر ہے جنہوں نے دل کا حال زبان پر جاری کیا ہے اور ان سے بھی جو دل میں رکھتے تھے، غرض کہ سب کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور وہ ہر شخص سے اس کے کام اور نیت کے مطابق سلوک کرے گا۔

چند نکات

چونکہ زیرِ بحث آیات میں رسولِ پاکؐ کی طرف سے ایک دعوت کے اس موقعے پر مسلمانوں کے کچھ فرائض کا ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "مہمان نوازی، مہمان کا حق اور میزبان کے فرائض" کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات کا ایک گوشہ بیان کیا جائے۔

۱۔ مہمان نوازی: اسلام مہمان نوازی کے مسئلے کو خاص اہمیت دیتا ہے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

" الضیف دلیل الجنۃ "

مہمان جنت کا راہنما ہے۔[1]

مہمان کی اہمیت اور احترام اس قدر زیادہ ہے کہ اسلام میں اسے ایک آسمانی ہدیہ کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے،

[1] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۴۶۰ (حدیث ۱۴) باب ۹۴۔

ارشادِ پیغمبرؐ ہے:

" اذا اراد اللہ بقوم خیرا اھدی الیھم ھدیۃ،

قالوا وما تلک الھدیۃ؟

قال الضیف، ینزل برزقہ، ویرتحل بذنوب اھل البیت۔"

"جب خدا کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو اس کی طرف انمول تحفہ بھیج دیتا ہے۔"

"لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ انمول تحفہ کیا ہے۔

فرمایا مہمان، جو اپنا رزق لے کر آتا ہے اور گھر والوں کے گناہ لے کر جاتا ہے اور وہ بخشے جاتے ہیں۔[1]

قابلِ توجہ یہ ہے کہ کسی نے پیغمبرِ اکرمؐ سے عرض کیا:

میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں۔ میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ مکمل وضو کرتا ہوں، نماز قائم کرتا ہوں، زکوٰۃ برمحل ادا کرتا ہوں اور مہمان کی خندہ پیشانی سے خدا کی خوشنودی کے لیے تواضع کرتا ہوں۔

تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

" بخ، بخ، بخ، ما لجھنم علیک سبیل ان اللہ قد برأک من الشح ان کنت کذلک۔"

"کیا کہنا، مرحبا، واہ واہ، جہنم کے راستے تم پر بند ہیں اور اگر تیری حالت یہی ہے تو خدا نے تجھے ہر قسم کے بخل سے پاک کر دیا ہے۔"

اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن اختصار کو مدِنظر رکھ کر اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۔ میزبانی میں سادگی: اس ساری اہمیت کے باوجود جو مہمان کو حاصل ہے، پرتکلف اور انواع و اقسام کے کھانے کھلانا اسلام کی نظر میں نہ صرف یہ کہ اچھا کام نہیں، بلکہ باقاعدہ طور پر اس سے منع بھی کیا گیا ہے۔ اسلام کا یہ حکم ہے کہ میزبانی اور خاطر تواضع سادہ قسم کی ہو اور اس نے مہمانی اور میزبانی کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کے طور پر ایک نہایت ہی منصفانہ حد بندی کر دی ہے اور وہ یہ کہ میزبان کے پاس جو کچھ موجود ہے اس سے پہلوتہی نہ کرے اور مہمان بھی اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھے۔ اسی سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

" المؤمن لا یحتشم من اخیہ، وما ادری ایھما اعجب؟ الذی یکلف اخاہ اذا دخل علیہ ان یتکلف لہ، او المتکلف لاخیہ؟

"مومن اپنے مومن بھائی کے ساتھ بے تکلف ہوتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ ان دو میں سے کون سا شخص زیادہ عجیب ہے، آیا وہ جو اپنے بھائی کے پاس جا کر اسے تکلف میں ڈال دیتا ہے یا وہ جو خود سے مہمان کے

[1] بحار الانوار جلد ۷۵، صفحہ ۴۶۱ (حدیث ۱۴) باب ۹۴۔

سے تکلف میں پڑجاتا ہے؟ [1]

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"ان لانتکلف للضیف مالیس عندنا وان نقدم الیہ ماحضرنا"

"جو چیز ہمارے پاس نہیں ہے اس کے لیے مہمان کے واسطے تکلف نہ کریں اور جو موجود ہے اس سے پہلوتہی نہ کریں"۔ [2]

۳- مہمان کا حق: ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مہمان ایک آسمانی تحفہ اور خدائی عنایت ہے۔ اس کی عزت بھی اسی طرح کرنا چاہیئے، جس طرح اپنی عزت کی جاتی ہے اور اس کے بارے میں انتہائی احترام ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے حتیٰ کہ امیرالمومنین علیہ السلام پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ:

"من حق الضیف ان تمشی معہ فتخرجہ من حریمک الی البرّ"

"مہمان کے حقوق میں سے یہ ہے کہ اسے خدا حافظ کہنے کے لیے گھر کے دروازے تک جائیں۔" [3]

اور تکلف میں پڑے بغیر اس کے آرام و آسائش کے وسائل فراہم کیے جائیں۔ حتیٰ کہ ایک حدیث میں ہے کہ:

"قال رسول اللّٰہ ان من حق الضیف ان یعدلہ الخلال۔" [4]

"مہمان کے حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے خلال تک مہیا کریں۔"

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مہمان کم گو اور شرمیلے ہوتے ہیں اسی بنا پر حکم دیا گیا ہے کہ ان سے کھانا کھانے کے بارے میں نہ پوچھا جائے بلکہ دسترخوان بچھا دیا جائے، اگر ضرورت ہوگی تو کھا لیں گے، جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لا تقل لاخیک اذا دخل علیک اکلت الیوم شیئاً؟ ولکن قرب الیہ ما عندک فان الجواد کل الجواد من بذل ما عندہ"

"جب تمہارا بھائی تمہارے پاس آئے تو اس سے یہ نہ پوچھو کہ آج تم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں، بلکہ جو کچھ تمہارے پاس ہو، اس کے لیے حاضر کر دو۔ کیونکہ صحیح معنوں میں سخی وہی ہوتا ہے جو اس چیز کے خرچ کرنے میں گریز نہ کرے جو اس کے پاس ہے۔" [5]

خدا کی بارگاہ میں میزبان کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ جو کھانا اس نے تیار کیا ہے اسے حقیر نہ سمجھے، کیونکہ نعمتِ خدا جو

---

[1] بحارالانوار جلد ۷، صـ۱۵۴۔

[2] محجۃ البیضاء جلد ۳ صـ۲۹ (باب ثالث)۔

[3] بحارالانوار جلد ۵، صـ۲۵۵۔

[4] بحارالانوار جلد ۵، صـ۲۵۵۔

بھی ہو معزز اور محترم ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت مند اور تکلف کے دلدادہ لوگوں کے ہاں معمول ہے کہ دسترخوان کو جتنا بھی کھانوں سے بھر دیں، پھر بھی کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یا کہتے ہیں کہ آپ کے شایانِ شان کھانا تیار نہیں ہوا وغیرہ۔ اسی طرح مہمان کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اسے حقیر اور معمولی نہ سمجھے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ھلک امرؤ احتقر لاخیہ ما یحضرہ وھلک امرؤ احتقر من اخیہ ما قدم الیہ"

"میزبان نے اپنے بھائی کے لیے جو کچھ تیار کیا ہے، اگر وہ اسے حقیر سمجھے وہ ہلاک (و گمراہ) ہوگا اسی طرح جو مہمان تیار شدہ چیز کو حقیر سمجھے وہ بھی ہلاک ہوگا۔" [1]

اسلام نے مہمان کی قدر دانی اور احترام کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ یہاں تک کہ فرمایا گیا ہے کہ "جب مہمان تمہارے پاس آجائے تو آنے پر اس کی مدد کرو، لیکن گھر سے جاتے وقت اس کی مدد نہ کرو۔ مبادا اس کے دل میں خیال آجائے کہ آپ اس کے جانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔" [2]

۴- مہمان کی ذمہ داری: ہمیشہ حقوق اور فرائض برابر کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی جس طرح مہمان کے لیے میزبان کی کچھ اہم ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اسی طرح میزبان کی طرف سے مہمان پر بھی کچھ اہم ذمہ داریاں عاید ہیں۔ چنانچہ جو کچھ مذکورہ بالا احادیث میں بیان ہو چکا ہے، اس کے علاوہ بھی مہمان کا فریضہ ہے۔ جو کچھ اسے صاحب خانہ اپنے گھر میں پیش کرے، اسے قبول کرے، مثلاً جو کچھ بیٹھنے کے لیے حاضر کرے اسے قبول کرے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا دخل احدکم علی اخیہ فی رحلہ فلیقعد حیث یأمر صاحب الرحل فان صاحب الرحل اعرف بعورۃ بیتہ من الداخل علیہ"

جس وقت تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے گھر میں داخل ہو تو جہاں وہ بیٹھنے کے لیے کہے وہیں بیٹھ جائے، کیونکہ صاحبِ خانہ اپنے گھر کی کیفیت اور ان حصوں سے جنہیں آشکار نہیں ہونا چاہیئے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ [3]

خلاصہ یہ کہ مہمان نوازی اور میزبانی کے آداب و فرائض اور اسلامی معاشرے میں اس کی خصوصیات بہت بحث طلب ہیں۔ جو لوگ اس سلسلے میں مزید وضاحت چاہتے ہیں، انہیں بحارالانوار کی جلد ۷، کتاب العشرۃ کے باب ۳ سے ۷ کرم ۹ تک

---

[1] محجۃ البیضاء جلد ۳ صـ۳۰۔

[2] بحارالانوار جلد ۵، صـ۲۵۵ (حدیث ۲۷)۔

[3] بحارالانوار جلد ۵، صـ۴۵۱۔

اور کتاب "محجۃ البیضاء جلد ۳ باب ۴ فضیلۃ الضیافۃ" کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مادیت پرستی کے اس دور میں یہ قدیم انسانی اور اخلاقی رسم محدود ہو کر رہ گئی ہے بلکہ بعض معاشروں میں تو قریباً ختم ہو چکی ہے۔ اور شنید میں آیا ہے کہ جب وہاں کے لوگ اسلامی ممالک میں آتے ہیں اور ان علاقوں میں کھلے دل سے مہمان نوازی کے روح پرور مناظر دیکھتے ہیں اور مہمانوں کے ساتھ گرمجوشی اور مہر و محبت کے سلوک کا مشاہدہ کرتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں کہ کس طرح یہ لوگ اپنے گھر میں موجود زندگی کے بہترین وسائل اور قیمتی غذائیں ایسے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے وقف کر دیتے ہیں جن سے تھوڑا بہت رابطہ ہے یا جن سے سفر کے دوران مختصر سی آشنائی ہوئی ہے۔ لیکن اگر اسلامی روایات کو مدنظر رکھا جائے کہ جن کا تھوڑا سا حصہ بیان ہوا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس قدر ایثار و فداکاری کی کیا وجوہات ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ اس بارے میں معنوی اور روحانی پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے، جو مادیت کے پرستاروں کی سوچ اور حساب سے بالاتر ہے۔

۵۵۔ لَاجُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝

ترجمہ

۵۵۔ ان (ازواجِ رسول) پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد، اولاد، بھائیوں بھتیجوں، بھانجوں، مسلمان عورتوں اور اپنے غلاموں سے (بغیر حجاب و پردہ کے ملیں)۔ اور اللہ کا تقوٰی اختیار کرو، کیونکہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ آیۂ حجاب (گزشتہ آیہ) کے نازل ہونے کے بعد ازواجِ رسولؐ کے آباء و اولاد اور دیگر رشتہ داروں نے آپ کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم بھی ان کے ساتھ پردے کی اوٹ میں رہ کر بات کیا کریں؟ تو اس پر زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا کہ یہ حکم تمہارے لیے نہیں ہے۔

تفسیر

قانونِ حجاب سے مستثنیٰ موارد:

چونکہ گزشتہ آیت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے حجاب کے بارے میں ایک مطلق حکم آیا تھا

جس سے یہ گمان پیدا ہوتا تھا کہ ان کے محرم بھی اس حکم پر عمل کرنے کے پابند ہیں اور انھیں بھی ازواج رسولؐ سے پردے میں ملاقات کرنا چاہیئے تو اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس حکم کی تشریح کر دی گئی۔

خدا فرماتا ہے: "پیغمبر کی بیویوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپ، اولاد، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، مسلمان عورتوں اپنے غلاموں کے ساتھ بغیر حجاب کے ملاقات کریں" (لا جناح علیھن فی اٰبائھن ولا ابنائھن ولا اخوانھن ولا ابناء اخوانھن ولا ابناء اخواتھن ولا نسائھن ولا ما ملکت ایمانھن)۔

دوسرے لفظوں میں ان کے محرم جو ان چھ گروہوں پر منحصر ہیں، وہ مستثنیٰ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کچھ اور افراد بھی محرم ہیں جن کا ان چھ گروہوں میں نام نہیں آیا مثلاً چچے اور ماموں وغیرہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید چونکہ اپنی فصاحت وبلاغت کو اعلیٰ صورت میں ملحوظ رکھتا ہے اور اصولِ فصاحت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی اضافی لفظ گفتگو میں نہ آنے پائے، لہٰذا یہاں پر چچاؤں اور ماموؤں کے ذکر سے اجتناب کیا ہے، کیونکہ بھتیجیوں اور بھانجوں کے ذکر سے چچاؤں اور ماموں کا محرم ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ محرمیت ہمیشہ دونوں طرف سے ہوتی ہے، جس طرح کسی کا بھتیجا اس کا محرم ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی بھتیجے کے ساتھ محرم ہوگی (اور معلوم ہے کہ ایسی عورت انسان کی پھوپھی شمار ہوگی)۔ نیز جس طرح بھانجا کسی کا محرم ہوتا ہے، اسی طرح وہ بھی بھانجے کی محرم ہوگی (اور معلوم ہے کہ ایسی عورت اس کی خالہ شمار ہوگی)۔

جس طرح پھوپھی اور خالہ بھتیجے اور بھانجے کی محرم ہوگی تو چچا اور ماموں بھی تو بھتیجی اور بھانجی کے محرم ہوں گے۔ (کیونکہ چچا اور پھوپھی، نیز ماموں اور خالہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) اور یہ امر قرآن کے گہرے نکات میں سے ہے۔ (غور کیجیے گا)

یہاں پر ایک اور سوال پیش آتا ہے کہ شوہر کا باپ اور شوہر کا بیٹا بھی تو عورت کے محرم شمار ہوتے ہیں تو پھر یہاں پر ان کا ذکر کیوں نہیں آیا، جبکہ سورۂ نور کی آیت ۳۱ میں ان کو محرم کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں گفتگو صرف آنحضرتؐ کی بیویوں کے بارے میں ہے اور معلوم ہے ——— کہ ان آیات کے نزول کے وقت نہ تو آپ کے والدِ گرامی زندہ تھے نہ ہی اجداد اور نہ ہی آپ کا کوئی بیٹا تھا۔ (پھر غور کیجیے گا)۔[1]

رضاعی بھائی بہنوں اور اس قسم کے دیگر افراد کا ذکر نہ کرنا بھی اسی بنا پر ہے کہ وہ بھی بھائی بہنوں اور دوسرے محرموں کے ضمن میں شمار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

آیت کے آخر میں گفتگو کے لب ولہجہ کو "غائب" سے "خطاب" کی طرف تبدیل کر کے ازواجِ رسول کو مخاطب کرتے

---

[1] مورخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین بیٹوں کا ذکر کیا ہے، قاسم اور عبداللہ (جن کا لقب طیب اور طاہر تھا) یہ دونوں حضرت خدیجہ کے بطن مبارک سے تھے اور مکہ میں بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اور تیسرے حضرت ابراہیم جو آٹھویں ہجری کو پیدا ہوئے اور ۱۶ یا ۱۸ ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔ بہرحال ان میں سے کوئی بھی سورۂ احزاب کے نزول کے وقت موجود نہیں تھا۔ ابراہیم اس واقعے کے بعد ہوئے اور بچپن ہی میں دنیا سے آنکھیں بند کر گئے۔ (اسد الغابہ اور تاریخ و رجال کی دوسری کتب کی طرف رجوع فرمائیں)۔

ہوئے قرآن کہتا ہے: "تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے" اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ (واتقین اللہ ان اللہ کان علیٰ کل شیء شھیدًا)۔

کیونکہ حجاب اور اس قسم کے امور گناہ سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہیں اور بس۔ مقصود تو درحقیقت وہی تقویٰ ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ ذرائع بھی کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نسائھن" (ان کی عورتیں) ہم مذہب اور مسلمان عورتوں کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جس طرح سورۂ نور کی تفسیر میں ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمان عورتوں کے لیے اچھا نہیں ہے کہ وہ غیر مسلم عورتوں کے سامنے بغیر پردہ کے آئیں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ چیزیں اپنے شوہروں سے جا کر بیان کریں۔[1]

باقی رہا "ما ملکت ایمانھن" کا جملہ تو جیسا سورۂ نور کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں کنیزیں بھی شامل ہیں اور غلام بھی، لیکن بعض روایات کے مطابق یہ حکم کنیزوں کے ساتھ مختص ہے۔ اسی بنا پر ممکن ہے کہ ان کا ذکر عورتوں کے کلی ذکر کے بعد اس لحاظ سے ہو کہ غیر مسلم کنیزیں بھی اس حکم میں شامل ہوں (غور کیجیے گا)

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۸ صفحہ ۲۳۰ سے بعد کی طرف رجوع فرمائیں (اردو ترجمہ)

۵۶۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○

۵۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُّھِیْنًا ○

۵۸۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُھْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ○ ع

ترجمہ

۵۶۔ خدا اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درُود بھیجو اور سلام کرو اور ان کے فرمان پر سر تسلیم خم کرو۔

۵۷۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں، خدا انہیں دنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور اس نے ان کے لیے خوار کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۵۸۔ اور جو اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو بلاوجہ اذیت پہنچاتے ہیں، وہ بہتان اور واضح

گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

تفسیر[1]

آنحضرتؐ پر درود و سلام:

گزشتہ آیات میں پیغمبرِ اسلامؐ کی حرمت کی حفاظت کے لیے اور انہیں کسی قسم کی تکلیف اور آزار نہ پہنچانے کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور ان آیات میں پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خدا اور اس کے فرشتوں کا خصوصی تعلق اور لگاؤ بیان کیا گیا ہے۔ پھر اسی سے متعلق مومنین کو حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ کو دکھ پہنچانے والوں کے لیے دردناک عذاب اور ان کے منحوس انجام کی خبر دی گئی ہے۔ آخر میں ان لوگوں کے عظیم گناہ کا تذکرہ کرتا ہے جو مومنین کو تہمت کے ذریعے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: "خدا اور فرشتے نبی پر رحمت اور درود بھیجتے ہیں" (ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ عالم ہستی کا آفریدگار اور حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس کائنات کی تدبیر کرنے والے فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں۔ اب جبکہ ایسا ہے تو تم بھی اس وسیع پیغام سے ہم آہنگ ہو جاؤ۔ "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ان پر درود بھیجو اور انھیں سلام کرو اور ان کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دو" (یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیمًا)۔

وہ عالم آفرینش کا ایک انمول گوہر ہیں اور اگر خدا کی مہربانی سے تمھیں میسر ہیں تو مبادا انہیں ارزاں سمجھ لو، مبادا اس کی عظمت اور مقام کو فراموش کر دو جو خدا اور اس کے فرشتوں کے نزدیک ہے، وہ ایک ایسا عظیم انسان ہے، جو تمہارے ہی درمیان کھڑا ہے، لیکن وہ ایک عام انسان نہیں، بلکہ ایسا انسان ہے، جس کا وجود پوری کائنات کا خلاصہ ہے۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "صلات" کی جمع "صلوات" ہے اور جس وقت اس کلمہ کو خدا کی طرف نسبت دی جائے تو رحمت نازل کرنے اور رحمت بھیجنے کے معنی میں ہوگا اور جب اس کی نسبت فرشتوں اور مومنین کی طرف ہو تو پھر طلب رحمت کے معنی میں ہوگا۔[2]

---

[1] یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ان آیات کی تفسیر کی ابتدا شب میلادِ رسولؐ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ میں ہوئی ہے۔

[2] راغب نے مفردات میں اس مفہوم کو دوسرے لفظوں میں پیش کیا ہے۔

۲- "یصلّون" کو فعل مضارع کی صورت میں لانا اس کے استمرار کی دلیل ہے، یعنی ہمیشہ خدا اور فرشتے اس پر رحمت بھیجتے اور درود بھیجتے رہتے ہیں، مسلسل اور جاودانی رحمت اور درود۔

۳- "صلّوا" اور "سلّموا" کے درمیان کیا فرق ہے؟ مفسرین نے اس پر بہت بحث کی ہے، لیکن جو کچھ ان دو الفاظ کے لغوی مفہوم اور قرآنی آیت کے ظاہری معنی سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ "صلّوا" پیغمبر اکرم پر طلب رحمت اور درود بھیجنے کا حکم ہے۔

رہا "سلّموا" تو وہ یا تو پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے احکام اور فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۶۵ میں آیا ہے:

"ثُمَّ لَا یَجِدُوا فِی اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوا تَسْلِیمًا"

"مومن وہ ہیں جو آپ کے فیصلے کو دل و جان سے قبول کریں، حتیٰ کہ آپ کے کسی فیصلے میں ذرہ بھر بھی ناراضی کا اظہار نہ کریں۔ بلکہ مطلق طور پر تسلیم کریں"

نیز ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابوبصیر نے عرض کیا: پیغمبر اکرم پر صلوات بھیجنے کو تو میں سمجھ گیا ہوں، لیکن اس تسلیم کا کیا معنی ہے؟

تو امامؑ نے فرمایا:

"هو التسلیم له فی الامور"

"ہر کام میں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔"[1]

یا پھر پیغمبر اکرم پر "السلام علیك یا رسول الله" اور اس قسم کے کسی طریقے سے سلام بھیجنے کے معنی میں ہے، جس کا مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ خداوندی سے سلامتی کی درخواست کرنا ہے۔

ابو حمزہ ثمالی، پیغمبر اکرم کے کعب نامی ایک صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: آپ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں، لیکن صلوات کس طرح بھیجنی ہے؟ تو آپ نے فرمایا یوں کہا کرو:

"اللّٰهمّ صلّ علی محمّد و آل محمّد کما صلّیت علی ابراهیم انّك حمید مجید، وبارك علی محمّد و آل محمّد کما بارکت علی ابراهیم و آل ابراهیم انّك حمید مجید"

اس حدیث سے پیغمبر اکرم پر درود و صلوٰۃ کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے اور سلام کا معنی بھی۔[2]

---

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں اور دوسری حدیث شیعہ اور سنی کتابوں میں متعدد طریقوں سے قریب قریب ایک جیسی عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

[2] مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں، یہ حدیث شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں متعدد طریقوں سے تقریباً ایک جیسی عبارتوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

اگرچہ سلام کے یہ دونوں معانی مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں ایک ہی نقطے کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ اور وہ ہے پیغمبر اکرم کے حضور قولی اور عملی تسلیم کیونکہ جو شخص ان پر سلام بھیجتا ہے اور خدا سے ان کی سلامتی طلب کرتا ہے تو درحقیقت وہ ان سے اپنے عشق اور محبت کا ثبوت دیتا ہے اور انھیں واجب الاطاعت پیغمبر کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔

۴- یہ امر قابل توجہ ہے کہ رسول اکرمؐ پر صلوات بھیجنے کی کیفیت کے سلسلے میں بے شمار شیعہ اور سنی روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "محمد" پر صلواۃ بھیجتے وقت "آل محمد" کا اضافہ بھی کرو۔

درمنثور میں "صحیح بخاری"، "صحیح مسلم"، "سنن ابوداؤد"، "سنن ترمذی"، "سنن نسائی"، "سنن ابن ماجہ"، "ابن مردویہ" اور دوسرے راویوں نے کعب بن عجرہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

"اما السلام علیك فقد علمنا فکیف الصلاة علیك؟"

"آپ پر سلام کرنا تو ہم جانتے ہیں، لیکن فرمائیے صلات کیسے بھیجی جائے؟"

تو آپ نے فرمایا۔ یوں کہو:

"اللّٰهمّ صلّ علی محمّد وعلی آل محمّد کما صلّیت علی ابراهیم انّك حمید مجید، اللّٰهمّ بارك علی محمّد وعلی آل محمّد کما بارکت علی ابراهیم و آل ابراهیم انّك حمید مجید"۔

سیوطی (تفسیر درمنثور کے مؤلف) نے اس حدیث کے علاوہ اٹھارہ دوسری احادیث بھی نقل کی ہیں، جن میں تصریح ہوئی ہے کہ صلوات میں "آل محمدؐ" کا بھی ذکر کرنا چاہیئے۔

ان احادیث کو اہل سنت کی مشہور و معروف کتب اور صحابہ کی ایک جماعت سے نقل کیا گیا ہے۔ جن میں ابن عباسؓ، طلحہ، ابو سعید خدری، ابوہریرہ، ابو مسعود انصاری، بریدہ، ابن مسعود، کعب بن عجرہ اور امیر المومنین حضرت علیؑ شامل ہیں۔[1]

برادران اہل سنت کی مشہور حدیث کی کتاب، صحیح بخاری میں اس بارے میں متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے قارئین کرام اصل کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔[2]

صحیح مسلم میں بھی اس سلسلے میں دو روایات آئی ہیں۔[3]

تعجب کی بات ہے کہ اس کتاب میں باوجودیکہ ان دو احادیث میں محمد و آل محمد کا کئی بار باہم تذکرہ ہوا ہے، لیکن باب کا جو عنوان منتخب کیا گیا ہے وہ "باب الصلاة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" (ذکر آل کے بغیر) ہے۔[4]

---

[1] تفسیر درمنثور آیہ مذکورہ کے ذیل میں بو تفسیر المیزان جلد نمبر ۱۶ صفحہ ۳۶۵۔ صفحہ ۳۶۶ کے مطابق۔

[2] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۵۱۔

[3] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۳۰۵ باب الصلاة علی النبی۔

[4] پاکستان میں بھی ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، کتب، رسائل اور تقاریر میں خصوصاً مولوی صاحبان جب آنحضرت کا ذکر کرتے ہیں تو "صلی اللہ علیہ وسلم" (بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض اہلِ سنت اور متعدد شیعہ روایات میں "محمد" اور "آلِ محمد" کے درمیان لفظ "علیٰ" کے ساتھ تک بھی نہیں ہے اور صلاۃ کی کیفیت اس طرح ہے، "اللّٰھم صل علیٰ محمد و آلِ محمد"

اس گفتگو کو ہم اسلام کے عظیم الشان پیغمبر کی ایک اور حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں" ابن حجر مکی اپنی کتاب صواعق میں نقل کرتے ہیں کہ آنجناب نے ارشاد فرمایا:

"لاتصلوا علی الصلاۃ البتراء فقالوا وما الصلاۃ البتراء؟ قال تقولون اللّٰھم صل علی محمد، وتمسکون، بل قولوا اللّٰھم صل علی محمد و آل محمد"

"مجھ پر کبھی (ناقص اور) دم بریدہ صلوات نہ بھیجا کرو۔"

اصحاب نے عرض کی: حضور! وہ ناقص صلوٰۃ کیا ہے؟

فرمایا: اگر فقط "اللّٰھم صل علی محمد" کہو اور اس سے آگے نہ بڑھو اور رُک جاؤ، بلکہ چاہیئے کہ یوں کہا کرو، "اللّٰھم صل علی محمد و آلِ محمد" [1]

انہی روایات کی بناء پر اہلِ سنت کے بزرگ فقہا کی ایک جماعت حضورِ ختمی مرتبت کے نام کے ساتھ "آلِ محمد" کے اضافہ کو نماز کے تشہد میں واجب سمجھتی ہے [2]

۵۔ آیا رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پر صلاۃ بھیجنا واجب ہے یا نہیں، اگر واجب ہے تو کہاں کہاں واجب ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب فقہا نے دیا ہے۔

تمام فقہاء شیعہ اسے نماز میں پہلے اور دوسرے تشہد میں واجب سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ باقی تمام مقامات پر مستحب جانتے ہیں۔ علاوہ ان احادیث کے جو اہلِ بیت کے طریقوں سے اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں، کتب اہلِ سنت میں بھی وہ روایات کم نہیں جو وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔

ان میں سے ایک مشہور روایت میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

"سمعت رسول اللّٰہ یقول لا یقبل صلاۃ الا بطھور، وبالصلاۃ علی"

"میں نے رسول اللہ سے سنا انھوں نے فرمایا کہ نماز طہارت اور مجھ پر درود بھیجے بغیر قبول نہیں ہوگی۔"

فقہاء اہلِ سنت میں سے امام شافعی دوسرے تشہد میں صلوٰۃ پڑھنا واجب سمجھتے ہیں اور امام احمد اور دوسرے کئی فقہا کے بارے میں دو طرح کی روایات نقل ہوئی ہیں، البتہ امام ابوحنیفہ جیسے بعض افراد اسے واجب نہیں سمجھتے [3]

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ہی لکھتے اور بولتے ہیں "و آلہ" ادا نہیں کرتے، تعجب ہے (مترجم)

[1] صواعق محرقہ ص۱۴۴۔

[2] علامہ حلیؒ کتاب تذکرہ کی بحث تشہد میں اس قول کو تمام علماء شیعہ کے علاوہ امام احمد بن حنبل اور بعض شافعیوں سے بھی نقل کرتے ہیں۔

[3] تذکرہ علامہ حلی جلد ۱ ص۱۲۶۔

لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت امام شافعی اس فتوے کو اپنے شعر میں نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یا اھل بیت رسول اللّٰہ! حبکم — فرض من اللّٰہ وفی القرآن انزلہ

کفاکم من عظیم القدر انکم — من لم یصل علیکم لا صلاۃ لہ

"اے اہلِ بیت رسول! تمھاری محبت خدا کی جانب سے قرآن میں واجب قرار دی گئی ہے۔"

"تمھارے مقام کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ جو شخص تم پر درود نہ بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔" [1]

⁂

بعد والی آیت حقیقت میں گزشتہ آیت کے نقطہ مقابل کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: "جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں، خدا انھیں دُنیا اور آخرت میں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کیے ہوئے ہے" (ان الذین یؤذون اللّٰہ ورسولہ لعنھم اللّٰہ فی الدنیا والاٰخرۃ و اعدلھم عذابا مھینا)۔

پروردگار کو ایذا پہنچانے سے کیا مراد ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ مراد کفر و الحاد ہے، جو خدا کو غضبناک کرتا ہے کیونکہ خدا کے بارے میں آزار اور اذیت کا استعمال درحقیقت خدا کے غضب کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کو ایذاء دینے سے مراد رسولِ خدا اور مومنین کو ایذاء پہنچانا ہو اور یہاں پر خدا کا ذکر اس مطلب کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ لیکن پیغمبرِ اسلام کی ایذاء کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر وہ کام شامل ہے جو آپ کو ایذاء پہنچائے خواہ وہ کفر و الحاد ہو یا احکامِ الٰہی کی مخالفت، نیز آپ کی طرف ناروا نسبتیں اور تہمتیں یا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم انھیں اپنے گھر دعوت دیں تو اس وقت آپؐ کے لیئے زحمت اور مشقت پیدا کرنا۔ جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۵۳ میں ابھی گزر چکا ہے۔ یعنی "ان ذالکم کان یؤذی النبی ....." تمھارا یہ کام پیغمبر کو تکلیف دیتا ہے۔

یا وہ امر جو سورۂ توبہ کی آیت ۶۱ میں آچکا ہے کہ پیغمبرِ اکرم کو آپؐ کی مشفقانہ گفتگو کی وجہ سے دشمن آپؐ پر سادہ لوحی اور خوش فہمی کا الزام دیتے تھے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

"ومنھم الذین یؤذون النبی ویقولون ھو اذن"

"ان میں سے کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو نبی کو تکلیف پہنچاتے اور کہتے کہ وہ خوش فہم انسان ہیں جو ہر ایک کی بات پر کان دھر لیتا ہے۔"

اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔

یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں وارد ہونے والی روایات سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خاندانِ رسالتؐ خصوصاً حضرت

---

[1] کتاب "الغدیر" میں ان اشعار کی نسبت امام شافعی کی طرف "شرح المواھب زرقانی" جلد ۷، ص... میں ایک اور جماعت سے بھی نقل کی گئی ہے۔

علیؑ اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دختر نیک اختر حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کو تکلیف دینا بھی اسی آیت میں شامل ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری جزءِ پنجم میں آیا ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا۔

" فاطمۃ بضعۃ منی فمن اغضبہا اغضبنی۔"

فاطمہ میرا جگر کا ٹکڑا ہے، جو شخص اسے غضب ناک کرے گا۔ وہ مجھے غضب ناک کرے گا۔[1]

یہی حدیث صحیح مسلم میں اس طرح آئی ہے،

" انّ فاطمۃ بضعۃ منی یوذینی ما اذاھا۔"

" فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو چیز اسے تکلیف دیتی ہے، وہ مجھے تکلیف دیتی ہے۔"[2]

آنحضرتؐ کا اس سے ملتا جلتا فرمان حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے:[3]

باقی رہا زیرِبحث آیت میں لفظ توجیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس کا معنی ہے "رحمتِ خدا سے دوری" یہ بالکل رحمت اور صلوٰۃ کے مدمقابل ہے، جس کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہوچکا ہے۔

"لعن" اور رحمت الٰہی سے دھتکارا جانا اور وہ بھی خود خدا کی طرف سے کہ جس کی رحمت بے پایاں اور وسیع ہے، درحقیقت عذاب کی بدترین قسم ہے، خصوصاً جب کہ رحمت سے یہ دوری دنیا اور آخرت دونوں میں ہو۔ (جیسا کہ اسی آیت میں ہے) اور شاید اسی بناء پر "لعن" کا ذکر "عذاب مہین" سے پہلے ہوا ہے " اَعَدّ " (تیار کرچکا ہے) کی تعبیر اس عذاب کی تاکید اور اہمیت کی دلیل ہے۔

❁ ❁ ❁

اس سلسلے کی آخری آیت مومنین کی ایذار کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور خدا اور پیغمبرؐ کے بعد اس امر کی حد سے زیادہ اہمیت بتاتی ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے "جو لوگ صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو اس کام کی وجہ سے جو انہوں نے انجام نہیں دیا آزار پہنچاتے ہیں وہ بہتان اور آشکار گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں" (والذین یؤذون المؤمنین والمؤمناتِ بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا)۔

کیونکہ مومن، ایمان کی وجہ سے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اسی وجہ سے یہاں پر خدا اور رسول کے بعد اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

" بغیر ما اکتسبوا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی ایسے گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے جو آزار و اذیت کا سبب ہو۔ یہیں سے واضح ہوجاتا ہے کہ جس وقت ان سے کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے جو حد، قصاص یا تعزیر

---

[1] صحیح بخاری جزء ۵ ص ۲۔

[2] صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۹۰۲ (باب الفضائل فاطمہ)۔

[3] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

کا موجب ہو تو پھر ان پر حدود و قصاص وغیرہ کے اجراء میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی یہ چیزیں شامل نہیں ہیں۔

"بھتان" کو "اثما مبینا" پر مقدم کرنا اس کی اہمیت کی وجہ سے ہے، کیونکہ بہتان کا شمار عظیم ترین اذیتوں میں ہوتا ہے اور اس کا زخم نیزے اور خنجر کے زخم سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے، جیسا کہ کسی عرب شاعر نے کہا ہے،

جراحات السنان لھا التیام ولا یلتام ما جرح اللسان

" نیزے کے زخم تو مندمل ہوسکتے ہیں، لیکن زبان کے زخم نہیں مل سکتے۔"

اسلامی روایات میں اس بات کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہم پڑھتے ہیں۔

خداوند عزّ وجل ارشاد فرماتا ہے:

"لیاذن بحرب منی من اذا عبدی المؤمن۔"

" جو شخص میرے مومن بندے کو تکلیف پہنچاتا ہے، وہ میرے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔"[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کچھ لوگ رہتے تھے جو مومنین کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے اور ان کی طرف ناروا باتیں منسوب کرتے تھے (حتیٰ کہ خود پیغمبرِ اسلامؐ بھی ان موذیوں کی زبان سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے)۔ وہی لوگ جو دوسرے معاشروں خصوصاً موجودہ دور میں کم نہیں ہیں، ان کا کام نیک اور مقدس لوگوں کے خلاف سازشیں تیار کرنا، جھوٹ بولنا اور بہتان تراشی کرنا ہوتا ہے۔

قرآن مجید انھیں اپنے سخت ترین حملوں کا نشانہ بناتا ہے اور ان کے اعمال کو بہتان اور واضح گناہ قرار دیتا ہے۔ بعد والی آیات میں بھی اس سلسلے میں بات ہوگی۔

ایک اور حدیث میں جسے امام رضا علیہ السلام اپنے جدِ امجد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرتے ہیں، اس طرح آیا ہے،

" من بھت مؤمنا او مؤمنۃ او قال فیہ ما لیس فیہ اقامہ اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ علی تل من نار حتی یخرج مما قالہ فیہ۔"

" جو شخص مومن مرد یا مومن عورت پر بہتان باندھے، یا اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کرے جو اس میں نہیں ہے، تو خدا اسے قیامت میں آگ کے ٹیلے پر قرار دے گا اور وہ اس وقت تک وہیں رہے گا، جب تک اپنے کیے کی سزا نہ پالے۔"[2]

---

[1] اصول کافی جلد ۲، ص ۳۵۰۔

[2] بحار الانوار جلد ۵، ص ۱۹۴۔

۵۹۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○

۶۰۔ لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا ○

۶۱۔ مَّلْعُوْنِیْنَ ۛۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ○

۶۲۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ○

ترجمہ

۵۹۔ اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مؤمنین کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے اوپر ڈال لیا کریں تاکہ (وہ کنیزوں اور گناہ سے آلودہ عورتوں سے الگ) پہچانی جائیں اور کسی کی طرف سے انہیں دکھ اور تکلیف نہ پہنچے اور (اگر اب تک خطا اور کوتاہی سرزد ہوئی ہے تو) خدا ہمیشہ غفور رحیم ہے۔

۶۰۔ اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو مدینہ میں جھوٹی خبریں اور بے بنیاد افواہیں پھیلاتے ہیں اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے خلاف تیار کریں گے، پھر وہ تھوڑی سی مدت کے سوا آپ کے نزدیک اس شہر میں نہیں رہ سکیں گے۔

۶۱۔ اور ہر جگہ سے دھتکارے جائیں گے اور جہاں کہیں ملیں گے گرفتار کر لیے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے۔

۶۲۔ گذشتہ اقوام میں خدا کی یہی سنت جاری رہی ہے اور آپ خدا کی سنت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائیں گے۔

شانِ نزول

تفسیر علی بن ابراہیم میں پہلی آیت کی شان نزول یہ بیان کی گئی ہے کہ اس زمانے میں مسلمان عورتیں مسجد میں جا کر رسول پاکؐ کے پیچھے نماز پڑھا کرتی تھیں۔ رات کے وقت جب وہ مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے جاتیں تو کچھ بے ہودہ اور اوباش نوجوان ان کے راستے میں بیٹھ جاتے اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں کر کے انھیں تکلیف پہنچاتے اور ان کا راستہ روکتے۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اچھی طرح سے پردہ کریں تاکہ واضح ہو سکے کہ یہ مسلمان عورتیں ہیں اور کوئی شخص مزاحمت کے لیے بہانہ نہ بنا سکیں۔

اس کتاب میں دوسری آیت کی شان نزول اس طرح لکھی ہے کہ مدینہ میں منافقین کا ایک ٹولہ تھا جس کا کام یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض موقعوں پر جنگ کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ آپ کے بارے میں مختلف افواہیں پھیلاتا، کبھی کہتا کہ پیغمبرؐ قتل ہو گئے ہیں، کبھی کہتا انھیں قید کر لیا گیا ہے، وہ مسلمان جو جنگ کرنے کی توانائی نہ رکھتے تھے اس سے انھیں سخت پریشانی ہوتی۔ جب پیغمبر اکرمؐ کے پاس اس امر کی شکایت کی گئی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان افواہ پھیلانے والوں کو سختی سے تنبیہ کر دی گئی۔[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ صفحہ ۳۰۸ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

تفسیر

زبردست انتباہ:

خداوندِ عالم نے گذشتہ آیات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مؤمنین کو ایذا اور تکلیف پہنچانے کی ممانعت کے بعد یہاں پر اذیت کے ایک اور مورد کا ذکر کیا ہے اور اس سے نبٹنے کے دو طریقے بیان کیے ہیں۔ سب سے پہلے صاحبِ ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ایسا کام نہ کریں، جس سے بدطینت لوگوں کے ہاتھ کوئی بہانہ آسکے۔ اس کے بعد منافقین، چھیڑ خوانی کرنے والے اوباشوں اور افواہیں پھیلانے والے عناصر کو زبردست تنبیہ کی گئی ہے اور ایسی زبردست تنبیہ جس کی مثال قرآنی آیات میں بہت کم ملے گی۔

پہلے حصّہ میں فرمایا گیا ہے۔ "اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں تاکہ واضح ہو جائیں اور انہیں کوئی اذیت نہ پہنچا سکے۔" (یا ایھا النبی قل لازواجک و بناتک ونساء المؤمنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین)۔

"یعرفن" (پہچانے جانے) سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے متضاد بھی نہیں ہیں۔ پہلا یہ کہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کنیزیں سر اور گردن کو چھپائے بغیر گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ اور چونکہ یہ کیفیت اخلاقی لحاظ سے اچھی نہیں تھی، لہٰذا کبھی کبھی اوباش اور بے ہودہ قسم کے نوجوان ان سے چھیڑ خوانی کرتے تھے، لہٰذا یہاں پر آزاد مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اسلامی حجاب کی مکمل طور پر پابندی کریں تاکہ وہ کنیزوں سے جدا پہچانی جائیں اور بے ہودہ اور اوباش افراد کے لیے چھیڑ خوانی کا کوئی بہانہ نہ بنیں۔

واضح رہے کہ اس گفتگو کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اوباش اور بدقماش لوگوں کو کنیزوں سے چھیڑ چھاڑ کا حق حاصل ہو گیا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ بدفطرت لوگوں کے ہاتھوں میں کسی قسم کا بہانہ باقی رہنے نہ پائے۔

دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان عورتیں پردے کے بارے میں سہل انگاری اور بے پرواہی نہ برتیں، جیسا کہ بعض لاابالی قسم کی عورتیں پردہ کے ہوتے ہوئے بھی بے پردہ ہوتی ہیں اور ان کے جسم کے زیادہ تر حصے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو بے ہودہ افراد کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

"جلباب" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین اور اربابِ لغت نے اس کے چند ایک معانی ذکر کیے ہیں،

۱۔ "ملحفہ" (چادر) اور بڑا سا کپڑا جو دوپٹے سے بڑا ہوتا ہے اور سر اور گردن اور سینہ وغیرہ کو چھپا دیتا ہے۔

۲۔ مقنعہ اور خمار (دوپٹہ اور اوڑھنی)۔

۳۔ لمبا اور ڈھیلا ڈھالا کرتہ۔[1]

اگرچہ یہ معانی آپس میں مختلف ہیں، لیکن ان سب کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ بدن کو ایسے کپڑے کے ذریعے چھپایا جائے۔ (توجہ رہے کہ "جلباب" جیم پر زبر اور زیر دونوں سے پڑھا جاتا ہے) لیکن زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ اس سے مراد پہننے کا وہ کپڑا ہے جو دوپٹے سے بڑا اور چادر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ جیسا کہ "لسان العرب" کے مؤلف نے بیان کیا ہے۔

اور "یدنین" (قریب کریں) سے مراد یہ ہے کہ عورتیں اوڑھنیوں کو اپنے بدن کے قریب کریں تاکہ وہ ٹھیک طرح سے انھیں چھپا سکے نہ یہ کہ اسے آزاد چھوڑ دیں کہ جو کبھی ہٹ جائے اور بدن نظر آنے لگے۔ یعنی وہ اسے لپیٹے رکھیں۔

باقی رہی یہ بات کہ اس جملے سے بعض لوگ یہ استفادہ کرنا چاہتے ہیں کہ چہرے کو بھی چھپایا جائے، تو اس مفہوم کی کوئی دلیل نہیں ملتی اور بہت کم مفسرین نے اس آیت کے مفہوم میں چہرے کے چھپانے کو داخل سمجھا ہے۔[2]

بہرحال اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پردے کا حکم آزاد عورتوں کے لیے اس سے پہلے نازل ہو چکا تھا، لیکن بعض عورتیں سادہ لوحی کی وجہ سے اس کی پابندی نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے یہ آیت تاکید کر رہی ہے کہ اس کی پابندی کرنے میں خوب توجہ سے کام لیں۔

چونکہ اس حکم کے نازل ہونے سے بعض صاحب ایمان عورتیں گذشتہ زمانے کی بابت فکر میں پڑ گئیں، لہٰذا آیت کے آخر میں اضافہ کیا گیا ہے: "خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے" (وکان اللہ غفورًا رحیمًا)۔

اگر تم سے اب تک اس معاملے میں کوتاہی ہوئی ہے تو چونکہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھی لہٰذا خدا تمہیں بخش دے گا۔ توبہ کرو، اس کی طرف لوٹ آؤ اور عفت و پاک دامنی اور حجاب کے فریضے کو اچھی طرح انجام دو۔

صاحب ایمان عورتوں کو پردے کی پابندی کا حکم دینے کے بعد دوسرے مسئلے یعنی اوباش اور اراذل افراد کی تکلیف دہ کارروائیوں کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ اگر منافقین اور بیمار دل لوگ نیز وہ افراد بھی جو مدینہ میں جھوٹی افواہیں پھیلاتے ہیں، اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی آپ کو ان کے خلاف اٹھائیں گے اور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے پھر وہ ایک مختصر سی مدت کے علاوہ اس شہر میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔" (لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک فیھا الا قلیلًا)۔[3]

---

[1] ملاحظہ ہوں یہ کتب: لسان العرب، مجمع البحرین، مفردات راغب، قطر المحیط اور تاج العروس۔

[2] حجاب کے فلسفے اور اس کی اہمیت، اسی طرح ہاتھوں کے کلائی تک استثناء کے سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۱۴ سورۂ نور کی آیہ ۳۰ و ۳۱ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

[3] "قلیلا" یہاں پر ایک محذوف سے مستثنیٰ ہے اور تقدیری طور پر اس طرح تھا: "لا یجاورونک زمانًا الا زمانًا قلیلا"۔

"مــرجفــون"، "ارجاف" کے مادہ سے ہے اور ایسی افواہیں پھیلانے کے معنی میں ہے جو دوسروں کو دکھ دینے کے لیے گھڑی جائیں اور یہ کلمہ دراصل "ارجاف" یعنی اضطراب اور تزلزل کے معنی میں ہے اور چونکہ افواہیں عام لوگوں میں اضطراب پیدا کر دیتی ہیں، لہٰذا یہ لفظ ان کے لیے بولا جاتا ہے۔

"نغــرینک"، "اغــراء" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے کسی کام کے انجام دینے یا کسی چیز کے حاصل کرنے کی دعوت دینا، جس میں ترغیب و تشویق اور برانگیختہ کرنا بھی شامل ہے۔

آیت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں تین گروہ تخریب کاری میں مشغول تھے، ان میں ایک ٹولہ اپنے ناپاک عزائم پورا کرنا چاہتا تھا اور یہ کام باقاعدہ سوچی سمجھی سکیم اور منظم منصوبے کے تحت انجام دیتا تھا نہ کہ شخصی اور انفرادی صورت میں پہلے تو وہ منافقین تھے جو اسلام کے خلاف اپنی سازشوں سے اسے تباہ کر دینا چاہتے تھے۔

دوسرے وہ اوباش اور آوارہ لوگ تھے، جنھیں قرآن پاک "دل کے بیمار" قــرار دیتا ہے (الذین فی قلوبھم مرض) جیسا کہ یہی تعبیر اسی سورۂ (احزاب) کی آیت ۳۲ میں بھی ہوا و ہوس کے مریض و شہوت پرست افراد کے بارے میں آئی ہے:

"فــلا تخضعــن بالقــول فیطمع الــذی فـی قلبــه مــرض"۔

"اے ازواجِ رسول! جس وقت بات کرو تو نرمی کے ساتھ بات نہ کیا کرو، ورنہ دل کے مریض لوگ تمھارے بارے میں طمع کرنے لگ جائیں گے۔"

تیسرے وہ لوگ تھے، جن کا کام مدینہ میں افواہیں پھیلانا تھا خصوصاً ایسے مواقع پر جب پیغمبر خدا اور لشکر اسلام جنگ کو جاتے تو وہ مدینہ میں رہ جانے والے لوگوں کے حوصلے پست کرنے اور ان کے دلوں کو کمزور کرنے کے لیے رسول پاک اور مومنین کی شکست کی خبریں پھیلانا شروع کر دیتے تھے۔

بعض مفسرین کے بقول یہ یہودیوں کا گروہ تھا۔ بہر حال قرآن مجید نے تینوں گروہوں کو زبردست سرزنش کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تینوں تخریبی پروگرام منافقین کی کارستانیاں تھیں ان کو الگ الگ کر کے اس لیے پیش کیا گیا تاکہ ان کے طریقۂ واردات کو واضح کر کے بتا دیا جائے۔

بہر حال قرآن کہتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس قبیح اور ناشائستہ کام کو جاری رکھا تو ہم ان کے خلاف ایک عمومی حملے اور یورش کا حکم صادر کر دیں گے تاکہ مومنین کے ایک ہی سردار اقدام سے مدینہ کے تمام منافقین کی بیخ کنی ہو جائے اور پھر وہ کبھی اس شہر میں رہنے کے قابل نہ رہ سکیں۔

اور جب وہ اس شہر سے نکال دیئے جائیں گے اور اسلامی حکومت کی حفاظت سے محروم ہو جائیں گے "تو جہاں کہیں بھی ملیں گے دھر لیے جائیں گے اور قتل کر دیئے جائیں گے" (ملعــونین اینما ثقفــوا اخذوا وقتلوا تقتیــلا)۔

"ثقفوا"، "ثقف" اور "ثقافت" کے مادہ سے بڑی مہارت کے ساتھ کسی چیز کو حاصل کرنا ہے، جو کلچر کو "ثقافت" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی مفہوم کی بنا پر ہے۔

• یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس عمومی حملے کے بعد کہیں بھی امان نہیں پا سکیں گے اور انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے گا آیا اس آیت سے مراد یہ ہے کہ انھیں مدینہ سے باہر تلاش کر کے قتل کر دیا جائے؟ یا عمومی جلاوطنی کے حکم کے بعد اگر مدینہ میں رہ جائیں گے تو اس قسم کے انجام سے دوچار ہوں گے؟ اس بارے میں دو احتمال ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا تضاد موجود نہیں، وہ اس سے کہ اس سازشی، بیمار دل اور افواہیں پھیلانے والے تخریب کار ٹولے سے جب اسلامی حکومت اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا لے گی تو انھیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم مل جائے گا تو پھر وہ وہیں پر رہ جائیں یا وہاں سے نکل جائیں، شجاع اور جاں بکف مسلمان انہیں کہیں بھی امان سے نہیں رہنے دیں گے۔

پھر آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے بلکہ "یہ خدا کی ہمیشہ سنت ہے جو گزشتہ اقوام میں بھی تھی" کہ جس وقت کوئی تخریب کار اور مفسد ٹولہ بے شرمی کا مظاہرہ کرے اور سازشیں کرنے میں حد سے بڑھ جاتا تھا تو ان کے لیے عمومی حملے کا حکم صادر ہو جاتا تھا (سنة الله فی الــذین خلــوا من قبــل)۔

اور چونکہ یہ حکم ایک خدائی سنت ہے، لہٰذا اس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، کیونکہ "تم خدا کی سنت کے لیے کبھی تغیر اور تبدیلی نہیں پاؤ گے" (ولــن تجد لسنة الله تبــدیلا)۔

یہ تعبیر حقیقت میں اس تنبیہ کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے کو واضح کرتی ہے کہ وہ جان لیں کہ یہ بات قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی، لہٰذا انھیں چاہیئے کہ یا تو اپنے شرمناک اعمال میں تبدیلی پیدا کریں یا پھر اس قسم کے دردناک انجام کے انتظار میں رہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ پہل خود سے کرنا چاہیئے: جو حکم ان آیات میں اسلامی حجاب کو مکمل طور پر ملحوظ رکھنے کے سلسلے میں آیا ہے اور قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہے کہ یہ حکم پہنچا دو تو پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ازواج کو مدِ نظر رکھا گیا ہے، پھر آپ کی اولاد پھر مومن عورتیں اور یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ ہر قسم کی اصلاح کا آغاز اپنے آپ اور اپنے گھرانے سے کرنا چاہیئے اور یہی لائحہ عمل بنی نوعِ انسان کے تمام مصلحین کے لیے ہے۔

بیویوں اور اولاد میں سے پہلے بیویوں کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ انسان کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، جبکہ اولاد کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شوہروں کے گھر منتقل ہو جاتی ہیں۔

۲۔ دونوں طریقوں سے بچاؤ: چونکہ اجتماعی برائیوں کا عام طور پر ایک سبب نہیں ہوتا، بلکہ کئی اسباب ہوتے ہیں لہٰذا ان کا ہر طرف سے مقابلہ ہونا چاہیئے۔ مذکورہ بالا آیات میں بدمعاش اور آوارہ لوگوں کی شرارتوں سے نمٹنے کے لیے صاحب ایمان عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسا کوئی کام نہ کریں، جس سے اُن کے ہاتھ کوئی بہانہ آ جائے اور دوسری طرف چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو زبردست سرزنش اور تنبیہ کے ساتھ روکا گیا ہے اور یہ ایک دائمی

اور عمومی طریقہ ہے کہ دوست کی اصلاح کرنا چاہیئے اور دشمن کا طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔

۳۔ مسلمانوں کی طاقت ور پوزیشن: ان آیات کی سخت اور طاقت پر مبنی تنبیہات سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ جب بنی قریظہ کا ماجرا ختم ہوگیا اور مسلمانوں کے اس داخلی دشمن کی بیخ کنی ہو گئی تو مدینہ میں مسلمانوں کی پوزیشن پورے طور پر مستحکم ہوگئی۔ اب صرف ان منافقین کی طرف سے مخالفت ہوتی تھی جو بطور ناشناختہ مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہُوئے تھے، یا پھر اوباش و آوارہ لوگ تھے یا پھر افواہیں پھیلانے والے، لہٰذا اس موقع پر آنحضرت نے ان سے طاقت کی زبان میں بات کی اور خبردار کیا کہ اگر وہ اپنے زہریلے پروپیگنڈے اور ناپاک سازشوں سے دست بردار نہ ہُوئے تو ایک ہی حملہ سے ان کا حساب چکا دیا جائے گا، چنانچہ اس فیصلہ کن اور سوچی سمجھی تنبیہ نے اپنا اثر دکھا دیا۔

۴۔ فساد کو جڑ سے کاٹ دو: اسلام کے خلاف سازش کرنے والے منافقوں، مسلمانوں کی ناموس سے چھیڑ خانی کرنے والوں اور افواہیں پھیلانے والوں کی فتنہ پردازیوں سے نمٹنے کے لیے مندرجہ بالا آیات نے جو طریقہ کار بتایا ہے، آیا وہ تمام زمانوں میں اور تمام اسلامی حکومتوں کے لیے بھی اپنانا جائز ہے؟

اس بارے میں بہت کم مفسرین نے بحث کی ہے، لیکن یوں نظر آتا ہے کہ یہ حکم باقی اسلامی احکام کی طرح کسی زمان و مکان اور اشخاص کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا۔

اگر واقعاً زہریلا پروپیگنڈہ اور سازش حد سے گزر جائے اور ایک تحریک کی صورت اختیار کرلے اور اسلامی معاشرے کو صحیح معنوں میں خطرات سے دوچار کردے تو کیا حرج ہے کہ اسلامی حکومت مندرجہ بالا آیات کے حکم کو نافذ کردے اور لوگوں کو فساد کی جڑیں کاٹنے کے لیے ایک جھنڈے تلے جمع کرلے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے امور خاص کر جنہیں تبدیل نہ ہونے والی سنت کہا گیا ہے، ان کا نفاذ انسان از خود نہیں کرسکتا بلکہ صرف اور صرف مسلمانوں کے ولی و سرپرست اور حاکم شریعت کی اجازت سے نافذ کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ خدا کی اٹل سنتیں: ان آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآن نے خدا کی تبدیل نہ ہونے والی سنتوں میں سے ایک سنت یہ بتائی ہے کہ سازشیں کرنے والوں کی بیخ کنی کے لیے ایک عمومی حملے کا حکم دیا ہے اور یہ چیز گذشتہ امتوں میں بھی تھی۔ اس جیسی تعبیر قرآن مجید کے ایک اور مقام پر بھی آئی ہے۔

منجملہ ان کے اسی سورہ احزاب کی آیت ۳۸ میں زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کی اجازت صادر کی گئی ہے کہ مُنہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے عقد جائز ہے، پھر فرمایا گیا ہے:

"پیغمبر کے لیے جرم اور گناہ نہیں ہے کہ وہ امرِ الٰہی کو نافذ کریں چاہے جو بھی ہو"

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے:

"سنة الله فی الذین خلوا من قبل وكان امر الله قدرًا مقدورا"

یہ پروردگار کی سنت ہے جو گذشتہ اقوام اور انبیائے ماسلف میں بھی تھی اور خدا کا فرمان ثابت اور اٹل معیار پر قائم ہے۔

سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ میں کفار اور مجرم اقوام کو ہلاکت کی تنبیہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"فهل ینظرون الا سنة الاولین فلن تجد لسنة الله تبديلا ولن تجد لسنة الله تحويلا"

"کیا وہ اسی نحس انجام کا انتظار کرتے ہیں، کہ جس نے پہلی اقوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، لیکن آپ کبھی سُنّتِ الٰہی میں تبدیلی نہیں پائیں گے اور نہ ہی سُنّتِ الٰہی کے لیے کوئی تغیر ہے۔"

سورہ مؤمن کی آیت ۸۵ کے مطابق گذشتہ اقوام میں سے ہٹ دھرم کفار نے جب تباہ کن عذاب کا مشاہدہ کیا تو اس موقع پر ایمان کا اظہار کیا، لیکن ایسا ایمان ان کے لیے مفید ثابت نہ ہوسکا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"سنة الله التی قد خلت فی عباده وخسر هنالك الكافرون"

"یہ خدائی سنت ہے جو گذشتہ زمانے میں بھی اس کے بندوں میں جاری ہوچکی ہے اور وہاں کفار نقصان اور خسارے میں گرفتار ہوئے۔"

نیز سورۂ فتح کی آیت ۲۳ میں مومنین کی کامیابی، کفار کی شکست اور جنگوں میں ان کے لیے یار و مددگار نہ ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"سنة الله التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبديلا"

"یہ پروردگار کی سنت ہے جو گذشتہ زمانے میں بھی تھی اور خدا کی سُنّت ہرگز تبدیل نہیں ہوتی۔"

نیز سُورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۷ میں جہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جلاوطن کرنے یا ان کا کام تمام کرنے کی سازش کو بیان فرمایا گیا ہے،

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"اگر وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہناتے تو وہ بھی آپ کے بعد زیادہ دیر باقی نہ رہتے۔"

"سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحويلا"

"یہ ان پیغمبروں کی سنت ہے، جنھیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے اور آپ ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھ پائیں گے۔"

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسے مواقع پر "سنت" سے مراد خدا کے "تشریعی" یا "تکوینی" ثابت اور اساسی قوانین ہیں، جن میں کبھی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں عالمِ تکوین و تشریع میں خداوندِ عالم کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جن میں کسی وقت بھی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، اور یہ انسانوں کے ساختہ و پرداختہ قوانین کی طرح تبدیلی کا شکار نہیں ہوتے۔ یہ قوانین اقوام گذشتہ پر بھی حکم فرما تھے اور آئندہ بھی نافذ رہیں گے۔

انبیاء کی مدد کرنا، کفار کو شکست دینا، خدائی احکام پر ضروری عمل کرنا خواہ ماحول اسے ناپسند کرے، عذاب الٰہی کے

نازل ہونے کے وقت توبہ کا مفید نہ ہونا اور اس قسم کے دوسرے امور ان دائمی سنتوں کا حصہ ہیں۔

اس قسم کی تعبیریں ایک طرف تو راہِ حق کے تمام راہیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور انھیں سکون کی نعمت عطا کرتی ہیں اور دوسری طرف انبیاء کے اتحاد اور نظام آفرینش اور انسانوں کی زندگی کے نظام پر حاکم قوانین کے یکساں ہونے کو واضح کرتی ہیں جو درحقیقت دلائل توحید میں سے ہے۔

۶۳۔ يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝

۶۴۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝

۶۵۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

۶۶۔ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝

۶۷۔ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاۗءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝

۶۸۔ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝

ترجمہ

۶۳۔ لوگ آپ سے قیامت (کے وقت) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے: اس کا علم صرف خداوندِ عالم کے پاس ہے۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت نزدیک ہو۔

۶۴۔ خدا نے کافروں پر لعنت کی ہے (اور انھیں اپنی رحمت سے دور رکھا ہے) اور ان کے لیے جلانے والی آگ تیار کر رکھی ہے۔

۶۵۔ وہ اس میں ابد تک رہیں گے اور وہاں ان کا نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

۶۶۔ وہ دن جس میں ان کے چہرے (جہنّم کی آگ کے باعث) تبدیل ہو جائیں گے (اور وہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے اور) کہیں گے اے کاش ہم نے خدا اور پیغمبر کی اطاعت کی ہوتی۔

۶۷۔ اور کہیں گے خداوندا! ہم نے اپنے بڑوں اور وڈیروں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

۶۸۔ پروردگارا! تو انھیں دُوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت فرما۔

تفسیر

قیامت کب آئے گی؟

گذشتہ آیات اشرار اور منافقین کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں ان آیات میں ان کے تخریبی منصوبوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کبھی تو وہ استہزاء اور مسخرہ پن کے طور پر اور کبھی سادہ دل لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے یہ سوال پیش کرتے تھے کہ قیامت ان اوصاف کے ساتھ جو محمدؐ بیان کرتے ہیں، کب برپا ہوگی؟ ارشاد ہوتا ہے: "لوگ آپ سے قیام قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ (یسئلک الناس عن الساعة)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بعض مومنین بھی تحقیق اور جستجو کی غرض سے یا معلومات میں اضافہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کا سوال کرتے ہوں، لیکن بعد والی آیات کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ پہلی تفسیر آیت کے معنی سے زیادہ قریب ہے۔

اس بات کی گواہ ایک اور آیت ہے جو اس بارے میں سورہ شوریٰ میں آئی ہے:

"وما یدریک لعل الساعة قریب یستعجل بها الذین لا یؤمنون بها والذین اٰمنوا مشفقون منها ویعلمون انها الحق"

"آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہو، لیکن جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے اس کے لیے جلدی کرتے ہیں البتہ مومنین اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔"

(شوریٰ ۱۷ و ۱۸)

اس کے بعد موجودہ آیت میں انھیں اس طرح جواب دیا گیا ہے: "اے پیغمبر! کہہ دیجیے اس بات کا علم صرف خدا کے پاس ہے اور خدا کے علاوہ دوسرا کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں"۔ (قل انما علمها عند الله)۔

خواہ وہ انبیاء مرسل ہوں یا ملک مقرب کوئی بھی یہاں باخبر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا گیا ہے: "آپ کو کیا معلوم شاید قیامت نزدیک ہو"۔ (وما یدریک لعل الساعة تکون قریبا)۔

اسی بناء پر ہمیشہ قیامت کے انتظار میں رہنا چاہیئے اور اصولی طور پر اس کے مخفی رہنے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو امان میں نہ سمجھے اور قیامت کو دور خیال نہ کرے اور خود کو عذاب اور خدائی سزا سے محفوظ تصور نہ کرے۔

اس کے بعد کفار کو تنبیہ اور اس کے دردناک عذاب کی نوعیت کا ایک گوشہ پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "خدا نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے جلانے والی آگ فراہم کر رکھی ہے"۔ (ان الله لعن الکافرین واعدّ لهم سعیرا)۔

"وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جلانے والی آگ میں رہیں گے اور اپنے لیے کوئی سرپرست اور مددگار نہ پائیں گے"۔ (خالدین فیها ابدًا لا یجدون ولیًّا ولا نصیرا)۔

خدا ہی تو ہے جو کسی کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے، لیکن قیامت کے دن کفار کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ ہی کوئی نصیر۔

اس کے بعد قیامت میں ان کے دردناک عذاب کے ایک حصے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "اس دن کو یاد کرو جب ان کے چہرے جہنم کی آگ کے سبب بدل جائیں گے"۔ (یوم تقلب وجوههم فی النار)۔

یہ تغیر یا تو چہرے کے رنگ کے لحاظ سے ہو کہ کبھی وہ سُرخ اور نیلے ہو جائیں گے اور کبھی زرد اور پژمردہ یا آگ کے شعلوں پر ہونے کے لحاظ سے، یعنی کبھی ان کی ایک سمت آگ پر ہوگی اور کبھی دوسری سمت۔ (اعاذنا الله)

یہ وہ مقام ہے، جہاں ان کی حسرت بھری آہیں بلند ہوں گی اور وہ فریاد کر کے کہیں گے: "اے کاش ہم نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی"۔ (یقولون یا لیتنا اطعنا الله واطعنا الرّسولا)۔

اگر ہم اطاعت کرتے تو اس قسم کے دردناک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

اور کہیں گے پروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی، انھوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے" (وقالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا)۔ ۱؎

"سادہ" "سید" کی جمع ہے جو بڑے مالک کے معنی میں ہے، جس کے ذمہ اہم شہروں یا ملک کا نظم ونسق ہوتا ہے اور "کبراء" "کبیر" کی جمع ہے اور بڑے لوگوں کے معنی میں ہے، خواہ یہ بزرگی عمر کے لحاظ سے ہو یا علم کی وجہ سے یا معاشرتی طور پر۔

اس لحاظ سے لفظ "سادہ" معاشرے کے اہم افراد اور سرداروں کی طرف اشارہ ہے اور "کبراء" وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان کے ماتحت رہ کر ان کے معاون اور مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ حقیقت میں ہم نے خدا کی اطاعت کے بجائے سرداروں اور وڈیروں کی اطاعت کی تھی اور انبیاء کی اطاعت کے بجائے "کبراء" کی اطاعت کی تھی اس لیے مختلف لغزشوں اور بدبختیوں کا شکار ہو گئے۔

واضح رہے کہ ان کے نزدیک "سیادت" اور "بزرگی" کا معیار صرف طاقت، لاٹھی، غیر شرعی مال وثروت اور مکروفریب تھا اور یہاں پر دو تعبیروں کا انتخاب اس لیے ہے کہ وہ کسی حد تک اپنے عذر کی توجیہ کریں گے اور کہیں گے کہ ہم ان کے ظاہری جاہ وجلال اور رعب ودبدبہ سے مرعوب ہو گئے تھے۔

اس موقع پر یہ گمراہ جہنمی غصے میں پاگل ہو جائیں گے اور خدا سے اپنے گمراہ کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے۔ "خداوندا! انھیں دوگنا عذاب دے۔ ایک تو ان کی اپنی گمراہی پر اور دوسرا ہمیں گمراہ کرنے پر": (ربنا اٰتھم ضعفین من العذاب)۔

"اور ان پر بہت بڑی لعنت بھیج"، (والعنھم لعنا کبیرا)"

یقیناً وہ عذاب اور لعنت کے مستحق ہیں۔ لیکن "عذاب مضاعف" اور "لعن کبیر" کا استحقاق دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی وجہ سے رکھتے تھے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورۂ اعراف میں ہے کہ جس وقت یہ گمراہ پیروکار اپنے سرداروں اور پیشواؤں کے لیے کئی گنا عذاب کا تقاضا کریں گے تو ان سے کہا جائے گا:

"لکل ضعف ولٰکن لا تعلمون۔" (اعراف آیت ۳۸)

"ان کے لیے بھی کئی گنا عذاب ہے اور تمھارے لیے بھی۔ لیکن تم جانتے نہیں ہو۔ ۲؎

۱؎ "الرسولا" اور "السبیلا" کے آخر میں جو الف ہے "الف اطلاق" کہلاتا ہے (چونکہ الف لام اور تنوین اکٹھے نہیں ہو سکتے) اور یہ آیتوں کے اواخر کی ہم آہنگی کے لیے ہے۔

۲؎ قابل توجہ یہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "ضعفین" اور سورۂ اعراف کی آیت میں "ضعف" آیا ہے۔ لیکن "ضعف" کے مفہوم میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ائمہ کفر وضلال کے عذاب کا کئی گنا ہونا تو واضح ہے۔ لیکن ان گمراہ پیروکاروں کے عذاب کا کئی گنا ہونا کس بناء پر ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک گناہ تو گمراہی کی وجہ سے ہوگا اور دوسرا گناہ ظالموں کو تقویت پہنچانے اور ان کی کمک کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ کیونکہ ظالم لوگ اکیلے کسی کام کو آگے نہیں بڑھا سکتے، بلکہ ان کے یار ومددگار ان کے میدان کی آگ کو بھڑکانے اور ان کے ظلم وکفر کے تنور کو مزید گرم کرنے کے لیے وہ کام کرتے ہیں۔ پھر بھی باہمی تناسب سے پیشواؤں اور سرداروں کا عذاب زیادہ سخت اور دردناک تر ہوگا۔

اس بارے میں ہم اسی سورہ کی آیت ۳۰ کی تفسیر میں زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔

۶۹- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا ۝

۷۰- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝

۷۱- يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۶۹- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے موسیٰ کو تکلیف پہنچائی اور خدا نے موسیٰ کو اس چیز سے مبرّا کیا جو وہ ان کے حق میں کہتے تھے اور وہ خدا کے نزدیک آبرومند اور (باعظمت) تھے۔

۷۰- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور حق بات کرو۔

۷۱- تاکہ خدا تمہارے اعمال کی اصلاح کرے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ عظیم کامیابی سے سرفراز ہوگا۔

تفسیر

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ناروا تہمتیں:

گذشتہ آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام اور آپ کو کسی قسم کی اذیت نہ دینے کے حکم کے فوراً بعد ان آیات میں روئے سخن مومنین کی طرف کرکے قرآن کہتا ہے: "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی۔ لیکن خدا نے موسیٰ کو ان تمام ناروا نسبتوں سے مبرا اور پاک قرار دیا اور وہ بارگاہ خداوندی میں آبرومند اور عظیم منزلت کے مالک تھے" (یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسٰی فبرأہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیھا)۔

اذیت پانے والے انبیاء میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے جتنی تکلیف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی اتنی کسی اور نبی کو نہیں پہنچائی۔ پھر کچھ تکلیفیں ایسی تھیں جو ان منافقین کی تکلیفوں سے ملتی جلتی تھیں جو وہ رسول اسلام کو دیتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دینے سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید نے اسے کیوں مجمل طور پر بیان کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں علماء نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ جن میں سے یہ بھی ہیں کہ:-

۱- ایک روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ایک پہاڑ کی چوٹی پر گئے اور حضرت ہارونؑ کی وہاں پر وفات ہوگئی، افواہیں پھیلانے والے بنی اسرائیلیوں نے ان کی موت کا الزام حضرت موسیٰ پر رکھ دیا، مگر خدا نے حقیقت امر کو واضح کر دیا اور پروپیگنڈا کرنے والوں کی قلعی کھول دی۔

۲- جیسا کہ سورہ قصص کی آخری آیات کے ذیل میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ مکار قارون نے زکوٰۃ سے بچنے اور فقراء و مساکین کے حقوق ادا نہ کرنے کے لیے ایک سازش تیار کی اور وہ یہ کہ ایک بدکار عورت کو تیار کیا گیا کہ وہ اپنے غیر مشروع روابط کے نام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائے، لیکن خدا کی مہربانی سے نہ صرف یہ کہ سازش کارگر ثابت نہ ہوئی، بلکہ اس شیطانی منصوبے کے برخلاف اس عورت نے حضرت موسیٰ کی پاکدامنی کی گواہی دے کر قارون کی سازش کو طشت ازبام کر دیا۔

۳- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے ایک ٹولے نے انھیں جادو، جنون اور خدا پر جھوٹ کی تہمت باندھنے کا الزام دیا۔ لیکن خدا نے انھیں واضح معجزات کے ذریعے ان ناروا نسبتوں سے مبرا اور پاک قرار دے دیا۔

۴- بنی اسرائیل کے جاہلوں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو برص وغیرہ جیسے چند ایک جسمانی عیوب

سے متہم کیا، کیونکہ آپ نہانے دھونے کے وقت اپنے کپڑے لوگوں کے سامنے نہیں اتارتے تھے، چنانچہ ایک دن انھوں نے نہانے کی غرض سے لوگوں سے دُور جا کر کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیئے اور وہ پتھر کپڑے لے کر چل دیا اور بنی اسرائیل نے ان کے بدن کو دیکھ لیا کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

۵- بنی اسرائیل کی حیلہ سازی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکلیف کا ایک اور عامل تھی - کبھی تو وہ تقاضا کرتے کہ انھیں خدا کا دیدار کرایا جائے، کبھی کہتے کہ من وسلویٰ جیسی غذا ہمارے لیے مناسب نہیں ہے، کبھی کہتے کہ ہم اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ بیت المقدس میں داخل ہو کر عمالقہ کے ساتھ جنگ کریں، تو اور تیرا پروردگار جاؤ اس جگہ کو فتح کرو۔ پھر ہم بعد میں آ جائیں گے۔

لیکن جو کچھ آیت کے معنی میں زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ آیت ایک کلی اور جامع حکم بیان کرتی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مختلف طریقوں سے اذیت پہنچاتے تھے، جو مدینہ کے لوگوں کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی بعض اذیتوں کے مشابہ تھیں، افواہیں پھیلاتے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے اور آپ کی ایک بیوی کی طرف ناروا نسبت جیسی اذیتیں کہ جس کی تفصیل سورہ نور کی تفسیر (تفسیر نمونہ جلد ۸ ذیل آیہ ۱۱ تا ۲۰) میں گزر چکی ہے۔ یا جیسے وہ اعتراضات جو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زینبؓ سے ازدواج کے بارے میں تھے۔ یا وہ تکلیفیں جو آپ کے گھر میں آ کر پہنچاتے یا غیر مہذب طریقے سے آپ کو پکارنے کے سلسلے میں اذیتیں تھیں۔

باقی رہا سحر و جنون وغیرہ کی نسبت یا بدنی عیوب کی بات اگرچہ یہ تہمتیں حضرت موسیٰ کے بارے میں تھیں۔ لیکن "یا ایھا الذین اٰمنوا" کا خطاب پیغمبر اسلام کے بارے میں مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ مومنین نے نہ تو حضرت موسیٰؑ کو اور نہ ہی حضرت محمد مصطفےٰ کو سحر و جادو سے کبھی متہم کیا اور اس طرح جسمانی عیوب کا اتہام بالفرض حضرت موسیٰ کے بارے میں تھا۔ اور خدا نے انھیں مبرا کیا، لیکن پیغمبر اسلام کے بارے میں تاریخ کوئی مثال پیش نہیں کرتی۔

بہر حال اس آیت سے یہ استفادہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جس وقت کوئی شخص بارگاہ خداوندی میں آبرومند اور صاحب قدر و منزلت ہو تو خداوند عالم موذی لوگوں کی ناروا تہمتوں سے اس کا دفاع اور حمایت خود کرتا ہے۔! بشرطیکہ انسان کا اپنا دامن صاف ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی آبرومندی کا بھی پاس کرے، تو وہ بھی یقیناً انسان کی پاک دامنی کو مناسب موقع پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اگرچہ بدخواہ قسم کے لوگ تہمت لگانے میں ایڑی چوٹی کا زور ہی کیوں نہ لگا دیں۔

ہم نے اس بات کی تصدیق پاک دامن یوسف علیہ السلام کی داستان میں دیکھی ہے کہ کس طرح خدا نے انہیں عزیز مصر کی زوجہ کی خطرناک تہمت سے بری کر دیا۔

اسی طرح جناب عیسیٰ کی والدہ حضرت مریمؑ کے بارے میں ہے کہ جن کے نوزاد شیرخوار نے ان کی پاکیٔ داماں اور عفت کی گواہی دی اور ان بدطینت اسرائیلیوں کی زبان بند کر دی جو انھیں متہم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب زمانۂ پیغمبر کے مومنین سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ان کے بعد بھی عرصہ وجود میں قدم رکھیں اور ایسا کام کریں جو آپؐ کی روح مقدس کو رنجیدہ اور آزردہ کر دے، آپؐ

کے دین کو حقیر سمجھیں، آپ کی تمام زحمات کو برباد کر دیں، آپؐ کی میراث کو بھلا دیں۔ تو یہ آیت ان کے لیے بھی ہوگی۔

اسی لیے بعض روایات جو اہل بیتؑ سے وارد ہوئی ہیں ان میں ہے کہ "جن لوگوں نے حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کو تکلیف پہنچائی ہے وہ بھی اس آیت کے مشمول ہیں"۔[1]

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ جب ہم خدا کے عظیم پیغمبروں کے حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ بھی جاہل اور منافق قسم کے لوگوں کی زبان کے زخم سے محفوظ نہیں تھے تو کسی کو یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے، کہ پاک اور مومن لوگ اس قسم کے افراد سے محفوظ رہیں گے، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان رضا الناس لا یملك والسنتهم لا تضبط"

"نہ تو تمام لوگوں کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ ہی تمام لوگوں کا منہ بند کیا جا سکتا ہے"

اور آخر میں فرماتے ہیں:

"کیا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام پر کئی طرح کی تہمتیں نہیں لگائیں اور انھیں تکلیف نہیں پہنچائی؟ یہاں تک کہ خدا نے انہیں تمام اتہامات سے بری قرار دے دیا۔"[2]

اعمال کی درستی کے لیے حق بات کیا کرو:

جب افواہ پھیلانے والوں اور زبان سے ایذا پہنچانے والوں کے بارے میں گفتگو ہو چکی تو اس کے بعد والی آیت ایک حکم صادر کرتی ہے جو درحقیقت اس عظیم معاشرتی مسئلے کا علاج ہے، چنانچہ خدا فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لے آئے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور حق بات کہا کرو"۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ وقولوا قولاً سدیدا)۔

"سدید" "سد" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے "محکم اور استوار" جس میں کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہو سکے اور وہ قول جو حق اور واقعے کے مطابق ہو، جو محکم سد (بند) کی طرح باطل کی موجوں کو روک دیتا ہے۔

بعض مفسرین نے اسے "صواب" (درست) کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے جھوٹ و لغو سے پاک ہونے نیز بعض نے ظاہر اور باطن کے ہم آہنگ ہونے اور "صلاح و رشاد" وغیرہ کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے۔ یہ سب معانی مذکورہ بالا جامع معنی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

بعد والی آیت "قول سدید" اور "حق بات" کا نتیجہ یوں بیان کرتی ہے۔ "خداوند عالم تقویٰ اور حق بات

---

[1] نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۰۸۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۳۰۹۔

کی بنا پر تمہارے اعمال کی اصلاح کرتا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ (یصلح لکم اعمالکم و یغفر لکم ذنوبکم)۔

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ، اصلاح زبان کی بنیاد اور حق بات کا سرچشمہ ہے اور حق بات اصلاح اعمال کے موثر عوامل میں سے ہے، اور اصلاح اعمال گناہوں کی بخشش کا سبب ہے، کیونکہ:

"ان الحسنات یذھبن السیئات۔"

"نیک اعمال گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔" (ہود/۱۱۴)

علماء اخلاق نے کہا ہے کہ زبان بدن کا سب سے زیادہ بابرکت عضو اور اطاعت، ہدایت اور اصلاح کا سب سے موثر وسیلہ ہے اور اس کے باوجود بدن کے سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ گناہگار عضو بھی شمار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تیس گناہان کبیرہ اس چھوٹے سے عضو سے جنم لیتے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

" لا یستقیم ایمان عبد حتی یستقیم قلبہ ولا یستقیم قلبہ حتی یستقیم لسانہ۔"

" کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا، جب تک اس کا دل راست نہ ہو اور دل اس وقت تک سیدھا نہیں ہو سکتا، جب تک اس کی زبان سیدھی نہ ہو۔"[2]

ایک اور قابل توجہ حدیث ہے جو امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

" ہر شخص کی زبان روزانہ صبح کے وقت تمام دوسرے اعضاء کی احوال پرسی اور خیریت دریافت کرتی ہے اور

---

[1] امام غزالی نے "احیاء العلوم" میں بیس ایسی لغزشیں جو زبان سے سرزد ہوتی ہیں یا گناہان کبیرہ جن کا تعلق زبان سے ہوتا ہے ذکر کیے ہیں۔ ۱۔ جھوٹ ۔ ۲۔ غیبت ۔ ۳۔ چغل خوری ۔ ۴۔ زبان سے منافقت کا اظہار۔ ۵۔ بے جا مدح و ثنا (خوشامد)۔ ۶۔ بدزبانی اور گالی دینا۔ ۷۔ غنا اور غلط اشعار۔ ۸۔ مزاح میں حد سے تجاوز۔ ۹۔ مسخرہ پن اور استہزاء۔ ۱۰۔ دوسروں کے راز فاش کرنا۔ ۱۱۔ وعدہ خلافی کرنا۔ ۱۲۔ بے جا لعنت کرنا۔ ۱۳۔ لڑائی جھگڑا۔ ۱۴۔ باطل امور میں گفتگو۔ ۱۶۔ زیادہ باتیں کرنا۔ ۱۷۔ ایسے امور کے بارے میں گفتگو کرنا جو انسان سے متعلق نہیں ہیں۔ ۱۸۔ شراب، جوا، اور گناہ کی دوسری محفلوں میں تعریف کرنا۔ ۱۹۔ ایسے مسائل کے بارے میں سوال اور جستجو جو انسان کے ادراک سے بالاتر ہیں۔ ۲۰۔ بات کرنے میں تصنع اور تکلیف سے کام لینا۔ اس کے علاوہ دس اور چیزوں کا ہم اضافہ کرتے ہیں۔ ۱۔ تہمت لگانا۔ ۲۔ جھوٹی گواہی دینا۔ ۳۔ فحاشی اور بے بنیاد افواہیں پھیلانا۔ ۴۔ خودستائی ۵۔ بے جا اصرار۔ ۶۔ گفتگو میں سختی کرنا۔ ۷۔ زبانی ایذا رسانی۔ ۸۔ ایسے شخص کی مذمت کرنا جو مذمت کا مستحق نہ ہو۔ ۹۔ زبان کے ساتھ کفرانِ نعمت کرنا۔ ۱۰۔ باطل کا پرچار۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۱، ص ۲۷۸۔

کہتی ہے: کیف اصبحتم؟"

" تم نے کیسے صبح کی؟"

وہ سب زبان کے اظہار محبت کے جواب میں کہتے ہیں: بخیر ان ترکتنا!

" خیریت ہے، اگر تو نے رہنے دی۔"

پھر وہ مزید کہتے ہیں: تجھے ہم خدا کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ ہمارا خیال رکھنا۔

" انما نثاب بک و نعاقب بک۔"

" ہمیں تیرے ذریعے ثواب ملے گا اور تیری ہی وجہ سے عذاب۔"[1]

اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں جو سب کی سب زبان کے انتہائی زیادہ اثرات پر دلالت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسانی نفوس کی تہذیب اور اصلاح اخلاق میں زبان کا بڑا کردار ہے۔ اسی بناء پر ایک حدیث میں ہے:

" ما جلس رسول اللہ علیٰ ھذا المنبر قط الا تلا ھذہ الاٰیۃ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیدا۔"

" جب بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس منبر پر تشریف فرما ہوتے، تو اس آیت کی تلاوت فرماتے: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور سچی بات کہو۔"[2]

آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے۔ "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، وہ بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔" (ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیما)۔

کونسی کامیابی اس سے بالاتر ہو گی کہ انسان کے اعمال پاک ہوں، اس کے گناہ بخشے جائیں اور بارگاہ رب العزت میں سرخرو اور سرفراز ہو کر پیش ہو۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۱، ص ۲۷۸

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۶، ص ۳۷۴ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

۷۲۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝

۷۳۔ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

ترجمہ

۷۲۔ ہم نے امانت (ذمہ داری اور ولایتِ الٰہیہ) کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے (اس کا بوجھ) اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا، وہ بہت ہی ظالم اور جاہل تھا (اس نے اس مقام کی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور اپنے اوپر ظلم کیا)۔

۷۳۔ مقصد یہ تھا کہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کی صفیں مومنین سے جدا ہو جائیں اور خدا (ان) کو عذاب دے، اور اپنی رحمت صاحبِ ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں پر نازل کرے اور

خدا ہمیشہ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

نوعِ بشر کا بہت بڑا اعزاز:

سورۂ احزاب کی یہ دونوں آخری آیات ان اہم مسائل کی تکمیل کرتی ہیں جو اس سورہ میں ایمان، عمل صالح، جہاد، ایثار، عفت و پاک دامنی، ادب اور اخلاق کے سلسلے میں آئے ہیں اور یہ بھی واضح کرتی ہیں کہ انسان کس قدر ممتاز حیثیت کا مالک ہے کہ خدا کی عظیم ذمہ داری کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر اپنے وجود کی قدر و قیمت کو نہ پہچانے اور اس سے جاہل ہو جائے تو کس طرح اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتا ہے اور اسفل السافلین میں جا گرتا ہے۔

پہلے تو انسان کے تمام عالم خلقت میں اہم ترین اور عظیم ترین اعزاز کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی" (انا عرضنا الامانة علی السماوات والارض والجبال)۔

لیکن عالم خلقت کے ان عظیم اور بڑے موجودات نے اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اپنی ناتوانی کا اظہار کیا اور اس کام سے ڈرتے تھے (فابین ان یحملنها واشفقن منها)۔

واضح ہے کہ ان کا انکار تکبر کی وجہ سے نہیں تھا، جیسا کہ شیطان اور آدم کو سجدہ کرنے سے اس کی روگردانی کرنے کے سلسلے میں بیان ہوا ہے:

ابٰی واستکبر (بقرہ/۳۴)

بلکہ ان کا انکار "اشفاق" یعنی ایسے خوف و ہراس کے ساتھ تھا، جس میں توجہ بھی تھی اور خضوع و خشوع بھی۔ لیکن اسی اثنا میں انسان جو عالم آفرینش کا عجوبہ ہے، آگے بڑھا اور اس نے اس کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا: (وحملها الانسان)۔

لیکن افسوس کہ "اسی ابتداء ہی میں اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور جو کچھ اس امانت کے اٹھانے کے لائق تھا، اسے انجام نہیں دیا" (انہ کان ظلوما جهولا)۔

عظیم مفسرین نے اس آیت کے سلسلے میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور "امانت" کے معنی کی حقیقت معلوم کرنے اور بیان کرنے میں بہت زیادہ کوشش کی ہے اور مختلف نظریات کا اظہار کیا ہے، جن میں سے ہم بہترین نظریہ کو ان قرائن کی جستجو سے منتخب کرتے ہیں، جو خود آیت میں چھپے ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر معانی اور مفہوم سے لبریز اس آیت میں یہ پانچ نکات زیادہ قابل غور ہیں:

۱۔ "امانت الٰہی" سے کیا مراد ہے ؟

۲۔ اسے آسمان وزمین اور پہاڑوں کو پیش کرنے کا کیا مقصد ہے ؟

۳۔ کیوں اور کس طرح ان موجودات نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا ؟

۴۔ کس طرح انسان اس امانت کے بوجھ کا حامل ہُوا ؟

۵۔ کیوں اور کس طرح وہ "ظلوم" اور "جہول" ٹھہرا ؟

"امانت" کے متعلق مختلف تفاسیر ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے یہ بھی ہے کہ، اس سے مراد ارادے کی آزادی اور اختیار ہے جو انسان کو باقی موجودات سے ممتاز اور نمایاں کرتی ہے یا مراد عقل ہے جس پر ثواب عذاب کا دارومدار ہوتا ہے "امانت سے مراد" صفت عبودیت کا کمال جو معرفت اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یا اس سے مراد انسانی جسم کے اعضاء و جوارح" ہیں، مثلاً آنکھ خدا کی امانت ہے، جسے محفوظ رکھنا چاہیئے اور اسے گناہ کی راہ میں صرف نہیں کرنا چاہیئے۔ کان، ہاتھ، پاؤں اور زبان میں سے ہر ایک خدا کی امانت ہے، جن کی حفاظت کرنا ہر انسان پر واجب ولازم ہے۔

یا مراد" وہ امانتیں ہیں جو انسان ایک دوسرے سے لیتے ہیں۔ اور "عہد و پیمان کو پورا کرنا" بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یا مراد" اللہ کی معرفت" ہے۔

یا مراد" خدائی واجبات اور فرائض الٰہی ہیں مثلاً نماز، روزہ اور حج وغیرہ۔

لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ بعض کو ایک دوسرے میں مدغم کیا جا سکتا ہے، بعض لوگوں نے اصل مطلب کے کچھ حصّوں کو اور بعض نے تمام گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

ایک جامع جواب کے حصول کے لیے ہمیں انسان پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے کہ اس کے پاس کونسی ایسی چیز ہے، جو نہ تو آسمان اور زمین میں ہے اور نہ ہی پہاڑوں کے پاس ؟

انسان ایک ایسی مخلوق ہے، جس میں انتہائی زیادہ استعداد موجود ہے اور وہ اس استعداد سے استفادہ کرتے ہوئے "خلیفۃ اللہ" کا مصداق اتم بن سکتا ہے اور کسب معرفت، تہذیب نفس اور کمالات کے ذریعے عزت و افتخار اور اعزازات کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور فرشتوں سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔

یہ استعداد ارادہ واختیار کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے اس نے صفر سے شروع کیا ہے اور لامتناہی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور اپنے ہی ارادے اور اختیار سے اسے طے کرتا جا رہا ہے۔

آسمان وزمین اور پہاڑ بھی ایک طرح کی معرفت الٰہی کے حامل ہیں، وہ خدا کا ذکر اور تسبیح بھی کرتے ہیں اور اس کی عظمت کے سامنے گڑگڑانے والے اور سجدہ گزار بھی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ذاتی، تکوینی اور جبری شکل میں ہے۔ اسی بنا پر ان کے وجود میں تکامل اور ارتقا نہیں ہے۔

صرف ایک موجود ایسا ہے، جس کی نزولی اور صعودی قوس لامتناہی ہے اور غیر محدود طور پر ارتقائی بلندیوں تک پرواز کر سکتا ہے اور ان تمام کاموں کو اپنے ارادہ واختیار سے انجام دیتا ہے اور وہ "انسان" ہے۔ یعنی یہ ہے وہ

خدائی امانت اٹھانے کے لائق جس کے اٹھانے سے تمام موجودات نے انکار کر دیا۔ یوں اکیلے اُس نے میدان میں اُتر کر اسے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔

اسی لیے ہم بعد والی آیت میں دیکھتے ہیں کہ انسان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مومن، کافر اور منافق۔ اسی بنا پر ایک مختصر سے جملے میں کہا جا سکتا ہے کہ امانت الٰہی وہی غیر محدود صورت میں ارتقائی قابلیت ہے، جس میں ارادہ اور اختیار کی آمیزش ہوتی ہے، جس سے وہ انسانیت کے کمال اور خدا کی خاص بندگی کے مقام تک پہنچ کر ولایت الٰہیہ کو قبول کرتا ہے۔

لیکن یہ کہ صرف اس امر کو "امانت" سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے، جبکہ ہماری ساری زندگی اور ہمارا سب کچھ خدا کی امانت ہے؟ درحقیقت یہ چیز انسان کے اس اہم اور عظیم امتیاز کی بنا پر ہے، ورنہ خدا کی باقی نعمتیں بھی اسی کی امانت ہیں، لیکن اس کے مقابلے میں ان کی بہت ہی کم اہمیت ہے۔

یہاں پر امانت الٰہی کا ایک اور مفہوم لیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ "امانت الٰہی" سے مراد "عہد اور ذمہ داری" کو قبول کرنا ہے۔

اسی لیے جن لوگوں نے امانت کو ارادہ واختیار کی آزادی کی صفت سمجھا ہے، انھوں نے اس عظیم امانت کے صرف ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اس کی تفسیر "عقل" یا "اعضاء بدن" یا "لوگوں کی آپس کی امانتیں" یا "فرائض و واجبات" یا "تمام شرعی احکام کی ادائیگی بیان کی ہے، ان میں سے ہر ایک نے ایک عظیم پھل دار درخت کی صرف ایک شاخ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے اور اس کا ثمر حاصل کیا ہے۔

یا امانت کے پیش کرنے سے مراد اشیاء کا باہمی موازنہ کرنا ہے، یعنی جب اس امانت کا ان کی استعداد سے موازنہ کیا تو انھوں نے زبان حال کے ساتھ اس عظیم امانت کو قبول کرنے سے اپنی عدم اہلیت کا اعلان کیا۔

دوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اور اس طرح سے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں نے زبان حال سے پکار کر کہا کہ اس امانت کا بوجھ اُٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔

یہاں سے تیسرے سوال کا جواب بھی واضح ہو گیا کہ کس طرح ان موجودات نے اس عظیم امانت کے اٹھانے سے انکار کیا اور بڑے ادب کے ساتھ اپنا خوف وہراس ظاہر کر دیا۔

یہیں سے ان کی اس امانت الٰہی کے اٹھانے کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

کیونکہ انسان اس طرح سے پیدا کیا گیا ہے جو ایفائے وعدہ اور ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہے، خدا کی ولایت کو قبول کر سکتا ہے، عبودیت اور کمال کے جادہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور اس راہ کو پروردگار کی مدد سے اپنے ہی پاؤں کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعے پہنچنے والی متعدد روایات بتاتی ہیں کہ اس امانت الٰہی سے مراد "امیرالمومنین علیؑ اور ان کی اولاد امجاد علیہم السلام کی ولایت ہے۔ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ اور ائمہ اطہارؑ کی ولایت درحقیقت اسی ولایت مطلقہ الٰہیہ کی ایک طاقتور شعاع ہے اور اولیاء خدا کی ولایت کو قبول کیے بغیر عبودیت تک رسائی اور ارتقاء کی جادہ پیمائی قطعاً ناممکن ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے جب کسی نے "عرض امانت" والی آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

"الامانة الولایة، من ادعاها بغیر حق کفر"

"امانت وہی ولایت ہی تو ہے، جس کا ناحق دعویٰ کرنے والا مسلمانوں کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

"الامانة الولایة، والانسان هو ابو الشرور المنافق"

"امانت وہی ولایت ہے اور انسان جس کی ظلوم و جہول سے توصیف کی گئی ہے، بہت سے گناہوں کا مرتکب اور منافق ہے۔"[2]

ایک اور نکتہ جس کی طرف یہاں پر اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ ہم سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے ذیل میں عالم ذر کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب خدا نے انسان سے عالم ذر میں توحید کا اقرار لیا تھا وہ انسان کی فطرت، استعداد اور سرشت کے ذریعے تھا۔ درحقیقت عالم ذر، عالم استعداد و فطرت کا دوسرا نام ہے۔

اسی طرح خدائی امانت کے قبول کرنے کے بارے میں بھی یہی کہنا ہوگا کہ یہ قبولیت کسی مقررہ قاعدہ کلیہ کے تحت یا محض تکلف کی بنا پر نہیں تھی۔ بلکہ عالم استعداد کے مطابق ایک تکوینی قبولیت ہے۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے انسان کے "ظلوم و جہول" ہونے کا مسئلہ۔

کیا انسان کی توصیف ان دو الفاظ کے ساتھ جو ظاہر طور پر اس کی مذمت کر رہے ہیں، اس امانت کے قبول کرنے کی وجہ سے ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب منفی ہے، کیونکہ اس امانت کو قبول کر لینا انسان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ اتنا بڑا اعزاز حاصل کر لینے کے بعد اس کی مذمت کی جائے؟

یا تو یہ توصیف اس بنا پر ہے کہ انسان بہت نسیان کا شکار ہوتا ہے اور اپنی ذات پر ظلم کرتا رہتا ہے اور آدمیت کی قدر و منزلت سے ناآشنا ہے، جس کام کی ابتدا ہی سے نسلِ آدم میں "قابیل" کے ذریعے بنیاد پڑ چکی تھی اور قابیل کے نقشِ قدم پر چلنے والوں نے اسے آگے بڑھایا اور اب تک اسے جاری رکھے ہوئے ہے۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۳۴۱۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۳۴۱۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وہ انسان جسے عرش کی بلندیوں سے صدا آتی رہتی ہو، وہ بنی آدم جس کے سر پر "کرمنا" کا تاج سجایا گیا ہو، وہ انسان جو "انی جاعلٌ فی الارض خلیفة" کے مصداق زمین میں خدا کا نمایندہ ہو، وہ بشر جو معلم اور مسجود ملائکہ ہو وہ "ظلوم و جہول" نہیں تو اور کیا ہوگا کہ جو اپنی ان عظیم اقدار کو طاقِ نسیان میں رکھ کر خود کو اس عالم کا اسیر بنا لے اور شیاطین کی صف میں شامل ہو کر اسفل السافلین کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرے۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس انحرافی راستے پر چلنے والے لوگ عرصہ دراز سے چلتے آرہے ہیں۔ جو انسان کے "ظلوم و جہول" ہونے کی قوی دلیل ہے۔ حتیٰ کہ خود حضرت آدم علیہ السلام جو سلسلہ آدمیت کی پہلی کڑی اور طہارت و عصمت کے مقام پر فائز تھے، اپنے اوپر ظلم کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔ بارگاہِ خدا میں عرض کرتے ہیں:

"ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین"

(سورۂ اعراف / ۲۳)

درحقیقت اس عظیم امانت کی عظمت کے ایک گوشے کو فراموش کرنے کی بدولت ہی ان سے ترک اولیٰ سرزد ہوا تھا بہرحال اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان جو ظاہرا چھوٹی اور کمزور سی مخلوق ہے، لیکن تخلیق عالم کا ایک ایسا عجوبہ ہے، جس نے اس عظیم امانت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہے، جسے اٹھانے سے زمین و آسمان اور پہاڑ عاجز آگئے تھے۔ ہاں اس کے مقام یہ عظمت اسی صورت میں ہے کہ وہ اپنے اس مقام کو بھول نہ جائے۔[1]

بعد والی آیت حقیقت میں انسان کے سامنے اس امانت کو پیش کرنے کی علت ہے اور اس حقیقت کا بیان ہے کہ انسان اس عظیم خدائی امانت کا بار اٹھا لینے کے بعد تین حصوں میں بٹ گئے۔ منافق، مشرک اور مومن۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ خدا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچائے نیز خدا صاحبِ ایمان مردوں اور باایمان عورتوں پر رحمت نازل کرے، خدا ہمیشہ سے غفور و رحیم ہے"۔ (لیعذب اللّٰه المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات ویتوب اللّٰه علی المؤمنین

---

[1] جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس امر کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ہم آیت میں کسی چیز کو مقدر مانیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے اور انھوں نے آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کرنے سے مراد ان میں رہنے والوں کے سامنے امانت پیش کرنا ہے، یعنی ملائکہ اور فرشتوں کے سامنے اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ جن چیزوں نے امانت کو قبول کرنے سے انکار کیا انہوں نے اسے ادا کر دیا اور جنھوں نے قبول کیا انہوں نے خیانت کا ارتکاب کیا" یہ تفسیر نہ صرف تقدیر کی احتیاج کی بنا پر خلاف ظاہر ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ اعتراض ہے کہ فرشتے بھی ایک طرح کی تکلیف پر عمل پیرا ہیں اور ایک حصۂ امانت کے حامل ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر، پہاڑ میں رہنے والوں کو فرشتوں سے تعبیر کرنا عجیب و غریب ہی ہے۔
(غور کیجئے گا)

والمؤمنات وكان الله غفورًا رحيمًا)۔

عربی قائدہ کے تحت " لیعذب " کی " لام " کونسی "لام" ہے ؟ اس سلسلے میں دو احتمال ہیں،

۱۔ ایک یہ کہ " لام غایت" ہے جو کسی چیز کے انجام کو بیان کرنے کے لیے ذکر ہوتی ہے۔ اس بنار پر آیت کا مفہوم یوں ہوگا:

"اس امانت کو اٹھانے کا انجام یہ ہوا کہ ایک گروہ نے نفاق کی راہ اختیار کی اور ایک گروہ نے شرک کی، اور اس خدائی امانت میں خیانت کرنے کی وجہ سے اس کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور اہل ایمان کا ایک گروہ اس امانت کو ادا کرنے اور اپنے فرائض پر قائم رہنے کی بنار پر رحمت الٰہی کا مستحق قرار پایا"

۲۔ دوسرا یہ کہ "یہ لام علت" ہے اور اس میں ایک جملہ مقدر ہے۔ اس بنار پر آیت کی تفسیر یوں ہو گی:

"امانت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تمام انسان آزمائش کی کٹھالی میں قرار پائیں اور ہر شخص اپنے اپنے باطنی حالات کو ظاہر کر کے اپنے استحقاق کے مطابق جزا اور سزا پا سکے۔"

چند اہم نکات

۱۔ اہل نفاق کو مشرکین پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ منافق اپنے آپ کو "امین" ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ وہ خائن ہوتا ہے۔ لیکن مشرک کی خیانت واضح ہے۔ اس لیے منافق عذاب کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔

۲۔ ان دونوں گروہوں کو مومنین پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ گزشتہ آیت کا آخری حصہ "ظلوم اور جہول" پر ختم ہوتا ہے اور "ظلوم وجہول" منافق اور مشرک کے ساتھ مناسب ہے۔ منافق "ظالم" اور مشرک "جاہل" ہے۔

۳۔ لفظ " اللہ" منافقین اور مشرکین دونوں کے عذاب کے بارے میں ایک مرتبہ آیا ہے اور مومنین کی جزار کے سلسلے میں بھی ایک مرتبہ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انجام کے لحاظ سے پہلے دونوں گروہ ایک جیسے ہیں اور مومنین کا معاملہ ان سے بالکل جدا ہے۔

۴۔ مومنین کے بارے میں "جزا" کے بجائے "توبہ" کا لفظ آیا ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ انھیں زیادہ تر خوف اپنی ان لغزشوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو کبھی کبھی ان سے سرزد ہوتی ہیں۔ لہٰذا خداوند تعالیٰ انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی لغزشوں کو معاف کر دیا جائے گا۔

یا اس بنار پر ہے کہ خدا کا بندوں کی توبہ قبول کرنے کا مقصد اس کی رحمت کی طرف بازگشت ہوتا ہے اور معلوم ہے کہ لفظ "رحمت" میں ہر قسم کی جزار اور بخشش چھپی ہوئی ہے۔

۵۔ پروردگار کی "غفور ورحیم" کے ساتھ توصیف یا تو اس لیے ہے کہ یہ کلمہ "ظلوم" اور "جہول" کے مقابلے میں یا پھر مومن مردوں اور مومن عورتوں کے بارے میں توبہ کی مناسبت سے۔

اب جبکہ ہم بفضل پروردگار سورۂ احزاب کے اختتام کو پہنچ گئے ہیں، اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سورہ کے آغاز و انجام کی ہم آہنگی نہایت ہی قابلِ غور ہے۔ کیونکہ یہ سورہ (احزاب) پیغمبر کو خدا کا تقویٰ اختیار کرنے اور کفار و منافقین کی اطاعت سے رکنے اور خدائے علیم و حکیم کی ذات پر تکیہ کرنے سے شروع ہوئی ہے اور انسان کی زندگی کے عظیم ترین مسئلے یعنی امانت الٰہی کے اُٹھا لینے کے ذکر پر اور پھر انسانوں کو تین گروہوں (منافق، کافر اور مومن) میں تقسیم کرنے اور خدائے غفور ورحیم کا ذکر کرنے پر ختم ہوئی ہے۔

ان دونوں مباحث کے درمیان ان تینوں گروہوں سے متعلق گفتگو ہوئی ہے کہ انہوں نے امانت الٰہی کے ساتھ کس طرح سلوک کیا ہے؟ جو سب ایک دوسرے کی تکمیل اور ایک دوسرے کو واضح کرتی ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے، جنہوں نے تیری امانت کو خلوصِ دل کے ساتھ قبول کیا اور عشق کی حد تک اس کی حفاظت کی اور اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہوئے۔

خداوندا! ہمیں ایسا مومن بنا جس پر تیری رحمت اور مغفرت نازل ہوئی ہے۔ منافقین اور مشرکین سے قرار نہ دے کہ جو "ظلوم وجہول" ہونے کے باعث عذاب کے مستحق ٹھہرے ہیں۔

خداوندا! اس دور میں جبکہ "احزاب کفر" دوبارہ "مدینۂ اسلام" کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ ان پر اپنے غیظ و غضب کا خوفناک طوفان نازل فرما اور ان کے قصور و محلات کو ان کے سروں پر گرا دے اور ہمیں ایسی طاقت و استقامت عطا فرما کہ ان حساس لمحات میں پہاڑ کی طرح ڈٹ جائیں اور اپنے جان و دل سے "مدینۂ اسلام" کی پاسداری کریں۔ آمین یا ربّ العالمین!

سورۂ احزاب تمام شد

تفسیر نمونہ کی سترھویں جلد کا اختتام بروز جمعہ ۲ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ کو ہوا۔

تفسیر نمونہ ـــــــــ جلد ۱۷

کا ترجمہ

اس حقیر پُر تقصیر ـــــ سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی (مرحوم)

کے ہاتھوں

برمکان ـــــــــ سیٹھ نوازش علی ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن لاہور

بوقت ـــــــــ ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ

بتاریخ ـــــــــ ۲، جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۶ھ

بطابق ـــــــــ ۱۳، فروری سنہ ۱۹۸۶ء

شبِ جمعہ

اختتام پذیر ہوا۔

الحمدللہ واخراً والصلوٰۃ علی النبی و آلہ ابداً دائماً۔

سیّد صفدر حسین نجفی

اِدارہ اِمامیہ قِرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآنِ پاک (تفسیر نمونہ جلد ۹) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

وَاللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سُلطان الافاضل)

مدرس / مینیجر

امامیہ قرآت کالج

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباحُ القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباحُ القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام رَوِش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی لُغت کے زیادہ دِقت طلب الفاظ کو بھی شامل کردیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کردی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سیّد شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خُدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عُمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مُفید ثابت ہوسکتی ہے۔

اِنچارج
شعبۂ تصحیح و ترتیب
مصباحُ القرآن ٹرسٹ

اشاریہ

تفسیر نمونہ ــــــ جلد ۹

ترتیب و تزئین ------ سیّد شکیل حسین موسوی
------ سیّد محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

توحید

عدل

نبوت

امامت

قیامت

شفاعت و توسل

معجزہ

جنّت

جہنّم

توبہ

احکام

نماز

روزہ

زکوٰۃ

جہاد

پردہ

احکامِ طلاق

اطاعتِ رسول

اطاعتِ والدین

اعمالِ صالح

امر بالمعروف

انفاق اور ادائیگی حقوق

نہی عن المنکر

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

مہمان نوازی

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ

ابراہیمؑ کی قوم

اہلِ کتاب

بنی اسرائیل

شعیبؑ کی قوم

عاد و ثمود

لُوطؑ کی قوم

نوحؑ کی قوم

شخصیات

آئمہ نُور و نار

آسیہ

ابراہیم علیہ السّلام (نبی)

حضرت ابراہیمؑ (فرزندِ آنحضرتؐ)

ابو حمزہ ثمالی

ابو حنیفہؒ

ابوذر غفاریؓ

ابو سعیدؓ خدری

ابو سہل سہری

جمیل بن معمّر

جویریۂ (اُمّ المومنین)

حذیفہؓ یمانی

حزقیل

حسین بن خالد

امام حسینؑ بن علیؑ (شہیدِ کربلا)

جناب خدیجۃ الکبریٰ (اُمّ المومنین)

خوفو (بادشاہِ مصر)

جناب خولہؓ بنت حکیم (اُمّ المومنین)

زاذان

زرارہ

حضرت علیؑ ابن الحسینؑ زین العابدین (امام چہارم)

حضرت علیؑ ابن موسٰیؑ رضا (امام ہشتم)

علی بن محمدؐ (سیّد)

عکرمہ بن ابوجہل

عمرو بن عبدود

عمرو کی بہن

حضرت عیسٰیؑ ابنِ مریمؑ

جنابِ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام

فرعون

ولید بن عقبہ

وارث

ہامان

ھبیرہ

علماء و دانشور

کتبِ آسمانی

تورات

قرآن مجید

کُتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

(ب)

(ت)

(ث)

(ج)

(ح)

(خ)

(ذ)

(ر)

٭

متفرق موضوعات

آزمائش (مختلف طریق سے)

آئمہِ نور و نار

آیۂ تطہیر

حضرت ابوطالبؑ کا ایمان

اچھی اور بُری رسُومات

احادیث میں فطرت خداشناسی کا ذکر

ادارتِ کار کے شرائط

ازواجِ نبیؐ (اُمہات المومنین)

استقلالِ رُوح اور اس کی اصلیت

اسلام میں عورت کا مقام

اصلاحِ احوال اور بچاؤ کے طریقے

افتراء

انفس و آفاق میں اللہ کی آیات

انکارِ حق کیلیئے بہانے

ایک اور عظیم کامیابی

ایک بڑی رسم کا ٹوٹنا

٭

رنگینیٔ دُنیا کا فریب

زبان سے سرزد ہونے والے گناہانِ کبیرہ

زمین کی سیاحت میں حکمتیں پوشیدہ ہیں

سختیوں میں فطرت انسانی کے جوہر کھلتے ہیں

سُود

شب و روز کا وجود نعمتِ عظیم ہے

شرائط مہر

شرک

صرف وحی الٰہی کی پیروی کرو

طبقاتی تفاوت

ظالموں کے ہر گروہ کی سزا مختلف تھی

ظاہر بین لوگ

ظُلم

ظہار

عابد شب زندہ دار

عالمِ خواب کے عجائبات

عذابِ الٰہی کی طلبی

عظمتِ قرآن اور مبداء و معاد

عظیم ترین افتخار

※ ※ ※

مِصباحُ القُرآن ٹرسٹ

ایک تعارف

قرآن آئینِ اسلام، فرد اور معاشرے کی بہترین سعادت کا حامل دستورِ الٰہی، مسلمانوں کا فخر اور ہر معنی میں عظمت و صداقت کا معجزہ ہے۔ قرآن کے بغیر مسلمان اور اسلامی معاشرے کا کوئی تصوّر نہیں۔

قرآن کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے معلّم خود رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ پاک ہے۔ اپنے بعد اُمت کو نہجِ اسلام پر باقی رکھنے کے لیے بھی پیغمبرِ خداؐ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

" انّی تارك فیکم الثّقلین کتاب اللّٰہ وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما فلن تضلّوا بعدی "

ترجمہ: " مَیں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت اہلِ بیت۔ اگر تم ان دونوں کے دامن سے وابستہ رہے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔"

اسی بنیادی فکر کے پیشِ نظر " **مصباح القرآن ٹرسٹ** " کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اسی فکر کے تحت " ٹرسٹ " نے اب تک جو کُتب شائع کی ہیں، ان کی فہرست پیشِ خدمت ہے۔

(ادارہ)

مطبوعاتِ مصباح القرآن

کتاب	مصنف / مترجم		قیمت	
قرآن پاک (معریٰ) رنگین		ہدیہ	۲۵۰	روپے
قرآن پاک (معریٰ) سفید کاغذ		ہدیہ	۵۰	روپے
قرآن پاک مترجم	از مولانا فرمان علیؒ	ہدیہ	۲۰۰	روپے
تفسیر نمونہ (۲۷ جلدیں)	ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ	ہدیہ	۱۲۵	روپے (فی جلد)
قرآن کا دائمی منشور	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۲۵	روپے 〃
تفسیر پیام قرآن	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۲۵	روپے 〃
ہمارے آئمہؑ (۱۲ کتابوں کا سیٹ)	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۴۰	روپے (فی سیٹ)
ولایت فقیہ (جلد اوّل)	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۳۰	روپے
ولایت فقیہ (جلد دوم)	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۵۰	روپے
تفسیر فصل الخطاب (۷ جلدیں)	علامہ سید علی نقی النقویؒ	ہدیہ	۱۲۵	روپے (فی جلد)
تحریف قرآن کی حقیقت	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۵	روپے
صلح اور جنگ	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۰	روپے
مذہب اور عقل	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۰	روپے
رہنمایانِ اسلام	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۳۰	روپے
اسوۂ حسینی	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۵	روپے
اثباتِ پردہ	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۰	روپے
معراج انسانیت	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۵	روپے
زندگی کا حکیمانہ تصور	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۵	روپے
آیت الکرسی	ترجمہ مولانا محمد تقی نقوی	ہدیہ	۷۰	روپے
مدخل التفسیر	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۵۰	روپے
آیۂ تطہیر	〃 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۳۰	روپے
توضیح المسائل	آقائے گلپایگانی رحمۃ اللہ علیہ	ہدیہ	۶۵	روپے
مختصر الاحکام	〃 〃 〃	ہدیہ	۳۰	روپے
گفتارِ انبیاء	آقائے لنگرودی۔	ہدیہ	۴۰	روپے

کتاب	مصنف / مترجم		قیمت	
انوار القرآن	ترجمہ و حواشی مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ	۳۰۰	روپے
میزان الحکمت (جلد اوّل)	ترجمہ مولانا محمد علی فاضل	ہدیہ	۲۵۰	روپے
تاریخِ قرآن	ڈاکٹر محمود رامیار	ہدیہ	۱۵۰	روپے
قرآن اہلبیت کی نظر میں	جعفر الہادی ترجمہ شفا نجفی	ہدیہ	۲۰	روپے
قرآن فہمی	استاد مطہری شہید ترجمہ سید انوار احمد بلگرامی	ہدیہ	۱۵	روپے
معاد قرآن کی نظر میں	آیت اللہ مظاہری ترجمہ 〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۲۵	روپے
مدینۃ العلم (ارشادات پیغمبر اکرمؐ)	ترجمہ سید جاوید جعفری	ہدیہ	۲۰	روپے
خطبۂ مؤنقہ (ارشادات علیؑ ابن ابی طالب)	〃 〃 〃 〃	ہدیہ	۱۰	روپے
اسلام میں مقام قرآن و عترت	ترجمہ سید محمد حسین زیدی	ہدیہ	۳۰	روپے
صحیفۂ پنجتن پاک	آغا حسن رضا غدیری	ہدیہ	۲۰	روپے
تحفۃ الابرار	〃 〃 〃	ہدیہ	۱۵	روپے
ردّ دہریت	کیپٹن فہیم رضا	ہدیہ	۲۵	روپے
اسلامی اقتصادیات	حافظ سید ریاض حسین نجفی	ہدیہ	۱۵	روپے
آئین تربیت	ترجمہ ثاقب نقوی، قیصر عباس	ہدیہ	۴۰	روپے
خلاصہ الغدیر	مولانا رضی جعفر نقوی	ہدیہ	۴۵	روپے
مسئلہ خمس	مولانا ابن حسن نجفی	ہدیہ	۲۵	روپے
تعلیمات اسلام	مولانا شیخ علی مدبر نجفی	ہدیہ	۱۵	روپے
خاندان اور انسان	مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ	۲۵	روپے
توحید القرآن	مولانا محمد ہارون زنگی پوری	ہدیہ	۵۰	روپے
شیعہ اور تحریف قرآن	آقائے علی میلانی	ہدیہ	۲۵	روپے
مبانی حکومت اسلامی	آیت اللہ جعفر سبحانی	ہدیہ	۴۰	روپے
میراث انبیاء	سید مجتبیٰ حسین	ہدیہ	۴۰	روپے
معاد	آقائے محمد تقی فلسفی	ہدیہ	۱۰۰	روپے

قرآن سنٹر ۲۴، الفضل مارکیٹ۔ اُردو بازار لاھور
فون: ۷۳۱۴۳۱۱

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ سا غطہر حسین
۴] علامہ سید علی نقیؒ
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید سجاد حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ممتاز بہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم